بیسویں صدی

BISWIN SADI

8



حقیقی ہندوستان



لندن سے رات کو تمہاری رات پہ دن کو بھی رشک آتا ہے



حقیقی ہندوستان



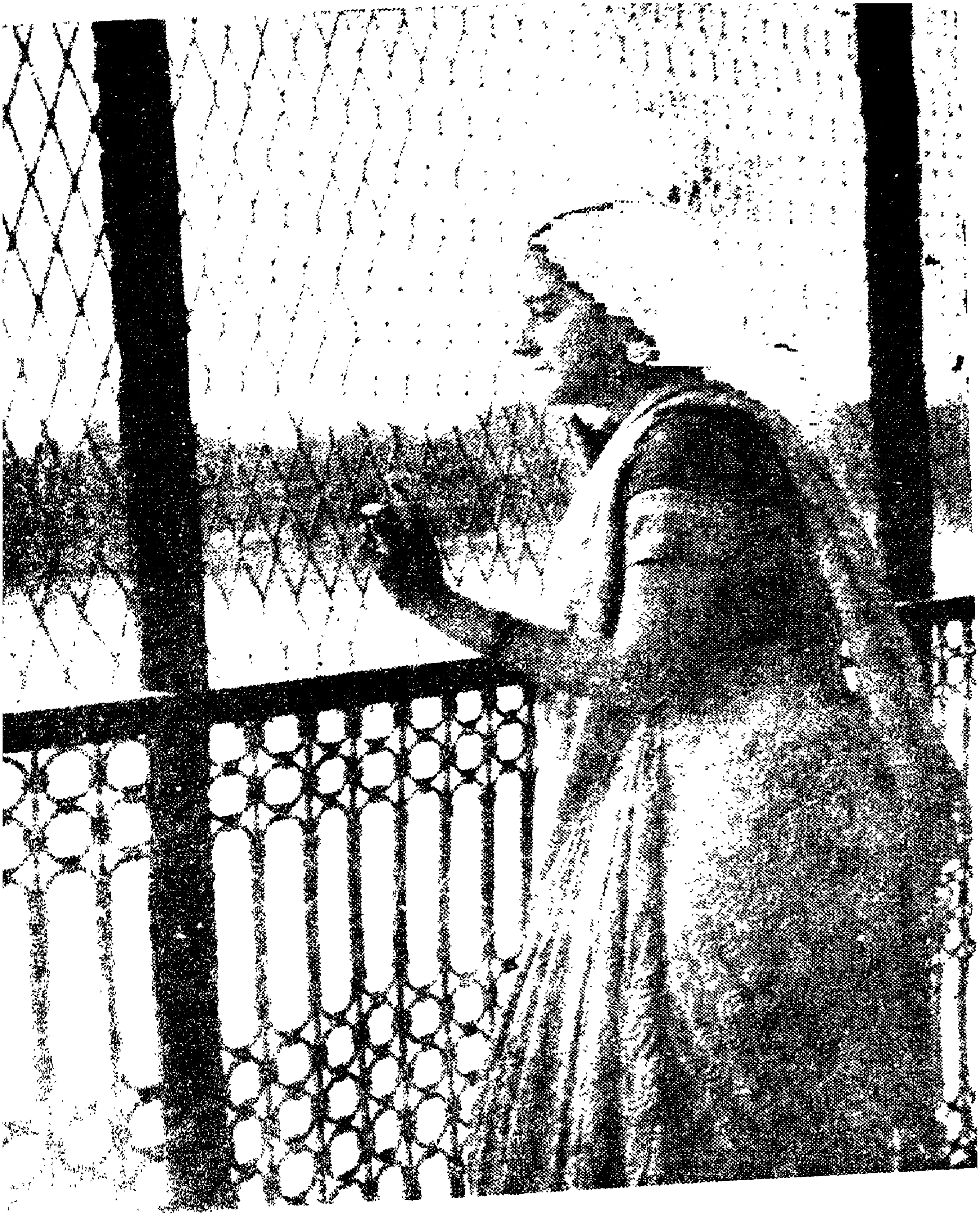
لنڈن ——— رات کو ؎ تمھاری رات پہ دن کو بھی رشک آتا ہے





اب گھر چلیں

زاویہ نظر سے پہلے



ہنسراج چلہ۔ کلیان۔ بمبئی

س۔ زندگی؟

ج۔ [illegible] اسرار حیات علامہ اقبال نے فرمایا ہے؟

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

س۔ موت؟

ج۔ موت اک زندگی کا وقفہ ہے۔

س۔ جنت یا جہنم؟

ج۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

ناصر زیدی۔ کراچی

س۔ زندگی صاحب! زندگی کے اُفق پہ یہ اندھیرا کب تک چھایا رہے گا؟

ج۔ شعور زندگی لے رہا ہے [illegible] مرتب کر رہے ہیں مستقبل کے افسانے

نثار احمد۔ کٹیہار

س۔ انسان جب دُنیا کے بکھیڑوں میں پھنس جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ دُنیا کی کس چیز کو اپناتا ہے؟

ج۔ دولت کو!

س۔ انسانیت کس وقت اور کب بکتی ہے؟

ج۔ جب انسان پر شیطان کا جادو چل جاتا ہے؟

س۔ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے، لیکن اُس کی کون کون سی خواہش جوان رہتی ہے۔

ج۔ جوان بننے اور زندہ رہنے کی خواہش۔

قمرالدین شیخ۔ پیپل گاؤں

مجھے بیسویں صدی حد سے زیادہ پسند ہے۔ کہئے کیسے دل خوش کروں۔

ج۔ بیسویں صدی کے مطالعہ سے اس کے بلند پایہ ادبی مضامین اور زندگی آموز حیات افروز مقالوں سے۔

الیف۔ اے شیون بجنوری

س۔ انسان میں کتنی بُرائیاں اور کتنی بھلائیاں ہیں؟

ج۔ انسان لاتعداد برائیوں اور بھلائیوں کا مرکب و مجموعہ ہے۔

نبی محمد۔ تندواری

س۔ آپ بیسویں صدی معموں میں ٹوکن کے حساب سے انعام تقسیم کرتے ہیں۔ یا نام وار۔ اگر ایک نام کے کئی ٹوکن ہوں اور اُن کے حل صحیح ہوں تو کیا آپ ٹوکنوں کی تعداد کے لحاظ سے انعام دیں گے؟

ج۔ جی نہیں۔ ایک نام اور پتہ پر ایک ہی انعام دیا جاتا ہے۔ خواہ اُس نام اور پتہ پر کتنے ہی ٹوکن بھیجے جائیں۔ اور خواہ وہ حل کئی مختلف انعامات کے مستحق ہوں۔ البتہ بڑے انعام کو چھوٹے پر ترجیح دی جائے گی۔

س۔ اگر کئی دوست ایک لفافے میں اپنے حل الگ الگ ٹوکن اور رسید منی آرڈر کے ساتھ بھیجیں تو کیا اُن کو شریک مقابلہ

کر لیا جائے گا؟

ج۔ جی ہاں! وہ شریک مقابلہ کر لئے جائیں [illegible] ایک ہی لفافے میں صرف [illegible] حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ لیکن [illegible] بھی ایک ہی منی آرڈر سے بھیجے [illegible] کوپن منی آرڈر میں تفصیل [illegible] یہ بہت ضروری ہے۔

محمد عثمان۔ کٹیہار

س۔ شوہر کی وفاداری گاؤں کی ایک [illegible] کر سکتی ہے یا شہر کی ایک تعلیم یافتہ [illegible]

ج۔ اس کا انحصار گاؤں یا شہر کی بیوی پر [illegible] بچپن میں لڑکی کی تعلیم و تربیت پر [illegible] اس ترقی یافتہ زمانے میں گاؤں کی بیوی [illegible] کی زیادہ فرمانبردار ثابت ہوتی ہے۔

س۔ ایک شریف عورت اپنے شوہر سے انتقام کے لئے کس وقت آمادہ ہوتی ہے؟

ج۔ شریف عورت اپنے شوہر سے کسی وقت [illegible] کسی حالت میں بھی انتقام نہیں لیتی۔

روشن محمد۔ کٹک

س۔ کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو قابو [illegible] رکھ سکتا؟

ج۔ انسان شیطان کے بہکانے میں بہت آجاتا ہے۔

س۔ کسی بے وفا دوست کی کیا سزا ہو سکتی [illegible] جب کہ وہ اپنے کو وفادار سمجھ رہا ہو۔




AFGHAN
SNOW

منی آرڈر بھیجنے کی زحمت سے نجات حاصل کیجئے

آپ کو پوسٹل آرڈر خریدنے اور منی آرڈر بھیجنے کی زحمت سے بچانے کے لئے ہم نے ایک ... اڑھائی روپیہ یا پانچ روپیہ، ساڑھے سات روپیہ اور دس روپیہ مالیت کے "بیسویں صدی کا ... ود چیز" چھپوائے ہیں۔ آپ کو جس قسم کے اور جتنے کیش ود چیز درکار ہوں اُن کی رقم اور چھ آنے رجسٹری خرچ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر ہم سے کیش ود چیز منگوالیں۔ اور ... کے لئے یہ کیش ود چیز بھیج دیا کریں۔ اس طرح آپ منی آرڈر کرانے اور ڈاک خانے کی رسید بھیجنے سے بچ جائیں گے۔ کیش ود چیز محض آپ کی سہولت کے خیال سے شائع کئے گئے ہیں ... ود چیز بذریعہ وی پی نہیں بھیجے جاتے۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مطلوبہ کیش ود چیز کی تفصیل ضرور لکھ دیں۔ تاکہ روانگی میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہ رہے۔

پتہ :- بیسویں صدی معمے ترکمان گیٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۸ نئی دہلی

بیسویں صدی معموں کے صحیح حل حاصل کیجئے

صحیح حل حاصل کرنے کیلئے آپ حل بھیجتے وقت اُسی لفافہ میں اپنا مکمل پتہ لکھا ہوا بغیر ٹکٹ کا سادہ لفافہ بھیجئے اور فیس کے منی آرڈر میں تین آنے کا اضافہ کر دیجئے یا پوسٹل آرڈر پر تین آنے کا ایک ٹکٹ چسپاں کر دیجئے۔ صحیح حل محض اُن لوگوں کو بھیجا جاتا ہے جو منی آرڈر کی رقم میں تین آنے کا اضافہ کرتے ہیں یا پوسٹل آرڈر پر تین آنے کا ایک ٹکٹ چسپاں کر دیتے ہیں واضح رہے ہندوستان میں پاکستان کے پوسٹل آرڈر یا ٹکٹ کارآمد نہیں ہیں۔ پاکستانی بھائی اور بہنیں کراچی فیس بھیجتے وقت منی آرڈر کی رقم میں تین آنے کا اضافہ کر دیں مقامی اصحاب چھپا ہوا حل دفتر بیسویں صدی نئی دہلی سے دو آنہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی معمے ترکمان گیٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۸ نئی دہلی

فخر الاطباء حکیم دینا ناتھ جی کوہلی

نے صحت یاب ہونے کے بعد گرانڈ ٹرنک روڈ امرتسر میں مطب شروع کر دیا ہے امرتسر اور بیرونجات کے مریض محترم حکیم صاحب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

جواب طلب امور کیلئے

ہمیشہ جوابی کارڈ یا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمایئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی بھائی اس شرط سے مستثنےٰ ہیں۔ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر ضرور تحریر فرمایئے کہ یہ رقم آپ کس سلسلے میں بھیج رہے ہیں۔ تاکہ آپ کے آرڈر کی تعمیل جلد از جلد ہو سکے۔

(مینجر رسالہ بیسویں صدی۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی)

خاوند بیوی کا رہنما

پریم شاستر۔ کام شاستر۔ گربھ شاستر

اِن کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا ... کے لئے بہت ضروری اور بہت مفید ہے۔ ایسے ایسے کارآمد نکتے جو اکثر تجربہ کار ... خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی اور جوانی کی اصلی ... ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے ... مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔ اِن ... خوبیوں کا اندازہ آپ اِس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں ... کی۔

پانچ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں!

یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد ... فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین ...

کام شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین ...

گربھ شاستر باتصویر ———— قیمت اردو تین روپے ہندی تین ...

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸ نئی ...

ج۔ پہلے آپ یہ فیصلہ کر لیجئے کہ واقعی دوست بے وفا ہے یا نہیں۔ مجرم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دینا بہت ضروری ہے۔

جعفر علی۔ گیا

س۔ کانگریسی حکومت کے تین تحائف جن کا پہلا حرف "ب" ہے؟

ج۔ بیکاری، بے انصافی، بددیانتی۔

ملک ردولوی۔ کانپور

س۔ کیوں بھتیا! ہماری جمہوری حکومت میں ہریجنوں کا کیا مقام ہے؟

ج۔ روایتی قانون میں مساوی۔ عمل میں پستی۔

س۔ بیسویں صدی کی مقبولیت کا کیا راز ہے؟ فضلِ ربی یا آپ کی کاوش؟

ج۔ ہماری کاوش، ادبا کا تعاون، فضلِ ربی!

مدن لال جین۔ سنگرور

س۔ خوشتر بھتیا! کیا آپ بیسویں صدی معموں کے کلکٹر بنلاتے ہیں؟ میری ازحد خواہش ہے کہ بیسویں صدی معموں کا کلکٹر بنوں۔

ج۔ آپ شوق سے بیسویں صدی معموں کے کلکٹر بن سکتے ہیں۔ رقم بذریعہ منی آرڈر بھیج کر آپ کیش واوچرز طلب فرما سکتے ہیں۔ فیس منی آرڈر آپ کے ذمے ہوگی۔ روانگی کیش واوچرز کا رجسٹری خرچ ہمارے ذمے ہوگا۔ کیش واوچرز بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کا دستور نہیں ہے۔

س۔ کراس کئے ہوئے پوسٹل آرڈر معموں میں قابلِ قبول ہیں یا نہیں؟

ج۔ جی ہاں۔ قابلِ قبول ہیں۔

پی سی۔ ورما۔ دھوری

س۔ بیسویں صدی کے کیا معنی ہیں؟

ج۔ اپنے دامن میں ادب کی رعنائیاں لئے ہوئے انسانیت کا نقیب۔

س۔ آپ نے رسالہ کا نام بیسویں صدی کیوں رکھا؟

ج۔ اس لئے کہ یہ نام حقیقت سے قریب تر ہے۔ بیسویں صدی بیسویں صدی کا آئینہ ہے۔

انوار حسین۔ پٹنہ

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت کیا چیز ہے؟

ج۔ اقتدار۔

س۔ عورت کب انتقام پر تُل جاتی ہے؟

ج۔ جب اس کی نسائیت کو ٹھیس لگتی ہے۔

علی حیدر راعین۔ بکسر

س۔ سُنا ہے بار بار کوشش کرنے سے انسان ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

ج۔ بالکل درست ہے۔

س۔ زندگی میں ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

ج۔ انسانیت کی سربلندی و سرفرازی۔

محمد ادریس انصاری۔ ہلدوانی

س۔ ملک کی تباہی و بربادی کس چیز پر منحصر

ج۔ لیڈر شپ پر۔

س۔ شرافت اور اخلاق میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شرافت اور اخلاق میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔

س۔ عمل کے بغیر علم؟

ج۔ گدھے کی پیٹھ پر کتابیں لاد دینا۔

محی الدین انجم۔ خواجہ چاند چھپرہ

س۔ شکسپیر کا قول ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے

آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ شیکسپیئر نے کہا ہے "دنیا ایک اسٹیج ہے۔ اور انسان اس اسٹیج کا اداکار ہے۔"

س۔ کیا انسان موت سے پہلے غم سے نجات پا سکتا ہے۔

ج۔ زندگی میں غم اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات نہیں پا سکتا لیکن بلند حوصلہ لوگ غم کو بھی خوشی بنا لیتے ہیں۔

لعل جمال ملک۔ وزیر آباد

س۔ اگر بیسویں صدی بذریعہ رجسٹری منگوایا جائے تو کیا سالانہ قیمت ہوگی؟

ج۔ سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے۔ رجسٹری خرچ ساڑھے چار روپے کل ساڑھے نو روپے۔ رسالہ بذریعہ رجسٹری منگوانے سے ڈاک کے ڈاکوؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

س۔ اگر شادی شدہ جوڑے کی طبیعتیں آپس میں نہ ملیں تو کیا انھیں الگ ہو جانا چاہئے؟

ج۔ نہیں، دونوں کو اپنی طبیعتیں ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اقبال احمد۔ نندبار

س۔ فلم "مرزا غالب" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ اس اردو دشمنی کے دور میں "مرزا غالب" قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس میں خامیاں بھی ہیں۔

س۔ بھارت میں ہر ادگھاٹن یا افتتاح کیا کسی لیڈر کے ہاتھوں ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اس لئے کہ اس دور میں لیڈر ہی سب کچھ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں "راشی" بھی ہیں "سمگلر" بھی کالے چور بھی لیڈری فرما رہے ہیں۔

عبدالحلیم صدیقی چنیتر پور

س۔ مسلمانوں میں طرح طرح کی جماعتیں نکل رہی ہیں۔ کیوں؟ اور ان میں کون سی جماعت حق ہے؟

ج۔ جماعت بازی کسی بھی حالت میں اچھی نہیں۔ خودغرض لیڈر اپنا دھندا چلانے کے لئے جماعت بازی کا چکر چلاتے رہتے ہیں۔

افتخار احمد چمن۔ دہلی

س۔ حیوان حیوان سے نفرت نہیں کرتا لیکن انسان، انسان سے نفرت کیوں کرتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان، حیوان کی ترقی پذیر نسل ہے!

س۔ سلام کس موقع پر کس انداز سے کرنا چاہئے؟

ج۔ اخلاق کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مرتبے کے لحاظ سے بروقتِ ملاقات سلام کرنا چاہئے۔

اسرار کاظمی۔ رائے بریلوی

س۔ آغازِ محبت کب ہوتا ہے اور انجامِ محبت کیا ہوتا ہے؟ ذرا وضاحت کیجئے۔

ج۔ آغازِ محبت "مسرت"۔ انجامِ محبت "مصیبت"۔

س۔ میں "بیسویں صدی" کا محبوب ہوں اور "بیسویں صدی" میری محبوبہ ہے۔ تو عاشق و معشوق ان دونوں پر تھوڑا سا تبصرہ کیجئے۔

ج۔ بیسویں صدی کتاب نہیں، رسالہ ہے۔ پھر آپ کی محبوبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ دونوں ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔

یوسف علی اندوری۔ پٹلاد

س۔ خودغرض دوست یا بے غرض کتا؟

ج۔ ایسی حالت میں بے غرض کتا قابلِ ترجیح ہے۔

س۔ گورکھ دھندے کا ڈھنڈورا؟

ج۔ روٹی کمانے کا دھندا۔

سید اسمٰعیل۔ بندوپور

س۔ غریبوں کی پامال زندگی خوفناک راتوں کی طرح کیوں نظر آتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ اس میں حدِ نظر تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن ؎

شعورِ زندگی لے دوست ان تاریک راتوں میں
مرتب کر رہا ہے صبحِ مستقبل کے افسانے



س۔ معتہ حل کرنا جائز ہے یا ناجائز ؟

ج۔ معتہ حل کرنا کسی مذہب یا قانون میں ناجائز نہیں۔ بشرطیکہ معتہ باز بے ایمان نہ ہو۔

س۔ ماں، باپ اپنے بچوں سے کیسی اُمیدیں رکھتے ہیں ؟

ج۔ ایک مالی پودا لگاتے وقت اُس سے جو اُمیدیں رکھتا ہے۔

ندیم ۔ سولن

س۔ بڑے آدمی کے اوصاف ؟

ج۔ وہ دولت مند ہو یا لیڈر یا سرکاری اعلیٰ افسر !

س۔ آپ بیسویں صدی میں افسانوں کو ترتیب ادیبوں کے نام کے مطابق دیتے ہیں یا افسانوں کے معیار کے مطابق ؟

ج۔ افسانوں کے معیار کے مطابق ہم فن پہلے دیکھتے ہیں۔ فنکار بعد میں۔

تبارک اللہ انصاری ۔ جلالپور

س۔ کیا موجودہ دور میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بے ایمانی ایمان داری پر غالب آگئی ہے ؟

ج۔ بے شک۔ اس لئے کہ انسان انسانیت سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔

مسعود تقی زیدی ۔ الٰہ آباد

س۔ آج کی دُنیا میں دولت دوست ہے یا دوست سب سے بڑی دولت۔

ج۔ آج کی دنیا میں دولت سب سے بڑا دوست ثابت ہو رہی ہے۔

مس زہرہ جمال ۔ لائلپور

س۔ آپ کو پھول پسند ہیں یا کانٹے ؟

ج۔ دونوں ! کانٹے بھی پھول کا دُوسرا رُوپ ہیں۔

ایس ۔ پی ۔ لال بھاکڑہ

س۔ انسان کیسے ڈرائی کلین کیا جا سکتا ہے ؟

ج۔ مذہب کے پٹرول سے دھو کر۔

ایم فضل ناشاد ۔ سیتامڑھوی

س۔ کیا ہنسی انسان کے کُمھلائے ہوئے چہرے کو شگفتہ بنا دیتی ہے ؟

ج۔ جب تک ہنسی میں دل شریک نہ ہو اُس وقت تک چہرہ شگفتہ نہیں ہوتا۔

س۔ کیا بغیر محبت کی شادی بہت ہی ہیبت ناک ہے ؟

ج۔ شادی ایک ایسا رشتہ ہے جس سے محبت خود بخود پیدا ہوتی ہے۔

احمد سعید کریمی ۔ بمبئی

س۔ خوشتر بھائی ! کیا شاعر کو سیاست سے الگ رہنا چاہیئے ؟ جیسا کہ حضرت جگر مراد آبادی نے کہا ہے ؎

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

ج۔ شاعر کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے حضرت جگر مراد آبادی نے صرف اپنے بارے میں کہا ہے۔ سب شاعروں کے لئے نہیں۔

س۔ ایٹمی طاقت امن کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے ؟

ج۔ ابھی تو اِس کا تجربہ انسانی تباہی و بربادی کی نیت سے ہو رہا ہے۔

شیو شنکر گپتا ۔ دہلی

س۔ کسی کے بلند ارادوں کی بات سُن کر دُنیا کو رشک کیوں ہوتا ہے۔ اور اُن ارادوں کو حاصل کرنے میں مدد دینے کے بجائے دُنیا رکاوٹیں کیوں پیدا کرتی ہے ؟

ج۔ بلند ارادہ رکھنے والے دُنیا کے رشک اور رکاوٹوں کی پروا نہیں کرتے کسی کی امداد کے بغیر اپنا راستہ چلتے رہتے ہیں۔



د حسن محنت کش ہے شان وطن

۵۰۰۰۰ پچاس ہزار روپے کے نقد انعام

۳۲۰۰۰ پہلا انعام بالکل صحیح حل پر بتیس ہزار روپے ★ دوسرا انعام ایک غلطی پر نو ہزار روپے ۹۰۰۰

پانچواں انعام سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو پانچ سو روپے	چوتھا انعام تین غلطیوں پر ساڑھے تین ہزار روپے	تیسرا انعام دو غلطیوں پر پانچ ہزار روپے

صحیح حل کا فیصلہ بیسویں صدی معمہ بورڈ کرے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام بیسویں صدی کے قریبی پرچے میں شائع ہوں گے ہندوستان اور پاکستان سے فیس داخلہ فی خاکہ ایک روپیہ ایک شلنگ چھ پنس ہے۔ ایک ہی نام سے تین خاکوں کی رعایتی فیس داخلہ اڑھائی روپے یا چار شلنگ اور چھ خاکوں کی پانچ روپے یا آٹھ شلنگ ہے۔ اسی حساب سے جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۹ کے تمام حلوں کے ساتھ صرف ایک کوپن بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۹ جو بیسویں صدی نئی دہلی یا بلبغ و بہار کراچی سے کاٹا گیا ہو یا اسکی قیمت [illegible] چار آنے ضرور بھیجیے

دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۹ جولائی ۱۹۵۵ء آٹھ بجے رات تک	ڈاک سے حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۸ ؍ جولائی ۱۹۵۵ء چار بجے شام تک

اشارے

دائیں سے بائیں:۔

۱۔ کُتے ـــــ رہتے ہیں اور کارواں چلتا رہتا ہے۔ (بھونکتے)

۱۔ ـــــ حالات ناموافق ہوں تو ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ (جب ۔ سب)

۔ آزادی کے بعد بعض شرنارتھیوں کی زندگی میں ـــــ کو بہت دخل حاصل ہو گیا ہے۔ (آہ ۔ آس)

۔ چہرے کی ـــــ حسن یا تقدس کا آئینہ ہوتی ہے (ضیا)

۔ کتنا بڑا نام ذلیل ہو کے رہ گیا (مہتر)

۱۔ طوفانوں سے لڑنے والا ملاح ـــــ ہوئی لہروں دیکھ کر کچھ ایسا پریشان نہیں ہوتا۔ (اُبھرتی ۔ بپھرتی) چلیپائی۔

۱۴۔ ـــــ مل جانے کے بعد خیال چھوڑ دینا مشکل ہوتا ہے۔ (دل)

۱۵۔ ـــــ کرنے والی نظریں حسین بھی ہوتی ہیں اور تیکھی بھی! (گھائل ۔ مائل) چلیپائی

۱۔ سپاہی کی تلوار بھی تو وہیں ہوگی جہاں ـــــ ہو۔ (نیام ۔ قیام)

۱۔ بات ـــــ سے پہلے تھوڑا بہت سوچنا تو ضروری ہوتا ہے۔ (کہنے ۔ کرنے)

۱۔ نہروں سے ـــــ ہونے پر زمین سونا اگلنے لگی ہے۔ (سیراب)

۱۔ بیسویں صدی معموں کا انداز سب سے ـــــ ہے۔ (جُدا)

اوپر سے نیچے:۔

۱۔ آجکل معموں کی دنیا میں ـــــ کے ٹٹو خوب دولتیاں جھاڑ رہے ہیں۔ (بھاڑے)

۲۔ کبھی ـــــ کے مسلسل وعدے بھی بیزاری کا باعث بن جاتے ہیں۔ (کبھی ۔ کسی)

۴۔ ضروری نہیں کہ غمگین شرابی زیادہ پی کر ـــــ جائے۔ (بہل ۔ بہک)

۶۔ ـــــ انسان کو نکما اور آوارہ خیال بنا دیتی ہے (مستی ۔ سُستی)

۸۔ خلوص کے بغیر دیا ہوا ـــــ بھی زہر بن جاتا ہے (امرت)

۱۱۔ کبھی کبھی بلبل کو ـــــ کے کانٹے کا زخم بھی نصیب ہوتا ہے۔ (بھول ۔ پھول) چلیپائی

۱۲۔ ـــــ کی طاقت بڑے بڑے بدماغوں کو راہ پر لے آتی ہے۔ (علم ۔ قلم ۔ حلم (نرمی ۔ انکساری)

۱۳۔ اپنے گھر میں ـــــ لگے دیکھ کر انسان کی جھنجھلاہٹ قدرتی بات ہے۔ (تالے)

۱۵۔ ـــــ کھانے والے لوگ دوسرے گروہ کو حقارت اور نفرت سے غیر مہذب قرار دیتے ہیں۔ (گھاس ۔ ماس) چلیپائی

۱۷۔ گدھوں کے خاک اڑانے سے چاندنی کی روشنی ـــــ کم ہوتی ہے۔ (کب)

بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۴۹

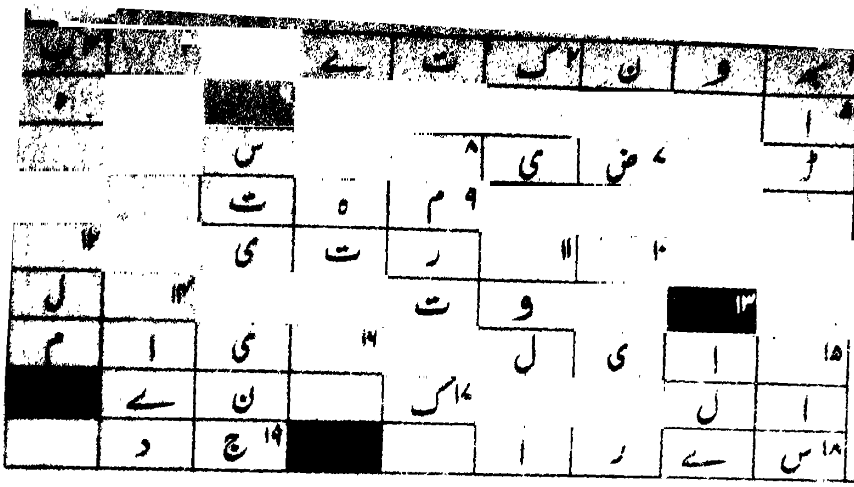
۴ ب	۳		ے	ت	۲ ک	ن	و	۱ بھ
ہ	■	■ ۶		■	■			۵ ا
	■	■ س		۸	ی	۷ ص	■	ڑ
■		■ ت	■ ہ	۹ م			■	
۱۲	■	■ ی	■ ت	ر	۱۱	۱۰	■	■
ل	۱۴			ت	و		۱۳	■
م	ا	ی	۱۶	■	ل	ی	ا	۱۵
	ے	ن		۱۷ ک			ل	ا
	د	۱۹ ج			ا	ر	ے	۱۸ س

اپنے حل اس پتہ پر بھیجیے ـــــ بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۴۹ ۔ ترکمان گیٹ ۔ نئی دہلی

پاکستانی اپنی فیس بھیجنے کا پتہ ـــــ جناب خضر دہلوی ۔ عقب ریڈیو اسٹیشن ۔ کراچی

دائیں سے بائیں اشارہ نمبر ۱۵ میں "ع" دانستہ حذف کی گئی

بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۹۴

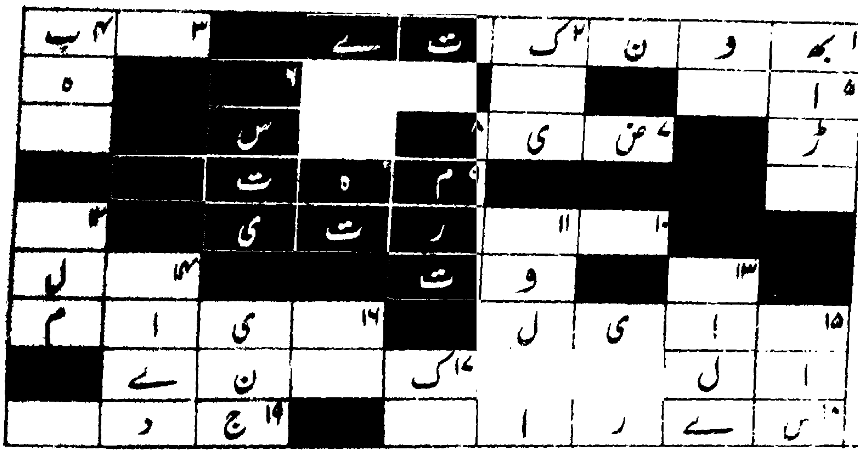


نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۹۴

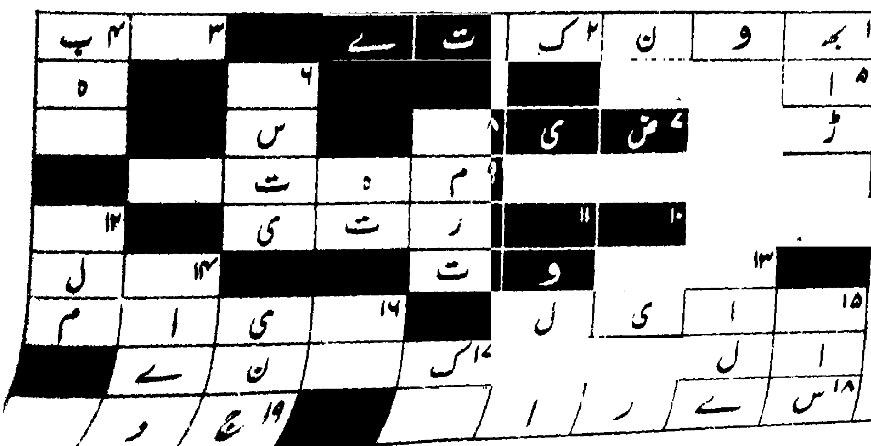


نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۹۴



نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

اپنے حل اس پتہ پر بھیجیے — بیسویں صدی سالگرہ معمہ نمبر ۹۴ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں رہنے والے اپنے حل اس پتہ پر بھیجیں — جناب [illegible]

اس کے علاوہ آپ سادہ کاغذ پر بھی لفظوں یا خانوں میں حل بھیج سکتے

ساڑھے بائیس ہزار روپے کے نقد انعامات 22500

13500 پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ساڑھے تیرہ ہزار روپے • دوسرا انعام ایک غلطی پر چار ہزار روپے **4000**

تیسرا انعام دو غلطیوں پر دو ہزار چھ سو روپے	چوتھا انعام تین غلطیوں پر دو ہزار روپے	پانچواں انعام سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو چار سو روپے

صحیح حل کا فیصلہ بیسویں صدی معمہ بورڈ کرے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام بیسویں صدی کے قریبی پرچے میں شائع ہوں گے۔ ہندوستان اور پاکستان سے فیس داخلہ فی خاکہ ایک روپیہ یا ایک شلنگ چھ پنس ہے۔ ایک ہی نام سے تین خاکوں کی رعایتی فیس داخلہ اڑھائی روپے یا چار شلنگ اور چھ خاکوں کی پانچ روپے یا آٹھ شلنگ ہے۔ اسی حساب سے جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۹ کے تمام حلوں کے ساتھ صرف ایک کوپن بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰ جو بیسویں صدی نئی دہلی یا باغ دہبہار کراچی سے کاٹا گیا ہو۔ یا اُس کی قیمت موازی چار آنے ضرور بھیجیے

دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۹ اگست ۱۹۵۹ء آٹھ بجے رات تک	ڈاک سے حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۹ اگست ۱۹۵۹ء چار بجے شام تک

اشارے

دائیں سے بائیں:۔

۱۔ کون ہے جو بدفطرت بلیک میلر پر ـــــ نہ بھیجے گا۔ (لعنت)

۳۔ ـــــ کرنے والے کی عزت کرنی ہی پڑتی ہے۔ (کرم۔کام)

۵۔ دُنیا کے ـــــ دیکھ کر انسان تقدیر پر شاکر نہیں رہ سکتا۔ (رنگ۔رنج)

۶۔ اس میں برکت ہوتی ہے۔ (حرکت)

۸۔ بعض لوگوں کو اُن کا ـــــ ہی مشہور کر دیتا ہے (جہل۔جل)

۹۔ اس سے بہت زیادہ کام لینے کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ (نوکر۔موٹر)

۱۲۔ اٹلی ایسی جگہ واقع ہے کہ اسے ہمیشہ ـــــ سے خطرہ رہتا ہے۔ (یونان۔طوفان)

۱۵۔ ایسے آدمی کے سامنے دُنیا جھکتی ہے (بڑے۔بُرے) چلیپائی

۱۶۔ جس کا حساب پاک اُس کو کیا ـــــ؟ (باک)

۱۷۔ چاند ـــــ پھیلاتا ہے اور کتے بھونکتے ہیں۔ (نور)

۱۸۔ ـــــ میں غرق ہو جانے والے کو کون بچا سکتا ہے؟ (ساغر۔ساگر) چلیپائی

اوپر سے نیچے:۔

۱۔ حرام کمانے کی ـــــ انسان کو بلیک میلر بنا دیتی ہے۔ (لت)

۲۔ بدفطرت کے لئے بُرائی کو ـــــ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ (ترک)

۴۔ جس کارخانہ دار کو اچھے ـــــ مل جائیں اُس کی کامیابی میں کیا شک! (مستری یعنی مشتری یعنی گاہک)

۷۔ دُنیا میں ـــــ کھانے والا عام طور پر زیادہ احتیاط اور شرافت سے کام لیتا ہے۔ (ٹھوکر۔چوکر یعنی گیہوں کی بھوسی) چوکر کھانے والے سے مُراد ہے بہت غریب آدمی

۸۔ بھوکے فقیر کی طرف روٹی کا ایک ٹکڑا پھینک دیا جائے تو وہ ایک مرتبہ تو ـــــ اُٹھتا ہے۔ (جی۔جل)

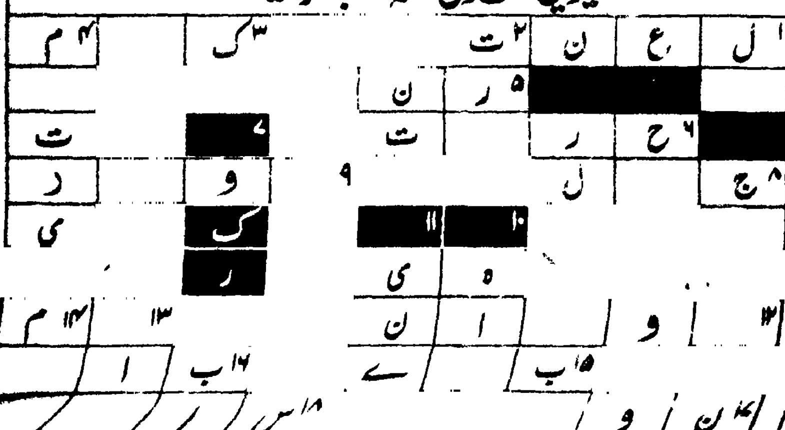
۱۰۔ اس کی ہوا تو گویا مُردے میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔ (بہار۔پہاڑ) چلیپائی

۱۱۔ دوست نواز اور محفل پسند آدمی کو تنہا ـــــ میں لُطف تو نہیں آسکتا۔ (جینے۔پینے)

۱۳۔ ـــــ کا لطف اُٹھانے کے لئے بھی خوش ذوقی اور زندہ دلی کی ضرورت ہے۔ (باغ۔راگ) چلیپائی

۱۴۔ بدمعاش لوگ اخلاق کی دُہائی دینے لگیں تو دُنیا اسے ـــــ ہی کہتی ہے۔ (مکر)

بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰



اپنے حل اس پتہ پر بھیجیے ـــــ بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰ ترکمان گیٹ

پاکستان سے فیس بھیجنے کا پتہ

بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰

نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰

نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰

نام:-

پتہ:-

حل نمبر:-

اپنے حل اس پتہ پر بھیجیے ____ بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی

پاکستان والے بھیجیے کا پتہ ____ جناب خضر دہلوی۔ عقب ریڈیو اسٹیشن۔ کراچی

اس کے علاوہ آپ سادہ کاغذ پر بھی لفظوں یا خاکوں میں حل بھیج سکتے ہیں

پہلا انعام تراسی (۸۳) اصحاب کے حصے میں آیا

معمہ نمبر ۴۸ کے تیس ہزار روپے کی تقسیم

بیس ہزار روپے کا پہلا انعام بالکل صحیح حل پر تراسی اصحاب کے حصے میں بحساب دو سو چالیس روپے پندرہ آنے ۲۴۰/۱۵/- فی کس آیا

انہیں انعام پانے کی اطلاع ۱۴ جون ۱۹۵۵ء کو دی گئی اور انعامات ۲۵ جون ۱۹۵۵ء کو بھیج دیئے گئے

۱۔ شیخ فضل حسین کمبل فیکٹری۔ گڑھی شاہو لاہور۔ ۲۔ محمد حسین معرفت شاہ اشتیاق علی شاہ کیٹینی آر پی اے۔ ایف ڈرگ روڈ کراچی۔ ۳۔ شرافت اللہ خاں ولد عبداللہ خاں کلرک ڈپٹی ڈائریکٹر آفس کراچی۔ ۴۔ بشیر احمد پیر زادہ ۔۔۔ سپرنٹنڈنگ انجینئر۔ بلڈنگس سرکل صدر حیدر آباد سندھ پاکستان۔ ۵۔ عبدالحمید خاں گلی نمبر ۲۴ مکان نمبر ۔ سنت نگر لاہور۔ ۶۔ ریاض انور عنایت اللہ بلڈنگ انار کلی لاہور۔ ۷۔ جعفر علی سبزی منڈی ملتان نمبر ۔۔۔ لا راولپنڈی شہر۔ ۸۔ جان محمد اینڈ سنز فقی اسسٹنٹ انجینئر ویسٹرن سندھ سرکل سکھر (سندھ)۔ ۹۔ رزاق صدیق معرفت خالق دینا ہال بندر روڈ کراچی۔ ۱۰۔ جی ایم قاضی فردی بلڈنگ پہلا منزلہ ۔۔۔ روڈ۔ نیا ناگپاڑہ بمبئی نمبر ۸۔ ۱۱۔ مترسین جین ۲۷۷۳ چوڑی والان دہلی۔ ۱۲۔ اندر سنگھ گزرت لال معرفت میسرز ۔۔۔ بانڈ انڈیا لمیٹڈ بالمقابل جیر ٹائکز سہارنپور۔ ۱۳۔ عبدالرحمٰن معرفت عبدالقیوم ۔۔۔ ہاؤس نمبر ۔۔۔ گلی موتی چال نمبر ۱۶ بمبئی نمبر ۸۔ ۱۴۔ منگو رام جین۔ رام گنج سرداراں ضلع لدھیانہ۔ ۱۵۔ محمد یٰسین پس فری گاؤں ۔۔۔ ایلا اندھیری بمبئی۔ ۱۶۔ ایم جی۔ این کلاتھ مرچنٹ سندھی کالونی گونڈیا (ایم پی)۔ ۱۷۔ اے صدیق ڈاکخانہ انچولی ضلع میرٹھ۔ ۱۸۔ سید نذر حسین بیاگی اسٹور چکوال ضلع جہلم۔ ۱۹۔ جگدیش چند شادہ آنند پور صاحب ضلع ہوشیار پور۔ ۲۰۔ ظہیر احمد سوداگر بلڈنگ پہلا منزل روم نمبر ۔۔۔ ہینس روڈ بمبئی نمبر ۱۱۔ ۲۱۔ برجموہن بخشی دہلی۔ این بخش کلاتھ مرچنٹ ڈاکخانہ کرڈوواڑی ضلع شولاپور۔ ۲۲۔ علی حسن ادریسی محلہ شیخ صاحبان خورجہ ضلع بلند شہر۔ ۲۳۔ پرشوتم داس ریفنڈ چیک آف انڈیا لدھیانہ۔ ۲۴۔ محمود یار خاں درسگاہ ناصریہ تلک روڈ جمشید روڈ کراچی نمبر ۵۔ ۲۵۔ پرتاب سنگھ معرفت دی خالصہ آئرن ورکس سمان احاطہ مین پوری۔ ۲۶۔ عبدالحکیم معرفت محمد یحییٰ عثمانی ۸۹/ اے۔ خداداد کالونی کراچی نمبر ۵۔ ۲۷۔ اننت رام نندہ کوارٹر نمبر ۱۱۲/ ۷ اٹھاون نسب فریدآباد۔ ۲۸۔ منشی حافظ علی محمد عتیق منڈی بلاقی رام حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ۔ ۲۹۔ پی ایس بسرا قصبہ مائل گہلاں براستہ جنگ جالندھر۔ ۳۰۔ مقبول احمد انصاری مقام مندمورہ ڈاکخانہ حبیب والا (ضلع بجنور)۔ ۳۱۔ بیش چندر بٹالیہ انڈین ایئر فورس آفیسرز میس آگرہ چھاؤنی۔ ۳۲۔ احمد علی ولد عبدالغنی قادری معرفت قمرالدین نیوز ایجنٹ بازار جگی پورہ بدایوں۔ ۳۳۔ اوم پرکاش نرولہ ڈرافٹنگ آفس گن کیریج فیکٹری جبلپور۔ ۳۴۔ وحیدالزماں رزمی ایڈیٹر سہ روزہ نئی دنیا ملتان۔ ۳۵۔ جے ایس نگم ۳۰۲۸ پیپل مہادیو حویلی صوبی حوض قاضی دہلی۔ ۳۶۔ ولی محمد کلرک پی گروپ ٹی ڈی ای ایس پوسٹ بکس نمبر ۱۷ کانپور۔ ۳۷۔ دینل کمار سود پالم پور ضلع کانگڑہ۔ ۳۸۔ بشیر احمد تاج بوٹ ہاؤس لوہانی سرائے سہارنپور۔ ۳۹۔ شریمتی رتنا ہرکن داس معرفت ایس ہرداس دیوبل ۔۔۔ ۴۰۔ الونگیا محلہ اجمیر۔ ۴۰۔ رشید فاطمہ بیگم معرفت سعیداللہ مکان نمبر ۲۷ ۔ ۴۱۔ وارڈ نمبر ۴ متصل درگاہ مشکل کشا بہادر گنج الہ آباد نمبر ۳۔ ۴۱۔ رام سرن داس چاولہ ولد لالہ دیوا نجید چاولہ ڈاکخانہ رُدر پور ضلع نینی تال۔ ۴۲۔ ایس ایس جوہر پبلیکیشن برانچ ۔ آئی سی اے آر کوئین وکٹوریہ روڈ نئی دہلی۔ ۴۳۔ حبیب اللہ صدیقی ہیڈ مستری ہیڈ کوارٹر انجینئر آفس سکشن ناردرن ریلوے بریلی جنکشن

۴۴۔ امریک سنگھ مکان نمبر ۳۱۱۳ کچی سرائے انبالہ چھاؤنی۔ ۴۵۔ رزا محمود حسین معرفت دیوز موٹرس نمبر ۱۵ ایچ چین ایونیو کلکتہ نمبر ۷۔ ۴۶۔ سادھنا معرفت مسٹر لیل مدن چوپڑہ اودے بھون نزد پولیس لائنز اندورہ ناگپور۔ ۴۷۔ ممتاز علی چودھری براؤس نمبر ۶۔ ۵۔ جالنگ مارکیٹ نظیر آباد لکھنؤ۔ ۴۸۔ گجندر سنگھ رام پرشاد شاہ لین بارڈی نمبر ۶ کلکتہ۔ ۴۹۔ مدن گوپال ۸ راج بازار اسکوائر نئی دہلی۔ ۵۰۔ ایس مظفر حسین ایجنٹ اما سیونگ مشین۔ بازار سنبھلی گیٹ مراد آباد (یو پی)

۵۱۔ موہن لال بھاٹیہ معرفت بھاٹیہ آٹوموبائلز کامٹی روڈ ناگپور۔ ۵۲۔ جے پی مصرا ۲ ہاتھی کھانہ جھانسی۔ ۵۳۔ ہرچند ہنس نگودھی پوسٹ قصبہ گڑھ گوڑ گانواں۔ ۵۴۔ مدن لال خریا کمار شو سٹور کشمیری بازار ہوشیار پور۔ ۵۵۔ جے رام داس سندھی کلاتھ مرچنٹ سبزی منڈی رائے بریلی۔ ۵۶۔ پریتم سنگھ مکان نمبر ۱۴/۲۳۰۱ کا ریادیر نگر دیال باغ آگرہ۔ ۵۷۔ دید پرکاش بھارتی ۵۰۵ کمانڈ ڈبلیو ایس اے ای ایم ای ایم ڈبلیو ورکشاپ دہلی کینٹ۔ ۵۸۔ حوالدار رتن پر ساش۔ ۱/۷۔ ۴ کابل لائن دہلی چھاؤنی۔ ۵۹۔ ڈاکٹر پرسوتم راج بھاٹیہ مونسپل سرجن بازار خرادیاں لدھیانہ۔

۴ ا	■	ہ	۳ ب	■	ی	۲ ب	د	۱ ا
ت	ب	ا	ب	۵ ط	■	ن	■	ت
ا	■	■	■	ی	ہ	ا	پ	۶ س
ع	ی	۸ ب	۷ ر	■	■	و	■	ر
■	■	د	ح	■	■	ٹ	■	■
۱۲ ع	۱۱ ر	■	ل	■	■	■	۱۰ غ	۹ م
ی	ا	■	ت	۱۴ ن	■	۱۳ ن	ی	ے
ر	ہ	۱۶ ش	■	ت	■	ک	ا	۱۵ ل
ت	ی	ر	ی	۱۷ خ	■	ر	ل	■

صحیح حل بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۸

۶۰۔ سدرشن لعل۔ روزانہ ملاپ پٹیالہ۔ ۶۱۔ سریندر سنگھ معرفت مہاراجہ کلاتھ ہاؤس پالم پور ضلع کانگڑہ۔ ۶۲۔ فضل محمد چوہدری۔ ریاض بلڈنگ نزد پنجاب سوپ فیکٹری۔ بیرون شیرانوالہ گیٹ لاہور۔ ۶۳۔ ایل آر چوپڑہ۔ اپر انڈیا گلاس ورکس لمیٹڈ انبالہ شہر۔ ۶۴۔ کرتار سنگھ ملی شوجی بھائی چال۔ اکولہ (ایم پی)۔ ۶۵۔ دیال چند حلوائی دیو نگر بلاک نمبر ۴ دکان نمبر ۴۱ ۵۸ قرول باغ نئی دہلی۔ ۶۶۔ ٹھاکر دوستی سین بیرہ ریل بازار کانپور۔ ۶۷۔ بستراں دیوی دھرم پتنی لالہ رام لال گگرہ مکان نمبر ۱۴۷/ IV B گلی درزیاں پھیری روڈ محلہ ملکانہ فاضلکا (فیروزپور)۔ کنول یادو معرفت آر سی یادو گوری شنکر بلڈنگ امری گیٹ اجمیر۔ ۶۹۔ رام موریتی اروڑہ۔ رام موریتی ستیش کمار آئرن مرچنٹ بمقام لوہیاں تحصیل نکودر۔ ۷۰۔ پرہلاد بھگت سپرنٹنڈنٹ سنٹرل۔ پے اینڈ اکاؤنٹس آفس منسٹری آف ڈبلیو ایچ ایس ایکر یڈکو نئی دہلی۔ ۷۱۔ کملا دیوی معرفت رکھی رام ایس ایس ٹریڈرز کلکٹ نمبر ۱۸۰ اربیر سکیشن مشین شاپ۔ این آر ورکشاپ کالکا۔ ۷۲۔ لکھمیر سنگھ ترلوک ریڈیو سروس ہاپوڑ۔ ۷۳۔ محمد اسحاق صدیقی ولد محمد ابراہیم صدیقی محلہ کمپنی باغ ستنا (مدھیہ پردیش)۔ ۷۴۔ نیلم کماری ویدیہ کمل ٹاکیز فرخ آباد۔ ۷۵۔ ستیش چہانہ معرفت ہر اکرٹ بہا ند چیانہ دکان نمبر ۲۶ ٹاؤن شپ راجپورہ۔ پیپسو۔ ۷۶۔ ۵۵۔ الحاج حویلی نائی منڈی آگرہ۔ ۷۷۔ دیوہ رام کھربندہ فراشخانہ کوارٹر نمبر ۳۹ رامپور۔ ۷۸۔ ہر دیال اکاؤنٹس کلرک کیتھل ڈویژن ماڈل ٹاؤن انبالہ۔ ۷۹۔ سردار گوبند سنگھ مان معرفت کیپٹن جگر سنگھ صاحب نمبر ۵۹ ۔۔۔ ۳۔ ۸ عنبر سیٹھ حیدرآباد دکن۔ ۸۰۔ تیلو رام راجپوت دکان نمبر ۴۹ مارکیٹ نگل ٹاؤن شپ (ہوشیارپور)۔ ۸۱۔ لئیق احمد دہلوی فارسیٹ کنزرویٹر گورنمنٹ آف پاکستان اولڈ سکھر سندھ۔ ۸۲۔ این عبدالحکیم پان والا ۲۱/۱۰ آگل محمد اسٹریٹ کراچی نمبر ۲۔ ۸۳۔ نور محمد وکیل۔ دال منڈی بنارس۔

چار ہزار پانچ سو روپے کا دوسرا انعام ایک غلطی پر حسب ذیل ۲۸۸، اصحاب کے حصے میں بحساب پندرہ روپے دس آنے فی کس آ…

… مظہر حسین کراچی۔ میر احمد کراچی۔ عبد القیوم کراچی۔ غلام اکبر کراچی۔ خواجہ موسیٰ کراچی۔ یونس علی کراچی۔ ارشاد حسین کراچی۔ … ناگپور۔ … بمبئی۔
… لکھنؤ۔ عبد العظیم گونڈوی لکھنؤ۔ انور النساء کراچی۔ نور حسین لاہور۔ جمعدار محمد شاہ گوجرخاں۔ ایس ایس رحمٰن کلکتہ۔ ایس ایس اے خاں لکھنؤ۔ بیگم ایس … کلکتہ۔ عباس علی … احمد آباد۔
… آگیا رام … سہارنپور۔ رشیدہ بیگم سہارنپور۔ عبد الخالق سہارنپور۔ برجموہن نئی دہلی۔ ایس این ورما جھانسی۔ ایس ایم … بریلی۔ بابو رام … شاہ آباد۔ محمود احمد خاں … مہندر سنگھ دہلی۔ جبلپور۔
… عبد الحمید … مظفر احمد … دہلی۔ گوردھیان چند نئی دہلی۔ سید حسن سید ہاشم گدگ۔ کملیش دہلی۔ پرویز احمد خاں مسوری۔ محمد جہانگیر لاہور۔ … کراچی۔ نیاز محمد بیگ کراچی۔ ایم … اسماعیل الٰہی … پور۔
… کوئٹہ۔ شجاعت علی خاں کوئٹہ۔ نذیر خاتون رحیم یار خاں۔ حمید بیگ میسور۔ امر دیوان جالندھر۔ ایم ابراہیم بمبئی۔ ظہور الحق بمبئی۔ عائشہ … بمبئی۔ عبد الستار خاں بمبئی۔ محمد اقبال … لاہور۔
… لکھنؤ۔ حسن … ماڈل ٹاؤن شپ … فرید آباد۔ موہن سنگھ … کندن لال نئی دہلی۔ … راولپنڈی۔ محمد عالم … میکوال۔ غلام رقیہ … عبد الحمید سہارنپور۔ … جلیشوری ناگپور۔ مسز … گوبند سنگھ …
… شیام … سیالکوٹ۔ عارف شاہ سیالکوٹ۔ … نصیر آباد۔ ودیا پرکاش … کریم کراچی۔ دیا کماری … راج … فرخ آباد۔ … کنڈہ گھاٹ۔ سنتوش کمار … سرینگر۔ عبد الحمید … میرٹھ۔ عبد الرحمٰن …
… سراج … چراغ علی کانپور۔ سروج کماری بریلی۔ عبد الخالق سہارنپور۔ … سنگھ کانپور۔ … شام سنگھ … دھامپور۔ … رام … بالم پور۔ … جیت کمار … مالیگاؤں۔
… رام کرشن … رامپور۔ … خاں لکھنؤ۔ … لدھیانہ۔ وشنداس … سہارنپور۔ محمد نبی … دہلی۔ … ملک دہلی۔ … پرشاد … اجیت پرشاد …
… جمیل … محمد مصطفیٰ … دولت رام شرما پٹھانکوٹ۔ … سنگھ … سوہن … برج … دہلی۔ آصف مرزا دہلی۔ آصف حسین نئی دہلی۔ … مراد آباد۔ … ہرش …
… ناگپور۔ … رام … لال کپور … دہلی۔ آر پی … نئی دہلی۔ کنول دہلی۔ محمد عمر شاہ … بمبئی … روپ …
… سکندر آباد۔ احمد پاشاہ … ناگپور۔ کمل … نئی دہلی۔ پون کمار نئی دہلی۔ زیب النساء … افغانستان۔ جینت رام میانی … محمد صابر سہارنپور۔ سومنت کمار ہوشیارپور۔ … امرتسر۔ … کلکتہ۔ پشپا رانی …
… محمد یوسف … علی اظہر … زاہد حسین منٹگمری۔ یوسف کراچی۔ کے گنگا دھر نظام آباد۔ امرناتھ نئی دہلی۔ بالکرشن پالم پور۔ عبد القیوم سہارنپور۔ … بریلی۔ لکشمی … دہلی۔ گیان چند گپتا …
… ظہور الدین لاہور۔ عبد الحمید خورجہ۔ شکنتلا دیوی شاہدرہ۔ … دیوی اجمیر۔ ایسر داس اجمیر۔ منگھرمل … سوہن لال نئی دہلی۔ سمترا دیوی دہلی۔ شام … کماری … امرتسر۔
… جاگیر … رام کمار … عبد الحق الٰہ آباد۔ روشن لال خورجہ۔ گوبند رام … پرشاد الٰہ آباد۔ … سنتوش کماری … عشرت جہاں رامپور۔ … لدھیانہ۔ پریم ناتھ … محبوب حسن کانپور۔ عبد الغنی داؤد بمبئی۔ … کانپور۔
… طیب … جیونداس … سلطان حسن رامپور۔ بابا نانک … پریم کانتا ڈیرہ … عبد اللطیف کراچی۔ عبد الحی کراچی۔ شمیم حسین … کریم بخش … موہن لال … ودیا …
… عبد الکریم … لطیفہ … حبیب اسمٰعیل … ماڈل ٹاؤن شپ … امرتسر … لدھیانہ … مہندر سنگھ … عبد الغنی کراچی۔ جگندر پال کلکتہ۔ راشد سلیم کراچی۔
… قادر ابراہیم … بھولو رام شملہ۔ اوم پرکاش اجمیر۔ اعجاز الدین … بسنت سنگھ … چھوٹے خاں … ماڈل ٹاؤن شپ۔ … امرتسر۔ راجندر سنگھ …
… عبد العزیز … رشید احمد … لاہور۔ ایم بشیر احمد لاہور۔ ایل اے خاں اورنگ آباد۔ … انبالہ کینٹ۔ … بابو سیتاپور۔ … کراچی۔
… عبد الواحد … رام … بیگم … لکھنؤ۔ … جہاں … دہلی۔ … لال دہلی۔ رام چندر … دہلی۔ … اے یو خاں کراچی۔ … لاہور۔ … یو خاں کراچی۔ … لکھنؤ۔
… محمد الطاف الٰہ آباد۔ … گوربخش سنگھ … اندر داس دہلی۔ … مراد آباد۔ گنگا سہائے … محمد سلیم لاہور۔ … محمد شفیع کوئٹہ۔ محمد عالم خاں کراچی۔ … منٹگمری۔ … سیتاپور۔
… مسز امرت کور امرتسر۔ محمد الیاس … محمود الحق … سہائے … عبد الرسول … مقبول احمد … اوم پرکاش … ملتان۔ … کراچی۔
… جمشید پور۔ ابراہیم … سرداری لعل … کانپور۔ … عزیز الحسن … اسمٰعیل … حسین … گوبند رام … موہن لال جالندھر چھاؤنی۔ حیدر آباد۔ … انبالہ۔ ستیہ پال …
… ایس ایس نرولہ … بابو رام شرما دہلی۔ اجے پال سنگھ … محمد شمیم رانی گنج۔ معیز الدین فتح گڑھ۔ … فیروزپور چھاؤنی۔ … سلطان احمد … حیدر آباد سندھ۔ عباس …
… کراچی۔ … رامپور۔ … دہلی۔ پریم ناتھ نئی دہلی۔ … بریلی۔ … سنگھ … لاہور۔ … رامپور۔ … خورشید … خلیل الدین لاہور کینٹ۔
… عبد الحق دہلی۔ انوار ظفر لاہور۔ فضل الٰہی سہارنپور۔ سکندر … لکھنؤ۔ سید عالم … کانپور۔ محمد رفیع … انور حسین لاہور۔ محمد نیاز قلات۔ انیس الدین کراچی۔
… کیشوری لال شرما شملہ۔ گیتا شرما شملہ۔ ایم وینکٹیا بداپلی۔ محمد حسین داری۔ ہری پال نامکم۔ افسر علی آگرہ۔ ریاض الدین لاہور۔ آمنہ رشید کراچی۔ بیگم … محمد … لائل پور۔ … امرتسر۔ مدن لال …
… امرتسر۔ دیوان … جبلپور۔ افضل خاں جبلپور۔ محی الدین بھاگلپور۔ … کانپور۔ … محمد حسین چودھری میاں چنوں۔ تنویر خانم کراچی۔ … رام شرما شملہ۔ … امرتسر۔ … لال شملہ۔
خاں ٹونک۔ سردار احمد خاں حیدر آباد سندھ۔ عبد الحمید میاں چنوں۔

تین ہزار روپے کا تیسرا انعام دو غلطیوں پر حسب ذیل ۱۸۴، اصحاب کے حصے میں بحساب تین روپے گیارہ آنے فی کس آ…

… محمد ادریس … محبوب … شیخ … بال کرشن … ناگپال سہارنپور۔ ڈی ایل ناگپال سہارنپور۔ محمد معین سہارنپور۔ بدھ پرکاش جالندھر۔ لکشمی دیوی بھوپال۔ … پٹیالہ۔ شام سندر لعل … کرشن کمار … نئی دہلی۔
… محبوب … بی لکشمی … محمد محسن … محمد محی الدین حیدر آباد دکن۔ ودیا رانی لدھیانہ۔ خورشید بانو بریلی۔ … فرید آباد۔ … شاہجہانپور۔ رام لعل … آسانند دہلی چھاؤنی۔ بھارت مترا لدھیانہ۔ دیو راج لدھیانہ۔
… امری رام پٹنہ۔ … سنگھ پٹیالہ۔ برجموہن سنگھ … بختاور سنگھ … حسن علی … فاطمہ بیگم کانپور۔ سمیع اللہ خاں … برج لعل … جالندھر۔ عبد السلیم جالندھر۔ برہانپور۔
… جاگیر سنگھ … پرکاش چند سہارنپور۔ رام ناتھ دہلی چھاؤنی۔ حکیم عزیز احمد دیوبند۔ … انبالہ۔ … راج رانی آگرہ۔ محمد یاسین دہلی۔ ہردیال دہلی۔ جسپال نئی دہلی۔
… محمد ابو القاسم … ایم ایم علی کرول۔ ثمر احمد نجیب آباد۔ شہاب الدین لائل پور۔ ٹیک چند فرید آباد۔ نیم چند سہارنپور۔ محمد حفیظ الدین نظام آباد۔ اے اے چیا گیا۔ محمد طیب جگسلائی۔ … آباد۔
… پٹھانکوٹ۔ سومناتھ … بال کرشن … بسنت رام اکولہ۔ خواجہ محمد امین کلکتہ۔ … ناگپور۔ اے رؤف … دہلی۔ … نصیر احمد لاہور۔ محمد امین سیالکوٹ۔ سعید اختر خاں بمبئی۔ …
… بیگم … مسز آر جہاں کراچی۔ ایس شبیر اصغر … عارف کراچی۔ اختر سعید کراچی۔ جواد حسن خاں کراچی۔ غلام محمد کراچی۔ حیدر علی خاں کراچی۔ کملا دیوی جھالاواڑ۔
… سید احمد خاں … کرم سنگھ ہوشیار پور۔ گوراندتا ہوشیار پور۔ چندر پال سود ہوشیار پور۔ رام کشن ہوشیار پور۔ … بشیر آباد۔ محمد عبد الجبار … احمد آباد۔ رحمان میاں علی میاں احمد آباد۔
… مدن لعل امرتسر۔ … فرید آباد۔ … ایس پی۔ … سولن۔ … انبالہ۔ گیا چند … رام لعل خورجہ۔ … کرشن خورجہ۔ … دیالپور۔ … بہاری لعل امرتسر۔ … شریف۔ ایم کے …
… رام لعل امرتسر۔ … لابھ سنگھ … جتندر کمار … بھٹنڈہ۔ نریندر سنگھ بھٹنڈہ۔ … حیدر آباد دکن۔ مہدی حسن … کراچی۔ … بیگم … حسن احمد پرتاب گڑھ۔ احمد آباد۔

[illegible] قمر النساء [illegible] محمد احمد کانپور [illegible] آباد [illegible] علی [illegible] - [illegible] لدھیانہ - میاں قطب [illegible] گوجرانوالہ [illegible] محمد حسین [illegible] جالندھر [illegible] غلام حسین [illegible] - [illegible] کراچی - سید علی [illegible] - غلام علی [illegible] کراچی [illegible] محمد جمیل [illegible] - الطاف حسین [illegible] - [illegible] محمد شفیع کراچی - محمد سلیم ملتان [illegible] لکھنؤ - شاہ [illegible] بمبئی - [illegible] آباد دکن [illegible] - کاملا [illegible] - [illegible] شملہ - ایس ایل کھنہ شملہ - رام گوپال [illegible] - سورج پرکاش شملہ [illegible] - [illegible] مظفر [illegible] - [illegible] پرشاد [illegible] - [illegible] پرشاد [illegible] - منظور شاہ کرن [illegible] - روشن لال امبوڈی - یاسین کوٹلہ [illegible] حسین [illegible] لکھنؤ - عبد الحفیظ خاں کانپور [illegible] - سلطانہ [illegible] کلکتہ - [illegible] دہلی - کنور سین [illegible] - [illegible] میرٹھ - [illegible] مراد آباد [illegible] - سرجیت سنگھ دہلی - [illegible] لدھیانہ - محمد سلیم اللہ [illegible] - [illegible] امرتسر - جگدیش لال دہلی - [illegible] دہلی - محمد اصغر دہلی - [illegible] دہلی - جالندھر [illegible] - مشتاق احمد کلکتہ [illegible] لکھنؤ - [illegible] حسین لکھنؤ - [illegible] دہلی - [illegible] دہلی - محمد حسین [illegible] [illegible] کلکتہ - اکبر بھائی [illegible] حسین [illegible] - ایم اے رضا حیدر آباد دکن [illegible] دیوی [illegible] - [illegible] حیدر آباد دکن [illegible] - [illegible] کراچی - خلیل الرحمن کراچی - غلام احمد [illegible] حیدر آباد دکن - [illegible] عزیز اللہ خاں کراچی - عبد الحمید خاں لاہور - احمد حسین [illegible] - عبد الرحیم [illegible] - [illegible] پٹیالہ [illegible] - [illegible] سنگھ امرتسر - رام سرن سنگھ [illegible] [illegible] گوردوارہ [illegible] - [illegible] الہ آباد - نور محمد [illegible] - عبد الرؤف [illegible] - [illegible] سنگھ [illegible] - سورج پرکاش [illegible] - لوک ناتھ [illegible] فرید آباد - [illegible] داس جالندھر [illegible] - [illegible] لال [illegible] فرید آباد - لال چند لکھنؤ [illegible] - [illegible] آگرہ - [illegible] الدین [illegible] - [illegible] گردھاری لال کالکا [illegible] کالکا - بیگم [illegible] - [illegible] سنگھ جالندھر [illegible] - جیا لال [illegible] - [illegible] جگدیش چند [illegible] - [illegible] کراچی - حسن میاں کراچی - [illegible] الدین [illegible] [illegible] لکھنؤ - ابراہیم آدم احمد آباد - عبد الرحمن کلکتہ - محمد سلیمان کلکتہ - محمد [illegible] کراچی - [illegible] کراچی - غلام [illegible] پشاور - منظور [illegible] - عبد الغفار کراچی - [illegible] رامپور [illegible] حیدر آباد سندھ - عبد الحفیظ [illegible] - [illegible] رامپور [illegible] کراچی [illegible] کراچی [illegible] کراچی - [illegible] حیدر آباد سندھ - منصور علی کراچی - سلامت [illegible] - [illegible] داس [illegible] سرینگر - [illegible] دہلی [illegible] - [illegible] دہلی - عرفان بیگ [illegible] - [illegible] راولپنڈی - [illegible] نظام الدین [illegible] - غلام غوث حیدر آباد دکن [illegible] - [illegible] ڈھاکہ - کاظم [illegible] - [illegible] میرپور خاص - [illegible] دہلی [illegible] - شوکت علی [illegible] - آفاق حسین لکھنؤ [illegible] - [illegible] سنگھ دہلی - محمد شمیم [illegible] - [illegible] حیدر آباد دکن [illegible] ساہیوال - نور بخش لاہور - عبد القیوم [illegible] پشاور [illegible] - [illegible] الہ آباد [illegible] - شرف الدین [illegible] [illegible] محمد [illegible] - [illegible] کانپور - [illegible] حیدر آباد دکن [illegible] - [illegible] - راج رانی [illegible] - تنویر احمد خاں [illegible] [illegible] جہانگیر اختر [illegible] - عبد الحلیم ملتان [illegible] ماری پور [illegible] ماری پور [illegible] ماری پور - [illegible] ماری پور - طالب ماری پور - آئی احمد ماری پور [illegible] ماری پور - [illegible] ماری پور [illegible] - راحت النساء ماری پور [illegible] حسین ماری پور - محمد رمضان ماری پور [illegible] ماری پور [illegible] - [illegible] کراچی - [illegible] کراچی - سلطان غوث [illegible] کراچی - جمیل انور کراچی - سعید احمد ملتان [illegible] [illegible] کراچی - [illegible] کراچی - [illegible] کلکتہ [illegible] - ہاشم کراچی - مشتاق احمد کلکتہ [illegible] - [illegible] احمد آباد [illegible] - [illegible] سنگھ [illegible] آباد [illegible] [illegible] دیوی دہلی [illegible] مراد آباد [illegible] - [illegible] دہلی - محمد سلیم کانپور - امیر احمد کانپور [illegible] - جنید الرحمن [illegible] [illegible] - [illegible] آدم [illegible] - [illegible] امرتسر [illegible] - ایس کے [illegible] [illegible] - [illegible] - داؤد محمد کراچی - محمد رفیق لاہور [illegible] - عبد الغفور خاں [illegible] کراچی - [illegible] - محمد صدیق میاں [illegible] - احتشام حسین لاہور [illegible] آباد [illegible] - ممتاز بیگم کراچی - [illegible] - [illegible] - [illegible] - محمد صفدر [illegible] - [illegible] سلطان پور [illegible] [illegible] سہارنپور [illegible] - رام لال سہارنپور [illegible] - [illegible] - یوسف [illegible] مراد آباد - [illegible] لال دہلی - ایس مرزا لکھنؤ [illegible] - احمد حسین مراد آباد - [illegible] لکھنؤ [illegible] - [illegible] - [illegible] - رام سنگھ امرتسر - [illegible] جالندھر [illegible] - [illegible] دہلی - [illegible] سہارنپور - [illegible] الدین [illegible] - تارا چند [illegible] - ایس [illegible] - [illegible] بمبئی - [illegible] - کیلاش [illegible] - فاطمہ بیگم بمبئی - [illegible] بمبئی - غلام محمد [illegible] بمبئی - [illegible] - حسن الدین [illegible] دہلی [illegible] رامپور - ایس ایم [illegible] - [illegible] کراچی - [illegible] - احسان اللہ خاں کراچی [illegible] [illegible] - رام [illegible] [illegible] میرٹھ [illegible] - [illegible] کلکتہ - [illegible] غلام محمد [illegible] - علی محمد [illegible] - [illegible] سرینگر [illegible] - [illegible] - فرید انصاری [illegible] النساء بیگم [illegible] - تاج محمد [illegible] - محمد ابراہیم کراچی - [illegible] کراچی - عبد العزیز [illegible] - [illegible] الرحمن کراچی - [illegible] دہلی [illegible] محمد [illegible] - [illegible] بیگم کلکتہ - [illegible] لدھیانہ - [illegible] دیوی [illegible] - [illegible] امرتسر - [illegible] دیوی [illegible] - سوہن لال [illegible] [illegible] لاہور - محمد جلال [illegible] - حامد خاں [illegible] - سعید اختر [illegible] - [illegible] عالم [illegible] - [illegible] جعفر بمبئی - [illegible] - [illegible] گڑھ - تارا [illegible] لدھیانہ [illegible] فرخ آباد - [illegible] - عبد اللطیف خاں [illegible] - [illegible] اختر کراچی - [illegible] خاں [illegible] - [illegible] - [illegible] رامپور [illegible] سنگھ [illegible] دہلی - [illegible] دہلی - لال سنگھ دہلی - [illegible] دہلی - [illegible] لال نئی دہلی [illegible] نئی دہلی [illegible] پرشاد [illegible] - ہاشم حسین لکھنؤ - فرید چند دہلی [illegible] نئی دہلی - بیگم [illegible] حسین نئی دہلی - محمد حنیف [illegible] - [illegible] - [illegible] سہارنپور [illegible] لال نئی دہلی - محمد اکرم کانپور - [illegible] سنگھ دہلی - [illegible] - عبد الرحمن بریلی - شام لال نئی دہلی [illegible] نئی دہلی - ایس کے [illegible] دہلی - جگ موہن لال نئی دہلی

[illegible] فضل احمد [illegible] ۔ رام ثریا بابا نانک ۔ فضل عباس نجم الدین ملتانی [illegible] یوسف [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ۔ سعادت علی اکبر کراچی ۔ محمد سلیم کراچی ۔ اکبر فرح منٹگمری ۔ اودھا رام ایسر داس اجمیر ۔ محمد اسحٰق لکھنؤ ۔ عبدالحق لاہور ۔ [illegible] ملتان [illegible]
[illegible] ۔ حاجرہ [illegible] کراچی ۔ غلام رضیہ چکوال ۔ سعید احمد لاہور ۔ محمد اسمٰعیل بیگ ۔ لکھنؤ ۔ بدلو منہاد کلکتہ ۔ ماجدہ خاتون [illegible] ۔ رتن لال [illegible]
[illegible] ۔ حبیب الرحمٰن کلکتہ ۔ خالد محمود لاہور ۔ نذیر حسین لاہور ۔ اے ۔ الیف خاں بمبئی ۔ مریم داؤد بمبئی ۔ مختار احمد لکھنؤ ۔ گردھاری لال [illegible]
سہارنپور ۔ محمد یوسف سہارنپور ۔ [illegible] پور (کراچی) ۔ جگت رام شاہ آباد ۔ [illegible] ۔ ہرسنگھ فتح آباد ۔ محمد مقیم سہارنپور ۔ [illegible] حیدر آباد دکن ۔ [illegible]
[illegible] بیگم سہارنپور ۔ دیپ چند سہارنپور ۔ ہری کشن نواں شہر دوآبہ ۔ گوپال داس غازی آباد ۔ ایرانی بیگم سہارنپور ۔ محمد نسیم سہارنپور ۔ سوشیل کماری [illegible]
سہارنپور ۔ عثمان علی بھوپال ۔ منظور حسین لاہور ۔ ایم ۔ آئی ۔ سہگری کراچی ۔ حمید الحسن ایبٹ آباد ۔ ایم عبدالحمید لاہور ۔ بشیر احمد سہارنپور ۔ اجیت سنگھ جالندھر ۔ [illegible]
محمد حسین [illegible] ۔ [illegible] بی بی [illegible] ۔ محمد شبیر مراد آباد ۔ ہزاری لال مراد آباد ۔ ستیہ کے اتو پی لکھنؤ ۔ شام سندر [illegible] ۔ بنارسی لال دہلی ۔ عزیز الدین کراچی ۔ عنایت [illegible]
دہلی ۔ غلام محمد ۔ [illegible] ۔ اندر جیت دہلی ۔ کوکو ناہو ۔ عبدالرحمٰن بریلی ۔ کندن لال فرید کوٹ ۔ بیلی شاہ آباد مارکنڈہ ۔ سوہن لال [illegible] ۔ کندن لال [illegible] ۔ خالد خانم [illegible]
[illegible] ۔ پرویز منیر لاہور چھاؤنی ۔ جاوید منیر لاہور چھاؤنی ۔ انیس شمسی [illegible] ۔ پریا نند لدھیانہ ۔ [illegible] شاہدرہ ۔ زرینہ خاتون سہارنپور ۔ سدھیر کمار سہارنپور ۔ [illegible] لال سہارنپور ۔ [illegible]
ڈی ۔ ایل ۔ ناگپال سہارنپور ۔ مریم بی بمبئی ۔ منظور حسین کراچی ۔ پروین چوہدری ۔ ملتان ۔ ارشد علی اورنگ آباد ۔ محمد اسلم حیدر آباد ۔ ریاض ایس جاوید ۔ [illegible] ۔ رشید [illegible]
[illegible] ۔ سلیم حسین [illegible] ۔ ایم ۔ ایم صادق ۔ منڈی [illegible] ۔ صادق مرزا کراچی ۔ جی شمس الدین میرٹھ ۔ رحمت بی کراچی ۔ محمد نصیر الدین کراچی ۔ شبیر محمد خاں [illegible] بمبئی ۔ ہری کرشن ۔ [illegible]
ایچ ۔ پی ۔ [illegible] ۔ محمد ایوب ۔ [illegible] ۔ امن میاں رام پور ۔ جلیل خاں رام پور ۔ شری کرشن رام پور ۔ کنور بہادر رام پور ۔ منصور خاں [illegible] ۔ عبدالرشید لاہور ۔ شیخ احمد جالندھر ۔ محمد [illegible]
جالندھر ۔ ابوالحسن لاہور ۔ محمد نذیر لاہور ۔ ارجن سنگھ امرتسر ۔ لطافت حسین پٹنہ ۔ بی ۔ سی مدن امرتسر ۔ [illegible] ۔ گردھاری لال دہلی ۔ احمد دین [illegible] ۔ عالمگیر ۔ بشیر احمد بریلی ۔ ایم ۔ جی [illegible]
کرتار سنگھ ۔ [illegible] ۔ الیف رحمان رام گڑھ چھاؤنی ۔ عزیز الدین احمد [illegible] ۔ ایس ۔ ایس سہگل ۔ اودے پور ۔ پیارے لال کان پور ۔ پیارے لال [illegible] ۔ اودھو رام ۔ پٹیالہ ۔ ایم ۔ [illegible]
عبدالواحد ۔ سی ۔ ایم ۔ جینت گڑھ ۔ بے بی فیروز مونگیر ۔ سردول سنگھ امرتسر ۔ کنول پھول دہلی ۔ ہرمہندر سنگھ نئی دہلی ۔ امرا تہ دہلی ۔ موہن لال [illegible] ۔ ہری پرکاش جھانسی ۔ [illegible] سنگھ [illegible]
فضل حسین اندور ۔ مدن لال لدھیانہ ۔ ستیا نند نواں شہر دوآبہ ۔ قیصر جہاں بیگم بدایوں ۔ اشرف علی خاں لاہور ۔ حمیدہ بیگم لاہور ۔ مظفر سعید کراچی ۔ یونس علی عارف پور والہ ۔ عبدالرزاق کراچی ۔ [illegible]
محمد شفیع ایبٹ آباد ۔ وید کمار بٹھنڈہ ۔ پریم کمار امرتسر ۔ صفات فاطمہ رام پور ۔ محمود مرزا شیدا سیتاپور ۔ گیندن لعل بدایوں ۔ اقبال احمد جھانسی ۔ پیار چند کالکا ۔ دیسراج کالکا ۔ سوانتی کمار [illegible]
غازی آباد ۔ شام لال کالکا ۔ ساوتری دیوی جے پور ۔ شانتی بھوشن مظفر نگر ۔ پی ۔ سی سود امرتسر ۔ عالیہ بیگم کانپور ۔ موہن لعل [illegible] ۔ عبدالرشید بنارس کینٹ ۔ ست پال [illegible] ۔ [illegible]
ہربنس سنگھ امرتسر ۔ محمد فاروق [illegible] ۔ سلطان احمد سلطانپور ۔ خلیل احمد فرخ آباد ۔ جگدیش لعل اودھم پور ۔ محمد سلیم ملتان ۔ شہادت خاں جبل پور ۔ گردھاری لعل [illegible] ۔ پرسرام پٹیالہ ۔ اقبال احمد کراچی ۔ [illegible]
کراچی ۔ سلطان صلاح الدین کراچی ۔ کنیز فاطمہ سہارنپور ۔ بسنت سنگھ دہلی ۔ لتا کماری دھامپور ۔ [illegible] شاہجہانپور ۔ محمد کاظم لکھنؤ ۔ عبدالرحمٰن دھام پور ۔ محمد تحسین [illegible] ۔ دھرم چند [illegible]
پلی بھیت ۔ فصاحت اللہ خاں پیلی بھیت ۔ محمد آفاق پیلی بھیت ۔ صغرا بیگم کلکتہ ۔ چمن لعل نئی دہلی ۔ امرت کور نئی دہلی ۔ ہری اوم نئی دہلی ۔ مس نیلم نئی دہلی ۔ مایا دیوی نئی دہلی ۔ ستیش چندر نئی دہلی ۔ [illegible]
[illegible] ۔ آفاقی بیگم رام پور ۔ [illegible] ۔ ہربنس سنگھ دہلی ۔ رفیع اللہ کراچی ۔ جلیل احمد کراچی ۔ عبدالغفار کراچی ۔ محمود حسین کراچی ۔ نسیم یحییٰ کراچی ۔ اشرف علی کراچی ۔ علی ظہیر کراچی ۔ ساہ جبین کراچی ۔ [illegible]
کراچی ۔ حفیظ الدین کراچی ۔ عبدالرشید کراچی ۔ برہم دت جالندھر ۔ وہاج الحق کراچی ۔ عبدالحق کراچی ۔ ظفر اقبال کراچی ۔ انجمن النساء کراچی ۔ ناہید یحییٰ کراچی ۔ قمر عالم کراچی ۔ شاہدہ خاتون کراچی ۔ [illegible]
مقصود حسین کراچی ۔ رضیہ خاتون کراچی ۔ ارشاد الحق کراچی ۔ عبدالرحمٰن کراچی ۔ عبدالوہاب کراچی ۔ فضل الرحمٰن کراچی ۔ یار محمد کراچی ۔ دبیر احمد کراچی ۔ دھیان سنگھ سوجانپور ۔ گوپال داس نئی دہلی ۔ [illegible]
عبدالمبین ناگ پور ۔ عبدالجبار خاں کراچی ۔ اکبر نذیر رام پور ۔ پانڈورنگ جالنہ ۔ فدا حسین سیتاپور ۔ فقیر محمد قلات ۔ رئیسہ بیگم رام پور ۔ ناظم حسین کراچی ۔ امتیاز الحق کراچی ۔

دو ہزار روپے کا چوتھا انعام تین غلطیوں پر حسب ذیل ۱۶۱۴۷۶۸ اصحاب کے حصے میں بحساب ایک روپیہ چھ آنے فی کس آیا

اوم پرکاش گوڑ گانواں ۔ جتیندر کمار نئی دہلی ۔ کملا دیوی انبالہ شہر ۔ چاندی رام بہل نیو دہلی ۔ مہندر سنگھ فرید آباد ٹاؤن شپ ۔ رام لعل گوڑ گانواں ۔ ہری کرشن بھاٹیہ لکھنؤ ۔ تاج محمد سہارنپور ۔ محمد علی سہارنپور ۔ [illegible]
بھوپندر سنگھ لدھیانہ ۔ اشہد علی سیونی ۔ محمد یونس علی صابر مرجان ہاٹ ۔ شوو دلیش کماری اکونہ ۔ تسنیم بانو [illegible] ۔ بالمکند نکودر ۔ عبدالمجید جبل پور ۔ موہن لعل گردھر [illegible] سنگھ [illegible]
نابھہ ۔ ٹھاکر لعل چند کرنال جھجر ۔ تی آر ڈیوڈ چوکی جریب ۔ جلیل خاں حیدر آباد دکن ۔ اوم پرکاش دیوبند ۔ کنیز فاطمہ مبارکپور ۔ رفعت احمد کراچی ۔ سید جمال یوسف کراچی ۔ [illegible] فیروز پور ۔ نواب جان سہارنپور ۔ [illegible]
میاں محمد نذیر لائلپور ۔ رگھبیر سنگھ جلال والہ ۔ راج کوشلیا سہگل دہلی ۔ کلتار رائے چنڈی گڑھ ۔ گلشن رائے کھر الدھیانہ ۔ مدن لعل دہلی ۔ قمر النساء بیگم [illegible] ۔ شمیم حسن محبوب نگر ۔ محمد محمود الدین خاں [illegible]
اندر جیت ہوشیار پور ۔ نیر اقبال کراچی چھاؤنی ۔ عبدالرحیم خاں حیدر آباد سندھ ۔ اے ۔ سی ۔ ملک کراچی ۔ سید سعد حسنی کراچی ۔ ثریا جنید صدیقی کراچی ۔ محمد حنیف سہارنپور ۔ ایس ۔ اے ۔ جمال الدین سکندر آباد ۔ [illegible] بیگم لاہور ۔
عبدالعزیز بٹھرانکی ۔ نظیر احمد خاں بہاولپور ۔ اے وحید خاں کراچی ۔ راجہ محمد حیات جہلم ۔ شیخ خورشید حسین نوشہرہ چھاؤنی ۔ ایم محمد اسمٰعیل حافظ آباد ۔ سید ظہور احمد سرگودھا ۔ سید اصغر علی کراچی ۔ ڈاکٹر رحمت النبی [illegible] ۔ [illegible]
عبدالمنان ڈیرہ اسمٰعیل خاں ۔ مرزا احمد حسن منٹگمری ۔ ضابطہ خاں مردان ۔ بشیر سہگل سرگودھا ۔ فضل النساء احمد پور شرقیہ ۔ امیر الدین کراچی ۔ عبدالرشید خاں کوٹری ۔ راجہ بیر خاں سرگودھا ۔ دو لی چند [illegible]
چنڈی گڑھ ۔ محمد ناصر خاں اترولہ ۔ موتی بانو مظفر پور ۔ محمد اسحاق دربھنگہ ۔ عنایت اللہ سیوالیا ۔ سید محمد قاضی پیٹھ ۔ چکرپاو ورنگل ۔ سید طاہر حسین کراچی ۔ جمیل الدین کراچی ۔ محمد اسحاق کلکتہ ۔ [illegible] ۔ [illegible] کرام
فیروز جنگ خاں دربند ۔ ایم سعید حبیب آباد ۔ سید آل حسن کراچی ۔ عابدہ بیگم راولپنڈی ۔ ذکیہ خاتون لکھنؤ ۔ بشیر بیگم کراچی ۔ محمد سعید چنتیاں ۔ قاضی [illegible] ۔ محمد امین گوجرانوالہ ۔ غلام عباس کراچی ۔ محمد [illegible] کراچی ۔ [illegible]
لاہور ۔ مستری غلام رسول منٹگمری ۔ محمد شہزادہ الیشر [illegible] ۔ اوم پرکاش پلول ۔ نہرو بیگم مراد آباد ۔ اشوک گپتا مراد آباد ۔ تربینی پرشاد بلاری ۔ معین الدین [illegible] ۔ تیلوک سنگھ بمبئی ۔ رام دھن ۔ [illegible] ۔ منظور احمد [illegible]
رام پور ۔ سجاد حسین بدایوں ۔ امیر احمد بدایوں ۔ مسعود فاطمہ بدایوں ۔ پرکاش چند سہارنپور ۔ کوثر احمد بدایوں ۔ پنڈت کنول کرشن [illegible] ۔ ہنس راج لیہاں ۔ امیر خانم سہارنپور ۔ ڈاکٹر گورکھن سنگھ [illegible] ۔ [illegible] بیگم سہارنپور ۔ [illegible]
لدھیانہ ۔ حسن آرا بیگم سہارنپور ۔ کرتار سنگھ لدھیانہ ۔ خیبر بیگم سہارنپور ۔ ایم الیف خاں راولپنڈی ۔ عبدالقیوم قریشی ایبٹ آباد ۔ محمد رشید خاں کراچی ۔ فضل حق خاں حیدر آباد سندھ ۔ فائق مصطفےٰ خاں [illegible] ۔ [illegible]
کوئٹہ ۔ نصیر احمد لاہور ۔ ضیا رضوی کراچی ۔ سید حامد ترمذی کراچی ۔ پیر بھائی حیدر آباد ۔ محمد اسلم میاں چنوں ۔ برکت بی بی لاہور ۔ حفیظ الحق ملتان چھاؤنی ۔ سید مدثر محبوب گنج ۔ [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ایم خاں بمبئی ۔ بشیر خاں کٹک ۔ علی نواب خاں پٹنہ ۔ عزیز الفاطمہ پٹنہ ۔ ایم کے وتھلیا ۔ حیدر آباد دکن ۔ دیال چند [illegible] ۔ ست دیتی دہلی ۔ رمضان علی [illegible] ۔ شیلا رانی سرسنگھ ۔ [illegible] امرتسر ۔ [illegible]
واقی امبوٹہ ۔ سرلا امبوٹہ ۔ جیت اندر کور امرتسر ۔ ہری سنگھ امرتسر ۔ مشرف علی بارہ بنکی ۔ محمد عظیم بارہ بنکی ۔ پریم پرکاش تھانہ آباد ۔ نسیم اختر سلطان ۔ [illegible] ۔ [illegible] پٹیالہ ۔ گرپال داس [illegible] ۔ [illegible]
چمن لال لدھیانہ ۔ مایا دیتی مراد آباد ۔ کاکا جیت سنگھ ماہل گہلوں ۔ سول چند مراد آباد ۔ برج لال مراد آباد ۔ دینا ناتھ [illegible] ۔ اوم پرکاش مراد آباد ۔ برج [illegible] ۔ [illegible]

محمد اسحاق بھوپال ۔ ایس پی ۔ ایل مساس کالونی ۔ ابوالفضل سید احمد گورکھپور ۔ سیدہ منور رنگ آباد ۔ لت گیتا چند ۔ سورج گپتا چند ۔ ایم کبیر دیگا پور ۔ محمد منیر الدین سالار گنج ۔
بیگم سید خاتون گلبار ۔ غلام کراچی ۔ سیما کراچی ۔ سید شریف علی کراچی ۔ تنویر کراچی ۔ آغا کراچی ۔ جمال کراچی ۔ بیگم اصغر علی شاہ ۔ علی الدین خان کراچی ۔ خالد کراچی ۔ نجمہ کراچی ۔ فرخ کراچی ۔ حسرت کراچی ۔ جمال الدین کراچی ۔ نوشاد کراچی
شکیلہ کراچی ۔ محمد انور ۔ مسرت جہاں بیگم کراچی ۔ کوثر کراچی ۔ افتخار کراچی ۔ کے ایس حنیف کیمبلپور پاکستان ۔ ستار کراچی ۔ گوہر جہاں ہری پور ۔ اشرف شرف بھریا ۔ شاہ عبدالغفور ۔ ایس محمد الستار کراچی ۔ بابو کراچی ۔ محمد اسمٰعیل کراچی
سکینہ کراچی ۔ جگدیش داس نئی دہلی ۔ محمود یوسف ۔ صلاح الدین کراچی ۔ جمنا دیوی نئی دہلی ۔ رفیع الدین کراچی ۔ مس شمیم نئی دہلی ۔ رشی چند نئی دہلی ۔ رخسانہ بیگم پیلی بھیت ۔ محمد اسمٰعیل کراچی ۔ محمد مسلم کراچی ۔
خالدہ کراچی ۔ ریحانہ بیگم پیلی بھیت ۔ جے خالدہ کراچی ۔ ادریس کراچی ۔ احمدی بیگم پیلی بھیت ۔ ایس شاہدہ ماری پور ۔ ایم شاہدہ ماری پور ۔ پی شاہدہ ماری پور ۔ یوسف شاہدہ ماری پور ۔ فری شاہدہ ماری پور ۔ اسلام الدین پیلی بھیت
بی شاہدہ ماری پور ۔ کیو ایم اقبال ماری پور ۔ سلیم اختر ماری پور ۔ سراج الدین ماری پور ۔ ایوب خان ماری پور ۔ محمد پروین ماری پور ۔ آئی محمد پروین ماری پور ۔ کے محمد پروین ماری پور ۔ عظمت اللہ خان پیلی بھیت ۔ سید نصیر احمد بھٹ ۔
حمید الدین کراچی ۔ مظفر کراچی ۔ رمضان بی بی کراچی ۔ انیس ظفر کراچی ۔ مرزا عبدالحمید کراچی ۔ بنڈن بندو اینڈ کو نواب شاہ ۔ ایس نواب اسلم حیدرآباد سندھ ۔ فردوس بیگ لاہور ۔ فاطمہ خاتون دینا جپور ۔ منشی انور حسین
۔ رحیم ۔ سرو ماری پور ۔ سنت رام شدھ ۔ سید شبیر حسین عادل آباد ۔ دولت رام شدھ ۔ سید محمد عالم لکھنؤ ۔ جی آر شرما نئی دہلی ۔ رام چند فرید آباد ۔ سنت رام فرید آباد ۔ برش کمار فرید آباد ۔ دھرم دیوی فرید آباد ۔
گندھاری لال فرید آباد ۔ ایس ایم خان قلات ۔ نازنین بیگم سہارنپور ۔ رزاق ماری پور ۔ ایچ آر گھور بریلی ۔ جمیل احمد بھوپال ۔ بریلی محمد ولی بمبئی ۔ مسرت تسنیم قلات ۔ ایس ایم مرتضیٰ کراچی ۔ ٹیلو کمار دیوی آبادو ۔ الیٹوکس
رام مگری ۔ ناظم علی کلکتہ ۔ اندرپال سنگھ کو اشنج ۔ بے بی ہردیوی آر احمد آباد ۔ مس سلومن بھدانی نگر ۔ نواب عالم کانپور ۔ جیت سنگھ رام گڑھ ۔ دھنی رام دہلی کینٹ ۔ عبدالرحمان خان لکھنؤ ۔ انور حسین کراچی ۔ احمد الدین
سیالکوٹ ۔ سید مظہر حسین سیالکوٹ ۔ معز بیگم لاہور ۔ سید مختار احمد کراچی ۔ محمد ریاض کراچی ۔ کمپلی دیوی بمبئی ۔ بیشری پرشاد الہ آباد ۔ چندرپال کانگڑہ ۔ سری چند لدھیانہ ۔ دوارکا ناتھ جالندھر ۔ محمد شریف لاہور ۔
سید سکندر علی لکھنؤ ۔ گلزار احمد سکھر سندھ ۔ سیتارام نوراجہ ۔ جنزان سنگھ نئی دہلی ۔ آصف بیگم علی گڑھ ۔ رام علی جبلپور ۔ سنتوش کماری نئی دہلی ۔ ابراہیم بمبئی ۔ کھیمی نرائن لکھنؤ ۔ درشن کماری دہلی ۔ محمد علاء الدین کلکتہ ۔ تھورام
لی محمد یامین بمبئی ۔ محمد زکی خان بمبئی ۔ محمد یحییٰ بمبئی ۔ محمد اشفاق دہلی ۔ راج کمار مدن لال روڑ ۔ محمد فضل رام پور ۔ محفوظ علی خان رام پور ۔ محمد جمیل الدین بدایوں ۔ محمد حنیف کڑ دولی ۔ محمد حنیف خان بمبئی ۔ ماسٹر عبداللطیف
بہار ۔ عطر چند نئی دہلی ۔ موہن سنگھ نئی دہلی ۔ کانتی دیوی دیوبند ۔ بھگوان داس کالکا ۔ حفیظ سکندر کانکا ۔ ارن کمار کالکا ۔ نجیب مراد آباد ۔ دوشا رانی مظفر نگر ۔ محمد احمد مظفر نگر ۔ شمیم آرا بیگم بدایوں ۔ دیش لعل بدایوں ۔
ل کمار اجالہ ۔ الہ پرشاد حیدرآباد ۔ شاہین اختر سہارنپور ۔ سرش کمار اجمیر ۔ جگن ناتھ امرتسر ۔ خورشید بانو دہلی ۔ ساجدہ رضا لکھنؤ ۔ گیان پستک بھنڈار نگینہ ۔ گیارسی احمیر ۔ سنت رام دھرم پور ۔
دیوی دھرم پور ۔ ہربنس سنگھ امرتسر ۔ چندر شیکھر ہوشیارپور ۔ کیدار ناتھ نئی دہلی ۔ نورالدین منڈی راولپنڈی ۔ راج ۔ ایم احمد کرتار پورہ ۔ محمد علی لاہور ۔ بشیر احمد کھلوال ۔ شار احمد فیروزپور ۔ مرزا نظام الحسن کراچی ۔
حسین کراچی ۔ فضل محمد کراچی ۔ ہری چند بھیلوال ۔ سندر داس دہلی ۔ این ۔ ایل جوہر شملہ ۔ ایم عبدالحمید ملتان ۔ عنایت علی خان کراچی ۔ عشرت انوار کراچی ۔ محمد سکین ہری پور ۔ مونس اختر ڈھاکہ ۔ شہاب الدین راولپنڈی
احمد صدیقی لاہور ۔ محمد عبداللہ کراچی ۔ ایس ۔ اے حق الیشرڈی ۔ ایم ظہیر الدین کراچی ۔ فاطمہ بیگم کراچی ۔ محمد طاہر کراچی ۔ غلام محمد جھنگ ۔ ایم ۔ آر خان کراچی ۔ نسیم الدین ملتان ۔ محمد نذیر کراچی ۔ ڈاکٹر شام لعل بٹالہ ۔
بولے بیگ کراچی ۔ محمد شمس الدین بمبئی ۔ محمد اقبال لاڑکانہ ۔ عبداللطیف راولپنڈی ۔ لاج وتی نکل شاؤن شپ ۔ مسز سراج پالم پور ۔ سید اکرم شاہ رانچی ۔ مرید الدین زنگور ۔ ناہید کراچی ۔ عبدالرشید ظفر گوجرانوالہ
بیرانگر محمد ابراہیم نڑل ۔ اصل احمد چندوسی ۔ عزیز الدین خان آنند ۔ ملک احمد خان کراچی ۔ محمد عباس پھیپھڑی ۔ بلونام آنند ۔ بالورام لدھیانہ ۔ میاں اسمٰعیل حسین سگرام پورہ ۔ علاتی رام جالندھر ۔ نیاز علی لکھنؤ ۔ ایچ آر راجہ
راجی ۔ ماچرام چیمہ ۔ راج رانی گنانی کلاں ۔ بابو رام بھگواڑہ ۔ جتی لال بریلی ۔ بیگم چند فرید آباد ۔ بے بی ناز بریلی ۔ چمن لال انبالہ ۔ اوم پرکاش شاہدرہ ۔ بلونت سنگھ دہلی ۔ او شارانی دہلی ۔ درشن سنگھ علی گڑھ ۔ ہری چند
نالہ ۔ بہاری لعل دہلی ۔ شمع نسیم کراچی ۔ ست پال دہلی ۔ شاہد علی لکھنؤ ۔ حویلی رام لدھیانہ ۔ محمد صدیق کوٹری ۔ محمد زماں چیچہ وطنی ۔ مسعود الحسن کراچی ۔ ابوبکر یوسف کراچی ۔ عبداللطیف سیالکوٹ ۔ محمد مظفر حسن کراچی ۔
صفیہ آرا بانو سکھر سندھ ۔ عصمت بیگم حیدرآباد سندھ ۔ سرجیت سنگھ کانپور ۔ شاہد حسین لاہور ۔ جمن خان لاہور ۔ حنیفہ بیگم مردان ۔ ہربنس سنگھ کانپور ۔ عبداللطیف سیالکوٹ ۔ رشید احمد لاہور ۔ شاہدہ بانو کراچی
بیگم فقیر راولپنڈی ۔ ایم ابراہیم کراچی ۔ زبیدہ خاتون کراچی ۔ کنج لال کانپور ۔ العید الدین کراچی ۔ ایم ایم گوشہ ہوشیارپور ۔ سوم دت ہوشیارپور ۔ رضوانہ خاتون سیرج ۔ جمال احمد خان لکھنؤ ۔ عبدالمجید راجندر گاؤں ۔ دیراں دیوی
لاہور ۔ مختار حسین کراچی ۔ آغا محمد علی پور ۔ عبداللطیف کلکتہ ۔ تفضل حسین دھوری ۔ عبدالرؤف جالنہ ۔ حبیب احمد حیدرآباد ۔ سمیع بنا جاگل ضلع پٹنہ ۔ ایس آر لوگاتی دہلی ۔ عبدالخالق راجندر گاؤں ۔ آئشہ خاتون گوڑہ ۔
رسالہ بیگم لکھنؤ ۔ محمد یوسف خضری ۔ غلام رسول ادونی ۔ ناصر علی سیتاپور ۔ جسونت سنگھ سنگرور ۔ سعداللہ کوتوالی لوکھنور ۔ ارشاد علی خان لکھنؤ ۔ سید محمد کاظم لکھنؤ ۔ نذیر عباس لکھنؤ ۔ محمد حسین کرنیل گنج ۔ برج موہن گوڑہ
لس مارج نکل شاؤن شپ ۔ خان چند دہلی ۔ ایس ۔ ایم اسمٰعیل لاہور ۔ محمودہ خاتون روہڑی ۔ منظور حسین شاہ لاہور ۔ ام سلمیٰ بیگم اٹاوہ ۔ ایس اے طالب شاہ رانچی ۔ کرشنا دتی زیرہ ۔ شریف حسین بھاگلپور ۔
حسین بھتی پور ۔ کرشن سنگھ لدھیانہ ۔ شو چرن داس کالچھوہ ۔ راج سہگل امرتسر ۔ سلامت اے بھیلکے ۔ بہار شاہ پالمپور ۔ تصدق احمد بانو جبل پور ۔ ضمیر خان کلکتہ ۔ رضا الرحمن گیا ۔ ایم جگت حیدرآباد ۔ تکت چند دہلی
ماہر بالی مانکپور ۔ غلام عیسیٰ سبی بلوچستان ۔ اے کے میرین بمبئی ۔ سعیدالنسا جالنہ ۔ رشید الدین جالنہ ۔ محمد شبیب منڈی صادق گنج ۔ عبداللہ بمبئی ۔ نفیسہ بیگم بھوپال ۔ ممتاز احمد رڑکی ۔ دولت بیگ بمبئی ۔ شاہ علی
بلوچ ۔ اصغر علی بمبئی ۔ حاجی محمد یوسف سہارنپور ۔ سری کرشن پیلی بھیت ۔ زہرہ خاتون بہٹ ۔ رسہارنپور لال کمار لکھنؤ ۔ نسیم بیگم سہارنپور ۔ رام چندر بانس بریلی ۔ کرامت علی بریلی ۔ کیلاش چند رائے بڑھ نگر ۔
سید خالد مراد آباد ۔ جوگندر ناتھ سہارنپور ۔ صوفی محمد نبی سہارنپور ۔ محمد منیر سہارنپور ۔ نزاہد بیگم سہارنپور ۔ دیوراج نئی دہلی ۔ دھن پال سنگھ سہارنپور ۔ عبدالجبار کراچی ۔ طفیل محمد لاہور ۔ میر محمد رحیم یار خان ۔ احتشام حسین
دہڑی ۔ حبیب الرحمن میانوالی ۔ حبیب الرحمن خان ہری پور ۔ ایم ۔ سلطان راولپنڈی ۔ محمد صادق راولپنڈی ۔ آمنہ بیگم راولپنڈی ۔ محمد بشیر لاہور کینٹ ۔ سوہن سنگھ ہوشیارپور ۔ سیتارام نئی دہلی ۔ بلبیر سنگھ دوسوہہ ۔ مکھ راج منڈی
مظفر گڑھ ۔ محمد ادریس قلات ۔ سرل اے ۔ اینڈ روز جے پور ۔ بس گوپ مانیکوٹ ۔ رشیدہ پروین عشرت ناگپور ۔ سید سردار احمد ۔ ایس سائیں بہار راج شملہ ۔ ہرسنگھ دہلی ۔ عصمت الاسلام خان پیلی بھیت ۔ بیدارام آہلو والیہ
بالیہ ماجری ۔ محمد حیا ملتان شہر ۔ روشن لال کپور زیروانہ ۔ مستری تلک راج امرتسر ۔ طیب بھائی بوہرہ جالندھر ۔ ٹھاکر ابلاجی سنگھ کرشکال ۔ محمد شریف الدین احمد لائلپور ۔ منیر آتھنگ ۔ محمد عبدالرحمن حیدرآباد دکن ۔ سرحد شتاق احمد
کراچی ۔ سوہن سنگھ موہ ۔ غلام رسول گوجر خان ۔ محمد یوسف انصاری گرڈ ڈیہہ ۔ خدیجہ کراچی ۔ آکرام ماری پور ۔ منشی ریاض محمد نسیم ناگپور ۔ پریم ناتھ تھوہ دہلی ۔ سرجیت کے آہلووالیہ بمبئی ۔ منورجہاں بیگم ملتان شہر
بے پی سنتوش نینی تال ۔ محمد جوت ڈنگور ۔ اکبری خاتون کیتھار ۔ کپل دیو شرما جام نگر ۔ رام لال کانپور ۔ دیوان چند جھانسی ۔ حکیم جھونیاں شیخو پورہ ترک ۔ دیر پال شرما جموں توی ۔ گیان سنگھ رائے پور ۔ گوربخش سنگھ الیر کوٹلہ ۔
قیام الدین اکبر علی رائے پور ۔ سیتن ہار کلکتہ ۔ مشتاق سنگھ ہوشیارپور ۔ اختر ماری پور ۔ مرزا امیر علی کلکتہ ۔ رام چند جالندھر شہر ۔ سید احمد کراچی ۔ محمد قمر الدین کامٹی ۔ راج کشن کالونہ موٹھ ۔ اندرجیت سنگھ جبل پور ۔ ہرچند کسن
امرتسر ۔ جیلس ملاح بدرم امرتسر ۔ الیف راشدہ ماری پور ۔ برنام سنگھ بھوپال ۔ پنڈت بالمکند سولنپور ۔ روشن لال لکھنؤ ۔ دھرم سالہ ۔ پشپا کپور کانپور ۔ پرتاپ سنگھ برسٹر ۔ ایچ راشدہ ماری پور ۔ عبدالسلام سرنگر ۔ ہری رام کوشل فیروزکوٹ ۔ دل شاد
شکیلہ بلقیس ۔ اے انصاری ناسک ۔ خدیجہ طاہرہ علی گڑھ ۔ شریف ماری پور ۔ بشیر احمد خان کراچی ۔ مطیع الرحمن تھرپارکر ۔ عبداللطیف ماری پور ۔ زبیدہ بیگم لاہور ۔ گنیش سنگھ شہزادہ ماری پور ۔ برد یپ کمار فرخ آباد ۔ لکشمی دیوی جودھپور ۔ شفیق ماری پور ۔
شکیل ماری پور ۔ شاہدہ خاتون منڈسور ۔ سعیدہ ماری پور ۔ بشیر ماری پور ۔ لکشمی دیوی شیلانگ ۔ شیلا دیوی امرتسر ۔ نعیمہ ماری پور ۔ وی صمد ماری پور ۔ ٹی صمد ماری پور ۔ ایس صمد ماری پور ۔ کیو صمد ماری پور ۔ ایچ صمد ماری پور ۔ بی صمد ماری پور ۔
بی صمد ماری پور ۔ عبدالسلام ماری پور ۔ عبدالصمد ماری پور ۔ فقیر محمد ناتھن فانی ۔ محمد یعقوب فرید آباد ۔ احمد لاہور ۔ گوپال لاہور ۔ عبدالرشید آباد ۔ گورامین داس دہلی ۔ اوم پرکاش بھاجپور ۔ نواب جان سہارنپور ۔ ظہور جہاں بیگم نجیب آباد
اختر گورکھپور ۔ عبدالماجد نگینہ ۔ ایس کے بند ڈیپو ۔ احمد حسین گرڈیہہ ۔ مسٹر الطاف شیلانگ ۔ عبدالسلام بمبئی ۔ مختار الدین بمبئی ۔ عبدالحفیظ بمبئی ۔ نبی بانما بمبئی ۔ لطیف بی بمبئی ۔ محمد اسحاق بمبئی ۔ چاند بمبئی ۔ بلقیس بیگم بمبئی ۔
ایم خان بمبئی ۔ عبدالستار محمد فقیر بمبئی ۔ بانو شاہ امی شاہ بمبئی ۔ شانا امی شاہ بمبئی ۔ حکیم نذیری بمبئی ۔ محمد سعید اختر خان بمبئی ۔ عبدالعزیز بمبئی ۔ حافظ جمیل الدین بمبئی ۔ حلیمہ بی محمد فقیر بمبئی ۔ ایم شبیر بمبئی ۔ عبدالعزیز خان کانپور ۔ سوز چند دہلی ۔

[illegible] شامپال کی کچھوہن لال نئی دہلی۔ محمد عاشق شاہ [illegible]

[illegible] محمد یوسف [illegible] گجرات۔ محمد انور [illegible] الٰہی بخش [illegible] حیدرآباد دکن۔ محمد عبدالرؤف حیدرآباد دکن۔ غلام [illegible]

[illegible] بلونت سنگھ [illegible] محمد اسمٰعیل علی گھریار روڈ۔ [illegible] لدھیانہ۔ عبدالصمد کانپور [illegible] دیوبند۔ [illegible]

[illegible] عاشق علی رام پور۔ محمد مطلوب رام پور۔ سکینہ کاظمی کراچی۔ امت [illegible] انیس الدین ملتان کینٹ۔ [illegible] نسیم فاطمہ دیوبند [illegible]

[illegible] رام رتن مرادآباد۔ ظہیر الدین بدایوں۔ محمد خلیل خاں ڈھاکہ۔ [illegible] ملتان [illegible] غفاری پور۔ [illegible] ڈھاکہ۔ [illegible] مرادآباد۔ [illegible]

[illegible] حسین [illegible] رام پور۔ [illegible] عبدالمجید ہوشنگ آباد۔ اشفاق حسین بدایوں۔ انصار حسین بدایوں۔ [illegible] آل حسن بدایوں۔ [illegible]

[illegible] ذی گاندھی رام پور۔ ایل۔ حاجی محمد پیارے رام پور۔ سی آر سجل رام پور۔ پربھا بھاٹیہ نئی دہلی۔ [illegible] ڈیرہ بابا نانک۔ [illegible] سنگھ گوردایہ۔ [illegible]

[illegible] قاضی عبدالمجید [illegible] گمبھیر لاتور۔ [illegible] غلام محمد [illegible] عبدالقیوم کلکتہ۔ [illegible] مرادآباد۔ ترپتا رانی ڈیرہ بابا نانک۔ [illegible] مرادآباد۔ [illegible]

[illegible] ایم آر [illegible] دہلی۔ بلونت سنگھ نئی دہلی۔ پروفیسر رام ناتھ نئی دہلی۔ [illegible] موہنی نئی دہلی۔ محمد بشیر خاں لکھنؤ۔ [illegible] مرادآباد۔ [illegible] رضیہ بیگم [illegible] رام [illegible] دہلی۔

[illegible] فیض آباد۔ [illegible] حیدرآباد دکن۔ محمد عبدالرسول حیدرآباد دکن۔ [illegible] سرفراز علی کلکتہ۔ ایم [illegible] بمبئی۔ [illegible] امروہہ۔ [illegible] جمشید رضوی [illegible] کراچی۔

[illegible] جیکب آباد۔ محمد اشرف کراچی [illegible] نثار احمد کراچی۔ [illegible] کراچی۔ اے آر [illegible] خلیل احمد سکھر۔ [illegible] کراچی۔ [illegible] عبدالعزیز [illegible] بہاولپور۔ [illegible]

[illegible] تارا چند فرید آباد۔ [illegible] جعفر رائے پور۔ آر آر [illegible] نواب [illegible] کراچی۔ [illegible] مادھو لال شملہ۔ [illegible] ظہیر احمد کراچی۔ عابد رضا راولپنڈی۔ ایچ [illegible] کراچی۔ اے [illegible] لائل پور۔ عبدالمجید [illegible] محمد شفیع میاں چنوں۔

[illegible] حیدرآباد [illegible] عبدالرحمٰن حیدرآباد [illegible] ایم کے جبل پور [illegible] خلیق احمد [illegible] راولپنڈی۔ محمد شریف خاں راولپنڈی۔ [illegible] دہلی۔ [illegible] ہوشیارپور۔ [illegible] کلکتہ۔ [illegible] لکھنؤ۔ [illegible] محمد سلیم لکھنؤ۔ [illegible]

[illegible] جے آر [illegible] ایم [illegible] جھانسی۔ [illegible] سروج کماری جھانسی۔ [illegible] امرتسر۔ [illegible] بمبئی۔ [illegible] محمد نور الدین بمبئی۔ [illegible] ایس ایم قادری بمبئی۔ ایس [illegible] مرادنگر۔ [illegible] شوکت علی [illegible]

[illegible] ایس [illegible] شملہ۔ ایس۔ [illegible] دلی رام کوشل شملہ۔ [illegible] لال شملہ۔ [illegible] بیگ فرخ آباد۔ [illegible] سورت۔ [illegible] اکبری [illegible] شیخ امیر حیدرآباد۔ [illegible] فرخ آباد۔ [illegible] علی خاں [illegible] ایس کے [illegible]

[illegible] ایم [illegible] کشن پرشاد [illegible] حیدرآباد دکن۔ [illegible] حیدرآباد دکن۔ [illegible] حیدرآباد۔ [illegible] دیوی۔ [illegible] شملہ۔ [illegible]

[illegible] دہلی۔ [illegible] آگرہ۔ [illegible] دہلی۔ [illegible] دیوی دہلی۔ [illegible] سورت۔ [illegible] دہلی۔ [illegible] شیام داس [illegible] حیدرآباد دکن۔ [illegible] محمد عباس علی حیدرآباد دکن۔ محمد عبدالرحیم حیدرآباد دکن۔ [illegible]

[illegible] کشوری لال [illegible] دہلی۔ [illegible] بکرم جیت [illegible] آگرہ۔ بشیر احمد آگرہ۔ [illegible] پی پریم [illegible] کماری [illegible] دہلی۔ بیگم انور سلطانہ دہلی۔ [illegible] شام لال [illegible] احمد [illegible]

[illegible] سومرا دیوی بنارس۔ [illegible] غلام احمد [illegible] مظفر [illegible] عبد [illegible] دیارام سنگھ کانپور۔ [illegible] سنگھ [illegible] امرتسر۔ [illegible] دیوبند۔

[illegible] سہارنپور۔ کنیز فاطمہ سہارنپور۔ [illegible] فاطمہ بیگم کانپور۔ عبدالعزیز [illegible] سکھر۔ [illegible] بمبئی۔ [illegible] سنگھ [illegible] لکھنؤ۔ [illegible] مسلم رضا لکھنؤ۔ [illegible] بھوپال۔ [illegible]

[illegible] محمد شفیق الرحمٰن رام پور۔ شفیق الرحمٰن رام پور۔ کانتی سروپ بدایوں۔ انیس احمد سہارنپور۔ [illegible] دہلی۔ [illegible] عائشہ بیگم بدایوں۔ [illegible] سنگھ نئی دہلی۔ [illegible] کماری مظفرنگر۔ [illegible] سنگھ دہلی۔ [illegible] عبدالمجید کانپور۔

[illegible] تبسم [illegible] کراچی۔ عبدالرحیم کراچی۔ عبدالحلیم کراچی۔ [illegible] کراچی۔ محمد احسن کراچی۔ انور علی کراچی۔ محمد محسن کراچی۔ محمد الیاس کراچی۔ احمد باری کراچی۔ جمیلہ خاتون کراچی۔ [illegible] احمد کراچی۔ [illegible] خاتون کراچی۔ رفیعہ خاتون کراچی۔

[illegible] خاتون کراچی۔ شمیلہ خاتون کراچی۔ ریحانہ خاتون کراچی۔ صفیہ خاتون کراچی۔ شمشاد حسین کراچی۔ ثروت اقبال کراچی۔ زوار حسین کراچی۔ شائستہ محمود کراچی۔ رابعہ محمود کراچی۔ محمد شریف کراچی۔ سید حسین کراچی۔ کراچی۔

[illegible] شعیب احمد کراچی۔ ذوالفقار حسین کراچی۔ [illegible] حسین کراچی۔ محمد صغیر کراچی۔ مسیح الدین کراچی۔ صفیہ خاتون کراچی۔ غالب علی کراچی۔ خلیل احمد کراچی۔ احمد حسین کراچی۔ محمود الحق کراچی۔ شمیم [illegible] کراچی۔ [illegible] کراچی۔

[illegible] عابدہ خاتون [illegible] یوسف رام پور۔ رام چندر بدایوں۔ [illegible] خاتون کراچی۔ عاصیہ خاتون کراچی۔ محمود محسن کراچی۔ حسیب الدین کراچی۔ یونس علی کراچی۔ شمیم احمد کراچی۔ عشرت حسین کراچی۔ ثریا جمال کراچی۔ [illegible] حسین کراچی۔

[illegible] محمد سلطان حیدرآباد [illegible] منظور [illegible] غلام سرور حیدرآباد۔ ایف۔ ایم۔ [illegible] ضیاء الحق [illegible] محمد علی راولپنڈی۔ عبدالحمید پشاور۔ [illegible] لاہور۔ ایم۔ [illegible] عارف [illegible] رشید احمد [illegible] کراچی۔ عبد [illegible]

[illegible] کرم سنگھ [illegible] نور محمد سلطان پور۔ [illegible] شام موتی [illegible] سید حسن [illegible] محمد اسحٰق کلکتہ۔ [illegible] لال [illegible] ستوری [illegible] دیہ پرکاش دہلی۔ [illegible] پریم چند [illegible] سنگھ۔ [illegible] محمد بخش [illegible] حیدرآباد [illegible]

[illegible] محمد اسمٰعیل [illegible] ہوشیارپور۔ [illegible] ہوشیارپور۔ پاربتی دیوی [illegible] محمد علیم خاں [illegible] لدھیانہ۔ [illegible] کلیم الدین جالندھر۔ ریاض الدین جالندھر۔ خیر الدین جالندھر۔ [illegible] عبدالصمد عابدی [illegible] سورانسی۔ [illegible] گوبند ناتھ [illegible]

[illegible] سنگھ [illegible] محمد رادت [illegible] عطا محمد [illegible] محمد بشیر حسن [illegible] آگرہ [illegible] اکبر حسن خاں آگرہ۔ امرائیل بیگ آرہ۔ [illegible] گوبند سنگھ [illegible] ڈھاکہ۔ امت الحی [illegible] رشید احمد [illegible] نند [illegible]

[illegible] رحمت اللہ [illegible] عمرو [illegible] سید متین احمد پٹنہ۔ [illegible] بانو پٹنہ۔ [illegible] جھانسی۔ انیس بیگم جھانسی۔ [illegible] سنگھ [illegible] دیوانند [illegible] کمار ڈیرہ دون۔ [illegible] پٹیالہ [illegible] سنگھ [illegible] گڑھ۔

[illegible] دیوی [illegible] دہلی۔ راجندر پرشاد دہلی۔ [illegible] احمد سکھر۔ [illegible] رائے [illegible] دیہ پرکاش کانپور۔ [illegible] شان کلکتہ۔ زہرہ شبیر کلکتہ۔ [illegible] دیوی نئی دہلی۔ [illegible] لکھنؤ۔ مختار حسن [illegible] پٹیالہ۔ اوم پرکاش [illegible]

جنگ سنگھ ہوشیارپور۔ مصطفےٰ کمال بمبئی۔ محمد سراج الدین کانپور۔ جیت رام کسولی۔ [illegible] ولی محمد [illegible]

[illegible] محمد عمر خاں مرادآباد۔ محمد علی خاں رام پور۔ [illegible] احمد [illegible] کلکتہ۔ عبدالستار کلکتہ۔ [illegible] فضل الرحمٰن لکھنؤ۔ [illegible] دہلی۔ رام [illegible] دہلی۔ [illegible] لال [illegible] کانپور۔ عبدالواحد کانپور۔ محمد [illegible] کانپور۔ عبدالغفار کانپور۔ عبدالرؤف کانپور۔ [illegible] مشتاق احمد کانپور۔

[illegible] امرتسر۔ ہری [illegible] سنگھ [illegible] سروپ سنگھ [illegible] کراچی۔ کیپٹن عبدالودود کراچی۔ عبدالمنان کراچی۔ [illegible] امرتسر۔ [illegible] گیان چند [illegible] رشمی لال [illegible] گڑھ۔ [illegible] آباد دکن۔ رام کشن امرتسر۔ [illegible] سید محمد [illegible]

[illegible] حسین [illegible] رام [illegible] احمد [illegible] دیہ پرکاش [illegible] گردھاری لال جالندھر۔ دیہ پرکاش [illegible] دہلی۔ [illegible] شوشیلا دیوی آگرہ۔ [illegible] سوہانی پٹیالہ۔ [illegible] رام [illegible] عثمان آباد۔ محمد عبدالقادر [illegible] اسمٰعیل [illegible] پٹیالہ۔ صادق علی [illegible]

[illegible] امیر حسین [illegible] سنگھ [illegible] کشن سروپ [illegible] غلام محمد کراچی۔ [illegible] سنگھ [illegible] مصلح الدین [illegible] رام [illegible] معین الدین [illegible] کے۔ ایم [illegible] پورن چند [illegible] گوربت سنگھ رولت پور۔

[illegible] ارشاد [illegible] فیض اللہ خاں ملتان۔ [illegible] حمید حیدرآباد۔ [illegible] محمد الدین راولپنڈی۔ [illegible] نواب شاہ۔ [illegible] برکت علی [illegible] محمد سلیم گوجرانوالہ۔ [illegible] رخصت اللہ [illegible] عبداللطیف [illegible] عبدالمیاں کلکتہ۔ [illegible] عبدالقدوس کراچی۔ [illegible]

[illegible] سوہن لال [illegible] بہنس راج [illegible] کسولی۔ جگت رام [illegible] کیشوداس [illegible] عبدالرؤف جالندھر۔ [illegible] کرم چند [illegible] رحمت اللہ [illegible] محمد شیرازی [illegible] فخر الدین [illegible] پور۔ [illegible] جیکب آباد۔ [illegible] لاہور۔ [illegible] لاہور۔ [illegible] پور۔ [illegible]

[illegible] رام [illegible] سکندرآباد۔ [illegible] سنگھ [illegible] سنگھ [illegible] محمد عبدالکریم [illegible] عطا اللہ [illegible] پریم سنگھ [illegible] عبدالکریم [illegible] اصغر علی [illegible] اورنگ آباد۔ رحیم یار خاں [illegible] افضل حسین [illegible]

[illegible] اشرف علی [illegible] سید [illegible] الدین [illegible] کانپور۔ [illegible] سیتا رام [illegible] سنگھ [illegible] سہارنپور۔ احمد جان سہارنپور۔ محمد اسلام سہارنپور۔ رفیق احمد سہارنپور۔ [illegible] سہارنپور۔ [illegible] سہارنپور۔ [illegible] مرادآباد۔

[illegible] مرزا سعید الدین [illegible] دہلی۔ [illegible] دیوی دہلی۔ محمد حیات [illegible] سہارنپور۔ [illegible] سہارنپور۔ جیت کور [illegible] ڈیرہ بابا نانک۔ [illegible] سنگھ [illegible] الٰہ آباد۔ رام رتن [illegible] باندہ۔ [illegible]

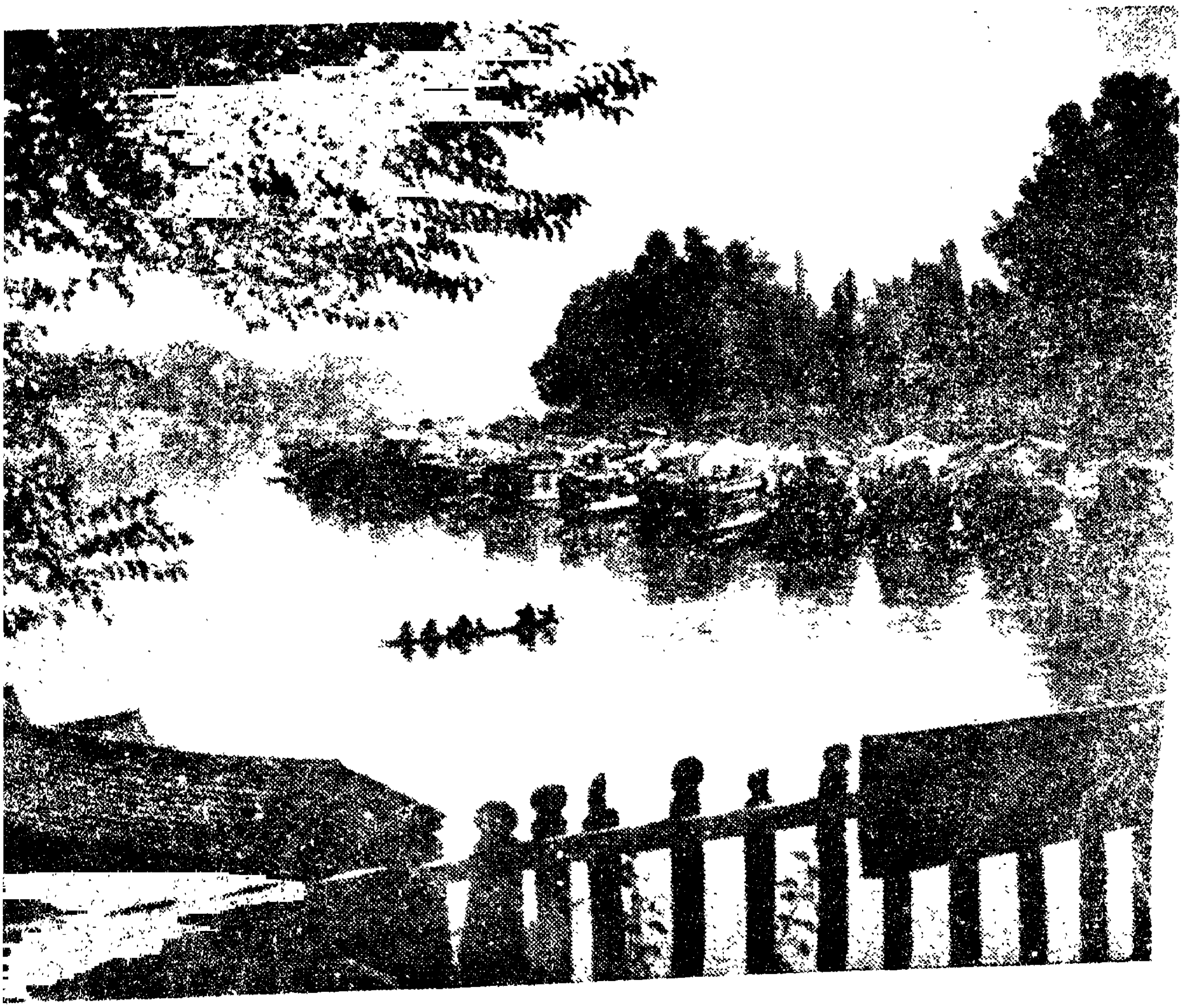
[illegible] توحید احمد [illegible] بشیر احمد [illegible] چاٹگام۔ جہاں اللہ [illegible] انصاری چاٹگام۔ [illegible] نصیر احمد [illegible] بیگم [illegible] چراغ الدین [illegible] ہوشنگ آباد۔ عبدالنظیر خاں [illegible] سہارنپور۔ [illegible]

[illegible] احسان الرحمٰن کراچی۔ [illegible] کراچی۔ [illegible] سہارنپور۔ [illegible] کمار سہارنپور۔ اقبال احمد سہارنپور۔ [illegible] پٹیالہ۔ [illegible] لال [illegible] جموں توی۔ [illegible] موہن لال [illegible] رحیم یار خاں۔ رئیس [illegible] چاٹگام۔ شمس الحق [illegible] سید پور۔ اصغر حسین [illegible] ڈھاکہ۔

[illegible] کراچی۔ [illegible] النساء کراچی۔ صاحب النساء کراچی۔ راحت النساء کراچی۔ عبدالباقی کراچی۔ محمد مسعود کراچی۔ زاہدہ خاتون کراچی۔ انور عالم کراچی۔ ظہیر احمد کراچی۔ ضمیر الحق کراچی۔ نور محمد کراچی۔ شعیب الاسلام کراچی۔

[illegible] سہارنپور۔ [illegible] سہارنپور۔ [illegible] چند [illegible] درگا داس [illegible] بمبئی۔ الطاف حسین [illegible] مول چند [illegible] ڈیرہ دون۔ [illegible] رام کانپور۔ جوزف سنگھ کانپور۔ [illegible] بمبئی۔ گوربچن سنگھ [illegible] عبدالرحیم [illegible] نسیم النساء کراچی۔

[illegible] جبل پور۔ محمد [illegible] عبدالکریم [illegible] حسین الدین کراچی۔ انبالہ۔ [illegible] کوشلیا دیوی۔ [illegible] عبداللہ گڑھ۔ سری رام [illegible] سہارنپور۔ [illegible] کمار سہارنپور۔ [illegible] سنگھ [illegible] پٹیالہ۔ [illegible] کرنیل سنگھ پٹیالہ۔ [illegible] لال پٹیالہ۔ سہارنپور۔



ہاؤس بوٹوں کا شہر — ڈل سری نگر

[illegible] احمد شاہ جہاں پور۔ جلیل حسین لکھنؤ۔ آباد۔ بدھ پرشاد پیری۔ پرکاش وتی وا[illegible]۔ مبارک بیگ عبداللہ مالوہ آباد۔ ایس را جیشور راؤ عادل آباد۔ حمیدہ بیگم [illegible]۔ اسمٰعیل یوسف محمود [illegible]۔ ایس [illegible]
[illegible] لال جلپور۔ محبوب علی دارجیلنگ۔ ایس ایم ادریس پٹنہ۔ نذیر الدین حیدر آباد دکن۔ ایم اسمٰعیل کلکتہ۔ چرنداس کپور تھلہ۔ برکت علی [illegible]۔ علی محمد مالیر کوٹلہ۔ بی نرنجن سنگھ گوالیار۔ کنور
[illegible] کنیز فاطمہ [illegible]۔ رام لال الہ آباد۔ زہرہ حسین بھوپال۔ موہن سنگھ جالندھر۔ ترصدیقی بھاگلپور۔ مدن لال امرتسر۔ ستیش موہن مظفر نگر۔ تیج بہادر کھیرہ کلکتہ۔ مختار احمد فیروز آباد۔ بابو رام
[illegible] سریم داس [illegible]۔ نور[illegible]۔ حامد خاں [illegible]۔ راج رانی [illegible]۔ اکبر حسین [illegible]۔ عبدالشکور [illegible]۔ زکی انور بھاگلپور۔ نریندر سنگھ کھرکیا۔ مختار سنگھ [illegible]
[illegible] گوردیال سنگھ کرنال۔ منشی رام تاہن۔ [illegible] ہری رام سہگل روپڑ۔ لیتق النساء بیگم حیدر آباد دکن۔ دلیپ کمار ترہنی گھاٹ۔ ایم امین عباسی راجہ ناند گاؤں۔ راجکمار
[illegible] بسنت سنگھ دہلی چھاؤنی۔ دلدار حسین لکھنؤ۔ ایس کمار شکوہ آباد۔ نفیسہ بیگم راولپنڈی۔ عبدالعلی مراد آباد۔ جگن ناتھ مراد آباد۔ ظفر احمد کراچی۔ رحمت خاں نواب شاہ سندھ۔ سندر لال شاہ
[illegible] سلطان سید [illegible] شاہجہانپور۔ راجیندر کمار شاہجہانپور۔ ایس ایم نذیر زیدی کراچی۔ احمد علی لورالائی۔ ایس ایچ لکھنؤ۔ ناظم حسین کانپور۔ لطیف الرحمٰن چاٹگام۔ محمد عمر کراچی۔ بھرت [illegible]
[illegible] لکھنؤ۔ احمد سلطان لکھنؤ۔ اشرف حسین بمبئی۔ زہرہ خاتون بریلی۔ نریندر کمار دہلی۔ سیتا دیوی الور۔ اجیت سنگھ کرنال۔ ترپت ورشا کرنال۔ مہندر پرتاپ دوست پور۔ پنجاب سنگھ بریلی۔
[illegible] بریلی۔ شمشاد علی بریلی۔ رام لال ادم پرکاش شاہجہانپور۔ رام لبھایا [illegible]۔ کرشن لال بریلی۔ طیب حسین بریلی۔ حبیب خاں بریلی۔ سبحان علی علی پور۔ سید علی اصغر کراچی۔ محمد ادریس جہلم۔ نور بالا [illegible]
[illegible] فصیح منو جبلپور۔ نورالحسن بھوپال۔ عبدالرحمٰن جبلپور۔ سید سکین بمبئی۔ جگدیش سرینگر۔ اکبر علی حیدر آباد۔ سردار احمد حیدر آباد۔ ایم اے رانی کھنہ۔ عبدالغنی حیدر آباد۔ عبداللطیف [illegible]
[illegible] انعام الحق [illegible]۔ [illegible] برودہ۔ خالد رشید کانپور۔ محمد حبیب۔ سوم ناتھ سیجن۔ موہن لال [illegible] بابا نانک۔ [illegible] چند بیدوال۔ کستوری لال [illegible]۔ سکندر یوسف [illegible]۔ عبدالمجید [illegible]۔ نورجہاں بیگم
[illegible] نورالدین احمد آباد۔ برنام داس بنارس۔ دھنی رام دہرہ دون۔ لیش دیوی امرتسر۔ ہربھجن سنگھ [illegible]۔ فقیر چند امرتسر۔ حیدر بہادر [illegible]۔ پریم ناتھ جموں توی۔ عبدالستار خاں بھوپال۔ مسعود
[illegible] محمد علی خاں رامپور۔ محمد اسلام جے پور۔ مسعود احمد [illegible]۔ ستندر [illegible] ہوشیار پور۔ محمد شرفت احمد جودھپور۔ ایم سی جہا حیدر آباد۔ بالک رام مالیر کوٹلہ۔ جلال الدین سہارنپور۔ رگھبیر سنگھ [illegible]
[illegible]۔ عبدالسلام دیوبند۔ منی لال [illegible]۔ محسن بھائی ناگپور۔ کرشن لال لدھیانہ۔ محمد امین [illegible] آباد۔ محمد ظہیر کلکتہ۔ عبدالعزیز آسام۔ مظہر الاسلام گھارو۔ دوارکا ناتھ نئی دہلی۔ خورشید علی واہ کینٹ
[illegible] کلکتہ۔ محمد نسیم سہارنپور۔ ایس کے بی نئی دہلی۔ چمن لال لکھنؤ۔ امۃ الرحمٰن سہارنپور۔ مختار احمد رشاد۔ ناظم رحیم یار خاں۔ سجاد حسین شاہ ہری پور۔ ہربنس سنگھ دہلی۔ ابوالقاسم۔ جیندر گھوناتھ۔ شمسوار شاہ
[illegible] محمد اصغر بمبئی۔ عبداللہ خاں کراچی۔ صغیر حیدر کراچی۔ محمد اکرم ڈھکوٹ۔ بیگم محمد شفیع قصور۔ محمد اقبال [illegible]۔ محمد جاوید راولپنڈی۔ ادریس احمد کراچی۔ ذوہر بیگم کراچی۔ نسیر احمد [illegible]۔ محمد ابراہیم [illegible]
[illegible] لاہور۔ تصدق حسین شاہ چکوال۔ رمیش کمار مراد آباد۔ دیے کماری امرتسر۔ سرلا دیوی لدھیانہ۔ ڈی ایچ داس کانپور۔ گلاب سنگھ کانپور۔ محمد یوسف کلکتہ۔ محسن خاں مونگیر۔ سی ایم سوہن سرمول۔ [illegible]
[illegible] کانپور۔ کرشن لال پٹھانکوٹ۔ زین العابدین کلکتہ۔ شیخ عبدالماجد دہلی۔ غلام رسول تیلور۔ بجنہ رائیو۔ ست پال لدھیانہ۔ شری رام کھنیارہ۔ ایچ سی مسری کوٹی۔ سردار میاں حیدر آباد۔ روبندر لعل
[illegible]۔ شاہدہ گیلانی لاہور۔ فتح محمد حیدر آباد۔ محبوب عالم خاں [illegible]۔ صدیق غنی [illegible] آدم۔ قدر حسین میر پور خاص۔ عبدالشکور حیدر آباد۔ محمد اسلم لاہور۔ میاں طارق لاہور۔ بیگم گلزار کراچی۔ بیگم لیلیٰ
[illegible]۔ ایم اے ایچ چشتی کراچی۔ عالم خاں چھانگا مانگا۔ فضل حسین راولپنڈی۔ تنویر عارف ساہر کینٹ۔ ایم اے ایچ چشتی کراچی۔ بی ایس بدایوں۔ امرناتھ لدھیانہ۔ سکینہ بانو رامپور۔ شاقب حسین
[illegible]۔ غلام نبی ہمت نگر۔ محمد عثمان ہمت نگر۔ کنیز مہر النساء ہمت نگر۔ عبدالرزاق ہمت نگر۔ اے لطیف ہمت نگر۔ شتی بالا امرتسر۔ سرجیت سنگھ جموں۔ نیلم کماری بھگواڑہ۔ مہندر پال امرتسر۔ ویدپرکاش
[illegible] تاراچند گوندیا۔ ایس احمد کلکتہ۔ بابو شریف [illegible]۔ ملک حفیظ اللہ کلکتہ۔ ملکھ سنگھ کرتار پور۔ ایم احمد مصطفیٰ آباد۔ بابا شفیع احمد سلی۔ عبدالستار گنٹور۔ طلعت عشرت بانو کٹیہار۔ کنہیا لعل [illegible]
[illegible]۔ گرادھیو مل [illegible] بریلی۔ شام سندر دہلی۔ پیارا لال ڈیرہ بابا نانک۔ راج بالا امرتسر۔ سلمیٰ خاتون کراچی۔ سنتوش کماری ڈاری۔ جوالا سنگھ کنڈا گھاٹ۔ باوا لکشمی ڈاری۔ غلام حسین جودھپور۔ امیداس دہلی
[illegible] چند دہلی۔ پشپا وتی دہلی۔ کے سی جاول بلاسپور۔ بابو رام منگلا دہلی۔ رمیش چندر دہلی۔ روپ نرائن ملوتی۔ ہری کشن میرٹھ۔ جگن ناتھ رامپور۔ گیان سنگھ کانگڑہ۔ ہرنام سنگھ نئی دہلی۔ جے دیال کنال [illegible]
[illegible] بریلی۔ بے بے سنگھ گودہ۔ محمد سلیمان ڈلہوزی۔ پرتھوی ناتھ سرینگر۔ بنسی لال دہلی۔ مظفر خاں گولموری۔ عبدالمنان میرٹھ۔ محمد یوسف میرٹھ چھاؤنی۔ بلبیر سنگھ دہلی۔ محمد اسحاق ننگلتہ۔ مدن لال نئی دہلی۔ سرجیت
[illegible] کانپور۔ دنیسہ کوثر سندھنور۔ مبارک علی فرخ آباد۔ کشنا دیتی بریلی چھاؤنی۔ گوربچن داس ہوشیار پور۔ مسز آر گرسے کانپور۔ شان احمد خاں کلکتہ۔ احمد جان محمد علی۔ امرناتھ لسی ابوہر۔ انتظار الحسن اناؤ۔
[illegible] زی الدین [illegible]۔ محمد سلطان ملتان۔ شیریں اختر ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ عبدالمجید الا موسیٰ۔ آر کے ریڈی تلح کھن پورہ۔ دامودر بھارددواج راجپورہ۔ ایم عبدالحق بتیا۔ رمیش پی پردیسی گوندیا۔ اللہ دین [illegible]
[illegible] عبدالرزاق چھانگا مانگا۔ رخسانہ کراچی۔ عابد حسین کراچی۔ صادق محسن سرگودھا۔ جاوید احمد کوٹری۔ جیندر پربھا گیور تھلہ۔ حفیظ محمد قاضی حیدر آباد سندھ۔ بشیر الدین حیدر آباد سندھ۔ [illegible]
[illegible] نوشہرہ چھاؤنی۔ لبتو ناتھ پرشاد لکھنؤ۔ دھرم دیو نئی دہلی۔ بیگم سعید الدین دہلی۔ ستیش کمار سہارنپور۔ خلیل احمد دہلی۔ سرجیت سہارنپور۔ حسن آرا بیگم سہارنپور۔ نیم چند سہارنپور۔ [illegible]
[illegible] سہارنپور۔ تیش پال جموں۔ شو رام پونہ۔ نولکشور شاہجہانپور۔ دلدار حسین دھام پور۔ مدن لکھنؤ۔ عبدالرشید خاں لکھنؤ۔ محمد نسیم سہارنپور۔ یوگیش چندر امرتسر۔ لیلا دیوی امرتسر۔ سو دھا سنگھ [illegible]
[illegible] امرتسر۔ جگن ناتھ سوجانپور۔ محمد اسلام سہارنپور۔ شگفتہ نصرت علی دہلی۔ بے بی شاہدہ نئی دہلی۔ توقیر حسین سہارنپور۔ آئی آر بھوپالی بمبئی۔ ہنس راج جموں توی۔ محمد رضی الدین مظفر نگر۔ [illegible]
[illegible] پور۔ محمد یونس [illegible]۔ پریم سنگھ فیض آباد۔ کرشن لال انبالہ۔ ہری کشن انبالہ۔ رمیش چند انبالہ۔ ارونا انبالہ۔ نصرت اللہ خاں لاہور۔ ایم آر رحیم الوری۔ سترا سنت رام لکھنؤ۔ شودیو [illegible]
[illegible]۔ محمد بشیر [illegible]۔ محمد حسین بھوساول۔ رگھوراج سرن مراد آباد۔ راج درشن مراد آباد۔ کندن لال پٹھانکوٹ۔ دین محمد دہلی چھاؤنی۔ سکھو بہرائچ۔ نور یار رام کانپور۔ دھرم پال امرتسر
[illegible] کمار سنگرور۔ ایم اے حسین [illegible]۔ ایم جی ایس گل امرتسر۔ ناصرہ بانو مدراس۔ رام کمار دھناس۔ گل نعیم حیدر آباد سندھ۔ عبدالرشید خاں حیدر آباد سندھ۔ شمشاد خاں نواب شاہ
[illegible] حسین لاہور۔ محمد یعقوب کراچی۔ صبیح الدین کراچی۔ فضل الٰہی لاہور۔ رخسانہ چشتی کراچی۔ گلنار چشتی کراچی۔ ولی الرحمٰن کراچی۔ محمد صفی اعظم سوہدرہ۔ شفیق افضال میر پور خاص۔ حسین
[illegible] کراچی۔ عبدالستار ہری پور۔ اچھی بی اورنگ آباد۔ آصف خاں اورنگ آباد۔ مسز ایچ اے خاں اورنگ آباد۔ شہناز فاطمہ اورنگ آباد۔ عروس فاطمہ بیگم اورنگ آباد۔ تحویلداس دہلی

پچھوے روپے کا پانچواں انعام سب سے زیادہ حل بھیجنے

ایسے اکرمیر تقوی راج بھالیہ ڈینٹل سرجن بازار خراویان
یانک کے حصے میں آیا۔ موصوف بارہ سو نو ۱۲۰۹ حل بھیجکر
انعام کے مستحق قرار پائے۔

حلوں کی پکڑ ز جائیگی جن صاحب کو یہ حل کے پہنچے پر کچھ شک ہو وہ فوراً اطلاع ایک روپیہ فیس جانچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرکے رسیدی آرڈر جانچ خانے سے ملتی ہے ۔ ہمراہ بھیجکر پکڑ ز جانچ کرائیں۔ جن صاحب کے حل پکڑ ز جانچ میں صحیح ثابت ہوں گے انھیں نہ صرف ہم انعام دیں گے بلکہ فیس جانچ بھی واپس کردی جائے گی۔ جون ۱۹۵۹ء کے بعد موصول ہونے والی پکڑ ز جانچ کی کوئی درخواست قابل توجہ نہ سمجھی جائے گی۔ سفر پاکستانی بھائیوں کی درخواستیں ۵ ربیع الاول [illegible] تک قبول کی جائیں گی۔ [illegible] میں حلوں کی تعداد، تاریخ، فیس روانگی اور [illegible] ترسیل فیس [illegible] تاکہ [illegible] جلد از جلد [illegible]

انعامات کی روانگی انعامی رقوم کے منی آرڈر دو جلتے ہیں نتیجہ شائع ہونے ہی ڈاک خانے کے حوالے کردئیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں انعامات جناب غضنفر علی صاحب۔ [illegible] کراچی تقسیم کرتے ہیں۔ تاہم فہرست کرلیں۔ [illegible] عنایتی رقوم [illegible] [illegible] ہر ہفتے کی تاریخ حق جانچ گزر جانے کے بعد حل [illegible] کے تقسیم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوجاتا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] بعد میں بھیجے ہوئے [illegible] [illegible] آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آمنہ [illegible] رسال [illegible] پاکستانی پوسٹ کارڈ [illegible] ہندوستان [illegible] پاکستانی بھائی [illegible] سکتے ہیں۔

معمہ نمبر ۴۸ کا فیصلہ

ہماری رائے اور فیصلہ

[illegible] بیسویں صدی کی میٹنگ آج شام ۷ بجے چھلی والان اُردو بازار دہلی میں منعقد ہوئی معمہ نمبر ۴۸ کے اشاروں پر لفظ بلفظ غور کیا گیا ڈیڑھ گھنٹے کی دلچسپ علمی بحث کے بعد حسبِ ذیل [illegible]

دائیں سے بائیں:-

اشارات ا، ۲، ۳، ۷ کا ایک ہی ایک جواب تھا۔

۳ "خیالات میں ـــــ جانے والا شخص کام نہیں کرسکتا" بہ (رہ) خیالات میں رہ جانا کچھ با معنی اور بامحاورہ جملہ نہیں۔ اسکے علاوہ خیالات میں رہ جانا بھی دراصل خیالات میں بہ جانے کا نام ہے پھر شخص کام نہ کرسکنے کا اشارہ واضح طور پر بہ کی طرف ہے

۵ "ـــــ کا پیشہ رذیلوں نے اختیار کرکے بدنام ہوگیا" طبابت (طباعت) طباعت کے پیشے کی بدنامی کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اس کی شہرت جیسی بھی تھی بحیثیت پیشہ ویسی ہی اب تک موجود ہے طبابت کا پیشہ البتہ رذیلوں نے بدنام کردیا ہے جو اس کے تقدس سے قطع نظر کرکے اسے محض فریب کارانہ دکانداری کا ذریعہ بنائے ہیں۔

۱۱ "ـــــ سے ڈرنا ایسی کچھ بری بات تو نہیں" سیاہی (سپاہی) سیاہی سے ڈرنے کا سوال صرف تاریکی کے معنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ڈرنے پر نہ تو طعن کی گنجائش ہے، نہ بحث و تمحیص کی۔ البتہ سپاہی سے ڈرنے یا نہ ڈرنے کے بارے میں بحث ہوسکتی ہے۔ اور ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بات ٹھیک ہے کہ قانون کے نمائندہ سپاہی سے ڈرنا کچھ ایسی بری بات تو نہیں۔

۱۵ "بے وجہ ـــــ ہمیشہ ذلت کا باعث ہوتی ہے" لاگ (لاف)۔ لاف کے ساتھ اول تو بے وجہ کا لفظ غیر ضروری ہے دوسرے لاف ہمیشہ ذلت کا باعث نہیں ہوتی کبھی کبھار کارآمد بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن بے وجہ لاگ لازمی طور پر ذلت کا باعث ہوتی ہے۔

۱۶ "ـــــ سے نفرت کرنے والا مہذب تو نہیں کہلا سکتا" شہر (شعر) شعر کو تہذیب و تمدن کا جزو تو سمجھا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہت سے مہذب کاروباری لوگ یا سائنسداں وغیرہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں شہر تہذیب کا مرکز ہوتا ہے۔ اس لئے شہر سے نفرت کرنے والا مہذب نہیں کہلا سکتا۔

اوپر سے نیچے:-

اشارات نمبر ا، ۴، و ۸ کا ایک ہی ایک جواب ممکن تھا۔

۳ "بعض اوقات خوب کام آتی ہے" بناوٹ (بغاوت) بغاوت بعض اوقات کام تو آجاتی ہے لیکن "خوب" کام بناوٹ ہی آتی ہے یعنی بناوٹ اکثر اوقات تو کام آجاتی ہے اور بعض اوقات "خوب" کام آتی ہے۔

۷ "دنیا سے ـــــ کے بعد انسان کی قدر ہوئی بھی تو کیا" رحلت (رخصت) دنیا سے رخصت ہونے کا مطلب بھی مرنا ہی ہے لیکن رحلت کا لفظ اس کے لئے ایک اصطلاح بن گیا ہے۔ اور یہی موزوں جواب ہے۔

۹ "مسلسل ـــــ سے ہی محبت کی بنیاد بن جایا کرتا ہے" میل (کھیل)، کھیل کے ساتھ مسلسل بہت ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر کھیل سے مراد محض ناٹک کے طور پر دو شخصوں کا کوئی مخصوص پارٹ ادا کرتے جانا بھی تو ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ میل میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں کھیل بھی سما جاتا ہے

۱۰ "نیک ـــــ آدمی کو ہر دلعزیز بنا [illegible] خوشی حاصل رہتی ہے" خیال (خصال) بظاہر دونوں [illegible] خوب موزوں ہیں۔ لیکن یہاں دلی خواہش کا سوال [illegible] محض ایک وقتی چیز ہے۔ اس لئے خیال بہ مقابلہ خصال بہتر جواب ہے۔

۱۱ "کسی جگہ کی مختلف راہوں سے یہ واقف [illegible] اور کون ہوگا" راہی (راعی)، راعی چرانے والے [illegible] راہوں سے تو یقیناً واقف ہوتا ہے لیکن یہاں کسی جگہ [illegible] مختلف راہوں کا سوال ہے۔ اور اس وسیع تر سوال [illegible] جواب راہی ہی ہوسکتا ہے۔ جس کے معنوں میں راعی [illegible] بہت زیادہ وسعت ہے۔ دائیں سے بائیں نمبر ۱۱ [illegible] دیکھیے۔

۱۲ "توقع کے خلاف عزیزوں کی غداری [illegible] ـــــ کے مارے خاموش ہو جاتا ہے" غیرت (حیرت) عزیزوں کی غداری توقع کے خلاف تو بہرحال ہوتی [illegible] مگر اسی طرح دوستوں کی غداری بھی توقع کے خلاف ہوتی ہے اور انسان دوستوں کی غداری پر تو حیرت [illegible] مارے خاموش رہ جائے گا مگر عزیزوں کے معاملے میں "غیرت" کا جذبہ حیرت پر بھی غالب آجائے گا۔

۱۳ "ایک ـــــ کے طرز سے کسی ملک کی تہذیب [illegible] اندازہ کرنا سخت غلطی ہے" نگر (نفر)، طرز کی موجود [illegible] میں یوں بھی نفر کے مقابلے میں نگر بہتر اور قرین قیاس جواب ہے۔ لیکن دائیں سے بائیں نمبر ۱۵ کے واضح جواب [illegible] پیشِ نظر اس کا انتخاب اور بھی مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے خلاف شرانگیز پراپگنڈا ٹکڑ گدا بلیک میلروں کا ایک گروہ اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک عرصے سے بیسویں صدی کے خلاف شرانگیز پراپگنڈا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں خودساختہ داستانوں اور فرضی افسانوں کو اشاعت دی جارہی ہے۔ پوسٹربازی بھی ہوئی ہے اور ہینڈبل بھی تقسیم ہوئے [illegible] ان لوگوں کے خلاف چونکہ ہم قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں۔ اس لئے بہت سے انکشافات برسرِ عدالت ہی ہوں گے۔ فی الحال ہم اپنے قارئین کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی دو بلیک میلر اخبارات کے خلاف فوجداری دعوے دائر کئے گئے تھے اور انھوں نے عدالت میں ناک رگڑ کر تحریری معافی مانگ لی تھی

انعام یافتگان کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث تاریخ روانگی انعامات ۲۵ رجون ۱۹۵۵ء مقرر کرنی پڑی ہے

بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۷ میں پہلا انعام حاصل کرنیوالے پانچ خوش نصیبوں کے خطوط

ٹ ڈیپارٹمنٹ ۔ ۷ ٹیپیر بیرکس کراچی نمبر ۴
مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۵۵ء

جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ بیسویں صدی تسلیم

بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۷ میں پہلا انعام پانے کا
، پھر خط اور آج مبلغ /۲۷۰ روپے کا چیک ملا۔
کی جیسی تعریف سُنی تھی میں نے آپ کو اُس سے بھی
دہ دیانتدار پایا۔۔۔۔۔ انعامات کی فوری ادائیگی
ے میں کیا ایک دُنیا متاثر ہے۔۔۔۔

خیر اندیش
احمد حسن انصاری

— ۲ —

کالکا جی کالونی ۔ نئی دہلی
۲۳ مئی ۱۹۵۵ء

جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم

بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۷ کے تین حل میں
نے اپنی عزیزہ کملا دیوی کے نام سے بھیجے تھے۔
ان میں سے ایک حل مبلغ /۲۷۰ روپے کے انعام
تحق نکلا۔۔۔۔ اتنی دیانت داری اور صدق دلی کے
نام نہ کہیں کمانے جلتے ہیں اور نہ ہی اتنی جلد ادائیگی
جاتی ہے۔ ۱۲ مئی کو آپ کا مبارکباد کا تار اور خط
ساتھ ساتھ ملے۔ یہ بھی تحریر تھا کہ انعام کا چیک

ایک ہفتے تک بھیج دیا جائے گا۔ ہماری حیرت کی
کوئی انتہا نہ رہی کہ چیک تیسرے دن ہی مل گیا۔

نیازمند
جگدیش چندر ملہوترہ

— ۳ —

از کوٹ قادر
۱-۶-۵۵

جناب ایڈیٹر صاحب بیسویں صدی معمہ دہلی

تسلیم ۔ پہلے انعام کا مستحق قرار پانے پر جو مسرت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ خداوند تعالیٰ کا احسان اور آپ کی دیانت داری اور خوش انتظامی کا ہی نتیجہ ہے کہ میں بہت سے گرہ کٹوں کے ہزاروں، اور لاکھوں کے سبز باغ دیکھنے کے بعد آج اپنی محنت میں کامیاب ہوا ۔ اور بقاء الدین سلمہٗ کے نام سے بھیجے ہوئے حلوں میں ایک حل صحیح نکلا۔ بیسویں صدی کی دیانت داری کی تعریف کس منھ سے کیجائے میری دعا ہے کہ خدا اسے دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ انعام کی رقم کا اتنی جلدی تقسیم ہو جانا میں تو ایک جادو ہی سمجھتا ہوں۔ یہ میری کامیابی نہیں ہے بلکہ بیسویں صدی معموں کی سچائی کی فتح ہے۔۔۔۔۔۔ فقط والسلام

آپ کا معین الدین (والد بقاء الدین) معرفت خلیل احمد
کوٹ قادر تحصیل نجیب آباد

— ۴ —

حیدرآباد سندھ ۔ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء

مکرمی تسلیم

بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۷ میں کامیابی کی اطلاع بذریعہ تار میری ننھی بچی عابدہ بیگم کے نام مورخہ ۱۴ مئی کو ملی بے اندازہ مسرت ہوئی۔ زیادہ تو ہم کو خوشی اس بات کی کہ آپ معمے کے کاروبار کو بہت دیانتداری اور ایمانداری سے چلاتے ہیں۔ ایک ہفتہ کے اندر ادائیگی تو ایک معجزہ سے کم نہیں۔ دوسرے معموں کو آپ کی تقلید کرنی چاہیے۔ فقط والسلام ۔ نذر محمد برائے عابدہ بیگم لکھی میکھی تراسنج مکان نمبر ۴/۶ حیدرآباد (سندھ)

— ۵ —

بجنور — ۲۵ مئی ۱۹۵۵ء

بخدمت جناب منیجر صاحب بیسویں صدی معمے دہلی

تسلیم و نیاز۔ اس میں شک نہیں کہ جہد مسلسل کے بعد جب اُس کا پھل حاصل ہوتا ہے تو بے اندازہ مسرت کے سوتے دماغ سے اُبل پڑتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت میری ہوئی جس وقت آپکا تار اور خط موصول ہوئے مطمئن تو میں صحیح حل دیکھ کر ہی ہو گیا تھا لیکن تصدیق آپکے خط اور تار سے ہوئی۔۔۔۔ نیازمند مسعود احمد

پاکستانی بھائیوں کیلئے ایک ضروری اعلان پاکستان سے بیسویں صدی معموں میں حصہ لینے والے بھائیوں اور بہنوں کی سہولت کے لئے کراچی سے جناب خسرو دہلوی عقب ریڈیو اسٹیشن کراچی ہر ماہ باقاعدہ رسالہ باغ و بہار شائع کر رہے ہیں۔ اس میں دلچسپ افسانوں، دلکش غزلوں، صحت و سائنس، حسن و عشق اور فلم اور آرٹ کے علاوہ بیسویں صدی معموں کے فوٹو کن نتیجہ، فہرست انعام یافتگان، اشارات وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان سے حل بھیجنے والے بھائی اور بہنیں رسالہ بیسویں صدی نہ ملنے کی صورت میں رسالہ باغ و بہار کراچی سے فوٹو کن کاٹ کر بیسویں صدی معموں میں شرکت کر سکتے ہیں ۔

افسانے ہی افسانے

نرملا
زندہ جاوید ناول نگار منشی پریم چند کا لازوال ناول۔ عورت کی بے بسی کی دردناک تصویر۔ بلند پایہ ادبی تحفہ جس پر خود مصنف کو ناز تھا۔ تین روپے آٹھ آنے کے بجائے صرف دو روپے۔

بقراط
بے مثل مزاح نگار شوکت تھانوی کا بے نظیر کارنامہ۔ رنگے سیاروں کے ہوشربا کرتوت زندگی کی قوس قزح کی دلآویز مسکراہٹیں۔ بیحد دلچسپ قہقہہ آفریں پاکیزہ ناول۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

رادھا ایلزبتھ
آگ اور خون کے بھیانک کھیل کی لرزہ خیز کہانی۔ جنا داس اختر کی بیباک انداز نگارش کی زبانی تقسیم وطن کے خونی فسادات کی حشر انگیز داستان۔ قیمت دو روپے۔

شیطان
فرشتہ صورت شیطان کے شیطانی کارنامے ایک نواب اور اس کے ولی عہد کی سیاہ کاریاں۔ سنگیت کی رانی نورجہاں کی پرکیف کہانی۔ منٹو کی زبانی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

مالوہ
زندہ جاوید روسی ادیب میکسیم گورکی کا شہرۂ آفاق شہ پارہ۔ ایک زہریلی عورت کی فریب کاریوں کی زہریلی داستان۔ نوجوان ادیب جناب نریش کمار شاد کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

محبت روتی ہے
خونی آہوں اور جگرسوز آہوں کی زبانی محبت کی لرزہ خیز کہانی۔ نامور ادیب غلام عباس کا بے پناہ رومانی ناول۔ قیمت دو روپے۔

حسن کی قیمت
زندگی کے حسن، اور گھناونے پن کی لرزہ خیز داستان۔ بدکاروں کی زندگی بے نقاب ہونے کے بعد۔ انتصار حسین کا دلآویز ناولٹ۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

رومانِ بہار
رومانی لطافتوں اور دل آویزیوں کی رنگین کہانی قلب کی گہرائیوں میں مچلنے والے جذبات کی تصویر۔ نامور ناول نگار اشفاق احمد کا انوکھا رومانی تحفہ۔ قیمت صرف دو روپے۔

تھکن
(ناول) دت بھارتی آج کے سماج کی لڑکیوں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی عیاشی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو پڑھ کر ایک بار پھر لڑکیاں گالیاں دینے لگی ہیں۔ ضرور پڑھیے۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے۔

گناہ کے دھبے
دت بھارتی کہتا ہے کہ اگر میرے ناول پسند نہ آئیں تو افسانے پڑھیے۔ اور ہم کہتے ہیں اگر ناول پسند آجائیں تو افسانے ضرور پڑھیے۔ قیمت دو روپے

نمک پارے
جناب سید محمد حسن … مضامین اور افسانے … جو طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ بقول خواجہ … فاروقی ایسی سنجیدہ ظرافت اب کہاں … قیمت صرف دو روپے چار آنے۔

شرحِ دیوانِ غالب
مرزا ابوالفضل … مصنفہ … ملسیانی۔ دیوان غالب کی اس سے اچھی شرح … شائع نہیں ہوئی۔ شارح کا نام نامی ہی اس … کی ضمانت ہے۔ کتاب کے شروع میں … ایک بسیط تبصرہ ہے جس میں غالب کے کلام … کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے … ادیبوں، شاعروں، اور پروفیسروں نے اس … اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ کاغذ، نفیس کتابت و طباعت۔ قیمت فی جلد پانچ روپے۔

گلشن کشیدہ کاری
رسالہ سائز کے … نئے نئے ڈیزائن … خوبصورت ٹائیٹل۔ جسے مشہور ماہر کشیدہ کاری … دیا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ڈیزائن … اشلوک درج ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود … جلد صرف دو روپے۔

بیسویں صدی معمے دہلی

(۱) بیسویں صدی معموں کے اشارے عام فہم اور آسان ہوتے ہیں۔ مزید آسانی کیلئے اشاروں کے سامنے ممکن الفاظ دیئے ہوتے ہیں۔ بہت معمولی غور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی لفظ صحیح ہے۔ ممکن الفاظ اسلئے دیئے جاتے ہیں کہ بہت معمولی غور سے آپ بڑے سے بڑا انعام آسانی سے حاصل کر سکیں۔ (۲) ممکن الفاظ کی موجودگی بیسویں صدی معموں کے سہل اور آسان ہونے کی دلیل ہے۔ آپ ذراسی دماغی محنت اور معمولی توجہ سے ہزار ہا روپے کے انعامات حاصل کر سکتے ہیں۔ (۳) بیسویں صدی معموں کے ممکن الفاظ معمے کی ایمانداری کا روشن ثبوت ہیں۔ اس کے مختصر اور سیدھے سادے اشارے اور صداقت اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز ہے۔ (۴) بیسویں صدی معموں میں بے شمار لوگ بہت معمولی محنت سے بڑے بڑے انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ آپ بھی بیسویں صدی معمے حل کر کے گراں قدر انعامات حاصل کر سکتے ہیں۔ (۵) بیسویں صدی معموں کا ایک بھی بڑا انعام آپ نے حاصل کر لیا تو بلاشبہ آپ کی آئندہ زندگی آرام سے گزرے گی (۶) بیسویں صدی معموں کے انعامات کی ادائیگی نتیجہ نکلتے ہی فوراً ہو جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا یہ پہلا معمہ ہے جس کا فیصلہ علمدہ دست معمہ بورڈ کے ذریعے ہوتا ہے اور نتیجہ نکلتے ہی فوراً انعامات تقسیم ہو جاتے ہیں۔ (۷) آپ معمول میں سچائی اور دیانت داری کے حامی ہیں اسی لئے آپ کو بیسویں صدی معموں میں حصہ لینا چاہیئے۔ دوست دشمن سبھی بیسویں صدی معموں کی سچائی اور دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں۔

بیسویں صدی معمے ۔ ترکمان گیٹ ۔ نئی دہلی

پاکستانی بھائیوں کیلئے ضروری اعلان

"بیسویں صدی" کسی خاص گروہ اور تحریک سے وابستہ نہیں۔ یہ فرقہ دارانہ اور علاقائی تعصبات سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ اپنے دیانتدارانہ اصول کار اور مرنجان مرنج پالیسی کی بدولت "بیسویں صدی" ہندوستان اور پاکستان میں یکساں مقبول و ہر دلعزیز ہے۔ آپ بیسویں صدی حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہیں اور بعض اوقات آپ کو اپنے شہر کے ایجنٹ اخبارات سے رسالہ نہیں ملتا تو یقیناً آپ کو ملال ہوتا ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ آپ سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر جناب خضر دہلوی عنہ ریڈیو اسٹیشن کراچی کے پتہ پر بھیج دیجئے۔ اور ڈاک خانہ سے منی آرڈر روانہ کرنے کی جو رسید وہ آپ رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ نئی دہلی کے پتہ پر لفافہ میں بھیج دیجئے۔ رسید دیکھتے ہی بیسویں صدی آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

دھوکے اور فریب سے بچئے!

آپ بڑی بڑی رقوم کے فرضی انعامات کے جال میں گرفتار ہو کر اپنے خون پسینے کی کمائی ضائع نہ کریں۔ کسی بھی معمے میں شریک ہونے سے پہلے آپ اچھی طرح تسلی کر لیں کہ اس معمے کے انعامات تقسیم بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟ آپ اپنی تسلی اور ذاتی اعتماد کے بغیر کسی بھی معمے میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ یاد رکھئے یہ لاکھوں روپے کے انعامات سراسر دھوکا اور فریب ہوتے ہیں۔

ٹوکن بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰

میں بیسویں صدی معموں کی شرائط پڑھکر اور منظور کر لینے کے بعد بیسویں صدی معمہ نمبر ۵۰ کے حل بھیج رہا ہوں میں ایڈیٹر بیسویں صدی کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا۔ نام و پتہ:۔

ٹوکن بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۹

میں بیسویں صدی معموں کی شرائط پڑھکر اور منظور کر لینے کے بعد بیسویں صدی معمہ نمبر ۴۹ کے حل بھیج رہا ہوں میں ایڈیٹر بیسویں صدی کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا۔ نام و پتہ:۔

[illegible] روپے کے حقیقی انعامات لاکھوں کے فرضی انعامات سے بہتر [illegible]

بیسویں صدی معمّوں کی شرائط

——— حل بھیجنے سے پہلے ان شرائط کو غور سے پڑھ لیجئے۔ ان شرائط کی پابندی لازمی ہے ———

۱۔ فیس داخلہ فی خاکہ ایک روپیہ یا ایک شلنگ چھ پنس ہے۔ ایک معمہ کے ایک ہی نام اور ٹوکن سے تین خاکوں کی رعایتی فیس داخلہ ڈھائی روپیہ یا چار شلنگ اور چھ خاکوں کی پانچ روپیہ یا آٹھ شلنگ ہے۔ اس حساب سے جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔

۲۔ فیس داخلہ انڈین پوسٹل آرڈر، برٹش پوسٹل آرڈر، بیسویں صدی کے جاری کردہ کیش دو چیز یا منی آرڈر کے ذریعہ بھیجئے۔ منی آرڈر بھیجنے کی صورت میں وہ رسید جو منی آرڈر کرنے پر ڈاک خانہ سے ملتی ہے خاکوں کے ہمراہ ضرور بھیجئے۔ تاکہ منی آرڈر کی رقم دیر سے بھی پہنچے تو آپ کے حل مقابلے میں شریک ہو جائیں۔ پاکستانی پوسٹل آرڈر قبول نہیں کئے جاتے۔ فیس بصورت ٹکٹ یا لفافہ میں نوٹ آنے کی صورت میں ہرگز منظور نہیں کی جائے گی۔

۳۔ اپنے حلوں کے ساتھ ٹوکن بیسویں صدی معمہ جو بیسویں صدی نئی دہلی یا بلٹز (بہار) کراچی میں شائع ہوتا ہے ضرور بھیجئے۔ ایک ہی نام سے خواہ جتنے حل بھیجیں صرف ایک ٹوکن کافی ہے۔ ٹوکن اسی معمہ کا ہو جس کا حل بھیجا جائے۔ آپ ٹوکن نہ بھیج سکیں تو اُس کی قیمت موازی چار آنے بھیج دیجئے ٹوکن لگ کر آپ کے حل شریکِ مقابلہ ہو جائیں گے۔ جن حلوں کے ساتھ ٹوکن یا رسید منی آرڈر نہیں آئے گی۔ یا بعد میں کسی دوسرے لفافہ میں آئے گی، اُن حلوں کو مقابلے میں شریک کرنے یا نہ کرنے کا ہمیں اختیار ہوگا۔

۴۔ پاکستان سے حل بھیجنے والے فیس داخلہ بذریعہ منی آرڈر جناب خضر دہلوی۔ عقب ریڈیو اسٹیشن کراچی کے پتہ پر بھیجیں اور منی آرڈر کوپن پر بحساب بیسویں صدی دہلی معمہ نمبر ۔ اور اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں۔ اور منی آرڈر رسید جو ڈاک خانے سے ملتی ہے اپنے حلوں کے ہمراہ دہلی بھیجیں۔ تاکہ آپ کے حل مقابلے میں شریک کر لئے جائیں۔

۵۔ حل چھپے ہوئے یا سادہ کاغذ پر ہاتھ سے بنائے گئے خاکوں میں آنے ضروری ہیں ہر حل کے نیچے اپنا نام اور پورا پتہ خوشخط روشنائی سے لکھا ہونا لازمی ہے۔ ایک بار حل بھیجنے کے بعد اُن میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔ حلوں کی فیس کم پہنچنے کی صورت میں حل شریکِ مقابلہ نہیں ہوں گے۔ آپ چاہیں تو لفظوں میں بھی حل بھیج سکتے ہیں مگر خوشخطی کا خیال رکھئے۔

۶۔ حل روشنائی سے صاف لکھیئے۔ ہر لفظ جس میں کوئی پنسل سے لکھا ہوا، یا کاٹ کر لکھا ہوا، تبدیل شدہ، کٹا پھٹا، مشکوک، محکوک اور مبہم حرف ہوگا یا نامکمل لفظ ہوگا وہ ایک غلطی شمار ہوگا۔ بھ، پھ، تھ، جھ، چھ، کھ، گھ، لھ وغیرہ ایک حرف اور دھ، ڈھ، رھ وغیرہ دو حرف ہیں۔ زیر، زبر، پیش، چھوٹی اور بڑی "یے" اور مد کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا مشدد حرف ایک ہی شمار کیا جائے گا۔ نون اور نون غنہ میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ املا کی غلطی شمار کی جاتی ہے۔

۷۔ حفاظت کے لئے حلوں کو رجسٹری سے بھیجئے۔ کئی آدمی مل کر اپنے اپنے ٹوکن کے ہمراہ ایک ہی لفافہ میں حل بھیج سکتے ہیں۔ اور فیس بھی ایک ہی منی آرڈر کے ذریعہ [illegible] ہے منی آرڈر کوپن پر فیس کی تفصیل ضرور لکھیں معمہ کی فیس یا ہدیہ [illegible] میں کسی دوسرے حساب کی رقم ہرگز نہ بھیجئے۔ کیونکہ معمہ کا حساب بالکل الگ رکھا جاتا ہے اور نہ حلوں کے ہمراہ کسی قسم کی فرمائش کیجئے۔ حل موصول نہ ہونے یا دیر سے موصول ہونے یا راستے میں گم ہو جانے کی صورت میں بیسویں صدی پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

۸۔ پہلا انعام بالکل صحیح حل پر دیا جائے گا جو معمہ بورڈ کے حل سے حرف بحرف ملتا ہوگا۔ بہت سے صحیح حل موصول ہونے کی صورت میں انعام کی رقم مساوی طور پر تقسیم کر دی جائے گی۔ اسی طرح دوسرا انعام ایک غلطی والوں میں اور تیسرا انعام دو غلطی والوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ کوئی صحیح حل موصول نہ ہونے کی صورت میں پہلا انعام ایک غلطی والوں میں اور دوسرا انعام دو غلطی والوں میں تقسیم ہوگا۔ اسی طرح چار اور پانچ غلطیوں والے بھی انعام حاصل کر سکتے ہیں

۹۔ ایک معمے میں ایک شخص کو ایک ہی ٹوکن سے ایک ہی انعام مل سکتا ہے یعنی وہ اپنے متعدد حلوں کے ذریعے جس بڑے انعام کا مستحق ہوگا، وہی بڑا انعام اسے دیا جائے گا۔ سب سے زیادہ حل بھیجنے کے انعام پر یہ شرط عائد نہیں ہوتی۔ بیسویں صدی یا اس سے متعلقہ دفاتر کا کوئی رکن اس معمہ میں حصہ نہیں لے سکتا۔

۱۰۔ اس معمہ کے تمام معاملات نیز متنازعہ امور میں ایڈیٹر بیسویں صدی کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اور قانونی طور پر قابلِ قبول ہوگا۔ بیسویں صدی معموں کی یہ شرائط ایڈیٹر بیسویں صدی اور حل بھیجنے والوں کے درمیان ایک ایسے معاہدے کی حیثیت رکھتی ہیں جو دہلی میں قرار پایا ہے۔ اور ہر حالت میں دہلی میں ہی مکمل طور سے عمل پذیر ہوتا طے پایا ہے۔ امورِ متنازعہ میں سماعت کا حق صرف دہلی کی عدالتوں کو حاصل ہوگا۔ دہلی سے باہر کسی عدالت کو حقِ سماعت حاصل نہیں ہوگا۔ معموں میں شرکت ان شرائط کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرنے والے انعام کے مستحق نہ ہوں گے نظرِ ثانی کی تاریخ گزرنے کے بعد (جو ہر مہینے کی آخری تاریخ اور پاکستانی بھائیوں کے لئے پندرہ تاریخ ہوتی ہے) حل تلف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کسی قسم کا دعویٰ یا مطالبہ قابلِ توجہ نہ ہوگا۔

۱۱۔ مقامی حضرات حل اور فیس داخلہ دفتر بیسویں صدی معمے ترکمان گیٹ نئی دہلی میں روزانہ صبح ساڑھے نو بجے سے ساڑھے پانچ بجے شام تک جمع کرا کے رسید لے سکتے ہیں۔ معمہ کی آخری تاریخوں میں اتوار کو بھی حل وصول کئے جاتے ہیں۔ [illegible] حل بھیجتے وقت لفافہ پر بیسویں صدی معمہ کا نمبر واضح طور پر لکھیئے۔

فیس اور حل بھیجنے کا پتہ

بیسویں صدی معمے۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی

پاکستان میں فیس۔ جناب خضر دہلوی عقب ریڈیو اسٹیشن کراچی کے نام اور حل بذریعہ منی آرڈر دہلی بھیجئے۔ پاکستانی بھائیوں کے انعامات پاکستان ہی میں ادا کئے جاتے ہیں۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر خوشتر گرامی ——— مطبوعہ پنجاب نیشنل پریس [illegible] دہلی ——— ٹائیٹل [illegible] پریس [illegible] دہلی

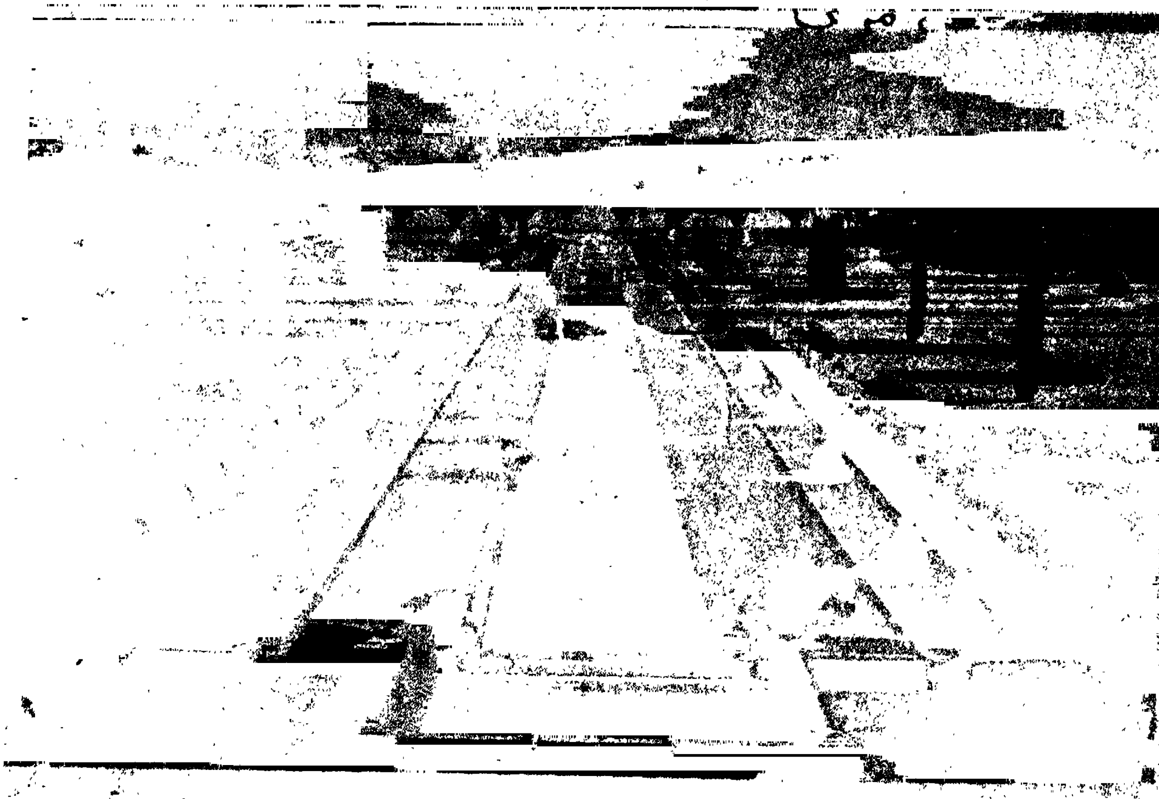


.... مگر میرا خیال ہے کہ ....

15th YEAR OF PUBLICATION
BISWIN SADI NEW DELHI
JULY REGD.NO.D100 1955

بیسویں صدی

ستمبر



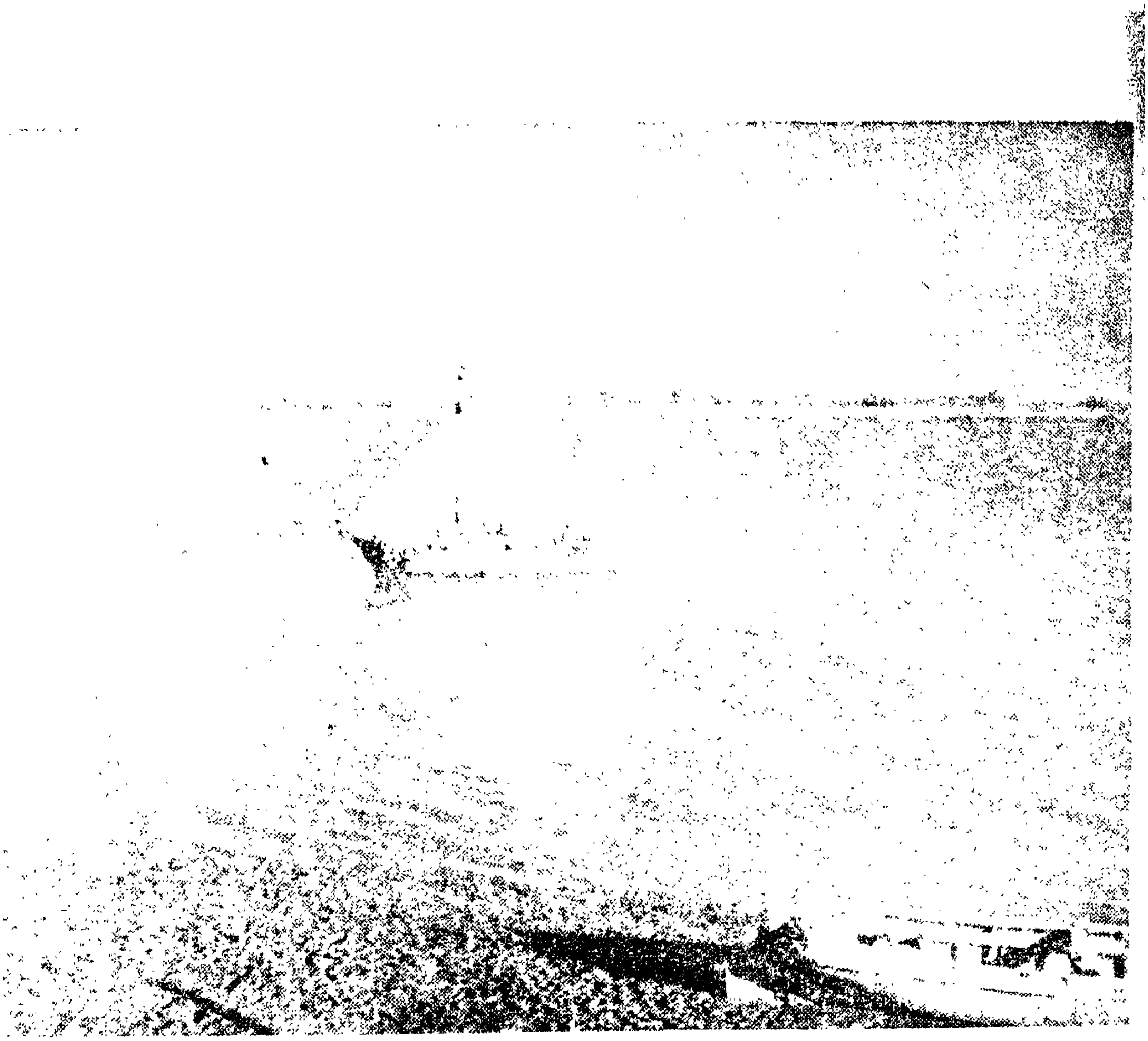
ہم نے دھرتی پہ بھی فردوس سجا رکھی ہے —— (میسور کے برنداون گارڈنز)

ISWIN SA... DELHI



منظرِ دل نشیں بھی ہے، موسم برشگال ہے ؎ ہم تو مگر ہیں کامگار، گھر کا ہمیں خیال ہے

(فوٹو: سراج انور۔ دہلی)



[illegible]

بیسویں صدی دہلی

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
قیمت فی پرچہ
آٹھ آنے

ستمبر ۱۹۵۶ء

جلد ۲۰
نمبر ۹
سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت
۹ شلنگ
ٹیلیفون دفتر ۲۶۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۴۸۰۲۵

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں، جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی

تلخ و ترش

از ادارہ

باادب باملاحظہ ہوشیار ——— ہوشیار پور کی تحقیقاتی رپورٹ آگئی۔ یہ تحقیقاتی رپورٹ جس کے لیے پہلے انکار کیا گیا تھا۔ اور انھیں شریمن نارائن کی جنھوں نے تحقیقات کے مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ سرکار کا کام ہے اس سے ہمارا کیا واسطہ ——— لیکن ایک دن ہم نے اچانک یہ خبر سنی کہ مولانا آزاد نے اُن کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی ——— کیا فرماتے ہیں شریمن نارائن جی اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں، ذرا مشتے نمونہ از خروارے آپ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

"پولیس والوں نے عورتوں کو اُن کے بالوں اور کپڑوں سے پکڑ کر گھسیٹا، عورتوں کے کپڑے پھٹ گئے۔ دوپٹے اتر گئے۔ پولیس والوں نے عورتوں کو گندی گالیاں دیں ——— عورتوں اور بچوں پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لوگوں کا تعاقب کر کے انھیں لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے پیٹا گیا ——— جلوس کے بڑے حصے پر بے خبری کے عالم میں پولیس نے حملہ کیا ——— پولیس پر کوئی پتھراؤ نہیں کیا گیا ——— لاٹھی چارج انتقام لینے کے لیے کیا گیا اور جلوس کے بھاگنے کے تمام راستے روک دیے گئے ———"

خداوندا یہ سب خواب کی باتیں تو نہیں، کیا واقعی یہ سب کچھ ہوا؟ ہمیں تو الف لیلہ کی سی داستان معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف سردار پرتاپ سنگھ کیروں کا طنطنہ، دوسری طرف شریمن نارائن کا انکار اور اس پر یہ رپورٹ۔ ابوالحسن سوتے جاگتے کا سا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہندوستانی عورتوں کے ساتھ ہوا۔ ہندوستان کے جمہوری آسمان کے نیچے اور جمہوری حکومت کے دور میں۔ اور ابھی تک اس حکومت کا قصر زمین بوس نہیں ہوا۔ اور سردار پرتاپ سنگھ کیروں ابھی تک بدستور راج سنگھاسن پر براجمان ہیں ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ لمبی چوڑی فردِ جرم سردار جی کی حکومت کے خلاف، جسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ——— آہ اب اگر اس حکومت کی ہمیں فاتحہ پڑھنی پڑی تو یہی کہیں گے ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لوگ ابھی تک بچہ سقے کا راج یاد کرتے تھے۔ لیکن کیروں شاہی بھی بھلائی نہ جا سکے گی۔

"کیروں کے جھوٹ کا پردہ تار تار ہو گیا" ——— اِن تاروں کو بھی توڑ ڈالو تو بات بنے۔

سونی پت میں ایک جن سنگھی لیڈر نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "کانگرس ملک کو تباہ کر رہی ہے" ——— کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں یہ الفاظ ایک جن سنگھی لیڈر کے منھ سے لیکن یہ بھی تو فرما دیا ہوتا کہ جن سنگھ کیا کر رہا ہے؟ بچا غالب نے خوب کہا تھا ؏ ——— شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایک اخباری عنوان ہے۔ "لاٹھی چارج کو حق بجانب قرار دینے والے کیروں کی پشیمانی" ——— ؎ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ابھی کیا ہو [illegible] سے ہٹنے کے بعد بھی سردار جی پشیمان ہوتے تو اُسے بھی بر وقت ہی کہتے۔

دلّی کی سرکاری تجارت کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے ——— مغربی نہر کی پٹڑی ٹوٹ جانے سے پانچ گھنٹے میں ٹھاں کے قریب بینت نگر میں تقریباً چار سو مکانوں میں پانی داخل ہوگیا۔ جس سے وہاں کے مکانوں کے لئے خطرہ لاحق ہوگیا۔ پرشارتھیوں بے چاروں نے فوراً اپنا سامان باہر نکال لیا۔ اور وہ بے سروسامانی کی حالت میں باہر پڑے ہوئے تھے کہ اس کی اطلاع وزیر بحالیات ڈاکٹر پدہ دیر سنگھ کر دی گئی۔ اور فائر بریگیڈ کو بلوایا گیا۔ اُس کے دو یونٹ وہاں آئے اور اُنھوں نے پچیس روپے فی گھنٹہ کے حساب سے پانی نکالنے کے لئے مانگا ——— یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ پُرشارتھیوں کے ساتھ اوّل تا آخر تجارت ہوئی ہے۔ چار آنے گز کی زمین چالیس روپے گز بکی ہے ہزار کے مکان کے پانچ ہزار لئے گئے ہیں۔ اور ایک لاکھ کے کلیم کو پچیس ہزار کا رکھا گیا ہے۔ اس لئے اس واقعے پر شارتھیوں کو کوئی ملال نہیں ہونا چاہئے۔ جب تک موجودہ نظام باقی ہے یہی ہوتا رہے گا۔

پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں خاصی رونق رہی۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے والی بات، مسٹر دیش مکھ وزارت سے مستعفی ہو کر آئے تو سیدھے ڈاکٹر مکرجی کی لائن پر چلے اور پنڈت نہرو کی ذات کو نشانہ بنایا۔ اُن کی تقریروں اور اُس پر جوابات نے پارلیمنٹ میں کافی چہل پہل پیدا کر دی۔ ایک دن سوال جواب شعروں میں ہوئے دیشمکھ نے اپنی تقریر میں چوٹ کرتے ہوئے کہا کہ ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

پنڈت نہرو نے جوابی تقریر میں یہ شعر پڑھا ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اگر ہم بھی پارلیمنٹ میں ہوتے تو پنڈت نہرو کی اُن ناز برداریوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اُنھوں نے مسٹر دیشمکھ کی اب تک کی ہیں، کچھ اس طرح عرض کرتے ؎

نیاز عاشقی اس قدر کے معشوق کیا جانیں
یہ لاتوں کے بچار ہی ہیں میاں باتیں نہیں چلتیں

"برطانیہ نے مصر کو جنگی سامان کی بہم رسانی بند کر دی" ——— اس پر ہمیں اُس کتّے کا قصہ یاد آگیا جو ایک گاڑی کے نیچے گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اُسے خیال آیا کہ یہ گاڑی تو میرے سہارے چل رہی ہے میں نے خواہ مخواہ اتنا بوجھ اپنی کمر پہ اٹھا رکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا، وہ رُک گیا۔ اور گاڑی جو تھی آگے نکل گئی۔ پھر اُسے خیال آیا۔ اوہو، یہ تو بہت بُرا ہوا کم از کم اب تک بھرم تو قائم تھا۔ اس لئے برطانیہ یہ فیصلہ نہ کرتا تو اچھا تھا۔ کم از کم وہ جھوٹا بھرم تو قائم رہتا۔ مگر اب وہ بھی جاتا رہا ——— رہا مصر کے لئے اسلحہ کا سوال، سو وہ پہلے ہی چیکوسلاواکیہ سے حاصل کر رہا ہے۔

"ایک ہزار ٹیچروں کی ہڑتال" ——— سمجھ لو چالیس ہزار بچوں کی دُعائیں قبول ہوئیں۔ اور اُن کی چھٹی ہوگئی۔

اخباری اطلاع ہے کہ کراچی میں ایک ڈومیسٹک سائنس کالج کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جہاں امریکی امداد سے پاکستانی لڑکیوں کو ناچ کی تربیت دی جائے گی۔ اُنھیں حسین فیشن ایبل اور خوبصورت بننے کے گُر سکھائے جائیں گے اور محبت کرنے کا آرٹ بھی سکھایا جائے گا ——— اِس حمام میں سب ننگے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کا راز کھُل گیا اور کوئی پردے میں ہے۔ کہیں امریکی امداد ہے اور کہیں بغیر امداد کے کام ہو رہا ہے۔ پاکستان نے کالج بنا کر بدنامی مول لی۔ ورنہ کیا پاکستان کیا ہندوستان۔ آپ کو گلی گلی، سڑک سڑک چلتے پھرتے تربیتی کالج نظر آئیں گے۔ دو چوٹیاں، ترچھی نظریں، ابرو کمان رُخساروں پہ غازہ، لبوں پہ لالی، دوپٹہ مفلر بنا ہوا سینہ نیم عُریاں، بلوریں بازو بجلیاں گراتے چلے جاتے ہیں۔

"پتنی دان" کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیے ——— اپریل ۱۹۵۶ء میں ایک فوجی نوجوان کی ایک نوجوان لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔ فوجی بیوی کو گھر چھوڑ کر ڈیوٹی پر چلا گیا۔ شوہر کی عدم موجودگی میں بیوی نے پریم تیوار سنبھالی۔ اور رنگیں تیا کیجئے۔ آخر یہ پریم بار آور ہوا اور کھیل کا نتیجہ رُونما ہونا شروع ہوا۔ اِسی اثنا میں فوجی واپس آگیا۔ اُسے بیوی کے پریم کو بار آور دیکھ کر حیرت ہوئی۔ راز کھُلا تو شوہر نے "پتنی دان" کا فیصلہ کیا۔ ایک پنچایت بُلائی گئی۔ اور اُس نے بیوی کو اُس کے پریمی کے حوالے کر دیا۔ اور اب ہر ماہ بیوی کو خرچ بھی دے رہا ہے ——— ہے نا "مثالی شوہر"۔ اِس شوہر کو ہم اِس کے سوا کیا کہیں ؎

لکھا جائے گا تیرا نام گردوں پر ستاروں سے
صدا تحسین کی اُٹھے گی ہمیشہ آبشاروں سے

فرہاد و مجنوں، رانجھا اور مہینوال اُس عاشقِ زار کی قسمت پر حسد کر رہے ہوں گے۔

"مغربی طاقتوں کے کس بَل نکل گئے" ——— ٹھیک جیسے پتہ خرے کے تنکلے کے نکلتے ہیں۔

"گُڑ کا مستقبل کیا ہوگا ؟" ——— چاکلیٹ اور ٹافی بنیں گے۔

"پٹیالہ میں سترہ برس بعد قتل کے ایک ملزم کا سُراغ ملا ہے۔ ملزم حکیم بنا رہا" ——— اِس ایک قتل کا حال تو سب کو معلوم ہے لیکن اِس خود ساختہ حکیم نے ہزاروں کو قبرستان بھیج دیا ہوگا۔ اُن کا بھی سُراغ لگا لیا جائے اور سب مقدمات ایک ساتھ ہی چلائے جائیں۔

"جیسلمیر میں ڈاکو پولیس افسر کو ہلاک کرنے کے بعد فرار ہوگئے" تو آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ وہیں کھڑے پولیس کے آنے کا انتظار کرتے رہتے۔

ایک خبر ہے "رُوسی عورتیں مغربی فیشن کے اُونی پارچہ جات کی دلدادہ ہوگئیں" ——— لینن کی جو وصیت اب شائع کی گئی ہے اُس میں یہی لکھا ہوگا۔ اسٹالن کے زمانے میں تو مغرب کی جانب کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک خبر ہے کہ "ہندوستان اور پاکستان کے درمیان منقولہ جائداد پر فیصلہ کُن کانفرنس منعقد ہونے والی ہے" ——— ایسی بہت سی کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ مگر کولھو کا بیل وہیں ہے۔ کوئی نتیجہ خیز کانفرنس کرنی ہے تو غیر منقولہ جائداد کے بارے میں کیجئے۔ ورنہ اِن کانفرنسوں کو شرنارتھی اور مہاجرین دونوں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہند اور پاکستان کے حکمراں کیا جانیں ع

حقیقت پُوچھئے جا کر کسی بسمل سے بسمل کی

ایک عنوان ہے "کیرول وزارت کا مستقبل مخدوش" ——— آپ مستقبل کی بات کرتے ہیں سردار جی کو تو حال بھی مخدوش نظر آرہا ہے۔ کاش آپ اُن کے دل کی دھڑکنیں سُن سکتے۔

"مُردہ عورت کے بچّہ پیدا ہوگیا۔ جاپانی ڈاکٹروں کا کمال" ——— ایک اپنے ہندوستانی ڈاکٹر ہیں جو کبھی کبھی زندہ عورتوں کے بھی بچّہ پیدا کرانے میں ناکام رہتے ہیں۔

"پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک کو دبانے کے لئے کسانوں پر اتیاچار" ——— تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو۔ یہاں ہُشیار پور میں کیا ہوا ہے۔

"دہلی اسمبلی کا آخری اجلاس" ——— یعنی کہ دہلی کی حکومت عالمِ نزع میں ——— بُلاؤ خواجہ حالؔی کو۔ تاکہ پھر کوئی نوحہ لکھ ڈالیں۔ ؎

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

افسانہ

باسی ہڈی

از

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم۔ اے

رانچی

محترمی خوشتر بھائی!

ایک کہانی "باسی ہڈی" بھیج رہا ہوں۔ اس کہانی کے کردار اور واقعات فرضی ہیں لیکن فیدن میاں اور الطاف میاں کے کردار ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اِن کی حقیقت پر کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں دہلی آرہا ہوں۔ عصمت اور بچے بھی ساتھ ہوں گے۔ ملاقات ہوگی۔ اور باتیں ہوں گی۔

اُمید ہے آپ اچھے ہوں گے ——— تسلیم!

مخلص

شکیل الرحمٰن

جب وہ زمیندار تھے تو اُن کا نام میاں فدا حسین تھا۔ جب زمینداری چھن گئی تو کچھ عرصے تک میاں فیدن رہے۔ اور پھر پھیدن میاں بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کا نام بھی بدلتا رہا۔ اُن کے دقار پر بوڑھی سی شکن آگئی تھی۔ کمر جھک گئی تھی لیکن تن کر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ وقت نے اُن سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ جذبات کے وہ تیور تھے اور نہ عود و عنبر میں لپٹی ہوئی اُن کی وہ دُنیا تھی۔ گیت کی موت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو رقص نے ضرور دم توڑ دیا تھا۔ اُداس دائروں نے اُن کے رنگ و رُوپ کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ خضاب لگنے کے باوجود سر کے بال سفید تھے۔ آنکھوں میں زرد روشنی تھی۔ اُن آنکھوں کے حلقوں میں برف کی تہیں جمنے والی تھیں اور چہرے کی جھرّیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اِس حقیقت سے کچھ واقف ضرور ہیں۔ دل کی پستی سے درد کا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور اُس دُھوئیں سے اُن کا دم کبھی کبھی گھٹنے لگتا تھا۔ اور وہ پریشان ہو کر اپنے ماضی کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے

اُن کا ماضی ہمیشہ زندگی سے بھرپور آیا۔ جیسے پھولوں کے شبنمی کٹوروں پر جلترنگ کی آواز۔ قوسِ قزح کی کمان کی لچک۔ گنگناتے ہوئے کپاس کے پھول بنفشے کے غنچے بیلو۔ شام۔ چاندنی رات۔ صبح کی چاندنی۔ سوندھی ہوائیں۔ شاخِ زیتون کی مُسکراہٹ۔ ماضی کا خیال سناٹے میں گیتوں کا لمس لاتا۔ تھوڑے لمحے کا سرور لاتا۔ اور کبھی کبھی بدحواسی بھی لاتا۔ جب زمینداری گئی تو وہ بدحواس ہو گئے۔ اِسے ہر فرد نے محسوس کیا۔ یہ بدحواسی کچھ اور آگے بڑھی اور اُن کے رہنے سہنے کا ڈھنگ بدل گیا۔ اُن کی "بارہ د[ری]" اُن نگاہوں میں اب برباد ہو چکی تھی کبھی کبھی ٹھنڈی سانس لے کر اپنی بارہ دری کو [یاد کرتے] تھے اور دل ہی دل میں کہتے تھے "یہاں کتنا ہجوم رہتا تھا حضور، سرکار، حاکم، مالک، گالیاں، حکم، ڈر، خوف، شفقت، رحم، روپے کی جھنکار، عجیب فضا تھی۔ ایک ڈانٹ سے آسامیوں کی روحیں کانپ جاتی تھیں۔ اُن کے دا[دا] تو اسی بارہ دری میں کوڑے لگواتے تھے۔ لاشیں گرائی تھیں۔ عجب

یب دبدبہ تھا۔ وقت کتنی تیزی سے بھاگ گیا تھا؛ اور آج وہ اپنا ہاتھ مل رہے تھے
ور ٹھنڈی سانس بھر رہے تھے۔ اِس بارہ دری کی فضا گھونگھروؤں کی جھنکار اور ساز
کی آواز سے گونجا کرتی تھی۔ تاش کھیلے گئے تھے۔ روپیہ لُٹائے گئے تھے شراب پی
گئی تھی۔ گندی گالیاں محبت اور شوق سے دی گئی تھیں۔ عیش کا زمانہ تو ہمیشہ ایسا ہی
رہتا ہے۔ اب بھی اُن کی وہ بارہ دری کم آباد نہیں تھی۔ اِس لئے کہ محلّے کے آوارہ لڑکے
وہاں گولیاں کھیلتے تھے تاش کھیلتے تھے۔ لٹّو نچاتے تھے۔ جُوا کھیلتے تھے گندی گالیاں
بکتے تھے ہنگامہ کرتے تھے۔ روایت کسی نہ کسی صورت میں قائم تھی۔ لیکن سعیدن میاں
کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ لڑکوں کو ڈانٹتے تھے۔ گالیاں دیتے تھے۔ لیکن محلّے کے اُن لڑکوں
نے اُن کی کبھی کوئی پرواہ نہ کی۔ اِس لئے کہ وہ میاں فدا حسین نہیں تھے۔ سعیدن میاں
بن گئے تھے۔

وقت کے ساتھ اُن کے جینے کا ڈھنگ بدل سا گیا تھا۔ اُن کی ایک پُرانی سائیکل
تھی اور ایک بندوق تھی۔ بندوق ساتھ ہمیشہ رہی۔ لیکن کبھی ہاتھ میں نہ رہی۔ سائیکل
میں بندھی رہی۔ وہ بازار سے شلغم اور پیاز بھی لانے جاتے تو بندوق والی سائیکل
یا سائیکل والی بندوق اُن کے ساتھ چلتی۔ اور وہ بازار سے اپنی سائیکل اور بندوق
لے کر اِس طرح لوٹتے جیسے شلغم اور پیاز کو گولیاں مار کر شیر کی طرح ساتھ لا رہے ہیں۔ اِس
طرف وہ لُنگی پہننے لگے تھے۔ نیلی لنگی اور اُس لنگی کو چمڑے کی پیٹی سے سنبھالے رہتے
وہ اُس لنگی میں ہر جگہ جاتے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں، شکار میں، بازار، کچہری، تھانے،
ریلوے اسٹیشن۔ غرض ہر جگہ اُن کی نیلی لنگی اُن کے ساتھ ہوتی۔ وہ کہتے، اِس لُنگی سے
اُن کا جسم کچھ ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی اُن کی بارہ دری سُرخ سفید گھوڑوں، اور سُرخ
آنکھوں کی شہرت تھی۔ اور اب وہ اپنی بندوق والی سائیکل، نیلی لُنگی اور بدخو اس
چہرے سے پہچانے جاتے تھے۔

اُنھیں صبح سے شام تک اِس کی فکر رہتی تھی۔ کہ اُنھیں کتنے لوگوں نے
راستوں پر سلام کیا۔ پہلے وہ رات کو روپوں کا حساب کر کے تجوری بند کرتے تھے۔ اب
اِس کا حساب کر کے سوتے تھے کہ کن لوگوں نے سلام کیا۔ کس سے کہاں ملاقات
ہوئی تھی اور فلاں شخص نے دیکھتے ہی سلام کیا یا نہیں۔ آج فقیر الدین نے سلام
نہیں کیا۔ اُسے دماغ ہو گیا ہے۔ کوآپریٹو سوسائٹی کا انسپکٹر جو ہو گیا ہے۔ اُس نے
پرانا زمانہ اچھی طرح نہیں دیکھا۔ ورنہ آج اُس کا رویّہ کچھ اور ہوتا۔ صبح سے شام تک

لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ سب بارہ دری میں سلام کرتے رہتے تھے۔ عجیب زمانہ تھا؛
آج مولوی عبداللہ کو دیکھو میری سائیکل کی طرف نظر بھی نہیں اُٹھاتا ہے۔ اپنا وقت
بھول گیا۔ ابّا مرحوم نے اُس کے خاندان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ احسان فراموش؛
ہر روز وہ کئے گئے سلام کی فہرست ذہن میں بناتے اور اُن لوگوں کو نفرت کی نگاہ
سے دیکھتے جو اُن سے مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ سعیدن میاں دن بھر کچہری، تھانہ
ریلوے اسٹیشن اور نہ جانے کہاں کہاں کا چکر لگاتے تھے۔ اپنی حالت یہ تھی کہ افسروں
اور پولیس والوں کو خواہ مخواہ سلام کرتے کرتے پریشان رہتے تھے۔ اِس کی احتیاط ضرور
کرتے تھے کہ اُنھیں اُن لوگوں کو سلام کرتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ کچہری میں دیہاتوں
کے مقدموں میں دلّالی کرتے تھے۔ اور اِس طرح کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ لوگ جب اُن سے
پوچھتے کہ وہ دن بھر کورٹ میں کیا کرتے ہیں تو فرماتے میرے کئی مقدمے چل رہے
ہیں۔ انتہائی طور پر پریشان ہوں۔ لاکھوں روپوں کے چکر میں ہوں۔ عزیزوں
سے مقدمے چل رہے ہیں۔ باپ دادا کی جائداد کہاں کہاں ہے کوئی پتہ نہیں چل
رہا ہے۔ جس کو جو ملا کھا پی کر بیٹھ گیا۔ پولیس افسروں کی کافی خوشامد کرتے تھے
اِس سے اُن کا کیا فائدہ تھا اسے وہی بہتر جانتے تھے۔ لیکن ایک بات بالکل صاف
تھی کہ اِس طرح وہ لوگوں پہ یہ دھونس جماتے تھے کہ پولیس والے اُنھیں اپنا دوست
سمجھتے ہیں۔ اور شہر کا کوئی کام اِن کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے۔ پولیس والوں
کو خوش رکھنے کے لئے اپنی بارہ دری میں اُنھوں نے کبھی کبھی دعوتیں بھی کیں اور کسی
سے سمدھی، کسی سے نانی، کسی سے پوتا کا رشتہ لگایا۔ تاکہ رشتے غیر معمولی بن جائیں معمولی
نہ رہیں۔ پولیس والوں کی مدد سے اُنھوں نے شہر کے اُن لوگوں کو کبھی کبھی پریشان بھی کیا
جن لوگوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کی سطحیت نمایاں تھی۔ رفتہ رفتہ تمام لوگ اُنھیں
پہچان گئے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ زمینداری ختم ہوتے ہی وہ اپنا اصل نام کھو بیٹھے
تھے۔ اور سعیدن میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہ بات اُنھیں پسند نہ تھی پھر
بھی وہ اُسے برداشت کر رہے تھے۔ اِس لئے کہ اُنھیں برداشت کرنا تھا۔ کس کی
زبان بند کرتے، وہ پٹے ہوئے مہرے تھے لیکن بساط پر رہنا چاہتے تھے اُن کے
رہنے سہنے کا ڈھنگ ضرور بدل گیا تھا لیکن خیالات میں عجیب تڑپ تھی عجیب تلملاہٹ
تھی۔ چوٹ کھائی ہوئی ذہنیت تھی جو بلبلا کر اُٹھنا چاہتی تھی۔ شکست کا احساس
تھا، اُن کے دل میں ایک تاریخ تھی جس کے صفحوں پر سات پُشت کے افسانے تھے

افسانے کے افسانوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب۔ جب وہ اِن افسانوں پر نظر ڈالتے تھے تو اپنی تھکن بھول جاتے تھے۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ حدِ نظر تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ زمرّدیں گھاس کے بچھونے پر انھیں نیند سی آرہی ہے۔ اور دادا کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دادا جان کی عیاشی کی محفل نظر آتی تھی۔ ابا جان کا زور و ظلم دکھائی دیتا تھا۔ انھیں محسوس ہوتا، اُن کے آنسو اس تاریخ کے صفحوں پر بہنے کو تیار ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اُن کی آنکھوں کے پپوٹوں پھڑکے ہوئے ہیں۔ اُن کے دادا جان کی یہ ادا تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زمین سے اُس وقت تک نہیں گزرتے تھے جب تک کہ وہ زمین خرید نہ لیتے تھے۔ اُن کا یہ ریکارڈ تھا کہ اُنھوں نے آج تک کسی دوسرے کی زمین پر قدم نہیں رکھا۔ اگر راستے میں دوسرے کی زمین کا کچھ حصہ آبھی گیا تو فوراً اپنے منیم کو حکم دے کر خرید لیا اور پھر آگے بڑھے۔ اس شان کی مثال نہیں ملے گی۔ ابا جان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ دودھ اور مکھن سے اُن کا جسم طوائفیں ہر صبح دھویا کرتی تھیں۔ اور پانچ مرغ اور بیس انڈے صرف صبح کی چائے کے ساتھ آتے تھے۔ انگریزوں کے لئے اُنھوں نے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ اور پھر خان صاحب کے ٹائیٹل سے نوازے گئے۔ ایسی باتیں یاد کرکے انھیں کچھ اطمینان ہوتا۔ وہ اُن روایات کو اُن کی اِس حالت میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کم سے کم انھیں اس طرح دیکھیں کہ وہ فلاں میاں کے پوتے اور فلاں میاں کے صاحب زادے ہیں۔ زمینداری چلی گئی تو کیا ہوا۔ خدا حسین تو زندہ ہیں۔ اُن کی حرکتوں سے پریشان ہو کر لوگ کہتے۔

"رسّی جل گئی بل نہیں گئے۔"

"ڈبّہ خالی ہو گیا ہے۔"

"چھوڑی ہوئی باسی ہڈی پڑی ہے۔"

تو وہ اندر ہی اندر جل جاتے۔ اُن کا بس چلتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ لیکن انھیں خاموش رہنا پڑتا۔ اُن کے وقت کا یہی تقاضا تھا۔

اُن کی بارہ دری میں کچھ تصویریں اور طُغرے لگے ہوئے تھے۔ ایک تصویر تو اُن کے ابا مرحوم کی تھی۔ گھوڑے پر سوار اور کمر میں تلوار۔ ایک طرف برطانوی حکومت کی دی ہوئی سند فریم میں لگی لٹک رہی تھی۔ اور مکڑی کی جالیوں سے لپٹی سنہرے حرفوں میں اس کا اعلان کر رہی تھی کہ پھیدن میاں کے ابا حضور کو حضورِ برطانیہ نے خان صاحب کا خطاب کبھی دیا تھا۔ کاغذ میں کیڑے لگ چکے تھے۔ ایک تصویر پھیدن میاں کی تھی۔ مُردہ شیر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں میں ٹوٹی کی بندوق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پھیدن میاں نے اپنی جوانی میں ایک شیر مارا تھا۔ اور یہ تصویر اُسی وقت کی یادگار تھی۔ کچھ بزرگوں نے قسم کھا کر یہ بھی بتایا کہ وہ شیر پھیدن میاں نے خود نہیں مارا تھا۔ اُن کے ساتھ شکار میں اُن کا ایک پشاوری دوست تھا جس نے شیر مارا تھا لیکن چونکہ اُس پشاوری دوست کا حقہ پانی پھیدن میاں کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے پاس بندوق کا لائسنس نہیں تھا۔ اور جس بندوق سے اُس نے جنگل میں شیر مارا تھا وہ بندوق پھیدن میاں کی تھی۔ اِس لئے وہ خاموش رہا اور پھیدن میاں نے اپنی فتح اور کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اور ایک زندہ شیر کی طرح شہر میں ایک مُردہ شیر لے کر داخل ہوئے۔ پتہ نہیں حقیقت کیا تھی۔ شکار کی تصویر تو اُن کی فتح کی گواہی ضرور دے رہی تھی۔ بے شمار عربی طغرے لگے ہوئے تھے۔ تصویر وں پر مکڑا کی جالیاں پھیلی رہتی تھیں۔ پھیدن میاں۔ ۔ ۔ اُن تصویروں اور طغروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے۔ پھیدن میاں کے ایک نوکر تھے الطاف میاں، کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی لکڑی کے سہارے چلتے تھے۔ اُنھوں نے پھیدن میاں کے والد مرحوم کی خدمت کی تھی لیکن انھیں اِس خاندان کی پوری تاریخ یاد تھی۔ تاریخ کے بے شمار صفحوں کا اضافہ اُنھوں نے کیا تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے، ایک دفتر کھل جاتا تھا۔ لوگ اُن کی باتوں سے اُکتا گئے تھے۔ افیون کے نشے میں عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔ سچ پوچھیے تو سارے شہر میں صرف الطاف میاں تھے جو پھیدن میاں کا دم بھرتے تھے۔ نمک حلالی کا ثبوت دے رہے تھے۔ پھیدن میاں الطاف میاں کے افیون کا انتظام کر دیتے تھے۔ اِس لئے کہ وہی ایک شخص تھے جنھیں دیکھ کر اور جن کی باتیں سُن کر انھیں اطمینان ہوتا تھا۔ اور کچھ لمحے کی مسرت حاصل ہو جاتی تھی۔ افیون ملنے میں جب کبھی دیر ہوئی الطاف میاں نے تماشہ کر دیا۔ محلّے میں پھیدن میاں کی شکایتیں شروع کر دیں۔ اور کہا۔ "باپ دادا والی بات کہاں سے آئے گی؟ وہ لوگ راجہ تھے راجہ" اور جب پھیدن میاں دوسرے لمحے افیون کا انتظام کر دیتے تو اُسی شام الطاف میاں یہ کہتے ہوئے نظر آتے "بانس کی جڑ میں بانس ہوتا ہے۔ راجہ کا بیٹا راجہ ہی ہوگا" پھیدن میاں جب کسی وجہ سے مایوس اور اُداس رہتے اور خود ماضی کو کھنگالنے لگتے

ک جاتے تھے اور کوئی خاص مزہ نہ آتا۔ تو الطاف میاں کو افیون ضرور کھلاتے تھے
رپھر حویلی میں مگسی آتی اور الطاف میاں چھیدن میاں کو اُن کی تاریخ سُناتے۔ اپنے لکھے
ے صفحے بھی پڑھتے اور بتاتے کہ کئی پشتوں سے بڑا پایہ آ رہا ہے۔ اور یہ بڑا پا کبھی ختم
ہوگا۔ آج زمینداری گئی ہے تو کیا ہوا۔ کل انگریز پھر آجائیں گے۔ اور زمینداری مل
ائے گی۔ پھر حویلی اسی طرح آباد رہے گی۔ بارہ دری میں انگوری کے دور چلیں گے۔
و گھنگروؤں کی جھنکار سے اُس کی فضا گونجے گی۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے جائیں
گے۔ اور دنیا چھیدن میاں کی شان دیکھے گی۔ چھیدن میاں نہ جانے کیوں بعض حقیقتوں
جانتے ہوئے بھی بچوں کی طرح الطاف میاں کی باتیں سُننے لگتے۔ اور انھیں کچھ نہ کچھ تسکین
و جاتی تھی۔

ایک بار شہر میں چیچک کی وبا پھیلی۔ اور چھیدن میاں کی بیگم کا اس مرض میں
نتقال ہوگیا۔ انھیں کافی صدمہ پہنچا۔ گئے زمانے کو یاد کر کے خوب روئے۔ اُن کے لئے
یلی میں اب کوئی کشش نہ رہی۔ گھر میں صرف اب الطاف میاں رہ گئے تھے جو انھیں
خاطر میٹھی میٹھی تسلیاں دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ اور الطاف میاں نے چھیدن میاں کو اس کا احساس دلا
ن دیا کہ وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کی عمر کے لوگ پہلوانی کرتے ہیں، رہ
بالوں کا سوال تو آجکل کے نوجوانوں کے بال بھی پکنے لگے ہیں۔ خوشبودار انگریزی
ں لگانے سے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں۔ اب سفید بال بڑھاپے کے نشان نہیں
ہے۔ الطاف میاں نے بتایا کہ جب وہ پندرہ برس کے تھے تو اُن کے بال پکنے شروع
و گئے تھے۔ چھیدن میاں پر اِن باتوں کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی گیا۔ اپنی جوانی کا احسا
نہیں ہوا لیکن یہ ضرور محسوس ہوا کہ وہ تگڑے قسم کے انسان ہیں۔ اور اُن کے جسم کے
ن میں بڑی گرمی ہے۔ الطاف میاں کی اِن باتوں میں رفتہ رفتہ بہت کشش محسوس
ونے لگی۔ اور اُن کے حقہ پانی اور افیون کا انتظام اور اچھا ہوگیا۔

چھیدن میاں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ میں پھر کچھ فرق آیا۔ بال سنور
گئے۔ خوشبودار تیل مارکیٹ سے آئے۔ اکثر فلمیں دیکھی گئیں۔ حویلی میں کبھی کبھی
ست قسم کے قوال بھی آئے۔ انھوں نے کچھ اپنی دلالی اور کچھ مکان کے دوسرے
حصے کے کرائے سے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اُن کا رنگ بدل رہا تھا
ور دوسری طرف اُن کے بڑے مکان کا۔ وہ خوبصورت بن رہے تھے اور مکان پر

کوڑھ کے دھبّے پڑ رہے تھے۔ مکان کی دیواریں جا بجا پھٹ گئیں۔ ایک طرف تعمیر ہو
رہی تھی اور دوسری طرف تخریب۔ عجیب عالم تھا۔ مکان کی بنیاد بھی کمزور ہو رہی
تھی۔ دیواریں ٹوٹنے والی تھیں اور چھیدن میاں الطاف میاں کی باتوں سے لطف
اندوز ہو کر سوچ رہے تھے "ظہورن کی لڑکی کلثوم ۔ ۔ ۔ ۔" مکان کا ایک ستون گر گیا۔ ایک
دیوار گر گئی۔ پورا مکان خطرے میں پڑ گیا۔ کرایہ دار نے مکان چھوڑ دیا۔ اور ظہورن کی لڑکی
کلثوم کا خیال بھی خیال ہی بن کر رہ گیا۔

دسمبر کی سردی تھی۔ اس بار سردی زیادہ پڑی تھی۔ بہت سی ٹھنڈک کو الطاف
میاں کا جسم برداشت نہ کر سکا۔ فالج نے اُن کے کمزور جسم پر حملہ کر دیا۔ چھیدن میاں
کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بارہ دری برف کے نیچے دب گئی ہے۔ اُن کے آبا و اجداد کی
تاریخ کے صفحے اُڑنے والے ہیں۔ اُن کی علالت نے چھیدن میاں کا دماغ چکرا دیا۔ اُن
کی گھبراہٹ ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا، اُن کی کائنات ڈوبی جا رہی
ہے۔ الطاف میاں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ الطاف میاں اُن کے
پُرانے نوکر تھے لیکن وہ جو کچھ کر رہے تھے ایک نوکر کے لئے نہیں کر رہے تھے۔
الطاف میاں کے ساتھ اُن کی مہربانیوں کی جو وجہ تھی وہ اُسے جانتے تھے۔ ایک خاص
قسم کے سکون اور ایک خاص قسم کی تسکین کے لئے انھیں الطاف میاں کے لئے
کچھ کرنا پڑتا تھا۔ الطاف میاں کی علالت نے اداس سائے پھیلا دیئے۔ چھیدن میاں
کی آنکھیں سہمی سہمی سی تھیں۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے سینے میں آگ لگ
رہی ہے۔ والد مرحوم کے انتقال کے وقت بھی اُن کی یہ حالت نہ ہوئی تھی۔ رفیقۂ
حیات کی جدائی نے بھی ایسا غم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے الطاف میاں زندہ رہیں
ہڈی کا یہ ڈھانچہ کھڑا رہے۔ بولتا رہے۔ باتیں بتاتا رہے۔ یہ انسانی ڈھانچہ چھیدن میاں
کی روح میں گیتوں کا لمس گھونتا رہا تھا لیکن فالج گرنے کے چار روز بعد الطاف میاں
انتقال کر گئے۔ دل کی پتی سے چاند کے پہاڑوں تک درد کا دھواں پھیل گیا۔ الطاف
میاں اپنے ساتھ سب کچھ لے گئے۔ تاریخ کے نایاب صفحے، عود و عنبر میں لپٹی ہوئی جنت
تبسم کی شراب، مہوے کے زرد پھول۔ سکون، قرار، اطمینان، ڈھارس، نصیحت،
شفقت، محبت۔ چھیدن میاں کو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہیں۔ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ کس
کے ساتھ کل بھی ختم ہو چکے تھے کبھی کبھی سوچتے "مجھ میں اور باسی ہڈی میں فرق ہی کیا ہے؟"

...لیلہ کے افسانوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ۔ جب وہ ان افسانوں پر نظر ڈالتے تھے تو اپنی شکن بھول جاتے تھے ۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ حدِ نظر تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ نمرودیں گھاس کے بچھونے پر انھیں نیند سی آرہی ہے ۔ اور دادا کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں ۔ دادا جان کی عیاشی کی محفل نظر آتی تھی ۔ ابا جان کا زور و ظلم دکھائی دیتا تھا ۔ انھیں محسوس ہوتا، اُن کے آنسو اس تاریخ کے صفحوں پر بہنے کو تیار ہیں ۔ لیکن کسی وجہ سے اُن کی آنکھوں کے پپوٹوں پر رُکے ہوئے ہیں ۔ اُن کے دادا جان کی یہ ادا تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زمین سے اُس وقت تک نہیں گزرتے تھے جب تک کہ وہ زمین خرید نہ لیتے تھے ۔ اُن کا یہ ریکارڈ تھا کہ اُنھوں نے آج تک کسی دوسرے کی زمین پر قدم نہیں رکھا ۔ اگر راستے میں دوسرے کی زمین کا کچھ حصہ آبھی گیا تو فوراً اپنے منیم کو حکم دے کر خرید لیا اور پھر آگے بڑھے اس شان کی مثال نہیں ملے گی ۔ ابا جان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ دُودھ اور مکھن سے اُن کا جسم طوائفیں ہر صبح دھویا کرتی تھیں ۔ اور پانچ مرغ اور بیس انڈے صرف صبح کی چائے کے ساتھ کھاتے تھے ۔ انگریزوں کے لئے اُنھوں نے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں ۔ اور پھر خان صاحب کے خطاب سے نوازے گئے ۔ ایسی باتیں یاد کر کے انھیں کچھ اطمینان ہوتا ۔ وہ اُن روایات کو اُن کی اس حالت میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کم سے کم انھیں اس طرح دیکھیں کہ وہ فلاں میاں کے پوتے اور فلاں میاں کے صاحب زادے ہیں ۔ زمینداری چلی گئی تو کیا ہوا ۔ فدا حسین تو زندہ ہیں ۔ اُن کی حرکتوں سے پریشان ہو کر لوگ کہتے ۔

"رسی جل گئی بل نہیں گئے ۔"

"ڈبہ خالی ہو گیا ہے ۔"

"چھوڑی ہوئی باسی ہڈی پڑی ہے ۔"

تو وہ اندر ہی اندر جل جاتے ۔ اُن کا بس چلتا تو نہ جانے کیا کرتے ۔ لیکن انھیں خاموش رہنا پڑتا ۔ اُن کے وقت کا یہی تقاضا تھا ۔

اُن کی بارہ دری میں کچھ تصویریں اور طغرے لگے ہوئے تھے ۔ ایک تصویر تو اُن کے ابا مرحوم کی تھی ۔ گھوڑے پر سوار اور کمر میں تلوار ۔ ایک طرف برطانوی حکومت کی دی ہوئی سند فریم میں لگی لٹک رہی تھی ۔ اور مکڑی کی جالیوں سے لپٹی سنہرے حرفوں میں اس کا اعلان کر رہی تھی کہ پھیدن میاں کے ابا حضور کو حضور برطانیہ نے خان صاحب کا خطاب کبھی دیا تھا ۔ کاغذ میں کیڑے لگ چکے تھے ۔ ایک تصویر پھیدن میاں کی تھی ۔ مُردہ شیر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں میں اُن کی بندوق ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ پھیدن میاں نے اپنی جوانی میں ایک شیر مارا تھا ۔ اور یہ تصویر اُسی وقت کی یادگار تھی ۔ کچھ بزرگوں نے قسم کھا کر یہ بھی بتایا کہ وہ شیر پھیدن میاں نے خود نہ مارا تھا ۔ اُن کے ساتھ شکار میں اُن کا ایک پشاوری دوست تھا جس نے شیر مارا لیکن چونکہ اُس پشاوری دوست کا حقہ پانی پھیدن میاں کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے پاس بندوق کا لائسنس نہیں تھا ۔ اور جس بندوق سے اُس نے جنگل میں شیر مارا تھا وہ بندوق پھیدن میاں کی تھی ۔ اِس لئے وہ خاموش رہا اور پھیدن میاں نے اپنی فتح اور کامیابی کا اعلان فرمایا ۔ اور ایک زندہ شیر کی طرح شہر میں ایک شیر لے کر داخل ہوئے ۔ پتہ نہیں حقیقت کیا تھی ۔ شکار کی تصویر تو اُن کی ... گواہی ضرور دے رہی تھی ۔ بے شمار عربی طغرے لگے ہوئے تھے ۔ تصویروں ... کی جالیاں پھیلی رہتی تھیں ۔ پھیدن میاں ۔ ۔ ۔ اُن تصویروں اور طغروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے ۔ پھیدن میاں ... نوکر تھے الطاف میاں، کافی ضعیف ہو چکے تھے ۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی ... لکڑی کے سہارے چلتے تھے ۔ انھوں نے پھیدن میاں کے والد مرحوم کی خدمت ... لیکن انھیں اِس خاندان کی پوری تاریخ یاد تھی ۔ تاریخ کے بے شمار صفحوں کا ... اُنھوں نے کیا تھا ۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے، ایک دفتر کھل جاتا تھا ۔ لوگ اُ... سے اُکتا گئے تھے ۔ افیون کے نشے میں عجیب و غریب باتیں کرتے تھے ۔ ... تو سارے شہر میں صرف الطاف میاں تھے جو پھیدن میاں کا دم بھرتے تھے ... حلالی کا ثبوت دے رہے تھے ۔ پھیدن میاں الطاف میاں کے افیون کا ... کر دیتے تھے ۔ اِس لئے کہ وہی ایک شخص تھے جنھیں دیکھ کر اور جن کی باتیں ... اطمینان ہوتا تھا ۔ اور کچھ لمحے کی مسرت حاصل ہو جاتی تھی ۔ افیون ملنے میں کبھی دیر ہوئی الطاف میاں نے تماشہ کر دیا ۔ محلّے میں پھیدن میاں کی شکا... کر دیں ۔ اور کہا ۔ "باپ دادا والی بات کہاں سے آئے گی؟ وہ لوگ راجہ ... اور جب پھیدن میاں دوسرے لمحے افیون کا انتظام کر دیتے تو اُسی شام ... میاں یہ کہتے ہوئے نظر آتے "بانس کی جڑ میں بانس ہوتا ہے ۔ راجہ کا بیٹا را... پھیدن میاں جب کسی وجہ سے مایوس اور اُداس رہتے اور خود ماضی کو کھنگ...



ضہ بہ اک شے آنے والی آگئی کیا تم نہ آوگے

تک جاتے تھے اور کوئی خاص مزہ نہ آتا۔ تو الطاف میاں کو افیون منزہ کھلاتے تھے پھر طلائیں گرمی آتی اور الطاف میاں پھیدن میاں کو اُن کی تاریخ سُناتے۔ اپنے لکھے ہوئے صفحے بھی پڑھتے اور بتاتے کہ کئی پشتوں سے یہ ٹھاٹ چلا آرہا ہے۔ اور یہ ٹھاٹ کبھی ختم نہ ہوگا۔ آج زمینداری گئی ہے تو کیا ہوا۔ کل انگریز پھر آجائیں گے۔ اور زمینداری مل جائے گی۔ پھر حویلی اسی طرح آباد رہے گی۔ بارہ دری میں انگوری کے دَور چلیں گے گھنگھروؤں کی جھنکار سے اُس کی فضا گونجے گی۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہائے جائیں گے۔ اور دُنیا پھیدن میاں کی شان دیکھے گی۔ پھیدن میاں نہ جانے کیوں بعض حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی بچوں کی طرح الطاف میاں کی باتیں سُننے لگتے۔ اور انھیں کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

ایک بار شہر میں چیچک کی وبا پھیلی۔ اور پھیدن میاں کی بیگم کا اس مرض میں انتقال ہوگیا۔ انھیں کافی صدمہ پہنچا۔ گئے زمانے کو یاد کرکے خوب روئے۔ اُن کیلئے حویلی میں اب کوئی کشش نہ رہی۔ گھر میں صرف اب الطاف میاں رہ گئے۔ تھے جو اُن کی خاطر میٹھی میٹھی تسلیاں دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ اور الطاف میاں نے پھیدن میاں کو اس کا احساس دلا ہی دیا کہ وہ ابھی بُوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کی عمر کے لوگ پہلوانی کرتے ہیں۔ رہ گیا بال کا سوال تو آجکل کے نوجوانوں کے بال بھی پکنے لگے ہیں۔ خوشبودار انگریزی تیل لگانے سے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں۔ اب سفید بال بڑھاپے کے نشان نہیں رہے۔ الطاف میاں نے بتایا کہ جب وہ پندرہ برس کے تھے تو اُن کے بال پکنے شروع ہوگئے تھے۔ پھیدن میاں پر اِن باتوں کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی گیا۔ اپنی جوانی کا احساس تو نہیں ہوا لیکن یہ ضرور محسوس ہوا کہ وہ تگڑے قسم کے انسان ہیں۔ اور اُن کے جسم کے خون میں بڑی گرمی ہے۔ الطاف میاں کی اِن باتوں میں رفتہ رفتہ بہت کشش محسوس ہونے لگی۔ اور اُن کے حقہ پانی اور افیون کا انتظام اور اچھا ہوگیا۔

پھیدن میاں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ میں پھر کچھ فرق آیا۔ بال سنور گئے۔ خوشبودار تیل مارکیٹ سے آئے۔ اکثر فلمیں دیکھی گئیں۔ حویلی میں کبھی کبھی مست قسم کے قوّال بھی آئے۔ انھوں نے کچھ اپنی دلالی اور کچھ مکان کے دوسرے حصے کے کرایے سے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اُن کا رنگ بدل رہا تھا اور دوسری طرف اُن کے بڑے مکان کا۔ وہ خوبصورت بن رہے تھے اور مکان پر کوڑھ کے دھبے پڑ رہے تھے۔ مکان کی دیواریں جا بجا پھٹ گئیں۔ ایک طرف تعمیر ہو رہی تھی اور دوسری طرف تخریب۔ عجیب عالم تھا۔ مکان کی بنیاد بھی کمزور ہو رہی تھی۔ دیواریں ٹوٹنے والی تھیں اور پھیدن میاں الطاف میاں کی باتوں سے لُطف اندوز ہو کر سوچ رہے تھے۔ "ظہورن کی لڑکی کلثوم . . . . " مکان کا ایک ستون گر گیا۔ ایک دیوار گر گئی۔ پورا مکان خطرے میں پڑ گیا۔ کرایہ دار نے مکان چھوڑ دیا۔ اور ظہورن کی لڑکی کلثوم کا خیال بھی خیال ہی بن کر رہ گیا۔

دسمبر کی سردی تھی۔ اُس بار سردی زیادہ پڑی تھی۔ برف سی ٹھنڈک کو الطاف میاں کا جسم برداشت نہ کر سکا۔ فالج نے اُن کے کمزور جسم پر حملہ کر دیا۔ پھیدن میاں کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بارہ دری برف کے نیچے دب گئی ہے۔ اُن کے آبا و اجداد کی تاریخ کے صفحے اُڑنے والے ہیں۔ اُن کی علالت نے پھیدن میاں کا دماغ چکرا دیا۔ اُن کی گھبراہٹ ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا، اُن کی کائنات ڈوبی جا رہی ہے۔ الطاف میاں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ الطاف میاں اُن کے پُرانے نوکر تھے لیکن وہ جو کچھ کر رہے تھے ایک نوکر کے لئے نہیں کر رہے تھے۔ الطاف میاں کے ساتھ اُن کی مہربانیوں کی جو وجہ تھی وہ اُسے جانتے تھے۔ ایک خاص قسم کے سکون اور ایک خاص قسم کی تسکین کے لئے انھیں الطاف میاں کے لئے کچھ کرنا پڑتا تھا۔ الطاف میاں کی علالت نے اُداس سائے پھیلا دیئے۔ پھیدن میاں کی آنکھیں سہمی سہمی سی تھیں۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے سینے میں آگ لگ رہی ہے۔ والد مرحوم کے انتقال کے وقت بھی اُن کی یہ حالت نہ ہوئی تھی۔ رفیقۂ حیات کی جدائی نے بھی ایسا غم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے الطاف میاں زندہ رہیں۔ ہڈی کا یہ ڈھانچہ کھڑا رہے۔ بولتا رہے۔ باتیں بناتا رہے۔ یہ انسانی ڈھانچہ پھیدن میاں کی رُوح میں گیتوں کا لمس گھولتا رہا تھا لیکن فالج گرنے کے چار روز بعد الطاف میاں انتقال کر گئے۔ دل کی پستی سے چاند کے پہاڑوں تک درد کا دُھواں پھیل گیا۔ الطاف میاں اپنے ساتھ سب کچھ لے گئے۔ تاریخ کے نایاب صفحے، عود و عنبر میں لپٹی ہوئی جنت تبسّم کی شراب، مہوے کے زرد پھول۔ سکون، قرار، اطمینان، ڈھارس، نصیحت، شفقت، محبت۔ پھیدن میاں کو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہیں۔ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ رہی کیسا تھ بل بھی ختم ہو چکے تھے کبھی کبھی سوچتے "مجھ میں اور باسی ہڈی میں فرق ہی کیا ہے؟"

...کے افسانوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں وہ اِن افسانوں پر نظر ڈالتے تو اپنی تھکن بھول جاتے تھے۔ اُنہیں محسوس ہوتا حدِ نظر تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ زمرد میں گھاس کے بچھونے پر اُنھیں نیند سی آرہی ہے۔ اور دادا کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ دادا جان کی عیاشی کی محفل نظر آتی تھی۔ ابا جان کا زور و ظلم دکھائی دیتا تھا۔ اُنھیں محسوس ہوتا، اُن کے آنسو اس تاریخ کے صفحوں پر بہنے کو تیار ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اُن کی آنکھوں کے پپوٹوں پر رُکے ہوئے ہیں۔ اُن کے دادا جان کی یہ ادا تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زمین سے اُس وقت تک نہیں گزرتے تھے جب تک کہ وہ زمین خرید نہ لیتے تھے۔ اُن کا یہ ریکارڈ تھا کہ اُنھوں نے آج تک کسی دوسرے کی زمین پر قدم نہیں رکھا۔ اگر راستے میں دوسرے کی زمین کا کچھ حصہ آ بھی گیا تو فوراً اپنے منیم کو حکم دے کر خرید لیا اور پھر آگے بڑھے اِس شان کی مثال نہیں ملے گی۔ ابا جان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ دودھ اور مکھن سے اُن کا جسم طوائفیں ہر صبح دھویا کرتی تھیں۔ اور پانچ مُرغ اور بیس انڈے صرف صبح کی چائے کے ساتھ کھاتے تھے۔ انگریزوں کے لئے اُنھوں نے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ اور پھر خان صاحب کے ٹائٹل سے نوازے گئے۔ ایسی باتیں یاد کرکے اُنھیں کچھ اطمینان ہوتا۔ وہ اُن روایات کو اُن کی اِس حالت میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کم سے کم اُنھیں اِس طرح دیکھیں کہ وہ فلاں میاں کے پوتے اور فلاں میاں کے صاحب زادے ہیں۔ زمینداری چلی گئی تو کیا ہوا۔ خدا حسین تو زندہ ہیں۔ اُن کی حرکتوں سے پریشان ہو کر لوگ کہتے۔

"رسّی جل گئی بل نہیں گئے۔"

"ڈبّہ خالی ہوگیا ہے۔"

"چھوڑی ہوئی باسی ہڈی پڑی ہے۔"

تو وہ اندر ہی اندر جل جاتے۔ اُن کا بس چلتا تو نہ جانے کیا کہتے۔ لیکن اُنھیں خاموش رہنا پڑتا۔ اُن کے وقت کا یہی تقاضا تھا۔

اُن کی بارہ دری میں کچھ تصویریں اور طُغرے لگے ہوئے تھے۔ ایک تصویر تو اُن کے ابا مرحوم کی تھی۔ گھوڑے پر سوار اور کمر میں تلوار۔ ایک طرف برطانوی حکومت کی دی ہوئی سند فریم میں لگی لٹک رہی تھی۔ اور مکڑی کی جالیوں سے لپٹے سنہرے حرفوں میں اِس کا اعلان کر رہی تھی کہ پھیدن میاں کے ابا حضور کو حضور برطانیہ نے خان صاحب کا خطاب کبھی دیا تھا۔ کاغذ میں کیڑے لگ چکے تھے۔ ایک تصویر پھیدن میاں کی تھی۔ مُردہ شیر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں میں اُن کی بندوق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پھیدن میاں نے اپنی جوانی میں ایک شیر مارا تھا۔ اور یہ تصویر اُسی وقت کی یادگار تھی۔ کچھ بزرگوں نے قسم کھا کر یہ بھی بتایا کہ وہ شیر پھیدن میاں نے خود نہیں مارا تھا۔ اُن کے ساتھ شکار میں اُن کا ایک پشاوری دوست تھا جس نے شیر مارا تھا لیکن چونکہ اُس پشاوری دوست کا حقہ پانی پھیدن میاں کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے پاس بندوق کا لائسنس نہیں تھا۔ اور جس بندوق سے اُس نے جنگل میں شیر مارا تھا وہ بندوق پھیدن میاں کی تھی۔ اِس لئے وہ خاموش رہا اور پھیدن میاں نے اپنی فتح اور کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اور ایک زندہ شیر کی طرح شہر میں ایک مُردہ شیر لے کر داخل ہوئے۔ پتہ نہیں حقیقت کیا تھی۔ شکار کی تصویر تو اُن کی فتح کی گواہی ضرور دے رہی تھی۔ بے شمار عربی طغرے لگے ہوئے تھے۔ تصویروں پر مکڑیوں کی جالیاں پھیلی رہتی تھیں۔ پھیدن میاں۔ ۔ ۔ اُن تصویروں اور طغروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے۔ پھیدن میاں کے ایک نوکر تھے الطاف میاں، کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ لکڑی کے سہارے چلتے تھے۔ اُنھوں نے پھیدن میاں کے والد مرحوم کی خدمت کی تھی لیکن اُنھیں اِس خاندان کی پوری تاریخ یاد تھی۔ تاریخ کے بے شمار صفحوں کا اضافہ خود اُنھوں نے کیا تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے، ایک دفتر کھل جاتا تھا۔ لوگ اُن کی باتوں سے اُکتا گئے تھے۔ افیون کے نشے میں عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو سارے شہر میں صرف الطاف میاں تھے جو پھیدن میاں کا دم بھرتے تھے۔ نمک حلالی کا ثبوت دے رہے تھے۔ پھیدن میاں الطاف میاں کے افیون کا انتظام کر دیتے تھے۔ اِس لئے کہ وہی ایک شخص تھے جنھیں دیکھ کر اور جن کی باتیں سُن کر اُنھیں اطمینان ہوتا تھا۔ اور کچھ لمحے کی مسرت حاصل ہو جاتی تھی۔ افیون ملنے میں جب کبھی دیر ہوئی الطاف میاں نے تماشہ کر دیا۔ محلّہ میں پھیدن میاں کی شکایتیں شروع کر دیں۔ اور کہا۔ "باپ دادا والی بات کہاں سے آئے گی؟ وہ لوگ راجہ تھے راجہ" اور جب پھیدن میاں دوسرے لمحے افیون کا انتظام کر دیتے تو اُسی شام الطاف میاں یہ کہتے ہوئے نظر آتے "بانس کی جڑ میں بانس ہوتا ہے۔ راجہ کا بیٹا راجہ ہی" پھیدن میاں جب کسی وجہ سے مایوس اور اُداس رہتے اور خود ماضی کو گنگنا...

تک جاتے تھے اور کوئی خاص مزہ نہ آتا۔ تو الطاف میاں کو افیون ضرور کھلاتے تھے وہ پھر طبیعت میں گرمی آتی اور الطاف میاں پھیدن میاں کو اُن کی تاریخ سناتے تو اپنے کھیے ہوئے صفحے بھی پڑھتے اور بتاتے کہ کتنی پشتوں سے یہ ٹھاٹ چلا آرہا ہے۔ اور یہ ٹھاٹ کبھی ختم نہ ہوگا۔ آج زمینداری گئی ہے تو کیا ہوا۔ کل انگریز پھر آجائیں گے۔ اور زمینداری مل جائے گی۔ پھر حویلی اُسی طرح آباد رہے گی۔ بارہ دری میں انگوری کے دَور چلیں گے۔ گھونگھروؤں کی جھنکار سے اُس کی فضا گونجے گی۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے جائیں گے۔ اور دُنیا پھیدن میاں کی شان دیکھے گی۔ پھیدن میاں نہ جانے کیوں بعض حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی بچوں کی طرح الطاف میاں کی باتیں سُننے لگتے۔ اور انھیں کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

ایک بار شہر میں چیچک کی وبا پھیلی۔ اور پھیدن میاں کی بیگم کا اس مرض میں انتقال ہو گیا۔ انھیں کافی صدمہ پہنچا۔ گئے زمانے کو یاد کر کے خوب روئے۔ اُن کیلئے حویلی میں اب کوئی کشش نہ رہی۔ گھر میں صرف اب الطاف میاں رہ گئے تھے جو افیون کی خاطر میٹھی میٹھی تسلیاں دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ اور الطاف میاں نے پھیدن میاں کو اس کا احساس دلا ہی دیا کہ وہ ابھی بُوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کی عمر کے لوگ پہلوانی کرتے ہیں، سفید بال کا سوال تو آجکل کے نوجوانوں کے بال بھی پکنے لگے ہیں۔ خوشبودار انگریزی تیل لگانے سے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں۔ اب سفید بال بڑھاپے کے نشان نہیں ہے۔ الطاف میاں نے بتایا کہ جب وہ پندرہ برس کے تھے تو اُن کے بال پکنے شروع ہو گئے تھے۔ پھیدن میاں پر اِن باتوں کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی گیا۔ اپنی جوانی کا احساس تو نہیں ہوا لیکن یہ ضرور محسوس ہوا کہ وہ تگڑے قسم کے انسان ہیں۔ اور اُن کے جسم کے خون میں بڑی گرمی ہے۔ الطاف میاں کی اِن باتوں میں رفتہ رفتہ بہت کشش محسوس ہونے لگی۔ اور اُن کے حقّہ پانی اور افیون کا انتظام اور اچھا ہو گیا۔

پھیدن میاں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ میں پھر کچھ فرق آیا۔ بال سنور گئے۔ خوشبودار تیل مارکیٹ سے آئے۔ اکثر فلمیں دیکھی گئیں۔ حویلی میں کبھی کبھی مست قسم کے قوّال بھی آئے۔ اُنھوں نے کچھ اپنی دلّالی اور کچھ مکان کے دوسرے حصّے کے کرائے سے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اُن کا رنگ بدل رہا تھا اور دوسری طرف اُن کے بڑے مکان کا۔ وہ خوبصورت بن رہے تھے اور مکان پر کوڑھ کے دھبّے پڑ رہے تھے۔ مکان کی دیواریں جا بجا پھٹ گئیں۔ ایک طرف تعمیر ہو رہی تھی اور دوسری طرف تخریب۔ عجیب عالم تھا۔ مکان کی بنیاد بھی کمزور ہو رہی تھی۔ دیواریں ٹوٹنے والی تھیں اور پھیدن میاں الطاف میاں کی باتوں سے لُطف اندوز ہو کر سوچ رہے تھے "ظہورن کی لڑکی کلثوم . . . . " مکان کا ایک ستون گر گیا، ایک دیوار گر گئی۔ پورا مکان خطرے میں پڑ گیا۔ کرایہ دار نے مکان چھوڑ دیا۔ اور ظہورن کی لڑکی کلثوم کا خیال بھی خیال ہی بن کر رہ گیا۔

دسمبر کی سردی تھی۔ اُس بار سردی زیادہ پڑی تھی۔ برف سی ٹھنڈک کو الطاف میاں کا جسم برداشت نہ کر سکا۔ فالج نے اُن کے کمزور جسم پر حملہ کر دیا۔ پھیدن میاں کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بارہ دری برف کے نیچے دب گئی ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد کی تاریخ کے صفحے اُڑنے والے ہیں۔ اُن کی علالت نے پھیدن میاں کا دماغ چکرا دیا۔ اُن کی گھبراہٹ ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا، اُن کی کائنات ڈُوبی جا رہی ہے۔ الطاف میاں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ الطاف میاں اُن کے پُرانے نوکر تھے لیکن وہ جو کچھ کر رہے تھے ایک نوکر کے لئے نہیں کر رہے تھے۔ الطاف میاں کے ساتھ اُن کی مہربانیوں کی جو وجہ تھی وہ اُسے جانتے تھے۔ ایک خاص قسم کے سکون اور ایک خاص قسم کی تسکین کے لئے اُنھیں الطاف میاں کے لئے کچھ کرنا پڑتا تھا۔ الطاف میاں کی علالت نے اداس سائے پھیلا دیئے۔ پھیدن میاں کی آنکھیں سہمی سہمی سی تھیں۔ اُنھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے سینے میں آگ لگ رہی ہے۔ والد مرحوم کے انتقال کے وقت بھی اُن کی یہ حالت نہ ہوئی تھی۔ رفیقۂ حیات کی جدائی نے بھی ایسا غم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے الطاف میاں زندہ ہیں ہڈی کا یہ ڈھانچہ کھڑا رہے۔ بولتا رہے۔ باتیں بناتا رہے۔ یہ انسانی ڈھانچہ پھیدن میاں کی رُوح میں گیتوں کا لمس گھولتا رہا تھا لیکن فالج گرنے کے چار روز بعد الطاف میاں انتقال کر گئے۔ دل کی پستی سے چاند کے پہاڑوں تک درد کا دُھواں پھیل گیا۔ الطاف میاں اپنے ساتھ سب کچھ لے گئے۔ تاریخ کے نایاب صفحے، عود و عنبر میں لپٹی ہوئی جنت تبسم کی شراب، مہوے کے زرد پھول۔ سکون، قرار، اطمینان، ڈھارس، نصیحت، شفقت، محبت۔ پھیدن میاں کو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہیں۔ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ تب کیا تھا کل بھی ختم ہو چکے تھے کبھی بھی سمجھتے "مجھ میں اور باسی ہڈی میں فرق ہی کیا ہے؟"

[illegible] افسانوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب [illegible] اِن افسانوں پر نظر ڈالتے تھے تو اپنی تھکن بھول جاتے تھے۔ انھیں محسوس ہوتا [illegible] حدِ نظر تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ زمرّدیں گھاس کے بچھونے پر انھیں نیند سی آرہی ہے۔ اور دادا کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دادا جان کی عیاشی کی محفل نظر آتی تھی۔ ابّا جان کا زور و ظلم دکھائی دیتا تھا۔ انھیں محسوس ہوتا، اُن کے آنسو اس تاریخ کے صفحوں پر بہنے کو تیار ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اُن کی آنکھوں کے پپوٹوں پھڑکے ہوئے ہیں۔ اُن کے دادا جان کی یہ ادا تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زمین سے اُس وقت تک نہیں گزرتے تھے جب تک کہ وہ زمین خرید نہ لیتے تھے۔ اُن کا یہ ریکارڈ تھا کہ انھوں نے آج تک کسی دوسرے کی زمین پر قدم نہیں رکھا۔ اگر راستے میں دوسرے کی زمین کا کچھ حصہ آ بھی گیا تو فوراً اپنے منیم کو حکم دے کر خرید لیا اور پھر آگے بڑھے اِس شان کی مثال نہیں ملے گی۔ ابّا جان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ دُودھ اور مکھن سے اُن کا جسم طوائفیں ہر صبح دھویا کرتی تھیں اور پانچ مرغ اور بیس انڈے صرف صبح کی چائے کے ساتھ آتے تھے۔ انگریزوں کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ اور پھر خان صاحب کے ٹائیٹل سے نوازے گئے۔ ایسی باتیں یاد کرکے انھیں کچھ اطمینان ہوتا۔ وہ اُن روایات کو اُن کی اِس حالت میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کم سے کم انھیں اس طرح دیکھیں کہ وہ فلاں میاں کے پوتے اور فلاں میاں کے صاحب زادے ہیں۔ زمینداری چلی گئی تو کیا ہوا۔ خدا حسین تو زندہ ہیں۔ اُن کی حرکتوں سے پریشان ہو کر لوگ کہتے۔

"رسّی جل گئی بل نہیں گئے۔"

"ڈبیہ خالی ہو گیا ہے۔"

"چھچھوڑی ہوئی باسی ہڈی پڑی ہے۔"

تو وہ اندر ہی اندر جل جاتے۔ اُن کا بس چلتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ لیکن انھیں خاموش رہنا پڑتا۔ اُن کے وقت کا یہی تقاضا تھا۔

اُن کی بارہ دری میں کچھ تصویریں اور طغرے لگے ہوئے تھے۔ ایک تصویر تو اُن کے ابّا مرحوم کی تھی۔ گھوڑے پر سوار اور کمر میں تلوار۔ ایک طرف برطانوی حکومت کی دی ہوئی سند فریم میں لگی لٹک رہی تھی۔ اور مکڑی کی جالیوں سے لپٹی سنہرے حرفوں میں اِس کا اعلان کر رہی تھی کہ پھیدن میاں کے ابّا حضور کو حضورِ برطانیہ نے خان صاحب کا خطاب بھی دیا تھا۔ کاغذ میں کیڑے لگ چکے تھے۔ ایک تصویر پھیدن میاں کی تھی۔ مُردہ شیر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں میں اُن کی بندوق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پھیدن میاں نے اپنی جوانی میں ایک شیر مارا تھا۔ اور یہ تصویر اُسی واقعہ کی یادگار تھی۔ کچھ بزرگوں نے قسم کھا کر یہ بھی بتایا کہ وہ شیر پھیدن میاں نے خود نہیں مارا تھا۔ اُن کے ساتھ شکار میں اُن کا ایک پشاوری دوست تھا جس نے شیر مارا تھا لیکن چونکہ اُس پشاوری دوست کا حقہ پانی پھیدن میاں کے ہاتھ میں تھا اور اُس کے پاس بندوق کا لائسنس نہیں تھا۔ اور جس بندوق سے اُس نے جنگل میں شیر مارا تھا وہ بندوق پھیدن میاں کی تھی۔ اِس لئے وہ خاموش رہا اور پھیدن میاں نے اپنی فتح اور کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اور ایک زندہ شیر کی طرح شہر میں ایک مُردہ شیر لے کر داخل ہوئے۔ پتہ نہیں حقیقت کیا تھی۔ شکار کی تصویر تو اُن کی فتح کی گواہی ضرور دے رہی تھی۔ بے شمار عربی طغرے لگے ہوئے تھے۔ تصویروں پر مکڑیوں کی جالیاں پھیلی رہتی تھیں۔ پھیدن میاں۔۔۔ اُن تصویروں اور طغروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے۔ پھیدن میاں کے ایک نوکر تھے الطاف میاں، کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ لکڑی کے سہارے چلتے تھے۔ انھوں نے پھیدن میاں کے والد مرحوم کی خدمت کی تھی لیکن انھیں اِس خاندان کی پوری تاریخ یاد تھی۔ تاریخ کے بے شمار صفحوں کا اضافہ خود انھوں نے کیا تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے، ایک دفتر کھل جاتا تھا۔ لوگ اُن کی باتوں سے اُکتا گئے تھے۔ افیون کے نشے میں عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو سارے شہر میں صرف الطاف میاں تھے جو پھیدن میاں کا دم بھرتے تھے۔ نمک حلالی کا ثبوت دے رہے تھے۔ پھیدن میاں الطاف میاں کے افیون کا انتظام ضرور کر دیتے تھے۔ اِس لئے کہ وہی ایک شخص تھے جنھیں دیکھ کر اور جن کی باتیں سُن کر انھیں اطمینان ہوتا تھا۔ اور کچھ لمحے کی مسرت حاصل ہو جاتی تھی۔ افیون ملنے میں جب کبھی دیر ہوئی الطاف میاں نے تماشہ کر دیا۔ محلّے میں پھیدن میاں کی شکایتیں شروع کر دیں۔ اور کہا۔ "باپ دادا والی بات کہاں سے آئے گی؟ وہ لوگ راجہ تھے راجہ!" اور جب پھیدن میاں دوسرے لمحے افیون کا انتظام کر دیتے تو اُسی شام الطاف میاں یہ کہتے ہوئے نظر آتے "بانس کی جڑ میں بانس ہوتا ہے۔ راجہ کا بیٹا راجہ ہی ہوگا۔" پھیدن میاں جب کسی وجہ سے مایوس اور اُداس رہتے اور خود ماضی کو گنگنانے لگتے

شک جاتے تھے اور کوئی خاص مزہ نہ آتا۔ تو الطاف میاں کو افیون ضرور کھلاتے تھے اور پھر جلد ہی گرمی آتی اور الطاف میاں پھیدن میاں کو اُن کی تاریخ سُناتے شجرے کے ہوئے صفحے بھی پڑھتے اور بتاتے کہ کئی پُشتوں سے یہ شجرہ پایا ہوا آرہا ہے۔ اور یہ شجرہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ تمہاری زمینداری گئی ہے تو کیا ہوا۔ کل انگریز پھر آجائیں گے۔ اور زمینداری مل جائے گی۔ پھر حویلی اسی طرح آباد رہے گی۔ بارہ دری میں انگوری کے دور چلیں گے۔ گھونگھروؤں کی جھنکار سے اُس کی فضا گونجے گی۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے جائیں گے۔ اور دُنیا پھیدن میاں کی شان دیکھے گی۔ پھیدن میاں نہ جانے کیوں بعض حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی بچوں کی طرح الطاف میاں کی باتیں سُننے لگتے۔ اور اُنھیں کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

ایک بار شہر میں چیچک کی وبا پھیلی۔ اور پھیدن میاں کی بیگم کا اس مرض میں انتقال ہو گیا۔ اُنھیں کافی صدمہ پہنچا۔ گئے زمانے کو یاد کر کے خوب روئے۔ ان کیلئے حویلی میں اب کوئی کشش نہ رہی۔ گھر میں صرف اب الطاف میاں رہ گئے تھے جو افیون کی خاطر میٹھی میٹھی تسلیاں دے رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ اور الطاف میاں نے پھیدن میاں کو اس کا احساس دلا ہی دیا کہ وہ ابھی بُوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کی عمر کے لوگ پہلوانی کرتے ہیں، رہ گیا بال کا سوال تو آجکل کے نوجوانوں کے بال بھی پکنے لگے ہیں۔ خوشبودار انگریزی تیل لگانے سے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں۔ اب سفید بال بڑھاپے کے نشان نہیں ہے۔ الطاف میاں نے بتایا کہ جب وہ پندرہ برس کے تھے تو اُن کے بال پکنے شروع ہو گئے تھے۔ پھیدن میاں پر اِن باتوں کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی گیا۔ اپنی جوانی کا احساس تو نہیں ہوا لیکن یہ ضرور محسوس ہوا کہ وہ تگڑے قسم کے انسان ہیں۔ اور اُن کے جسم کے خون میں بڑی گرمی ہے۔ الطاف میاں کی اِن باتوں میں رفتہ رفتہ بہت کشش محسوس ہونے لگی۔ اور اُن کے حقہ پانی اور افیون کا انتظام اور اچھا ہو گیا۔

پھیدن میاں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ میں پھر کچھ فرق آیا۔ بال سنور گئے۔ خوشبودار تیل مارکیٹ سے آئے۔ اکثر فلمیں دیکھی گئیں۔ حویلی میں کبھی کبھی مست قسم کے قوال بھی آئے۔ اُنھوں نے کچھ اپنی دلالی اور کچھ مکان کے دوسرے حصّے کے کرائے سے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف اُن کا رنگ بدل رہا تھا اور دوسری طرف اُن کے بڑے مکان کا۔ وہ خوبصورت بن رہے تھے اور مکان پر کوڑھ کے دھبّے پڑ رہے تھے۔ مکان کی دیواریں جا بجا پھٹ گئیں۔ ایک طرف تعمیر ہو رہی تھی اور دوسری طرف تخریب۔ عجیب عالم تھا۔ مکان کی بنیاد بھی کمزور ہو رہی تھی۔ دیواریں ٹوٹنے والی تھیں اور پھیدن میاں الطاف میاں کی باتوں سے لُطف اندوز ہو کر سوچ رہے تھے "ظہورن کی لڑکی کلثوم . . . . " مکان کا ایک ستون گر گیا، ایک دیوار گر گئی۔ پورا مکان خطرے میں پڑ گیا۔ کرایہ دار نے مکان چھوڑ دیا۔ اور ظہورن کی لڑکی کلثوم کا خیال بھی خیال ہی بن کر رہ گیا۔

دسمبر کی سردی تھی۔ اِس بار سردی زیادہ پڑی تھی۔ برف سی ٹھنڈک کو الطاف میاں کا جسم برداشت نہ کر سکا۔ فالج نے اُن کے کمزور جسم پر حملہ کر دیا۔ پھیدن میاں کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بارہ دری برف کے نیچے دب گئی ہے۔ اُن کے آبا و اجداد کی تاریخ کے صفحے اُڑنے والے ہیں۔ اُن کی علالت نے پھیدن میاں کا دماغ چکرا دیا۔ اُن کی گھبراہٹ ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اُنھیں محسوس ہو رہا تھا، اُن کی کائنات ڈوبی جا رہی ہے۔ الطاف میاں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ الطاف میاں اُن کے پُرانے نوکر تھے لیکن وہ جو کچھ کر رہے تھے ایک نوکر کے لئے نہیں کر رہے تھے۔ الطاف میاں کے ساتھ اُن کی مہربانیوں کی جو وجہ تھی وہ اُسے جانتے تھے۔ ایک خاص قسم کے سکون اور ایک خاص قسم کی تسکین کے لئے اُنھیں الطاف میاں کے لئے کچھ کرنا پڑتا تھا۔ الطاف میاں کی علالت نے اُداس سائے پھیلا دیئے۔ پھیدن میاں کی آنکھیں سہمی سہمی سی تھیں۔ اُنھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے سینے میں آگ لگ رہی ہے۔ والد مرحوم کے انتقال کے وقت بھی اُن کی یہ حالت نہ ہوئی تھی۔ رفیقۂ حیات کی جدائی نے بھی ایسا غم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے الطاف میاں زندہ رہیں ہڈی کا یہ ڈھانچہ کھڑا رہے۔ بولتا رہے۔ باتیں بناتا رہے۔ یہ انسانی ڈھانچہ پھیدن میاں کی رُوح میں گیتوں کا رس گھولتا رہا تھا لیکن فالج گرنے کے چار روز بعد الطاف میاں انتقال کر گئے۔ دل کی پستی سے چاند کے پہاڑوں تک درد کا دُھواں پھیل گیا۔ الطاف میاں اپنے ساتھ سب کچھ لے گئے۔ تاریخ کے نایاب صفحے، عود و عنبر میں لپٹی ہوئی جنت تبسم کی شراب، ہوے کے زرد پھول۔ سکون، قرار، اطمینان، ڈھارس، نصیحت، شفقت، محبت۔ پھیدن میاں کو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہیں۔ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ رسی کے ساتھ بل بھی ختم ہو چکے تھے کبھی کبھی سوچتے "مجھ میں اور باسی ہڈی میں فرق ہی کیا ہے؟"

اُس کو چھوڑا جگ کو پکڑا اِس من کو سمجھائے کون
مورکھ اِتنی بات نہ جانا اپنے کون پرائے کون

غزل

از

جناب نثار اٹاوی، ایم۔ اے

کوئی نہیں ہے میت کسی کا آنسو مفت بہائے کون
اِس کنکر پتھر کی دُنیا میں موتی برسائے کون

میں ہوں مِٹّی تُو ہے سونا میرا تیرا جوڑ نہیں
میں ہوں دھرتی تُو چندرما، چندرما، چھُو پائے کون

لیک تو وہ مدھ ماتی آنکھیں پھر اُس پر کاجل کی باڑھ
اور قیامت بن جائیں گی کچی نیند جگائے کون

آج پرکھ ہے میخانے میں بڑے بڑے متوالوں کی
جیون ہے اِک بِس کا پیالہ، دیکھیں ہاتھ بڑھائے کون

تارے ڈوبے، چندر کرن کی ریشم ڈوری ٹوٹ گئی
اے میرے سپنوں کی رانی جھُولا تجھے جھُلائے کون

آنکھ لڑی نظریں ٹکرائیں بجلی سی اِک کوند گئی
کِس کے من میں آگ لگی، دیکھیں پہلے مُسکائے کون

اُن ہونٹوں سے امرت پی کر ساغر مجھ تک آیا ہے
دیکھیں میرے پیمانے سے پیمانہ ٹکرائے کون

اِک اَن دیکھے انجانے سے جوڑی تُو نے پریت نثارؔ
من کے دُوار کھُلے رہنے دے کیا جانے، کب آئے کون

افسانہ

دوزخ

از

جناب یونس احمد ایم۔ اے

ڈھاکہ ——— مئی ۱۹۵۶ء

خوشتر بھائی! خلوص و محبت

گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ نادم ہوں کہ بر وقت جواب نہ دے سکا۔ دنیاوی ہنگامے کب پیچھا چھوڑتے ہیں۔ سو فیصدی حقائق پر مبنی افسانہ ارسال کر رہا ہوں۔ پٹ سن مشرقی پاکستان کی خاص پیداوار ہے۔ لیکن بڑے بڑے تاجر غریب اور بے زبان کاشتکاروں کو کس کس طرح لوٹتے اور اپنے شکنجوں میں جکڑتے ہیں اس کا ہلکا سا عکس میں نے پیش کیا ہے، ——— ان دنوں اپنی زندگی خود ایک طویل مختصر افسانہ بنی ہوئی ہے۔ اس لئے افسانہ لکھنے کا موڈ پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد کراچی جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد خط لکھوں گا۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز کیش

یونس احمد

ڈھاکے سے نرائن گنج کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ٹیکسی والے کو ایک روپیہ دیجیے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر آپ اپنے کو وہاں پائیں گے لیکن ٹیکسی سے کہیں زیادہ لطف لانچ پر آتا ہے۔ اور وہ بھی برسات کے موسم میں جب گھٹائیں چھائی ہوں اور بوڑھی گنگا اور سیتا لکھیا کی سطح تک پانی آگیا ہو۔

پچھلے سال کی بات ہے

حامد کی پوسٹنگ نرائن گنج تھی اور قیام ڈھاکہ میں۔ اس لئے وہ تقریباً روزانہ ڈھاکے سے نرائن گنج جایا کرتا تھا۔ برسات شروع ہو چکی تھی۔ روزانہ گھٹائیں گھر کر آتیں۔ رم جھم ہوتی۔ پھر بادل صاف ہو جاتے۔ وہ کالی گھٹاؤں کو دیکھتا تو گنگنانے لگتے۔ اور تھوڑی ہی دیر کے اندر ایسا محسوس کرتا جیسے وہ مادی تفکرات سے بالکل آزاد ہو گیا ہے۔ سال میں چھ مہینے برسات ہی کا اثر ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشندے خواہ وہ ان پڑھ ہوں یا پڑھے لکھے، جوان ہوں یا بوڑھے فطرتاً شعر و نغمہ سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اُدھر گھٹائیں گھر کر آئیں، اِدھر بچوں نے ناچنا شروع کیا۔ جوان لڑکیوں کے پیلے من میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ بوڑھے اپنے بیتے دن یاد کرنے لگے۔ اور جوانوں کی آنکھیں کسی کو چوری چھپے بلانے لگیں۔

آمینہ کا دل بھی گھٹاؤں کی طرح بہت جذباتی اور بارش کی بوندوں کی طرح صاف و شفاف تھا۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد جو چیز سب سے پہلے دیکھی وہ بارش ہی تھی۔ اور اس کے کانوں میں سب سے پہلی آواز ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ اور دھم دھم گرنے والے اولوں کی تھی۔

آمینہ کا باپ رزاق پٹ سن کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا، بادل اور پانی ہی اس کی کائنات رہے۔ رزاق نرا جاہل تھا لیکن

محنت کرنے میں گاؤں کے کڑیل جوان بھی اُس کے آگے مات کھا جاتے تھے۔ اِس وقت اُس کی عمر پچاس کو پہنچ چکی تھی۔ امینہ جب دس سال کی ہوئی اُس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور آج وہ چودہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ چار یا پانچ سال سے رزاق امینہ کے ساتھ جس محبت و شفقت کا برتاؤ کرتا چلا آرہا تھا، اُسی کا نتیجہ تھا کہ امینہ کو اپنی ماں کی عدم موجودگی کا بہت زیادہ احساس نہیں ہوا۔ رزاق کی سادہ لوحی گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ گاؤں والوں کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی وہ رزاق کے پاس پہنچ جاتے، اپنا دُکھڑا بیان کرتے اور وہ اُن کی مدد کرنے کو فوراً تیار ہو جاتا۔

شام کا وقت گاؤں والوں کے لئے بہت ہی سہانا ہوتا ہے۔ وہ دُنیا کے سارے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ناچ گانوں کا سماں بندھ جاتا ہے۔ اِن باتوں کے لئے رزاق کا جھونپڑا سارے گاؤں میں مشہور تھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد گاؤں کے تمام لوگ اُس کے گھر پر آجاتے۔ محفلیں جمتیں۔ گانوں کا دور شروع ہوتا۔ ڈھولک کی تال پر دو چار منچلے جوان ناچنے اور تھرکنے لگتے۔ اور رزاق میاں اپنے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔

رزاق میاں کی اِس روز روز کی فیاضی سے امینہ کبھی کبھی برہم ہو جاتی اور دل پر جبر کر کے کہہ ڈالتی۔

"بابا! آپ اپنا کشادہ ہاتھ تنگ نہیں کریں گے تو گھر پر کچھ پس انداز نہیں ہو سکتا۔"

رزاق، امینہ کی اِن باتوں کو ہنسی میں اُڑا دیتا۔

وہ کہتا۔

"جان ہے تو جہان ہے۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد شام کو دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ طبیعت نہ بہلاؤں تو جینا مشکل ہو جائے گا امینہ۔ گھر بار کی فکر ضرور کرنی چاہیئے۔ تو میں اس سے غافل نہیں ہوں۔"

رزاق کی یہ باتیں سُنکر امینہ خاموش ہو جاتی۔ وہ کہتی بھی کیا۔ وہ تو گاؤں کی شرمیلی لڑکی تھی۔ اُس کے لب ہمیشہ سلے رہتے۔ آنکھیں جھکی رہتیں۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی۔ اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ اپنے بڑوں سے بات کرتے وقت آنکھیں ہمیشہ نیچی رکھنی چاہئیں۔

امینہ چودہ پندرہ سال کی الھڑ لڑکی ہی لیکن کبھی کبھی جب آدھی رات کو تُند ہواؤں کے جھکڑ چلتے اور پھر اِس کے بعد مُوسلا دھار بارش شروع ہو جاتی تو اُس کے معصوم دل کو کسی چیز کی چاہت ہوتی۔ کبھی آپ ہی آپ شرما جاتی اور کبھی لالٹین کی روشنی تیز کر کے کچھ سوچنے لگتی لیکن اُس کے جذبات کی بلاخیزی اُس وقت ختم ہو جاتی جب اُس کے ذہن میں ماں کا تصور آجاتا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی!

پٹ سن کی بُوائی ختم ہو چکی تھی۔ اور رزاق کے پاس بہت سارے تاجر روزانہ اُسے شیشے میں اُتارنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

کوئی کہتا۔

"رزاق میاں تمھاری جھولی بھر دوں گا میرے لئے اِتنی گانٹھیں رکھ دینا۔"

اور کوئی اُسے اِس طرح لالچ دیتا۔

"کب تک افلاس کی گود میں ماتم کرتے اور کراہتے رہو گے؟ زیادہ سے زیادہ پٹ سن کاشت کرو تو دولت تمھارے گھر کی لونڈی بن جائے گی۔"

بے چارہ رزاق اُن کی باتیں سُنتا اور کبھی کبھی دل ہی دل میں خوش ہو کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔

"یہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میرے پاس کاشت کرنے کی زمین کافی ہے میں زیادہ کاشت کروں گا تو پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔"

پٹ سن کے پودے بڑھنے لگے تھے۔ کھیت لہلہانے لگے۔ رزاق کی آنکھوں میں مسرتوں کی ہزاروں قندیلیں روشن ہو گئیں۔ وہ اپنے کھیت کی طرف دیکھتا اور امینہ سے کہتا۔

"بیٹی امینہ! اِس فصل میں میں تمھارے سارے زیورات بنا دوں گا فکر نہ کرو۔ ہاں تمھیں جن جن چیزوں کی ضرورت ہو مجھے ایک فہرست دے دو۔"

امینہ کہتی۔

"ابا جان! پہلے پیسے آجائیں تو میں آپ کو فہرست دے دوں گی۔"

"ارے پگلی تُو تو میری باتوں کو ہنسی میں اُڑا دیتی ہے۔ دیکھتی نہیں اِس

بیسویں صدی دہلی

جولائی ۱۹۵۵ء

ہندوستان اور پاکستان کے لئے فی پرچہ

آٹھ آنے

جلد ۱۹

نمبر ۷

سالانہ قیمت مع محصول ڈاک
ہندوستان اور پاکستان کے لئے

پانچ روپے

ششماہی

تین روپے

ممالک غیر سے سالانہ قیمت

۹ شلنگ

ٹیلیفون دفتر

۲۶۶۳۷

ٹیلیفون ہاؤس

۴۸۰۲۵

ایڈیٹر

خوشتر گرامی

پتہ :- بیسویں صدی۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی

…اشت کتنی اچھی ہوتی ہے۔ اور پھر تاجروں نے میری خوشامد بھی شروع کر …ہے۔"

"بابا پٹ سن کی کٹائی ہونے دیجئے پہلے۔"

"ارے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے فرصت دے دے ۔ ۔ ۔ ہاں تجھے کانوں کے …ے، چاندی کی چوڑیاں، گلے کا ہار اور انگشتری چاہیئیں۔ میں سب بنوا دوں …بس چند دن اور انتظار کرو۔ اچھا چلم تو بھر لاؤ۔ دیکھو بادل پھر گھر کر آگئے۔ …ب سے کالی گھٹائیں پھر اُمڈتی چلی آرہی ہیں۔ بہت ہی زور کی بارش ہوگی۔"

"ابا جان! ایک بات کہوں؟"

امینہ نے بہت چاؤ سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی!" اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ میرے زیور اور گہنے کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں؟ یہ چیزیں کوئی …ضروری تو نہیں۔"

"تو نادان ہے امینہ۔ تجھے کیا معلوم کہ جب تیرا بیاہ رچایا جائے گا تو …زیوروں کی قیمت کتنی بڑھ جائے گی۔ اچھا اب جا۔ چلم بھر لا۔"

امینہ چلی گئی۔ وہ اپنے باپ کی اس بے چینی اور پریشانی کی تہہ تک …یں پہنچ سکی۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ شادی بیاہ میں زیور کی ضرورت کیوں …ے گی۔ شادی کا تصور بھی اس کے ذہن میں پختہ نہیں ہوا تھا۔

نرائن گنج سے حامد کا تبادلہ منشی گنج ہوگیا۔ یہاں پٹ سن کے کھیت …ر دور تک نظر آتے ہیں۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے کھیت۔ اس کا …ی یہاں جلد ہی گھبرا گیا۔ دن رات بارش کی جھڑی سے طبیعت بھنا گئی۔ نہ کہیں …ا نہ جانا۔ صرف پٹ سن کے گودام میں رہنا یا پھر کسانوں کو بہلانا پھسلانا۔ کبھی …ی رزاق آجاتا تو اس سے خوب باتیں ہوتیں۔ کیونکہ حامد کا مقصد اس کے …تھ وابستہ تھا۔

رزاق کی سادہ لوحی سے نہ صرف حامد ہی فائدہ اٹھاتا تھا۔ دوسرے …ر بھی اونے پونے دام دے کر اس کی دولت بٹور کرلے جاتے تھے۔ منشی گنج آئے …ے حامد کو تین چار مہینے ہو چکے تھے۔ وہ یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ رزاق برابر اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

"حضور کبھی میرے بھی گھر آئیے۔ آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ دل گھبرا جاتا ہوگا آپ کا۔ میرے گھر کے ایک طرف بڑا سا باغ بھی ہے۔ جس میں پھلوں کے درخت ہیں اور سبزیوں کے پودے بھی۔ آپ کی طبیعت بہت خوش ہوگی اس باغ کو دیکھ کر۔"

لیکن حامد جواب میں صرف اتنا کہہ دیتا۔

"رزاق میاں! کبھی ضرور آؤں گا۔ میرا دل اکیلے میں واقعی گھبرا گیا ہے۔"

اور ایک دن اپنے ہی مقصد کے تحت حامد کو اس کے گھر جانا پڑا۔ پٹ سن کی کٹائی ہونے والی تھی اور حامد چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سستی قیمت پر اس سے پٹ سن حاصل کرلیا جائے۔ جب وہ اس کے گھر پہنچا، رزاق دیکھتے ہی نہال ہوگیا۔ خوشی سے آنکھیں چمکنے لگیں۔ اپنے کمرے سے ملے ہوئے کشادہ دالان میں چٹائی بچھادی۔ حامد اس پر بیٹھ گیا۔ رزاق نے حامد کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس نے آخر کار اُسے نواز ہی دیا۔

اس نے وہیں سے امینہ کو آواز دی۔

"بیٹی چلم لے آنا۔ اور کچھ کیلے اور سپاری بھی۔"

یہ کہہ کر وہ حامد سے مخاطب ہوگیا۔

"آپ کو تمباکو کا تو شوق ہوگا؟"

اگرچہ تمباکو سے حامد کو شروع ہی سے نفرت رہی ہے۔ لیکن وہ انکار نہ کرسکا۔ اس نے کہہ دیا۔

"ارے بھئی تمباکو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ رزاق میاں کیلے وغیرہ نہ منگواؤ میں کش لگاؤں گا بہت شوق سے۔"

لیکن رزاق میاں ایسے مصر ہوئے کہ حامد کی زبان بند ہوگئی۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ امینہ نے آواز دی۔

"بابا لے جائیے چلم اور کیلے۔"

رزاق میاں اٹھ کر گئے اور دونوں چیزیں لے آئے۔ بولے "معاف کیجئے گا۔ غریب آدمی ہوں۔ بھلا آپ کی خاطر و مدارات کیا کرسکتا ہوں۔"

پٹ سن کا ذکر آ گیا تو حامد نے رزاق میاں کی خوب خوب تعریف کر دی کہا ــــــ

"رزاق میاں! تمہارا پٹ سن کا کیا مقابلہ۔ کیوں نہ ہو۔ آخر پرانا تجربہ جو ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ رزاق میاں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور حامد نے جب محسوس کر لیا کہ وہ اُس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ تو کہنے لگا۔

"رزاق میاں! اس بار مُنہ مانگے دام دوں گا۔ خوش ہو جاؤ گے لیکن ایک بات کا خیال رکھو۔ دوسرے کاشتکاروں کے مقابلے میں ذرا سستا بیچو۔ تو میں اکیلا ہی سارا پٹ سن خرید لوں گا۔"

اتنا کہہ کر حامد نے بات پلٹ دی اور کہا۔

"ہاں رزاق میاں! ذرا اپنا باغ تو دکھا دو۔"

اتنا سُننا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"آیئے آیئے!"

دونوں باغ کی طرف چل پڑے۔ باغ اُس کے مکان سے بالکل متصل تھا۔ کیلے کے درخت بہت ہی قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ حامد نے آم، جامن اور کٹھل کے بھی درخت دیکھے۔ دوسری طرف سبزیوں کے پودے لہلہا رہے تھے ایک طرف مرغیوں کا قافلہ بھی دیکھنے میں آیا۔

حامد دیکھنے میں محو تھا کہ رزاق میاں نے کہا۔

"دیکھئے، یہ ہے میری بچی امینہ۔"

حامد کی نگاہیں کیلے کے درخت سے ہٹ کر امینہ کو دیکھنے لگیں۔ گاؤں کی سادی سلونی لڑکی۔ کچھ حیا، کچھ پردہ، کچھ معصومیت!

رزاق نے کہا۔

امینہ جب دس سال کی تھی اس کی ماں دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔ اُسے رخصت ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن میں اس کے لئے ایک زیور بھی نہ بنوا سکا۔ اس کی ماں نے مرتے وقت تاکید کی تھی کہ پٹ سن کی فروخت سے جتنے پیسے ملیں اُن سے میری بچی کے لئے زیور بناتے رہنا۔ لیکن سارے پیسے قرض خواہوں کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں اور دل کی آرزو دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ اس بار تو میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس کے سارے زیور اکٹھے ہی بنوا دوں گا۔"

حامد نے اُس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس بار تو تمہیں پیسے بھی کافی ملیں گے۔ اس کی شادی بہت دھوم دھام سے رچانا۔"

زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ امینہ وہاں سے بھاگ گئی۔ جیسے اُسے شادی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ اُسے جلد ہی اس گھر سے دُوسرے گھر جانا ہے۔

رزاق میاں بہت دیر تک حامد کو اپنی داستان سُناتے رہے۔ لیکن اُسکے ذہن میں اُس کی داستان سے کہیں زیادہ پٹ سن کی خریداری کی فکر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسے بھی ہو اسے بہلا پھسلا کر اتنے سستے دام میں اس سے سارے پٹ سن خرید لے کہ اُسے کم سے کم تین چار ہزار روپے بچ جائیں۔ کیونکہ اُسے بھی جلد ہی شادی کرنی ہے۔ وہ اپنے دوست احباب سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ اس سال ضرور شادی کرے گا۔ وہ اپنی منگیتر کے لئے پچھلے سال کے منافع سے زیورات بنا چکا ہے۔

اس موسم میں پٹ سن کی کاشت مانگ سے کہیں زیادہ ہوئی تھی۔ اس لئے کٹائی ہوتے ہوئے قیمتیں توقع سے کہیں زیادہ گر گئیں۔ حامد جیسے تاجروں کی بن آئی۔ اور اب یہ بات طے پا چکی کہ وہ تین چار ہزار با آسانی پیدا کر لے گا اور اسی سال فاطمہ اُس کے گھر دُلہن بن کر آئے گی۔ اور وہ اُس کے حُسن جہاں تاب سے اپنے گھر کو روشن کر سکے گا۔ اُس کے ذہن میں فاطمہ کی جوانی کا نشہ جاگنے لگا۔ اُس کا خیال حُسن اور اُس کے خیالی حُسن کی سحر کاری اُسے ایک نئی دُنیا میں لے گئی۔ عیش و عشرت کی دُنیا۔ خوشبوؤں، پھولوں، اور قہقہوں کی دُنیا۔ اُسے اس تصور میں بے اندازہ لذت مل رہی تھی کہ دستک سُنائی دی اور پھر رزاق کی بھرائی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔

اُس کے اس بے وقت آنے سے حامد کا خیالی محل چکنا چور ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے آج حامد کو سلام بھی نہیں کیا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ رزاق کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن الفاظ حلق میں اٹک کر رہ جاتے تھے

حامد ہی نے اُس سے

...چا۔

"رزاق میاں اتنے
...گھبرائے کیوں ہو؟ کچھ
...بھی"

اور رزاق میاں
نے مشکل سے اتنا کہا۔
"بھاؤ بہت گر چکا
ہے جتنے پیسے آئیں گے
...خواہوں کو بھی پورے
...ہوں گے۔۔۔ اور میری
...کا کیا ہوگا۔۔۔ اُس کی
...دی کیسے ہو گی؟"

وہ یہ کہہ رہا تھا اور
...کے دل میں خوشی، اور
...رت کے چراغ جل رہے
تھے۔

اُس کی آنکھوں میں
...کا حُسن تھا۔۔۔ اُس کی
...یالی تصویر تھی۔ ہزاروں
روپے کے نوٹوں کی سرسراہٹ
...روپوں کی جھنکار سے
...کے کان گونج رہے
تھے۔ رزاق ہاتھ باندھے
...رہا۔ اور فاطمہ کی تصویر
...آتشِ شوق کو ہوا
...رہی۔۔۔

غزل

از

جناب احمق پھپھوندوی

یہ فطرت شیخ صاحب کی تھی کس درجہ شریفانہ
مجھے کعبے میں چھوڑا چل دیئے خود سوئے بتخانہ

یوں ہی اے زُلفِ غرب کر دیا سب کو جو دیوانہ
تو رہنا ہے یقیناً تجھ کو بے آئینہ وشانہ

جو ان کا دوستنا ہے تو اطمینان سے بیٹھو
کہ بنتا جائے گا یہ ذکر افسانہ در افسانہ

یقیناً کچھ نہ پائے گا صلہ اس جان دینے کا
یہ سب کچھ جانتا ہے پھر بھی جل مرتا ہے پروانہ

رواداری کہاں سے آئے ہندوستان والوں میں
بدل ڈالیں یہ کیونکر ذہنیت اپنی غلامانہ

یہاں تو موت ہی مرغوب ہے اس قحط سالی میں
تم اپنے پاس رکھو اپنا اعجازِ مسیحانہ

مرا زر بھی تصدق، دل بھی قرباں، جان بھی صدقے
دلا دے کوئی مجھ کو اُن سے خوشنودی کا پروانہ

جنابِ عشق بھی ہم خاصیت ہیں بوم و پشہ کے
جہاں ٹھہرے بنا ڈالا اُس آبادی کو ویرانہ

حکومت کی کفالت کا تصدق ہے یہ اے زاہد
کہ جاری ہیں دھڑا دھڑ تیرے اخراجاتِ شاہانہ

زمانہ قدر دانوں سے ہے خالی آج کل احمق
وہ دیوانہ ہے جو اس عہد میں بنتا ہے فرزانہ

ایک ریڈیائی تمثیل

جنم جنم کے ساتھی

از

جناب برج کیتال

گو بھائی کا ٹیج سات بنگلہ بمبئی ۴۱ ــــــ ۴ر جون ۱۹۵۶ء

محترمی گرامی صاحب! تسلیمات

میں نے لکھا تھا کہ افسانہ جلد ہی روانہ کروں گا۔ لیکن ایسا کر نہ سکا۔ اس کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن اسکے ساتھ ساتھ ایک خوشخبری بھی آپ کو سُنانا چاہتا ہوں ــــــ اتنے دنوں میں بہت مصروف رہا۔

مصروفیت ــــــ ؟

"ناچتے قدم" نام کی فلمی کہانی اشوک پکچر والوں کے لئے لکھ رہا تھا لیکن ــــ اب تو میں سوچتا ہوں کہ آپ تو اس لائن کو سرے سے ہی پسند نہیں کرتے۔ شاید اس بات پر خوش ہوں، نہ ہوں ــــــ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں خوشتر صاحب کہ اس فلم کو دیکھنے کے بعد آپ مجھ سے کوئی گلہ نہ کریں گے۔

اور اب افسانہ کی بات کرتا ہوں ــــــ

افسانہ نہیں بھیج رہا۔ ریڈیائی ڈرامہ بھیج رہا ہوں۔ آج سے چھ مہینے پہلے یہ ڈرامہ میں نے ریڈیو والوں کو بھیجا تھا۔ اور آج سے پندرہ دن پہلے جب میں ریڈیو اسٹیشن گیا، کہ اس ڈرامے کے متعلق دریافت کروں کہ اس کا کیا ہوا تو پتہ چلا کہ ابھی تک اُن لوگوں نے یہ ڈرامہ پڑھا ہی نہ تھا۔

وجہ ــــــ ؟

کیوں یہ اُردو میں لکھا گیا تھا۔ اور بدقسمتی سے جن صاحب کو یہ ڈرامہ پڑھ کے اپنا فیصلہ دینا تھا وہ اُردو سے ناواقف تھے۔ بہر حال اُنھوں نے وعدہ کیا کہ ایک ہفتہ تک اس کا جواب دیا جائے گا ــــــ آج صبح یہ ڈرامہ مجھے واپس مل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پن کی ہوئی اس کی ہندی "سمری" بھی ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ ڈرامے کا فیصلہ ڈرامہ پڑھ کے نہیں بلکہ سمری پڑھ کے کیا گیا ہے۔ سمری بھی بھیج رہا ہوں۔ اسے پڑھیئے اور بتایئے کہ سمری غلط ہے یا نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایئے کہ ہماری جمہوری حکومت میں اُردو لکھنے والے ادیبوں کا حشر کیا ہوگا؟ آپ اس ڈرامہ کو پڑھ کر دیکھیں پسند آئے تو بیسویں صدی میں شائع کریں تاکہ شوق سے کی ہوئی محنت ضائع نہ ہو ــــ اور کیا لکھوں، زیادہ آداب۔

خلوص نما

برج کیتال

...تی کے ساتھ ہی ایک دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آتی ہے ... ہاتھوں کی چوڑیاں جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ دروازے پر دستک پھر ہوتی ہے۔ اور دستک دیتے ہوئے ہاتھوں کی چوڑیاں پھر جھنجھناتی ہیں۔ آہستہ آہستہ موسیقی دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ اور دستک کی آواز اور بھی اُبھر آتی ہے۔ اس وقت مائیک کے پاس سے یہ الفاظ تھکی تھکی اور پریشان آواز میں ادا کئے جاتے ہیں۔

رجّو۔ "چھوڑیئے مہندر بابو! ——— مہندر بابو! ——— کوئی آگیا ہے!"

(دستک کی آواز پھر آتی ہے)

رجّو۔ (دبی ہوئی آواز میں) "چھوڑ بھی دیجئے مہندر بابو! ——— میں دیکھوں کون آیا ہے!"

مہندر۔ "نہیں!"

رجّو۔ "میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں ——— مجھے دروازہ کھولنے دیجئے۔"

مہندر۔ (ایک لمبی سانس لے کر) "نہیں رجّو ——— تم اندر جاؤ ——— دروازہ میں کھولتا ہوں۔"

(رجّو کے اُٹھ کر جانے کی آواز۔ اُس نے پاؤں میں پازیبیں پہن رکھی ہیں۔ دروازہ اب کی بار اور بھی زور سے کھٹکھٹایا جاتا ہے۔)

مہندر۔ (اُونچی آواز میں) "کون؟"

گیتا۔ (باہر سے) "میں ہوں۔"

مہندر۔ (اُسی طرح) "کون ہے؟"

گیتا۔ "واہ! اب تو آپ کے لئے آواز پہچاننا بھی مشکل ہوگیا۔"

مہندر۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) "ارے تم ہو گیتا ——— آؤ ——— اندر آجاؤ۔"

گیتا۔ (اندر آتے ہوئے) "اب کیسی ہے طبیعت آپ کی؟"

مہندر۔ "پہلے سے تو بہت اچھا ہوں۔ اور اب تم آگئی ہو تو اور بھی اچھا ہوگیا ہوں۔"

گیتا۔ "کہیں یہ بات تو نہیں کہ —

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مہندر۔ "شاید!"

گیتا۔ "لیکن آپ کے مُنھ پر تو رونق بھی نہیں۔"

مہندر۔ "کیوں؟"

گیتا۔ "بس نہیں ہے، زردی چھا رہی ہے چہرے پر اور آنکھیں تو ایسے جیسے کسی نے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ کیا بات ہے؟"

مہندر۔ "بات؟ میرے خیال میں تو کچھ بھی نہیں۔"

گیتا۔ "اور میرے خیال میں ضرور کچھ ہے۔ بتایئے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں آپ؟"

مہندر۔ "یہ سب تمھارا وہم ہے۔ یہ بتاؤ کہ آج آ کیسے گئیں؟"

گیتا۔ "منور ملنے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت آج پھر ٹھیک نہیں میں نے رجّو سے کہا تھا۔ آج صبح ہی ڈاکٹر کے ہاں اُسے ملی تھی۔ بہت تعریف کر رہی تھی اُس کی۔ سُنا ہے آپ کا بہت خیال رکھتی ہے وہ؟"

مہندر۔ (جیسے کچھ جھینپتے ہوئے) "ہاں!"

گیتا۔ "بے چاری ——— بہت اچھی لڑکی ہے۔ اُس نے کبھی کسی کی محبت دیکھی نہیں۔ لیکن سب سے پیار کرتی ہے۔ چھوٹی سی تھی جب اُس کے ماں باپ مر گئے تھے۔ اور اب کتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اب تو اُس کی شادی بھی ہوجانی چاہیئے۔ ہے نا؟"

مہندر۔ "چھوڑو بھی گیتا۔ کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔ لو یہاں آرام سے بیٹھو۔"

گیتا۔ "اپنے بستر کی کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے ہے جیسے کوئی کُشتی لڑ رہا ہو۔ اُٹھئے۔ پہلے آپ کا بستر ٹھیک کردوں۔ کیا وہ آپ کا بستر ٹھیک نہیں کرتی؟ ——— آپ بولتے کیوں نہیں؟"

مہندر۔ "بول تو رہا ہوں۔"

گیتا۔ میں جانتی ہوں۔ میرا اس وقت کا یہاں آنا آپ کو اچھا نہیں لگا۔ لیکن یہ تو بتایئے اُس وقت کیا کریں گے جب میں ہمیشہ کے

سکنے کے لیے آپ کے پاس آجاؤں گی؟"

مہندر۔ "تب! تب تو میں اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھوں گا گیتا۔"

گیتا۔ (شوخی سے) "اچھا جی! اور جانتے ہو میں اس وقت کیا بتانے آئی ہوں آپ کو؟"

مہندر۔ نہیں تو ——— لیکن ہاں ——— آج تمھارا ریزلٹ بھی تو نکلنے والا تھا نا؟

گیتا۔ "اُس میں تو پاس ہو گئی ہوں۔ لیکن یہ بتلانے نہیں آئی تھی۔"

مہندر۔ "تو؟"

گیتا۔ "ڈیڈی واپس آگئے ہیں۔"

مہندر۔ "او!"

گیتا۔ "اور اُنھوں نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔"

مہندر۔ "او!"

گیتا۔ "آپ خوش نہیں ہوئے۔"

مہندر۔ "کیوں نہیں۔ میں بہت خوش ہوں گیتا ——— بہت خوش ہوں!"

گیتا۔ "نظر تو نہیں آتے۔"

مہندر۔ "تو کیسا نظر آتا ہوں؟"

گیتا۔ "بیمار!"

مہندر۔ "وہ تو تم جانتی ہو۔ میں بیمار ہوں ہی۔"

گیتا۔ "ہاں، بھول گئی تھی۔ رجو تو آجاتی ہے نا وقت پر؟"

مہندر۔ "ہاں!"

گیتا۔ "تو میں اب جاؤں؟"

مہندر۔ "———"

گیتا۔ "اچھا تو میں جاتی ہوں۔ کل پھر آؤں گی۔ لیکن ایسی کوئی بات ہو تو رجو کو گھر معلوم ہے۔ اُسے بھیج دیجیے گا ——— اچھا؟"

مہندر۔ "———"

گیتا۔ "میں کہتی ہوں آج کوئی بات ضرور ہے۔ ورنہ ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ میں جانے لگی اور آپ نے روکا نہ ہو۔"

مہندر۔ "تم روکنے سے کب رُکی ہو گیتا۔ جو آج رُک جاؤ گی؟"

گیتا۔ "ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ میں واقعی نہیں رُکوں گی۔ دیکھیے روک کے۔ جا رہی ہوں میں ——!"

(لیکن مہندر روکتا نہیں۔ گیتا کے جاتے ہی دوسرے کمرے میں چھپی رجو دوڑتی ہوئی باہر آتی ہے۔ اور تیزی سے مہندر کے قریب آکر پوچھتی ہے)

رجو۔ "تم گیتا دیدی سے شادی کرنے والے ہو؟ کیا یہ بات ٹھیک ہے مہندر بابو؟"

مہندر۔ "———"

رجو۔ "بتاؤ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟"

مہندر۔ (سنجیدہ اور بھاری آواز میں) "ہاں!"

رجو۔ "تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

مہندر۔ (جیسے مطلب نہ سمجھتے ہوئے) "تمھیں چھوڑ دوں کا مطلب ———؟"

رجو۔ "مطلب کہ تم میرے ہوتے ہوئے کسی اور سے شادی کرو گے؟"

مہندر۔ "کیوں؟ تم کون ہوتی ہو ایسا کہنے والی؟"

رجو۔ (یہ کہتے کہتے رجو کا دل بھر آتا ہے) "کیا میں کوئی نہیں ہوتی ایسا کہنے والی۔ اپنا من، تن اور دل دے کر بھی مجھے کوئی حق نہیں ہے تم پر؟"

مہندر۔ "مجھ سے محبت مت کرو رجو۔ تم جانتی ہو کہ میں گیتا سے پیار کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اور اب ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔"

رجو۔ "لیکن میں یہ بھی تو جانتی ہوں مہندر بابو! کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ اپنا جسم اور اپنی رُوح تمھارے حوالے کی ہے۔ اور اب اب میں صرف تمھاری ——— صرف تمھاری ہو کے رہ سکتی ہوں۔"

[illegible]ندر۔ [illegible] آواز میں) "کان کھول کر سن لو رجّو! میرا تمھارا رشتہ [illegible]ور نوکر کے رشتے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اور اس کیلئے تمھیں ہر مہینے تنخواہ ملتی ہے!"

رجّو۔ (جیسے اُسے کسی نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر دے مارا ہو) "اچھی قیمت لگائی ہے تم نے میرے پیار کی مہندر بابو۔ تنخواہ تو میں تمھارے برتن مانجھنے کی لیتی تھی۔ تمھارا کھانا بنانے اور کپڑے دھونے کی لیتی تھی بابو! اِس بات کی تنخواہ تو میں نے تم سے کبھی نہ لی تھی کہ تمھاری اُنگلی میں چُبھا ہوا کانٹا میرے دل میں بھالے کی طرح آ لگے۔ کہ تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ دیکھ کے میرا دل بھی ڈوبنے لگ جائے۔ اِس بات کی نوکری تو نہ کی تھی کہ تمھارے سر میں درد ہو اور میں رات رات بھر اُسے گود میں رکھ کے سہلاتی رہوں! اِس بات کی تنخواہ تو تم نے کبھی نہ دی تھی کہ تمھاری آنکھ کے ایک اشارے پر میں اپنا سب کچھ تمھارے قدموں پر نچھاور کر دوں۔ تم کیسے خریدار ہو بابو! جو تم نے پندرہ روپے مہینے پر یہ سب کچھ خرید لیا؟"

مہندر۔ (ڈوبی ہوئی سی آواز میں) "رجّو!"

رجّو۔ "یہ کہتے ہوئے تمھیں لاج بھی نہیں آتی کہ میرا تمھارا رشتہ، مالک اور نوکر کے رشتے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے کیا میں صرف نوکرانی ہوں تمھاری —— صرف نوکرانی ہوں —— اور کچھ نہیں؟"

مہندر۔ (اونچی آواز میں) "خاموش رہو رجّو! خاموش رہو!"

رجّو۔ "میں چوٹ کھا کر خاموش رہنے والوں میں سے نہیں ہوں مہندر بابو! میں اُن میں سے بھی نہیں جو آسانی سے ہار مان لیتے ہیں۔ جب تک تمھارا اصلی روپ نہ دیکھا تھا دھوکہ کھاتی رہی۔ اب پتہ چل گیا ہے تو تمھارا یہ داؤں کبھی نہ چلنے دوں گی۔"

مہندر۔ (سنبھل کر) "کیا کروگی تم؟"

رجّو۔ "جو کچھ بھی میرے بس میں ہوگا —— میں —— میں گیتا دیدی کے پاس جاؤں گی . . . ."

مہندر۔ (دھمکانے کے سے انداز میں) "رجّو!"

رجّو۔ "اُسے سب کچھ بتا دوں گی! اُسے کہہ دوں گی کہ میری طرح وہ بھی دھوکہ نہ کھا جائے تم سے۔"

مہندر۔ "خبردار رجّو! ایسا کیا تو گلا گھونٹ دوں گا تمھارا۔"

رجّو۔ "میں موت سے نہیں ڈرتی!"

مہندر۔ "صرف خیال ہے تمھارا۔"

رجّو۔ "تو پھر گھونٹ دو میرا گلا —— مار ڈالو مجھے!"

مہندر۔ "پاگل پن نہ کرو رجّو!"

رجّو۔ "تم میرا گلا گھونٹ دوگے تو بھی میں تمھارا پیچھا نہ چھوڑوں گی —— میری آتما بار بار تمھیں اپنے گناہوں کی یاد دلائے گی۔ اور تم زندگی بھر سُکھی نہ رہ سکوگے۔ جا رہی ہوں میں . . . .!"

مہندر (چیخ کر) "رجّو!"

(لیکن جواب میں ایک دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے۔)

—— (PAUSE) ——

گیتا۔ "کیا بات ہے رجّو —— کہاں سے آرہی ہو؟"

رجّو۔ (CONFUSED) "گیتا دیدی —— گیتا دیدی!"

گیتا۔ (پریشان آواز میں) "اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ بولتی کیوں نہیں ہو۔ کیا انھوں نے کچھ کہلا بھیجا ہے؟"

رجّو۔ "نہیں!"

گیتا۔ "وہ کیسے ہیں؟"

رجّو۔ (بھرے ہوئے گلے سے) "اچھے!"

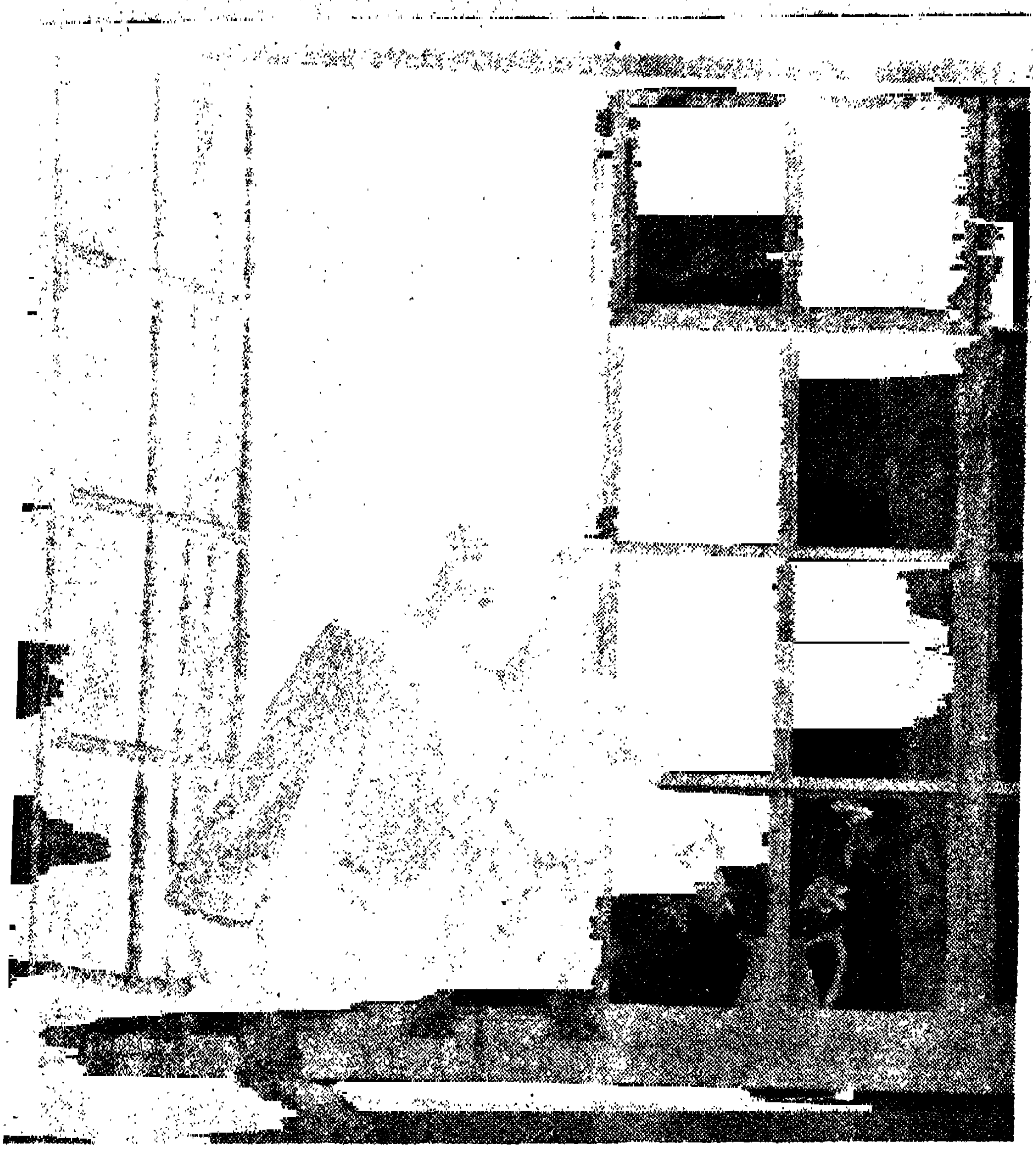
گیتا۔ "تو پھر بات کیا ہے۔ تم اتنی گھبرائی ہوئی سی کیوں ہو؟"

رجّو۔ "ایک بات کہنے آئی تھی دیدی۔"

گیتا۔ "تو پھر کہہ ڈالو نا —— ہچکچا کیوں رہی ہو؟"

رجّو۔ "بات ہی ایسی ہے دیدی! سوچتی ہوں میں نے کہہ بھی دی تو شاید تم مانو نہ مانو!"

گیتا۔ (خوشی سے) "مانوں گی —— ضرور مانوں گی! آج تو تم جو کچھ بھی کہوگی مان لوں گی۔ تم کیا جانو آج میں کتنی خوش ہوں۔"



ع ہر اک شے آنے والی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے

رجو۔ "بہت خوش ہو دیدی!"

گیتا۔ "ہاں ـــــ بہت خوش۔ لیکن اب یہ مت پوچھنا کیوں۔ ورنہ مجھے شرم آجائے گی"

رجو۔ (گلا بھر بھر آتا ہے) "دیدی! تمھاری شادی مہندر بابو سے ہونے والی ہے نا؟"

گیتا۔ "اسی لئے تو میں اتنی خوش ہوں پگلی ـــــ اسی لئے تو اتنی خوش ہوں!"

(مختصر سا وقفہ اور موسیقی)

رجو۔ "اچھا ـــــ تو میں چلوں دیدی؟"

گیتا۔ "لیکن وہ بات ـــــ؟"

رجو۔ "پھر کہوں گی دیدی ـــــ آج نہیں"

گیتا۔ "کیوں؟"

رجو۔ "آج تم اتنی خوش ہو دیدی کہ وہ بات ـــــ"

گیتا۔ "کہہ ڈالو نا؟"

رجو۔ (واپس مڑتے ہوئے تیزی سے کہتی ہے) نہیں دیدی ـــ نہیں دیدی ـــ نہیں ـــ!"

(اتنا کہہ کے رجو بھاگ جاتی ہے۔ اُس کی پازیبوں کی آواز دیر تک سنائی دیتی ہے)

ـــــ(PAUSE)ـــــ

منورما۔ "تم نے کچھ سنا گیتا؟"

گیتا۔ (بے پروائی سے) "کیا؟"

منورما۔ "رجو کے بارے میں کچھ نہیں سنا تم نے؟"

گیتا۔ (ذرا حیران ہوکے) "نہیں تو"

منورما۔ "سارے محلے میں چرچا ہو رہا ہے ـــــ تھوڑی دیر میں سارے شہر کو پتہ چل جائے گا۔۔۔۔"

گیتا۔ (بات کاٹ کر) "اور پھر ساری دنیا کو ـــــ لیکن ہوا کیا یہ تو بتاؤ؟"

منورما۔ "رجو ماں بننے والی ہے!"

گیتا۔ (چیخ کر) "کیا کہا؟"

منورما۔ "ٹھیک کہہ رہی ہوں ـــــ اور جانتی ہو لوگ اس کے لئے کس کا نام لیتے ہیں؟"

گیتا۔ (ایک دم سہم کر اور پھر غصے میں) "نہیں نہیں ـــــ یہ جھوٹ ہے"

منورما۔ "اگر سچ پوچھو گیتا تو میرا بھی یہی خیال ہے ـــــ وہ دونوں جوان ہیں۔ ایک ہی گھر۔۔۔۔"

گیتا۔ (بات کاٹ کر) "چپ رہو منورما ـــــ پرماتما کے لئے اس سے آگے کچھ نہ کہنا ـــــ مجھے اُن پر پورا بھروسہ ہے!"

منورما۔ "بھگوان کرے تمہارا وشواس سچا نکلے"

گیتا۔ "میرا وشواس جھوٹا نہیں ہو سکتا ـــــ میں ابھی جاکر رجو سے پوچھوں گی۔

ـــــ(PAUSE)ـــــ

(گیتا رجو سے پوچھ رہی ہے)

گیتا۔ "رجو! ـــــ رجو!"

رجو۔ (افسردہ سی، بجھی بجھی سی) "کیا بات ہے دیدی؟"

گیتا۔ "رجو! ـــــ جو کچھ میں نے سنا ہے کیا وہ سچ ہے؟"

رجو۔ "تو تم نے سن لیا دیدی؟"

گیتا۔ "مجھے بتاؤ کیا وہ بات سچ ہے؟"

رجو۔ "اب تم جان ہی چکی ہو دیدی تو نہیں کیسے کردوں؟"

گیتا۔ "تو پھر بتاؤ ـــــ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اُس کا؟"

رجو۔ (گھبرا کر) "دیدی ـــــ!"

گیتا۔ "اُس نے تم سے شادی کیوں نہ کرلی؟"

رجو۔ "وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا دیدی"

گیتا۔ "پیار نہیں کرتا تو کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے اس نے تم سے؟ کیا اُس کا نام نہیں بتاؤ گی؟"

رجو۔ "دیدی!"

گیتا۔ "جانتی ہو لوگ کس کا نام لے رہے ہیں؟"

رجو۔ "دیدی ــــ لوگ ٹھیک کہتے ہیں دیدی!"

گیتا۔ "تو پھر تم نے مجھ سے کیوں نہ بتایا؟"

رجو۔ (روتے ہوئے) "ایک بار بتلانے آئی تھی۔"

گیتا۔ "پھر ــــ؟"

رجو۔ "بتا نہ سکی ــــ دیدی! اُس روز تم بہت خوش تھیں۔"

گیتا۔ "ــــــــ"

رجو۔ "دیدی! ــــ اِس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے دیدی!"

گیتا۔ "نہیں رجو! میں تمھیں دوش کب دیتی ہوں؟"

رجو۔ "میری زندگی تو تباہ ہو گئی دیدی۔ لیکن تم ــ تم بھی اب اُس سے دھوکا نہ کھانا۔"

گیتا۔ "نہیں رجو! تمھاری زندگی تباہ نہیں ہوئی۔"

رجو۔ "دیدی!"

گیتا۔ "میں ٹھیک کہتی ہوں رجو ــــ مہندر بابو کی شادی مجھ سے نہیں، تم سے ہوگی۔"

(موسیقی اِس جملہ پر ایک بینگ کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ اور پھر دب جاتی ہے)

(اب مدھم موسیقی کے ساتھ شام ڈھلے آشیانوں کو لوٹنے والے پرندوں کی چہکار نمایاں طور پر سُنائی دے رہی ہے۔ گیتا کی آواز آتی ہے۔)

گیتا۔ "مہندر بابو!"

مہندر۔ (چونک کر) "ارے تم ــــ گیتا ــــ آؤ آؤ ــــ باہر کب سے کھڑی ہو؟"

گیتا۔ "ابھی آئی ہوں۔ رخصت ہونے آئی ہوں مہندر بابو!"

مہندر۔ (حیرانی سے) "رخصت ہونے؟ ــــ کہاں جا رہی ہو؟"

گیتا۔ "کہیں بھی نہیں لیکن اب یہاں نہیں آؤں گی۔ آپ سے ایک بھیک مانگنے آئی ہوں۔ مایوس تو نہیں کریں گے؟ میری بات مانیں گے نا؟"

مہندر۔ "تمھاری کونسی بات میں نے نہیں مانی گیتا؟"

گیتا۔ "وعدہ کیجئے کہ جو کچھ میں پوچھوں گی آپ سچ سچ بتائیں گے؟"

مہندر۔ "وعدے لینے پہ کیوں تُل گئی ہو گیتا۔ کیا مجھ پر بھروسا نہیں رہا؟"

گیتا۔ "یہی کہتے ہوئے تو مجھے ڈر آتا ہے۔"

مہندر۔ "کیا؟"

گیتا۔ "سوچتی ہوں اُس پر وشواس کروں یا آپ پر؟"

مہندر۔ "کس کی بات کرتی ہو؟"

گیتا۔ "رجو کی!"

مہندر۔ (لفظ رجو اُس کے دماغ پر ایک ہتھوڑے کی طرح آ کے پڑتا ہے۔) "کیا کہا ہے اُس نے تم سے؟"

گیتا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

مہندر۔ "گیتا!"

گیتا۔ "میں جانتی ہوں مہندر بابو! کہ انسان کبھی کبھی کچھ ایسی باتیں بھی کر گزرتا ہے جو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی ہوتیں۔ میرے لئے چاہے آپ ایک دیوتا سے کم نہ ہوں۔ لیکن ہیں تو انسان ہی اور انسان غلطی کرنے سے کبھی بچ نہیں سکتا۔"

مہندر۔ (پریشان ہو کر) "تم کیا کہنا چاہتی ہو گیتا؟"

گیتا۔ "یہی کہ غلطی کرنے کے بعد انسان کو اُس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اور آپ کو بھی بھگتنا پڑے گا۔"

مہندر۔ "کیا کرنا ہوگا مجھے؟"

گیتا۔ "رجو سے شادی!"

مہندر۔ (تقریباً چیخ کر) "یہ کیسے ہو سکتا ہے گیتا؟"

گیتا۔ "ہو کیوں نہیں سکتا۔ جب ایک غریب اور بے بس لڑکی کی لاج لُوٹی جا سکتی ہے۔ اُسے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ دُنیا والوں کے طعنوں اور کڑوی باتوں کی بھٹی میں جھونکا جا سکتا ہے تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کی اور اُس کے بچے

والے بچّے کی زندگی بچانے کے لئے آپ اُس سے شادی کرلیں۔"

مہندر۔ "تو کیا میں ایک چھوٹی سی بھول کے لئے اپنی ساری زندگی تباہ کرلوں گیتا؟"

گیتا۔ "آپ کی اِس چھوٹی سی بھول نے کسی اور کی زندگی بھی تو تباہ کر رکھی ہے مہندر بابو!"

مہندر۔ "گیتا ——— کیا تمھیں اپنا خیال نہیں آتا ——— میرا خیال نہیں آتا ——— اُن وعدوں کا خیال نہیں آتا جو ہم نے کیے تھے؟"

گیتا۔ "آتا ہے۔ اور اِن سب سے زیادہ مجھے خیال آتا ہے، رجو کی قابلِ رحم زندگی کا۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے ہونے والے بچے کے تاریک مستقبل کا۔ اور پھر میرا اور آپ کا رشتہ تو جنم جنم کا ہے۔"

مہندر۔ "تو کیا رجو سے میری شادی کرکے اُس رشتے کو توڑ دینا چاہتی ہو؟"

گیتا۔ "نہیں۔ یہ تو صرف اِس جنم کی بات ہے مہندر بابو۔ اگر اپنی ایک زندگی کے بدلے میں کسی کے من کی خوشیاں اُسے دے سکوں تو اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؟"

مہندر۔ "اور میرے من کی خوشیاں؟"

گیتا۔ "وہ تو آپ نے اپنے ہاتھوں لُٹا دیں مہندر بابو!"

مہندر۔ "گیتا ——— !"

گیتا۔ "مہندر بابو! اگر میری طرح آپ بھی پیار کا دعویٰ کرتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ رجو سے شادی کرلیں گے۔"

مہندر۔ (گھبرا کر) "مجھے کچھ سوچنے دو گیتا۔"

گیتا۔ "گیتا کی سوچ کیا آپ کے لئے کافی نہیں۔ آج میں رجو کو آپ کا فیصلہ سُنانے والی ہوں۔ اب میں جارہی ہوں۔"

مہندر۔ "گیتا! ——— میری بات تو سنو گیتا۔ !!"

گیتا۔ "نہیں اور کچھ نہیں سُنوں گی۔"

مہندر۔ "گیتا ——— !"

گیتا۔ (رُک کر فیصلہ کن انداز میں) "مہندر بابو آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔"

یہ کہتے ہوئے گیتا وہاں سے چلی جاتی ہے۔

وقفے کی موسیقی میں سے شہنائیوں کی آواز اُبھرتی ہے۔ اور جب شہنائیوں کی آواز پنچم تک پہنچتی ہے تو پس منظر سے طوفان کی آواز اُبھرتی ہے اور آہستہ آہستہ طوفان کی آواز شہنائیوں کی آواز پر چھا جاتی ہے۔ طوفان کی آواز کے ساتھ ساتھ دروازوں اور کھڑکیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز اُبھرتی ہے ایک لحظہ کے بعد طوفان کی آواز انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ اور پھر کہیں دُور سے ایک کُتّے کے رونے کی دردناک اور ڈراؤنی آواز آتی ہے۔ آہستہ آہستہ طوفان کی آواز مدھم ہوجاتی ہے اور منورما کی آواز اُبھرتی ہے ——— !

منورما۔ "گیتا ——— گیتا ——— !"

گیتا۔ (جیسے کسی خواب سے چونک کر) "کیا ہے؟"

منورما۔ "اتنے زوروں کا طوفان اُمڈ رہا ہے اور تمھیں کچھ معلوم ہی نہیں۔"

گیتا۔ "اتنے زوروں کا طوفان اُمڈ رہا ہے اِسی لئے تو کچھ معلوم نہیں۔"

منورما۔ "دیکھو تو کواڑ کتنے زور زور سے کھڑکھڑا رہے ہیں۔ تو انھیں بند کیوں نہیں کردیتی؟"

گیتا۔ "کواڑ بند ہوں یا کھلے مجھے ان سے کیا منورما؟"

منورما۔ "اور اگر یہ ٹوٹ گئے تو؟"

گیتا۔ "تو اور بھی اچھا ہوگا۔ یہ کواڑ سدا ہی کے لئے کھلے رہیں گے۔ چاہوں، تو بھی بند نہ کرسکوں گی۔ کاش یہ کواڑ ٹوٹ ہی جائیں۔"

(اُسی وقت ایک کواڑ کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز آتی ہے)

منورما۔ "لو اب خوش ہوئیں؟"

گیتا۔ (کھوئی ہوئی سی) "کیوں، کیا ہوا؟"

منورما۔ "کواڑ ٹوٹ گیا ہے اور کیا ہوتا!"

گیتا۔ "کواڑ ٹوٹ گیا ہے؟ کب؟ کہاں؟"

(دوسرے کواڑ کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز)

منورما۔ "لو ——— دوسرا بھی ٹوٹ گیا۔"

گیتا۔ (کچھ حیران ہوکر) "دوسرا بھی ٹوٹ گیا؟!" (پھر اچانک ہی جیسے ہوش میں آتے ہوئے) "اور ——— تم اِن کواڑوں کی بات کرتی ہو؟"


سیزرز
سگریٹ
"SCISSORS"
CIGARETTES
SPECIAL
SCISSORS
W.D.&H.O.WILLS.
W.D.&H.O.WILLS,
BRISTOL & LONDON.
"SCISSORS"
W.D. & H.O.WILLS
SCISSORS
MARK
SG/243

"اور تم نے کیا سمجھا؟"

"میں نے سمجھا من کے کواڑ۔ باہر طوفان آیا تو گھر کے کواڑ ٹوٹ گئے لیکن جب آتما طوفانوں میں گھری ہوئی ہے تو من کے کواڑ کیوں نہیں ٹوٹ جاتے۔ کبھی بند ہوتے ہیں کبھی کھل جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں یہ بھی ٹوٹ جائیں۔ گھر کے کواڑوں کی طرح!"

"آج پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے گیتا؟"

"کیا تم نہیں جانتی ہو؟"

"نہیں تو۔ آج ہی لوٹی ہوں میں یہاں ——— آخر کیا ہو گیا ہے تمھیں؟"

"رجّو مر گئی۔"

(یک دم چونک کر) کیا کہہ رہی ہو گیتا؟"

"جس کے لئے میں نے اپنی زندگی بنجر بنا ڈالی منورما وہ خود اپنی زندگی سے وفا نہ کر سکی۔"

"لیکن جب میں یہاں سے گئی تو وہ اچھی بھلی تھی۔"

"موت نے اُسے اچانک آگھیرا۔ وہ مطمئن ہو کے مری۔ اور میں زندہ رہ کر بھی بے چین ہوں!"

ا۔ "کیوں؟ اب کون ہے راستے میں؟ بولو گیتا ——— اب کون ہے راستے میں؟"

"کوئی بھی تو نہیں۔!"

ا۔ "تو پھر اُن سے جا کر ملتی کیوں نہیں؟"

"ہاں! میں اُن سے ضرور ملوں گی۔ سُنا ہے اُنھیں میری ضرورت ہے۔ منورما! تم وہ کھڑکی بند کیوں نہیں کر دیتیں۔ سُنا ہے اُن کی آنکھیں ہر وقت دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ اور پھر اچانک ہی چونک پڑتے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں، نہ کہیں باہر جاتے ہیں۔ گم سُم۔ پتھر کے بُت کی طرح۔ سب کا کہنا ہے، اگر وہ بولے نہیں۔ روئے نہیں، اپنے دل کا غبار نہیں نکالا تو پاگل ہو جائیں گے۔"

منورما۔ "تو کیا تم اُن کی مدد نہ کرو گی؟"

گیتا۔ "کیوں نہ کروں گی؟ اُن کے لئے تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی۔ اُنھیں کہوں گی، مہندر بابو! ——— مہندر بابو ——— !"

——— (PAUSE) ———

گیتا۔ "مہندر بابو ——— کیا آپ مجھ سے بولیں گے نہیں؟"

مہندر۔ " ——— "

گیتا۔ "مہندر بابو!"

مہندر۔ "کیا ہے؟"

گیتا۔ "مجھ سے بولیں گے نہیں؟"

مہندر۔ "تم سے کیوں نہ بولوں گا گیتا ——— میرا اور ہے ہی کون اس دنیا میں؟"

گیتا۔ (ایک ٹھنڈی سانس لے کے) "ہاں ——— رجّو تھی ——— وہ چل بسی۔"

مہندر۔ "رجّو کی بات مت کرو گیتا۔ مت چھیڑو اُس کا ذکر میرے سامنے، میں اُسے بھول جانا چاہتا ہوں۔ اُس کی یاد اپنے دل سے یوں نکال دینا چاہتا ہوں جیسے وہ میری زندگی میں کبھی آئی ہی نہ ہو ——— !"

(اس وقت پس منظر سے رجّو کے قہقہے کی آواز آتی ہے)

مہندر۔ (کھویا ہوا سا) "کیوں ہنس رہی ہو گیتا، کیوں ہنس رہی ہو مجھ پر ——— ؟"

گیتا۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

مہندر۔ "تو پھر یہ کس کی آواز تھی؟"

گیتا۔ "کسی کی بھی تو نہیں۔"

مہندر۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہنس رہا ہو۔"

گیتا۔ "ابھی تک تو ہنسی بہت دور ہے ہونٹوں سے۔"

مہندر۔ "تو پھر یہ رجّو تھی ——— ضرور وہی ہنس رہی تھی!"

گیتا۔ (حیرانی سے) "لیکن وہ بھوت کہاں ہے؟ اب تو بے چاری مر گئی۔"

مہندر۔ "اور میری زندگی اب بھی ویسی ہی ——— تاریک ہے!"

(رجو کے قہقہے کی آواز)

گیتا۔ "مہندر بابو!"

مہندر۔ "نہیں نہیں گیتا ——— اب میری طرف ایسی نگاہوں سے نہ دیکھو ——— میری ویران زندگی میں اب تم کچھ نہ پاسکو گی، کچھ نہ پاسکو گی۔"

گیتا۔ "تو کیا میرا سہاگ . . . ."

مہندر۔ "میں نہیں جانتا۔ میں اِس کے سوا کچھ بھی نہیں جانتا کہ میں تمھارے قابل نہیں ہوں۔"

گیتا۔ "ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

مہندر۔ "تم مہان ہو گیتا، اور میں تمھیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میں وہ دن ابھی زندگی میں نہیں دیکھنا چاہتا، جس دن تم مجھے یہ کہہ سکو کہ میں نے تمھیں دھوکہ دیا۔ میں وہ گھڑی دیکھنا ابھی پسند نہ کروں گا جب تمھیں مجھ سے نفرت ہو جائے ——— !"

گیتا۔ "نفرت ہونے کو ہوتی مہندر بابو تو اُسی دن نہ ہو جاتی؟"

مہندر۔ "تب کی بات اور تھی گیتا!"

گیتا۔ "گیتا جب بھی آپ سے پیار کرتی تھی اور اب بھی۔"

مہندر۔ "کاش سدا کے لئے ایسا ہو سکے۔"

گیتا۔ "کاش آپ مجھ پر یقین کر سکتے مہندر بابو!"

مہندر۔ "یہی تو افسوس ہے گیتا کہ ہم ایک دوسرے پر یقین نہیں کرتے۔ کیا تم یہ بات مان لو گی کہ میں نے کسی کا خون کیا ہے؟"

گیتا۔ "نہیں یہ میں نہیں مان سکتی۔"

مہندر۔ "اور اگر میں کہوں تو ——— ؟"

گیتا۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مہندر۔ "یہی بات میں اب سوچتا ہوں گیتا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک اَن ہونی بات کیسے ہو گئی؟"

گیتا۔ "کیا ہو گیا مہندر بابو؟"

مہندر۔ "اُس نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اُس نے کہا تھا، اگر میرا گلا گھونٹ دو گے تو میری رُوح کبھی تمھارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ (رجو کے قہقہے کی آواز) ہمیشہ تمھیں تمھارے گناہ کی یاد دلاتی رہے گی۔ (رجو کے قہقہے کی آواز پھر آتی ہے) سُن رہی ہو۔ سُن رہی ہو گیتا! وہ میری مجبوری اور بے بسی پر قہقہے لگا رہی ہے۔ اور اب میں اُسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ مجھے پاگل کر دے گی گیتا ——— مجھے پاگل کر دے گی۔"

گیتا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا مہندر بابو! ——— کس نے کہا تھا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتی؟"

مہندر۔ "رجو نے! ——— اور میں نے اُسے مار ڈالا۔ اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ اُس کی زندگی ختم کر کے میں نے اپنے اور تمھارے راستے کا پتھر ہٹا دینا چاہا تھا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کی موت اُس کی زندگی سے زیادہ خطرناک ہو گی! مرنے کے بعد . . . ."

گیتا۔ (بات کاٹ کر) "مہندر بابو!"

مہندر۔ "بس یہی ڈر تھا مجھے۔ میں اِس راز کو اپنے سینے میں چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ جان لینے کے بعد تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔"

گیتا۔ "نہیں مہندر بابو!"

مہندر۔ "گیتا! کیا اب بھی تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ کیا اب بھی تم کہہ سکتی ہو کہ تمھیں مجھ سے نفرت نہیں؟"

گیتا۔ "ہاں مہندر بابو! میں اب بھی آپ سے پیار کرتی ہوں۔ میں اب بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھے آپ سے نفرت نہیں۔"

مہندر۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو گیتا؟"

گیتا۔ "گیتا نے اس سے پہلے بھی کبھی جھوٹ بولا ہے کیا؟"

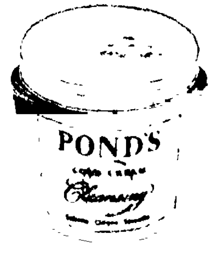
مہندر۔ "تو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا گیتا؟"

گیتا۔ "اگر آپ نے گیتا کا گلا گھونٹا ہوتا مہندر بابو! تو وہ ضرور آپ کو



اپنے قدرتی حُسن کو اور بھی دلکش بنائیے

جلد کو ملائم بنانے والی یہ کریم آپ کے رُوپ رنگ کو نِکھار دیتی ہے



چکنی پونڈز کولڈ کریم کے روزانہ استعمال سے آپ کی جِلد کی ملائمت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔

رات کو سونے سے پہلے پونڈز کولڈ کریم اپنے چہرے پر اچھی طرح ملیئے۔ یہ آپ کی جِلد کے مسامات کی گہرائیوں میں اتر کر چھپے ہوئے میل کو صاف کرکے آپ کی جلد کو تر و تازہ اور گداز بنا دیتی ہے۔ یہ کریم جِلد کی صفائی کرنے کے علاوہ آپ کے روپ رنگ کو بھی نکھار دیتی ہے!

پونڈز
کولڈ کریم

جلد کے محافظ قدرتی روغن کی کمی پوری کیجیے

جب آپ منہ دھوتی ہیں تو آپ کی جلد کے محافظ قدرتی روغن بھی دُھل جاتے ہیں۔ ان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے پونڈز کولڈ کریم استعمال کیجیے۔ اس سے آپ کی جلد ریشم کی طرح ملائم بنی رہے گی اور آپ کے روپ رنگ کی دلکشی بھی برقرار رہے گی۔

افزائش حُسن کے متعلق مُفت کتابچہ: "Lovelier with Pond's" نامی ہمارا مُفت انگریزی کتابچہ منگائیے۔ اس میں اپنے قدرتی حُسن کو بڑھانے کے لئے آپ کو بہت سی کارآمد ترکیبیں ملیں گی۔ اس پتہ پر لکھئے: جی۔ پی۔ او۔ بکس ۱۶۱۲، بمبئی ۱

P.2903

معاف کردیتی لیکن آپ نے رجّو کا گلا گھونٹا ہے۔ اور ایسا کوئی اختیار مجھے نہیں کہ میں آپ کو معاف کردوں!"

"تو کیا اب پھر تم مجھ سے دُور ہو جاؤ گی؟"

"میں آپ سے دُور ہی کب تھی مہندر بابو!"

"تو کیا میرے سپنے سچ ہو جائیں گے گیتا؟"

(ایک ٹھنڈا سانس بھر کر) "میں بھی یہی چاہتی ہوں مہندر بابو!"

"تو پھر کب؟"

"کیا؟"

"میں شادی کی بات کر رہا ہوں گیتا!"

"شادی؟ لیکن شادی کے لئے تو ابھی بہت انتظار کرنا پڑے گا مہندر بابو!"

"انتظار؟"

"ہاں! ——— شاید اگلے جنم تک!"

"کیا یہ پہیلیاں بجھوا رہی ہو گیتا؟"

(آواز میں عزم کی جھلک ہے) "گیتا کی نظروں میں انسان کی زندگی ابھی اتنی سستی نہیں ہوئی مہندر بابو جتنی آپ سمجھے بیٹھے ہیں۔ آپ نے رجّو کی زندگی لی ہے۔ قانون کی نظروں میں آپ مجرم ہیں!"

"اور تمھاری نظروں میں؟"

میری نظروں میں بھی۔ میں آپ کو قانون کے حوالے کر دوں گی۔"

(گھبرا کر) "کیا کہہ رہی ہو گیتا، جانتی ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"جانتی ہوں۔ کم سے کم چند سال اور زیادہ سے زیادہ یہ زندگی!"

"لیکن تم نے اپنے لئے کیا سوچا ہے؟"

"اپنے لئے مجھے کچھ نہیں سوچنا ہے مہندر بابو!"

"کیا تم یہ جُدائی برداشت کر لو گی؟"

"جُدائی کیسی؟ ہم دونوں تو جنم جنم کے ساتھی ہیں (ذرا دھیمی آواز میں) جنم جنم کے ساتھی!" (گیتا کے آخری بار جنم جنم کے ساتھی کہنے کے ساتھ ہی موسیقی اُبھرے اور پھر یکدم پس منظر میں گم ہو جائے۔)

افسانۂ رنگ و بو

از

جناب امر چند قیس جالندھری

اِک گُلِ رنگین سے میں نے صحنِ گلشن میں کہا — وہ بھی عالم یاد ہے تجھ کو کہ تو رنگین تھا
کونپلوں ہی میں نہاں تھا تیرا رنگِ لاجواب — تیرے عارض سے ابھی پھوٹا نہ تھا حُسنِ شباب
وقت نے تجھ کو نہ دی تھی شکل غنچے کی ابھی — اور نوکِ شاخ پر تیری جھولی نہ تھ

یہ بھی عالم ہے کہ تجھ میں آگئی ہے موہنی — اُڑ رہی ہے صحنِ گلشن میں مہک ہر سُو تری
دیکھنے والوں کو دیوانہ بنادیتا ہے تُو — راہ گیروں کو بھی مستانہ بنادیتا ہے
تجھ پہ تتلی مست ہے تجھ پر فدا بادِ صبا — جس پہ شیدا ہے زمانہ تُو ہے اب وہ د

اُس گُلِ رعنا کا سر فرطِ حیا سے جُھک گیا — اور وہ حسرت بھرے انداز میں کہنے لگ
"میری خوش رنگی بلائے جاں ہے میرے واسطے — میری خوشبو موت کا ساماں ہے میرے وا
کاش گلشن میں نہ آتی بھول کر بادِ بہار — کاش ! کھل سکتا نہ میں مجھ کو یہ ہوتا اختیا

خار نے جب یہ سُنا تو زیرِ لب اِک آہ کی — اور بولا "رشک کے قابل ہے گُل کی زندگ
پڑ گئے الفاظ یہ بادِ صبا کے کان میں — پتے پتے سے وہ کہہ آئی بہارستان میں
"گُل اُٹھا سکتا نہیں جس رنگ و بُو کے بار کو — اُف ! اُسی کی آرزو تڑپا رہی ہے خار

بیسویں صدی دہلی

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں فی
پرچہ
آٹھ آنے

جولائی
۱۹۵۵ء

جلد ۱۹
نمبر ۷

سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت
۹ شلنگ
ٹیلیفون دفتر
۲۶۶۳۷
ٹیلیفون ہاؤس
۴۸۰۲۵
ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ :- بیسویں صدی ۔ ترکمان گیٹ ۔ نئی دہلی

افسانہ

پتھّر کی پہاڑی

از

محترمہ نکہت اقبال بی۔اے۔بی ٹی

۱۱۶۔گاندھی گارڈن ویسٹ کراچی —— ۱۵ر مئی ۱۹۵۶ء

بھائی صاحب!

تسلیم۔ افسانہ نمبر میں شرکت کی دعوت کے لئے شکریہ! —— ایک ڈائری نما افسانہ حاضر ہے۔ یہ میرا پہلا ڈائری نما افسانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں عام روش سے ہٹ کر چلی ہوں۔ کہاں تک کامیاب ہوئی، یہ میں نہیں بتا سکتی یہ نقادوں اور پڑھنے والوں کا کام ہے —— میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اسے پڑھنے والے اس میں عورت کے دل کی دھڑکنیں محسوس کریں گے۔

پتھر کی پہاڑی تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن اکثر انسان بھی پہاڑی ثابت ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ چلتا پھرتا ہے۔ لیکن پتھر کی پہاڑی چل نہیں سکتی۔ صوفیہ آپا کو میں نے ایک پہاڑی سے تشبیہ دی ہے۔ اور جو کچھ کہنا چاہتی تھی اُسے شاید کامیابی سے نبھایا بھی ہے —— ویسے تو انسان اور پتھر کا مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن فنکار کی نظر مقابلہ کر سکتی ہے۔

بھابی کی خدمت میں آداب کہیے۔ بچوں کو بہت سے پیار۔

آپ کی بہن

نکہت اقبال

. . . . . آج بھی یہاں کی دھوپ چمپئی ہے۔ بقول صوفیہ آپا کے دھوپ کیلی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی لڑکی نے صبح صبح اپنے زرد دوپٹے کا آنچل پھیلا دیا ہو۔ مجھے صوفیہ آپا کا یہ جملہ بہت پیارا معلوم ہوا۔ اور واقعی ہے بھی پیارا جملہ۔ پیلے آنچل کے پھیلنے پر غور کیا جائے تو تخیل کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے —— سفید پوش پہاڑی آنکھوں میں اُبھر آتی ہے جس پر ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں آنچل کے دونوں کنارے پکڑے ہے۔ اور کھڑی مسکرا رہی ہے جیسے کوئی آئینہ دکھائے —— چمپئی دھوپ اب سامنے پھیلے ہوئے شفتالو اور آڑوؤں کے سرسبز درختوں تک جا پہنچی ہے سبز رنگ پر زرد رنگ اب "آنچل والی لڑکی" نے پھینک دیا ہے —— لیکن یہ کیا بات ہے کہ میں جب بھی چمپئی دھوپ کو دیکھتا ہوں تو صوفیہ آپا کے زرد گال کیوں نمایاں ہو جاتے ہیں؟

اُس وقت بھی یہی ہوا۔ بڑھتے ہوئے زرد رنگ کو دیکھ کر صوفیہ آپا کے

... چھپتا ہوا زرد رنگ یاد آ گیا۔ میں اُس وقت ناشتے کی میز پر بیٹھا شفاف شیشوں کی کھڑکیوں سے ... باہر کے پہاڑی منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کہ صوفیہ آپا کو ... مڑ کر دیکھا کہ وہ چونک گئیں۔ حالانکہ وہ میز کے ایک جانب بہت دیر سے بیٹھی میری طرح باہر فضاؤں میں زرد رنگ کے کرشمے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو خاموشی سے مجھے دیکھا۔ اور پوچھا۔

"کیا بات ہے خالد؟"

"کچھ نہیں۔"

"تم نے مجھے چونک کر دیکھا کیوں؟"

"دل کی بات بتادوں آپا؟"

"ہاں دل کی بات بتا، خالد! دل میں جو بات آئے کہدیا کرو ورنہ — وہ دل میں جو بات گھٹ جاتی ہے، ناسور بن جاتی ہے۔"

"جب میں چمپئی دھوپ کو دیکھتا ہوں تو آپ کے گالوں کی زردی بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے صوفیہ آپا؟"

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا خیال ہی ہو خالد۔"

صوفیہ آپا نے لیٹے لیٹے پہلو بدلا اور قدرے مسکرا کر کہا۔ اُن کی مسکراہٹ نے مجھے اچانک یہ احساس دلایا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں، وادیوں، شفتالو، اور آڑوؤں کے باغات پر چھا جانے والی چمپئی دھوپ دراصل آنچل کا کرشمہ نہیں صوفیہ آپا کی پھیکی ہوئی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ حالانکہ کچھ دن پہلے جب صوفیہ آپا ہنستی تھیں تو سچ مچ پھول کھل جاتے تھے لیکن اب وہ بات اُن کی مسکراہٹ میں نہیں تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے صوفیہ آپا کی ہنسی بہت پسند تھی۔ ویسے تو وہ بہت مغرور تھیں۔ کبھی منہ نہ لگاتی تھیں اور مجھے اُن سے اِس کی شکایت تھی کہ وہ مجھے اپنا بھائی نہیں، غریب رشتہ دار سمجھتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اُن کی ہنسی بہت پیاری تھی۔ اور جب وہ ہنس دیتی تھیں، میرا دل صاف ہو جاتا تھا۔ لیکن میری شکایت دُور کرنے والی وہ ہنسی نہ جانے صوفیہ آپا کہاں کھو چکی تھیں۔

"نہیں خالد ایسی بات تو نہیں ہے۔"

"پھر آپ چپ چپ کیوں رہتی ہیں۔ پارسال جب آپ پہاڑ آئی تھیں تو گم صم نہیں تھیں۔ لیکن نہ جانے اس بار آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

صوفیہ آپا نے آہستہ سے ٹھنڈی سانس لی۔ اور یہ کہہ کر چلی گئیں "تمہارے لئے گرم کافی لاؤں، یہ تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" اور مجھے شک ہوا کہ شاید میں نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ میں گالوں کی زردی کا راز ضرور معلوم کروں گا۔

. . . . آج نہ یہاں وہ چمپئی دھوپ ہے اور نہ خنک ہوا کچھ عجیب سا موسم ہے۔ اُداس اور مغموم سا موسم۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ صوفیہ آپا اُداس ہیں۔ اس لئے ساری فضائیں نڈھال ہیں۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ عورت چاہے تو ساری فضاؤں کو نکھا دے اور چاہے تو رُلا دے۔ میں اس جملہ کو ایک شاعرانہ جملہ سمجھتا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ رہا ہوں!

جب ماحول اُداس ہو اور جی گھبرائے تو چہل قدمی آدمی کو بہلا دیتی ہے میں خوبانیوں کے باغ کی طرف ہو لیا۔ جہاں صوفیہ آپا اکثر خوبانیاں کھانے جاتی تھیں۔ باغ خوبانیوں سے لدا کھڑا تھا لیکن خوبانیاں مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ وہ دن مجھے یاد آ گیا جب میں صوفیہ آپا کے ساتھ یہاں خوبانیاں کھانے آیا تھا۔ وہ خوبانیاں توڑتی جاتی تھیں اور آدھی خوبانی کھا کر مجھے دیتیں اور کہتیں۔

"لو یہ خوبانی کھاؤ۔ دیکھو کتنی میٹھی اور رسیلی ہے۔"

اور میں کٹی ہوئی خوبانیاں کھاتا رہا۔ شاید انجان بن کر۔ ورنہ جھوٹی چیز کھانا مجھے پسند نہیں۔ لیکن یہ میں سمجھ نہ سکا کہ میں صوفیہ آپا کے منھ کی خوبانیاں کیسے کھاتا رہا۔ آج تنہائی میں بھی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ کئی گھنٹے میرے باغ میں گزر گئے۔ اور نہ جانے کیا کیا خیالات آتے رہے۔ کیا صوفیہ آپا کسی سے محبت کرتی ہیں؟ کیا جوانی میں کسی لڑکی کا محبت کرنا ضروری ہے؟ کیا محبت پھول نہیں کانٹا ہے؟

گھر آتے ہی میرے قدم صوفیہ آپا کے کمرے کی طرف ہو لئے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھیں اور نہ جانے کہاں تھیں۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ شاید وہ سو رہی ہیں لیکن کھڑے کھڑے کون سو سکتا ہے؟

"صوفیہ آپا!"

وہ چونک پڑیں اور مجھے شک ہوا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرا گئیں، ور آنسو پی گئیں۔ جب باتیں شروع ہوئیں تو صوفیہ آپا کی آواز میں چھپا ہوا درد ظاہر ہوگیا۔

"آپا! آج وہ چمپئی دوپٹے والی لڑکی نہیں آئی؟ کیونکہ آج کی دھوپ سفید تھی۔ آپ نے محسوس کیا؟"

"ہو سکتا ہے اُسے کوئی کام ہو؟"

"کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ آج اُداس ہو۔"

"بھلا اُسے کیا غم ہو سکتا ہے؟"

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ نہیں سمجھ سکتے۔"

"پھر بھی میں بارہ سال کا ہوں۔ غم کو تو سمجھ سکتا ہوں۔"

اُنھوں نے مجھے بہت گھور کر دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اور بولیں۔

"کاش تم بھی غم آشنا ہوتے؟"

"میں غم آشنا بھی ہوں آپا۔"

"تمھیں کیا غم ہے؟"

"آپ کی خاموشی میری اُداسی کا باعث ہے!"

"سچ ——؟"

یہ کہہ کر صوفیہ آپا نے میری پیشانی چُوم لی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دو گرم پھلے میری پیشانی سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ میں نے آپا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور اُنھیں مجبور کیا کہ وہ اپنا درد بتائیں، پہلے تو وہ ٹال گئیں پھر وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور مجھے رازداں بنالیا۔ پہاڑ پر دن بھر اُداسی اور بے کیفی چھائی رہی۔ صوفیہ آپا دن بھر کمرے میں رہیں۔ یہاں تک کہ پہاڑ جیسی رات سر پر آگئی۔

. . . . . آج میں دن بھر صوفیہ آپا کے متعلق سوچتا رہا۔ اور معلوم نہ ہو سکا کہ دھوپ کب نکلی اور کب اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں آج وہ چمپئی آنچل والی لڑکی آئی تھی یا نہیں ——؟

نہ جانے کس نے اور کب یہ بات کہی تھی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکی کی اُداسی اور لڑکی کے غم میں محبت بڑی وجہ ہوتی ہے۔ صوفیہ آپا کا غم بھی محبت نے پیدا کیا تھا۔ محبت کرنا اُن کا حق تھا۔ لیکن اُس حق کے لئے غم اپنانا اُنہاں کی سمجھداری ہے میں نے صوفیہ آپا کو مجبور کیا کہ وہ آڑو کھانے اور رکھلانے باغ چلیں۔ بہت خوشامد کے بعد وہ راضی ہوگئیں۔

باغ پہنچ کر صوفیہ آپا ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئیں۔ اور کہنے لگیں۔

"خالد! کل میں نے شاید تمھاری عمر سے زیادہ باتیں بتادیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا۔"

"یہی کہ تمھیں میں نے رازداں بنالیا۔ جو شاید اچھا نہیں کیا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ بہت چھوٹے ہو معصوم ہو۔"

"میں آپ کا دوست بھی ہوں اور ہمدرد بھی!"

"کیا تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟"

"مجھے آپ سے نفرت نہیں ہو سکتی۔"

اس جواب پر اُنھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اُنھیں میرے جواب پر حیرت تھی۔ اور میں یہ حیرت دور کر دینا چاہتا تھا —— صوفیہ آپا کو بتا دیا کہ میں محبت کو بُری نہیں سمجھتا۔

"لیکن امی تو بہت ناراض ہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے جس سے محبت ہے وہ . . . ."

صوفیہ آپا کچھ نہ کہہ سکیں۔ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئیں۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔

"آپ جس شخص سے محبت کرتی ہیں وہ کوئی بڑا آدمی نہیں۔ ایک معمولی کلرک ہے لیکن بھیک تو نہیں مانگتا۔ چوری تو نہیں کرتا۔ زندگی کی مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ مونس بھائی مجھے اچھی طرح سمجھا چکے ہیں کہ وہ آدمی بہت بڑا ہے جو زندگی کی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے!"

"فلدا!" صوفیہ آپا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ خدا کی قسم تم بہت بڑے آدمی
ر گے۔ یہ خیالات تمھیں بہت بلندی تک لے جائیں گے۔"

اور انھوں نے میری پیشانی چوم لی۔ شاید میں نے صوفیہ آپا کو خوش کر دیا
تھا۔ میں اس سے زیادہ اور کس خوشی کا متمنی ہو سکتا تھا۔

لیکن خالہ جان مجھ سے ناراض تھیں۔ کیونکہ وہ صوفیہ آپا کی محبت سے نالاں
یں۔ میں نے انھیں یہ کہہ کر ناراض کر دیا تھا کہ محبت موٹر اور دولت نہیں چاہتی
الہ جان صوفیہ آپا کے لئے ایسے شوہر کی متمنی تھیں جو دولت اور مرتبہ بھی ساتھ لائے
ین انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ دولت محبت کے لئے تریاق ہے۔ دولت اور
تبہ ڈھونڈ کر وہ صوفیہ آپا کے لئے پھول نہیں چن رہی ہیں۔ کانٹے بو رہی ہیں۔ اور
انٹے نہ صرف صوفیہ آپا کے بلکہ خود خالہ جان کے زندگی بھر چبھتے رہیں گے۔ صوفیہ
کے لئے میں خالہ جان سے تو کیا خدا سے بھی لڑ سکتا ہوں۔ حالانکہ صوفیہ آپا نے
ے بہت سمجھایا کہ میں ایسا نہ کروں۔ انھیں شاید یہ ڈر ہے کہ خالہ جان اگلے سال
مجھے اپنے ساتھ پہاڑ نہیں لائیں گی۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں اسی حالت
پہاڑ آ سکتا ہوں۔ جب یہاں کی فضائیں مسکرائیں۔ اور ہر صبح کو سنہری دھوپ
نکلے۔

...... آج ہم دونوں سیر کے لئے نکلے تھے۔ صوفیہ آپا نے آج
ت کے موضوع پر کھل کر بات کی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہر زندہ شخص کو محبت سے
ار چار ہونا پڑتا ہے۔ اور وہ لوگ مر جاتے ہیں جو محبت سے آشنا نہیں ہوتے
تا یہ نے ٹوک دیا۔

"لیکن محبت تو شاید موت کا دوسرا نام ہے۔!؟"

"نہیں۔"

محبت اگر گالوں کی سرخی چھین لے۔ ہونٹوں کا تبسم چرالے، راتوں کی
ور دل کا سکون لے اُڑے۔ تو آدمی بچ گیا ہے گا؟"

"میں نہیں کہتی تھی کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہ تمھاری عقل کا نہیں عمر کا
ہے۔ جب بڑے ہوگے تو سمجھو گے کہ محبت دراصل زندگی ہے اور غم محبت
کرتا ہے۔ اس لئے محبت زندگی بڑھاتی ہے۔ [illegible]

میں اس فلسفے پر غور کرتا ہوں تو بات اور اُلجھ جاتی ہے۔ جو شخص کھانا نہ
کھائے گا تو مر جائے گا۔ سانس نہ لے گا تو جینا ناممکن ہو جائے گا۔ پھر غم زندگی کو
کم کرنے کے بجائے دوبالا کیسے کر دیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت دراصل فکروں
اور پریشانیوں کے اجتماع کا دوسرا نام ہے۔

دوپہر میں صوفیہ آپا نے مجھے ایک ناول پڑھنے کو دیا تھا۔ جس کی ہیروئن
صوفیہ آپا کی طرح محبت میں جل رہی تھی۔ مجھے تو شک ہوا کہ ناول کی ہیروئن کہیں
صوفیہ آپا ہی تو نہیں ہیں۔ دونوں کے حالات کتنے یکساں تھے۔ دونوں محبت کرتی
تھیں۔ لیکن دونوں کی محبت میں دیواریں حائل تھیں۔ ہیروئن بھی زندگی دے کر مسلسل
غم کی خواہاں تھی۔ اور یہی حال صوفیہ آپا کا تھا۔

ناول پڑھتے پڑھتے میں سو گیا۔ سو کر اُٹھا تو صوفیہ آپا سیر کے لئے تیار تھیں
رستے میں انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے محبوب سے ملنے جا رہی ہیں — صوفیہ آپا کا محبوب
کلرک تھا۔

میں نے پوچھا۔

"آپ نے کسی بڑے آدمی کے بجائے ایک کلرک سے اپنے دل کا دامن کیوں
باندھا؟"

آپا نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کلرک انسان نہیں ہوتا؟ اپنی محنت سے رزق کماتا ہے بھیک نہیں
مانگتا۔ امیروں کی طرح غریبوں کا خون نہیں چوستا۔ انسان ہو کر غریب انسانوں سے
نفرت نہیں کرتا۔"

لیکن واپسی پر خالہ جان کہہ رہی تھیں۔ میں اپنی لڑکی ایک کلرک کو نہیں دے
سکتی۔ میں ایک کلرک کو اپنا داماد نہیں بنا سکتی۔ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔
صوفیہ تو نادان ہے۔

دوسری طرف کمرے میں صوفیہ آپا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ محبت
انھیں رلا رہی تھی۔ ہمارے ملک میں محبت [illegible]
[illegible]
ہم پیدا ہوتے ہیں تو [illegible]

ہیں۔ مرنے کے بعد ہیں سب روتے ہیں ... رونے کا کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دوسرے دن میں نے صوفیہ آپا کو ٹٹولا۔

وہ دلیرانہ قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتی تھیں۔ روایتی عمل چاہتی تھیں۔ اُسے بھول بھی نہیں سکتی تھیں۔ پھر کیا ہو سکتا تھا؟ بات بنے تو کیسے بنے؟ خالہ جان اپنی ضد پر قائم تھیں۔ جب میں نے بہت کہا سنا تو غصہ ہو گئیں اور کہا۔

تم مجھے بے وفا سمجھتے ہو خالد؟"

بھیگی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں نے کہا۔

"میں تو آزما رہا تھا۔"

عورت محبت میں باوفا ہوتی ہے۔ چٹان کی طرح۔ اور چٹان آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتی!

۔۔۔۔۔۔ آج بھی کل کی طرح اُداسی اُداسی رہی۔ آج کا دن بھی کل ہی کی طرح بیت گیا۔ صوفیہ آپا اپنے کمرے ہی میں رہیں۔ اور میں نے چاہا بھی کہ مل لوں لیکن دروازے اندر سے بند تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کتاب پڑھتا رہا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب دل پریشان ہو تو کتاب میں بھی طبیعت نہیں لگتی۔ پڑھتے پڑھتے خیال اُس کمرے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں صوفیہ آپا دل کے زخم سے کھیل رہی تھیں میں نے کوشش بھی کی کہ میرا خیال اُن کی طرف نہ جائے۔ لیکن خیال بھی اُڑتے ہوئے بادل کی طرح ہے جدھر چاہا چلا گیا۔

کتاب چھوڑی تو باغ کا رُخ کیا۔ لیکن وہاں بھی جیسے سکون نہیں تھا خالہ جان بھی دن بھر نہ جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں۔ رات کو کھانے کی میز پر صوفیہ آپا سے خلافِ اُمید ملاقات ہو گئی۔ دن بھر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے غور سے دیکھا۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ دن بھر تنہائی میں رہ کر اُن پر کیا اثر ہوا ہے۔ اور یہ کہ وہ کن دشوار گزار منزلوں سے گذرتی رہی ہیں لیکن خلافِ اُمید صوفیہ آپا مسرور تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگیں اور بولیں۔

"آج تم کہاں رہے خالد؟"

"میں تو یہیں تھا۔ لیکن آپ کہاں گئی تھیں؟"

"شریر کہیں کے۔" وہ مجھے دیکھ کر ہنسیں۔ اور کہا "میں تو کمرے میں تھی۔ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"لیکن آپ نے تو دروازے بند کر رکھے تھے۔ میں کس طرح آجاتا؟"

"مجھے امید تھی کہ تم دستک دو گے۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ معلوم ہوا کہ تمھیں میری کوئی فکر نہیں ہے۔ کیوں؟"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے مجھے پہاڑی سے ڈھکیل دیا ہو۔ میں صوفیہ آپا کو کتنا چاہتا ہوں، اس کا انھیں احساس نہیں ہے۔ اگر احساس ہوتا تو وہ چٹکی نہ لیتیں ــــ!

میں جا نہیں رہا تھا۔ لیکن مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئیں۔ راستے بھر میرے ہونٹ سلے رہے۔ لیکن وہ گنگناتی رہیں۔ مجھے تعجب ضرور ہو رہا تھا کہ صوفیہ آپا اچانک بدل کیسے گئیں؟ کچھ سمجھ میں تو نہیں آیا۔ لیکن میں خوش ضرور تھا، اس لئے کہ اب پہاڑی فضائیں بھی مسکرا دیں گی۔

تھک گئے تو ایک پتھر پر پاس ہی پاس دونوں بیٹھ گئے۔ اچانک آپا نے کہا۔

"یہ سفید پہاڑی دیکھ رہے ہو؟"

"جی!"

"خوبصورت ہے؟"

"بہت ــــ"

"اگر میں انسان نہ ہوتی تو خوبصورت پہاڑی ہوتی۔"

"پھر آپ میری آپا نہیں ہو سکتی تھیں۔"

"لیکن میں تمھیں چاہتی بہت۔"

"پتھر کہیں محبت کرتے ہیں؟"

"انسانوں سے زیادہ!"

اور اپنے کمرے میں آنے کے بعد سامنے والی سفید پہاڑی جو چاندنی رات میں چمک رہی تھی میری توجہ کا مرکز بنی رہی ــــ کیونکہ صوفیہ آپا اگر انسان

نہ ہوتیں تو سلسلے والی پہاڑی ہوتیں —!!

. . . . . آج عرصے کے بعد چمپئی دھوپ نکلی تھی۔ چمپئی آنچل والی لڑکی آج پھر آگئی تھی! لیکن وہ چلی کہاں جاتی ہے؟ آج دن پچھلے دنوں سے کچھ اچھا گزرا۔ آج ہم سب پکنک پر گئے تھے۔ صوفیہ آپا، خالہ جان اور میں بھی۔ کچھ اور لوگ بھی تھے ان میں چند لڑکیاں بھی تھیں۔ اور چند نوجوان بھی تھے۔ مجھے پکنک میں بے حد لطف آیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ صوفیہ آپا پر بھی پکنک کا بہت اچھا اثر پڑا۔ وہ دن بھر ہنستی بولتی رہیں۔ کھیلی کودیں بھی، گانا بھی گویا۔ آج تو مجھے یہ شک ہو رہا تھا کہ وہ کبھی مغموم ہی نہیں تھیں۔ غم اُن سے بہت دُور تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے اچانک ایک انکشاف ہوا، وہ بھی اتفاقیہ۔ دو آنکھیں صوفیہ آپا کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔ صوفیہ آپا کو شاید اِس کا احساس نہ تھا۔ ورنہ اُن کے گال سُرخ ہو جاتے۔ میں چُپکے چُپکے بھانپ رہا تھا۔ فرید کی آنکھیں بدتمیزی کر رہی تھیں۔

اچانک مجھے غصہ آگیا۔ اور میں بے سوچے سمجھے بول اُٹھا۔

"صوفیہ آپا! دیکھئے یہ صاحب آپ کو بہت دیر سے گھُور رہے ہیں۔۔"

جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ صوفیہ آپا نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دوسرے سب ہی لوگ بُری طرح ہنس رہے تھے۔ لڑکیاں بھی اور نوجوان بھی۔ میں نہیں دیکھ سکا کہ فرید کس طرح ہنس رہا تھا۔ لیکن چند لمحوں بعد دیکھا تو فرید اُٹھ چکا تھا۔ صوفیہ آپا کے گال مسلسل رنگ ہی بدلتے رہے۔

بہت مشکل سے صوفیہ آپا پہاڑی گھوڑوں کی سواری کے لئے آمادہ ہوئیں۔ ٹٹوؤں کی سواری میں تو مجھے مزہ ہی آگیا۔

بہت ہی پُرلطف سواری ہے۔ وہ بھی جب اُونچے نیچے پہاڑوں کا سفر ہو۔ ٹھٹھے قدم قدم پر اُڑ رہے تھے۔ کیونکہ کبھی کوئی ڈھلک پڑتا تھا۔ تو کبھی کوئی لڑکیاں تو سب ہی گریں۔ اپنے کو سنبھال نہ سکیں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ صوفیہ آپا بہت توجہ اور محنت کے ساتھ باگیں پکڑے بیٹھی تھیں۔ وہ شاید اپنے پر ہنسوانا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن چند ہی منٹ بعد جب چڑھائی آئی تو وہ بھی ڈھلک گئیں۔ فرید پیچھے آ رہا تھا۔ جلدی سے کود پڑا اور صوفیہ آپا کو ہاتھوں میں لے لیا۔

ہاں! مجھے کچھ جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی کیا وجہ تھی لیکن میں ناگواری محسوس کر رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ صوفیہ آپا اسے کیوں برداشت کر رہی تھیں۔ اُدھر فرید کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی نہ کسی بہانے آپا کے پاس آجاتا اور باتیں کرنے لگتا تھا۔

ایک چٹان پر پہنچکر لڑکیوں کی رائے ہوئی کہ اِس چٹان کا فوٹو ہو۔ فرید کے پاس کیمرہ تھا۔ اُس نے فوٹو لئے۔ صوفیہ آپا کا فوٹو تو تنہا بھی لیا۔ مجھے تو جب صوفیہ آپا نے ہی نظر انداز کر دیا تھا تو دوسرا کون یاد رکھتا۔ میں چٹان کے کنارے بیٹھ گیا اور اُس نشیب کو دیکھنے لگا جو ہزاروں فٹ گہرا تھا۔ کتنا بھیانک اور خطرناک تھا۔ اگر کوئی گر پڑے تو پتہ نہ چلے کہ کہاں گیا۔

"ارے خالد!" صوفیہ آپا نے بازو پکڑتے ہوئے کہا ——— کیا گرنے کا ارادہ ہے؟"

"آپ دھکا دے دیجئے۔"

"ارے پاگل ہوا ہے۔"

میرا بازو پکڑے ہوئے صوفیہ آپا کنارے سے چلی آئیں اور دیر تک سمجھاتی رہیں کہ خطرناک مقام سے آدمی کو دُور رہنا چاہئے۔

"آپ بھی خطرناک مقام سے دُور رہئے۔"

"میں —؟"

"ہاں آپ!"

پھر لڑکیاں آگئیں۔ ورنہ میں کہہ دیتا کہ فرید بھی ایک خطرناک غار ہے۔ اور آپ اُس کے کنارے کھڑی ہیں۔

. . . . آج تیسرا دن ہے کہ موسم اچھا ہے۔ لیکن اِن تین دنوں میں صوفیہ آپا سے ملاقات ہی نہ ہوئی۔ وہ کہاں رہتی ہیں، خدا نے جانے؟ میں اُن سے یہ دریافت کرنے کے لئے بے قرار تھا کہ پہاڑوں میں غار اور نشیب کیوں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ ملیں بھی تو —؟

میں نہ جانے کیا کیا سوچتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ سوچنا بُرا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تو یہی کہوں گا کہ صوفیہ آپا کو فرید نے جال میں پھانس لیا ہے!



ع وہ اب شب آنے والی آگئی کیا تم نہ آوگے

صوفیہ آپا کا جال میں پھنس جانا کوئی تعجب کی بات بھی نہ ہوگی کیونکہ کسی کا کہنا ہے کہ لڑکیاں اور چڑیاں ایک ہی فطرت کی مالک ہوتی ہیں۔ انھیں جال میں پھنسا لینا مشکل کام نہیں۔

آج چمپئی دُھوپ تو میرے سامنے نکلی تھی۔ فضائیں بھی خوش ہیں جس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ صوفیہ آپا جہاں بھی ہوں گی، خوش ہوں گی۔ لیکن وہ [illegible] پہاڑی کیوں اُداس ہے؟

آخر رات کو صوفیہ آپا سے ملاقات ہوگئی۔

میں نے پوچھا۔

"آپ تو دکھائی نہیں دیتی ہیں"

"تمھیں کیا میری جستجو ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"آخر کیوں؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پہاڑوں میں غار کیوں ہوتے ہیں؟"

"زیادہ نہ سوچا کرو خالد!" انھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ "دماغ کمزور ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

لیکن میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا۔ صوفیہ آپا بہت زیادہ خوش تھیں۔ مجھے اُن کی خوشی سے یقیناً جلن نہیں ہے۔ کیونکہ میں انھیں [illegible] دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اُن کی خوشی اور اُن کے مسکرانے کا پس منظر کیا ہے؟

میں کمرے کی طرف مڑ لیا۔

صوفیہ آپا مسہری پر لیٹی تھیں اور گنگنا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اپنے قریب [illegible] لگیں۔

"تم نے کہا تھا کہ میں مسکرایا کروں ——— تو میں نے مُسکرانا [illegible]"

[illegible]

[illegible] کون سکھاتا ہے؟"

"میں نے سمجھا شاید کوئی آپ کو ہنسنا سکھا رہا ہے!"

"اچھا بتاؤ آج تمھارا دن کیسے گزرا ——— شفتالو اور آڑو کھانے گئے تھے؟"

"آڑوؤں میں مزہ نہیں رہا۔ اور شفتالو کھٹے ہوگئے۔"

اس پر صوفیہ آپا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور دیر تک گھورتی رہیں۔ میں بھی آپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھیں دُور تک تلاش کرتا رہا۔ پھر اچانک اُن کی آنکھیں جھک گئیں اور کہنے لگیں۔

"تم مجھے شاید بے وفا سمجھتے ہو گے؟"

میں چپ رہا۔

انھوں نے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں۔

"تم مجھے بے وفا سمجھتے ہو، حالانکہ میں بے وفا نہیں ہوں۔"

میں پھر بھی چپ رہا۔

صوفیہ آپا بے چین ہوگئیں۔ اور میں اب کی بار اٹھا اور کمرے کی طرف مڑ لیا۔

صوفیہ آپا کو وہیں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

. . . . . آج کی [illegible] دھوپ نکلی تھی۔ وہ چمپئی آپا [illegible]

[illegible] خوش [illegible] پھولوں سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صوفیہ آپا [illegible] وہ تو [illegible]

بعد ہی مجھے نہیں مل سکی تھیں۔ اُن کی محبت [illegible] کی طرح سوکھ گئی تھی۔ وہ تو اُن ہی دنوں فریب میں کچھ اس طرح گم ہوئیں کہ زمانے اور اپنی محبت کو بھلانے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھول چکی تھیں۔

آج میں کئی سالوں کے بعد یہاں اس غرض سے آیا تھا کہ ممکن ہے پہاڑ کی مانوس فضائیں مجھے آپا کا کچھ پتہ دے سکیں۔ یہ خیال تھا کہ شفتالو کے باغات جہاں آپا شفتالو کھانے بار بار آئی تھیں۔ اور پہاڑ [illegible] اُن سے واقف ہیں۔ میری کچھ مدد کر سکیں۔ آڑوؤں [illegible] باغات میری [illegible] کا مرکز تھے۔ لیکن

کسی نے میری [illegible] وہ سب خود حیران و پریشان تھے۔ انھیں بھی صوفیہ آپا کا انتظار تھا۔

شام کو میں اُس پہاڑی کے قدموں تک پہنچا، جہاں صوفیہ آپا گھنٹوں تنہائی میں بیٹھی رہتی تھیں۔ اور جس کے بارے میں اُنھوں نے کہا تھا کہ ــــ

"اگر وہ انسان نہ ہوتیں تو وہ سفید برف پوش پہاڑی ہوتیں۔ لیکن مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ جب پہاڑی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں نے پوچھا تھا۔

"تم بتا سکتی ہو صوفیہ آپا کہاں ہے؟"

"نہیں!"

"کیا وہ پھر کبھی تم سے ملنے آئیں؟"

"نہیں!"

"لیکن وہ تمھیں بھول نہیں سکتیں"

"بھول گئیں ــ بھول گئیں ــ بھول گئیں!!"

"کیا صوفیہ نے سب کو بھلا دیا؟"

"کیا ہم سب انھیں کبھی یاد نہ آئیں گے؟"

خوبانیوں کے پیڑوں کے درمیان سے ہوا آواز کرتی ہوئی گزر رہی تھی جس نے ماحول کو اور زیادہ مغموم بنا دیا تھا۔ اچانک میرے منھ سے نکلا۔

"صوفیہ آپا تم بے وفا نکلیں!"

اور یہ الفاظ پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے دُور تک نکل گئے!

دراصل صوفیہ آپا فرید کو پاکر خود کو بھی بھُلا بیٹھی تھیں۔ اور جب خود فراموشی اِس حد تک ہو تو پھر کیا شکایت!۔ انھیں بیوفا ہونے سے انکار تھا۔ اِس پر وہ ایک بار بُرا مان گئی تھیں لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ بیوفا نہیں تھیں۔ اُنھوں نے مجھ سے ایک بار نہیں بارہا کہا تھا کہ مجھے کبھی فراموش نہ کریں گی لیکن پھر بھی فراموش کر دیا۔ شادی نے اُن کی زندگی ہی بدل دی۔ لیکن خوشیاں اور مسرتیں کیا اتنا بدل دیتی ہیں۔ شادی کسی کو اِتنا بدل دیتی ہے؟

میں اُس پہاڑی کو دیکھ رہا ہوں جسے صوفیہ آپا پیار کرتی تھیں ــ پتھروں کی حسین لیکن بے جان پہاڑی اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ لیکن صوفیہ آپا، جو خود بھی ایک پہاڑی ہی تھیں ــــ حُسن کی جاندار، چلتی پھرتی، اور گاتی، گنگناتی پہاڑی! ــــ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں مجھے یاد آرہا ہے کہ آپ نے تلقین کی تھی کہ میں جوان ہوکر محبت ضرور کروں۔ کیونکہ محبت زندگی دیتی ہے۔

میں محبت تو کروں گا ــــ

لیکن کسی انسان سے نہیں ــــ پتھر کی کسی پہاڑی سے ــ کیونکہ

پتھر کی پہاڑی کبھی بے وفا نہیں ہو سکتی ــــ !!!

ہمارا آدمی




خستہ... تازہ... مزیدار...
بہترین بسکٹ
برٹینیا
BRITANNIA
THIN

غزل

از

جناب نافع رضوی ایم اے۔ ایل ایل بی

ظلمتیں نورِ سحر کو پیار کرتی ہی رہیں
مرمریں شانوں پہ وہ زلفیں بکھرتی ہی رہیں

میں لب و رخسار کے نغمات گاتا ہی رہا
اور حریمِ ناز میں زلفیں سنورتی ہی رہیں

دیکھتے تھے وہ نگاہِ لطف سے مجھ کو مگر
دل میں نشتر بن کے وہ نظریں اترتی ہی رہیں

اتراتا ما آپ کی محفل میں چپ بیٹھے ہم تو کیا
آرزوئیں بے رُخی کا شکوہ کرتی ہی رہیں

میکدے میں یُوں تو نافع نے بہت چھلکائے جام
پھر بھی دل کی چوٹیں شامِ غم اُبھرتی ہی رہیں

غزل

از

محترمہ شاہین بیگم

نہ ہوش سے ہے قریب اور نہ بیخودی سے دُور
نہ جانے کون سی منزل پہ آ گیا ہے شعُور

مجھے فریبِ محبت سے آشنا مت کر
ابھی حیات ہے غم ہائے روزگار سے دُور

تُو میرے سامنے ہے اور سامنے بھی نہیں
کبھی نظر میں ہے جلوہ ترا کبھی مستُور

ذرا سا فرق ہے بس حُسن و عشق میں اے دوست
کوئی نیاز کا بندہ، کوئی نیاز سے دُور

حیات و موت میں بس اتنا فرق ہے شاہین
حیات غم سے ہے معمور، موت غم سے دُور

غزل

از

جناب جعفر شیرازی

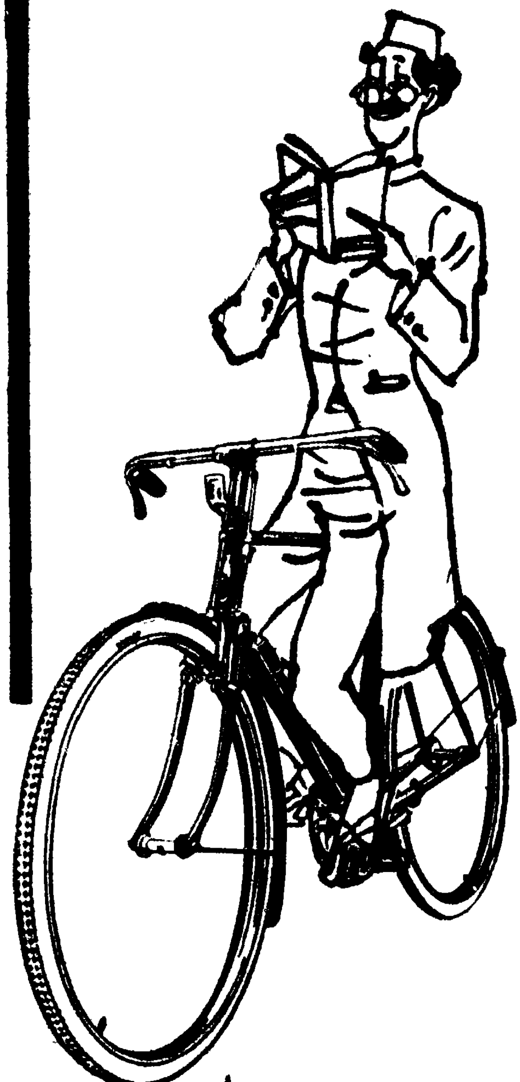
چشمِ ویراں سے اُبل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ
جب وہ یاد آتے ہیں چل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ

شب ڈھلے کی ہے ملاقات کوئی آنکھوں میں
اب جو شب ڈھلتی ہے ڈھل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ

کبھی جن آنکھوں سے بے وجہ اُچھلتی تھی ہنسی
اب اُن آنکھوں سے اُچھل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ

دل اُنھیں بھُول ہی جانے پہ ہے آمادہ مگر
ہائے جب آنکھوں سے ڈھل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ

اُف یہ حالات کہ افسانۂ حالات لئے
چشمِ جعفر سے اُبل پڑتے ہیں آنسو چپ چاپ



طنزیہ افسانہ

سچ کا بول بالا

از

جناب فکر تونسوی

دفتر "ملاپ" نئی دہلی ——— ۳۰ اپریل ۱۹۵۶ء

خوشترؔ پیارے!

یہ حیرت ہے کہ اُردو ادب کے ساتھ ساتھ آپ کا ناس نہیں ہو رہا۔ آخر آپ اُردو ادب کو زندہ رکھنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں ———؟

اب کے جو طنزیہ بھیج رہا ہوں، ایک عجیب تصوریہ" ہے۔ میں اسے خوفناک طنز بنانا چاہتا تھا لیکن قلم جھجک جھجک کر چلتا رہا۔ کیونکہ ہم ابھی اس قدر تلخ زہر اپنے علق سے اُتارنے کے اہل نہیں ہو سکے۔ اپنے خط میں تشریح کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھتا کہ آخر قارئین کو طنزیہ بھی تو پڑھنا ہے۔ البتہ بیسویں صدی کے قارئین سے میں اتنا ضرور پُوچھوں گا کہ میں نے کہانی کے ہیرو "سچ" کو اُس کی حقیقی منزل پر پہنچا دیا، یا گمراہ کر دیا؟

آپ کا

فکر تونسوی

یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب میں ابھی اس حد تک عقلمند نہیں ہوا تھا جتنا آجکل ہوں۔ آجکل تو میری عقلمندی کا یہ عالم ہے کہ میں ہر آدمی کو کمینہ سمجھتا ہوں۔

آغازِ بہار کی ایک لمبی دوپہر تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور بہار میں گرم گرم لُو چلتے دیکھ کر نظامِ فطرت پر بہت افسوس کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں اچانک کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سات آٹھ سال کا ایک غلیظ سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اور دونوں کندھوں سے پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ چہرہ جُھلسے ہُوئے پتّے کی طرح اُس کی جُھریاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لڑکا بچپن ہی میں ولی ہو گیا ہے۔

میں نے کہا ———

"آؤ جنٹلمین! کیا چاہتے ہو؟"

وہ بغیر جواب دیئے کمرے کے اندر گھس آیا۔ اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی کرسی پر ڈٹ گیا۔ اُس کی بے تکلفی دیکھ کر مجھے بے حد شرم آئی۔ حالانکہ شرم اُسے آنی چاہیئے تھی لیکن پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے، خفیہ پولیس کا کوئی ایجنٹ ہو۔ اس لئے شرم کیسی؟

میں نے بناوٹی خلوص سے پُوچھا ———

"کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟"

وہ بولا ——— "میں دھرتی ماں کا بیٹا ہوں۔ باپ آکاش پر بھگوان

رہتا ہے۔ دونوں مر گئے ہیں۔ یتیم ہوں!"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"میرا نام سچ ہے!"

"یعنی سچ سچ سچ ہو یا جھوٹ بول رہے ہو؟"

یہ سن کر یتیم لڑکے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اور اُس کے ساتھ میرا دل بھی پسیج گیا۔ شاید میری بات سے اُس کے ننھے سے معصوم دل پر چوٹ لگی تھی۔ اگرچہ اس میں کچھ میرا بھی قصور نہیں تھا۔ کیونکہ اپنی عمر کے تیس سالہ تجربے کے بعد میں نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا ایک جاہلانہ فعل ہے۔ یہ دونوں جڑواں بھائی ہیں۔

خود میں نے اپنی زندگی میں بارہا ایسے جھوٹ بولے ہیں جنھیں سچ سمجھ کر لوگوں نے میرا احترام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سچ کی جسمانی حالت اتنی دگرگوں ہو سکتی ہے۔ جیسی اِس ٹوٹے پھوٹے مریض اور خستہ جان چھوکرے کی تھی۔ اگر سچ واقعی ایسا ہوتا ہے تو رونے کا مقام ہے۔ چنانچہ لڑکا رونے لگا۔ میں بھی رونے لگا۔ اور جب ہم دونوں رو رو کر اپنے جی کا غبار دھو چکے تو میں نے پوچھا۔

"برخوردار! اب یہ بتاؤ کہ میرے گھر کیوں آئے ہو؟ — میرا مطلب ہے، زندگی کا پروگرام کیا ہے؟"

سچ نے جواب دیا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں یتیم ہو چکا ہوں۔ اور۔ ۔ ۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو کیا یتیم خانے جانا پسند کرو گے؟"

"نہیں —!" سچ نے میز پر رکھی ہوئی ککڑی کو لالچ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یتیم خانے نہیں جاؤں گا۔ وہاں کا منیجر کہتا ہے کہ ہم تمھیں بھوکا رکھ کر سرکار سے اپنی گرانٹ بند کرانا نہیں چاہتے۔ اُس نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ میں وہاں سے سیدھا آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ آرٹسٹ ہیں اور آرٹ ہمیشہ سچائی کی کھوج کرتا ہے۔"

اپنی تعریف سن کر میں نے ککڑی اُس کے حوالے کر دی۔ اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس ککڑی کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا۔ "دوست! تم نے بہت غلط سنا ہے۔ میں سچائی کی کھوج نہیں کرتا، بلکہ اُن الفاظ کی کھوج کرتا ہوں جو مارکیٹ میں بک سکیں اور ککڑیاں لا سکیں۔"

سچ کو شاید یہ سچی بات کڑوی لگی۔ اُس نے میری ککڑی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجئے اپنی ککڑی۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔ بھوکوں مر جاؤں گا، لیکن کسی کا احسان نہیں اٹھاؤں گا۔"

"ارے واہ رے خودداری کے پتلے!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "نہیں نہیں میں تمھیں دل سے چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں صرف آرٹسٹ نہیں ہوں، انسان بھی ہوں۔ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے یونہی جھوٹ موٹ کہا۔

"آپ مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیجئے۔ مجھے اپنا بیٹا بنا لیجئے۔"

سچ نے نہایت فرزندانہ اور لاڈ پیار کے لہجے میں کہا۔

یہ تجویز سن کر ایک بار تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ سچ کو اپنا بیٹا بنا لوں۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ تین بیٹے تو پہلے ہی گھر میں موجود ہیں۔ اُن کی نشو و نما ہی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔ تو یہ چوتھا بیٹا کیسے پرورش پائے گا؟ زیادہ سے زیادہ گھر میں ایک اور پھٹی ہوئی قمیص کا اضافہ ہو جائے گا۔ دوسرے تین بیٹے تو خیر سوکھے ٹکڑے چبا کر بھی جی لیں گے لیکن سچ تو بھگوان کا بیٹا ہے۔ پھلوں اور میووں کا عادی ہے۔ میرے گھر رہنے لگا تو چند ہی دنوں میں سوکھ کر کانٹا ہو جائے گا۔ اِس لئے میں نے معافی مانگتے ہوئے عرض کیا۔

"بھگوان پُتر! میرے غریب خانے پر تمھارا نباہ نہ ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں۔ تم میرے اِس تاریک گھرانے کا چراغ بن سکتے ہو۔ لیکن میرے پاس جلانے کے لئے تیل ہی نہیں۔ تو بتاؤ میں کیسے تمھارے دم سے اپنی تاریکیوں کو روشن کر سکتا ہوں؟"

سچ یہ جواب سن کر مایوس ہو گیا۔ اور میری ٹانگوں سے لپٹ کر بولا۔

"اوں، اوں، اوں۔ میں تو اِسی گھر میں رہوں گا!"

"چھوڑ دو میری ٹانگیں۔" میں نے اُس کا نازک سا ہاتھ وحشیانہ طریقہ

جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "ایسے احمقانہ لاڈ مجھے پسند نہیں آتے۔ معاشی حالت دیکھ کر لاڈ کرنا چاہئے۔ دیکھتے نہیں میرے پاس یہی ایک پتلون ہے۔ جو تم نے لپٹ کر خراب کردی۔ اسے پہن کر دفتر کیسے جاسکوں گا؟"

سچ نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں۔ اور پھر ایک غم زدہ اور زخمی انداز کے ساتھ دروازے کی طرف واپس جانے لگا۔ یقیناً وہ مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا میں طبعاً بزدل ہوں۔ کسی کی معمولی سی ناخوشی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لئے میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ ہم تم مل کر تمھارے لئے کسی سرپرست کی تلاش کریں۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرورت مند ضرور ایسا نکل آئے گا جو تمھیں اپنی آغوش میں لے لے!"

سچ نے یہ تجویز مان لی (نہ مانتا تو میرا کیا بگاڑ لیتا) میں نے اُسے سمجھایا کہ شہر میں نکلنے سے پہلے ذرا بن سنور لو۔ اس اُجڑی ہوئی دیوانگی کے ساتھ چلو گے تو لڑکے ڈھیلے مار مار کر تمھیں پیغمبر بنادیں گے۔ سچ ضد کرتا رہا کہ میں اپنی اسی اصلی اور اسی ہیئت کذائی میں چلوں گا۔ لیکن میں نے سوچا۔ سچ تو بالکل بے وقوف اور ... رہے۔

میں نے زبردستی پکڑ کر اُس کا مُنھ ہاتھ دُھلایا۔ تین پیسے والی کنگھی سے بال بنوائے۔ اپنے منجھلے بیٹے کی دُھلی ہوئی قمیص چُرا کر اُسے پہنائی۔ چائے بنانے کے لئے جو دُودھ رکھا ہوا تھا وہ اُسے پلایا۔ اور پھر اُس کی انگلی پکڑ کے باہر آگیا

تھوڑی دُور چل کر سچ تھک گیا۔ وہ کُتّے کے پلّے کی طرح ہانپنے لگا۔ چلتے وہ بُری طرح ڈگمگانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیدا ہوتے ہی اسے دق کا مرض ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا، اگر جلد ہی اسے کسی نے اپنا بیٹا نہ بنالیا تو یہ ایک دو دن میں مرجائے گا۔ اور دُنیا میں ہاہاکار مچ جائے گی۔ اور ممکن ہے اس کے مرتے ہی قیامت آجائے اور یہ چھوٹا سنسار اپنے مرکز کی طرف لوٹ جائے۔

میں نے اُسے کندھے پر اُٹھالیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بہت بڑی آسمانی کتاب کا بوجھ میرے کندھے پر آپڑا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ سات آٹھ سال کا لڑکا ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اتنا بوجھل تھا کہ مجھے فوراً ہی محترم سر آغا خاں کا خیال آگیا۔ چند منٹ تک چلنے کے بعد میں بھی تھک گیا اور میرا جی چاہا کہ اُسے اُتار کر کسی کوڑے کرکٹ کے ڈرام میں پھینک دوں اور سر آغا خاں اور آسمانی کتاب اور ... لیکن سچ میرے ذلیل ارادے کو بھانپ گیا۔ اور چیخ کر بولا۔ "ٹھہرو! مجھے کوڑے کرکٹ میں مت پھینکنا۔ ورنہ دُنیا بھر کے فلسفی اور مفکر تمھیں طعنہ دیں گے کہ تم اتنی چھوٹی سی سوشل ڈیوٹی بھی انجام نہ دے سکے۔ تمھارے ایسے سادہ دل اور نیک رُوح انسان بھی اگر ایسی حرکتیں کرنے لگے تو ہمالہ کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں سر پیٹ لیں گی۔"

بلندیوں اور گہرائیوں کا واسطہ پاکر میں سہم گیا۔ انسان ہمیشہ بلندی اور گہرائی سے خوف کھاتا رہا ہے۔ میں اپنے دانتوں کو بھینچ بھینچ کر اُس سنگدل لڑکے کا بوجھ اُٹھائے پھر چلنے لگا۔

چوراہا نکلی شاہ پر شری پنڈت بھوشن پرشاد جی پردھان ستیہ پرچارنی سبھا کا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے مین گیٹ پر شری بھوشن پرشاد جی کھڑے ہوئے کوّوں کو گھی کی چُوری کھلا رہے تھے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں کوندا۔ اور میں شری بھوشن پرشاد جی کے پاس جا پہنچا۔ سچ کو اُتار کر نیچے زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

"شریمان جی! تھوڑی سی چُوری اسے بھی کھلا دیجئے۔"

"کیوں ــــ؟"

شریمان جی نے کائیں کائیں کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ایک چھوٹا سا کوّا ہے!"

"جھُوٹ کیوں بولتے ہو! یہ تو انسان کا بچہ نظر آتا ہے۔ کوّا کہاں ہے؟"

"صرف دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ اس کی حالت کوّے سے بھی دگرگوں ہے بات یہ ہے شریمان جی! کہ اس لڑکے کا نام سچ ہے۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ اتنا مکروہ اور گندہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو کسی بھنگی چمار کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ میں سچ کے بارے میں آپ سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں ستیہ پرچارنی سبھا کا پردھان ہوں۔"

"آپ اسے اُجلے اُجلے کپڑے پہنا دیجئے۔ کھانے کے لئے کیک، پھل، اور دُودھ دیجئے۔ اور پھر اسے ستیہ پرچارنی سبھا کا سکریٹری بنا لیجئے۔ آپ اس کے

[illegible] بتا ہے۔ دونوں مر گئے ہیں۔ یتیم ہوں!"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

[illegible]

"[illegible] سچ ہو یا جھوٹ بول رہے ہو؟"

یہ سُن کر یتیم لڑکے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اور اُس کے ساتھ میرا دل بھی پسیج گیا۔ شاید میری بات سے اُس کے ننھے سے معصوم دل پر چوٹ لگی تھی۔ اگرچہ اس میں کچھ میرا بھی تصور نہیں تھا۔ کیونکہ اپنی عمر کے تیس سالہ تجربے کے بعد میں نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا ایک جاہلانہ فعل ہے۔ یہ دونوں جُڑواں بھائی ہیں۔

خود میں نے اپنی زندگی میں بارہا ایسے جھوٹ بولے ہیں جنھیں سچ سمجھ کر لوگوں نے میرا احترام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سچ کی جسمانی حالت اتنی دگرگوں ہو سکتی ہے۔ جیسی اِس ٹوٹے پھوٹے مریض اور خستہ جان چھوکرے کی تھی۔ اگر سچ واقعی ایسا ہوتا ہے تو رونے کا مقام ہے۔ چنانچہ لڑکا رونے لگا۔ میں بھی رونے لگا۔ اور جب ہم دونوں رو رو کر اپنے جی کا غبار دھو چکے تو میں نے پوچھا۔

"برخوردار! اب یہ بتاؤ کہ میرے گھر کیوں آئے ہو؟ — میرا مطلب ہے، زندگی کا پروگرام کیا ہے؟"

سچ نے جواب دیا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں یتیم ہو چکا ہوں۔ اور . . . ."

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو کیا یتیم خانے جانا پسند کرو گے؟"

"نہیں —!" سچ نے میز پر رکھی ہوئی گگڑی کو لالچ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یتیم خانے نہیں جاؤں گا۔ وہاں کا منیجر کہتا ہے کہ ہم تمھیں اپنے ہاں رکھ کر سرکار سے اپنی گرانٹ بند کرانا نہیں چاہتے۔ اُس نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ میں وہاں سے سیدھا آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ آپ آرٹسٹ ہیں اور آرٹ ہمیشہ سچائی کی کھوج کرتا ہے۔"

اپنی تعریف سُن کر میں نے گگڑی اُس کے حوالے کر دی۔ اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس گگڑی کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا۔ "دوست! تم نے بہت غلط سُنا ہے۔ میں سچائی کی کھوج نہیں کرتا، بلکہ اُن الفاظ کی کھوج کرتا ہوں جو مارکیٹ میں بِک سکیں اور گگڑیاں لا سکیں۔"

سچ کو شاید یہ سچی بات کڑوی لگی۔ اُس نے میری گگڑی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجیے اپنی گگڑی۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔ بھوکوں مر جاؤں گا، لیکن کسی کا احسان نہیں اُٹھاؤں گا۔"

"ارے واہ رے خودداری کے پُتلے!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "نہیں نہیں میں تمھیں دل سے چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں صرف آرٹسٹ نہیں ہوں، انسان بھی ہوں۔ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے یونہی جھوٹ مُوٹ کہا۔

"آپ مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیجیے۔ مجھے اپنا بیٹا بنا لیجیے۔"

سچ نے نہایت فرزندانہ اور لاڈ پیار کے لہجے میں کہا۔

یہ تجویز سُن کر ایک بار تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ سچ کو اپنا بیٹا بنا لوں۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ تین بیٹے تو پہلے ہی گھر میں موجود ہیں۔ اُن کی نشوونما ہی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔ تو یہ چوتھا بیٹا کیسے پرورش پائے گا؟ زیادہ سے زیادہ گھر میں ایک اور پھٹی ہوئی قمیص کا اضافہ ہو جائے گا۔ دوسرے تین بیٹے تو خیر سوکھے ٹکڑے چبا کر بھی جی لیں گے لیکن سچ تو بھگوان کا بیٹا ہے۔ پھلوں اور میووں کا عادی ہے۔ میرے گھر رہنے لگا تو چند ہی دنوں میں سُوکھ کر کانٹا ہو جائے گا۔ اِس لیے میں نے معافی مانگتے ہوئے عرض کیا۔

"بھگوان پُتر! میرے غریب خانے پر تمھارا نباہ نہ ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں۔ تم میرے اِس تاریک گھرانے کا چراغ بن سکتے ہو لیکن میرے پاس جلانے کے لیے تیل ہی نہیں۔ تو بتاؤ میں کیسے تمھارے دم سے اپنی تاریکیوں کو روشن کر سکتا ہوں؟"

سچ یہ جواب سُن کر مایوس ہو گیا۔ اور میری ٹانگوں سے لپٹ کر رو لا۔

"اوں، اوں، اوں۔ میں تو اِسی گھر میں رہوں گا!"

"چھوڑ دو میری ٹانگیں۔" میں نے اُس کا نازک سا ہاتھ وحشیانہ طریق

بیسویں صدی دہلی

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں فی پرچہ
آٹھ آنے

جولائی
۱۹۵۵ء

جلد — ۱۹
نمبر — ۷

سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت
۹ شلنگ
ٹیلیفون دفتر
۲۶۶۳۷
ٹیلیفون ہاؤس
۴۸۰۲۵
ایڈیٹر
خوشتر گرامی

سالانہ خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں۔ جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ :- بیسویں صدی۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی

جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ایسے احمقانہ لاڈ مجھے پسند نہیں آتے۔ معاشی حالت دیکھ کر لاڈ
کرنا چاہئے۔ دیکھتے نہیں میرے پاس یہی ایک پتلون ہے۔ جو تم نے پھٹ کر خراب کر دی
اب پہن کر دفتر کیسے جا سکوں گا؟"

سچ نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں۔ اور پھر ایک غم زدہ اور زخمی انداز کے ساتھ
بازار کی طرف واپس جانے لگا۔ یقیناً وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا
میں طبعاً بزدل ہوں۔ کسی کی معمولی سی ناخوشی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں
نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ ہم تم مل کر تمہارے لئے کسی سرپرست کی تلاش کریں۔ اتنا بڑا شہر
ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرورت مند ضرور ایسا نکل آئے گا جو تمہیں اپنی آغوش میں لے لے
"!

سچ نے یہ تجویز مان لی (نہ مانتا تو میرا کیا بگاڑ لیتا) میں نے اُسے سمجھایا کہ شہر
میں نکلنے سے پہلے ذرا بن سنور لو۔ اس اُجڑی ہوئی دیوانگی کے ساتھ چلو گے تو لڑکے
بالے ڈھیلے مار مار کر تمہیں پیغمبر بنا دیں گے۔ سچ ضد کرتا رہا کہ میں اپنی اسی اصلی اور
ننگی ہیئت کذائی میں چلوں گا۔ لیکن میں نے سوچا۔ سچ تو بالکل بے وقوف اور
[illegible] ہے۔

میں نے زبردستی پکڑ کر اس کا منھ ہاتھ دھلایا۔ تین پیسے والی کنگھی سے
بال سنوارے۔ اپنے منجھلے بیٹے کی دُھلی ہوئی قمیص چُرا کر اُسے پہنائی۔ چائے بنانے
کے لئے جو دودھ رکھا ہوا تھا وہ اُسے پلایا۔ اور پھر اُس کی انگلی پکڑ کے باہر آ گیا

تھوڑی دُور چل کر سچ تھک گیا۔ وہ کتے کے پلے کی طرح ہانپنے لگا۔ چلتے
چلتے وہ بُری طرح ڈگمگانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیدا ہوتے ہی اسے دق کا
مرض ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، اگر جلد ہی اسے کسی نے اپنا بیٹا نہ بنا لیا تو یہ ایک دو
دن میں مر جائے گا۔ اور دُنیا میں ہاہاکار مچ جائے گی۔ اور ممکن ہے اس کے مرتے
ہی پرلے آ جائے اور یہ جھوٹا سنسار اپنے مرکز کی طرف لوٹ جائے۔

میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بہت
ہی آسمانی کتاب کا بوجھ میرے کندھے پر آ پڑا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ سات آٹھ
سال کا لڑکا ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اتنا بوجھل تھا کہ مجھے فوراً ہی محترم سر آغا خاں
کا خیال آ گیا۔ چند منٹ تک چلنے کے بعد میں بھی تھک گیا اور میرا جی چاہا کہ اُسے
اُتار کر کسی کوڑے کرکٹ کے ڈرام میں پھینک دوں اور سر آغا خاں اور آسمانی کتاب اور
. . . . . لیکن سچ میرے ذلیل ارادے کو بھانپ گیا۔ اور چیخ کر بولا "ٹھہرو! مجھے
کوڑے کرکٹ میں مت پھینکنا۔ ورنہ دُنیا بھر کے فلسفی اور مفکر تمہیں طعنہ دیں گے
کہ تم اتنی چھوٹی سی سوشل ڈیوٹی بھی انجام نہ دے سکے۔ تمہارے ایسے سادہ دل، اور
نیک رُوح انسان بھی اگر ایسی حرکتیں کرنے لگے تو ہمالہ کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں
سر پیٹ لیں گی۔"

بلندیوں اور گہرائیوں کا واسطہ پاکر میں سہم گیا۔ انسان ہمیشہ بلندی اور
گہرائی سے خوف کھاتا رہا ہے۔ میں نے دانتوں کو بھینچ بھینچ کر اس سنگدل لڑکے
کا بوجھ اُٹھائے پھر چلنے لگا۔

چوراہا نکلی شاد پر شری پنڈت بھوبھل پرشاد جی پردھان ستیہ پرچارنی
سبھا کا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے مین گیٹ پر شری بھوبھل پرشاد جی کھڑے ہوئے
کوؤں کو گھی کی چُوری کھلا رہے تھے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے
ذہن میں کوندا۔ اور میں شری بھوبھل پرشاد جی کے پاس جا پہنچا۔ سچ کو اُتار کر
نیچے زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

"شریمان جی! تھوڑی سی چُوری اسے بھی کھلا دیجئے۔"

"کیوں ــــ؟"

شریمان جی نے دو مِیں کائیں کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ایک چھوٹا سا کوا ہے!"

"جھوٹ کیوں بولتے ہو، یہ تو انسان کا بچہ نظر آتا ہے۔ کوا کہاں ہے؟"

"صرف دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ اس کی حالت کوّے سے بھی دگر گوں ہے
بات یہ ہے شریمان جی! کہ اس لڑکے کا نام سچ ہے۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ اتنا مکروہ اور گندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو کسی
بھنگی چمار کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ میں سچ کے بارے میں آپ سے زیادہ معلومات
رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں ستیہ پرچارنی سبھا کا پردھان ہوں۔"

"آپ اسے اُجلے اُجلے کپڑے پہنا دیجئے۔ کھانے کے لئے کیک، پھل، اور
دودھ دیجئے۔ اور پھر اسے ستیہ پرچارنی سبھا کا سکریٹری بنا لیجئے۔ آپ اس کے

جسم پر نہ جائیے۔ اس کی رُوح میں جھانک کر دیکھئے۔"

شری بھوبھل پرشاد جی نے کونوں کو اُڑا دیا۔ اور بچی ہوئی چوری خود کھاتے ہوئے بولے۔

"مجھے دھوکہ دینے کی کوشش مت کیجئے۔ میں نے پورا شاستر زبانی رٹ رکھا ہے۔ اُس میں صاف لکھا ہے کہ ستیہ کا جسم چودھویں کے چاند کی طرح شفاف اور کومل ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں نیلی جھیلیں ایسا سکون ہوتا ہے۔ اور اُس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ اور اُس کی اُنگلیاں ہر وقت کسی اپسرا کی طرح ارغنوں بجاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ....."

میں نے گستاخانہ بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ نیلے شاستر نہیں ہوگا۔ آپ نے کوئی گھٹیا قسم کا جنسی ناول پڑھا ہوگا۔ آپ ہم پر اعتبار کیجئے کہ اس لڑکے کا نام سچ ہی ہے۔ آپ اسے اپنے ہاں رکھ لیجئے۔ آپ کی ستیہ پرچارنی سبھا کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

دس پندرہ منٹ کی ردّ و قدح کے بعد شری بھوبھل پرشاد جی نے ہمیں اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا۔ کہ آپ ایک ٹائپ شدہ درخواست لکھ کر دے جائیے اور اس لڑکے کا ایک فوٹو بھی۔ ہماری سبھا کی ورکنگ کمیٹی کی ایک بیٹھک اگلے ماہ ہونے والی ہے۔ اُس میں ہم نیلے شاستر کے اصولوں کی روشنی میں اس کیس پر بحث کریں گے۔ اگر کمیٹی نے ضروری سمجھا تو ایک تحقیقاتی بورڈ بنا کر پرکھیں گے کہ کیا لڑکا واقعی سچ کی شاستر کسوٹی پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔

"ستیہ بھجن مہاراج!" کہہ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ اس بھوبھل میں بھی ستیہ کی کوئی چنگاری نہ نکلی۔ سچ کا چہرہ اور بھی اُتر گیا۔

آدھے فرلانگ تک اُسے گھسیٹنے کے بعد میں پھر تھک گیا۔ اور ہم ایک مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ سامنے سڑک کے اُس پار بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے ایک نوجوان لڑکا اور نوجوان لڑکی ایک دوسرے کو پیار کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر سچ اُچھل پڑا اور بولا۔

"آہ! کتنا سچا پیار ہے۔ اس میں سچی محبت کی جھلک ہے، چلو ان کے پاس چلیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مجھے ضرور اپنا لیں گے۔"

ہم دونوں چوروں کی طرح قدم اُٹھاتے ہوئے اُن کے قریب جا پہنچے ہیں دیکھتے ہی لڑکی نے شرم سے گھونگھٹ کاڑھ لیا اور تیزی سے قریب کی ایک گلی میں گھس گئی۔ لڑکا کھڑا رہا جیسے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی طاقت جمع کر رہا ہو۔

سچ نے چھوٹتے ہی کہا۔

"نوجوان! تم ابھی ابھی اس لڑکی کو پیار کر رہے تھے۔ وہ نہایت پاکیزہ پیار تھا۔ اور میں ....."

لڑکے نے سچ کے منہ پر زناٹے کا طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بکواس مت کرو۔ وہ لڑکی تو میری بہن ہے۔ ہمارا کل امتحان ہونے والا ہے۔ اور ہم ایک گیس پیپر DISCUS کر رہے تھے!"

سچ نے اپنے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا امتحان دو ماہ پہلے ہو چکا ہے۔ اور لڑکی نے ایک سال سے کالج چھوڑ رکھا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے انتہا محبت کرتے ہو تو پھر سچی محبت کو چھپاتے کیوں ہو؟"

لڑکے نے اس مرتبہ مکا تان کر کہا۔

"ابے سچ کے ڈھنڈورچی منہ سنبھال کر بات کر۔ نہیں تو ابھی ابھی آوارہ گردی کے الزام میں تمہارا چالان کروا دوں گا۔ تھانیدار میرا گہرا دوست ہے۔"

سچ نے تڑپ کر کہا۔

"میں سچ بات کہنے کے لئے سُولی پر بھی چڑھنے کو تیار ہوں ...!"

اب معاملہ سُولی تک پہنچنے لگا تھا۔ پانی خطرے کے لیول سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے ڈر پیدا ہوگیا کہ اگر سچ کو سُولی پر چڑھایا گیا تو اس کے ساتھ مجھے بھی کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ملے گی۔ کیونکہ قانون کی آنکھیں بہت دُور تک دیکھتی ہیں۔

میں نے ڈر کے مارے فوراً سچ کے منہ میں اپنا رُومال ٹھونس دیا۔ تاکہ وہ کوئی اور سچی بات منہ سے نہ نکال سکے۔ اور پھر اُسے زبردستی اُٹھا کر بھاگ گیا۔ نوجوان لڑکا ہمیں بھاگتے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ سچ جب بھی میدان سے بھاگا ہے ہمیشہ قہقہوں نے اس کا پیچھا کیا ہے۔


PUBLIC
LIFE...
— the TIME FACTOR
سنٹر کی سوئی سے مزین یہ پاکٹ واچ پبلک لائف
کی بے شمار ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اور آپ
ہر کام وقتِ معینہ پر سرانجام دے سکتے ہیں
اس کا اعتماد آپ کے روزمرہ کے پروگرام کو صحیح
وقت پر پایۂ تکمیل تک پہنچانا یقینی بنا دیتا ہے
SECUNDUS POCKET
Centre-Second
Nickel Silver ... Rs. 77
WEST END WATCH Co.
BOMBAY
CALCUTTA

دھڑکتے دلوں کی محبّت بھری داستانیں

میرے سپنے نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین افسانوں کا دلفریب مجموعہ میرے سپنے کیا ہیں؟ زندگی کی اصلی تصویریں، محبت کے سچے نغمے، جوانی کی مسکراہٹیں، دوشیزگی کی انگڑائیاں۔ یوں تو کیا مرد، کیا عورت سبھی خواب دیکھتے ہیں لیکن ایک عورت کی آنکھوں میں جو خواب سکتے ہیں اُن کی دلفریبی اور رنگینی کا کیا کہنا۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگھار کمرے میں سنگھار کمرے میں عورت کا حسن، عورت کی رعنائی اور نکھر جاتی ہے۔ یہ فتنہ قیامت بن جاتا ہے۔ اور اس قیامت کے سامنے بڑے بڑے زاہدوں کے ہاتھ سے بھی ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ پروفیسر کرشنا کماری ایم اے نے "سنگھار کمرے میں" اسی حقیقت کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ جذبات آفریں افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحہ پر مستیوں کا ایک طوفان اور جذبات کی ایک مست انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ عشق و محبت کی ایک ایسی روداد ہے جس میں آرزو کے پُر کیف گیت بھی ہیں، آہوں کا دھواں بھی۔ اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی نمی بھی۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

حسن پرست حسن و شباب کی سرمستیوں اور رومان و محبت کی دلفریبیوں کی رنگین داستانیں جنہیں حضرت یزدانی جالندھری کے شوخ قلم نے کیف و سرور کی دنیا بنا دیا ہے۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ جوان دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان ہے۔ شباب کی مچلتی ہوئی اُمنگوں، آرزوؤں اور محبت کی سُلگتی ہوئی چنگاریوں کا عکس ہے۔ قیمت صرف دو روپے

دل کے پیام ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری کے رنگین افسانوں کا مجموعہ جس کے ہر افسانے میں آپ شباب کی دھڑکنیں اور الھڑ جوانیوں کے گیت سُنیں گے۔ آپ جوان دلوں کی آہیں اور برباد تمناؤں کی سسکیاں محسوس کریں گے اور اپنے ہی دل کے پیام سُنیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

بڑے آدمیوں کا عشق بھی بہرحال عشق ہے اور یہ ایسی آگ ہے کہ "لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے" عشق کی یہ آگ شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ ہر دل کو جلاتی ہے، ہر انسان کو تڑپاتی ہے۔ اس کتاب کا بارھواں ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بِک رہا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

یوکلپٹس کی ڈالی جادو نگار کرشن چندر کے افسانوں کا ایک شاندار مجموعہ جس میں رومان کے رنگین پھول کھلتے ہیں۔ قیمت صرف دو روپیہ بارہ آنے

ایک روپیہ ایک پھول نثر کے شاعر کرشن چندر کے پُر رومان اور پُر معنی افسانوں کا ایک اور مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے بارہ آنے۔

رات اندھیری ہے آپ بمبئی کی فلمی زندگی کی آوارگی، اوباشی، اور عریاں تصویر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں تو اس ناول کو ضرور پڑھیے۔ مصنف مہندر ناتھ۔ قیمت صرف چار روپے۔

چاند بجھ گیا سرلا دیوی عورتوں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ اگر آپ آج کی عورت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ان افسانوں کو ضرور پڑھیے۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے

دُکھتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حسن کی بیکلی ہے، عشق کی بیقراری ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد دو روپے

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار رام لال کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ ان افسانوں میں رومان و محبت کی رنگینیاں بھی ہیں اور حسن و شباب کی سرمستیاں بھی۔ ہر افسانے میں ایک نئی عورت ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

شاہی محلات کی پریم کہانیاں عشق و محبت کی پُر کیف سچی داستانیں۔ یہ سچی داستانیں فرضی افسانوں سے زیادہ دلچسپ، موثر اور پُر کیف ہیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

بے نام گلیاں پروفیسر کلام حیدری ایم اے کی بے نظیر رومانی کہانیوں کا دلکش مجموعہ۔ قیمت سوا دو روپے۔

کارِ امروز علامہ سیماب اکبر آبادی کی حیات افروز نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ساڑھے چار روپے

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی

اب ہم پھلوں کی ایک خوبصورت دُکان کے سامنے کھڑے تھے۔ دُکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ ایک کانسٹیبل اور دو تین معززسے ادمی ایک دس بارہ سال کے لڑکے کے رُخسار، پیٹھ، سر اور پیٹ پر برابر مُکّے اور تھپڑ رسید کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ لڑکے نے دکان سے ایک سیب چُرالیا ہے۔

لڑکا رو رو کر کہہ رہا تھا۔

"ہاں ہاں میں نے ہی سیب چُرایا ہے۔"

سچ بولنے کی پاداش میں کانسٹیبل نے اُسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

لڑکا کہنے لگا۔

"مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ اِسی لئے میں نے سیب چُرالیا۔"

سچ بولنے کی پاداش میں کانسٹیبل نے ایک اور تھپڑ جما دیا۔

لڑکا اُسی طرح کہتا رہا۔

"مجھے کھانے کے لئے لا دو تو میں سیب نہیں چُراؤں گا۔"

اور سچ بولنے کی پاداش میں کانسٹیبل نے مُکّہ مار کر لڑکے کے دانت توڑ دیئے۔ لڑکے کے مُنہ سے لہو کی دھاریں بہہ نکلیں۔ لوگ لہو دیکھ کر ہنسنے لگے سب طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"اِس چور، جیب کترے، اور جھوٹے لڑکے کو جیل میں لے جاؤ۔ یہ سوسائٹی کے دامن پر بدنما دھبہ ہے۔ سوسائٹی کے ارتقا میں رخنہ ڈالنے والا ہے۔ یہ لڑکا بھوکا نہیں ہے۔ جھوٹا بہانہ کرتا ہے۔ سالا حرام کا مال کھا کر مسٹنڈا بنا ہوا ہے، بھوک بھوک چلانا اِس کی عادت ہے۔ ہا ہا ہا ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔"

کانسٹیبل انصاف کی زنجیر سے باندھ کر لڑکے کو گھسیٹتا ہوا تھانے کی طرف لے چلا۔ ہم دونوں اُس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ لڑکا مسلسل سچ کی پکار گونجاتا ہوا جا رہا تھا۔

تھوڑی دُور جاکر ہم نے کانسٹیبل سے کہا۔

"لڑکا سچ بول رہا ہے اِسے چھوڑ دیجئے۔"

کانسٹیبل بولا۔

"اِس کی رہائی کے بدلے میں آپ کیا ادا کریں گے؟"

سچ نے کہا۔ "بھگوان تمھیں اِس کا اجر دے گا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں سنتری جی! بھگوان کو چھوڑ دیئے۔ کون جانے وہ دے یا نہ دے آپ مجھ سے میرا یہ اینڈی پینڈنٹ لے لیجئے۔ اور اِس لڑکے کو چھوڑ دیجئے۔"

کانسٹیبل مان گیا۔ کافی معقول آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اینڈی پینڈنٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"لے جائیے اِسے اور جاکر سمجھا دیجئے کہ قانون کی خلاف ورزی نہ کیا کرے کیونکہ انصاف کا ہاتھ بہت لمبا ہوتا ہے۔"

"کیا اینڈی پینڈنٹ سے بھی لمبا ہوتا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

کانسٹیبل کچھ نہ سمجھا۔ کافی جاہل آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہرکیف وہ انصاف اپنی جیب میں رکھ کر چلا گیا۔ اور میں نے لڑکے سے پُوچھا۔

"یہ بتاؤ، یہ سچ بولنا تم نے کہاں سے سیکھا؟"

لڑکا بولا۔

"اُستاد بھیکو خاں سے۔ وہ ہم بھکاری لڑکوں کی ٹولی کا سردار ہے۔ ہم جتنا کماتے ہیں، اُس کا نوّے فی صدی حصّہ اُستاد رکھ لیتا ہے۔ اور اُس کے بدلے میں ہمیں ایسے ایسے انوکھے اور نئے نئے سچ بولنا سکھاتا ہے کہ کمال کر دیتا ہے۔"

میں نے سچ کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔

"برخوردار سچ! لو اب تمھیں ایک ہمجولی اور ہم پیشہ مِل گیا ہے تم اِس کے ساتھ اُستاد بھیکو خاں کے ہاں چلے جاؤ۔ اور سچائی پھیلانے والی اِس ٹولی میں شامل ہو جاؤ۔ اور مجھے اب اجازت دو۔"

سچ نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ آنکھیں بند کئے جیسے مراقبے میں چلا گیا تھا۔

لڑکا بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ اِس لونڈے کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔ ہمارے ہاں یہ خوب چل جائے گا۔ اِس کی شکل و صورت تو خیر پہلے ہی بھکاریوں اور جیب کتروں کی سی ہے۔ تھوڑی سی ٹریننگ مِل گئی تو بڑے بڑوں کے کان کترنے گا۔"

بڑا چلتر لڑکا ہے، میں نے سوچا۔ اور سچ کے سر پر ایک ٹھوکا دے کر اُسے بیدار کرنا چاہا۔ لیکن سچ تو جیسے صدیوں کی نیند میں غرق ہو چکا تھا۔

چور لڑکا بولا۔

"اچھی بات ہے جب اس کی آنکھیں کھل جائیں اسے ہمارے اڈے پر لے آئیے گا۔ ہم اسے داخل کر لیں گے۔ اور جب آپ آئیں گے تو شاید میں آپ کو وہ انڈی پینڈنٹ بھی واپس دے دوں گا۔ جو آپ نے کانسٹیبل کو دیا تھا۔ آپ نے ناحق انڈی پینڈنٹ دے دیا اُسے۔ سالا ہم سے بھی حصہ بٹورتا ہے۔ اور بالائی آمدنی بھی بنا لیتا ہے۔ میں کل ہی جا کر اُس کانسٹیبل کی جیب سے آپ کا وہ انڈی پینڈنٹ اُڑا لاؤں گا۔ آداب عرض!"

لڑکا چلا گیا۔

میں ایک تنکا چبانے لگا۔ سچ کی آنکھ اب کھل گئی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"میرا سر گھوم رہا ہے"۔ چوری اور جیب کتری میں بھی جب سچ کی ملاوٹ ہو رہی ہو تو سر واقعی چکرا جاتا ہے!

اب ہم ایک نہایت پر رونق اور وسیع چوک میں پہنچ چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ کہاں جایا جائے۔ میں بہت اُکتا چکا تھا۔ چوک میں ایک بھاری جلسہ ہو رہا تھا۔ جہاں شہر کے مشہور سیاسی رہنما جناب نکھو نانندجی تقریر کر رہے تھے جناب نکھو نانندجی پانچ بار جلسہ گاہوں سے اور سات بار جُوا خانوں سے پکڑے گئے تھے۔ وہ سچ کو نہایت خوشی سے اپنا بیٹا بنانا منظور کر لیتے۔ کیونکہ وہ چند ماہ سے خود ایک گہرے سیاسی کرائسس کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اور عام طور پر سچ بولا کرتے تھے۔ جب تک اُن کا سیاسی کرائسس حل نہیں جاتا اُس وقت تک وہ سچ کو اپنے گھر میں رکھ سکتے تھے لیکن اس کے بعد... اُس کے بعد وہ اسے پھر گھر سے باہر نکال دیں گے۔ اور یہ چھوکرا پھر میرے ہاں بھاگا آجائے گا۔ شری نکھو نانندجی کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہیں۔ اور میں سچ کے لئے کوئی مستقل گھرانہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

چوک کے مشرقی کونے پر پڑے ہوئے ایک لمبے بینچ پر جا کر ہم بیٹھ گئے۔ بینچ کے دوسرے سرے پر شہر کے مشہور فلسفی اور مفکر حضرت بُدھی ناتھ سنگھ ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ کتاب کے صفحات پر سیاہی بھرے قلم سے کاٹے مارتے جا رہے تھے

میں نے اُن کے قریب کھسک کر کہا۔

"بُدھی ناتھ جی! ایک لڑکا ہے سچ نامی۔ کیا آپ اُسے اپنے ہاں نوکر رکھ لیں گے؟"

بُدھی ناتھ سنگھ نے اپنی موٹی عینک اُتارتے ہوئے کہا۔ کہاں ہے سچ؟ سچ کہیں بھی نہیں ہے۔ فلسفہ اور سائنس نے آج تک سچ کا جتنا کھوج لگایا تھا، آج وہ غلط ثابت ہو گیا ہے۔ اور آج میں اُس پر کالے نشانات لگا کر کاٹے جا رہا ہوں۔ جاؤ اور مجھے سچ کی کاٹ چھانٹ کرنے دو۔"

"تو کیا آپ اس کے بعد کچھ نئے سچ بھی تخلیق کریں گے؟"

"ہاں! یقیناً۔ کیونکہ کائنات نئی سچائیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر میں ذرا لیٹ ہو گیا تو شاید پُرانی سچائیاں دُنیا کا نظام بگاڑ کر رکھ دیں۔"

میں اُس فلسفی اور مفکر سے بھی مایوس ہو گیا۔ اور سچ کے قریب کھسک آیا اور آزردہ ہو کر کہا۔

"عزیزی سچ! میرے خیال میں تم اب ریلوے لائن پر سر رکھ کر خودکشی کر لو۔"

سچ نے کہا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔

"کیونکہ دراصل خودکشی ہی کائنات کی حقیقی سچائی ہے۔ اگر ہمارا وجود اس دُنیا میں نہ رہے تو دُنیا جھوٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا جائے۔"

سچ نے کہا۔ "مجھے فلسفیانہ باتوں میں مت اُلجھاؤ۔ فلسفہ نے ہمیشہ سچ کا چہرہ مسخ کیا ہے۔ جھوٹ کو خوبصورت بنانے کے لئے ہمیشہ فلسفہ نے اپنے برش لگائے ہیں۔ تم مجھے کسی سیدھے سادے انسان کے پاس لے چلو۔"

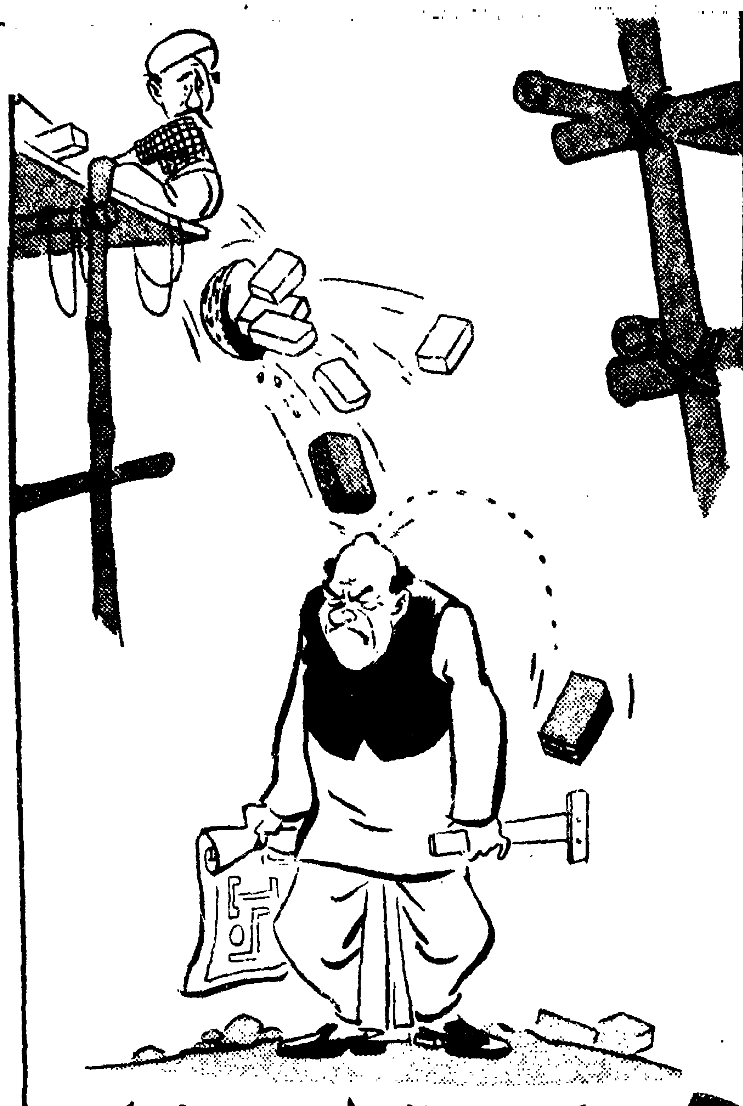
یہ کہہ کر وہ ایک بازاری سا شعر گنگنانے لگا ؎

سچائی عجب چیز دُنیا میں ہے
سچائی سے بڑھ کر نہیں کوئی شے

میں نے لُقمہ دیا۔ "سچائی سے بڑھ کر ایک اور شے دُنیا میں ہے۔"

"کیا؟"

"گنڈیریاں!"



میں نے سامنے گنڈیریوں کے ایک خوانچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
ا۔ مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ میں نے گنڈیریوں والے کے قریب جاکر کہا۔

"ایک پاؤ گنڈیریاں تول دو میٹھی ہیں نا؟"

گنڈیری والا ہنس کر بولا۔ "بالکل شربت کے گھونٹ ہیں جی۔ چکھ کر دیکھ لو۔"

بچے نے ایک گنڈیری اُٹھاکر چکھی اور گنڈیری والے سے کہا۔

"بالکل پھیکی ہے۔ تم نے جھوٹ بولا ہے بابا۔"

"کیا کریں بیٹا پیٹ تو پالنا ہے!"

بچے نے اُسے سمجھایا "پیٹ سے زیادہ اپنی رُوح کی پاکیزگی کا خیال رکھا کرو۔"

گنڈیری والا ہنسا۔

"جی، یہ اُپدیش رہنے دیجئے۔ یہ بازار ہے۔ مندر نہیں ہے۔ لینا ہے تو لو، نہیں تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

ہم چلنے لگے تو گنڈیری والے نے پیچھے سے آواز کستے ہوئے کہا۔ "ایک آدھ
نے کی گنڈیریاں تو لیتے جاؤ۔ مفت میں ایک گنڈیری کھائی اور چلتے بنے۔ بڑے
ہ کے پرچارک بنے پھرتے ہیں۔ اُچکے کہیں کے!"

اب میں نے پکا تہیہ کرلیا کہ دیانت خاں روڈ پر جہاں سیٹھ لعین چند کمین چند
نیر بروکر کی کوٹھی ہے وہاں سیٹھ جی کے بُلڈاگ کو چھوڑ لگادوں گا۔ اور بچے کو اُس کے
سامنے پھینک کر خود بھاگ جاؤں گا۔ اب میں اِس لاش کو زیادہ دیر تک گھسیٹ نہیں
سکتا تھا۔

کوٹھی کے قریب پہنچے تو بُلڈاگ کی بجائے سیٹھ لعین چند جی خود موجود تھے
اچانک نہ جانے میرے ذہن میں اُمید کی ایک کرن چمکی۔ کیوں نہ بُلڈاگ کے بجائے
خود سیٹھ جی کو آزمایا جائے؟

میں نے آگے بڑھ کر سیٹھ جی کو سلام کیا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔
میں نے بچے کا تعارف اُن سے کرایا۔ اور کہا۔

"پیارے سیٹھ جی! آپ جو گزشتہ دس سال سے بھگوان سے پرارتھنا کیا کرتے
تھے کہ وہ آپ کو سچ کی شکتی بردان کرے، سو آج بھگوان نے اِس معصوم رُوپ
میں سچ کو آپ کی سیوا میں بھیج دیا ہے۔ اِسے قبول فرمائیے!"

سیٹھ جی نے اپنے مصنوعی دانتوں سے مسکراتے ہوئے کہا "بھگوان کی یہ
اُدارتا ہے کہ اُس نے سچ کو میرے غریب خانے پر بھیج دیا۔ آج میں اپنے آپ
کو دُنیا کا سب سے بڑا بھاگیہ وان سمجھ رہا ہوں۔ آئیے اندر کوٹھی میں چل کر بیٹھیں۔"

ہم اندر چلے گئے۔ سیٹھانی جی بہت ہی تپاک سے ملیں۔ تھل تھل کرتی
ہوئی موٹی بھدی سیٹھانی جی کے مکروہ چہرے پر غازہ اور پاؤڈر نے ایک ہیجان انگیز
سانگھار پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ بالکل ایک دوشیزہ نظر آرہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے بڑھاپے کے سر پر شباب سوار ہے۔

سیٹھ جی نے ہمیں اپنی فیکٹری کا خاص الخاص سوڈا بھی پیش کیا۔ اور بتایا
کہ یہ سوڈا کوئی بازاری سوڈا نہیں ہے۔ بازار میں ہم جو سوڈا بھیجتے ہیں اُس میں صرف
مارکیٹ میں بڑھتی ہوئی کمپی ٹیشن کی وبا کا مقابلہ کرنے کے لئے چند ایک سستی آمیزشیں
کرتے ہیں۔ لیکن اپنے مہانوں کے لئے الگ خاص الخاص سوڈا بنواتے ہیں۔

"کیا کریں!" سیٹھ جی دُکھی ہوکر بولے۔ "ساری مارکیٹ جھوٹ میں لتھڑی
ہوئی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دریا میں رہ کر انسان کو بھی بھیگنا ہی پڑتا ہے۔"

بچے نے پہلے تو یہ سوڈا پینے سے انکار کیا۔ لیکن میں نے اُس کی پسلی میں ٹھوکا دے
کر اُسے پینے پر راضی کرلیا۔ جس سے اُس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ سیٹھ جی اِس دوران
میں کئی ٹیلیفون اٹینڈ کرتے رہے۔ اور لاکھوں رُوپوں کے سودے کرتے رہے۔
اِس کے بعد اُنھوں نے سارے گھر والوں سے سچ دیوتا کا تعارف کرایا۔ تین لڑکیاں
چار لڑکے، دو کُتے، ایک بندر۔ سبھوں نے باری باری دیوتا کے پاؤں چھوئے۔ اُس کے
گلے میں ہار ڈالے۔ دو جوان لڑکیوں نے سچ دیوتا کی تعریف میں پیانو پر گیت
گاکر سُنائے۔

ایک ملا جب دیوتا کے پاؤں چھونے لگی تو اُسے فوراً ڈسمس کر دیا گیا۔ دیوتا
کو باتھ رُوم میں لے جایا گیا۔ عطر، صابن، لیونڈر، اور خوشبوؤں سے اُس کے بدن
کو معطر کر دیا گیا۔ اور پھر اُسے زرق برق لباس، سونے کی چمکتی ہوئی انگوٹھیاں
اور ہار پہنا کر ایک آراستہ کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں اُسے ہاتھی دانت کی بنی
ہوئی ایک نفیس چوکی پر براجمان کر دیا گیا۔

"آج سے یہ کمرہ دیوتا کا کمرہ رہے گا!" سیٹھ جی نے اعلان کیا "ہم سب
صبح شام دیوتا کی آرتی اُتارا کریں گے۔ اِن کے چرن کمل میں کند مُول بھینٹ کیا

ریں گے۔ ہم جگنوؤں کی چھوٹی سی تنکی سے اپنے گھر کا اندھیرا دور کریں گے جگنون
سارے سنسار کا اندھیرا دور کریں گے۔"

جب سارا معاملہ طے ہو گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سچ کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے بھی اس کے چرن چھوئے۔ اور لوٹتے وقت آنکھ بچا کر سیٹھ جی کی میز سے چاندی کا ایک کپ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک گندے سے چھوکرے کی یہ عزت افزائی دیکھ کر میرے اندر حسد اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

آج بھی میرے گھر کے سامنے کبھی کبھی ماحول کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی ایک خوبصورت کار کی بتیاں چمک اٹھتی ہیں۔ جس میں سچ دیوتا نہایت ریشمی اور زرق برق لباس زیب تن کئے بیٹھا ہوتا ہے۔

اس کی بغل میں ایک کافر ادا حسینہ ہوتی ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا تھا۔ یہ سیٹھ جی کی حسین ترین لڑکی ہے جس سے میرا بیاہ ہو گیا ہے۔ اور سیٹھ جی نے اپنی محبت اور شردھا سے میرا من یوں جیت لیا ہے کہ اب میں کسی اور کے گھر جانا پسند نہیں کرتا۔

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نا مناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (مینیجر)



ع ہر اک شے آنے والی آگئی کیا تم نہ آؤ گے

ہم شاعر ہیں

از

جنابِ قتیلؔ شفائی

تہوہ فلسفے کی دھواں دھار فضا گونج اُٹھی
چائے کے لس میں کھوئے ہوئے لب کانپ گئے
——— ایک آواز کہ ہم شاعر ہیں

اپنی تخئیل میں تحلیل اجنتا کے نقوش
پنے افکار کا معیار الورا کا جمال
——— ہم سا انداز کہ ہم شاعر ہیں

کون ہے اپنے سوا نقدِ سخن کا وارث؟
میر و سودا کو بھی ہم ہیں پرکھنے والے
——— ہے یہی راز کہ ہم شاعر ہیں

ہم نے احساس کی پتی سے تراشے ہیرے
سنی شعر سے دل موم کئے ہیں ہم نے
——— یہ ہے اعجاز کہ ہم شاعر ہیں

نی ممنون ہے رومان کی ہر اک وادی
ج کے سارے حسیناؤں کے محبوب ہیں ہم
——— ہم کو ہے ناز کہ ہم شاعر ہیں

ے کا بل تو حضور آپ ادا کر ہی چکے
ب کسی "چہرے" کا تعاقب ہو جائے
——— اذنِ پرواز کہ ہم شاعر ہیں

شاعرِ رومان کے نام

از

جنابِ الطاف مشہدی

گنگناتی ہوں آپ کے اشعار | تھرتھراتے ہیں سازِ دل کے تار
میٹھی میٹھی خلش کے حامل ہیں | میرے شاعر کے دلنشیں افکار
شعر پڑھنے سے لگ گیا دل کو | درد کا روگ، سوز کا آزار
میرے کالج کی لڑکیاں اکثر | پڑھ کے روتی ہیں آپ کے اشعار
میرے اُجڑے چمن میں آؤ کبھی | شاعرِ ابر و بادِ صبحِ بہار
گاہے گاہے تخیلاتِ حسیں | ساتھ لاتے ہیں چاندنی کا نکھار
پڑھنے والوں میں آپ کے لیکن | کتنی سستی ہے آنسوؤں کی پھوار
درد کچھ اس قدر ہے گیتوں میں | چھن گیا مجھ سے زندگی کا قرار
ہائے وہ دکھ بھرے حسیں نغمے | جیسے ندی پہ چھڑ رہا ہو ستار
کیا خبر تھی کہ موسمِ گل میں | خون تھوکے گی زندگی کی بہار

میرا دعویٰ ہے شاعرِ روماں!
شاعری آپ کی ہے دل کی پکار!

سربمہر ٹنوں میں بند بارلی خرید کر احتیاط برتیئے

کھلی ہوئی بارلی میلی اور جراثیم آلود ہو سکتی ہے۔ آپ ایسے غیر ذمہ دار نہ بنیئے۔ رابنسنس پرل بارلی خریدیئے یہ بارلی خالص اور تازہ ہونے کے علاوہ سربمہر ٹنوں میں حفظان صحت کے مطابق بند ہوتی ہے

طلب کیجئے

رابنسنس پرل بارلی



جس کا ہر دانہ خالص ہوتا ہے

جینے کیلئے - ستیہ پال آنند اپنی کہانیوں کو دلہنوں کی طرح سجاتا ہے جہاں اُس کا جوان تفکر انھیں الفاظ کا خوبصورت جامہ پہناتا ہے وہاں اُس کے تجربے اور شاہدے مشاطگی کا فرض سرانجام دیتے ہیں۔ ہندی اور اُردو میں گزشتہ پانچ برس سے اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ دیدہ زیب کتابت، اعلیٰ خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت فی جلد اڑھائی رُوپے۔

چھبّیس سال بعد - امرتا پریتم اس وقت صرف پنجابی زبان کی نہیں بلکہ ہندوستان کی بڑی شاعرہ ہے۔ اِس کا فن ہندوستان کی حدود سے باہر نکل کر دُنیا کی اَن گنت زبانوں تک پہنچ چکا ہے۔ اُردو میں اِس کے افسانوں کا مجموعہ نہایت دل کش انداز میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، خوشنما مضبوط جلد۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

ملنے کا پتہ

رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی

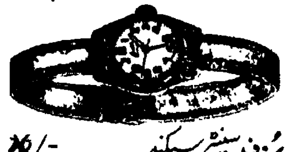
... قیمت میں نصف تخفیف

گارنٹی ۳ سال



جرمن الارم	[illegible]	13/-
سپیریر جرمن	[illegible]	15/-
پاکٹ واچ	[illegible]	8/-

نمبر 101 — سائز 3/4 9



15 جیولز واٹر پروف سینٹر سیکنڈ	70/-	36/-
17 " " " "	80/-	40/-
21 " " " "	100/-	56/-

نمبر 102 — سائز 3/4 9



5 جیولز رولڈ گولڈ سینٹر سیکنڈ	35/-	18/-
15 " " "	52/-	26/-
17 " " "	85/-	37/-

سٹار واچ کمپنی پوسٹ بکس نمبر 2508 بمبئی نمبر 2

افسانہ

ریڈیو اسٹیشن میں

از

جناب سُدرشن بالی

دی پیازا اسکوائر۔ گول مارکیٹ۔ نئی دہلی

۱۴ مئی ۱۹۵۶ء

مکرمی خوشتر گرامی صاحب!

حسب ارشاد افسانہ نمبر کے لئے افسانہ حاضر ہے ——— پچھلے سال میں نے "افسانہ ملا" میں کچھ ایڈیٹروں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس مرتبہ آل انڈیا ریڈیو کے اُن کرم فرماؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اکثر افسانہ نگاروں پر نظر عنایت فرماتے رہتے ہیں۔

نام مقام سب فرضی ہیں۔ کسی طرح کی مطابقت محض اتفاقیہ ہی ہوگی۔ اور اس کی ذمہ داری ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا افسانہ نویس پر عائد نہ ہوگی۔

آپ کا

سُدرشن بالی

کافی ہاؤس کی بید کی کرسی میں دھنسا ہوا وہ اظہر صاحب کا انتظار کر رہا تھا وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آج دن بھر دفتر میں اُسے بہت زیادہ کام بھی کرنا پڑا تھا۔ اور بڑے بابو کی خوشامد بھی!

ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ملے ہوئے فارم پر ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کے دستخط حاصل کرنا جُوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بڑا صاحب اُسے بُلائے گا۔ اُس کی کہانی کے متعلق سوال کرے گا۔ یہ اُسے ہر سوال کا تفصیل سے جواب دے گا۔ اور وہ اس کی قابلیت کا قائل ہو جائے گا۔ لیکن بڑا صاحب بڑا چُغد نکلا۔ جونہی بڑے بابو نے فائل اُس کے پاس بھیجا، اُس نے دستخط کر دیئے کہانی براڈکاسٹ کرنے کے سلسلے میں یہ آخری دشواری تھی جو آج حل ہو گئی۔

چیتن سنگھ کو اس منزل پر پہنچنے کے لئے بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پُورے چھ مہینے کے بعد یہ شیشے میں اُترتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اب صرف پانچ دن باقی تھے کہانی براڈکاسٹ کرنے میں۔ وہ فارم پر لکھے ہوئے تاریخ، وقت، اور کہانی کے نام کو کئی بار پڑھ چکا تھا۔

"جمعرات، رات کے ساڑھے نو بجے، "دھوپ"!"

کافی ہاؤس میں مختلف میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک احتیاطی نظر ڈالنے کے بعد اُس نے فارم جیب سے نکالا۔ اور ایک بار پھر بغور نظر ڈال کر جیب میں رکھ لیا۔

چیتن سنگھ کو دُنیائے ادب میں وارد ہوئے دو تین ہی سال گزرے تھے

کہانی کو تیار ہوتے سنتے جب اچانک ایک دن وہ لوگوں کی نظر سے اُس کا افسانہ "پہلا قدم" گزرا تو لوگ چیتن سنگھ کی افسانوی صلاحیتوں کے بھی قائل ہو گئے۔ اسی کالونی میں بہت سے لوگوں نے مبارک باد دی تھی۔ اُس کی کہانی کو سراہا تھا۔ سب سے زیادہ حوصلہ افزائی رقیہ آپا نے کی تھی۔

جب آپا نے کہا۔

"بھئی ہمیں تمھاری کہانی بہت پسند آئی۔ وہ کسی نوآموز کی نہیں بلکہ کہنہ مشق افسانہ نگار کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے"

تو چیتن سنگھ کا خوشی سے سیروں خون بڑھ گیا۔ اُس کے دل میں آپا کے لئے بڑی عزت جاگزیں ہوگئی۔ اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ اب اپنا ہر افسانہ کسی رسالے میں بھیجنے سے پہلے آپا کو برائے اصلاح دکھا لیا کرے گا۔

چیتن سنگھ نے شوقیہ نہیں بلکہ کسی مقصد کے لئے افسانہ نویسی شروع کی تھی اُس کی تنخواہ بہت کم تھی۔ صرف ایک سو تیس روپے۔ گھر کا خرچ اِس سے زیادہ تھا۔ اِس لئے اُس نے سوچا، مہینے میں دو تین کہانیاں لکھ کر کچھ روپیہ کمانے گا۔ کہانیاں تو وہ لکھنے لگا۔ لیکن روپیہ کہیں سے نہ آیا۔ بلکہ کاغذوں، لفافوں اور ڈاک کے ٹکٹوں کا خرچ کچھ بڑھ ہی گیا۔ اُس کے پڑوسی نے کلرکی کے علاوہ فرصت کے اوقات میں تصویروں پر فریم کرنے کا کام شروع کیا۔ جس سے اُسے چالیس پچاس روپے ماہوار کی آمدنی بہت آسانی سے ہونے لگی۔

چیتن سنگھ کبھی کبھی مایوس ہو کر سوچنے لگتا۔

'اِس افسانہ نویسی کی بجائے میں بھی اگر کوئی اور کام شروع کر دیتا تو اچھا تھا'

لیکن اب اُس کے لئے افسانہ نویسی ترک کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اِسی اُمید پر کہ کبھی نہ کبھی تو معاوضہ ملنا شروع ہوگا۔

اُس نے لکھنا جاری رکھا۔

ایک مرتبہ سنیچر کے دن دوپہر کو دفتر سے گھر جا رہا تھا۔ مال روڈ پر رکشا میں جاتی ہوئی رقیہ آپا مل گئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن جا رہی تھی۔ آئندہ پروگرام کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ چیتن سنگھ کو رکشا کے ساتھ ساتھ رہنے کے لئے سائیکل کی رفتار تیز کرنا پڑی۔ وہ قدرے ہانپ گیا۔ آپا نے کہا "چیتن سنگھ تم ریڈیو سے کیوں نہیں کہانی براڈ کاسٹ کرتے؟"

چیتن سنگھ کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اُس نے کبھی اِس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

آہستہ سے بولا۔

"اب کوشش کروں گا"

ریڈیو اسٹیشن کے نزدیک پہنچ کر آپا نے کہا ——

"آؤ میرے ساتھ۔ ریڈیو والوں سے تمھاری ملاقات کرا دوں"

[illegible] دروازے پر آپا نے رکشا رکوا دی۔ اور اپنے چرمی بیگ سے [illegible] روپے کا نوٹ نکالا۔

رکشا والے نے نوٹ دیکھتے ہی کہہ دیا۔ "صاحب! میرے پاس توڑ نہیں ہے۔ ابھی تو رکشا لے کر چلا آ رہا ہوں"

چیتن سنگھ نے جھٹ جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کتنے پیسے چاہئیں؟"

"چھ آنے" رکشا والے نے کہا۔

چیتن سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کی جیب میں چھ آنے ہی تھے چیتن سنگھ کو ریڈیو اسٹیشن کا ماحول بہت پسند آیا۔ آپا نے پروگرام اسسٹنٹ [illegible] سے اُس کا تعارف کرایا۔ اُس کی افسانہ نویسی کی تعریف بھی کی اور سفارش بھی۔ چہل نے کہا کہ وہ جلد ہی کوئی کہانی لکھ کر دے دے۔ کیونکہ عنقریب ہی اُن [illegible] ہونے والی ہے۔ اِس لئے وہ چاہتا ہے کہ جانے سے پہلے پہلے اُسے ایک [illegible] دے دے۔

لیکن ایک ڈیڑھ ماہ تک چیتن سنگھ کے دماغ میں کوئی پلاٹ نہ [illegible] وہ ریڈیو سے کوئی خاص چیز براڈ کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ خاص چیز [illegible] دماغ میں نہ آ رہی تھی۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں وہ کسی رسالے کے لئے بھی اف[illegible] لکھ سکا۔

آخر ایک روز اُسے پتہ چلا کہ چہل صاحب تبدیل ہو کر [illegible] گئے اور اُن کی جگہ ایک نئے اسسٹنٹ اطہر صاحب تشریف لائے ہیں۔ [illegible] سوچنے لگا۔ نئے صاحب سے تعارف ہونے سے پہلے پہلے کہانی


ڈالڈا
میرے
لئے
اچھا ہے
چھاپ
ڈالڈا
وناسپتی
DALDA
یہ نہ صرف کھانا پکانے کیلئے اچھا ہے بلکہ قوت بخش بھی ہے ۔

...ہی چاہیے۔ تاکہ تعارف ہوتے ہی جیب سے کہانی نکال کر اُس کے سامنے رکھ دے۔
...دن کسی روسی مصنف کا ناول پڑھتے پڑھتے اُس کے دماغ میں ایک کہانی کا پلاٹ
...آیا۔ تین چار روز خوب محنت کر کے اُس نے کہانی لکھ ہی ڈالی۔ "دھوپ!"

رقیہ آپا کے خاوند سمندر پار ملکوں کا دورہ کر کے واپس آ گئے تھے۔ اسلئے
...آپا سے آسانی سے ملاقات نہ ہو سکتی تھی۔ چیتن سنگھ ایک بار اُس کے ہاں گیا
...بھی تھا۔ آپا نے اپنے خاوند سے اُس کا تعارف بھی کرایا۔ اور چائے بھی پلائی۔ لیکن
چیتن کو اُس کے خلوص میں بہت کمی نظر آئی۔ اسے محسوس ہوتا رہا کہ آپا کے برتاؤ
میں بے رُخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہے۔ تب اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ کبھی اپنے آپ
...کے گھر نہیں جائے گا۔ وہ بُلائے گی بھی تو دو ایک بار ٹال مٹول کرنے کے
بعد جائے گا۔

لیکن "دھوپ" کہانی لکھنے کے بعد اُس کی بیتابی بڑھ گئی۔ اُس نے سوچا،
...آپا اسے پڑھ کر پسند کرے تو وہ نئے پروگرام اسسٹنٹ سے اس کی سفارش کرے
گی اور اُسے پروگرام مل جائے گا۔

آپا کے گھر جانے کے بجائے اُس نے ٹیلیفون پر بات کرنا زیادہ مناسب
سمجھا۔ لیکن رقیہ نے کہا۔

"بھئی مجھے تو آجکل بالکل فرصت نہیں۔ تم کہانی اَطہر کے پاس لے جاؤ
میرا ذکر کر دینا لیکن وہ ہے بڑا CHEAP چیپ قسم کا آدمی۔"

اِس چیپ قسم کا مطلب چیتن سنگھ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کہانی لے
کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اطہر نے اُس کی کہانی پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ قدرے
طویل معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی کہانیاں براڈ کاسٹ ہوتی ہیں جو پندرہ منٹ
میں پڑھی جا سکیں۔"

"یہ بھی پندرہ منٹ میں پڑھی جا سکتی ہے۔ میں نے پڑھ کر دیکھ لی تھی۔" چیتن
سنگھ نے کہا۔

"آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیے۔ میں پڑھنے کے بعد اپنی رائے دے
سکوں گا۔"

"میں پھر کب آؤں آپ کی رائے معلوم کرنے کے لئے؟"

"اطہر نے کہانی کے صفحوں کو پھر اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ آپ کے آنے
کی ضرورت نہیں۔ اس پر آپ کا پتہ لکھا ہوا ہے میں چٹھی بھیج دوں گا۔"

یہ سب گفتگو اتنی جلدی ختم ہو گئی کہ آپا کا ذکر کرنے کا موقع ہی نہ آیا۔
چیتن سنگھ اطہر کا شکریہ ادا کر کے اور اُسی کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک صنفِ نازک
پر اُچٹتی نگاہ ڈال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

دو ہفتے تک کوئی جواب نہ آیا۔ چیتن سنگھ صبح و شام دفتر آتے جاتے
ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سے گزرتا۔ وہ ہر بار سٹیشن کے احاطے میں نظر ڈال لیتا۔
اِس خیال سے کہ شاید اطہر اتفاقیہ طور پر دکھائی دے جائے تو اُس سے اپنی کہانی کے
بارے میں کچھ معلوم کر سکے۔ ورنہ وہ اُس کے پاس جانے میں کچھ اپنی ہتک سمجھتا
تھا۔ چٹھی کے لئے اُس نے کہا تھا۔ لیکن چٹھی کا انتظار دیکھتے دیکھتے وہ اُکتا گیا تھا
آخر اُس نے پبلک کال آفس سے فون کیا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی

"ہیلو!"

"مجھے اطہر صاحب سے بات کرنا ہے!"

"وہ اس وقت سیٹ پر نہیں ہیں!"

اتنا کہہ کر اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ چیتن سنگھ کو آگے بات کرنے کا
موقع ہی نہ دیا۔ وہ جان گیا کہ دوسری طرف سے وہی نازنین بول رہی تھی جسے
پچھلی مرتبہ اُس نے اطہر کے کمرے میں دیکھا تھا جس نے سفید سلک کی ساری
پہن رکھی تھی۔ اور کانوں میں ہاتھی دانت کے آویزے۔ ٹیلیفون کی ڈوری ضائع
ہونے کا اُسے کچھ ملال نہ ہوا۔

دس پندرہ دن مزید انتظار کرنے کے بعد چیتن سنگھ نے پھر ٹیلیفون
کیا۔ اب کی بار ریسیور اطہر ہی نے اُٹھایا۔ کہانی کے متعلق اُس نے بتایا کہ ابھی تک
پڑھ نہیں سکا۔ کام کاج بہت زیادہ ہے۔

"خیر کوئی بات نہیں" چیتن سنگھ نے کہا۔ "لیکن ابھی اور کتنے دن
لگیں گے؟"

اطہر نے قدرے ہنس کر کہا۔

"نہیں اب اور دن نہیں لگیں گے۔۔۔۔۔ یہ لیجئے میں نے آپ
کی کہانی نکال کر اُوپر رکھ لی ہے۔ اب کل آپ کا ہی کام کر ڈالوں گا۔"

"میں کب دریافت کروں؟"

...ٹیلیفون کر لیجیے گا۔"

...ین سنگھ سوچنے لگا۔ میں کیوں اتنے دن خاموش رہا۔ پہلے یاد دہانی کرا دیتا تو اس وقت تک افسانے کے متعلق کچھ فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ یوں ہی بلا وجہ جھجکتا رہا۔ اظہر آدمی تو بہت معقول معلوم ہوتا ہے کہ میرے یاد دہانی کراتے ہی اُس نے کہہ دیا۔ کل ہی آپ کا کام کر دوں گا۔"

لیکن دوسرے دن چار پانچ بجے ٹیلیفون کیا تو نسوانی آواز نے بتایا کہ اظہر ابھی ابھی سٹیڈیو گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی کچھ کھسر پُھسر کی آواز دوسری جانب سے چیتن سنگھ کو سُنائی دی۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ اظہر اپنی کُرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ سٹیڈیو میں نہیں گیا۔ اُسے ٹال رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اِس کھسر پُھسر کو اپنے وہم سے منسوب کیا۔ اُس نے پُوچھا۔

"کتنی دیر تک واپس آئیں گے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی تو گئے ہیں۔"

چیتن سنگھ نے رسیور رکھ دیا۔ اُس کے پاس اب کچھ اور کہنے کو تھا ہی نہیں۔ ورنہ اُدھر تو نازنین رسیور اُٹھائے اُس کے مزید سوالوں کا جواب دینے کو تیار بیٹھی تھی۔

چیتن سنگھ کو مایوس ہونا پڑا۔ افسانہ کے متعلق بلا وجہ تاخیر ہو رہی تھی۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ کل دن بھر ٹیلیفون کرتا رہوں گا۔ کسی وقت تو اظہر سے بات ہو سکے گی۔

اور اگلے روز اظہر نے کہا۔

"جناب! میں تو کل چار بجے آپ کے فون کا انتظار کرتے ہوئے سٹیڈیو چلا گیا۔"

"میں نے چار بجے فون کیا تھا۔"

"تو گھڑیوں میں دو ایک منٹ کا فرق ہو گا۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"وہی افسانہ کے متعلق آپ کا فیصلہ . . . ."

"وہ افسانہ تو میں نے پڑھ لیا ہے۔ اُس میں کچھ خامیاں ہیں۔ آپ کسی وقت آئیں تو وضاحت کر دوں گا۔"

"ابھی آ جاؤں؟"

"ابھی؟ ابھی نہیں۔ آپ کل آ جائیے گا۔"

"کل کس وقت؟"

"دو بجے کے بعد کسی وقت۔"

چیتن سنگھ نے اگلے دن ہیڈ کلرک کی خوشامد کر کے آدھے دن کی غیر سرکاری طور پر چھٹی لے لی۔ اور پُورے دو بجے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ چپراسی سے اطلاع کرائی تو اظہر صاحب خود ہی ہاتھ میں ایک موٹی سی فائل پکڑے، مُنہ میں پان دبائے وزیٹنگ رُوم میں آ پہنچے۔ اور بولے۔

"میں ابھی سکولوں کے طلبا کے پروگرام میں تقریر کرنے والا ہوں۔ اڑھائی بجے فارغ ہوں گا۔ گراں نہ گزرے تو یہیں انتظار کیجیے۔"

چیتن سنگھ کو وزیٹنگ رُوم میں بیٹھنا یوں بھی پسند تھا۔ ایسا صاف ستھرا کمرا اور گاڈریج کا حسین فرنیچر۔ وہ صوفے پر بازو پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے سامنے کی کُرسی پر ایک آرٹسٹ بیٹھی ہوئی تھی۔ شلوار قمیص میں ملبوس۔ شانوں پر دوپٹہ پھیلائے۔ گلے میں سُرخ موتیوں کی مالا پہنے ہوئے۔ شکل و لباس سے کچھ معلوم نہ پڑتا تھا۔ کہ خاندانی لڑکی ہے یا بازاری۔ اُس کے ساتھ جو نوجوان تھا وہ شکل صورت سے بازاری آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس سے چیتن سنگھ نے اندازہ ... کہ کوئی پیشہ ور گانے والی ہے لیکن پھر بھی اُسے بات کرنے کا حوصلہ ... لڑکی کے پاس ایک موٹی سی کتاب تھی۔ جو اُس نے میز پر رکھنے کے ... اپنی آغوش میں رکھی ہوئی تھی۔ اور اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا ... کا نام چیتن سنگھ کو معلوم نہ ہو سکا۔ اِتنی سی بات معلوم ہو جانے پر وہ ... لڑکی کے ذوق کا اندازہ لگا لیتا۔ اور پھر گفتگو کا سلسلہ جنبانی کچھ دشوار ...

تھوڑی ہی دیر میں ریڈیو کا کوئی چھوٹا موٹا افسر ایک فارم اُٹھائے ہوئے ... آرٹسٹ کے دستخط کرانے کے بعد بتایا کہ شام کو فلاں وقت پر پھر آ جا... وہ لڑکی اور اُس کا ساتھی نوجوان چلے گئے۔ اب چیتن سنگھ ... گیا۔ وہ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا ...

... سیشکل بنا ... [illegible] ...

... کی گھڑیاں ... [illegible] ...

... ڈھائی بجے ... [illegible] ...

بیسویں صدی دہلی

جولائی ۱۹۵۵ء

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں فی پرچہ آٹھ آنے

جلد — ۱۹
نمبر — ۷

سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت
۹ شلنگ

ٹیلیفون دفتر
۲۶۶۳۷
ٹیلیفون ہاؤس
۴۸۰۲۵

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں۔ جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

داخل ہوتے ہوئے اُس نے نازنین پر نظر ڈالی لیکن وہ نگاہ نیچی کئے اپنے کاغذات دیکھتی رہی۔ اُس نے کمرے میں آنے والوں کا کچھ نوٹس ہی نہیں لیا۔ چیتن سنگھ نے تو ریڈیو اسٹیشن آنے سے پہلے اپنے دفتر کے باتھ رُوم میں جاکر داڑھی کو سنوارا تھا۔ سر کی پگڑی کو ٹھیک ڈھنگ سے سجایا تھا لیکن اُس کی محنت بیکار گئی۔

اطہر نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر خود بھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میز کی دراز سے کہانی نکالی۔ اب چیتن سنگھ ذرا آگے کو جھک گیا۔ وہ کہانی کی خامیاں معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا لیکن اطہر نے صرف اتنا ہی کہا۔

کہانی کو تھوڑا کم کر دیجئے۔ یہ فُل سکیپ کاغذ کے ساڑھے چھ صفحوں پر لکھی ہوئی ہے۔ ہمارا ایک صفحہ ڈھائی تین منٹ میں پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہانی کم از کم اٹھارہ منٹ لے گی۔ آپ اسے پندرہ منٹ کی کر دیجئے۔

چیتن سنگھ نے کہانی واپس لیتے ہوئے کہا۔

"اور تو اس میں کوئی خامی نہیں؟"

"نہیں، اور کوئی خامی نہیں" اطہر نے کہا۔ "یہ کہانی واقعاتی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔"

"یہ تو ہماری پڑوسن کا واقعہ ہے!" چیتن سنگھ نے جلدی سے کہا۔

"اِسی لئے تو کہتا ہوں، نام وام سب بدل ڈالئے گا۔ کل کوئی اعتراض نہ کرے۔"

"نام تو میں نے سب فرضی رکھے ہیں۔ یہ کہانی لکھنے کے بعد میں نے اپنی پڑوسن اور اُس کے شوہر کو سُنادی تھی۔ انھیں کچھ اعتراض نہیں۔"

یہ سُنکر کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی نازنین نے بھی سر اُٹھایا۔ اور چیتن سنگھ کی نگاہیں اُس سے چار ہوئیں۔ گھبرا کر چیتن سنگھ اپنی پگڑی درست کرنے لگا جو اپنی جگہ پر بالکل دُرست تھی۔

"آپ کب تک کہانی درست کریں گے؟"

اطہر نے پوچھا۔

"کانٹ چھانٹ تو آج رات ہی کر ڈالوں گا۔ لیکن اِسے دوبارہ صاف کر کے لکھنا پڑے گا۔ وہ پرسوں اتوار کو ہی ہو سکے گا۔"

"تو سوموار کو آپ مجھے دے دیجئے گا۔ میں فوراً ہی کنٹریکٹ فارم جاری کر دوں گا۔"

چیتن سنگھ ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکلا تو اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے بیوی سے کہا۔

"سُنو تیجندر! اب جلد ہی میرا شمار مشہور افسانہ نویسوں میں ہونے لگے گا۔"

تیجندر سمجھ گئی کہ اُس کے شوہر کی آج رات کاغذ سیاہ کرتے ہوئے گزرے گی کیونکہ اِس سے پہلے وہ جب کبھی بہکی بہکی باتیں کیا کرتا تھا اُس کی تمام توجہ تیجندر سے ہٹ کر کاغذ، قلم کی طرف لگ جاتی چیتن سنگھ کی افسانہ نگاری تیجندر کے لئے ایک سوتن سے کم نہ تھی۔

لیکن جب چیتن نے بتایا کہ وہ جلد ہی ریڈیو سے کہانی براڈکاسٹ کرنے والا ہے تو بیوی کی نظروں میں اُس کی عظمت کئی گُنا بڑھ گئی۔ اُس رات تیجندر بڑبڑائی نہیں۔ بلکہ جب چیتن سنگھ کہانی میں کانٹ چھانٹ کرنے لگا تو وہ بہت اطمینان سے اُس کے پاس بیٹھی رہی۔ اور کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اُس نے ٹائم پیس قریب رکھ لیا۔۔ اور کہانی کو اُسی لہجے میں پڑھنے لگا جس سے اُسے براڈکاسٹ کرنا تھی۔ تیجندر بالکل خاموش پاس بیٹھی رہی۔ ایک بار پڑھنے کے بعد چیتن کی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔

اُس نے دوسری بار پڑھ ڈالی۔

اگلے دن وہ دفتر نہیں گیا۔ بیماری کا بہانہ کر کے گھر بیٹھا رہا۔ چھٹی کی عرضی بھیجدی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ کہانی پھر لکھنے لگا۔ کہانی لکھی گئی تو کئی مرتبہ پڑھنے کی مشق کرتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب وہ گھر سے باہر نکلا۔ بیوی سے کہا۔

"اگر کوئی ملنے والا آئے تو کہہ دینا ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔"

اور وہ سچ مچ ایک ڈاکٹر کی دُکان پر چلا گیا۔ دوا لینے کے لئے نہیں، اطہر کو ٹیلیفون کرنے کے لئے۔ اُس نے اطہر کو کہانی درست کرنے کی اطلاع دی تو اطہر نے کہا۔

"میں اِس وقت بہت مشغول ہوں۔ بہتر ہو اگر آپ شام کے وقت کہانی لیکر کافی ہاؤس پہنچ جائیں۔ وہاں فرصت میں اِس پر بحث ہو سکے گی۔"

اُسی شام اظہر شاعر دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ جہاں چیتن سنگھ بیدی کرسی میں دھنسا ہوا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

بیرے کو چائے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد چیتن سنگھ نے کہانی نکالی اظہر نے سرسری طور پر صفحے اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔ اور کہا۔

"اب یہ بالکل درست ہو چکی ہے۔ کل اتوار ہے۔ میں پرسوں ہی کنٹریکٹ فارم جاری کر دوں گا۔"

اور چائے نوشی کے بعد جب چیتن سنگھ نے بہت اطمینان سے ساڑھے سات روپے کا بل ادا کر دیا تو اظہر نے کہا۔

"بھئی ایسا نہیں ہو سکتا کہ پرسوں لنچ آور میں تم ریڈیو اسٹیشن چلے آؤ۔ میں کنٹریکٹ فارم تیار رکھوں گا۔"

"میں ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا۔" چیتن سنگھ نے جواب دیا۔

ساڑھے سات روپے خرچ کرنے کا اُسے ذرا بھی ملال نہ تھا۔ کیونکہ کہانی کا معاوضہ پچیس روپے ملنا تھا۔ اگر کہانی براڈ کاسٹ کرنے کے لئے اُسے پچیس روپے بھی خرچ کرنے پڑ جاتے تو کچھ افسوس نہ ہوتا۔ اُس کا شمار تو مشہور افسانہ نویسوں میں ہونے لگتا۔

اُس نے سوچا تھا، گھر واپس جاتے ہوئے ایک سندھی کی دکان سے بیوی کے لئے رس گُلّے لیتا جائے گا۔ لیکن اب زیادہ خرچ ہو جانے کے باعث وہ خالی ہاتھ گھر پہنچا۔ اور تمیندر کو خوشخبری سُنا دی کہ اُس کی کہانی منظور ہو گئی ہے۔

کنٹریکٹ فارم جاری ہو گیا۔ لیکن اُس پر بڑے صاحب کے دستخط کرانے میں بہت دقت پیش آئی۔ آخر جب وہ مشکل بھی حل ہو گئی تو چیتن سنگھ نے فوراً اظہر کو ٹیلیفون پہ مطلع کر دیا اور اُسی شام کافی ہاؤس میں دعوت کا پیغام دیا۔ اظہر نے کہا۔

"بھئی آج میرے پاس فتحپور کے ایک شاعر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ ذرا۔۔"

"آپ اُنھیں بھی ساتھ لے آئیں۔" چیتن سنگھ نے مکمل بات سُنے بغیر مدعو کر لیا۔

کافی ہاؤس میں اظہر نے فتحپوری شاعر سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ انھیں کافی، چائے وغیرہ سے کچھ رغبت نہیں۔ یہ تو صرف بادۂ ناب کے شیدائی

ہیں!"

چیتن سنگھ نے کبھی شراب نہ پی تھی لیکن اظہر کا مدعا سمجھ کر وہ اُنھیں بار میں لے گیا۔ سوچا خود نہیں پیئے گا۔ صرف اُنھیں پلائے گا لیکن جب بادہ جام سامنے آئے اور اظہر اور شاعر نے اصرار کیا تو چیتن سنگھ نے بھی جام اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

ذائقہ اُسے بالکل پسند نہ آیا لیکن شاعر کے یہ الفاظ بہت پسند آئے کہ "بغیر پیئے کوئی شاعری یا افسانہ نویسی کیا کر سکے گا۔" پیتے ہوئے شاعر نے جھوم جھوم کر اپنے تازہ ترین اشعار سُنائے جنھیں سُن سُن کر اظہر بھی جھومنے لگا۔ اور چیتن سنگھ کو اُسے دکھلانے کے لئے جھومنا پڑا۔

سولہ روپے کا بِل ادا کر کے وہ بار سے باہر نکلا۔ اظہر اور شاعر کو شب بخیر کہہ کر وہ بس اسٹینڈ تک پہنچا۔ کافی دیر تک بس کا انتظار کرنے کے بعد جب اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب پایا۔ بٹوا کہاں گیا؟ جب وہ بار سے باہر نکلا تو وہ اُس کی جیب میں تھا۔ وہاں سے بس اسٹینڈ تک چلتے چلتے کسی نے اُڑا لیا یا گر گیا۔ اب اُس کی جیب میں بس کے کرائے کے تین آنے بھی نہ تھے۔ وہ بارہ آنے میں رکشا لے کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

اب شراب اپنا اثر کر رہی تھی۔ راستے بھر نشہ طاری رہا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جب اُس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔

بیوی نے دروازہ کھولا اور خاوند کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ شراب کی تیز بُو اُس کی ناک سے ٹکرائی۔ تو چُپ چاپ وہ شوہر کو گھسیٹ کر اندر لے گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ پاس پڑوس کے لوگوں کو اس بات کی خبر ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا

"صاحب کرایہ تو دے دیجئے۔"

اور جب رکشا والا کرایہ لے کر چلا گیا تو تمیندر نے دروازہ بند کر کے چیتن سنگھ کے کپڑے اُتارے اور کھینچ کر پلنگ پر لٹاتے ہوئے اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

تیرہ سے پانچ روز کے بعد ۔۔۔ چیتن سنگھ ۔۔۔

ں بیٹھ کر آج کے پروگراموں کی ایک جھلک سن رہے تھے۔ جونہی اناؤنسر نے کہا
دیہاتی ...“ اس عنوان کے تحت آج رات سوا نو بجے آپ چیتن سنگھ سے انکی
کہانی سنیں گے۔“

تو چیتن سنگھ نے خوشی سے اچھل کر بیوی کو گلے لگا لیا۔ دن بھر وہ اپنے
دستوں کو مطلع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج رات کو سوا نو بجے ضرور میری کہانی
سننا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دبی زبان سے پچیس روپے کے چیک کا ذکر بھی
کر دیتا۔ “اور سب آرٹسٹوں کو تو اسی روز چیک مل جاتا ہے لیکن افسانہ نویسوں کو
یک روز بعد ملتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے؟“

شام کو گھر سے ریڈیو اسٹیشن جاتے ہوئے اس نے بیوی سے کہا۔ ”نو بجے ہی
سے ریڈیو لگا لینا۔ بعض اوقات عین وقت پہ صحیح سٹیشن کچھ نہیں ہوتا۔“ چیتن
سنگھ گھر سے کافی جلدی چل پڑا تھا لیکن وہ اتنی جلدی ریڈیو اسٹیشن نہ پہنچنا چاہتا
تھا۔ اس لئے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر ایک معمولی سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر
چائے پینے لگا۔ وقت گزارنے کے لئے۔

پونے نو بجے کے قریب وہ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر ویٹنگ روم میں بیٹھ
گیا۔ اظہر نے کہا تھا، وہ اسے وہیں ملے گا۔ لیکن اظہر کہیں دکھائی نہ دیا۔ تھوڑی
ہی دیر بعد ایک پروگرام اسسٹنٹ نے آکر پوچھا۔

”آپ ہی کا نام چیتن سنگھ ہے؟“

”جی ہاں!“

”مجھے افسوس ہے آج آپ کی کہانی براڈکاسٹ نہ ہو سکے گی۔“

”کیوں؟“ چیتن سنگھ نے گھبرا کر کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”آج سوا نو بجے دہلی سے ایک کیندریہ منتری کا بھاشن پر سارت کیا
جا رہا ہے۔“

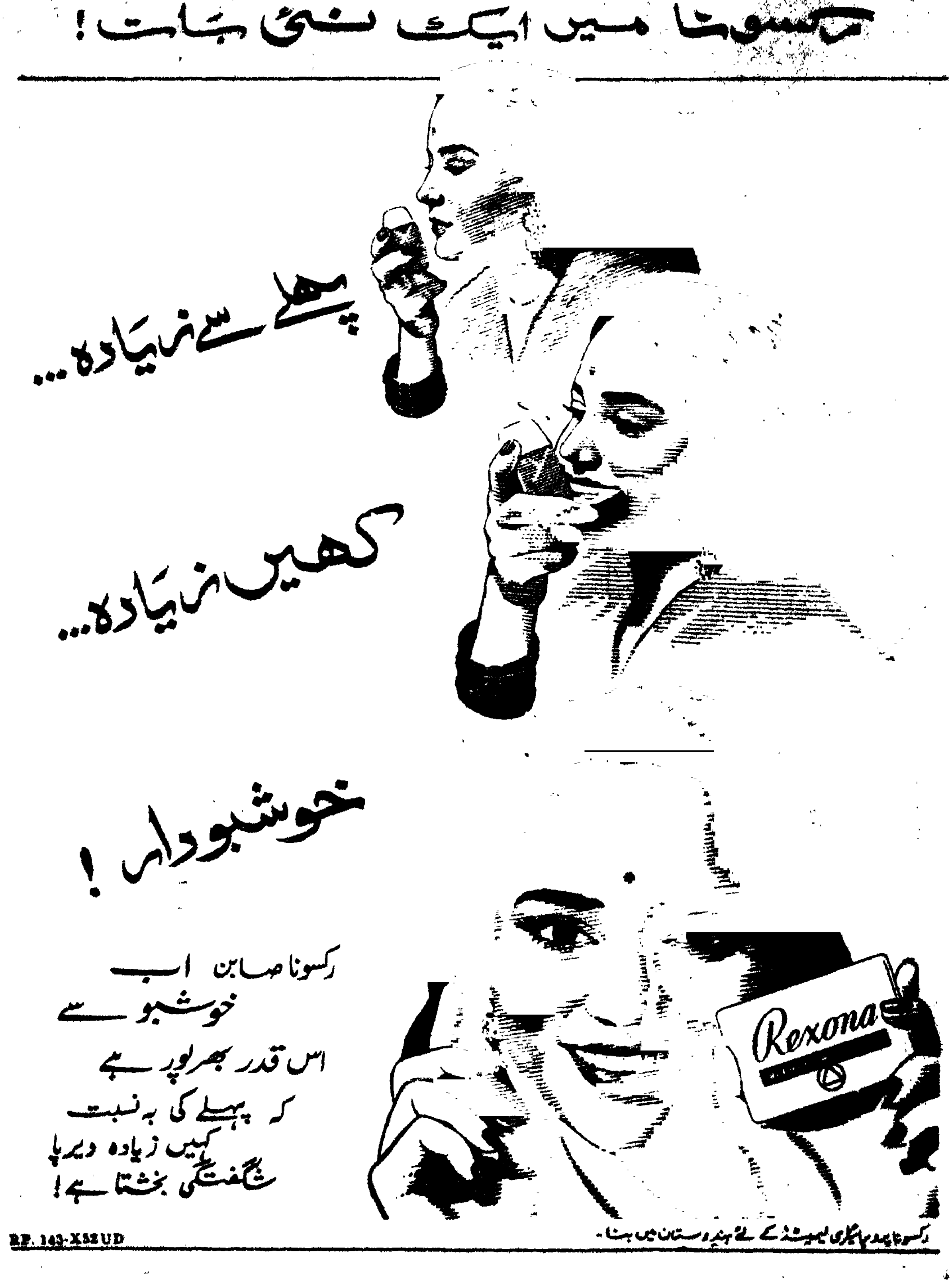
چیتن سنگھ کا جی چاہا، ایسی بری خبر سنانے والے کا منہ نوچ ڈالے
اس کے سپنوں کا سنہرا محل اس خبر کے جھٹکے کے ساتھ ایک دم گر پڑا۔ اس نے
سائیکل اٹھایا اور سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر اس کے دماغ پر
غصے کا بھوت سوار رہا۔ گھر پہنچا تو دیکھا، اس کی بیوی نے گلی محلے کی تمام
عورتوں کو جمع کر رکھا ہے۔ اور ریڈیو پر منتری مہودے کا بھاشن ہو رہا ہے۔

”بھارت ورش میں للت کلاؤں کی انتی کے لئے ہم نے جو یوجنائیں
بنائی ہیں۔ ان کے انوسار اب کوئی کلاکار بھوکا نہ رہ سکے گا۔۔۔ اسے اپنے
پاریشرم کا پورا پورا پھل ملے گا۔۔۔۔“

چیتن سنگھ غصے سے چیخا۔

”بند کرو! بند کرو یہ بکواس!!“

اور آگے بڑھ کر اس نے ریڈیو پر زور سے ایک لات جمائی۔ ریڈیو
میز پر سے نیچے لڑھک گیا۔ شارٹ سرکٹ ہو جانے کے باعث کمرے کی بتی بجھ گئی
عورتیں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے شور میں چیتن سنگھ کا شور گم ہو گیا۔


رکسونا میں ایک نئی بات!
پہلے سے زیادہ...
کہیں زیادہ...
خوشبودار!
رکسونا صابن اب
خوشبو سے
اس قدر بھرپور ہے
کہ پہلے کی بہ نسبت
کہیں زیادہ دیرپا
شگفتگی بخشتا ہے!
Rexona
RP. 143-X52 UD
رکسونا پروپرائٹری لمیٹڈ کے لئے ہندوستان میں بنا۔

مفید، کارآمد معلوماتی مقالے

صحت و زندگی

۱۔ کیا نمک مضرِ صحت ہے؟

کھانے کو لذیذ بنانے کے لئے نمک غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ مگر اس کا اعتدال سے زیادہ استعمال دماغ اور بصارت کے لئے نقصان دہ ہے جو نمک ہم کھاتے ہیں، وہ نمک ہم اُس کے علاوہ کھاتے ہیں جو ہماری غذاؤں میں موجود رہتا ہے۔ ہر پودے میں کچھ نمک والے اجزا رہتے ہیں۔ اگر بچپن ہی میں نمک کھانے کی عادت نہ ڈال دی گئی ہوتی تو غذا کے اجزا سے حاصل ہونے والا نمک ہمارے لئے کافی ہوتا۔

اِس حقیقت کی صداقت کے ثبوت کے لئے میدانوں اور جنگلوں میں رہنے والے جانور ہیں۔ جنھیں یہ نمک کبھی نہیں ملتا۔ اور جو گھریلو جانوروں کی نسبت زیادہ صحت مند اور طاقت ور ہوتے ہیں۔

نمک کی ایجاد اور استعمال کے رواج سے پہلے لوگ زیادہ صحت مند اور طویل عمر کے ہوتے تھے۔

بہت سے لوگوں کو بہت زیادہ نمک کھانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ یہ بُری عادت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ دودھ سے پکی ہوئی چیزوں میں بھی نمک ضرور ملاتے ہیں۔ اور اِس کے نتیجے کے طور پر معدہ اور آنتوں کے امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ نمک معدہ اور آنت کے پردے کو اُسی طرح کھا جاتا ہے، جیسے گھُن لکڑی کو۔ سَن کے جس بورے میں نمک رکھا جاتا ہے، وہ اُس بورے سے جلد خراب ہو جاتا ہے جس میں دال، گیہوں یا چاول رکھا جاتا ہے۔

جب نمک سن کے دھاگوں کو اتنی جلدی برباد کر دیتا ہے تو معدہ اور آنت کے نازک پردوں کو کتنا نقصان پہنچاتا ہوگا؟ اِس کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خون کی کمی کے مریض تیز نمک والی اور ترش چیزیں کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اِس کے نتیجے کے طور پر اُن کا معدہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگرچہ نمک خون کا ایک ضروری جزو ہے، اِس کے باوجود اِس کا بکثرت استعمال نقصاندہ ہے۔ یہ خون کو جلاتا اور خارش پیدا کرتا ہے۔ بعض بیماریوں میں اِس کا استعمال منع ہے۔

۲۔ بیماری کب پیدا ہوتی ہے؟

یورپ کے مشہور ڈاکٹر بندکٹ لسٹ نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے۔

"بیماری اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے جسم میں غیر قدرتی غذا داخل ہو جاتی ہے۔ اصل میں یہ غذا وہ غذا ہوتی ہے جسے قدرت انسان کی خوراک کی حیثیت نہیں دینا چاہتی۔ انسانی جسم کی مشینری کو قدرت نے مخصوص صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ بعض غذائیں اِس کے لئے مختصر کر دی گئی ہیں۔ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی نسبت قدرت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ انسانی معدہ تک نہ پہنچیں اِس طرح کی چیزوں کا اثر ہضم کی مشینری پر بُرا پڑتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اِس قسم کی غیر قدرتی غذا معدے میں پہنچکر ہضم کی مشین کے پُرزوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کرنے لگتی ہے اور اس کی معتدل رفتار میں فرق آجاتا ہے۔ اور یہی حالت آگے چل کر سارے امراض کی بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ اور انسان اپنی حقیقی اور قدرتی صحت سے محروم ہو جاتا ہے۔

۳۔ شلغم ــــــ ایک مفید سبزی

شلغم کے متعلق انگریزی زبان کی ایک تحقیر آمیز تلمیح ہے "شلغم سے خون نہیں نچوڑا جاسکتا۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسم کے نشوونما کے لئے خاص طور پر اس کے سبز پتوں سے آبِ حیات نچوڑا جاسکتا ہے۔ سبز پتوں میں کیلشیم کی بڑی مقدار ہوتی ہے۔ جو خون اور ہڈیوں اور دانتوں کے لئے بہت اہم چیز ہے۔

چھوٹے بچے جن کے نشوونما کا زمانہ ہے اور ایسے لوگ جن میں کیلشیم کی کمی ہو اُن کے لئے سبز پتوں کا تازہ نکالا ہوا رس پینا بہت مفید ہے۔ کیلشیم کے علاوہ شلغم اور اِن سبز پتوں میں سوڈیم لوہا، اور پُٹاشیم بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے اِن کا رس پینا خون کی کمار کو متوازن رکھنے کے لئے بہت مفید ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب اُس میں گاجر کا رس بھی شامل کرلیا جائے۔

آنکھوں کی کمزوری کے لئے شلغم کے سبز پتوں کا رس اور گاجر کا رس دونوں ملاکر شام کے وقت پینا چاہیے۔ بے حد مفید ہے۔ بیماروں کے لئے شلغم ہلکی اور زود ہضم غذا ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے خصوصیت سے بہت مفید ہے۔ اِس میں وٹامنز اے، بی، سی پائے جاتے ہیں۔

۴۔ قدرتی غذاؤں کی اہمیت

آج دُنیا میں اُن صحرائی قبائل اور جنگلی قوموں کے سوا جو ریگستانوں، کوہساروں اور غیر متمدّن علاقوں میں زندگی بسر کررہی ہیں۔ ایسے افراد شاید بہت کم مل سکیں گے جو حقیقی معنوں میں قدرتی غذا استعمال کرتے ہوں۔ لطف یہ ہے کہ ہماری تہذیب وشائستگی نے قدرتی اور مفید غذاؤں کا استعمال زمانۂ جہالت کی رسم قرار دے دیا ہے۔ اور آج اگر ہم اپنے اسلاف واجداد کی تقلید کرتے ہوئے قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے اِس طرح لطف اندوز ہونے لگیں کہ اُن کے حقیقی خواص مبدل نہ ہونے پائیں۔ تو دُنیا ہمیں غیر متمدن، جاہل، غیر مہذب اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے خطابات عطا کردے۔

دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اگر دوچار لمحوں کے لئے بھی ہم پُرسکون دل ودماغ کے ساتھ اپنی روزمرہ کھانے پینے کی چیزوں کا جائزہ لیں اور اُن کی اچھائی بُرائی پر تبصرہ کریں۔ تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ کوئی دانہ بھی ہمارے منہ تک اپنی اصلی حالت میں نہیں پہنچتا۔ پھلوں، میووں، اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں میں کون سی چیز ایسی ہے جسے ہمارا ذوقِ لذت گیری غیر حقیقی اور مصنوعی نہیں بنا دیتا؟ ہم ترکاریاں کھاتے ہیں لیکن اِس طرح کہ اوّل تو آگ اور دھوئیں سے اُن کی شکل ہی تبدیل کردیتے ہیں۔ اور پھر اُن میں نمک، مرچ، لونگ، دھنیا، ہلدی وغیرہ مسالے ڈال کر اُن کے خواص اور خصوصیات بھی بالکل بدل دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اور تغیّر بسا اوقات مبارک اور مستحسن نہیں ہوتا۔ کیونکہ مسالوں کی آمیزش سے وہ غذا مفیدِ صحت، ممدِ حیات ہونے کے بجائے مضرِ صحت ہوجاتی ہے اِس غذا کے معدے میں پہنچنے کے بعد زہریلے بُخارات پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ معدہ کی مشین ثقیل اور غیر قدرتی غذا ہضم کرنے سے یا تو عاجز ہوتی ہے یا آلاتِ ہضم میں طرح طرح کی رُکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ کی تمام مشینری غیر متوازن ہوکر صحت کو تباہ کردیتی ہے۔

۵۔ کل کا انتظار نہ کیجیے

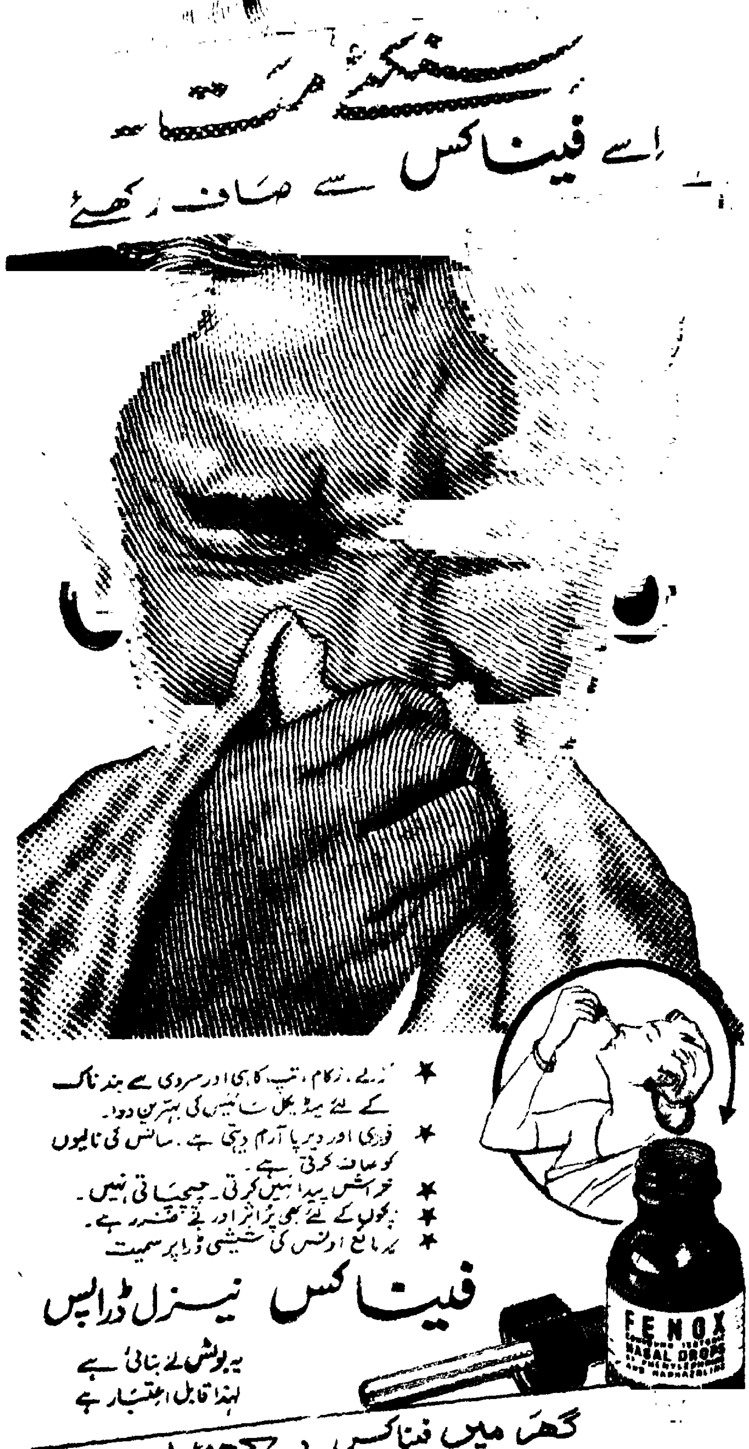
تابندہ ودرخشندہ دن مستقبل کے پردے میں نہیں چھُپا ہے۔ آپ کے سامنے موجود ہے۔ وہ آج ہی کا دن ہے۔ سنہرا موقع آنے والا نہیں ہے، وہ آگیا ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔ زندگی کو حسین اور تابناک بنانے کے لئے ساز، چیزیں، سارے سامان آپ کے سامنے ہیں۔ اِن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اِن کا مالک بننے کے لئے آگے بڑھیئے۔ اپنی طاقتوں کو پہچانیئے۔

۷۔ یہ بڑے لوگ

اپنے اندر اِس خیال سے احساسِ کمتری نہ پیدا ہونے دیجیے۔ کہ آپ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ آپ بہت سی غلطیاں کرتے ہیں۔

اگر بڑے لوگوں کی غلطیاں، اُن کی خامیاں، اُن کی پیشانی پر نقش کردی گئی ہوتیں تو اُنھیں اپنی ٹوپیاں ابروؤں پر سے پہننی ہوتیں۔

خط وکتابت کرتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے


اسے فیناکس سے صاف رکھیے
زکام، تپ کاہی اور سردی سے بند ناک کے لئے میڈیکل سائنس کی بہترین دوا۔
فوری اور دیرپا آرام دیتی ہے۔ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہے۔
خراش پیدا نہیں کرتی۔ چپچپاتی نہیں۔
بچوں کے لئے بھی پُراثر اور بے ضرر ہے۔
فیناکس نیزل ڈراپس
یہ بوٹس نے بنائی ہے
لہٰذا قابل اعتبار ہے
FENOX
NASAL DROPS
گھر میں فیناکس رکھیے!

FX. 4-X30 UD

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ علمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شائع نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوالات بھیج سکتا ہے۔ سوالات صاف اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

محمد زین العابدین - جاجا

س۔ امید کی کرن کب پھوٹتی ہے؟

ج۔ جب مایوسی کا اندھیرا انتہا پر ہوتا ہے جب غم حد سے بڑھتا ہے تو امید کا آفتاب نکلتا ہے۔

س۔ انسان کے [illegible] زیادہ خوشی [illegible] ہو سکتی ہے؟

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible] ہے؟

ج۔ [illegible]

[illegible] آباد

س۔ [illegible]

ج۔ رات کی تاریکی صبح کے اجالے کی پیامی ہے۔

س۔ دن کا اجالا؟

ج۔ دن کا وہ اجالا کس کام کا جو ہر بلند و پست کو نور و ضیا نہ بخشے!

ایم۔ اے حسن۔ کلکتہ

س۔ کیا سائنس کی ایجادات باعث جنگ ہیں؟

ج۔ جی ہاں! اسباب جنگ، آلات و سامان حرب [illegible] سائنس [illegible] ایٹم [illegible] سے سائنس [illegible] کی پیداوار تو ہیں۔

س۔ تہذیب و تمدن کا سائنس سے کیا رشتہ ہے؟

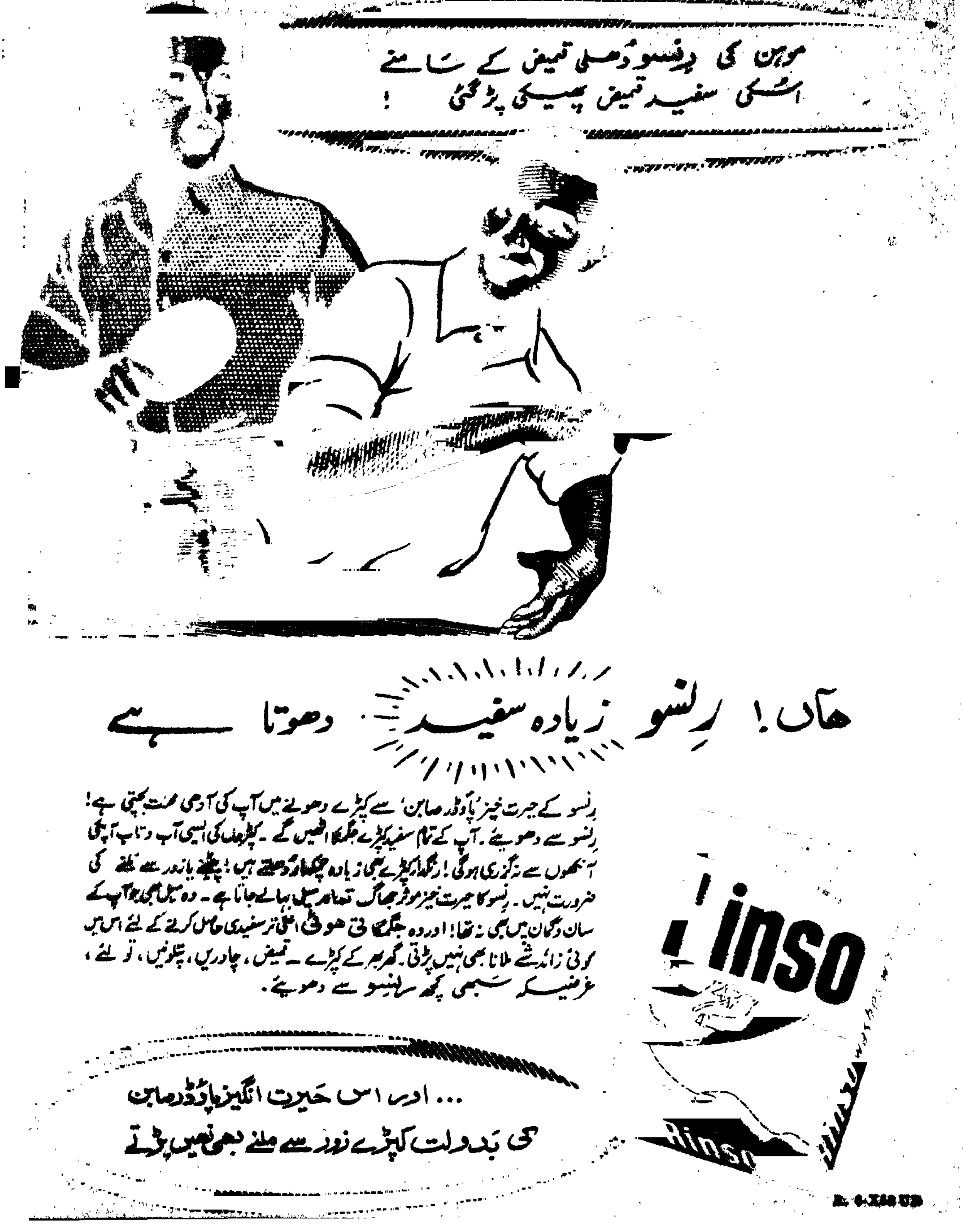
ج۔ چولی دامن کا۔

س۔ سائنس نے ہمارے اخلاق کو کہاں تک سنوارا ہے؟

ج۔ سائنس نے ہمارے اخلاق کو سنوارا کم بگاڑا زیادہ ہے!

س۔ انسان کی ترقی کی راہیں کس چیز نے [illegible] ہیں؟

ج۔ [illegible]


موہن کی رنسو دھلی قمیص کے سامنے
اسکی سفید قمیص پھیکی پڑ گئی !
ہاں! رنسو زیادہ سفید دھوتا ہے
رنسو کے حیرت خیز 'پاؤڈر صابن' سے کپڑے دھونے میں آپ کی آدھی محنت بچتی ہے! رنسو سے دھوئیے۔ آپ کے تمام سفید کپڑے جگمگا اٹھیں گے۔ کپڑوں کی ایسی آب و تاب آپکی آنکھوں سے نہ گزری ہوگی! رنگدار کپڑے بھی زیادہ چمکدار دکھتے ہیں! پٹخنے یا زور سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ رنسو کا حیرت خیز موثر جھاگ تمام میل بہالے جاتا ہے۔ وہ میل بھی جو آپکے سان و گمان میں بھی نہ تھا! اور وہ جگمگاتی ہوئی اجلی ترسفیدی حاصل کرنے کے لئے اس میں کوئی زائد شے ملانا بھی نہیں پڑتی۔ گھر بھر کے کپڑے — قمیص، چادریں، پتلونیں، تولئے، غرضیکہ سبھی کچھ رنسو سے دھوئیے۔
... اور اس حیرت انگیز پاؤڈر صابن
کی بدولت کپڑے زور سے ملنے بھی نہیں پڑتے
inso
Rinso
R. 6-X88 UD

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے مختلف اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی اور ادبی سوالات کے جوابات دیے جا سکیں گے۔ علمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات قابل اشاعت نہیں سمجھے جائیں گے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوالات بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

[illegible] زین العابدین - جہا جہا

امید کی کرن کب پھوٹتی ہے؟

جب مایوسی کا اندھیرا اتنا گہرا ہو جاتا ہے جب [illegible] کا آفتاب نکل آتا ہے۔

شادی کے موقع پر زیادہ خوش ہونے والی [illegible]

[illegible] کب مکمل ہوتی ہے؟

[illegible]

ج۔ رات کی تاریکی صبح کے اُجالے کی چاپ ہے۔

س۔ دن کا اُجالا؟

ج۔ دن کا وہ اُجالا کس کام کا جو ہر بلند و پست کو نور و ضیا نہ بخشے!

ایم۔ اے۔ حسن، کلکتہ

س۔ کیا سائنس کی ایجادات باعث جنگ ہیں؟

ج۔ جی ہاں انتہائی جنگی آلات سائنس [illegible] کی پیداوار ہیں۔

س۔ تہذیب و تمدن کا سائنس سے کیا رشتہ ہے؟

ج۔ چولی دامن کا۔

س۔ سائنس نے ہمارے اخلاق کو کہاں تک سنوارا ہے؟

ج۔ سائنس نے ہمارے اخلاق کو سنوارا کم، بگاڑا زیادہ ہے!

س۔ انسان کی ترقی کا راز کس چیز میں پوشیدہ ہے؟

ج۔ [illegible]

[illegible] شاکر [illegible] آباد

[illegible]

[illegible] ہے؟

[illegible] ہیں۔

[illegible] ہے۔ آپ کی [illegible]

[illegible] کے سلسلہ [illegible] کے متعلق

[illegible] ہو سکتا ہے۔

محمد احمد قریشی۔ کراچی

س۔ گناہ کی طرف انسان جلد کیوں راغب ہو جاتا ہے؟

ج۔ گناہ میں ایک کشش ہوتی ہے۔

س۔ کیا حالی مرحوم کا یہ ارشاد درست ہے کہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

ج۔ ہاں! بشرطیکہ انسان، انسان ہے ننگِ انسانیت نہیں۔

فضل رب فاروقی۔ گوملا

س۔ عصرِ حاضر میں انسانی ذہن پر زن پرستی کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے یا زر پرستی کا؟

ج۔ زر پرستی کا۔

س۔ [illegible] زندگی کے سفر میں چلتے چلتے سماج کی [illegible] اور اخلاق [illegible] سے گھبرا کر تھکن کا احساس کرنے لگتا ہوں۔ چین و سکون [illegible]

ج۔ [illegible]

ایس علی احمد۔ محبوب نگر

س۔ زندگی اور سماج میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ چولی دامن کا!

عبدالحلیم صدیقی۔ علی گڑھ

س۔ بھائی جان! عورت کو سب سے پیاری کون سی چیز ہے؟

ج۔ عفت و عصمت!

س۔ کبھی کبھی کلیاں کھلنے سے پہلے مرجھا کیوں جاتی ہیں؟

ج۔ کھلے ہوئے پھولوں کا انجام و مآل دیکھ کر۔

س۔ موسمِ بہار پر خزاں اپنا تسلط قائم کر لیتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ بہار کی قدر و قیمت معلوم ہو سکے۔

رفعت سلطان۔ جھنگ

س۔ آپ لوگوں کو بہت کچھ بتاتے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں میرے محترم استاد جناب سردار [illegible] احمد [illegible]

[illegible]

[illegible] اخلاق [illegible]

[illegible] بعد [illegible] دیکھ سکیں۔

ج۔ محترم سردار صاحب [illegible]

ارشاد احمد ناساز۔ کراچی

س۔ نفرت و حسن جب یکجا ہو جاتے ہیں تو کیا منظر ہوتا ہے؟

ج۔ فردوسِ گوش و جنتِ نظر

س۔ فرض اور عشق میں کس کی اہمیت ہوتی ہے؟

ج۔ فرض شناس ہو تو فرض کی، فرض ناشناس ہو تو عشق کی۔

س۔ جوانی کی آنکھ اندھی ہوتی ہے یا عشق اندھا ہوتا ہے؟

ج۔ کبھی جوانی اندھی ہوتی تھی اور عشق بھی اندھا ہوتا تھا لیکن آج کی جوانی اور آج کا عشق تو عقاب و شاہین کی آنکھیں رکھتے ہیں۔

محمد حسیب کمال [illegible]

س۔ [illegible]



اپنے بالوں کی قدرتی لہروں کو اور بھی حسین بنائیے
بالوں میں پڑی ہوئی لہریں سبھی کو اچھی لگتی ہیں۔ اسلئے بھاری اور گاڑھے تیل سے اپنے بالوں کو جمائیے مت۔ بلکہ ٹامکو پرفیومڈ کوکونٹ ہیر آئل کا استعمال کر کے اپنے بالوں کی قدرتی لہروں کے اس حسن کو اور بھی نکھاریئے۔ یہ ہلکا پھلکا اور بہت ہی صاف کیا ہوا تیل ان تین دلکش خوشبوؤں میں ملتا ہے :- جیسمین، روز، اور لیونڈر۔
۲۵ برس سے بھارت کا ہر دلعزیز ہیر آئل
ہفتہ میں ایک مرتبہ اپنے بال ٹامکو کوکونٹ آئل شیمپو سے دھوئیے۔ یہ آپ کے بالوں کو ملائم اور ان کی قدرتی لہروں کو برقرار رکھنے میں مدد پہنچاتا ہے۔
ٹامکو
پرفیومڈ کوکونٹ ہیر آئل اور شیمپو
ٹاٹا آئل ملز

[illegible]

س۔ [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] بہت [illegible]

س۔ [illegible] زندگی کب ہے بس اور مجبور [illegible]

ہوتی ہے!

ج۔ جب دوسرے کو بے بس اور مجبور دیکھتا ہے۔

محمد مزمل۔ کھنڈگری

س۔ زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں بتائیے کیا کروں؟

ج۔ زندگی کا حسن — زندگی کی رعنائیاں دیکھنے کے لئے ذوقِ نگاہ پیدا کیجئے۔

س۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں آخر میں جیت کس کی ہوتی ہے؟

ج۔ کبھی موت کی کبھی زندگی کی۔

س۔ [illegible] کی [illegible] کے [illegible] میں کیوں [illegible] ہے!

[illegible]

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ اس لئے کہ پھول [illegible] ہیں۔ پھول چھونے کے نہیں، دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں!

س۔ اگر کسی کا دل کہیں بکھر جائے؟

ج۔ جب کی ہمت — سمیٹ لینا چاہئے۔

س۔ عشق کی ابتداء اور انتہا کی تعریف کریں۔

ج۔ عشق کی ابتداء — ناقابلِ بیان لطف و لذت — عشق کی انتہا ناقابلِ برداشت تلخی و رسوائی ہوتی ہے۔

انصار احمد خان۔ کورنگی

س۔ جب [illegible] میں پھنس جائے تو؟

ج۔ پھر سمجھئے [illegible] کی کوشش کرنی چاہئے۔

س۔ دل ٹوٹنے کی آواز کیا ہوتی ہے؟

ج۔ اس کے معنی [illegible]

[illegible] ہوتا ہے۔

[illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

محمد [illegible] قریشی۔ نصیر آباد

س۔ [illegible] کیا [illegible] ہیں!

ج۔ [illegible] سیر و سیاحت کے [illegible] ہیں۔

س۔ [illegible] آدمی [illegible] ایسی بات [illegible] زندگی اور [illegible] دیتی ہے لیکن [illegible] اور [illegible] ہو جاتے تو [illegible] اور [illegible] کیوں؟

ج۔ اس [illegible]

[illegible]



ان اعلیٰ دفاتر سے احکام نکلتے ہیں ۔۔۔ اور ملک کے گل بوٹے مہتاب میں ڈھلتے ہیں

(سیکرٹریٹ - نئی دہلی)

(فوٹو - ایس - پی جین)

SADI NEW DELHI

SEPT. REGD.NO.

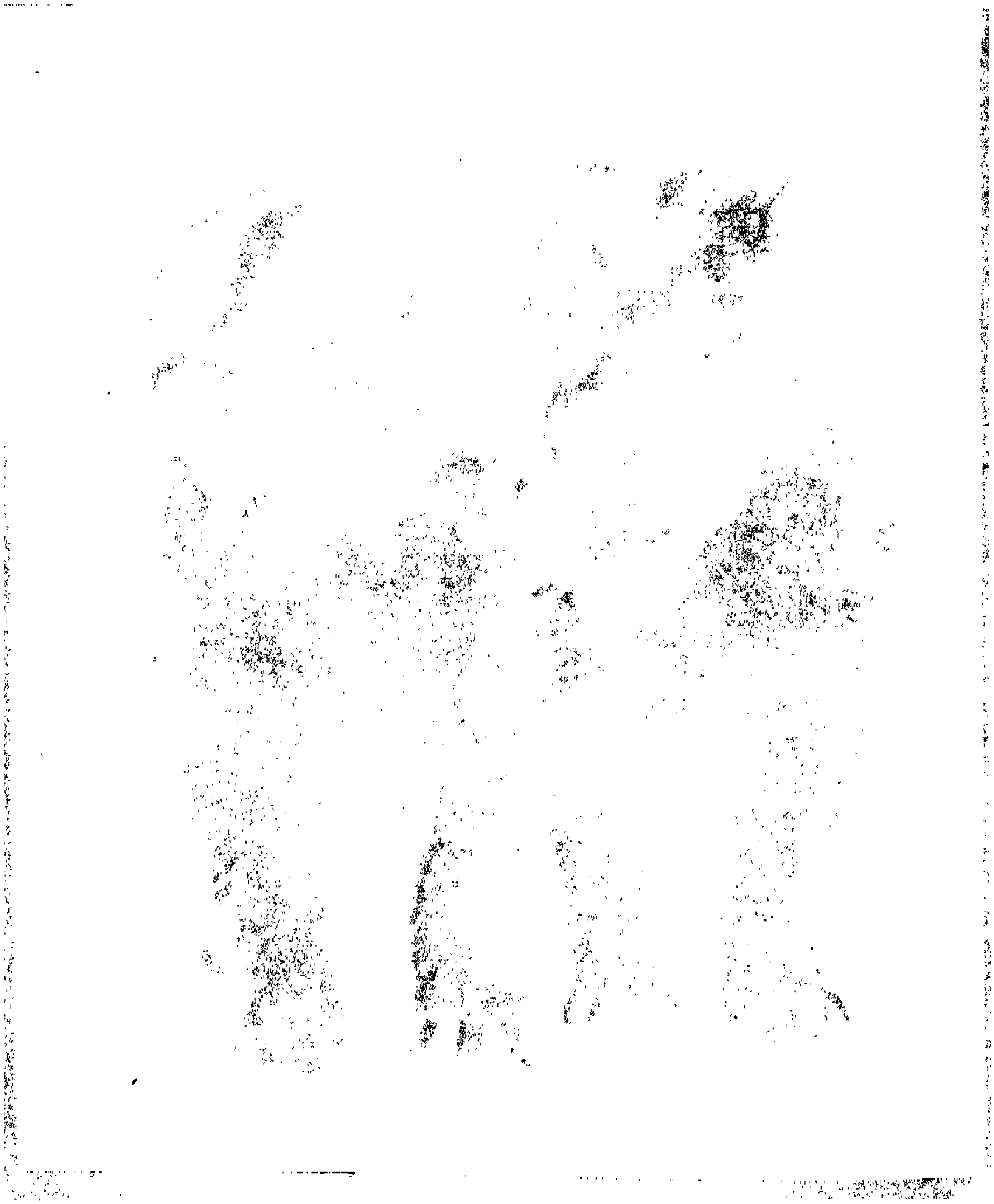


جو بولتی ہے ویسی تصویر بن گئی ہوں

نئی نویلی دلہن ——

1957

بیسویں صدی



خطرہ اور ہم سے



میں یہاں مرنے میں ہوں

تیرونشتر

از

خوشتر گرامی

پنجاب کے چیف منسٹر شری بھیم سین سچر نے اخباری نامہ نگاروں سے کہا "کہ مجھ سے پنجاب کی وزارت اور کانگرس پارٹی میں پھوٹ کے بارے میں سوال نہ کر و بلکہ تعمیری کاموں کی بابت کچھ پوچھو۔" ——— بہت اچھا! تو یہی بتا دیجئے کہ آپ نے آج تک کتنی کوٹھیاں تعمیر کر لی ہیں۔ اور آئندہ تعمیر کے لئے بنک میں کتنا روپیہ جمع کر لیا ہے۔ مختلف ذرائع سے اپنے کس کس عزیز کی قسمت تعمیر کر دی ہے۔ اور آپ ہمیں اپنی تعمیری سرگرمیوں کے انتقام کی خوشخبری سے کب تک سرفراز فرمائیں گے؟

ایک اخباری اطلاع ہے کہ "دلی اسمبلی کو توڑ کر یہاں کارپوریشن بنائی جائے گی" ——— چودھری برہم پرکاش بانی "مہا دلی" کو چاہیے کہ کسی ماہر امراضِ قلب کو ہر وقت ساتھ رکھا کریں۔ آج کل بُری بُری خبریں اُڑ رہی ہیں۔

ایک اخباری مضمون کا عنوان ہے کہ "کانگرس کے ٹکٹ کا ادھیکاری کون؟" ——— جواباً عرض ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہو۔ جو مقامی کانگرس کمیٹیوں کے پردھانوں اور صوبائی وزیروں کو خوش کر سکتا ہو۔ جس نے آزادی ملنے کے بعد کانگرس میں شمولیت فرمائی ہو۔ جسے ہائی کمان . . . . جی ہاں۔

ہندوستان کے وزیرِ خزانہ مسٹر دیش مکھ نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ابھی ملک میں مزید ٹیکس لگانے کی گنجائش باقی ہے" ——— تو پھر دیر کیا ہے۔ لگا ڈالئے۔ آپ کی موجودگی میں مزید ٹیکس لگانے کی گنجائش باقی رہ جائے تو ملک پر بھی لعنت ہے اور ملک والوں پر بھی۔ ہم نے آپ کو کچھ نہیں کہا آپ وزیر ہیں اس لئے بہت اچھے آدمی ہیں۔

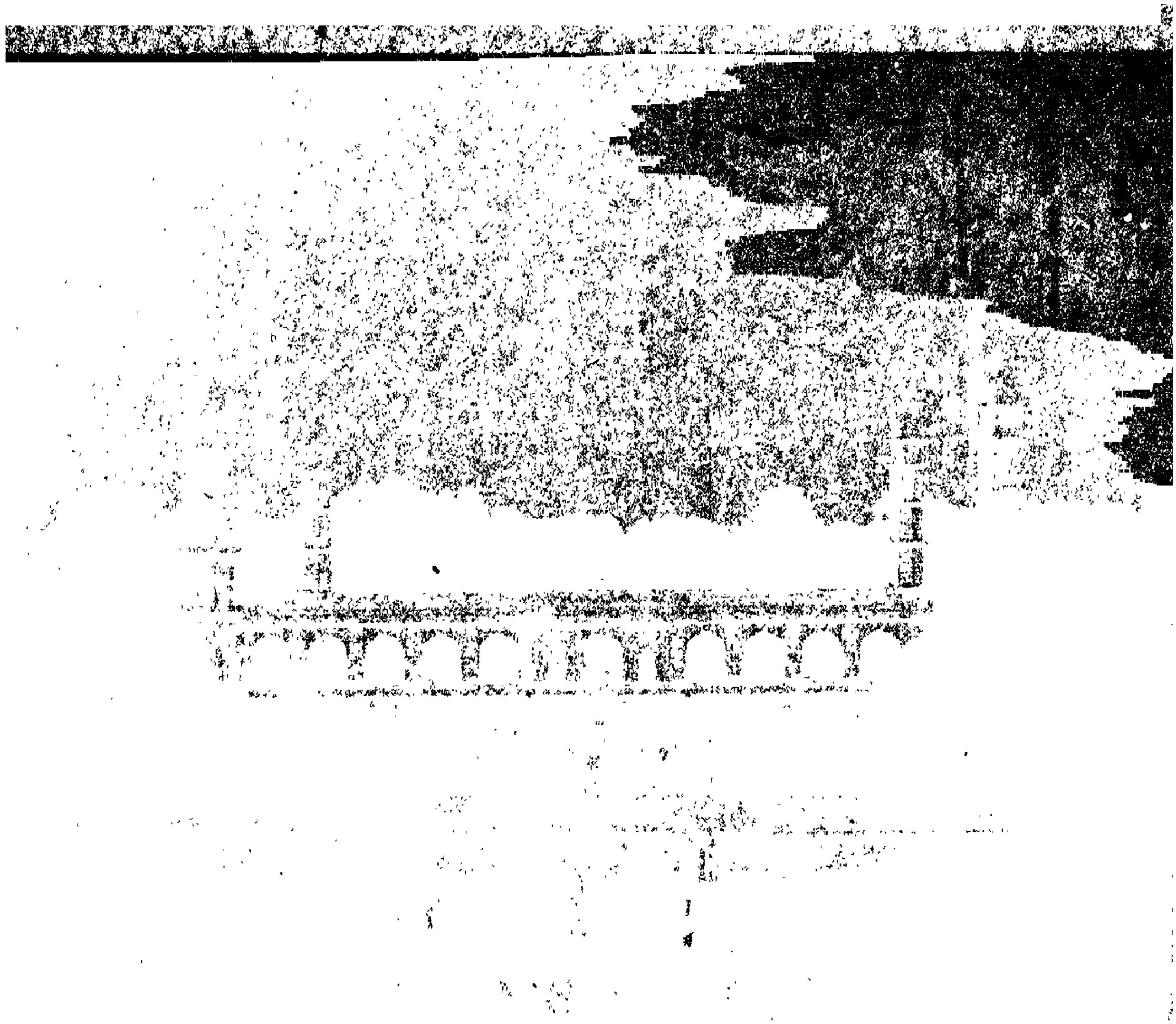
ہندوستان میں اسّی لاکھ سادھوؤں کی موجودگی کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا کہ "بہت سے لوگ اس لئے سادھو بن جاتے ہیں کہ انھیں کچھ کام کئے بغیر کھانا کپڑا مل جاتا ہے" ——— اسی طرح آجکل بہت سے لوگ خواہ مخواہ کانگرسی بن رہے ہیں۔ کیونکہ کانگرس میں شامل ہونے سے ان پڑھ لوگوں کو بھی وزارت تک مل جاتی ہے۔

انگلستان کے لیبر لیڈر مسٹر بیون نے ایک تقریر میں فرمایا کہ "انسانی فلاح و بہبود کے لئے ایک مہاتما گاندھی نے ہزار چرچلوں سے زیادہ کام کیا ہے" ——— گاندھی اور چرچل کا مقابلہ؟ گاندھی بے چارہ ایک غریب سے محکوم ملک کا لیڈر تھا۔ اور شریمان چرچل جی مہاراج نہ صرف برطانوی سلطنت کے محافظ، بلکہ دُنیا بھر کے سامراجیوں کے رہنما اور ہندوستان کے قومی غداروں اور خود غرض دشمنانِ وطن کے بھی پشت و پناہ تھے۔

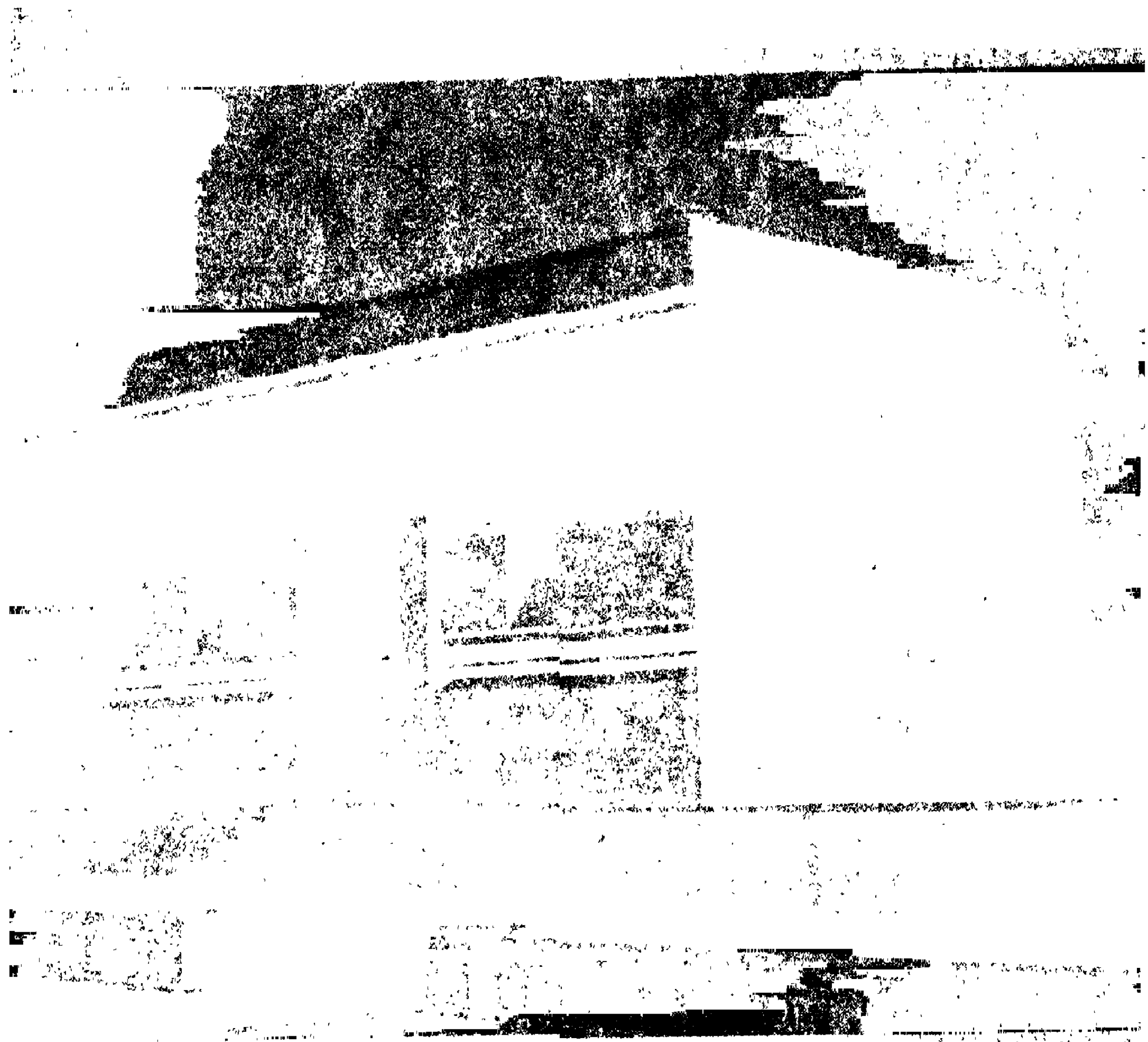
شری مہر چند کھنہ وزیر بحالیات کا خیال ہے کہ "کلیم داروں کو معاوضے کی ادائیگی میں سُست رفتاری بہت جلد ختم ہو جائے گی" ——— جی ہاں! آپ سے پہلے جو وزیر صاحبان اِس منحوس محکمے میں تشریف لائے وہ سب یہی کچھ کہتے کہتے تشریف لے گئے۔ اور آپ بھی انشاء اللہ ——— آگے حدِ ادب!



مجھے تو یہاں بٹھانے میں مزہ آرہا ہے



جہانگیرؒ کا مقبرہ ——— کبھی یہ جہانگیر تھے



علامہ اقبالؒ کی آرام گاہ ——— جن کا اقبال اب بھی بلند ہے



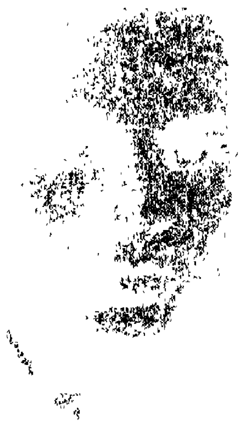
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مجازؔ مرحوم کے ساتھ



ع بزمِ احباب اور اُن کی یاد

(بیٹھے ہوئے) خوشترؔ گرامی ★ یوسف عطا ★ مجید لاہوری ★ مجازؔ مرحوم



حضرت ظفر عالمگیر ـــــ جن کا افسانہ سالنامہ کی زینت ہے



امن کے محافظ

فوٹو: آنند پرکاش سرحدی۔ بجنور

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
قیمت
فی پرچہ
ایک روپیہ

بیسویں صدی
نئی دہلی

سالنامہ
جنوری
۱۹۵۷ء

جلد ۔۔۔ ۲۱
نمبر ۔۔۔ ۱

سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت ۹ شلنگ
ٹیلیفون دفتر ۔۔۔ ۲۶۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۔۔۔ ۲۸۰۲۵

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی ۔ دہلی

ایک [illegible] سکھ لیڈر نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اکالی تحریک کے لئے غیر ملکی [illegible] ہے" ۔۔۔۔۔۔ جی ہاں پرسوں ہی [illegible] حکومت کی طرف سے [illegible] ہو لیتے [illegible] اکالی مورچہ بے شک [illegible] نقصان پہنچانے والی تحریک ہے لیکن [illegible] سے کیا فائدہ؟

[illegible] اگر کانگریس حکومت کے دور میں کھانے پینے کی چیزوں [illegible] تو بھوک [illegible] ۔۔۔۔۔۔ [illegible] کانگرسی حکومت [illegible] کانگریس کا تو [illegible] ہے کہ [illegible] ریاستوں کا [illegible] مشکل ہو رہا ہے۔

"[illegible] پیدا ہو [illegible] تار بھی [illegible] اکھاڑ دیئے گئے" ۔ [illegible] یکھو جس دن [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کا تقاضا یہی ہے کہ [illegible] اکھڑ گئے۔

[illegible] نے فرمایا ہے کہ "مسئلہ کشمیر کے حل [illegible] ہرگز نہیں کی" ۔۔۔۔۔ بہت اچھا کیا آپ نے [illegible] اس قسم کے اعلان کرتے رہتے [illegible] جیسے اخبار [illegible] انقلاب [illegible] گے۔

سردار [illegible] سنگھ [illegible] پنجاب فرماتے ہیں کہ "اکالی مورچہ سے سکھوں کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچے گا" ۔۔۔۔۔ یہ مورچہ سکھوں کے [illegible] نہیں لگایا گیا۔ [illegible] فرمائیے کہ اس [illegible] سنگھ [illegible] تماش [illegible] دوسرے بیکار لیڈروں کو فائدہ پہنچے گا کہ نہیں!

پنڈت شری رام شرما کا ارشاد ہے کہ "مردوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ حق بجانب نہیں" ۔۔۔۔۔۔ بالکل درست فرمایا آپ نے۔ اب گزارش صرف اتنی ہے کہ آپ وزارت سے تو نکالے جا چکے ہیں۔ اس لئے زندگی سے بیزار ہو کر فسادات کے خواہشمند ہوں گے تاکہ یا تو لیڈری چمک اٹھے یا شہادت نصیب ہو جائے مگر عام لوگ ابھی فسادات کا استقبال کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

فرمایا شری [illegible] نے کہ "کانگریس نے ہندوستان میں غربت کی انتہا پائی جاتی ہے" ۔۔۔۔۔۔ مگر شری گلزاری لال نندہ نے تو غریبی اور بیکاری بھوک [illegible] [illegible] کے لئے بیٹھے [illegible] غیر ملکی لیڈروں سے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان اتنی زیادہ ترقی کر چکا ہے کہ اب تصور [illegible] [illegible] ہو رہی ہے۔

پاکستان کے وزیر ڈاکٹر خان صاحب نے فرمایا کہ "پٹھان پختونستان حامی نہیں ہیں" ۔۔۔۔۔۔ آپ کا خیال درست ہی ہو گا مگر آپ کے برادر [illegible] اپنی پارٹی سمیت پختونستان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔" اس سلسلے میں اتنا کچھ کہہ چکے ہیں کہ گستاخی معاف۔

مس فاطمہ جناح نے فرمایا کہ "بیرونی عناصر کا خطرناک ہاتھ پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ اور پاکستان کی آزادی ختم ہو چکی" ۔۔۔۔۔۔ آپ کے خیالات کی تردید کی جرأت کون کر سکتا ہے لیکن اس قسم کے بیان دینے سے پہلے اپنی ذمہ داری [illegible] کا خیال رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ یوں ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کو حسب ضرورت سب کچھ کہہ گزرنے کا حق حاصل ہے۔

پٹیالہ کے ڈاکٹر دھیان سنگھ نے فرمایا ہے کہ "اکالیوں کی فرقہ دارانہ سرگرمیاں ملک کے لئے نقصان دہ ہیں" ۔۔۔۔۔۔ مگر آپ سے

تیر و نشتر

از

ادارہ

ایک عنوان "جنتا کی آواز" ——— جو جنتا راج میں نہیں سُنی جاتی۔

ایک خبر ہے "پنجاب میں چار نئے ٹرانسپورٹ محکمے قائم کئے جائیں گے" ——— افسروں اور وزیروں کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو مژدہ ہو کہ اُن کی پرورش کا سامان ہو رہا ہے۔

"یوپی میں موٹے اناج کی قلت" ——— لوگوں کو چاہئے کہ باریک اناج کھائیں وہ بھی نہ ملے تو کیک، ڈبل روٹی اور بسکٹ کھائیں۔

"حکومت مدراس نے نیلگری میں بھیڑوں کی اصلاح کی اسکیم بنائی ہے" ——— انسانوں کے سیرت و کردار کی دُرستگی تو ہو چکی۔ اب حیوانوں کی باری ہے۔

ایک عنوان ہے "پولیس کے ارکان مجرموں کے شریک کار" ——— مجرموں کی حفاظت کر رہے ہوں گے۔

"مدرسۂ نسواں نامپلی میں پردہ ختم" ——— ؎

پُوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

"گھر یلو ملازمین کا تصفیہ" ——— جو گھریلو صنعتوں کی طرح ترقی پذیر ہے۔

راجکماری امرت کور نے ڈاکٹروں کو تلقین کی ہے کہ وہ جنتا کو نیم حکیموں سے بچائیں ——— اور اپنے دام میں پھنسائیں۔ یہ ہے مطلب راجکماری جی کا۔

"پاکستان کی خارجہ پالیسی بے معنی ہے" مسٹر جنیدر یگر کا سرٹیفکیٹ ——— مسٹر جنیدر یگر کے پاس کوئی پاکستانی ڈکشنری ہوگی جس میں اس کے معنی نہیں ملتے۔ کسی انگریزی ڈکشنری میں تلاش کریں تو ضرور ملیں گے۔

روزنامہ امروز لاہور میں لاہور ڈویژن کے حکام کا ایک فیصلہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "لاہور میں قبرستانوں کی حالت بہتر بنائی جائے گی اور شہر کے لئے مزید قبرستان مہیا کئے جائیں گے" ——— چلو کوئی تو تعمیری کام ہوا۔ اب لاہور والے باطمینان مر سکتے ہیں۔ اگر انھیں زندگی میں کارپوریشن سے کوئی فیض حاصل نہ ہوا تو مرنے کے بعد اچھے قبرستان تو ملیں گے۔ زندگی بھر مکانوں کا رونا رہا مرنے پر تو قبرستان مہیا ہو جائیں گے۔

"کرایہ داروں کی مشکلات پر غور کرنے کے لئے کوٹلہ مبارک پور میں ایک جلسہ ہوا" ——— کرایہ داروں کی سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ ہر ماہ کرایہ دینا پڑتا ہے۔ غالباً اسی قسم کی مشکلات پر غور کیا گیا ہوگا۔

"اناج کی قیمتوں میں اضافہ روک لیا گیا" ——— یعنی نفع خوروں کے لئے ایک سنہری موقع پیدا کیا گیا۔

"ماسکو کے دو کارخانوں میں روسی مزدوروں کی پہلی بار ہڑتال"——

؎ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

خبر ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو فروری یا مارچ میں پنجاب کا دورہ کریں گے "—— کیوں زحمت فرمارہے ہیں پنڈت جی - وہاں سردار پرتاپ سنگھ کیرں خوب راج چلا رہے ہیں۔

کھنڈوہ میونسپلٹی کے نائب صدر نے ایک استقبالیہ مشاعرے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اُردو کے فن کار متحد ہو کر زبان و ادب کی خدمت کریں"۔—— اور اگر الگ الگ دھڑے بنا کر مشاعرے پڑھتے رہیں اور مشاعروں میں ملنے والی رقم پر جھگڑتے رہیں تو کیا یہ زبان و ادب کی خدمت نہ ہو گی ؟

"سیلون سے برطانوی اڈّوں کا صفایا"—— آپ سیلون کی بات کر رہے ہیں - ہمیں برطانوی حکومت کا برطانیہ میں صفایا ہوتا نظر آرہا ہے۔

بمبئی کی ایک خبر ہے "بھکارن کی زندگی بھر کی پونجی اُچکوں نے لُوٹ لی۔ غریب نے بھیک مانگ کر چار سو روپے جمع کئے تھے"—— یہ سوشلزم کا زمانہ ہے - اِس میں پونجی یا سرمایہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں - اُچکوں نے سوشلسٹ سماج کے قیام میں مدد دی ہے۔

اُجین کے ایک مشاعرے میں تقریر کرتے ہوئے مدھیہ پردیش کے وزیر خوراک نے کہا کہ "شاعر اور ادیب قوم کا مزاج تعمیری انقلاب کے ذریعے سنوار سکتے ہیں"—— یہ بے چارے پہلے اپنے مزاج کو تو سنوار لیں - قوم کے مزاج میں تو پھر ہی کنگھی چوٹی کریں - جتنا تخریبی ذہن اِس طبقے نے پایا ہے کسی دوسرے کا شاید ہی ہو۔

"نکاسی جائداد کا مسئلہ"—— جو سوائے روزِ محشر کے کبھی طے نہیں ہو سکتا - اور جسے اللہ میاں کے سوا کوئی طے نہیں کرے گا۔

"ایشیا نے بچے پیدا کرنے کے معاملے میں یورپ اور امریکہ کو ہرا دیا"—— ہائیڈروجن اور ایٹم بم کے دور میں قابلِ تعریف ترقی - یعنی یورپ اور امریکہ والے انسانیت کی تباہی کے منصوبے بنائیں اور ایشیا والے نسلِ انسانی بڑھائیں۔

"انصاف کا تقاضا ہے کہ گوا آزاد ہو"—— جو ڈاکٹر سالازار کی لغت میں نہیں پایا جاتا۔

"ہندوستان سے روس کو جُوتے بھیجے جائیں گے"—— اور کتنے کتنے میں پڑیں گے ؟

"کانگرس اور اکالی دل کے درمیان اب کوئی اختلافِ رائے نہیں"—— صاف صاف کہئے نا ؎

من تُو شُدم تُو من شُدی من تن شُدم تُو جاں شُدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تُو دیگری

پنڈت نہرو نے ایک تقریر کے دوران میں کہا "دُنیا کی مادی قوت بڑھ گئی لیکن دل و دماغ پر قابو پانا نہ آیا"—— اچھا ہی ہوا - ورنہ پھر لوگ آپ کے دل و دماغ پر سب سے پہلے قابو پانے کی کوشش کرتے۔

ایک خبر ہے کہ "شرنارتھی بیواؤں کے کلیم مارچ کے خاتمے سے پہلے ادا ہو جائیں گے"—— کون جانتا ہے مارچ سے پہلے کتنی کلیم کنندگان خود ختم ہو جائیں گی - ع کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک۔

ایک عنوان ہے - "امریکہ کی لڑکیاں بھی ٹھگ ہیں"—— یعنی ڈاکس اینڈ کمپنی تو تھے ہی - مگر لڑکیاں بھی ٹھگ نکلیں۔

ایک خبر ہے کہ وزیرِ اعظم چین مسٹر چو۔این لائی نے مارشل چیانگ کائی شیک سے کہا ہے کہ وہ چین واپس آکر کوئی بڑا عہدہ قبول کریں ——— جب تک جناب والا کا کرم شاملِ حال ہے ؏

ایں خیال است و محال است و جنوں

"پنجاب کا ایک اور سکینڈل ۔ حلقہ بندیوں میں گول مال" ——— ؏

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے

"برطانوی پارلیمنٹ میں قہقہے" ——— مسٹر ایڈن کی سیاسی بیماری کا مذاق اڑایا گیا ہوگا ۔

"جن سنگھ کو سوشلسٹ طرز کا غیر طبقاتی سماج پسند نہیں" ناگپور میں صدرِ جن سنگھ کی تقریر ——— انسانی برادری اور مساوات کو ہر رجعت پسند ناپسند کرتا ہے

ایک خبر کی سُرخی ہے "چاندنی میں چور پھرتے ہیں بڑا اندھیرا ہے" ——— چور کیا، اچھے خاصے یاراں کے ٹکڑے ہوگئے۔ جن کے چلنے پھرنے سے چاندنی میں اندھیرا ہونے لگا۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا "جب تک ہماری باتوں اور عمل میں یکسانیت پیدا نہ ہوگی امن قائم نہ ہو سکے گا" ——— ڈاکٹر صاحب اخلاق و رُوحانیات کی دُنیا میں بستے ہیں ۔ اور بدامنی پھیلانے والے جس دُنیا میں رہتے ہیں وہاں فلسفہ اور وعظ و نصیحت نہیں سمجھا جاتا ۔ بلکہ راکٹوں ، ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی زبان سمجھی جاتی ہے ۔

مجلسِ اقوامِ متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر کرشنا مینن نے کہا "حملہ آور ملکوں کو شرطیں پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" ——— مسٹر کرشنا مینن پرانے زمانے کی بات کر رہے ہیں ۔ اور اب چوری اور سینہ زوری کا زمانہ ہے ۔

مغربی پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب نے ایک حکم جاری کیا ہے جس کی رُو سے رشوت خور افسروں کے خلاف تحقیقات کی جائے گی ——— کاش! کبھی کوئی ایسا حکم بھی جاری ہو جس کی رُو سے رشوت خور، اقربا نواز ، اور خویش پرور وزیروں کے خلاف تحقیقات کی جا سکے ۔

نیو یارک سے حضرتِ عشق کے ایک تازہ ترین کارنامے کی اطلاع ملی ہے ۔ وہاں ایک ۸۷ سالہ دُلہن اور ۷۶ سالہ دُولہا نے شادی رچائی ہے اس شادی میں دُلہن کے تین پوتوں اور سات پڑپوتوں نے بھی شرکت کی ——— گویا ؏

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

کا فلسفہ غلط ثابت ہوا ۔ اور نہ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ؏

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ

بلکہ اب تو عشق کے سامنے تمام فلسفے ختم اور عمر کی تمام قیود ختم ہوگئی ہیں ۔

وزیرِ خارجہ فرانس نے کہا ہے کہ "ہم ساری نہر سوئز پر قبضہ کرنا چاہتے تھے ۔ افسوس کہ ہمارا مقصد پُورا نہ ہو سکا" ——— ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وزیرِ صحت راجکماری امرت کور نے لوک سبھا میں بتایا کہ "جن صوبوں میں خوراک میں ملاوٹ روکنے کا قانون نافذ ہوا ہے ، وہاں وہ موثر ثابت ہو رہا ہے" ——— ہم دلّی والوں کو تو پانی میں ملاوٹ روکنے والے قانون کی ضرورت ہے تاکہ صحت میں یہ تو اں کی ملاوٹ نہ ہو ۔

"کانگرس اکالی گٹھ جوڑ کا نتیجہ" ——— پنجابی صوبے کی بنیاد رکھی گئی ۔

افسانہ

قصہ مشہور لیڈر کی کرسی کا

از

جناب کرشن چندر ایم۔اے

کوور لاج۔ چار بنگلہ۔ اندھیری بمبئی ۔۔۔۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۵۶ء

خوشتر بھائی! آداب

اِدھر کچھ عرصے سے نیلام گھر کے فرنیچر کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ لیجئے ۔۔۔ اُن میں سے ایک مطالعہ ۔۔۔ "قصہ مشہور لیڈر کی کرسی کا" حاضر ہے۔ بہت عرصے سے ایڈیٹر کی کرسی کا قصہ لکھنے کے لئے جی چاہ رہا ہے۔ لکھ تو لوں، مگر ڈرتا ہوں کہ اُسے چھاپے گا کون؟ اب آپ ہمت کر جائیں تو کسی دن اُسے بھی لکھ ڈالوں ۔۔۔ (ضرور لکھئے۔ "بیسویں صدی" حاضر ہے ۔۔۔ ادارہ) ۔۔۔ اور کہیئے مزاج کیسا ہے؟ میں تو ابھی ابھی نرسنگ ہوم سے آیا ہوں۔ اور جنوری میں پھر جانے کا ارادہ ہے۔ اب تو زندگی کچھ اسی ڈھب سے گزرے گی۔

خاکسار
کرشن چندر

نیلام گھر میں لیڈر کی کرسی نے اپنا قصہ سنانا چاہا۔ لیڈر کی کرسی بہت پرانی تھی۔ اُس کی تین ٹانگیں تو ٹھیک تھیں۔ لیکن چوتھی ٹانگ بڑی بھدی اور بدشکل تھی معلوم ہوتا تھا کہ اصلی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد کسی اُجڈ بڑھئی نے جلدی سے لگادی ہے پُشت پر چمڑا لگا ہوا تھا۔ جو مسلسل استعمال سے گھس گیا تھا۔ اور اُس کی سطح پر متواتر رگڑ سے لیڈر کی پیٹھ کا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ نشان اتنا بڑا تھا کہ اُس پر ہماری قومی آزادی کی پوری تاریخ لکھی جاسکتی تھی۔ کرسی کی سیٹ پر نیلی مخمل کی رُوئی دار گدی جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اور اُس میں سے پھوسڑے نکل کر باہر جھانک رہے تھے۔ کرسی کا پالش بہت پُرانا تھا۔ اور کئی رنگ کا تھا۔ کہیں سے سیاہ، کہیں سے بھورا۔ اور جو چوتھی ٹانگ تھی وہ ہلکے بادامی رنگ کی تھی۔ اُس کرسی کو دیکھ کر بہت سے فرنیچر جو ایک ہی ساخت، ایک ہی رنگ اور ایک ہی لکڑی کے تھے۔ زور زور سے ہنس پڑے۔ کرسی نے خفا ہو کے کہا "میری بُری شکل پر مت ہنسو کبھی میں بھی تمھاری طرح جوان اور خوبصورت تھی۔ زمانے نے میرا یہ حال کردیا ہے۔ مگر زمانے نے سدا کسی کا ساتھ دیا ہے؟ ہر فرنیچر جو پیدا ہوتا ہے۔ ایک روز بوڑھا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ یہی زمانے کا دستور ہے!"

"سچ ہے! سچ ہے!" ایک بوڑھا پلنگ کھانس کر بولا۔

"خیر اب تم میرا قصہ سُنو!" کرسی ایک آہ بھر کر بولی۔ میں بھی زندگی کے بہت سے تجربے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ میں شہر ہیم پور کی کرسی ہوں۔ ہمارے شہر کی آبادی سات لاکھ سے اُوپر ہے۔ آدھی آبادی مراٹھوں کی ہے، آدھی یو۔پی والوں کی۔ یہ مدھ اُتر پردیش کی راجدھانی ہے لیکن یہاں پر ایک بھی کارخانہ نہیں۔ ہاں پاگل خانے گیارہ ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟" ایک لیمپ شیڈ نے پوچھا۔

"جب بھی سرکار یہاں کوئی کارخانہ لگانے کی سوچتی ہے مراٹھے کہتے ہیں۔

کارخانہ ہماری آبادی والے حصّے میں کھولنا چاہیئے۔ یو۔ پی والے کہتے ہیں نہیں اسے ہماری آبادی والے حصّے میں کھولنا چاہیئے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے سرکار نے ہیم پور میں شکر کی فیکٹری کھولنے کی منظوری دے دی تھی۔ یہ منظوری بڑی مشکلوں سے حاصل کی گئی تھی اور مرکزی سرکار سے بہت لڑ جھگڑ کے حاصل کی گئی تھی۔ لیکن جب اسے عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو شہر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یو۔ پی والے کہتے تھے چونکہ گنا یو۔ پی کے دیہات سے آتا ہے اس لئے فیکٹری اُن کے علاقے میں کھلنی چاہیئے۔ مرہٹے کہتے تھے چونکہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدور مرہٹے ہوں گے اس لئے یہ فیکٹری اُن کے شہری علاقے میں کھلنی چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ دونوں پارٹیاں الگ الگ جلسے کرنے لگیں۔ جلوس نکالنے لگیں شہر میں زبردست ہڑتال ہو گئی۔ سب دوکانیں بند ہو گئیں۔ سکول، کالج، دفتر سب بند ہو گئے۔ بجلی گھر کے ملازمین نے بھی ہڑتال کر دی۔ اور جب شہر میں بجلی نہ رہی تو جلوس میں بجلی کہاں سے آتی اور مائیکروفون، لاؤڈ سپیکر کہاں سے کام کرتے۔ چنانچہ اچھے اچھے تقریر کرنے والوں کے دم اکھڑنے لگے۔ مگر چونکہ شہر میں ہڑتال تھی اور لوگوں کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اس لئے اُن کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے جلسوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔ اس لئے ایسے لوگوں کی ڈھونڈ پڑی جو مائکروفون کے بغیر ہی تقریر کر سکیں۔ اسی ایک ضرورت نے زمانۂ حال کا وہ مشہور لیڈر پیدا کیا جس کی میں کرسی ہوں!"

کرسی یہاں تک کہہ کر ایک لمحے کے لئے رُکی۔ پھر اس نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"انھیں دنوں کی بات ہے۔ ہمارے شہر ہیم پور کے تیلیوں کے محلّے میں بھیکو نام کا ایک شیر فروش رہتا تھا جس کا کام پہلے تو بہت نہ چلتا تھا۔ لیکن جب سے سرکار نے دُودھ کی بجائے پانی میں چونا، میدہ، کھریا مٹی، سفید لکڑی کا بُرادہ غرضیکہ پانی میں کوئی بھی سفید چیز ڈال کر اُسے دُودھ کے نام سے بیچنے کی اجازت دے دی تھی بھیکو کا کام خوب چل نکلا تھا۔ یُوں بھیکو بہت شریف آدمی تھا۔ اُسے صرف اپنے کام سے غرض تھی اور دوسرے کی بے ایمانی سے اُسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اِس لئے بھیکو کو بہت تکلیف پہنچی۔ جب اُس کا بڑا لڑکا گوبندا آٹھویں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے دُودھ بیچنے سے انکار کر دیا۔ "میں آٹھویں فیل ہو کر دُودھ بیچوں یہ قطعی ناممکن ہے۔" گوبندا نے صاف انکار کر دیا۔ اور جب بھیکو نے غصّے میں آ کر اپنے بیٹے کو پیٹنا چاہا تو گوبندا لاٹھی لے کر کھڑا ہو گیا۔ گوبندا چھ فٹ سے اونچا تھا اُس کے جبڑے بڑے بڑے تھے اور رُخسار اندر کو دبے ہوئے تھے جس سے اُس کے جبڑے اور بھی مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ اُس کی آنکھیں سیاہ چمکیلی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ لیکن اُن آنکھوں کے اُوپر اُس کی بھنویں بڑی بڑی سیاہ اور گھنے بالوں والی تھیں جنہوں نے اُس کی آنکھوں کی چمک میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اُس کا ماتھا اور گھٹا ہوا تھا۔ اور ہونٹ موٹے موٹے اور بڑے بڑے تھے۔ اُس کے مُنہ کا دہانہ بہت بڑا تھا لیکن اُن سب سے بڑی اُس کی آواز تھی۔ وہ جب بولتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اُس کے حلق کے اندر ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ پڑھنے میں اُس کا جی مطلق نہ لگتا تھا۔ وہ سات بار آٹھویں میں فیل ہو چکا تھا۔ اور آٹھویں بار فیل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ بھیکو نے اُسے سکول سے اُٹھا لیا۔ اور اُسکے دودھ بیچنے سے انکار کرنے پر اُسے اپنے دوست جمّن بیڑی فروش کی بیڑیاں بیچنے پر لگا دیا۔ جمّن بیڑی فروش کی اصلی بنارسی تمباکو والی نمبروَن بیڑی جس کا تمباکو پرانی سڑی گلی ڈھاک کے پتوں اور گوار کی شاخوں کو کوٹ کوٹ کر انھیں تمباکو کی بُو دے کر تیار کیا گیا تھا اُن دنوں شہر میں بہت بکتی تھی۔ جمّن بیڑی فروش نے گوبندے کو اپنے ہاں دو روپے روز پر ملازم رکھ لیا۔ اُس کا کام یہ تھا کہ دو چار لونڈے اپنے ساتھ لے کر اور ٹھیلا لے کر وہ شہر کے گلی کوچوں میں چلا جاتا۔ اور کھڑا ہو کر اپنی گرجدار بلند آواز میں میاں جمّن کی اصلی بنارسی تمباکو والی نمبروَن بیڑی کی تعریف کرتا۔ اور لوگوں کو اُسے استعمال کرنے پر آمادہ کرتا۔ گوبندے کو بھی یہ کام بہت پسند آیا۔ ایک تو اُسے اپنی آواز استعمال کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ پھر اُسکے سر پر جو مجمع نے دار ٹوپی ہوتی۔ اور ہاتھ جو گھر ٹیل ہوتا اور پیچھے جو آٹھ دس لونڈوں کا لاؤ لشکر ہوتا وہ سب چیزیں اُسے بے پسند تھیں۔ اور گویا اُس کی مرضی کے عین مطابق تھیں۔ اُدھر بھیکو دُودھ فروش بھی خوش ہوا کہ چلو اُس کا لڑکا ٹھکانے سے کام پر لگ گیا۔

ایک دن جب وہ اتفاق سے چیلا پتی لین کے ناکے پر کھڑا ہوا اپنی گرجتی آواز میں بیڑیاں بیچ رہا تھا۔ اُدھر سے یو۔ پی والوں کا ایک جلوس نکلا جو "شوگر فیکٹری ہماری ہے!" یہ نعرہ لگاتا ہوا بڑا گھوڑا میدان میں جلسہ کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ جلوس کے لوگ نعرے لگا رہے تھے "شوگر فیکٹری ہماری ہے!" اور گوبندا چلّا رہا تھا

...ن ہماری ہے !"

مگر سارے جلوس پر گوبندے کی آواز بھاری تھی۔ لوگ حیرت سے اُس کی طرف ...نے لگے۔ اور آگے بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب جلوس آگے بڑھ گیا گوبندے ...یا دیکھا کہ دو آدمی جو اہر جیکٹ اور دھوتی پہنے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر آپس میں ...پُسر کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں آدمی اُس کے قریب آئے اور ...گئے۔

"یہ کیا بیڑی بیچنے کا کام کرتے ہو کوئی اچھا سا دیش سیوا کا کام کرو۔"

"بیڑی بیچنے میں مجھے دو روپے روز ملتے ہیں۔ دیش سیوا کے کام میں مجھے ...ے گا ؟" گوبندے نے فوراً پوچھا۔

"وہاں تمھیں پانچ روپے روز ملیں گے !"

"مجھے منظور ہے !"

اُن دونوں آدمیوں نے گوبندے سے ہاتھ ملایا۔ اُس کی پیٹھ تھپکی۔

پھر گوبندے نے پوچھا۔

"مگر یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کام کیا ہوگا ؟"

ایک آدمی نے جس کی جواہر جیکٹ دوسرے سے زیادہ خوشنما تھی، اپنی جیب کو ...ہلاتے ہوئے کہا۔ "آج رات کو تمھیں بڑا گھوڑا میدان میں ایک تقریر کرنا ہوگی۔"

"بیڑی ممبروں کی حمایت میں ؟" گوبندے نے پوچھا۔

"نہیں ! شوگر فیکٹری یونین والوں کی ہے !" اس بات کی حمایت میں۔"

"مگر مجھے تقریر کرنا نہیں آتی۔"

"وہ تم رہنے دو۔ وہاں تمھیں کیا بولنا ہے۔ وہ سب ہم بتا دیں گے ہمیں ...قط تمھاری آواز چاہیئے۔"

اور یہ بات تھی بھی سچ ——— بجلی نہ ہونے سے مائکروفون نہ چلتے تھے ...ر مجمع آہستہ بولنے والے مقرّروں کی تقریروں سے بور ہو جاتا تھا۔ اِس لحاظ سے گوبندے ...ی گرجتی گونجتی پاٹ دار آواز بہت کامیاب رہی۔ اور پھر گوبندے کو خود اپنی آواز ...بہت پسند تھی۔ وہ اُسے سُنتے رہنا چاہتا تھا۔ اِسلئے جو کچھ اُن دونوں آدمیوں نے ...اُسے پڑھایا تھا وہ اُس سے کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ دو ایک لطیفے اُس نے اپنے پاس ...سے جڑ دیئے۔ جو بہت کامیاب رہے۔ غرضکہ اُس دن کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔

خوشنما جواہر جیکٹ والے آدمی نے جس کا نام اُسے بعد میں معلوم ہوا کہ کالی چرن ورما ہے اور وہ شہر کا میونسپل کمشنر ہے، اُس کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور اُس سے کہا۔ "آج سے تو لیڈر ہو گیا ہے گوبندے۔"

گوبندا خوش ہو کر بولا۔ "سرکار ! سُنتا ہوں ہر لیڈر کے پاس ایک کُرسی ہوتی ہے۔ میرے گھر میں تو ایک کرسی بھی نہیں ہے۔"

تب کالی چرن ورما نے اُسی دن مجھے گپتا فرنیچر مارٹ سے خریدا اور میں اُسی روز گوبندے کے گھر پہنچا دی گئی۔ گوبندا مجھ پر پہلی بار بیٹھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اپنے باپ اور ماں اور بھائی تینوں کے سامنے بیٹھ کر لات پر لات رکھ کر شیخی بگھارنے لگا۔ "پانچ ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ اُنھوں نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے۔ جے کارے لگائے۔ میں اب لیڈر ہو گیا ہوں باپو۔ لیڈر !"

اُس کا باپ بھیکو ابھی ابھی بھینس کا دُودھ دُوھ کر آیا تھا۔ پریشانی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے دُودھ کا مٹکا پانی کے نل کے نیچے رکھ دیا۔ اور بولا۔

"بیٹا لیڈری میں کیا رکھا ہے۔ دو دن کی چاندنی ہے۔ پھر لیڈری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اور دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا لیکن ہمارا خاندانی دھندا سب سے اچھا ہے۔ جس میں دُودھ اور پانی اگر ایک دفعہ مل جائیں تو پھر الگ نہیں ہوتے ——— !"

بھیکو دیر تک دُودھ کے مٹکے میں گرتی ہوئی پانی کی دھار کو دیکھتا رہا اور جب مٹکا بھر گیا تو اُس نے پہلا مٹکا اُٹھا کر اُس کی جگہ دوسرا دُودھ کا مٹکا رکھ دیا۔

گوبندے نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔

"باپو ! جو کام تم کرتے ہو اُس میں عزّت نہیں ہے۔ میں ایسا کام نہ کروں گا۔ میں تو بس عزّت والا کام کروں گا۔ اور لیڈری سے بڑھ کر عزّت کسی بات میں ہے ؟"

بھیکو چُپ ہو گیا۔ بیٹے نے بات ٹھیک کہی تھی۔ گوبندے کی پاٹ دار آواز نے یو۔ پی والوں کے مخالفوں کے چھکّے چھُڑا دیئے۔ اُن کے جلوس میں لوگوں کی تعداد ہر روز بڑھتی گئی۔ آخر ایک روز "شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے" کی تحریک کا صدر بابو ہمّت راؤ پینڈھارکر رات کے دس بجے گوبندے کے گھر پہنچا۔ جب

گوبندا میز پر آلتی پالتی مار کے بیٹھا گھر والوں پر رعب جما رہا تھا۔

ہمت راؤ پینڈھارکر نے پوچھا۔

"یہ یُو پی والے تمھیں کیا دیتے ہیں ؟"

"پانچ روپے ایک بھاشن کے دیتے ہیں"

"ہم دس روپے دیں گے۔ ہمارے لئے کام کرو گے ؟"

"کروں گا کیوں نہیں ؟" گوبندا خوش ہو کے بولا۔ "یُو۔پی والے پانچ روپے دیتے تھے۔ اُس سے پہلے اصلی بنارسی تمباکو والی بیڑی نمبر ون والے صرف دو روپے دیتے تھے آپ دس روپے دیتے ہیں۔ تو میرا کیا سر پھرا ہے جو آپ کا کام نہ کروں گا"

اُس دن سے گوبندے نے "شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے"۔ والوں کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ وہی بھاشن، وہی آواز، وہی گوبندا فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جہاں یو۔پی والوں کا ذکر آتا تھا وہاں اب مراٹھوں کی حمایت میں بات ہونے لگی۔ بابو ہمت راؤ پینڈھارکر نے گوبندے کی بڑی ہمت بندھائی۔ بھرے جلسے میں اُس کا تعارف شری مان گوبندرام کہہ کر کرایا۔ اور اُسے ایک انصاف پسند یُو۔پی والے کے خطاب سے نوازا۔ گوبندے نہیں۔ گوبندرام کے کہنے پر پینڈھارکر نے اُس کے لئے ایک میز بھی خرید کر دے دی۔ جو میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میری پُشت پر اعلیٰ نرم چمڑے کا ایک غلاف چڑھایا گیا۔ جو آج تک آپ مجھ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اب گوبندا اکثر مجھ پر بیٹھ کر اور اپنی ٹانگیں میز پر پسار کر گھر والوں سے اپنی کامیابی کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور محلے والوں پر رعب گانٹھنے لگا تھا۔ محلے والے بھی اب اُس سے ذرا دبنے لگے تھے۔ اور اُس کی عزت کرنے لگے تھے۔

گوبندرام کی لیڈری چمکنے لگی۔ پہلے یو۔پی والوں پھر مراٹھوں کے لئے کام کرنے سے اُس کا سارے شہر میں شہرہ ہو گیا تھا۔ دو ایک بار تو اُس نے یہاں تک کر لیا کہ شام کو یُو۔پی والوں کے لئے تقریر ہوئی۔ اور رات کو مراٹھوں کے جلسے میں جا کے بول آیا۔ اور دونوں طرف سے پیسے وصول کر لئے۔ اور جب لوگوں نے پوچھا، یہ تم نے کیا کیا تو اُس نے جواب دیا۔ بھائی شوگر فیکٹری مراٹھوں کے علاقے میں جائے یا یُو۔پی والوں کی آبادی کے حصّے میں کھلے، رہے گی تو وہ بیم پور میں!

پینڈھارکر نے اُسے زیادہ نہیں ڈانٹا کیونکہ گو اب بجلی کی ہڑتال کھل گئی تھی۔ اور شہر میں بجلی آگئی تھی۔ پھر بھی جلسے کے لئے [illegible] کرائے پر لینے میں پچاس ساٹھ روپے نکل جاتے تھے [illegible] خرچ کرنے پر ایک عمدہ انسانی لاؤڈ سپیکر ہاتھ آگیا تھا۔

مگر پندرہ بیس دن کے بعد ہی گوبندے کی [illegible] ہوا یہ کہ سرکار نے یو۔پی والوں اور مراٹھوں کی [illegible] یہ فیصلہ کیا کہ بیم پور میں ایک سرے سے شوگر فیکٹری [illegible] نے اس کام کے لئے مدراس شہر کو چن لیا۔ [illegible] کھلنے سے رہ گیا۔ ہاں اس واقعے کے بعد [illegible] ہی تھا اُن کو۔

اس واقعے کے کئی ماہ بعد تک گوبندا بیکار رہا۔ بیڑی نمبر [illegible] سکتا تھا۔ حالانکہ جمن بیڑی فروش نے اب اُس کی بڑھتی ہوئی شہرت [illegible] اُسے تین روپے روز پر ملازم ہو جانے کی دعوت دی تھی۔ [illegible] ٹھکرا دیا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ [illegible] بولا۔ [illegible] سمجھوں گا، کیا تم بات کرتے ہو؟ بابو! میں اب بیڑی نہیں [illegible] مجھ سے تم کوئی شوگر فیکٹری بند کرا لو۔ کوئی قوم کھلوا لو، کوئی ملک [illegible] اب مجھ سے یہ بیڑی نہیں بیچی جائے گی۔"

اُس کا باپ چپ ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا [illegible] کارہے۔ آخر سوچ سوچ کر اُس نے گوبندے کا بیاہ [illegible] رچا دیا۔ اُس کی بہو گو بہت سُندر تو نہ تھی۔ اور پڑھی لکھی [illegible] کا دُودھ دوہنے میں لاثانی تھی۔ اس لئے [illegible] پھر اُس نے یہ بھی سوچا کہ لڑکا بیکار ہے۔ کام نہیں کرتا۔ مگر جب [illegible] گی اور گرہستی بڑھے گی تو خود ہی کوئی نہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہو جائے [illegible]

دن گزر گئے۔

مہینے گزر گئے۔

تین سال گزر گئے۔

لیکن گوبندے کو کوئی کام [illegible]

جھگڑا ہوا۔ اس اثنا میں میرا [illegible]

...سے موٹا، پہلے سے بدمعاش، پہلے سے چالاک ہو گیا تھا۔ دُوپائی گود میں کھیلتے تھے۔ وہ تو کہو بھیکو کے گھر میں دودھ کی برکت تھی۔ بلکہ پانی کی برکت [illegible] رہا۔ اور گوبندا کھا کھا کر موٹا ہوتا رہا۔ اور گلی محلے پر اپنی لیڈری کا خان [illegible] جمانے کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ اب تک بیکاری سے مر گیا ہوتا۔

تین سال بعد گوبندے کے دن پھرے۔ ہوا یہ کہ سر پر میونسپل الیکشن آ گیا [illegible] دھڑے بندیاں اور پارٹیاں جلسے اور جلوس، نعرے اور تماشے، باجے گاجے [illegible] پھیرے ہونے لگیں۔ اب کے گوبندے نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس [نے] جلسے، بازیوں اور پارٹیوں کا غور سے مطالعہ کیا۔ اور مطالعہ کرنے کے بعد نتیجے پر پہنچا کہ شہر میں "سجک" پارٹی کے جیتنے کا سب سے زیادہ امکان ہے [illegible] پارٹی کا نام پارٹی کے عقیدے سے لیا گیا تھا۔ جو یہ تھا "سب سے [illegible]" اس قول کے ہر لفظ کا پہلا حرف لے کر پارٹی کا نام "سجک" رکھ [illegible] تھا۔ گوبندے کو یہ پارٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ اس کے مزاج کے عین مطابق [illegible] پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے گوبندا اس کے جلسے میں ایک تقریر سننے گیا [illegible] جوش سے منہ لال کئے چلا رہا تھا۔

"[illegible] ہم ہندوستانیوں کو حق شہریت نہیں دیتے۔ کیا کرنا چاہئے؟"

"جنگ کردو!" مجمع زور سے چلا پڑتا۔

"جنوبی افریقہ والے ہم کو کالا سمجھ کر بےعزت کرتے ہیں۔ بولو کیا کرنا چاہئے؟"

"جنگ کردو!" مجمع اور بھی تیزی سے چلاتا۔

انہیں دنوں پاکستان کے ایک وزیر اعظم نے ایک تقریر میں ہندوستان [illegible] لہرایا تھا۔ [illegible] پھر کیا تھا، گوبندے کے ہاتھ میں معاملہ آ گیا۔ اس نے [illegible] دن سجک پارٹی کے بھرے جلسے میں ایک پستول داغ دیا۔ اور ایک جوشیلی تقریر کے دوران میں کہا۔

"جو ہمیں مُکا دکھائے گا ہم اس پستول سے اس کا سینہ چھلنی کر دیں"

مجمع جوش میں آ گیا۔ ساری فضا گوبند رام زندہ باد کے نعروں سے [illegible]۔ لوگ بے حد جوش میں آ کر طرح طرح کے نعرے لگانے لگے۔ گوبند رام کی ہیبت بے حد بڑھ گئی۔ جس کے پیش نظر سجک پارٹی کے بڑے لیڈروں کو گوبند رام کا نام میونسپل کمشنروں کے امیدواروں کی لسٹ میں لکھنا پڑا۔

گوبند رام اپنے حلقے سے میونسپل کمشنری کا امیدوار تو ہو گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہوا یہ کہ اس کی اس تقریر کے چند روز بعد پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اس پر الزام یہ تھا کہ (۱) اس نے بھرے جلسے میں پستول چلایا۔ (۲) اور پستول کا لائسنس اس کے پاس نہ تھا۔ (۳) اس نے اپنی اشتعال انگیز تقریر کی جس سے [illegible] اور [illegible] کے درمیان منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

گوبند رام کو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ادھر اس کی [illegible] پارٹی بھی میونسپل الیکشن ہار گئی۔ جیت دوسری پارٹی کی ہوئی [illegible] کا مقولہ تھا "[illegible]" یعنی "[illegible]" پارٹی۔

اس [illegible] سال [illegible] اس کی صحت بگڑ گئی۔ مجھ پر وقت بے وقت [illegible] لگے۔ پاؤں کے گھٹنے [illegible] لگے۔ کبھی کوئی چھوٹا بچہ مجھ پر بیٹھ کر [illegible] کبھی [illegible] نہیں [illegible] سیڑھی [illegible] کا کام [illegible] ایک دفعہ بچوں نے مجھے الٹا کر دیا۔ اور [illegible] طرح میں گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی اور میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی [illegible] خبر گیری کرنے والا تھا گوبند اتو جیل میں تھا [illegible] کسی کھڑکی کا [illegible] کو ملا کر مجھے کھڑے ٹھاک بیٹھنے کے قابل کر دیا [illegible] اور یہ غضب کا بادامی پالش بھی [illegible]۔

[illegible] وہ کسی [illegible] طرح روتے [illegible] گزر گئے [illegible] چھوٹا [illegible] پور کے مشہور غنڈوں سے شناسائی [illegible] اب [illegible] وہ جیل سے آیا تو شہر کے [illegible] واقف ہو [illegible] اور سوشل ان غنڈوں [illegible] بعد سجک [illegible] سب سے جنگ کرو پارٹی کے ممبروں نے اس کے گلے میں [illegible] پہنائے —— اس کی قومی خدمات [illegible] کی تعریف کی۔ گوبند رام نے مختصر [illegible] ادا کیا۔ اور [illegible] طبیعت کا بہانہ کر کے گھر [illegible]۔

میونسپل الیکشن اب پھر [illegible] آ رہا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کو جو لوڈ رکھتے

گوبندا مجھ پر آلتی پالتی ملئے بیٹھا گھر والوں پر رعب جما رہا تھا۔

ہمت راؤ پینڈھارکر نے پوچھا۔

"یہ یُو-پی والے تمھیں کیا دیتے ہیں؟"

"پانچ روپے ایک بھاشن کے دیتے ہیں۔"

"ہم دس روپے دیں گے۔ ہمارے لئے کام کروگے؟"

"کر دں گا کیوں نہیں؟" گوبندا خوش ہو کے بولا۔ "یُو-پی والے پانچ روپے دیتے تھے۔ اس سے پہلے اصلی بنارسی تمباکو والی بیڑی نمبر ون والے صرف دو روپے دیتے تھے آپ دس روپے دیتے ہیں۔ تو میرا کیا سر پھرا ہے جو آپ کا کام نہ کروں گا۔"

اس دن سے گوبندے نے "شوگر فیکٹری مراٹھوں کی ہے"۔ والوں کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ وہی بھاشن، وہی آواز، وہی گوبندا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جہاں یو-پی والوں کا ذکر آتا تھا وہاں اب مراٹھوں کی حمایت میں بات ہونے لگی۔ بابو ہمت راؤ پینڈھارکر نے گوبندے کی بڑی ہمت بندھائی۔ بھرے جلسے میں اُس کا تعارف شریمان گوبندرام کہہ کر کرایا۔ اور اُسے ایک انصاف پسند یُو-پی والے کے خطاب سے نوازا۔ گوبندے نہیں، گوبندرام کے کہنے پر پینڈھارکر نے اُس کے لئے ایک میز بھی خرید کر دے دی۔ جو میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میری پُشت پر اعلیٰ نرم چمڑے کا ایک غلاف چڑھایا گیا۔ جو آج تک آپ مجھ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اب گوبندا اکثر مجھ پر بیٹھ کر، اور اپنی ٹانگیں میز پر پسار کر گھر والوں سے اپنی کامیابی کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور محلّے والوں پر رعب گانٹھنے لگا تھا۔ محلّے والے بھی اب اُس سے ذرا دبنے لگے تھے۔ اور اُس کی عزت کرنے لگے تھے۔

گوبندرام کی لیڈری چمکنے لگی۔ پہلے یو-پی والوں پھر مراٹھوں کے لئے کام کرنے سے اُس کا سارے شہر میں شہرہ ہو گیا تھا۔ دو ایک بار تو اُس نے یہاں تک کر لیا کہ شام کو یُو-پی والوں کے لئے تقریر ہوئی۔ اور رات کو مراٹھوں کے جلسے میں جا کے بول آیا۔ اور دونوں طرف سے پیسے وصول کر لئے۔ اور جب لوگوں نے پوچھا، یہ تم نے کیا کیا تو اُس نے جواب دیا۔ بھائی شوگر فیکٹری مراٹھوں کے علاقے میں جائے یا یُو-پی والوں کی آبادی کے حصے میں کھُلے رہیگی تو وہ ہیم پور میں!

پینڈھارکر نے اُسے زیادہ نہیں ڈانٹا کیونکہ اب بجلی کی ہڑتال کھُل گئی تھی۔ اور شہر میں بجلی آ گئی تھی۔ پھر بھی جلسے کے لئے مائکروفون اور لاؤڈ سپیکر کرائے پر لینے میں پچاس ساٹھ روپے نکل جاتے تھے۔ اور یہاں صرف دس روپے خرچ کرنے پر ایک عمدہ انسانی لاؤڈ سپیکر ہاتھ آ گیا تھا۔

مگر پندرہ بیس دن کے بعد ہی گوبندے کی لیڈری چمک کر بجھ گئی۔ ہوا یہ کہ سرکار نے یو-پی والوں اور مراٹھوں کی روز روز کی چپقلش سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہیم پور میں ایک سرے سے شوگر فیکٹری کھلنی ہی نہ پائے۔ اُنھوں نے اس کام کے لئے مدراس شہر کو چُن لیا۔ اور اس طرح ایک کارخانہ ہیم پور میں کھُلنے سے رہ گیا۔ ہاں اِس واقعے کے بعد دو پاگل خانے اور شہر میں کھُل گئے۔ [illegible] ہی تھا اُن کو۔

اِس واقعے کے کئی ماہ بعد تک گوبندا بیکار رہا۔ بیڑی نمبر ون اب [illegible] سکتا تھا۔ حالانکہ چمن بیڑی فروش نے اب اُس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے پیشِ نظر اُسے تین روپے روز پر ملازم ہو جانے کی دعوت دے دی تھی۔ جسے گوبندرام نے یہ [illegible] ٹھکرا دیا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانا۔ بولا۔ "اب میں بیچوں گا؟ کیا تم بات کرتے ہو! بابو! میں اب بیڑیں نہیں، کوئی بڑی چیز ہی بیچوں گا۔ مجھ سے تم کوئی شوگر فیکٹری بند کروالو۔ کوئی قوم بکوالو، کوئی ملک نیلام کروالو۔ اب مجھ سے یہ بیڑی نہ بیچی جائے گی۔"

اُس کا باپ چپ ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ اُس کا لڑکا بیکار ہے۔ آخر سوچ سوچ کر اُس نے گوبندے کا بیاہ اپنی جات برادری میں کر دیا، اُس کی بہو گو بہت سُندر تو نہ تھی۔ اور پڑھی لکھی بالکل نہ تھی۔ مگر بھینس کا دودھ دوہنے میں لاثانی تھی۔ اِس لئے بھیکو نے کنیا کا ناطہ منظور کر لیا۔ پھر اُس نے یہ بھی سوچا کہ لڑکا بیکار ہے۔ کام نہیں کرتا۔ مگر جب گھر میں بہو آئے گی اور گرہستی بڑھے گی تو خود ہی کوئی نہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

دن گزر گئے۔

مہینے گزر گئے۔

تین سال گزر گئے۔

لیکن گوبندے کو کوئی کام نہ ملا۔ ہیم پور میں نہ کوئی کارخانہ کھلا نہ جھگڑا ہوا۔ اِس اثنا میں میرا چمڑا گھِس گیا تھا۔ میری سیٹ پھٹ چکی تھی

تھا کہ اکالی کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتے ہیں جو ملک کے لئے نقصان دہ ہو۔ جب تک ماسٹر تارا سنگھ جی کے دم میں دم ہے اکالیوں کی سرگرمیاں یہی رہیں گی۔

"سرکار انگریزی مظالم کی روک تھام کے لئے خاص کارروائی کرے گی" ——— وہ تو کریگی لیکن کب؟ ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیر ترقیات پنجاب فرماتے ہیں کہ "اکالی بزدل گرفتاری سے بچنے کے لئے گوردواروں میں چھپتے پھرتے ہیں"

اور کہیں ٹھکانا نہ ملے۔ کوئی معقول سکھ انھیں پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہو تو بے چارے گورو گھر میں بھی پناہ نہ لیں؟ آپ اسے بزدلی کہتے ہیں لیکن ماسٹر جی اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ راج نیتی ہے۔

برما کے پردھان منتری اُو۔ نُو نے فرمایا کہ "برما کسی صورت میں بھی غیر سے قرضہ نہیں لے گا" ——— کیا امریکہ سے بھی نہیں لوگے؟ نہیں بھائی اس سے ضرور لے لو۔ ورنہ مسٹر ڈلز کی سامراجی سکیم دھری کی دھری رہ جائے گی۔

"شاہجہان پور میں صراف لٹ گیا" ——— یہ تو بڑی عجیب بات ہے ہندوستان میں تو عام طور پر غریب لوگ ہی لٹتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لٹیروں اور ہماری حکومت کی پالیسی اور طریق کار میں بہت اختلاف ہے۔

"پرتگیزی پولیس کا بیان ہے کہ گوا کے گورنر جنرل کے محل میں "ٹائم بم" پکڑا گیا" ——— نہتے ستیاگرہیوں پر وحشیانہ حملے کر کے تم لوگوں نے دنیا بھر کی لعنت طوق گلو کر لی ہے۔ اب دنیا بھر کی رائے عامہ کو اپنے خلاف پا کر فدایان وطن کو بدنام کرنے کے لئے یہ سٹنٹ کھڑے کر رہے ہو۔ مگر یہ بہت پرانی اور فرسودہ چالیں ہیں۔ آپ ہی اگلی سچی کوشش تھی کہ جیسے کسی نے گورنر جنرل کی گردن سے ہاتھی باندھ دیا۔ وہ سالازار کی جیب میں ممبوئی شیر ڈال دی۔

حکومت ہند نے دوسرے پنج سالہ پلان کے ماتحت ساٹھ فیصدی بچوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے گا ——— اور اس طرح تعلیم یافتہ بے کاروں کی تعداد میں ہولناک اضافہ ہو جائے گا۔ کاش کوئی ان پلان بازوں کو سمجھا سکے کہ یک طرفہ منصوبہ بندی ایک سٹنٹ کی صورت میں آپ کے کام آسکے تو آسکے مگر قوم کو تباہ کر ڈالے گی۔

پرتگیزیوں نے دھمکی دی ہے کہ "اگر ہمیں گوا چھوڑنا پڑا تو جاتے جاتے اسے جلا کر خاک کر دیں گے" ——— جی ہاں آپ سے اس بربریت کی ہمیں بھی توقع ہے۔ کیونکہ آپ کوشش ضرور کریں گے لیکن اگر دوسری طرف سے پولیس ایکشن ہو گیا تو ذہن اور گوا دونوں کے دونوں جوں کے توں موجود رہیں گے۔ اور آپ ختم ہو جائیں گے۔ اور آپ کے ساتھ ہی وہ سالازار بھی۔

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں۔ اور ایڈیٹر کی اطلاع کیلئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ ان کے مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔

موٹا، پہلے سے بدمعاش، پہلے سے چالاک ہوگیا تھا۔ دیاکی گود میں
تے تھے۔ وہ تو کہو بھیکو کے گھر میں دودھ کی برکت تھی۔ بلکہ پانی کی برکت
رہا۔ اور گوبند اکھا اکھا کر موٹا ہوتا رہا۔ اور گلی محلے پر اپنی لیڈری کا خالی
کی کوشش کرتا رہا۔ ورنہ اب تک بیکاری سے مر گیا ہوتا۔

سال بعد گوبند سے کے دن پھرے۔ ہوا یہ کہ سر پر میونسپل الیکشن آگیا
بازیاں، اور پارٹیاں جلسے اور جلوس، نعرے اور تماشے۔ باجے گاجے
رستے ہونے لگیں۔ اب کے گوبندے نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اُس
بازیوں اور پارٹیوں کا غور سے مطالعہ کیا۔ اور مطالعہ کرنے کے بعد
پہنچا کہ شہر میں "سسجک" پارٹی کے جیتنے کا سب سے زیادہ امکان ہے
کا نام پلدلی کے عقیدے سے لیا گیا تھا۔ جو یہ تھا "سب سے
مقولے کے ہر لفظ کا پہلا حرف لے کر پارٹی کا نام "سسجک" رکھ
ے کو یہ پارٹی بہت پسند آئی تھی۔ یہ اُس کے مزاج کے عین مطابق
شامل ہونے سے پہلے گوبند اُس کے جلسے میں ایک تقریر سننے گیا۔
حصے سے منہ لال کئے چلا رہا تھا۔
نکا والے ہم ہندوستانیوں کو حقِ شہریت نہیں دیتے۔ کیا کرنا چاہیئے؟"
نگ کر دو!" مجمع زور سے چلا پڑتا۔
نوبی افریقہ والے ہم کو کالا سمجھ کر بے عزت کرتے ہیں۔ بولو کیا کرنا چاہیئے؟
نگ کر دو!" مجمع اور بھی تیزی سے چلاتا۔
میں دنوں پاکستان کے ایک وزیرِ اعظم نے ایک تقریر میں ہندوستانیوں
تھا۔ بس پھر کیا تھا، گوبندے کے ہاتھ میں معاملہ آگیا۔ اُس نے
ن سسجک پارٹی کے بھرے جلسے میں ایک پستول داغ دیا۔ اور ایک
تقریر کے دوران میں کہا:
بھی مُکا دکھائے گا ہم اِس پستول سے اُس کا سینہ چھلنی کر دیں

مع جوش میں آگیا۔ ساری فضا "گوبند رام زندہ باد" کے نعروں سے
لوگ بے حد جوش میں آ کر طرح طرح کے نعرے لگانے لگے۔ گوبند رام
بے حد بڑھ گئی۔ جس کے پیشِ نظر سسجک پارٹی کے بڑے لیڈروں کو

گوبند رام کا نام میونسپل کمشنروں کے اُمیدواروں کی لسٹ میں لکھنا پڑا۔

گوبند رام اپنے حلقے سے میونسپل کمشنری کا اُمیدوار تو ہوگیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہوا یہ کہ اُس کی اِس تقریر کے چند روز بعد پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا اُس پر الزام یہ تھا کہ (۱) اُس نے بھرے جلسے میں پستول چلایا۔ (۲) اور پستول کا لائسنس اُس کے پاس نہ تھا۔ (۳) اُس نے ایسی اشتعال انگیز تقریر کی جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

گوبند رام کو ڈھائی سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اُدھر اُس کی سسجک پارٹی بھی میونسپل الیکشن ہار گئی۔ جیت دوسری پارٹی کی ہوئی۔ جس کا مقولہ تھا "سب سے صلح کرو" یعنی "سسصک" پارٹی۔

اِس ڈھائی سال میں میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا۔ مجھ پر وقت بے وقت دودھ کے مٹکے، پانی کے گھڑے رکھے جانے لگے۔ کبھی کوئی چھوٹا بچہ مجھ پر بیٹھ کر پیشاب کر دیتا۔ کبھی بڈھا بھیکو اپنی میلی دھوتی سے رانیں کھجا کھجا کر میرے ڈنڈے سے ٹیلے کا کام لے کر آ بیٹھا کرتا۔ ایک دفعہ بچوں نے مجھے اُلٹا کر دیا۔ اور اِدھر اُدھر گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ اِس طرح میں گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہاں کون میری خبرگیری کرنے والا تھا۔ گوبندا تو جیل میں تھا خود ہی بھیکو نے محلے کے کسی تھرڈ کلاس بڑھئی کو بُلا کر مجھے ٹھوک ٹھاک کر بیٹھنے کے قابل کر دیا۔ یہ چوتھی ٹانگ اُس بڑھئی کی عطا کردہ ہے۔ اور یہ غضب کا بادامی پالش بھی اُسی کا ہے۔

خیر صاحب! ڈھائی سال بھی وہ کسی نہ کسی طرح روتے دھوتے گزر گئے اور گوبندا جیل سے چھوٹا۔ جیل میں اُس کی بھیم پور کے مشہور غنڈوں سے شناسائی ہوئی۔ اور اب وہ گوبندا وہ گوبندا نہ رہا تھا۔ اب کے جو وہ جیل سے آیا تو شہر کے بڑے بڑے غنڈوں پر دھونس سے بخوبی واقف ہو کے آیا۔ اور اپنا اثر اور رسوخ اُن غنڈوں سے بڑا کر کے لوٹا۔ جیل سے باہر نکلنے کے بعد سسجک پارٹی یعنی سب سے جنگ کرو۔ پارٹی کے ممبروں نے اُس کے گلے میں ہار پہنائے ——— اُس کی قومی خدمات کو سراہا۔ اُس کی قومی قربانیوں کی تعریف کی۔ گوبند رام نے مختصر سا شکریہ ادا کیا۔ اور ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے گھر بیٹھ رہا۔

میونسپل الیکشن اب پھر سر پر آ رہا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کو جوڑ توڑ رکھتے

تھے معلوم ہو چکا تھا کہ گوبندرام شہر کے کن لوگوں سے متعلق ہو چکا ہے۔ اور کنگرڈن روٹ وہ اُن کو دلوا سکتا ہے۔ گوبندرام نے اُن لوگوں کا اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے لئے آگے ایک ٹھیک بولنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ایک ٹیلی فون لگوا لیا۔ بیٹھک کو نئے ساز و سامان سے، نئے فرنیچر سے سجایا۔ مگر مجھے نہ بدلا۔ کمرے کی ہر چیز بدل گئی مگر میں، اُس کی کرسی وہی کی وہی رہی۔ گوبندرام اکثر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا یہ میری لیڈری کی پہلی نشانی ہے۔ میرے بُرے دِنوں کی ساتھی ہے۔ میں اِسے کبھی نہ بدلوں گا۔

لوگوں میں، سرکاری حلقوں میں، کاروباری حلقوں میں اُس کا اثر رسوخ خود بخود بڑھتا گیا۔ وہ لوگوں کے طرح طرح کے کام کرنے لگا۔ اور طرح طرح کے کام اُن سے لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کی وہ جوشیلی ڈھب کی شہرت ختم ہوتی گئی۔ اور اب وہ شہر کا ایک معزز سنجیدہ متین شہری سمجھا جانے لگا۔

اب کے میونسپل الیکشن میں اُس نے سمسک پارٹی کا ساتھ دیا اور اُن کے ٹکٹ پر اُمیدوار کھڑا ہوا۔ سمسک پارٹی کا مقولہ تھا، سب سے صلح کرو۔ چنانچہ اِس بار گوبندرام سب کے ساتھ چین، جاپان، لنکا، پاکستان، افریقہ، امریکہ، توران، افغانستان، آذربائیجان، سب کے ساتھ صلح کرو کا حامی بن گیا۔ اُن دنوں اُس کا چہرہ ایسا بھیگا بھیگا سا چکنا چپڑا ایک ایسی صلح کُل مسکراہٹ میں لتھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کوئی چہرہ نہ ہو کسی بناسپتی گھی کے ڈبے کا اشتہار ہو۔

تھوڑے دنوں میں میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکل آیا۔ اب کے نہ سمجک پارٹی کامیاب ہوئی۔ جس کا مقولہ تھا سب سے جنگ کرو، نہ سمسک پارٹی جس کا مقولہ تھا سب سے صلح کرو۔ بلکہ کھسک کجک پارٹی کامیاب ہو گئی جس کا مقولہ تھا "کبھی صلح کرو، کبھی جنگ کرو۔" گوبندرام پھر ممبر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مگر اب کے اُسے اِس کا زیادہ افسوس نہ ہوا۔ وہ ٹھیک رستے پر جا رہا تھا۔ لیڈری کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ ورنہ لیڈری کچھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ مختلف لوگوں سے مختلف رابطے قائم کرنے چاہئیں۔ اور جو، جو مانگے اُسے وہی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ صرف وہی پارٹی کامیاب ہو سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ووٹ دیتے وقت خوش کر سکے۔ اصول بہت عمدہ اور خوشنما ہونے چاہئیں۔ لیکن اُن کے اندر کوئی نہ کوئی پیچ ایسا ہونا چاہیئے جسے اپنی ضرورت کے مطابق گھما کر فوراً بدل دیا جا سکے۔

بہت سوچ سوچ کے گوبندرام نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد ڈالی جس کا مقولہ تھا "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟"

شہر کے بہت سے ذی ثروت اصحاب کو اپنی سکیم بتا کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور میونسپل الیکشن سے بہت پہلے اِس پارٹی کی بنیادوں کو مضبوط کر لیا۔ گوبندرام نے اُس کا منشور پیش کرتے وقت لوگوں کے سامنے جو تقریر کی وہ اُس پارٹی کی مکمل طور پر رہنمائی کرتی تھی۔

گوبندرام نے کہا۔

"اِس الیکشن میں ہماری پارٹی صرف اِس بات کو مدِ نظر رکھے گی کہ تمھارا کس میں فائدہ ہے، تم جو ووٹر ہو، تم جو شہر کے رہنے والے ہو، تم جو شہر کے اصلی مالک ہو۔ تمھارا کس میں فائدہ ہے؟ انکم ٹیکس بڑھانے میں یا گھٹانے میں؟ شہری سڑکیں چوڑی کرنے میں یا تنگ کرنے میں؟ بجلی کا ریٹ کم کرنے میں یا زیادہ کرنے میں؟ ملازموں کی تنخواہیں بڑھانے میں یا کم کرنے میں؟ ہماری پارٹی صرف وہی کام کرے گی جس میں تمھارا فائدہ ہو گا۔"

بات معقول تھی۔ لوگوں کو جچ گئی۔ میونسپل الیکشن کے دوران ہی میں صاف نظر آنے لگا کہ جیت اُس پارٹی کی ہو گی جس کا مقولہ تھا "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟" اِسی پروگرام کے تحت گوبندرام نے دھوبیوں کا ریٹ بڑھانے اور صابن کا نرخ کم کرنے کے لئے ہاں کر دی۔ نلکوں میں پانی کی مقدار بڑھانے اور پانی کا چارج کم کرنے کی سفارش کر دی۔ اُنھوں نے براہمنوں سے کہہ دیا کہ وہ بوچڑ خانہ بند کر دیں گے۔ اور چماروں سے کہہ دیا کہ اُنھیں چمڑا سستا اور زیادہ مقدار میں مہیا کیا جائے گا۔ کرایہ والوں سے کہہ دیا کہ اُن کے کرائے کم کر دیئے جائیں گے۔ اور مکان کے مالکوں سے کہہ دیا کہ مرمت کے بہانے وہ اپنے کرائے بڑھا سکیں گے۔

تھوڑے دنوں میں جب میونسپل الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ ووٹ "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟" والی پارٹی کو پڑے اور اُس کے ممبر بھی سب سے زیادہ تعداد میں چُنے گئے۔ اتفاقِ رائے سے گوبندرام کو میونسپل کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔

میونسپل کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں جب یہ سوال اُٹھا کہ "تمھارا کس میں فائدہ ہے؟"

والے پروگرام پر کس طرح عمل کیا جائے؟ تو بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کہ کیسے اِس پروگرام پر عمل کیا جائے جس کی ہر شق دوسری شق کے خلاف جاتی تھی۔

آخر گوبند رام نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ منشور ہی غلط ہے۔ تمھارا کس میں فائدہ ہے؟ اِسے بدل دینا چاہیئے۔ اور اس کے بجائے اس پر عمل کرنا چاہیئے کہ "اپنا کس میں فائدہ ہے؟" چاروں طرف سے واہ واکا دونگڑا برس گیا۔ صدر کمیٹی نے کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ واہ وا! گوبند رام!"

جب سے گوبند رام کی پارٹی شہر ہیم پور کے میونسپل کمیٹی پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ گوبند رام اب آچاریہ گوبند رام کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا محلہ چھوڑ کر سول لائنز میں سکونت اختیار کی ہے۔ انھوں نے دوسری شادی کی ہے۔ جو نئے فرنیچر کی طرح اپٹوڈیٹ اور خوبصورت ہے۔ مجھے پرانے گھر میں چھوڑتے وقت آچاریہ گوبند رام کو بہت دکھ ہوا۔ مگر اُن کی نئی فیشن ایبل بیوی اِس پر تیار نہ ہوئیں کہ میری ایسی بدہیئت بدشکل ٹوٹی پھوٹی کرسی کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔

میں اُس کے بعد بھی کئی سال تک پرانے گھر میں رہی۔ آخر جب میرا حلیہ بالکل بگڑ گیا۔ اور میں کسی کام کی نہ رہی۔ تو ایک دن بھیکو نے نیلام والے کو بلایا۔ اور اُس کے ہاتھ مجھے بیچ دیا ——— بیچتے وقت اُس کے دل سے آہ نکلی اور اُس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ میرے بیٹے کی کرسی تھی!"

"تمھارا بیٹا کیا کرتا ہے؟" نیلام والے نے پوچھا۔

"وہ میونسپل کمیٹی کا صدر ہے۔"

"صدر تو ہے۔ مگر کرتا کیا ہے؟" نیلام والے نے پھر پوچھا۔

"جانے کیا کرتا ہے؟" بھیکو نے جواب دیا۔ مگر میں سوچتا ہوں وہ ابھی تک دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور نقلی تمباکو والی بیڑی نمبر ون بیچتا ہے!

اُس بعد والی داستان بڑی تلخ ہے۔" کرسی ایک وقفے کے بعد بولی "پہلے مجھے ایک ایسے آدمی نے خریدا جو بڑا شریف ایمان دار اور غریب آدمی تھا لیکن مجھ پر بیٹھتے ہی وہ لاکھوں کی دولت کمانے اور بے ایمانی کرنے کے خواب دیکھنے لگا جب وہ اپنی حرکتوں کے بعد جیل چلا گیا تو مجھے ایک ایسے آدمی نے خرید لیا جو بیحد زن مرید تھا۔ لیکن اُس آدمی نے میرے چوکھٹے پر بیٹھتے ہی اپنی بیوی کو گالیاں سنانا شروع کر دیں۔ اور اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب اُس کی بیوی نے دیکھا کہ جب وہ اِس کرسی پر بیٹھتا ہے جبھی ایسی حرکت کرتا ہے تو اُس نے اُٹھا کے مجھے گھر سے باہر پھینک دیا وہاں سے ایک گونگے فقیر نے مجھے اُٹھا لیا۔ بدقسمتی سے جوں ہی وہ مجھ پر بیٹھا اُس کی زبان کھل گئی۔ اور وہ جو گونگا تھا ایک دم بولنے لگا۔ اور بولتا ہی چلا گیا۔ اور لگاتار سات دن اور سات راتیں بولتا ہی رہا۔ اور وہ سب کچھ بولتا گیا جو کبھی گوبند رام بولا کرتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُس کا بہت علاج کیا مگر اُس کا بولنا بند نہ ہوا۔ اور وہ بولتے بولتے مرگیا۔ پھر وہاں سے مجھے یہ اسمٰعیل بھائی لونڈے والا آخر ید لائے۔ اب جانے میں کس کے پاس جاؤں گی۔ مگر میں کہیں جاؤں۔ میری سرشت میں گوبند رام کی خصوصیات اس طرح رچ چکی ہیں کہ میں جہاں بھی جاؤں گی اُس مشہور لیڈر کی کرسی رہوں گی۔

لمنز و مزاح

آنکھیں میری — باقی اُن کا

از

جناب ظفر پیامی ایم۔ اے

ایک اداریہ ——— "پنجاب میں اب بھی نکمّے لیکن موقعہ پرست سیاسی
ڑروں کی کمی نہیں ہے۔" ——— براہِ کرم اُن کے نام گنوا دیجئے تاکہ سردار کیرو
ن سب کو بھی وزیر بنا دیں۔

ایک پاکستانی معاصر ——— "حجام ہڑتال کرنے والے ہیں کیونکہ وہ
پنی مرضی کے مطابق عوام کی حجامت کرنے کا حق چاہتے ہیں"۔ ——— مگر ہم
سمجھتے تھے یہ صرف لیڈروں ہی کا پیدائشی حق ہے۔

مولانا حاشانی ——— "عقل اور حُبّ الوطنی صرف وزیروں کی اجارہ
داری نہیں ہے"۔ ——— جی نہیں۔ اس میں نائب وزیروں اور پارلیمنٹری سکریٹریوں
کا بھی حصّہ شامل ہے۔

ڈاکٹر لوہیا ——— "سفید ہاتھی ابھی تک ہمارا خون چوس رہے ہیں"
——— سفید ہاتھی تو ۴۷ء کے بعد داغِ مفارقت دے گئے۔ آجکل تو
رونا سیاہ ہاتھیوں کا ہے۔

ایک اداریہ ——— "پچھلے دنوں خواتین کی ایک تنظیم نے 'ماؤں کے
وفد' کے نام سے چند خواتین کو چین بھیجا۔ لیکن اِن میں چند خواتین ایسی بھی
تھیں جو ابھی تک 'مِس' کہلاتی ہیں"۔ ——— آپ کو انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں
کی کیا خبر؟

ایک خبر ——— "آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے کانگرسی لیڈروں نے دہلی سے کلکتہ تک جس جہاز میں سفر کیا، اُسے ایک خاتون ہوا باز چلا رہی تھی۔ گویا ثابت ہو گیا کہ ہوائی سفر خاتون ہوا باز کے ہوتے ہوئے بھی محفوظ ہو سکتا ہے"۔ ——— لیکن اُن لوگوں کے لئے نہیں جنھیں دل کی بیماری ہو۔

مسٹر سہروردی ——— "حادثۂ مصر کے بعد بغداد پیکٹ کمزور ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا ہے"۔ ——— اور اگر کہیں اُس کا سب سے بڑا مخالف مصر بالکل ہی ختم ہو گیا تو اِس کی طاقت لاجواب ہو جائے گی۔

ایک سوال ——— "کیا آپ بتا سکیں گے کہ بیکار ادیب، بیکار لیڈر، بیکار عاشق، بیکار شاعر، بیکار نقّاد، بیکار صحافی، بیکار رقّاص اور بیکار ظفر پیامی کیا کرتے ہیں؟" ——— بیکار ادیب دستخط جمع کرواتا ہے، بیکار لیڈر گورنر بنتا ہے، بیکار عاشق غزلیں کہتا ہے، بیکار شاعر ڈاکٹر کیسکر کے محکمے میں نوکری کرتا ہے، بیکار صحافی یونین بناتا ہے، بیکار نقّاد بڑی بڑی کانفرنسیں بلاتا ہے، بیکار رقّاص خیر سگالی کے وفدوں میں ودیش جاتا ہے اور بیکار ظفر پیامی مجبوراً سچ بولنے لگتا ہے۔

پنڈت نہرو نے جونپور میں تقریر کرتے ہوئے پوچھا ——— "جب فرقہ وارانہ فسادات میں گھر جل رہے تھے تو کانگرسی کارکن کیا کر رہے تھے۔

الیکشن کی تیاری۔

ایک نقاد ——— "ہمارے ہاں ایسے بے شمار ادیب پیدا ہو رہے ہیں جو ادب کی تخلیق کم اور اپنی پبلسٹی زیادہ کرتے ہیں"——— دھیرے بولئے کہیں وزیر نشریات واطلاعات کو پتہ چل گیا تو وہ سب کے سب افسر بنا دیئے جائیں گے۔

میر مشتاق احمد ——— حیرت ہے کہ بم پھینکنے والوں کا تو ابھی تک سراغ مِل نہیں سکا۔ لیکن بیسیوں شریف آدمیوں کو نہ جانے کس جُرم میں پریشان کیا جاتا ہے؟"——— بم نہ پھینکنے کے جُرم میں۔

سر انتھونی ایڈن ——— "برطانیہ نے صرف اس لئے مصر میں مداخلت کی وہ مصریوں اور یہودیوں میں جنگ بند کروانا چاہتا تھا"——— یعنی ہر ایک مصری کو قتل کر دینے سے جنگ خود بخود بند ہو جاتی۔

مارشل بلگانن ——— "ہنگری اور مصر کے واقعات میں قطعاً کوئی مطابقت نہیں ہے"——— کیونکہ مصر میں جو قتلِ عام ہوا وہ سامراجی اور وحشیانہ تھا اور ہنگری میں جو قتلِ عام ہوا وہ عوامی اور مہذبانہ تھا۔

ایک جن سنگھی اخبار ——— "ملک میں واحد طریقۂ علاج کی ضرورت" لیکن آپ پھر بھی ناقابلِ علاج رہیں گے۔

ایک خبر ——— مولانا آزاد نے یونسکو کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ساری کارروائی اردو میں کی"——— پنڈت سمپورنانند کو کہنا چاہیئے کہ "اس گھوراتیا چار" کے خلاف پروٹسٹ کرتے ہوئے ہندوستان یونسکو سے علیحدہ ہو جائے۔ ورنہ اتر پردیش ہندوستان سے علیحدہ ہو جائے گا۔

یونسکو میں امریکی ڈیلیگیٹ نے کہا ——— "دراصل فارموسا ہی چین ہے"——— حیرت ہے کہ ابھی تک ڈاکٹر سالازار نے نہیں کہا۔ کہ دراصل گوا ہی ہندوستان ہے۔

مسٹر سہروردی ——— "سارا پاکستان مصر کی پُشت پر ہے"——— خدا اُ پُشت پر رہنے کی بجائے سامنے آئے۔ پُشت سے تو چھُرا گھونپا جا سکتا ہے۔

ایک خبر ——— "واشنگٹن میں رُوسی سفیر کی طرف سے انقلابِ روس کی سالگرہ کے سلسلے میں دی ہوئی پارٹی میں کئی سفیروں نے روسی شراب و ادا پینے سے انکار کر دیا"——— اس حساب سے انگریزوں کی اسکاچ وہسکی اور فرانسیسیوں کی شیمپین بھی حرام ہوئی۔ اِسی لئے ہم ہندوستانیوں نے پہلے ہی سب کو ختم کر کے صرف ٹماٹر جوس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

ماسٹر بلگانن کا پنڈت نہرو کو مراسلہ ——— "ہر قسم کے جارحانہ حملوں کو ختم کرنے کے ٹھوس اقدامات اٹھانے چاہئیں"——— اِسی لئے سویٹ روس نے ہنگری والوں کے جارحانہ حملے کو ختم کر دیا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن ——— "تاریخ کیا ہے؟"——— مورخوں کا مذاق۔

ایک اعلان ——— "اس مرتبہ امن کے لئے کوئی نوبل پرائز کسی کو نہیں دیا جائے گا"——— کیونکہ ایڈن اور موکے سے لے کر بلگانن، اور کروشچیو تک بیسیوں حضرات ایسے ہیں جنھوں نے امن کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اور نوبل پرائز معمے کا پہلا انعام تھوڑے ہی ہے کہ بیسیوں خوش نصیبوں میں بانٹ دیا جائے۔

ایک خبر ——— "ابھی تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ مسز سُچیتا کرپلانی پرجا سوشلسٹ پارٹی چھوڑنے کے بعد کیا کریں گی" ——— ہمیں پتہ چلا ہے وہ غور کر رہی ہیں کہ پرجا کمیونسٹ پارٹی، پرجا مسلم لیگ، پرجا مہا سبھا اور پرجا سنگھ میں سے کس تنظیم کا قیام فی الحال بہتر رہے گا۔

ایک اشتہار ——— "دمے، کھانسی، نمونیا وغیرہ کے لئے ہماری دوا آپ کو ایک بار سے زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑے گی" ——— دہلی میونسپل کمیٹی اور اروِن ہسپتال کو اس کی خدمات حاصل کرنا چاہئیں تاکہ مردم کشی کی مُہم میں آسانی ہو۔

مسٹر گوملکا سکریٹری پولش کمیونسٹ پارٹی ——— "پولینڈ کے عوام کے حقوق کو کسی سیاسی نظریئے پر قربان نہیں کیا جا سکتا" ——— ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک جرمن اور ایک پولش اُمیدوار سے ہاتھیوں پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا۔ انگریز کے مضمون کا عنوان تھا "جن ہاتھیوں کا میں نے شکار کیا"۔ فرانسیسی نے لکھا "ایک ہاتھی کے رُومان"۔ جرمن نے لکھا "ہاتھیوں کی نسلی تحقیق"۔ اور پولش اُمیدوار نے لکھا "پولینڈ کے ہاتھیوں کے حقوق"۔

ایک خبر ——— "وزارتِ سیاحت نے ہندوستان میں سیاحوں کی دیکھ بھال کرنے والی بڑی بڑی ٹورسٹ ایجنسیوں کی ایک فہرست شائع کی ہے" ——— ہندوستان کی سب سے بڑی ٹورسٹ کمپنی "ہندوستانی امن کونسل" کو اپنے دفتر کی چھت پہ چڑھ کر پروٹسٹ کرنا چاہئے کہ اتنے بڑے پیمانے پر سیاحوں کی ایکسپورٹ اور امپورٹ کرنے کے باوجود اُس کا نام شاملِ فہرست نہیں ہے۔

ایک اعلان ——— "ہندوستانی فلمیں چلی بھیجی جائیں گی" ——— تاکہ چلی والے ہندوستانیوں کی مصیبت کم کر سکیں۔ درد بانٹنا اسی کو کہتے ہیں۔

ڈاکٹر کیسکر ——— "آل انڈیا ریڈیو سے چوبیس گھنٹے پروگرام نشر کئے جائیں گے" ——— یعنی اب کیسکر جی نے شب خون مارنے کا مکمل پروگرام بنا لیا ہے۔

جنرل اسکندر مرزا ——— "دُنیا ایک بحران سے دوسرے بحران میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا" ——— لیکن پاکستان نے تو پہلے ہی بحرانوں کا ریکارڈ قائم کر رکھا ہے۔

ایک خبر ——— "ایشیائی ادیبوں کی ہونے والی کانفرنس مختلف ممالک کے درمیان ادیبوں کے تبادلے پر غور کرے گی" ——— اُردو ادب کانفرنس کا شکرگزار ہوگا، اگر اُس کے موجودہ "کرم فرماؤں" کی ایک بڑی تعداد کو تبادلہ چھوڑ تحفے کے طور پر ہی کہیں بھیج دیا جائے۔

ایک اطلاع ——— "رُوس میں ایک بُودھ مندر ملا ہے" ——— ہمارے ہاں کے مارکسی نقادوں کو یہ ثابت کر دینا چاہئے کہ یا تو مہاتما بدھ رُوسی تھے نہیں تو کم از کم کسی ڈیلی گیشن میں رُوس ضرور گئے تھے۔

ڈاکٹر لوہیا ——— "میں ہر سیلاب زدہ رفیوجی کے لئے ایک مکان بنوا دوں گا" ——— لیکن اس پروگرام پر عمل طاقت ہاتھ میں آنے کے سات سالہ پروگرام کے بعد شروع ہوگا۔

ایک خبر ——— "ہندو مہا سبھا نے اسرائیل کی حکومت تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اُدھر ملک فیروز خاں نون نے یہ کہا ہے کہ ہمارے لئے اسرائیل کی حکومت ایک زندہ حقیقت ہے" ——— یعنی ثابت ہوا کہ نیک، اور عقلمند لوگ خواہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں، ایک ہی بات سوچتے ہیں۔

ایک افواہ ——— "پنڈت نہرو سردار سورن سنگھ وزیرِ تعمیرات کی معیت میں نئی سرکاری عمارتیں دیکھنے گئے۔ اُنھوں نے ہر ایک عمارت پر گنبد بنے ہوئے دیکھ کر سردار سورن سنگھ سے کہا کہ سردار صاحب آپ نے تو ہر عمارت کو پگڑی پہنا دی ہے" ——— ماسٹر تارا سنگھ کو کہنا چاہئے کہ سرکاری عمارتوں کا "سنگھ بننا" کانگرس اکالی سمجھوتے کا پہلا کارنامہ ہے

افسانہ

حکومت

از

جناب ٹھاکر پونچھی

کیسری ہوٹل۔ پہاڑ گنج دہلی ——— ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء

برادرِ محترم خوشتر صاحب! تسلیمات

قدرے تاخیر ہوئی۔ اور معذرت چاہیے کا انداز دیکھئے کہ "حکومت" پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً آپ اس پیش کش کو ٹھکرائیں گے نہیں۔ کیونکہ ایسے موقعے بار بار ہاتھ نہیں آتے جب میرے جیسا ایک حقیر سا انسان حکومت پیش کرے! ——— یہ کہانی میری اپنی ریاست کی کہانی ہے۔ پونچھ ریاست کی، جب وہ ریاست تھی۔ اُس وقت کا رنگ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت کچھ اِن آنکھوں نے قریب سے دیکھا۔ پونچھ کو پھر پور ریاست کے لباس میں دیکھا۔ ریاست کو جاگیر اور راجہ کو جاگیردار کے لبادے میں دیکھا۔ اور ایک دن جاگیر کو پھر...... !؟ جانے دیجئے۔ یہ خالص سیاسی قسم کی بات بننے لگی۔ اور سیاست سے مجھے چڑ ہے۔ کیونکہ ہزار کوشش کے بعد بھی اپنے ماحول کی سیاست کو نہیں سمجھ سکا۔ جب معاملہ خاصا اُلجھ جاتا ہے تو دل مچلتا ہے، دماغ سوچتا ہے اِن لمحوں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ارادہ کرتا ہوں کہ...... !؟

لیکن من کی من ہی میں رہ جاتی ہے۔

ڈوگری شاعری کے جدید دور کی شاعرہ پدما شرما نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎ ———————

چاننیاں گگلے کنیاں لانیاں

چاند کی چاندنی کو اپنے سینے سے کیسے لگایا جائے؟

سوچتا ہوں یہ میرے بس کا روگ نہیں لیکن ہمت ہے کہ ستاروں کی کہکشاں کی طرح کبھی نہیں ٹوٹتی ——— "بیسویں صدی" کے لئے کہانی لکھتے وقت کسی قدر محتاط رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کہانی کار کی ذرا سی لغزش کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ اور خطوط کی درآمد اور برآمد کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور میں گھبرا جاتا ہوں۔ تیلے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن خفت مٹائے نہیں مٹتی۔ بہرحال مقامِ مسرت ہے کہ "بیسویں صدی" کے پڑھنے والے اپنے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو رہے ہیں۔ میں نے ایسے خطوط سے ہمیشہ کچھ پایا ہے ——— اب "حکومت" پیش کر کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

کشمیری شاعری کو بھی آپ "بیسویں صدی" میں جگہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر دہلی میں آبسنے والے میرے کشمیری ادیب دوست بہت خوش ہوئے۔ خصوصاً کشمیری کے شاعر اور نقاد دشمبر ناتھ کول اور شمبھو ناتھ بٹ حلیم نے اس خیال کو بہت سراہا۔ یہ دونوں یہاں کے کشمیری ادیبوں کی بزم کاشر بزمِ ادب دہلی" کے بانی اور روحِ رواں ہیں۔ یہ بزم آپ کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔

اور ہر ماہ شائع شدہ شاعروں کا کلام مہیا کیا کرے گی ——— میں تو یہاں تک کہوں گا کہ آپ ایک صفحہ کشمیری ڈوگری اور پنجابی شاعری کے لئے وقف کریں تاکہ اُردو کے علاوہ "بیسویں صدی" اِن تینوں زبانوں کی بھی نمائندگی کرے۔ "بیسویں صدی" حقیقی معنوں میں ایک عوامی پرچہ ہے۔ ہر طبقے میں مقبول ہے۔ کشمیری ڈوگری اور پنجابی کو جگہ دے کر آپ ملک کے شمالی حصے کے عوام کو ایسا مواد دے سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی زبان اور کلچر کو سمجھنے کا اہم ذریعہ بنے۔ آج کے دور میں جب علیحدگی کا جذبہ اور صوبائی تعصب پر نفس میں کارفرما ہے، اِس طرح کا تجربہ یقیناً صحت مند ماحول کی پرورش و پرداخت میں ایک نمایاں رُول ادا کرے گا۔ اور پھر آپ تو تجربے کرتے اور انھیں کامیاب بناتے ہی آئے ہیں۔ یہ بھی کر دیکھئے نا!

اپنے دو ناولٹ ناول "رات کے گھونگھٹ" اور "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" بلامبالغہ میں نے مادرزاد ننگے آپ کے ہاتھوں میں سونپے تھے۔ لیکن جب قلیل مدت کے بعد پھر کتابی صورت میں دیکھے، تو بہت ہی قیمتی اور خوبصورت لباس میں تھے۔ "انھوں" نے تو مجھے نہیں پہچانا لیکن میں پہچان گیا۔ خالق اور تخلیق میں بس اتنا ہی فرق ہے۔ زمانے کی ہوا ہی کچھ ایسی چلی ہے!

کوئی کارِ لائق: ——— اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش

ڈاکٹر پرچھی

باپ دادا حکیمی کرتے تھے۔ اِس لئے دستور کے مطابق انھیں بھی حکیم ہی ہونا چاہئے تھا۔ جیسے۔ ہاں تحصیلدار کا بیٹا تحصیلدار ہوتا تھا۔ پٹواری کا بیٹا پٹواری، ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر ہوتا تھا۔ اور فوجی کا بیٹا فوج ہی کی ملازمت کرتا تھا۔ یہی پُرانی ریت تھی لیکن ایک غیر معمولی حادثہ ہوا۔ اور اُس غیر معمولی حادثے نے باپ دادا کا قدیمی پیشہ اُن سے چھین لیا۔ اور حکومت کی ایک ڈور اُن کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ بات ساری ریاست میں مشہور تھی کہ بوٹا سنگھ کے والد مرحوم بڑے سردار صاحب نے جو اپنے نام کے ساتھ خاندانی حکیم لکھتے تھے بڑے راجہ صاحب کو دوا کی ایک انمول گولی دی تھی اُس انمول گولی کا اثر یہ ہوا کہ راجہ صاحب کی زندہ رانیوں میں سے سب سے چھوٹی اور ترتیب کے لحاظ سے آٹھویں رانی نے ٹیکا صاحب کو جنم دیا۔ لڑکیاں تو بے شمار تھیں۔ لیکن اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ جو گدی کا وارث بن سکے۔ اِس طرح ریاست کی گدی کا ایک خوبصورت وارث پیدا کر کے سردار صاحب کی رسائی راج دربار میں ہوگئی اور اُن کا لڑکا بوٹا سنگھ جو دن بھر جڑی بوٹیاں اکٹھی کیا کرتا تھا محکمہ مال کا ایک اہلکار بن گیا۔ اور بڑے سردار صاحب کے انتقال کے بعد حکیمی کی قدیمی خاندانی دکان کو ہمیشہ کے لئے تالا لگا دیا۔ جب تک نورپور ریاست رہی بوٹا سنگھ نائب تحصیلدار رہے۔ جب درباری سازشوں کی وجہ سے نورپور کو ریاست سے جاگیر بنا دیا گیا تو چھلانگ لگا کر تحصیلدار بن گئے۔ اُس ریاست نما جاگیر میں روپیہ کمایا نہیں [illegible] تھا۔ اور وہ بھی دونوں ہاتھوں سے۔ بوٹا سنگھ تو سونا اُگلنے والے کھیتوں [illegible] تھے۔ خوب لوٹا۔ باپ دادا تو دواؤں کی خالی بوتلیں ہی چھوڑ گئے تھے۔ انھوں خالی بوتلوں میں سونا بھرا۔ پُرانے مکان کی جگہ نئی حویلی کھڑی کی۔ اب [illegible] چلتے تھے اور شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ حکومت کا نشہ باقی تھا جو وہ [illegible] بیٹے پر نکالتے۔ اب وہ دور بھی نہ رہا۔ وہ نشہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب [illegible] اور گالی بکتے رہتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں پہلے اُنھوں نے کبھی گالی نہ بکی تھی [illegible] بُرا بھلا نہ کہا تھا۔ خاموش طبع منش تھے۔ بہت ہی ملنسار اور دوست [illegible] مل بانٹ کر کھانے کے عادی تھے لیکن جب سے اُن کی خوبصورت لاڈلی بیٹی [illegible] سردار کشمیرا سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے اُن کا دماغ چل نکلا ہے۔ [illegible] دماغ نئی نئی گالیوں کی اختراع کرتا رہتا ہے۔ صبح سویرے ہی اپنی حویلی [illegible] پر کھڑے ہو کر پہلے بڑبڑاتے تھے۔ اور اُس کے بعد بلند آواز میں گالی [illegible] دیتے تھے۔ دورہ صرف ایک دو گھنٹے کا ہوتا۔ اس کے بعد دماغ ٹھیک

ے لگتا۔ دوپہر کو شانت رہتے۔ کھانا وغیرہ کھا کر سو جاتے اور شام کو پھر حویلی کی اونچی
۔ہوتی اور گالیاں۔

لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ گاباں کو بھگانے میں اُن کے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ بھائی
بہن کو بھاگنے میں مدد دی۔ کیونکہ وہ خود بھی بنتو نام کی ایک غریب لڑکی سے عشق
۔تھا۔ ٹھیک بھی تھا۔ کیونکہ جب حرام کا پیسہ ہو اور اونچی حویلی ہو، بے فکری کے
او ۔۔۔ دگر دمرغ بانگ دیتے پھرتے ہوں۔ تو عشق آہی دھمکتا ہے۔ غریب لڑکی
ے۔۔ چاہے امیر لڑکی کے لئے بس اُس حویلی میں بھی عشق آدھمکا تھا اور گاباں
۔گنے میں مدد دے کر وہ اپنے لئے راستہ تیار کر رہا تھا۔ تاکہ اُس راستے کو اپنا کر
ی ایک دن اپنی بنتو کو لے کر اپنے خیالوں کی دُنیا میں چلا جائے جہاں نہ تحصیلداری
ہو اور نہ ہی اونچی حویلی کی نئے رنگ میں پرانی دیواریں۔ لوگ تو یہاں تک بھی
۔تے تھے۔ ۔ ۔ ۔ جتنے منہ اُتنی باتیں !؟

ٹھیک ہے۔ جٹ، ہوڈی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ لیکن مر کا بھی تو کچھ تقاضا
ہے۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اُنھوں نے
ری شادی نہ کی۔ اپنی رشتہ دار بیوہ عورتوں کی مدد ضرور کرتے تھے۔ اُن کی لڑکیوں
۔اپنے بھی روپیہ خرچ کرتے۔ اس نیک کام میں اگر کبھی کبھار اُنھیں ہرنت رنگنے
تو مل جاتا ہوگا، تو رنگ لینے میں کیا حرج۔ عادت تھی۔ کیونکہ ساری عمر
سیلداری کرتے گزاری تھی۔

اُن کی لاڈلی بیٹی گاباں بہت ہی خوبصورت تھی۔ گھنگھریالے بال اور بھوری
وں والی الھڑ گاباں نے اپنی مختصر سی زندگی میں ماحول کی طویل کہانیوں کو دیکھا
۔نہ تھا۔ اِدھر اُدھر سے باتیں ہی سُنی سُنائی تھیں۔ اور اُن سنی سُنائی باتوں پر یقین
۔تھی۔ بچپن اور لڑکپن نے صرف گاؤں کی وادیاں اور گاؤں کی گھاٹیاں ہی دیکھی
ں۔ صرف پریوں کی محبت کی کہانیاں سُنی تھیں۔ چاندنی راتوں میں گیتوں کی تانیں
۔تھیں۔ جھرنے دیکھے تھے۔ آبشاروں کی پھوار سے اپنے دل کو گُدگُدایا تھا لیکن
۔نے شہر میں آنکھ کھولی تھی۔ اور کچھ نہ جانتے پہچانتے ہوئے بھی شہر کے ہر خوبصورت
ان سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ اُس کی خوبصورتی اور معصومیت نے اُسے
کے انداز تو بخش ہی رکھے تھے۔ کئی رانجھے بھی پیدا ہوگئے۔ اور اُس کی محبت کا

دم بھرنے لگے۔ پتنگیں اُڑائی جاتیں۔ کھُلی فضاؤں میں اُن کے پر تولے جاتے۔ پیچ ڈالے
جاتے اور پھر کٹی ہوئی پتنگوں کے ساتھ ہی بھاگ جانے کی تیاریاں کی جاتیں۔ کئی
پتنگیں اُڑیں۔ کئی پیچ ڈالے گئے۔ کئی بار فضاؤں میں پر تول کر غوطہ لگانے کی سعی کی گئی
لیکن تحصیلدار صاحب کو بروقت علم ہو جانے پر اسکیمیں دھری کی دھری رہیں۔ کٹی ہوئی
پتنگیں دُور پہاڑوں کی جانب اُڑ گئیں۔ صرف مانجھے کی ڈور ہاتھ میں سرکتی رہ گئی۔
لیکن کشمیرا سنگھ جو دسویں فیل تھا مگر ایک اچھا تیراک تھا جس نے سیلاب کے دنوں میں
تین سو بھینسیں کنارے پر لگائی تھیں۔ اور کئی جانیں بچائی تھیں اور جس کی چرچا سارے
شہر میں تھی۔ بغیر دیکھے ہی گاباں کی معصوم بھوری آنکھوں میں سما گیا۔ حالانکہ یہ بات
بھی مشہور تھی کہ کشمیرا سنگھ عورتوں کو دیمک کا نام دیتا ہے۔ جو مرد کی زندگی کو آہستہ
آہستہ چاٹتی رہتی ہے۔

وہ اپنے جسم کو خوبصورت ـــــــــ اور مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ
سیلاب سے سینہ تان کر بھرپور مقابلہ کر سکے۔ جو ہر سال ریاست کے گاؤں بہا کر لے
جاتا تھا۔ اس کا اپنا گاؤں بھی اُسی کی نذر ہوا تھا اور ماں باپ، عزیز و اقارب بھی۔ سیلاب
ہر سال پوری شدت سے آتا اور کشمیرا سنگھ اُسکا مقابلہ کرنے کے لئے مشق کرتا رہتا۔
اُس نے اور بھی ساتھی بنا رکھے تھے۔ اُن کی مدد سے سیلاب کا مقابلہ کرتا۔ لیکن اُنھوں
نے اب گھر بسا لئے تھے۔

لوگ پوچھتے۔

"تمہارے ساتھی کہاں گئے؟"

کشمیرا سنگھ قہقہہ لگا کر جواب دیتا۔

"اُنھیں دیمک چاٹ گئی۔"

"تمھیں کیوں نہیں دیمک چاٹتی؟"

"میں دیودار کی لکڑی کا بنا ہوں۔ مجھے دیمک کیسے چاٹ سکتی ہے؟"

لیکن اُس نے خود دیمک کو اپنا لیا۔

جب پہلی بار اُس نے گاباں کو دیکھا، اُسی کا ہو رہا۔ ملاقاتیں بڑھیں۔
دیمک اُس کے قریب آتی گئی۔ گاباں کا بھائی کشمیرا سنگھ کا دوست بن گیا۔ وہ اُن
دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ دونوں خوبصورت تھے۔ جوان تھے۔ محبت کرتے
تھے۔ لیکن تحصیلدار صاحب اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے بیاہنے کی سوچ رہے تھے

...تحصیلدار ہو یا اُس کا باپ ہی تحصیلدار رہ چکا ہو۔ کیونکہ وہ خود تحصیلدار رہ چکے ...رہ پر تھا۔ ایک جدید طرز کی اُونچی حویلی تھی۔ وہ ایک دسویں فیل کشمیرا سنگھ کو کیسے ...سمجھتے۔ اُن کے ارادوں سے سب واقف تھے۔ بات چلانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے ایک سات کو جب بارش ہو رہی تھی اور دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا گابان اور ...سنگھ بھاگ گئے۔

تحصیلدار صاحب کو جب علم ہوا بھاگنے والے اپنے خیالوں کی رومانی دنیا میں پہنچ چکے تھے۔ بارش اور سیلاب نے دنیا والوں کے لئے رستے روک رکھے تھے۔ تلاش فضول ...اور بعد میں اُن کی سرکاری طور پر تلاش نہ ہو سکی۔ لیکن اپنے بیٹے کو تحصیلدار صاحب نے ...پیٹا۔ سر پر زنجیتے۔ جوان بیٹا تھا لیکن مار کھاتا رہا۔ گالی کھاتا رہا۔ ایک دن مار پیٹ ہو گئی۔ صرف گالیاں رہ گئیں۔ اب اُنھیں لوگ مخبوط الحواس سمجھتے تھے۔ کیونکہ بیٹے کی حرکت نے اُنھیں شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ اور ذہنی طور پر اُنھیں نڈھال کر دیا تھا۔ انہی دنوں ریاست میں فساد شروع ہو گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہاں اکثر فساد ہوتے رہتے تھے۔ اور اُن فسادوں کو شورش کا نام دے کر کسی فرقے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا۔ ریاست کا واحد اخبار جو ہفتے میں صرف ایک بار دو صفحوں پر چھپتا تھا۔ ایک ...عنوان جما دیتا۔

ریاست میں ہندو شورش کا آغاز!

ریاست میں مسلمان شورش کا آغاز!!

ریاست میں سکھ شورش کا آغاز!!!

اِس طرح کی تمام شورشیں ریاستی حکومت کے خلاف ہوتی تھیں۔ لیکن حکومت اُنھیں ہمیشہ مذہبی رنگ دے دیتی۔ اخبار کی سُرخی کے مطابق اب کی بار مسلمان شورش کا آغاز ہوا تھا۔ کچھ کچھ شورش نے بھی شدت اختیار کر لی تھی۔ کچھ کچھ حکومت کے کارندوں نے بھی بڑھا چڑھا کر بات بنائی تھی۔ شورش کسی گاؤں میں تھی۔ اُس کے اثرات ضروری طور پر شہر میں بھی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ متاثر ...سنگھ تحصیلدار ہوئے۔ اُن پر پھر مار پیٹ اور گالی کا دورہ پڑا۔ بات بات پر پھرتے ...وقت بے وقت گالی بکنے لگتے۔ اب لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ دورے کی وجہ ...بان ہے نہ اُن کی یاد۔ اُسے وہ بھول بیٹھے تھے۔ لوگ بھی اُس حادثے کو بھول ...لئے تھے۔ اب اُنھیں حکومت سے گلہ تھا۔ کیونکہ سب تو تیغ شورش کے ہنگامی حالات پر قابو پانے کے لئے اُنھیں مجسٹریٹ نہ بنایا گیا تھا۔ جبکہ دوسرے کئی پنشنر ریٹائرڈ اہلکاروں کو نواز گیا تھا۔

شہر کے باہر باؤلی تھی۔ سانپوں والی باؤلی۔ وہاں صبح چار بجے سے لے کر نو بجے تک خوب گہما گہمی رہتی۔ دھرماتما بوڑھے لوگ صبح سویرے ہی نہا کر چلے جاتے اُس کے بعد سرکاری ملازم آتے۔ اور جب وہاں کوئی نہ ہوتا تو ریٹائرڈ لوگ آتے۔ جو شاہی خزانے سے اچھی پنشن پاتے تھے۔ شورش کی وجہ سے اِس طبقے میں کافی چہل پہل تھی۔ حکومت کو اکثر کوساجاتا۔ کیونکہ اُن جیسے تجربہ کار کہنہ مشق پنشنروں کی خدمات حاصل نہیں کی جا رہی تھیں۔

معمول کی طرح ریٹائرڈ لوگ باؤلی کے سرسبز تلے میں بیٹھے مالش کر رہے تھے۔ شیس آسن لگا رہے تھے کہ بوٹا سنگھ ایک کچھے اور کُرتے میں آ دھمکے۔ آئیے آئیے کی آوازیں آئیں لیکن وہ تلے میں نہ گئے۔ کپڑے اُتار کر باؤلی میں نہانے کے لئے اُترنے لگے ایک بوڑھے سردار صاحب جو پولیس انسپکٹر رہ چکے تھے۔ اور اپنی جوان لڑکی اُن کے بیٹے کو دینا چاہتے تھے اُن کے قریب آئے اور اُن کے کان میں کچھ کہا۔ اُنھوں نے سُنتے ہی اپنی تیل کی بوتل پتھر پر پٹیک دی اور لگے بلند آواز میں حکومت کو گالی دینے۔

حکومت بدذات ہے!

حکومت ڈاکو ہے!!

حکومت حرام خور ہے!!!

نہ جانے اُنھوں نے کیا کیا بکا۔ اور بغیر نہائے ہی گالی دیتے بکتے گھر چلے گئے۔ حکومت کو اِس طرح کھلم کھلا گالی دینا۔ خصوصاً پنشن خور لوگوں کے لئے جرم تھا زمین جائیداد ضبط ہو سکتی تھی۔ اور قید کی سزا بھی۔ جمہوری حکومت تو تھی نہیں کہ تحریر و تقریر کی آزادی ہوتی۔ اور پھر جمہوری حکومت میں بھی گالی دینا جُرم ہے۔ اُسی رات جب تحصیلدار صاحب سوئے ہوئے تھے۔ پولیس ہتھکڑی لگا کر تھانے میں لے گئی۔

اُن کا جرم یہ تھا کہ اُنھوں نے سانپوں والی باؤلی پر حکومت کے وفادار پنشنروں کا مجمع لگا کر حکومت کو گالی دی۔ حکومت کو گالی دینے کا مطلب راجہ صاحب کو گالی دینا ہے۔ راجہ صاحب کو گالی دینے کا مطلب راجہ صاحب کے بزرگوں کو

ایک نیشنلسٹ سکھ لیڈر نے انکشاف فرمایا ہے کہ "اکالی تحریک کے لئے غیر ملکی امداد مل رہی ہے"۔ ——— جی ہاں۔ پرسوں ہی ویت نام کی حکومت کی طرف سے ماسٹر تارا سنگھ کو ایک منی آرڈر موصول ہوا ہے! بھائی! اکالی مورچہ بےشک ایک احمقانہ حرکت اور وطن کو نقصان پہنچانے والی تحریک ہے لیکن اس کے باوجود اس قسم کے احمقانہ الزامات سے کیا فائدہ؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر کانگرسی حکومت کے دور میں کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ بند نہ ہوئی تو پھر کب ہوگی؟" ——— ملاوٹ کانگرسی حکومت کے بعد ہی بند ہوگی۔ کانگرس کا تو اپنا یہ حال ہے کہ ملاوٹ کی بہتات کے مارے خالص کانگرسیوں کا نشان تک ڈھونڈنا مشکل ہو رہا ہے۔

"کیمپ روڈ ہوسٹل (دہلی) میں چودہ شرنارتھی کنبے اُجاڑ دیئے گئے"۔ ——— شرنارتھی کنبے بسے کب تھے جو اُجاڑ دیئے گئے۔ یاد رکھو جس دن شرنارتھی بس گئے اُسی روز بحالیات کا محکمہ ختم ہو جائے گا اور ملک کی بڑھتی ہوئی بے کاری میں اضافہ ہو جائے گا۔ اِس لئے ملکی مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ شرنارتھی اُجڑتے رہیں۔

مسٹر محمد علی وزیرِ اعظم پاکستان نے اعلان فرمایا ہے کہ "ہم نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے امریکی امداد سے دست بردار ہونے کی پیشکش ہرگز نہیں کی"۔ ——— بہت اچھا کیا آپ نے۔ آئندہ بھی اِس قسم کے اعلان کرتے رہیئے۔ ورنہ "ڈان" جیسے اخبار آپ کو بھی غدارِ اعظم کا خطاب عطا فرمائیں گے۔

سردار اجل سنگھ وزیرِ خزانہ پنجاب فرماتے ہیں کہ "اکالی مورچہ سے سکھوں کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچے گا"۔ ——— یہ مورچہ سکھوں کے فائدے کے لئے نہیں لگایا گیا۔ یہ فرمائیے کہ اس سے ماسٹر تارا سنگھ اور اسی قماش کے دوسرے بیکار لیڈروں کو فائدہ پہنچے گا کہ نہیں!

پنڈت شری رام شرما کا ارشاد ہے کہ "نعروں پر پابندی لگا ... حق بجانب نہیں"۔ ——— بالکل درست فرمایا آپ نے۔ ... کی یہ ہے کہ آپ وزارت سے تو نکالے جا چکے ہیں۔ اِس لئے زندگی ... لازماً فسادات کے خواہشمند ہوں گے۔ تاکہ یا تو لیڈری چمک اُٹھے یا شہادت نصیب ہو جائے۔ مگر ہم عام لوگ ابھی فسادات کا استقبال کرنے ... تیار نہیں ہیں۔

فرمایا شری دھیبر صدر کانگرس نے کہ "ہندوستان میں غربت کی انتہا ... جاتی ہے"۔ ——— مگر شری گلزاری لال نندہ نے تو غریبی۔ بے کاری ... بیماری تمام لعنتوں کو ملک سے بھگا دیا ہے۔ اور پنڈت نہرو نے اِن کے لئے بڑے بڑے غیر ملکی لیڈروں سے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لئے ہیں۔ ہندوستان اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اب تھوڑے سے تنزل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

پاکستان کے وزیر ڈاکٹر خان صاحب نے فرمایا کہ "پٹھان پختونستان ... حامی نہیں ہیں"۔ ——— آپ کا خیال درست ہی ہوگا۔ مگر آپ ... آپ کے برادرِ عزیز اپنی پارٹی سمیت پختونستان کی حمایت کرتے رہے ہیں اس سلسلے میں اتنا کچھ کہہ چکے ہیں کہ گستاخی معاف۔

مس فاطمہ جناح نے فرمایا کہ "بیرونی عناصر کا خطرناک ہاتھ پاکستان ... اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ اور پاکستان کی آزادی ختم ہو ..." ——— آپ کے خیالات کی تردید کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ لیکن ... قسم کے بیان دینے سے پہلے اپنی ذمہ دار پوزیشن کا خیال رکھنے میں کوئی ... نہیں ہوتا۔ یوں ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کو حسبِ ضرورت ... کچھ کہہ گزرنے کا حق حاصل ہے۔

پٹیالہ کے ڈاکٹر دھیان سنگھ نے فرمایا ہے کہ "اکالیوں کی فرقہ وا... سرگرمیاں ملک کے لئے نقصان دہ ہیں"۔ ——— مگر آپ ...

الی دیتا ہے۔ اور اُن کے بزرگوں کا شجرۂ نسب چونکہ بھگوان سے جڑتا تھا۔ اس لئے بھگوان کو گالی دینے کے مترادف تھا۔ جرم سنگین تھا۔ شورش سے بھی سنگین۔ مقدمہ عدالت تک پہنچا۔

جس دن پہلی پیشی تھی، عدالت کا کمرہ لوگوں سے اَٹا پڑا تھا۔ کچھ ریٹائرڈ لوگ تھے۔ کچھ گالیاں کے عاشق۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو ملازم پیشہ تھے۔ لیکن اپنے حالات سے نالاں تھے۔ اپنی قسم کا پہلا مقدمہ تھا۔ کیونکہ ایک تحصیلدار کٹہرے میں کھڑا تھا۔ عام لوگ تو حکومت کو شورش کے دنوں میں کوستے ہی رہتے تھے۔ لیکن جس نے ریاست کا نمک کھایا ہو اور اب تک برابر چاٹ رہا ہو اُس کے مُنھ سے ایسی بد کلامی اور بد اخلاقی نا قابلِ برداشت تھی۔

سرکاری وکیل غصے میں لال پیلا ہو رہا تھا۔ اور جو باتیں بوٹا سنگھ تحصیلدار نے کہی تھیں، وہ بھی اُن کے مُنھ میں ٹھونسی جا رہی تھیں۔ گالیوں کی طویل فہرست تھی۔ اور اُس میں ماں بہن اور بیٹی کی گالیاں بھی تھیں اور دوسری گالیاں بھی جو قابلِ اعتراض اور فحش تھیں۔

بوٹا سنگھ تحصیلدار ہتھکڑی پہنے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ پہلی ہی پیشی میں فیصلہ سُنایا جانے والا تھا۔ جب سرکاری وکیل اپنا بیان ختم کر چکا اور تین سال قید بامشقت کی سزا تجویز کر چکا تو فاضل جج نے پُوچھا۔

"آپ تحصیلدار رہ چکے ہیں؟"

"جی ہاں"

"کتنا عرصہ؟"

"پانچ سال نائب اور پندرہ سال تحصیلدار!"

"کتنی پنشن پاتے ہیں؟"

"پچھتر روپے!"

"کب سے پنشن لے رہے ہیں؟"

"غالباً دس سال سے"

"آپ کے والد مرحوم حکیم تھے؟"

"جی ہاں۔ انھیں کی خدمات کے صلے میں مجھے تحصیلداری ملی"

"کیا آپ نے حکومت کو گالی دی؟"

"جی ہاں!"

"جو الزام آپ پر لگایا گیا ہے وہ ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں! سولہ آنے ٹھیک"

"آپ کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

"صرف اتنا ہی کہ جو گالی میں نے حکومت کو دی، جو کچھ میں نے کہا میرا حق ہے۔ میں نے حکومت کو اپنا خون دیا ہے، دن رات خدمت کی ہے، محنت کی ہے اُسے بنایا سنوارا ہے۔ میں چاہوں تو اُسے تہس نہس بھی کر سکتا ہوں"

جج نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

"سرکاری وکیل نے تو صرف تین سال کی سزا تجویز کی ہے۔ میں آپ کو سات سال کی سزا دینا چاہتا ہوں!"

بوٹا سنگھ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"مجھے منظور ہے۔ لیکن میں دوبارہ عرض کروں گا کہ حکومت کو بُرا بھلا کہنا میرا حق ہے۔ اُس کی یہ حرکت نئی نہیں۔ پہلے بھی مجھ پر ایسے وار ہو چکے ہیں۔ یہ میری غیرت کا سوال ہے"

"کیسے وار؟"

"پہلے گاباں کو بھگانے میں مدد دی!"

"حکومت نے؟!" جج صاحب نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"جی ہاں حکومت نے۔ حکومت ہی نے اُس بے غیرت کشمیرا سنگھ کو بھگا دیا"

"حکومت کو آپ کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ کو شاید علم نہیں۔ لیکن اس بات کو اب بچہ بچہ جانتا ہے۔ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔ اس تحصیلداری نے میرا گھر اُجاڑ کر رکھ دیا۔ خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ میں ایک دُکھی باپ ہوں۔ ایسی حالت میں جو چاہوں کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔"

جج صاحب نے بات کاٹ دی۔

"تحصیلدار صاحب آپ۔۔۔۔"

بوٹا سنگھ نے اُونچی آواز میں اپنا فقرہ مکمل کیا ـــ کیونکہ میں حکومت

"پوچھا"

"کس حکومت کا؟"

"اپنے حکومت سنگھ کا! میں نے اپنے بیٹے حکومت سنگھ ہی کو بُرا بھلا کہا تھا۔ اب بھی کہوں گا۔ بھری عدالت میں سب کے سامنے کہوں گا کہ حکومت ..."

عدالت میں ایک قہقہہ گونجا۔

سرکاری وکیل چیخا —

"یہ بہانہ ہے۔ جھوٹ ہے۔ بیٹے کے نام کی آڑ میں جان خلاصی کرانا چاہتا ہے۔"

بوٹا سنگھ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ حکومت کسی منو نام کی لڑکی کو لینے شورش والے گاؤں چلا گیا ہے۔ بغیر مجھے اطلاع دئے۔ اگر وہ فسادیوں کے ہاتھ مارا گیا تو پھر ... ایک ہی بیٹا ہے۔ بیٹی بھی چلی گئی۔ اب صرف بیٹا رہ گیا تھا وہ بھی گیا۔ ہمارے خاندان میں بھوکے ننگے ہوتے ہوئے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تحصیلداری کا پیسہ ہی ایسا نکلا۔ یہ اہلکاری مجھے راس نہیں آئی۔ میں دوبارہ حکیمی کا پیشہ اپناؤں گا۔ حکومت سنگھ کو حکیم بناؤں گا اور ..."

جج صاحب نے فائل پر تیزی سے اپنا قلم چلاتے ہوئے فیصلہ لکھا اور پھر اُسے پڑھ کر سُنایا۔

"مسٹر بوٹا سنگھ ریٹائرڈ تحصیلدار کے بیٹے کا نام حکومت ہی ہے۔ حکومت سنگھ۔ انھیں باعزت بری کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک نصیحت کی جاتی ہے جو تحریر ہوتی ہے ضبط کی جاتی ہے:"

بوٹا سنگھ سٹپٹایا۔

"کس جرم میں؟"

جج صاحب نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ریاست کی حدود میں ——— اور خاص کر راجہ صاحب کی جاگیر میں ایسے نام نہیں رکھے جا سکتے!"

خط وکتابت کرتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔ خریداری سے متعلقہ امور کے لئے چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

غزل

از

جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

۸/۴ بینک روڈ الہ آباد
ار نومبر ۱۹۵۶ء

مکرمی حضرت خوشتر تسلیم

سالنامہ بیسویں صدی کے لئے غزل کی
آتش سر آنکھوں پر تعمیلِ ارشاد میں دیر یوں ہوئی کہ
نے سوچا غزل بھیجوں تو ایسی بھیجوں جو کسی قابل ہو یہ
انہ غزل حاضر ہے۔ اب جیسی بھی ہو۔ اب تک تو سال
ایک آدھ بار میرا دلی آنا ہو جاتا تھا۔ اب معلوم ہوتا
مجھ سے دلی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی۔ یارو
کتنی دور رسائی ہیں بستیاں۔

فراق گورکھپوری

ہے جس کی تلاش اے دل وہ ذات نہیں ہوتی　　ہر نور کے پُتلے میں ہر بات نہیں ہوتی

وہ رات وہ دن جس کے ہیں منتظر اہلِ دل　　وہ دن نہیں آتا ہے وہ رات نہیں ہوتی

راتیں ہوں کہ باتیں ہوں ہونے کو تو ہوتی ہیں　　وہ رات نہیں ہوتی وہ بات نہیں ہوتی

ہر لمحے پہ ہوتا ہے سایہ ابدیت کا　　اِک رات محبت کی اِک رات نہیں ہوتی

جو گنج لٹاتے ہیں اس در کے فقیر، اتنی　　دارا و سکندر کی اوقات نہیں ہوتی

دیکھا ہے جسے میں نے اُن نیچی نگاہوں میں　　ہر نرگسِ قاتل میں وہ گھات نہیں ہوتی

جو ہے رُخِ رنگیں میں وہ دن بھی کبھی ہوتا　　جو زلفِ سیہ میں ہے وہ رات نہیں ہوتی

اِک بات لبِ جاناں گو ہے تری باتوں میں　　وہ بات نہیں ہوتی ہیہات نہیں ہوتی

ہے گنجفۂ اُلفت اِک بازیٔ بے پایاں　　شہ پڑتی ہے رہ رہ کر پر مات نہیں ہوتی

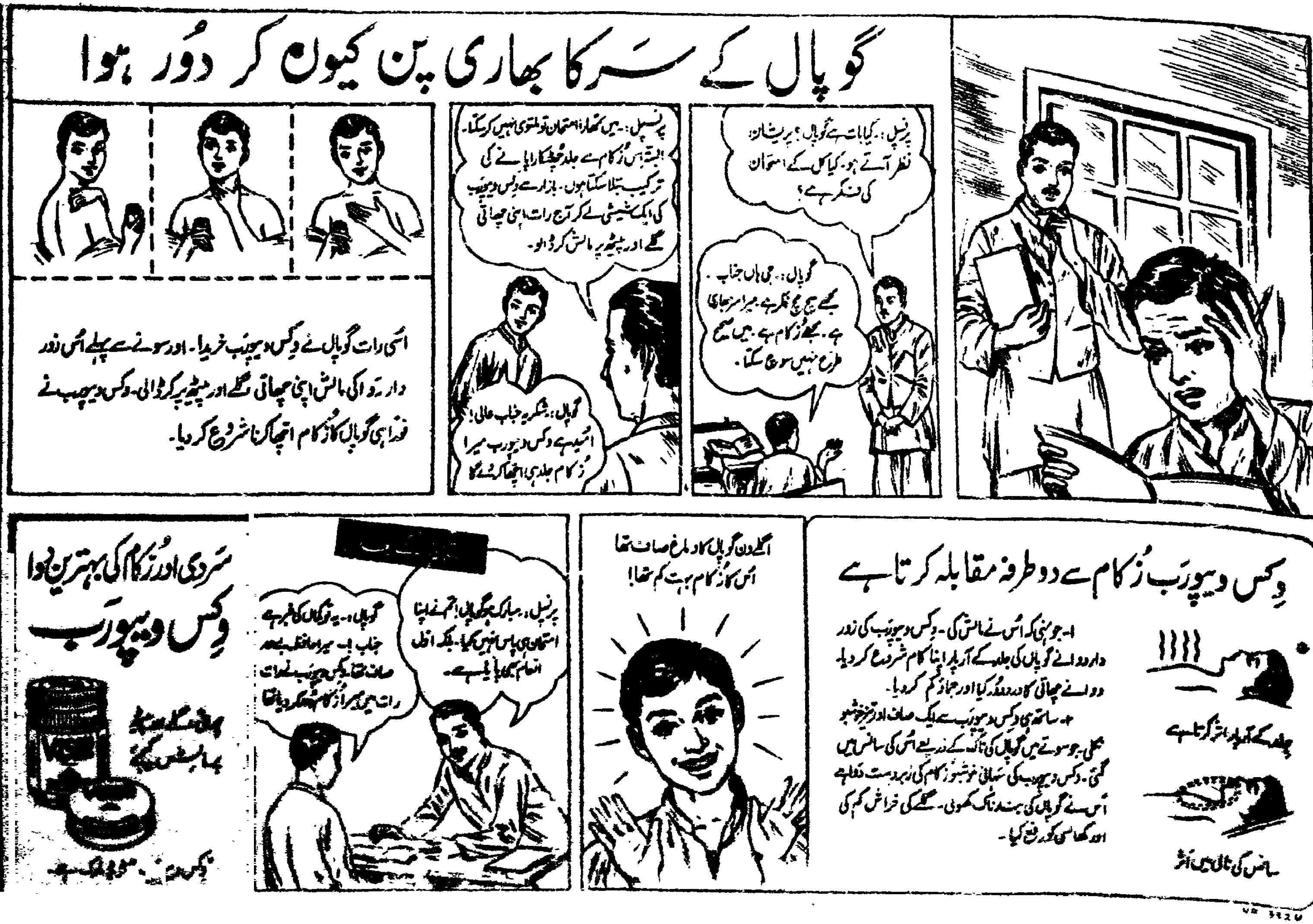
جو جان ہے موسم کی کیا جانئے کہاں ہے وہ　　پانی تو برستا ہے برسات نہیں ہوتی

مجھ سا بھی جو مل جائے تو اس کو غنیمت جان　　انسانوں کی دُنیا میں افراط[1] نہیں ہوتی

اُس جانِ تمنا سے کب ملتے ہیں خالی ہاتھ　　کب ہاتھ میں اشکوں کی سوغات نہیں ہوتی

سر اپنے ہی مصرعے پر دُھنتا ہوں فراق اکثر
ہر نور کے پُتلے میں ہر بات نہیں ہوتی

[1] یہاں میں اس قافیے کو جائز سمجھتا ہوں۔ کوئی چاہے تو افراط کی جگہ بہتات پڑھے (فراق)


گوپال کے سر کا بھاری پن کیوں کر دور ہوا
پرنسپل: کیا بات ہے گوپال؟ پریشان نظر آتے ہو۔ کیا کل کے امتحان کی فکر ہے؟
گوپال: جی ہاں جناب۔ مجھے سچ مچ فکر ہے۔ میرا سر بھاری ہے۔ مجھے زکام ہے۔ میں ٹھیک طرح نہیں سوچ سکتا۔
پرنسپل: میں تمہارا امتحان تو ملتوی نہیں کر سکتا۔ البتہ اس زکام سے جلد چھٹکارا پانے کی ترکیب بتلا سکتا ہوں۔ بازار سے وکس ویپوریب کی ایک شیشی لے کر آج رات اپنی چھاتی گلے اور پیٹھ پر مالش کر ڈالو۔
گوپال: شکریہ جناب عالی! امید ہے وکس ویپوریب میرا زکام جلدی اچھا کر دے گا
اسی رات گوپال نے وکس ویپوریب خریدا۔ اور سونے سے پہلے اس زور دار دوا کی مالش اپنی چھاتی گلے اور پیٹھ پر کروائی۔ وکس ویپوریب نے فوراً ہی گوپال کا زکام اچھا کرنا شروع کر دیا۔
وکس ویپوریب زکام سے دوطرفہ مقابلہ کرتا ہے
۱۔ جونہی کہ اس نے مالش کی۔ وکس ویپوریب کی زور دار دوا نے گوپال کی جلد کے آر پار اپنا کام شروع کر دیا۔ دوا نے چھاتی کا درد دور کیا اور جماؤ کم کر دیا۔
۲۔ ساتھ ہی وکس ویپوریب سے ایک صاف اور تیز خوشبو نکلی۔ جو سوتے میں گوپال کی ناک کے ذریعے اس کی سانس میں گئی۔ وکس ویپوریب کی سہانی خوشبو زکام کی زبردست دوا ہے۔ اس نے گوپال کی بند ناک کھولی۔ گلے کی خراش کم کی اور کھانسی کو رفع کیا۔
جلد کے آر پار اثر کرتا ہے
سانس کی نالی میں اثر
اگلے دن گوپال کا دماغ صاف تھا اس کا زکام بہت کم تھا!
پرنسپل: مبارک ہو گوپال! تم نے اپنا امتحان ہی پاس نہیں کیا۔ بلکہ اعلیٰ انعام بھی پایا ہے۔
گوپال: یہ وکس کی بدولت ہے جناب۔ میرا ماتھا بالکل صاف تھا۔ وکس ویپوریب نے رات ہی میں میرا زکام ٹھیک کر دیا تھا
سردی اور زکام کی بہترین دوا
وکس ویپوریب

ڈارلنگ

افسانہ

از

جناب اختر ملیح آبادی بی۔اے۔بی۔ٹی

گورنمنٹ ہائی اسکول ٹھٹھہ (مغربی پاک) ۔۔۔۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۵ء

خوشتر بھائی! تسلیم و نیاز!

افسانہ حاضر ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گا۔ مسٹر عابد کا کردار دیکھئے۔ یکسر نیا اور چھوتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ ابھی ہماری دُنیا میں ناپید ہیں۔ کیونکہ ہم مسٹر عابد کی طرح مصروف اور بااصول نہیں ہیں تاہم کل لیئے کردار عام ہو جائیں گے ۔۔۔۔ مدت کے بعد سلام مچھلی شہری سے ملاقات ہوئی۔ کہاں غوطہ لگا جاتے ہیں؟

ایک ناول لکھنوی ماحول پر زیر تکمیل ہے۔ وہ لکھنؤ جسے میں نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے، وہ بہت تلاش کرنے پر بھی اِس بار مجھے نہیں ملا۔ چاہتا ہوں کہ لکھنؤ کے کلچر کو ناولوں اور افسانوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں لکھنؤ کی جھلک دیکھ سکیں۔

بچوں کو بہت سے پیار۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں تسلیم! بچے سلام عرض کرتے ہیں اور آپ کی بھابی بچوں کو دعائیں بھیج رہی ہیں۔

آپ کا

اختر ملیح آبادی

سگریٹ سُلگاتے ہوئے اُس کی نظر اُس سلپ پر جم گئی جسے کچھ دیر پہلے اسی اُس وقت میز پر رکھ گیا تھا جب وہ فون کر رہا تھا۔ سگریٹ کا کش لے کر ۔۔نے سلپ اُٹھائی اور پڑھنے لگا۔

"مس فاخرہ پروپرائٹر کام؟"

نام کی جاذبیت کام کر گئی اور اُس نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی لپک کر اندر آیا ۔نے سلپ کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"بھیج دو!"

اور ساتھ ہی خود سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ٹائی پر نظر ڈالی اور سگریٹ کو خاص زاویئے ۔ہونٹوں میں داب لیا۔ دروازہ کھلا۔ مس فاخرہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئیں تو اُس نے فائل پر سے نظریں اُٹھاتے ہوئے سامنے دیکھا اور کہا۔

"تشریف رکھیے!"

"شکریہ!"

"فرمایئے؟"

"آپ کی فرم کا ایڈورٹائز دیکھ کر حاضر ہوئی ہوں جو آج ہی "ڈان" اور "مارننگ نیوز" وغیرہ میں ۔۔۔۔"

"اوہ!" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "یاد آ گیا۔ غالباً لیڈی اسٹینو کے متعلق ہمارا ایڈورٹائز تھا؟"

"اسی سلسلے میں آئی ہوں۔"

"مس فاخرہ!" اُس نے مس فاخرہ کے لباس اور خوبصورتی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "فرم کے مالک مسٹر عابد کے لئے لیڈی اسٹینو کی ضرورت ہے۔ ۔ ۔ ۔ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کروں گا کہ مسٹر عابد سے زیادہ شاید کراچی میں کوئی شخص مصروف نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس فرم کو عروج تک پہنچانے والی ہستی مسٹر عابد کی ہے۔ یہ انھیں کی کوشش اور انتھک محنت و مصروفیت کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف ملک میں بلکہ دُنیا کے اٹھارہ ممالک میں فرم کی ایجنسیاں قائم ہیں اور فرم نے دنیا کی جلد تجارت سنبھال رکھی ہے۔"

"مجھے یہ سُن کر یقیناً خوشی ہوئی!"

مس فاخرہ نے بے چین ہو کر تقریر کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔

"مس فاخرہ پرویز!" اُس نے مسکراتے ہوئے اور نظریں فاخرہ کے گلے پر جماتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہید یقیناً بارِ خاطر ہوگی۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ کو بعد میں شکایت کا موقعہ ملے۔ اس لئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مسٹر عابد کی اسٹینو کو بے پناہ ACTIVE ہونا چاہیئے۔"

"آپ ٹسٹ کر لیجئے!"

"یہ رسم تو پوری ہوگی۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن کیا آپ اس مصروف ترین شخصیت اور تیز رفتار شخص کو CATCH کر لیں گی؟ ۔ ۔ ۔ پچھلے چند ماہ میں پانچ لیڈی اسٹینو بدلی جا چکی ہیں ۔۔۔!"

"مجھے اُمید تو یہی ہے۔"

مس پرویز نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ اُس نے مس پرویز کے چہرے پر خود اعتمادی اُبھرتے دیکھی تو اُسے تعجب ضرور ہوا۔ کیونکہ کمسنی کے باوجود چہرے پر غضب کا ٹھہراؤ تھا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے کے گوشے میں مٹکاتے ہوئے اُس نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو کہنے لگا۔

"دیکھو! چائے لاؤ!"

"تکلیف نہ کیجئے!"

"کچھ تکلف ہے مس پرویز؟"

"تکلف تو کچھ بھی نہیں۔"

"پھر چلئے پیجئے۔ اس دوران میں ہم ایک دوسرے سے تفصیلی طور پر متعارف ہوں گے۔"

چائے کے دوران میں مس فاخرہ نے اُسے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "میرے والد فسادات میں کام آ گئے تھے۔ اُس وقت میں میٹرک میں تھی۔ میری ماں نے کسی نہ کسی طرح بغیر کسی سہارے کے میری تعلیم جاری رکھی۔ اب میں ہی اپنی ماں کا واحد سہارا ہوں۔ بی کام کا ارادہ ہے۔ ملازمت کے ساتھ تعلیم بھی جاری رہے گی دیکھئے وقت اِس ارادے کا کیا سلوک کس طرح کرتا ہے؟"

"چائے اور لیجئے!"

"جی نہیں شکریہ!"

"آپ تکلف کرتی ہیں!" اُس نے ہنستے ہوئے اور دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا "آپ کو فرم کے مالک کے ساتھ کام کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس پیچیدہ ہستی کو سمجھ لیں۔ اگر آپ نے خدانخواستہ تکلف کیا تو مسٹر عابد اس لئے ناراض ہو جائیں گے کہ آپ نے اُن کا قیمتی وقت برباد کیا۔"

"آپ کے ریہرسل کا طریقہ مجھے پسند نہیں آیا۔"

مس فاخرہ نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟"

"یہی کہ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ایک طرف آپ مجھے ENCOURAGE کر رہے ہیں تو دُوسری طرف مسٹر عابد کی طرف سے آپ مجھے خائف کرنا چاہتے ہیں!"

"آپ ہیں ذہین۔" اُس نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ہر لیڈی اسٹینو نے کام چھوڑتے وقت مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے انھیں پیچیدہ فطرت اور پیچیدہ کردار سے رُوشناس نہیں کرایا تھا۔ میں اب یہ الزام برداشت نہیں کر سکتا۔ اِس لئے میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ملازمت سے پہلے آپ دماغ کا جائزہ لے لیں بعد میں کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے!"

"صاف گوئی کا شکریہ! لیکن میں طے کر چکی ہوں کہ ضرور کام کروں گی!"

"بسم اللہ! اب مسٹر عابد کے پاس جانے سے پہلے ٹیسٹ ہو جائے آپ تیار ہیں؟"

"قطعی!"

دونوں کھڑے ہو گئے۔ ٹیسٹ شروع ہو گیا۔ ٹیسٹ میں اُس نے کا

زور عایت نہ کی۔ کیونکہ اُسے خوف تھا کہ رعایت کا نتیجہ کہیں بھگتنا نہ پڑے۔ ایک بار اُس نے ایک حسین چہرے کی سائڈلی تو بعد میں مسٹر عابد نے اُس کی ملازمت ہی سے ڈالی تھی۔ کہ ناقابل اسٹینو کو اُس تک لے ہی کیوں آئے؟ یہی وجہ تھی کہ اب وہ رعایت نہیں کرتا تھا۔

اب وہ مسٹر عابد کے کمرے کی طرف ہولیا۔ دروازے پر پہنچکر اُس نے مس فاخرہ سے کہا۔

"تشریف رکھیے۔ اور جُوں ہی طلبی ہو بغیر ایک لمحہ ضائع کئے تشریف آئیے گا۔"

"بہتر ہے!"

"یہ کہہ کر اُس نے دروازہ آہستہ سے کھولا۔ مس فاخرہ نے محسوس کیا کہ وہ خود اندر جاتے ہوئے کترا رہا ہے۔ آخر کار وہ کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا تو مسٹر عابد کو فائل کے مطالعے میں غرق پایا۔ اُس کی محویت اِس قدر تھی کہ مسٹر عابد کو کئی منٹ تک علم نہ ہو سکا کہ اندر کوئی آیا بھی ہے یا نہیں؟ علم اچانک ہوا اور اُس وقت جب فائل پڑھتے پڑھتے مسٹر عابد جھلا گئے۔ اور "FOOLISH" کہہ کر ریسیور اُٹھایا تو دیکھا میز کے دائیں جانب اُس کا پی۔ اے خاموش کھڑا ہے۔ ایکسچینج کو نمبر دیتے دیتے مسٹر عابد نے پُوچھا۔

"ییس، ہو آر یُو؟ (YES WHOARE YOU)"

"سر آئی ایم احمد۔ یور پی۔ اے۔ (SIR I AM AHMAD, YOUR P.A)"

"ہاں ذرا جلدی بُلایئے۔ وقت برباد نہ کیجئے ——— کہو احمد کیا بات ہے؟"

"جناب لیڈی اسٹینوگرافر . . . . . !"

مسٹر عابد نے جھلا کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیڈی اسٹینوگرافر؟ ——— کیا مطلب؟ ——— کون ہے؟ کیوں آئی ہے؟"

"جناب! فرم کا ایڈورٹائزہوا تھا۔"

"کب؟"

"آج انگریزی اخبارات میں جناب!"

"کیوں؟ کس نے کہا تھا؟ تم ٹرسٹ نمائی کیوں کرتے ہو آخر؟"

"جناب کا حکم تھا۔ کل شام کو جناب نے مجھے تحریری حکم دیا تھا۔"

"جھوٹ ——— بکواس!"

احمد نے فائل پیش کر دی جس میں مسٹر عابد کا لکھا ہوا نوٹ موجود تھا۔ اب مسٹر عابد کو یاد آ گیا۔ سر کھجا کر کہنے لگے۔

"یس، یُو آر رائٹ (YES YOU ARE RIGHT)"

احمد چپ کھڑا رہا۔

"بُلاؤ، جلدی کرو۔ ابھی مجھے سوا گیارہ بجے محکمۂ تجارت کے سکریٹری سے ملنا ہے!"

دوسرے لمحے مس فاخرہ کمرے میں تھی۔ اُس نے عجیب تماشا دیکھا مسٹر عابد کے دونوں ہاتھوں میں ریسیور تھے۔ اور باری باری دونوں سے ایک ہی وقت میں بات کر رہے تھے۔ تیسرا ریسیور گود میں رکھا تھا۔ اشارہ پاتے ہی احمد نے گود والا ریسیور اپنے باس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اور وہ بات کرنے لگے۔ ابھی بات جاری تھی کہ مسٹر عابد نے ریسیور اُلٹ دیئے۔ اور مس فاخرہ پر ایک نظر ڈال کر پُوچھا۔

"یس، یُو آر دی اونلی کنڈیڈیٹ (YES YOU ARE THE ONLY CANDIDATE)"

"یَس سر (YES SIR)"

"ٹیسٹیڈ؟ (TESTED)"

"فائینڈ او کے؟ (FIND O.K)"

"یَس سر۔ (YES SIR)"

"او کے ——— ہاں جناب! میں اپنی شرائط پر بزنس کر سکتا ہوں منظور ہو تو چار بجے سے پہلے مطلع کر دیں۔ ورنہ کل ایسا بھی ناممکن ہوگا۔ میں حُجت اور بکواس کا عادی نہیں ہوں۔"

یہ کہہ کر مسٹر عابد نے ریسیور غصّے سے رکھ دیا۔ اور کھڑے ہو گئے۔ گیارہ بجے تھے۔ وہ باہر جا رہے تھے۔ مس فاخرہ کو اپوائنٹمنٹ لیٹر دے دیا گیا۔ مس فاخرہ پھر بہت ہی مطمئن گئی۔ ڈھائی سو سے اسٹارٹ ہوا تھا۔

دوسرے دن پانچ منٹ پہلے مس فاخرہ دفتر آگئی۔ ٹھیک نو بجے مسٹر عابد ...ے میں داخل ہوئے۔ کوٹ اتار کر فائل کھینچی ہی تھی کہ نظر مس فاخرہ پر پڑی تو سخت ...سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں، یہاں کیسے؟"

یہ کہتے ہوئے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ چپراسی اچک کر اندر آگیا۔ مسٹر عابد نے ...ج کر کہا۔

"احمد کو بلاؤ۔ ابھی فوراً۔"

"یس سر!"

احمد آیا تو مسٹر عابد نے فائل سے نظر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بھئی! میرے کمرے کو ڈرائنگ روم بنا دیا گیا ہے؟"

احمد نے گھبرا کر جواب دیا۔

"نو سر!"

"پھر آپ یہاں کیسے تشریف فرما ہیں؟"

مسٹر عابد نے مس فاخرہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نئی اسٹینوگرافر ہیں جناب!"

"نئی اسٹینوگرافر؟ کب ملازم ہوئی ہیں؟"

"کل!"

"تم نے ملازم رکھا ہے؟"

"نہیں جناب! آپ کے حکم سے تقرری ہوئی ہے!"

"فلش!"

اور اُس وقت مسٹر عابد مطمئن ہوئے جب اپنے دستخط دیکھ لئے۔ پھر فائلوں میں ...ھو گئے۔ پون گھنٹے کے بعد فون کے لئے چونکے تو مس فاخرہ کو خاموش بیٹھے دیکھ کر ...چھا۔

"فاخرہ! تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ کیوں؟"

"جناب کے حکم کی منتظر ہوں!"

"اُف!" مسٹر عابد نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم کام نہیں کر سکتیں۔ ...خوبصورت لڑکیاں کام کرنا نہیں، بلکہ صرف سنگھار کرنا جانتی ہیں۔ اور کراچی کی لڑکیاں خاص طور پر!"

مس فاخرہ زیرِ لب مسکرائی تو مسٹر عابد بپھر گئے۔ اور بولے۔

"ہنسو مت!"

پھر فوراً ہی فون پر باتیں کرنے لگے۔ اچانک رسیور پر ہاتھ رکھتے ہوئے مس فاخرہ سے بولے۔

"چلو ایک خط لکھو!"

مس فاخرہ پنسل اور کاپی لے کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ مسٹر عابد باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور خط بھی لکھواتے جاتے تھے۔ پھر بولے۔

"فوراً ٹائپ کرو!"

مس فاخرہ تیزی سے مشین کے پاس آئی۔ ابھی مشین کو چھوا ہی تھا کہ دوسرا حکم ملا۔

"یہ اسٹیٹمنٹ بھی ابھی ٹائپ کرو فوراً!"

خط ہی نہیں ٹائپ ہو پایا تھا کہ ایک پارٹی خرید و فروخت کی گفتگو کرنے آگئی۔ مسٹر عابد نے کہا۔

"دیکھو مس فاخرہ! ہماری گفتگو کو شارٹ ہینڈ میں لکھنا اور پارٹی کے جاتے ہی گفتگو ٹائپ کرنے کے بعد فائل میز پر پہنچا دو۔ اور ہاں خط ٹائپ ہو گیا؟"

جواب سننے میں ایک منٹ لگتا۔ بھلا مسٹر عابد ایک منٹ کیسے برباد کرتے وہ تو فائل میں ڈوب گئے تھے۔ شام کو جب کمرے سے مس فاخرہ نکلی تو بے انتہا تھکی ہوئی تھی۔ کام تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن مسٹر عابد کے کام لینے کے طریقے نے اُسے تھکا دیا تھا۔ احمد سے زینے کے پاس ملاقات ہو گئی۔ احمد نے ہنس کر پوچھا۔

"کہئے مس فاخرہ! کیسی گزری؟"

"مسٹر عابد کو سمجھنا مشکل ہے!"

احمد ہنسنے لگا۔ اور پوچھا۔

"کیا اکتا گئیں؟"

"نہیں ہار تو نہیں مانوں گی۔ لیکن انھیں سمجھنا ہے بہت مشکل۔ عجیب آدمی ہے۔ آدمی نہیں، مشین ہے مشین!"

آپ مسٹر عابد کو CATCH کر لیں گی تو پھر عیش بھی ملے گا!"

"CATCH کیا میں تو ان کے پر کتر دوں گی۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

احمد نے باہر سڑک پر نکل کر مس فاخرہ کے دعوے کو کسوٹی پر کسا تو معلوم ہوا کہ مس فاخرہ کو اپنے متعلق غلط فہمی ہے۔ اُدھر مس فاخرہ جب بس میں بیٹھ چکی تو وہ سوچ رہی تھی کہ مسٹر عابد کیا پاگل تو نہیں ہیں؟ اور اگر پاگل نہیں ہیں تو کب تک پاگل ہو جائیں گے۔ گھر پہنچی تو سوچنے لگی، مسٹر عابد کی بیوی کا کیا حال ہوگا؟ اُسے مسٹر عابد کی بیوی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ یہ سوچ کر وہ ہنس دی کہ کہیں مسٹر عابد گھر پہنچتے پہنچتے اپنی بیوی کو تو نہیں بھول جاتے ہیں؟ اُن سے تعجب ہی کیا ہے۔ اس قدر مصروف آدمی سے کیا بعید؟

ابھی مس فاخرہ کو کسی طرح ایک ہی مہینہ ہوا تھا۔ مس فاخرہ ٹائپ میں مصروف تھی اس نے گھڑی دیکھی۔ مسٹر عابد آنے والے تھے۔ کہہ گئے تھے کہ ایک بجے آئیں گے۔ ایک بجے اُن کا لنچ شروع ہوتا تھا۔ دو منٹ باقی تھے کہ دروازہ کھلا اور مسٹر عابد تیزی سے اندر آئے۔ گھڑی دیکھی اور بولے۔

"ابھی دو منٹ باقی ہیں۔ دو منٹ میں کافی کام ہو سکتا ہے۔"

مس فاخرہ نے ٹائپ کرتے کرتے مسٹر عابد کو دیکھ لیا۔ وہ بھی مس فاخرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مس فاخرہ مسکرائی اور منھ پھیر لیا۔ دوسرے لمحے مسٹر عابد آدھمکے اور آتے ہی مس فاخرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بولے۔

"ابھی پونے دو منٹ باقی ہیں۔ کیوں نہ وہ کام کر ڈالوں جس کے لئے پچھلے دو ہفتوں سے منتظر ہوں لیکن وقت نہیں ملتا تھا!"

"کون سا کام جناب؟"

"دیکھو مس فاخرہ!" مسٹر عابد اُس پر جھک گئے اور بولے۔ "میں سارے پاکستان میں مصروف ترین، باکار اور باعمل آدمی ہوں۔ میرے پاس قطعی وقت نہیں ہے۔ اس لئے لچھے نہیں کاٹ سکتا..... مختصر گفتگو اور ٹھوس کام کا عادی ہوں... اب ایک منٹ باقی ہے...... ہاں کہنا یہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو..... کیا تم مجھ سے محبت کر سکتی ہو؟"

مس فاخرہ اس عجیب و غریب انداز پر گھبرائی تو بہت۔ لیکن مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ مسٹر عابد نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"شکریہ! تمھیں محبت کرنا منظور ہے..... شاباش! تم بھی وقت کی قدر کرنا سیکھ گئیں۔ چلو میرے ساتھ۔ میں ہوٹل میں لنچ کا انتظام کر چکا ہوں... چاہتا ہوں کہ لنچ کا ایک گھنٹہ اطمینان و سکون کے ساتھ گزاروں۔ آؤ۔"

مسٹر عابد نے مس فاخرہ کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل کر لفٹ کی طرف ہو لئے۔ پھر کار ہوٹل کی طرف ہو لی۔ مس فاخرہ پنجرے کی چڑیا کی طرح دم بخود تھی۔

اُس کے بعد سے اسی طرح کا ڈُوبا اُچھلا، گنڈے دار عشق شروع ہو گیا۔ کبھی تو دس دس دن گزر جاتے اور مسٹر عابد کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ اور کبھی دو تین منٹ ملتے تو محبت کی رفتار آندھی سے بھی زیادہ تیز ہوتی تھی۔ اسی طرح مسٹر عابد کو ایک ماہ بعد دو منٹ اور مل گئے۔ یہ دو منٹ بھی اُنھوں نے مس فاخرہ پر ضائع کر دیئے۔ اُس روز پھر مس فاخرہ کو لنچ پر لے گئے اور کہنے لگے۔

"مس فاخرہ! میری محبت سے بدگمان نہ ہونا۔ میں کراچی کا بے کار اور لفاظ عاشق نہیں ہوں۔ جو اپنی محبوبہ کے لئے قصیدے تو لکھتے ہیں۔ لیکن ایک پیسے کی مونگ پھلی بھی محبوبہ کے لئے خرید نہیں سکتے۔ لیکن میں باکار اور باعمل عاشق ہوں۔ کیا تمھیں مجھ سے محبت ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"شاباش!"

"تمھیں میری محبت کی قدر ہے مس فاخرہ؟"

"بے انتہا!"

"شاباش! تم اچھی لڑکی ہو۔ سمجھدار اور ذہین ہو!"

مسٹر عابد کے کاروباری عشق کا چرچا ہوا۔ احمد کو جب معلوم ہوا تو وہ ہنسنے لگا۔ کیونکہ مسٹر عابد عشق بھی کاروباری لہجے اور عدیم الفرصتی کے دوران میں کرتے تھے۔ جسے یقیناً عشق نہیں کہا جا سکتا تھا۔ انھیں یقین نہیں تھا کہ مس فاخرہ عشق کے مصنوعی لب و لہجے کو برداشت کرتی ہوگی۔ کیونکہ بہرکیف وہ لڑکی تھی۔ اور لڑکیاں عشق کے موڈ اور اس کے انداز سے واقف ہوتی ہیں۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مس فاخرہ اکثر مسٹر عابد کے ساتھ لنچ پر جایا کرتی تھی ــــ!؟

ایک دن شام کو احمد نے مس فاخرہ سے پوچھا۔

"مس فاخرہ! سُنا ہے آپ نے مسٹر عابد کو نہ صرف CATCH کیا ہے بلکہ اُن سے پریم بھی کرتے ہیں؟"

"میرا بھی یہی دعویٰ تھا۔ آپ کو یاد ہے؟"

"آپ نے کمال کر دیا!"

مسٹر عابد کا عشق مصروفیت۔ عدیم الفرصتی۔ بزنس اور فائلوں کے نیچے رینگتا رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر عابد اپنی مصروف زندگی میں مس فاخرہ کی کمی بھی محسوس کرنے لگے۔۔۔!

دفتر میں مس فاخرہ ٹائپ کر رہی تھیں۔ مسٹر عابد حسبِ معمول فائلوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گھڑی ایک بجانے والی تھی۔ اچانک اُنھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو منٹ باقی تھے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تیزی سے مس فاخرہ تک پہنچے اور اُس کے بازو پکڑ کر کرسی سے اُٹھاتے ہوئے بہت بے چینی سے کہا۔

"مس فاخرہ! ۔ ۔ ۔ لنچ میں دو منٹ باقی ہیں۔ ۔ ۔ میں کئی مہینوں سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں کتنا مصروف رہتا ہوں۔ ۔ ۔ میرے پاس وقت کی کمی ہے۔ ۔ ۔ مہینوں سے میں کوشش کر رہا ہوں کہ۔ ۔ ۔ صرف اتنا کہہ سکوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ۔ ۔ لیکن عدیم الفرصتی موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ ۔ ۔ لیکن آج میں نے اپنے قیمتی وقت کے۔ ۔ ۔ دو منٹ اظہارِ محبت کے لئے نکال ہی لئے۔ ۔ ۔ بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کر سکتی ہو مس فاخرہ؟ ۔ ۔ ۔ میرے پاس وقت نہیں۔ ۔ ۔ اسلئے تمہاری محبت کے قصیدے نہیں پڑھ سکتا۔ ۔ ۔ مصروف ترین آدمی ہوں۔ ۔ ۔ لیکن درخواست ہے کہ تم۔ ۔ ۔ میری محبت کو قبول کرو گی۔ ۔ ۔ بولو۔ ۔ ۔ جلدی بولو۔ ۔ ۔ دیکھو نصف منٹ باقی ہے۔ پھر لنچ کا وقفہ آجائے گا۔ ۔ ۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا مس فاخرہ۔ ۔ ۔!"

اور مس فاخرہ نے ہنستے ہوئے دونوں باہیں مسٹر عابد کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! کیا تم اِس ناقابلِ فراموش واقعے کو بھی بھول گئے کہ کل شب ہماری منگنی ہو چکی ہے۔ اور اگلے مہینے ہماری شادی ہو رہی ہے؟"

"اب یاد آگیا!" مسٹر عابد نے ہنستے ہوئے کہا: "ڈارلنگ! میں بہت مصروف انسان ہوں۔ واقعی اگلے ماہ ہماری شادی طے ہے اور کل منگنی بھی ہو چکی ہے ڈارلنگ!!"

سے نے کیا تھا کہ اکالی کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتے ہیں جو ملک کے لئے نقصان دہ نہ ہو؟ بندہ نواز! جب تک ماسٹر تارا سنگھ جی کے دم میں دم ہے اکالیوں کی سرگرمیاں ایسی ہی رہیں گی۔

"ہند سرکار پرتگیزی مظالم کی روک تھام کے لئے خاص کارروائی کرے گی"۔۔۔۔۔۔ وہ تو کریگی لیکن کب؟ ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیرِ ترقیات پنجاب فرماتے ہیں کہ "اکالی بزدل ہیں جو گرفتاری سے بچنے کے لئے گوردواروں میں چھپتے پھرتے ہیں"
جب اور کہیں ٹھکانہ نہ ملے۔ کوئی معقول سکھ انھیں پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہو تو بے چارے گوردگھر میں بھی پناہ نہ لیں؟ آپ اسے بزدلی کہتے ہیں لیکن ماسٹر تارا سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "راج نیتی" ہے۔

برما کے پردھان منتری اُو۔ نُو نے فرمایا کہ "برما کسی صورت میں بھی غیر ملکی قرضہ نہیں لے گا"۔۔۔۔۔۔ کیا امریکہ سے بھی نہیں لوگے؟ نہیں بھائی امریکہ سے ضرور لے لو۔ ورنہ مسٹر ڈلز کی سامراجی سکیم دھری کی دھری رہ جائے گی۔

"شاہجہان پور میں صرّاف لُٹ گیا"۔۔۔۔۔۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے ہندوستان میں تو عام طور پر غریب لوگ ہی لُٹتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے لٹیروں اور ہماری حکومت کی پالیسی اور طریقِ کار میں بہت اختلاف ہے۔

"پرتگیزی پولیس کا بیان ہے کہ گوا کے گورنر جنرل کے محل میں "ٹائم بم" رکھا گیا"۔۔۔۔۔۔ نہتے ستیاگرہیوں پر وحشیانہ حملے کرکے تم لوگوں نے دُنیا بھر کی لعنت طوقِ گلو کرلی ہے۔ اَب دُنیا بھر کی رائے عامّہ کو اپنے خلاف پاکر فدایانِ وطن کو بدنام کرنے کے لئے یہ سٹنٹ کھڑے کر رہے ہو۔ مگر یہ بہت پرانی اور فرسودہ چالیں ہیں۔ گپ ہی ہانکنی تھی تو سیدھی طرح کہہ دیتے کہ کسی نے گورنر جنرل کی نکٹائی سے ہاتھی باندھ دیا۔ اور سالازار کی جیب میں بھُوکی شیرنی ڈال دی۔

بھارت میں دوسرے پنج سالہ پلان کے ماتحت ساٹھ فیصدی بچوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے گا"۔۔۔۔۔۔ اور اس طرح تعلیم یافتہ بے کاروں کی تعداد میں ہولناک اضافہ ہو جائے گا۔ کاش کوئی اِن پلان بازوں کو سمجھا سکے کہ یک طرفہ منصوبہ بندی ایک سٹنٹ کی صورت میں آپ کے کام آسکے تو آجائے مگر قوم کو تباہ کر دے گی۔

پرتگیزیوں نے دھمکی دی ہے کہ "اگر ہمیں دمن کو چھوڑنا پڑا تو جاتے جاتے اسے جلا کر خاک کر دیں گے"۔۔۔۔۔۔ جی ہاں! آپ سے اِس بربریت کی ہمیں بھی توقع ہے۔ کم سے کم آپ کوشش ضرور کریں گے لیکن اگر دوسری طرف سے پولیس ایکشن ہو گیا تو دمن اور گوا دونوں کے دونوں جوں کے توں موجود رہیں گے۔ اور آپ ختم ہو جائیں گے۔ اور آپ کے ساتھ ہی وہ سالازار بھی۔

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں۔ اور ایڈیٹر کی اطلاع کیلئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیجدیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کردیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھدیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔

غزل

از

جناب ام پرکاش ساحر ہوشیارپوری ایم۔اے

ستم میں کرم ناگہاں مل گیا | کسی خوش نظر کا نشاں مل گیا
ہمیں دیر و کعبے سے کیا واسطہ | جبیں کو ترا آستاں مل گیا
غمِ دو جہاں سے اماں مل گئی | جو تیرا غمِ جاوداں مل گیا
ہمیں بھی تو خاطر میں لاتا نہیں | یہ دل کو ٹھکانا کہاں مل گیا
وہیں جھک گئی ہے جبینِ خلوص | محبت کا بندہ جہاں مل گیا
نپٹ لیں گے تجھ سے بھی صیاد ہم | چمن میں اگر آشیاں مل گیا
نکلنا پڑا مے کدے سے ہمیں | یہ کم بخت زاہد کہاں مل گیا
وہ ظالم جو سنتا نہ تھا بات بھی | وہی ہو کے خود مہرباں مل گیا
دھرا رہ گیا زہد و تقویٰ وہیں | وہ ایماں کا دشمن جہاں مل گیا

یہ سب حضرتِ جوش[1] کا فیض ہے
جو ساحر کو سحرِ بیاں مل گیا

[1] ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی

نیا محلہ پل بنگش دہلی
۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۵۶ء

برادرِ محترم خوشتر صاحب اخلوص و نیاز
آپ نے "تر" غزل کی فرمائش کی ہے میں ایک ایسی غزل بھیج رہا ہوں "جو تر بھی ہے اور تازہ بھی"۔ اُمید کہ آپ پسند فرمائیں گے ——— آپ . . . سے پریشان ہیں اور ہم لوگ حکومتِ دہلی کے اس جورِ ناروا کے شکوہ سرا ہیں جس نے میخانوں کو مقفل کر کے زندگی کی رنگینیوں کو ختم کر دیا۔ اب وہ ہنگامے، وہ شعر و نغمہ کی محفلیں کہاں ! خدا آپ کو "گھری بدر" کرے اور ہمیں "میخانہ بکنار" تو پھر "مرغ و ماہی و مے" کی دعوتوں کا لطف آئے ——— اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز مند
ساحر ہوشیارپوری

4158 (Urdu)

افسانہ

ایک ستارہ تنہا لرزاں

از

جناب ظفر عالمگیر

۲/۲۷۲ مارٹن کوارٹرس کراچی ۔ مغربی پاک

میرے حضور!

سالنامے کے لئے آپ کا ادبی نام اور افسانہ حاضر ہے۔ بہت دنوں پہلے کی بات ہے پروفیسر فاروقی ایم۔اے کی کلاس کو لیکچر دے رہے تھے۔ جہاں طالب علم اور بقول آپ کے حضرت ظفر عالمگیر بیٹھے حسب روایت افسانے کا پلاٹ سوچ رہے تھے۔ جب بھی آپ نے فرمائش کی میں نے اس پلاٹ کو لکھ بھیجنا چاہا لیکن نہ بھیج سکا۔ اور آج عرصے کے بعد لکھ ڈالا ہے اور بھیج رہا ہوں بہت ہمت کا کام ہوتا ہے۔ لوگ تو افسانہ نگاری کو گڑیوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ بہت ساری باتیں لکھنی ہیں۔ لیکن کیسے لکھوں؟ آپ یہ خط چھاپ دیں گے۔ ہماری باتیں دُنیا والے جان لیں گے اور پھر نئے تجزیہ کرنے بیٹھ جائیں گے۔ ایک بات ضرور عرض کروں گا مجھے پڑھنے والوں کی جانب سے خط نہیں، خطوط کے انبار وصول ہوتے ہیں۔ بے چاری سلمیٰ اس ڈاک سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اور میں اُن خطوط کی باتوں سے۔ کوئی زندگی کے حالات مانگتا ہے۔ کوئی فوٹو کا تقاضا کرتا ہے۔ کوئی ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے، کوئی صرف جواب چاہتا ہے۔ بعض وقت تو بڑا مزہ آتا ہے، دو چار قارئین مل کر افسانے پر بحث کر بیٹھتے ہیں، اور جج افسانہ نگار کو بناتے ہیں۔ غریب افسانہ بھی لکھے اور جج بھی بنے! آپ کو یاد ہوگا عربستان کی ریاست کویت سے آپ کے توسط سے مجھے ایک خط ملا تھا۔ اُس میں ایسی ہی بحث تھی۔ جواب میں نے براہ راست اُن قارئین کو بھیج دیا تھا۔ لیکن سوچئے کہاں عربستان اور کہاں ہندوستان۔ اُن دنوں تو میں حیدرآباد دکن میں تھا۔ ہند و پاک کے علاوہ مجھے خطوط عرب وغیرہ ممالک سے بھی ملے ہیں۔ اُن خطوط کو دیکھ کر ایک طرف تو میں آپ کے رسالے کی ہر دلعزیزی اور کثیر الاشاعت کا قائل ہو گیا تو دوسری طرف یہ احساس مجھے ہمیشہ کھٹکا کہ قارئین صرف افسانہ پڑھ کر مطمئن نہیں ہوتے۔ اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں کے متعلق وہ اور بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے خط لکھتے ہیں۔ لیکن اُن خطوط کا کہاں تک جواب دیا جائے؟ اکثر قارئین کو شکایت [illegible] ایک رسالے کے ذریعے شکریہ ادا کر دیتے ہیں۔ میں تو بہر حال جواب جلد دیتا ہوں۔ اور ہر خط کا جواب [illegible] کسی بنا پر ممکن نہیں کہ سارے خطوط کا جواب دے۔ اتنا فاضل وقت، اور لتنے فاضل [illegible] غور فرمائیں۔ خورشید بھائی! آپ بھی غور فرمائیں۔ "بیسویں صدی" کے لکھنے [illegible] کے ایک دو صفحے مخصوص کر دیں۔ اِس سے قارئین بھی خوش ہوں گے [illegible] "بیسویں صدی" کے لکھنے والوں کا ہے۔ اِس طرح قریب ہونے کا جو

[illegible] —— افسانے کی [illegible] —— [illegible]

[illegible] اور [illegible] کوئی چیز آپ کے [illegible]

[illegible] حضرت مولانا عبد [illegible] آپ کے [illegible]

اظہار تشکر —— بے معنی چیز ہے۔ اس سے کچھ [illegible]

عفت جھنجلائی۔ جیسے اُس کی آپی اور باجی نے اُس کی اُتھلی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔

"خدا کے لئے ایسی باتوں سے میرا دل نہ دُکھایا کرو آپی!"

وہ کہتے ہوئے اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بنگلے کی دوسری منزل پہ کچھ دیر وہ دیوار پر لگی ہوئی جمیل کی تصویر کو تکتی رہی۔

"پروردگار اِن کی جان کیا تیری دھرتی پر بوجھ تھی؟ یہ زندہ رہتے تو کیا زمین اُلٹ جاتی؟ کیا ہو جاتا جو تُو نے اِن کی جان لی؟"

اُس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ تصویر مسکرا رہی تھی۔

"میرے آنسو دیکھ کر مسکراتے ہو۔ بہت سنگدل ہو گئے ہو" اُس نے دھیرے سے کہا۔ اور دریچہ کھولا۔ دو منزلے سے رات کی تاریکی میں جھلملاتی ہوئی دُنیا پہ ایک نظر ڈالی۔ دُور تک سڑک کی دونوں جانب خاموش کھڑے ہوئے بنگلوں میں روشنیاں بہت دلفریب نظر آ رہی تھیں۔ دُور، بہت دُور اُفق پہ چاند نظر آ رہا تھا۔ جیسے دُنیا کے کنارے کھڑا دُنیا کا نظارہ کر رہا ہو۔

"کیا کر رہی ہو عفت؟"

دونوں بہنیں آ دھمکیں۔ اور اُس کے بستر پر بیٹھ گئیں۔ وہ پلٹ کر دریچے کے سہارے کھڑی ہو گئی۔

"عفت! تم انکار کیوں کرتی ہو؟" اُس کی آپی نے کہا۔

"آپی! آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں" عفت نے رُوکھا سا جواب دیا۔

"عفت! ہم تمھاری بھلائی کے لئے کہتے ہیں" اُس کی باجی نے سمجھانا چاہا۔

"باجی آپ بھی آپی کی کاربن کاپی ہیں۔ جو اُن کے دل کی بات ہوتی ہے، وہی آپ کی زبان پہ ہوتا ہے!"

"وہ بہت اچھا رشتہ ہے عفت" آپی نے [illegible] کی طرف [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

"اُن کے گھر [illegible] اچھا ہے تو آپ [illegible]"

عفت کا دل [illegible] گئے [illegible] رہی [illegible]

وہ بل کھاتی اور جھنجلاتی رہی۔ آخر اُس سے [illegible]

"ایسے آپ لوگ مجھے [illegible]" دونوں بہنیں چُپکی ہو رہیں اور کچھ دیر بعد اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سو جاؤ عفت! رات ہو چکی ہے" آپی نے کہا۔

"آپ کی نیند کی رات!"

عفت کے لہجے میں زہر تھا۔

بہنیں چلی گئیں۔ عفت نے [illegible] پر نظر ڈالی [illegible] مرحوم شوہر کی بہت بڑی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اُس نے [illegible] تصویر کو دیکھا اور ہونٹوں پہ ایک سرد آہ پھیل گئی۔ [illegible] چاہا کہ اِس تصویر کو نکال دیں۔ تاکہ جمیل کے نقوش عفت کے ذہن سے دھیرے دھیرے مٹ جائیں۔ لیکن عفت کے اصرار اور احتجاج نے انھیں بے بس [illegible] تھا۔ ایک عفت کی غیر موجودگی میں وہ تصویر [illegible] عفت سارا گھر [illegible] سر پہ [illegible] ایسا [illegible] کر اُٹھا [illegible] سمجھایا کہ آخر تصویر [illegible] پایا۔ جمیل زندگی کی ایک اتفاقی حادثے کی [illegible]

کے جرگل ضرور تھی کیا ... بہنوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تایا، کہ ایک ... دوبارہ شادی کرے

لیکن یا اُسکی باجی پوچھتیں

"آخر اکیلی کیا ... جمیل ہی جو اُس پر ناصر تھی ہو"

"آپ کیوں بار بار ... بھائی ہو؟ بالکل ... ہیں گن سکتے ہیں" عفت نے بہت تلخ جواب دیا تھا۔

ایک بار دونوں بہنوں نے سازش کی اور دھمکی دی کہ وہ اُن کی بات نہ مانے گی تو وہ اُن کے ساتھ نہ رہیگی۔ جمیل کے انتقال کے بعد دونوں بہنیں اُسکے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ باپ نے اپنی ساری پونجی ان لڑکیوں پر شادی میں اور تینوں کو جہیز میں ایک ایک بنگلہ دیا تھا۔ جمیل کے انتقال کے بعد عفت اکیلی ہو گئی۔ اور اپنی بہنوں کو مجبور کرنے لگی کہ وہ اُس کے پاس آ رہیں۔ اُسے وہ بنگلہ بھی چھوڑنا گوارا نہ تھا جس میں اُس نے جمیل کے ساتھ اپنی زندگی کے تین مہینے بسر کئے تھے۔ اُس کی دونوں بہنیں اُس کے پڑوس میں تھیں اور اُسے مجبور کر رہی تھیں کہ وہ اُن کے ہاں چلی جائے۔ لیکن عفت نہ مانی۔ اور دونوں بہنیں اس شرط پر اُس کے ساتھ رہنے لگیں کہ وہ اُسے کلب لے جایا کریں گی۔ اور عفت نے منظور کر لیا۔ لیکن جب اُنھوں نے دھمکی دی کہ وہ چلی جائیں گی۔ تو عفت بہت سٹپٹائی۔ دو تین دن تک وہ پریشان رہی۔ اور اُس کی بہنیں چپکی رہیں۔ وہ اُسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

"آپ لوگ چلی جائیں! اگر جانا ہی ہے"

اُس نے تیسرے دن جواب دے دیا۔

"اور تم؟" باجی نے پوچھا۔

"اکیلے۔ کیا زندگی بسر نہیں ہوتی؟ آپ کے ساتھ میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دن رات اپنے گھر ہی میں تو رہتے تھے"

عفت نے انتہائی بے بسی کے انداز سے کہا۔ اُس کے چہرے کی اُداسی اُس کے لہجے کی ... اُس کی آواز کی ... نے دونوں بہنوں کو مجبور کر دیا کہ ہتھیار ڈال دیں۔

دونوں اکثر سوچتی تھیں کہ شادی کے تین ہی مہینے بعد عفت کی مانگ ... اُجڑ گئی۔ اُس کے دل کی کوئی آرزو بر نہ آئی۔ اُس کے ہر خواب کی تعبیر جمیل کی لاش کے ساتھ دفن ہو گئی۔ وہ سوچتی تھیں عفت ابھی ... سے زیادہ حسین ہے۔ نوجوان ہے۔ اتنی ساری جائداد اُس کے نام ہے۔ اُسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ لیکن عفت مصر تھی کہ وہ دوبارہ شادی نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں کرے گی۔ اور اب بھی اُس کا وہی اصرار تھا۔

بہنیں اُسے اکیلی چھوڑ کر چلی گئیں۔ لیکن عفت کو نیند نہ آئی۔ اُس کی نیند اُڑ چکی تھی۔ وہ دریچے کے سامنے کھڑی تصویر کو تکتے تکتے وہ تھک گئی۔ گیٹ کھلنے کی آواز پر وہ چونکی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کی باجی کے شوہر کا چھوٹا بھائی سراج تھا۔ جو ابھی ایم اے کا طالب علم تھا۔ وہ کہیں جا رہا تھا۔ شاید یونہی گھومنے کے لئے

کچھ دیر تک کھڑی دریچے سے وہ دنیا کا نظارہ کرتی رہی۔ چاند کافی اُبھر چکا تھا۔ چاندنی شباب پر تھی۔ وہ اس سحر ناک نظارے کی تاب نہ لا سکی۔ اُس نے ٹھنڈی سی سانس لی۔ اور دور تک دوڑتی ہوئی سڑک پر نگاہ ڈالی۔ چاند کا نور سڑک کو جگمگا رہا تھا۔ دو سائے رینگتے نظر آ رہے تھے۔ اُڑتا ہوا آنچل پتہ دے رہا تھا کہ وہ کون تھے۔ بھرے ہوئے دل سے وہ اُن سایوں کو تکتی رہی۔ آخر نظر تھک گئی۔ سائے بھی بالکل دھندلے ہو گئے۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں چاندنی کرنوں کا سہارا پا کر ذہن ماضی کے مرغزاروں کی طرف دوڑ گیا۔

——— ان چاندنی راتوں میں وہ کبھی جمیل کے ساتھ گھوما کرتی تھی دونوں آدھی آدھی رات کو باتیں کرتے، ہنستے، جھومتے، جھگڑتے اس سڑک پر دور دور تک نکل جایا کرتے تھے۔ ایک رات ہوا تیز تھی اور عفت کا آنچل بُری طرح اُڑا جا رہا تھا۔ جمیل نے ہاتھ بڑھا کر آنچل کھینچ لیا تھا۔ وہ کتنی پریشان ہو گئی تھی۔

"رہنے بھی دیجئے۔ کوئی دیکھے گا تو آوارہ کہے گا۔"

"اب ایسے میں اوڑھ لوں گا!"

"تو کہاں اوڑھئیے گا آپ کے کس کام کا؟"

"کب تک دوپٹہ سنبھالے چلوں گی۔ کچھ دیر میں بھی کر دوں"

"رہنے دیجئے۔ ایسا اچھا نہیں لگتا"

"ہم کو اچھا لگتا ہے"

"مجھے پتا نہیں لگتا۔"

"ابھی لگتا ہو جائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے [illegible]۔"

دونوں جھگڑتے ہوئے نکل گئے۔ یکایک سڑک پر ایک کار نمودار ہوئی اور جمیل نے فوراً اسے عفت کے حوالے کر دیا۔

ایسی ہی ایک چاندنی رات کو لان پر بیٹھے بیٹھے جمیل نے کہا تھا۔

"اللہ نے ایک چیز بہت پیاری بنائی ہے۔"

"اور اس کا نام جمیل رکھا ہے۔" عفت نے فوراً کہہ دیا۔

"جی نہیں، اس کا نام جمیل نہیں۔"

"تو پھر میں بتاؤں، عفت ہے۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر وہ چیز اللہ میاں نے ابھی بنائی نہیں۔" عفت نے چپکے سے

"اسے چاند کہتے ہیں۔" جمیل نے کہا۔

"اونہہ چاند میں کیا رکھا ہے ویرانوں کے سوا۔"

"یہ ویرانے ہماری دنیا سے تو اچھے ہیں۔"

"تو جائیے ان ویرانوں میں بس جائیے۔"

"کتنی رعنائی ہے ان ویرانوں میں، کتنے پیارے لگتے ہیں یہ، تم سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔"

"تو جائیے نا، وہیں جا کر رہ جائیے۔ کون روکتا ہے۔ ہم تو چلے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے عفت! سنو تو سہی۔"

"اب ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔"

"ارے بابا دور کے ڈھول سہانے۔ کون جانے ان چاند تاروں کا جغرافیہ۔"

"بس بات بدل دی ایک منٹ میں۔ ایسے ہیں!" ـــــ وہ جمیل کے برابر جا بیٹھی۔

"کیسے ہیں؟"

"یہ کیا بات کہے ہیں؟"

"آخر بتاؤ تو سہی کتنے ہیں [illegible]۔"

"بہت سے ہیں!"

"کیا بات ہے صاحب [illegible] پیشوں سے محبت ہے ڈھنگ ہے۔"

"مگر ایک غلطی ہو تو بتاؤں، ہر چیز خراب [illegible]۔"

"اچھا تو دوستی ختم۔ کل اپنا [illegible] لینا۔"

"میرے لینا، میرے لینا، اور آ گیا ہے [illegible] کی دکان کھول لوں گی۔"

"اور میں خریدنے آیا کروں گا۔"

کتنی بے معنی باتیں تھیں وہ۔ لیکن کتنی پیاری۔ عفت کا جی چاہتا تھا، ساری زندگی ایک چاندنی رات بن جائے۔ اور ایسی ہی پیاری باتیں کرتے گزر جائے۔

عفت دریچے میں کھڑی ماضی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چار سال پہلے دونوں پہلی بار ملے تھے۔ عفت اسی بنگلے میں اپنے مرحوم باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دوسری منزل پر اپنے کمرے کے دریچے سے عفت نے بستی پر نگاہ ڈالی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سڑک پر کوئی نہ تھا۔ اور جنگل [illegible] کی طرح سنسان پڑی تھی۔ اس کی نظر قریب ہی ایک بنگلے پر اٹک گئی۔ جس کی دیوار کا سہارا لیے کوئی کھڑا بھیگ رہا تھا۔ پہلی نظر تو اڑتی ہوئی نکل گئی۔ لیکن عفت ٹھٹکی۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اچھا سا بیگ تھا۔ [illegible] تعمیر کچھ ایسی تھی کہ پانی سے بچنے کا کوئی آسرا نہ تھا۔ عفت نے ملازم کو کہہ دیا کہ اسے بلا لائے۔ باہر کے کمرے میں وہ [illegible] تھا۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اور [illegible] گیا۔ عفت کچھ دیر [illegible] میں پہنچی۔ اب بھی وہ دیوار سے لگا کھڑا بھیگ رہا تھا۔ [illegible] اور کوئی آرام سے بنگلے میں رہے یہ کہاں کی [illegible] ہے۔ عفت نے سوچا۔ اور اسے بلانا چاہا۔ لیکن وہ اس کی طرف [illegible] وہ

تھا اور وہ اب یونہی ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سوچا کہ پانی کا شور اتنا زیادہ اگر نہ ہوتا تو شاید وہ سن ہی نہ سکتا۔

کئی منٹ گزرے۔ اور وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ آخر نظریں ملیں اور عفت نے اُسے بلایا۔

وہ کھڑا ہی رہا۔ اور وہ بار بار ہاتھ ہلاتی رہی۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا بجلی اور وہ گیٹ پر پہنچی۔ اور جمیل اُسے دیکھ کر فوراً چلا آیا۔

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ وہاں کیوں بھیگ رہے تھے؟" عفت نے کہا۔ لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُسے اندر لے گئی۔ اور اُس نے بھیگا ہوا کوٹ اُتارا۔

"آپ کا فرش خراب ہو جائے گا۔"

جمیل نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کیجئے۔ آپ کپڑے کیسے بدلیں گے؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"بھیگے کپڑے پہننا ٹھیک نہیں۔ میرا کوئی بھائی بھی نہیں جس کے کپڑے آپ پہن سکیں۔" وہ پریشان تھی۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

"چائے تو پئیں گے نا؟"

وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

جمیل نے سلیقے سے آراستہ کئے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا ہی تھا کہ ایک بزرگ آدمی آ گئے۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو بیٹھو بیٹھو! تم بہت بھیگ گئے ہو، کہاں رہتے ہو؟"

"اسی بستی میں۔ مکان ذرا فاصلے پر ہے۔"

"آپ کے والد ہوں گے نا؟"

"جی ہاں، فضل الرحمٰن صاحب چیف جسٹس۔"

"تو آپ اُن کے صاحبزادے ہیں؟ میں اُنھیں جانتا ہوں۔"

"بارش نے روک دیا تھا مجھے۔"

"میری بچی نے دیکھ لیا آپ کو۔ اس سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"پہلے نوکر کو بھیجا۔ میں نہ آیا تو خود آ گئیں۔"

"بڑی عجیب لڑکی ہے صاحب۔ بہت نرم دل ہے اس کا۔" باپ نے کہا۔ اور عفت آئی۔

"ابا! وضو کے لئے پانی نکال دیا گیا ہے۔"

"اچھا بیٹے بیٹھو آرام سے۔ پانی رک جائے تو چلے جانا۔ بیٹی عفت! چائے کا انتظام کرو۔"

"چائے بن رہی ہے ابا!"

عفت نے کہا اور ابا چلے گئے۔

"آپ سنا ہے کہ بہت نرم دل کی ہیں؟"

"تو کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"ارادہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"یہ بیگ آپ کا ہے؟"

"جی ہاں!"

"آپ کسی کمپنی کے ایجنٹ تو نہیں؟ ایسا بیگ تو ایجنٹ ہی لئے پھرتے ہیں۔"

"ایجنٹ ہوتا تو بہتر تھا۔ میں فی الحال بیکار ہوں۔"

"کہاں تک پڑھا ہے آپ نے؟"

"آٹھویں جماعت تک!"

"بس آٹھویں تک؟"

"جی ہاں! کیا آپ نے اتنا بھی نہ پڑھا؟"

"میں بی اے کر رہی ہوں جناب!"

"یعنی؟ بی اے کیا ہے جو آپ کر رہی ہیں؟"

"ارے آپ کو کچھ پتہ نہیں؟ یہ سوٹ کیسے پہن لیا آپ نے؟"

"یہ تو بازار سے سیکنڈ ہینڈ خریدا تھا۔ یہ بیگ صاحب کا ہے۔ لے جا رہا تھا کہ بارش ہو گئی۔" جمیل نے کہا۔ اور بہت معنی خیز نظروں سے عفت نے اُسے دیکھا۔

آپ کے نئے سکے



یکم اپریل ۱۹۵۷ء سے

خرید و فروخت کے لئے دونوں ہی سکے یعنی نئے اور پرانے ٹھیک ہونگے۔ کوئی شخص ان میں سے کسی میں بھی ادائیگی لینے سے انکار نہیں کر سکتا۔

آپ کو سکوں کے تبادلہ کے نقشہ میں دیئے گئے متبادل سکوں سے زیادہ کی نہ تو مانگ کرنی چاہئے اور نہ ہی زیادہ ادائیگی کرنی چاہئے۔

آپ موجودہ سکوں یا نئے سکوں یا دونوں سکوں کو ملا کر جیسے بھی آپ کے پاس ہوں میں ادائیگی کر سکتے ہیں۔

- سکوں کے تبادلہ کے نقشہ کو رقم کی ٹھیک ادائیگی کے وقت ہی استعمال میں لایئے۔
- ٹھیک ٹھیک گنتی کے مقاصد کے لئے ۱۰۰ نئے پیسوں کو ایک روپیہ یا ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیوں کے برابر ہی حساب لگائیں۔
- حساب کی سہولت کے لئے اکائیوں کو پورا کرنے کی کارروائی جیسا کہ اس نقشہ میں کی گئی ہے ٹھیک اس وقت ہی عمل میں لائی جائے جبکہ آپ کو رقم کی ادائیگی کرنا ہی مقصود ہو۔ جبکہ نصف نیا پیسہ اور اس سے کم کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور اس سے زیادہ کو پورا ایک پیسہ شمار کر لیا جائے گا۔

آسانی سے یاد رکھنے کے قابل

۱	روپیہ	۱۰۰	نئے	پیسے
۸	آنے	۵۰	نئے	پیسے
۴	آنے	۲۵	نئے	پیسے
۳	آنے	۱۹	نئے	پیسے
۲	آنے	۱۲	نئے	پیسے
۱	آنہ	۶	نئے	پیسے
½	آنہ	۳	نئے	پیسے



سکوں کے تبادلہ کا نقشہ

(ایک روپیہ کی ادائیگی کے لیے برابر کے سکے)

آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے	آنے	پائیاں	نئے پیسے
۰	۳	۲	۴	۳	۲۷	۸	۳	۵۲	۱۲	۳	۷۷
۰	۶	۳	۴	۶	۲۸	۸	۶	۵۳	۱۲	۶	۷۸
۰	۹	۵	۴	۹	۳۰	۸	۹	۵۵	۱۲	۹	۸۰
۱	۰	۶	۵	۰	۳۱	۹	۰	۵۶	۱۳	۰	۸۱
۱	۳	۸	۵	۳	۳۳	۹	۳	۵۸	۱۳	۳	۸۳
۱	۶	۹	۵	۶	۳۴	۹	۶	۵۹	۱۳	۶	۸۴
۱	۹	۱۱	۵	۹	۳۶	۹	۹	۶۱	۱۳	۹	۸۶
۲	۰	۱۲	۶	۰	۳۷	۱۰	۰	۶۲	۱۴	۰	۸۷
۲	۳	۱۴	۶	۳	۳۹	۱۰	۳	۶۴	۱۴	۳	۸۹
۲	۶	۱۶	۶	۶	۴۱	۱۰	۶	۶۶	۱۴	۶	۹۱
۲	۹	۱۷	۶	۹	۴۲	۱۰	۹	۶۷	۱۴	۹	۹۲
۳	۰	۱۹	۷	۰	۴۴	۱۱	۰	۶۹	۱۵	۰	۹۴
۳	۳	۲۰	۷	۳	۴۵	۱۱	۳	۷۰	۱۵	۳	۹۵
۳	۶	۲۲	۷	۶	۴۷	۱۱	۶	۷۲	۱۵	۶	۹۷
۳	۹	۲۳	۷	۹	۴۸	۱۱	۹	۷۳	۱۵	۹	۹۸
۴	۰	۲۵	۸	۰	۵۰	۱۲	۰	۷۵	۱۶	۰	۱۰۰

اس کو سنبھال کے رکھئے۔ آپ کو اس کی ضرورت پڑیگی

"لیکن ـــــ"

عفت کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔

"لیکن کیا؟"

"آپ کا نام؟"

"جمیل الرحمن!"

اُس نے کہا۔

عفت نے بیگ پر لگا ہوا کارڈ پڑھا ـــــ "جمیل الرحمن ایم۔ اے لیکچرار گورنمنٹ کالج۔"

"آپ واقعی آسٹوریکنگ پڑھے ہوئے ہیں!"

"جی ہاں!"

"کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ چائے پی۔ اور بارش تھمتے ہی جمیل چلا گیا۔

وہ چلا تو گیا لیکن عفت دیر تک بیٹھی اُس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ بعد میں اُسے بھی اُس کا تذکرہ چھیڑا۔ کہ وہ چیف جسٹس فضل الرحمن کا لڑکا ہے۔ اور عفت کو فوراً خیال آیا کہ اُن کی ایک لڑکی اُس کے کالج میں بھی پڑھتی ہے۔ شام کو وہ دریچے میں کھڑی بہت دیر تک سڑک کو تکتی رہی۔ جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

دوسرے دن انٹرول میں وہ اپنے کالج سے گورنمنٹ کالج گئی۔ ایک غیبی طاقت نے اُسے مجبور کر دیا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ جمیل سے ملے۔ گورنمنٹ کالج وہ کئی بار جا چکی تھی۔ کالج اُس کے لئے نیا نہ تھا۔ وہاں اِدھر اُدھر گھوم کر وہ چلی گئی۔ اُس کی نظریں جمیل کو تلاش کرتی رہیں۔ لیکن اُس نے کسی سے پوچھنے کی جرأت نہ کی۔

دوسرے دن وہ کسی کتاب کی تلاش میں یونیورسٹی لائبریری پہنچی۔ وہاں اُسے جمیل مل گیا۔

"آپ کدھر لیکچرار صاحب؟ ـــــ" اُس نے کہا۔ اگرچہ وہ کسی قدر گھبرا گئی تھی۔

"کتابیں واپس کرنے آگیا تھا۔ کل لندن جا رہا ہوں۔"

"لندن جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں کل رات جا رہا ہوں!" اُس نے کہا۔

اور وہ سوچتی رہ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

جمیل نے اُسے پکارا۔

"کچھ نہیں ـــــ وہ پریشان ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔"

آخر جمیل چلا گیا۔ اُسے بہت سے کام تھے۔ عفت اُداس ہو گئی۔ جب وہ اپنے گھر پہنچی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ بے چین ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی چیز پا کر اُس نے کھو دی ہو یا کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔

دوسرے دن شام کو اُس نے ڈرائیور کو پانچ روپے دے کر کہا۔ "دیکھو آج رات بارہ بجے چپکے سے گاڑی نکالنا۔ ایئرپورٹ چلنا ہے۔ ہاں ابا سے نہ کہنا۔" ڈرائیور سے اُس نے ایسی فرمائش کبھی نہ کی تھی۔ اور کبھی رات کو وہ کہیں گئی تھی۔ لیکن ڈرائیور رضامند ہو گیا۔

آدھی رات کے اندھیرے اور سناٹے میں وہ ایئرپورٹ پر کھڑی جمیل کا انتظار کر رہی تھی۔

دس بارہ منٹ میں کئی کاریں آ رکیں۔ جمیل کے ساتھ اُس کے اپنے سارے عزیز اور دوست تھے۔ عفت کی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ جمیل سے مل سکے۔ پھولوں کا ہار اب بھی اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے اپنی کار کا ہارن بجا دیا ـــــ ایک بار ـــــ دوسری بار ـــــ تیسری بار ـــــ تیسری بار جمیل نے اُسے دیکھا۔ اور دیکھتا رہ گیا۔ پاس کا سب پہلے پھولوں کا ہار لئے کھڑا تھا۔ سب کی نظر بچا کر کچھ دیر بعد وہ اُس کے پاس آیا۔

عفت پھوٹ پڑی۔

"پھر آپ کب آئیں گے؟"

جمیل کو یقین ہو گیا کہ عفت اُس کی ہو چکی ہے۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے لے کر عفت ہی کو پہنا دیا۔

"آپ نہیں پہن جائیں گے؟"

"میں پہن جاؤں گا تو سب پوچھیں گے۔"

افسانہ

سالگرہ

از

جناب شوکت تھانوی

مجھے ذاتی طور پر سالگرہ سے شدید اختلاف ہے۔ خواہ وہ اپنی سالگرہ ہو یا کسی اور کی۔ اپنی سالگرہ سے اس لئے گھبراتا ہوں کہ مجھکو یہ معلوم کرنے کا کبھی شوق نہیں ہوا کہ زندگی کتنی ختم ہو چکی اور کتنی باقی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے نزدیک جینے کا مزہ کچھ علی الحساب جینے میں ہے۔ یہ نہیں کہ ہر سال بیٹھے حساب لگا رہے ہیں کہ لیجئے زندگی کا ایک سال اور کم ہوا اور موت ایک سال اور قریب آگئی۔ رہ گئی دوسروں کی سالگرہ۔ اس کا میں اس لئے مخالف ہوں کہ نام تو ہوتا ہے پارٹی میں جانے کا اور دینا پڑتا ہے وہاں تحفہ۔ پھر تحفے کے سلسلے میں بھی خیال یہ رکھنا پڑتا ہے کہ اپنا تحفہ ایسا بھی حقیر نہ ہو کہ دوسروں کے تحفے دیکھ کر خودکشی کو جی چاہنے لگے۔ ممکن ہے اور کسی کو یہ اتفاق پیش نہ آیا ہو مگر میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ یہ صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔ بلکہ مجھ کو تو پیش آ ہی گئی تھی۔ وہ تو کہئے کہ میں نے خودکشی کو خود ہی ٹال دیا۔ ورنہ بہت سے شاعر دوستوں کو سال ۱۹۵۱ء نکالنے کے لئے نہ جانے کس طرح تاریخِ وفات کہنا پڑتی۔

ہوا یہ کہ ایک عزیز کے بچے کی سالگرہ تھی اور میں اُس میں شرکت کے لئے تحفہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ ایک اور دوست مل گئے۔ جو حال ہی میں ولایت سے واپس آئے تھے۔ اور اب جو میں نے اُن سے تحفے کے انتخاب میں مدد چاہی تو وہ بڑے تجربہ کارانہ انداز میں بولے کہ بھئی تم لوگوں نے بھی اس تحفے کے قصے کو اچھی خاصی مصیبت بنا دیا ہے۔ میں نے تو اپنے قیامِ انگلستان میں ہمیشہ یہی دیکھا کہ اس سلسلے میں قطعاً تکلف نہیں برتا جاتا۔ برائے نام سی کوئی چیز خریدی اور دے دی۔ تحفہ قیمت کے اعتبار سے جانچنا ایک گنوارپن ہے مقصد تو اظہارِ خلوص سے ہے۔ چنانچہ وہاں تو بڑے بڑے لوگ یہ کرتے ہیں کہ جوتے کی ڈوری تک تحفے میں دے دیتے ہیں۔ خود میں نے ایک بہت بڑے لارڈ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے لارڈ کے بچے کی سالگرہ میں صابن کی ایک ٹکیہ لے کر گیا تھا۔ اور اُس پر لکھ دیا تھا کہ "برخوردار اِس سے بُلبلے بنانا! میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔۔۔

" واہ وا ۔ یہ تو اُس عالی دماغ لارڈ نے گویا شعر کہہ دیا۔ اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لاکھ سالگرہ مناؤ مگر ع

آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا"

چنانچہ نقالی ہی میں نے بھی صابن کی ایک ٹکیہ خرید کر اُس پر یہی عبارت لکھ دی کہ۔۔۔

"برخوردار اِس سے بُلبُلے بنانا۔"

مگر اب جو میں پارٹی میں پہنچا ہوں تو تحفوں کی میز عین وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ اور اُس پر عجیب عجیب تحفے قرینے سے رکھے ہوئے تھے کیمرہ، چھوٹا سا ریڈیو سیٹ، تین پہیوں کی سائیکل۔ چابی کا قیمتی موٹر، کرکٹ کا پورا سیٹ، اور تو اور سب سے زیادہ دھوم جس تحفے کی تھی وہ تھا ایک بے بی کار، جس پر وہ برخوردار بیٹھے نہایت شوق سے سارے ہال میں "پوں پوں" کرتے پھر رہے تھے۔ واقعی یہ بڑی خوبصورت بے بی کار تھی اور یقیناً سو ڈیڑھ سو کی ہوگی۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ یہ تحفہ دیا ہے خود میرے ہی ایک ماتحت نے تو اپنی صابن کی ڈبیا پر ندامت کے مارے برا حال تھا۔ اور تمام بُلبلے خود میرے دل و دماغ میں بن بن کر پھوٹ رہے تھے۔ اِس ندامت کے ساتھ ہی ساتھ میں حساب لگا رہا تھا کہ ان تمام تحفوں کی مجموعی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اور میرا تخمینہ یہ تھا کہ کم از کم یہ ہزار بارہ سو روپے کے تحفے ہیں جن میں میری ساڑھے سات آنے کی صابن کی ٹکیہ بھی شامل تھی۔ جو ان تحفوں میں سب سے بے ہودہ تحفہ تھا۔

عفت نے کاغذ کا پرزہ اُسے تھما دیا۔

اور وہ چلا گیا۔

عفت اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ آنسوؤں کا ہجوم لئے وہ کار میں بیٹھی اور لوٹ گئی۔ لیکن وہ سو نہ سکی۔ دریچے میں کھڑی کبھی آسمان کو اور کبھی اپنی گھڑی کو دیکھتی رہی۔ دو بجے تھے کہ آواز گونج اٹھی۔ ہوائی جہاز اُڑ چکا تھا۔ حسرت بھری نگاہوں سے وہ اُسے دُور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

جمیل نے جب اُس کا دیا ہوا کاغذ کھولا تو اُس پر صرف چند سطریں تھیں۔

"——— راک ڈیل

ڈریم لینڈ (۲)

۲۶ رجون سنہ ۱۹۵۲ء

"............!"

خط لکھو گے نا؟

"........"

اور خطوط ——— شروع شروع تو اِدھر اُدھر کی باتوں سے پُر ہوتے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُن میں دلوں کی دھڑکنیں سما گئیں۔

——— دریچے میں کھڑی عفت ماضی کے دُھندلکے میں دیکھ رہی تھی ——— کتنی بے چینی سے وہ اُن خطوط کا انتظار کرتی تھی۔ اور کتنی اُلجھن ہوتی تھی اُسے اُن خطوط کا جواب لکھتے۔ کتنی بار وہ لکھ لکھ کر پھاڑتی۔ کتنی بار اُس نے پوسٹ کرنے کی بجائے لفافے چاک کئے۔ پانی کی موٹی موٹی بوندوں نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے آسمان پہ نگاہ ڈالی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ٹوٹے ہوئے سفینے کی طرح چاند ڈوب چکا تھا۔ اُس نے پاس ہی کے ایک بنگلے کی دیوار پہ نگاہ ڈالی جہاں پہلی بار اُس نے جمیل کو ایسی ہی ایک موسلا دھار بارش میں کھڑے دیکھا تھا۔

بھرا ہوا دل لئے وہ بستر پر جا پڑی۔ ماضی کی یادوں، اور حسین باتوں اور شرارتوں اور اُن پر موسم کی رومانیت نے اُسے بے قرار کر دیا تھا۔ تنہائی کا احساس اُس کے دل پہ بوجھ ہوا جا رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اِس کمی کو اتنی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ جو جمیل کی موت سے پیدا ہو گئی تھی۔ تکیے میں مُنھ دھنسائے وہ رونے لگی۔ جیسے جمیل کی موت کی اطلاع اُسے ابھی ابھی ملی ہو۔ اتنی بے قرار وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ پیار بھری باتوں کے لئے تڑپ رہی تھی۔ وہ اُن شرارتوں کے لئے بے قرار تھی۔ جن سے زندگی کی مسرتیں عبارت ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اکیلی تھی نہ وہ خواہ مخواہ رُوٹھ سکتی تھی۔ اور نہ کوئی اُسے منانے والا تھا۔ کوئی نہ تھا جس کے بالوں کو وہ بکھیر سکے۔ کوئی نہ تھا جو پانی پیتے پیتے سارا پانی اُس پہ ڈال دے۔ کوئی نہ تھا جو اُسے پیار کر کے اُسے ساری کائنات سے بے نیاز کر دے۔ اور وہ بے قرار ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی بے قرار وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد اُٹھ بیٹھی۔ جمیل کی تصویر اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"کاش میں اِس تصویر کو جمیل بنا سکتی!"

اُس نے میز کی دراز سے دو چار تصویریں نکالیں۔ وہ اُن تصویروں سے باتیں کرنے لگی۔ اور پھر ایک تصویر پر اُس کی نظریں جم گئیں۔ جس میں پھولوں کے ہار پہنے وہ خود جمیل کی بغل میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس دن کی یادگار تصویر جب زندگی کی ساری مسرتیں اُسے جمیل کے رُوپ میں ملی تھیں۔

"نہیں بولو گے، کب تک چپ رہو گے؟"

اُس نے تصویر سے لپٹ جانے کی ناکام کوشش کی۔ میز پر بیٹھی وہ دیر تک اُن تصویروں کو تکتی رہی۔ وہ بھول چکی تھی کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور سراج گھومنے گیا ہوا ہے۔ اُسے سراج کی آواز تک سُنائی نہ دے رہی تھی۔ وہ لوٹ آیا تھا اور گیٹ کھولنے کے لئے نوکر کو آوازیں دے رہا تھا۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد اُس نے زور سے آواز دی۔ عفت چونکی۔ اُس نے دریچے سے دیکھا سراج کھڑا بھیگ رہا تھا۔ عفت کے دل کو ایک دھکا لگا۔ اُس نے اُسی دریچے سے جمیل کو ایسے ہی بھیگتا دیکھا تھا۔ جلدی سے عفت نے برساتی اوڑھی اور زینے سے اُتر پڑی۔ اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ اُسی طرح وہ کبھی جمیل کو بُلانے دوڑ گئی تھی۔

عفت نے گیٹ کھولا اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کو لوٹ آئی۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ جمیل کے بھیگے ہوئے سُوٹ نے اُسے کس قدر پریشان کر دیا تھا۔ سردی ہو جانے یا بخار آ جانے کے خوف سے اُس نے جمیل کے لئے فوراً چائے بنوائی تھی۔

"سراج کیا سوچے گا۔ میں کتنی انجان چلی آئی۔" عفت کو افسوس ہونے لگا

لیکن وہ چمکی رہی۔ عفت وہ پھول تھی جسے حاصل کرنے کی تمنا سرتاج نے کی تھی۔

عفت جانتی تھی۔ اور اسی لئے اُس سے دُور دُور رہتی تھی۔ ایک بار وہ سرتاج سے کسی ذرا سی بات پر اُلجھ پڑی تھی۔ اور پھر کبھی سرتاج سے بات نہ کی تھی۔ کچھ دیر وہ ادھر اُدھر کی باتیں سوچتی رہی۔ دو چار لمحوں بعد اُس نے اپنے کمرے کے دوسرے دریچے سے سرتاج کے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کپڑے بدل کر چائے بنانے کے لئے ہیٹر نکال رہا تھا۔

لیکن جیسے ہی اُس نے پلگ چڑھایا۔ فیوز اُڑ گیا۔ اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا عفت نے میز کی دراز ٹٹولی اور موم بتی نکالی۔ لیکن اُس کے پاس ماچس نہ تھی۔ موم بتی کو میز پر چھوڑ کر وہ بستر پر جا پڑی۔ بارش کا شور۔ موسلا دھار بارش کا شور رات کی تاریکی۔ بادلوں کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ وہ اندھیرے کمرے میں ڈرنے لگی۔ سب ہی سو چکے تھے۔ اُس نے سرتاج کے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ دیا سلائیاں جلا کر فیوز ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عفت نے میز سے موم بتی اُٹھائی۔ اور اندھیرے میں سنبھلتے ہوئے زینے سے اُتری۔

"اسے جلا دو سرتاج!" اُس نے موم بتی بڑھا دی۔

"تھینک یُو!"

سرتاج نے موم بتی جلائی۔

عفت کا دل جیسے کسی نے کچل دیا۔

ایک رات ایسے ہی فیوز اُڑ گیا تھا۔ اور عفت موم بتی لئے جمیل کے پاس جلانے پہنچی تھی۔

"ذرا اسے جلا دیجئے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تمھارا وجود کافی ہے!" جمیل نے انکار کر دیا تھا۔

"جلا بھی دیجئے۔ شاعری مت کیجئے۔"

"فیس لگے گی اسے جلانے کی!"

"ہر بات کی فیس چاہیے۔ کتنی فیس لیا کریں گے روز آپ؟"

"تو تشریف لے جائیے کون روکتا ہے۔"

"جاؤ ——!"

وہ موم بتی فرش پر ڈال کر چلی گئی تھی۔ اور جب وہ چار لمحوں بعد لوٹ کر آئی تو موم بتی جل رہی تھی۔

"اب کیوں جلایا؟!"

وہ چڑ کر پوچھ بیٹھی۔

"تم جو چلی گئی تھیں۔ اندھیرا ہو گیا تھا!" جمیل نے کہا اور موم بتی بجھا دی۔

——"اب اس کی ضرورت نہ رہی!"

"جی ہاں ضرورت نہ رہی!" اُس نے جمیل کو منہ چڑا دیا تھا۔

"ڈارون نے سچ کہا تھا۔ ہمارے باپ دادا بندر ہی تھے۔" جمیل نے کہا۔

"تو لگایئے نا چھلانگیں۔ چپکے کیوں بیٹھے ہیں۔"

اور پھر دونوں ہنس پڑے تھے۔

عفت موم بتی سرتاج کو تھما کر رُک نہ سکی۔ اور لوٹ گئی۔ اندھیرے میں کمزور سے مریض کی طرح وہ بستر پر جا پڑی۔ آسمان سے بہتے ہوئے پانی کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے۔ وہ بے قرار تھی۔ بہت بے قرار تنہائی کا احساس زہریلے سانپ کی طرح اُس کے دل کو ڈس رہا تھا۔ اور وہ تڑپ رہی تھی۔

"عفت ——!"

سرتاج موم بتی لئے آ پہنچا۔ وہ چونک پڑی۔

"فیوز ٹھیک نہیں ہوا؟"

"وہ بھی کچھ ہو گیا ہے۔ لو یہ موم بتی یہاں رکھ لو۔"

عفت نے موم بتی لی اور میز پر جما دی۔ سرتاج ایک مجسمے کی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

"تم رو کیوں رہی ہو عفت؟"

سرتاج نے میز پر نگاہ ڈالی۔ جمیل کی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔

"ٹوٹے ہوئے پھول کے لئے رونے سے کیا حاصل ہے عفت! اُسے رو رو کر شاخ پر لگایا تو نہیں جا سکتا!" سرتاج کی آواز میں ہمدردی تھی۔ وہ پھوٹ پڑی۔

"کیوں روتی ہو؟"

سرتاج اُس کے پاس کھڑا ہوگیا اور اُسے سمجھانے لگا۔ وہ بے قرار ہوئی جا رہی تھی۔

"سرتاج!" وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"عفت! رونے سے کیا ملے گا تمھیں؟"

وہ عفت کو سمجھاتا رہا اور مناتا رہا۔

عفت کے آنسو تھم رہے تھے۔ وہ کھِل رہی تھی اور سرتاج کو اپنی منزل نظر آرہی تھی۔

"اب سو جاؤ عفت! اِس طرح رویا نہ کرو۔"

سرتاج نے چال چلی۔

عفت نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لئے۔

"اُف آپ کتنے بھیگ گئے ہیں۔ چلئے میں چائے بنا دوں۔"

"چائے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کچھ ہوجائے گا آپ کو —— چلئے!"

عفت کے آنسوؤں کی طرح بارش تھم چکی تھی۔ اُس کے دل کے اُفق پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرح آسمان پر چھائے ہوئے بادل چھٹ رہے تھے۔

دوسرے دن ایک طویل عرصے کے بعد باجی اور آپی نے عفت کو کھلے ہوئے پھول کی طرح خوش دیکھا۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اُس کی تنہائی بس کچھ ہی دن کے لئے ہے!

شام کو باجی کسی کام سے عفت کے کمرے میں گئیں۔ انھیں یقین نہ آیا جمیل کی تصویر دیوار سے اُتار دی گئی تھی۔ اور اُس کی جگہ دیوار پر سرتاج کی وہ تصویر لگی ہوئی تھی جسے سرتاج نے اپنے کمرے میں لگا رکھا تھا۔

عفت، باجی کو تصویر پر غور کرتے ہوئے دیکھ کر بستر میں دُبک گئی ——

اور باجی مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

غزل

از

ابو الفصاحت حضرتِ جوشؔ ملسیانی

نکودر ــــ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۶ء

عزیزِ مکرم!

یہ سُن کر کہ بیسویں صدی کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے، بڑی مسرت ہوتی ہے۔ لیکن نظم کے لئے تقاضا ہوتا ہے تو جان پر بن جاتی ہے۔ جانتا ہوں کہ آپ کی عقیدت مندی مبالغے کی حدود تک پہنچی ہے لیکن آپ کے ارشاد کو ٹال بھی نہیں سکتا۔ لیجئے یہ غزل حاضر ہے۔

جوشؔ ملسیانی

خدا کے خاص بندے خاص جلوا دیکھ لیتے ہیں
فرشتوں نے بھی جو اَب تک نہ دیکھا دیکھ لیتے ہیں

اُنھیں بندوں کی ہے باریک بینی داد کے قابل
غمِ امروز میں جو عیشِ فردا دیکھ لیتے ہیں

حبابِ مے سمجھتے ہیں سرورِ عیشِ فانی کو
ہم اپنے جام میں انجامِ دُنیا دیکھ لیتے ہیں

حجابِ جلوہ کی اہلِ نظر پروا نہیں کرتے
وہ سو پردوں میں اُن کا رُوئے زیبا دیکھ لیتے ہیں

کہاں تک دھوئیں اشکوں سے ہم اپنے دامنِ دل کو
گھڑی بھر میں نیا داغِ تمنا دیکھ لیتے ہیں

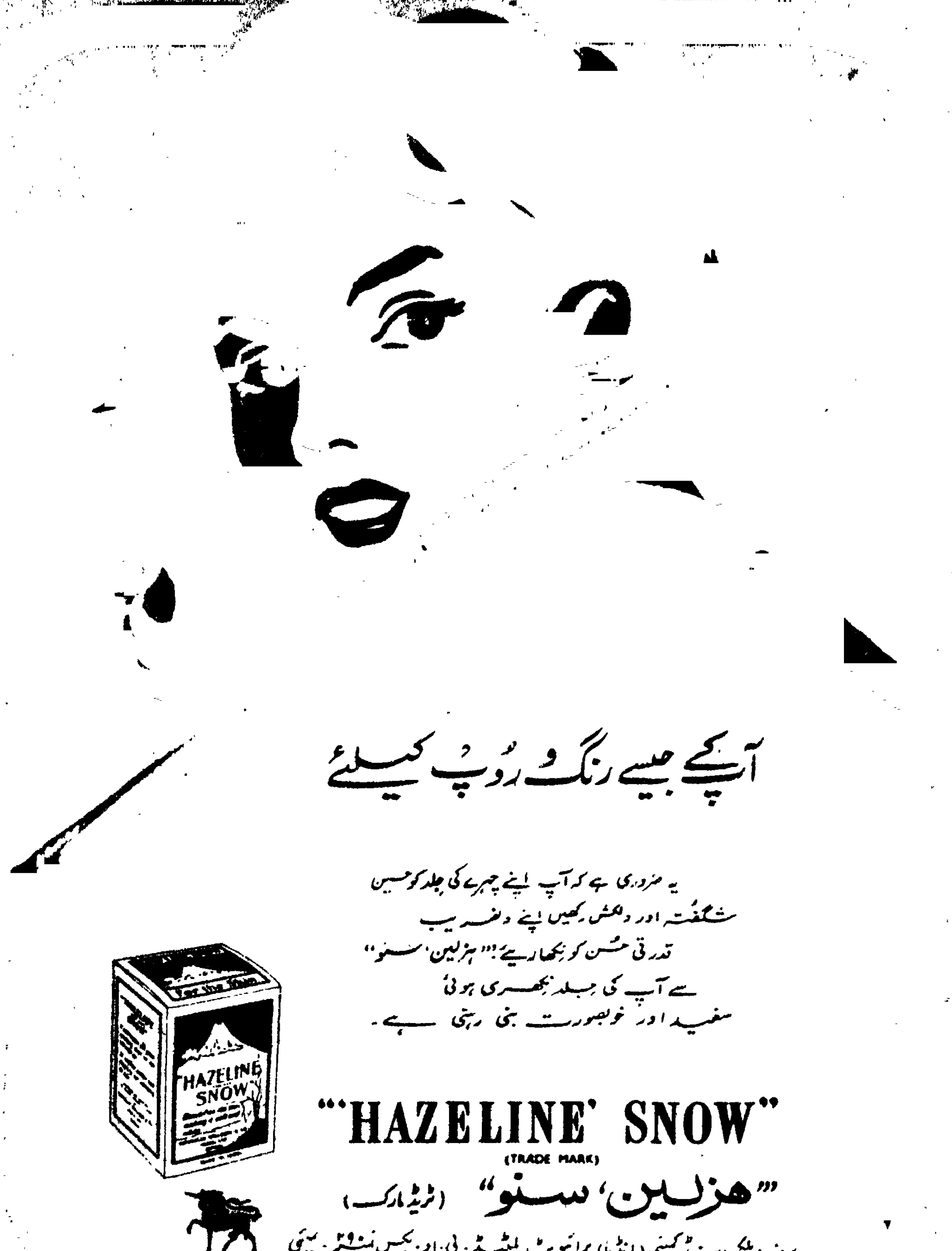
تمھارے جور کا حاصل اگر کچھ ہے تو بس یہ ہے
تماشا دیکھنے والے تماشا دیکھ لیتے ہیں

نظر سے کام لیتے ہی نہیں مشّاقِ نظر والے
خدا جانے وہ اِک جلوے میں کیا کیا دیکھ لیتے ہیں

بہ قدرِ ظرف سب کو دولتِ دیدار ملتی ہے
وہ پہلے حوصلہ تابِ نظر کا دیکھ لیتے ہیں

یہاں تو زندگی بھر ہم رہے اے جوشؔ فریادی
چلو محشر میں جو انصاف ہوگا دیکھ لیتے ہیں


سیزرز
سگریٹ
"SCISSORS"
CIGARETTES
SPECIAL
SCISSORS
W.D.&H.O.WILLS.
W.D.&H.O.WILLS.
BRISTOL & LONDON.
"SCISSORS"
W.D.&H.O.WILLS


آپ کے جیسے رنگ و رُوپ کیلئے
یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے چہرے کی جلد کو حسین
شگفتہ اور دلکش رکھیں اپنے دلفریب
قدرتی حُسن کو نکھاریے! "ہزلین، سنو"
سے آپ کی جلد نکھری ہوئی
سفید اور خوبصورت بنی رہتی ہے۔
"'HAZELINE' SNOW"
(TRADE MARK)
"ہزلین، سنو" (ٹریڈ مارک)
بروز ویلکم اینڈ کمپنی (انڈیا) پرائیویٹ لمیٹڈ۔ پی۔ او۔ بکس نمبر ۲۹۔ بمبئی

افسانہ

راستے اور موڑ

از

جناب م۔ا۔ راجندر ایم۔اے

۱۹۵ اے (ای ٹائپ) ونے نگر روڈ نئی دہلی ۳

برادرِ مکرم تسلیم

ایک تازہ افسانہ "راستے اور موڑ" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آجائے تو شریکِ اشاعت کرلیں ——— ایک چینی فلاسفر نے دُنیا کے بارے میں کہا ہے "اِس میں پُل زیادہ ہیں اور راستے کم" یہ زندگی کی اُلجھن اور اُس کی ناپائیداری کے اظہار کے لئے ایک بہت خوبصورت جملہ ہے۔ اِس افسانے میں محبت اور اخلاص کے گرد اسی فلسفے کی تفسیر کی کوشش کی ہے۔ جو اُمید ہے پسند کیجائے گی ——— اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

م۔ا۔ راجندر

اجے نمائش دیکھ کر گھر لوٹا تو اُس کے ذہن کے پردے پر ایک ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ہاں وہ کملیش ہی تھی جو اپنے شوہر اور ——— دو بچوں کے ساتھ باٹا والی دوکان کے سامنے سے، اُس کے پاس سے گزری تھی۔ کملیش نے کچھ آگے جاکر پیچھے مُڑ کر بھی دیکھا تھا۔ اور ایسا ہی اجے نے بھی کیا تھا۔ وہ اب دو لڑکوں کی ماں تھی۔ یہ جان کر اجے خوش ہوا۔ اُس نے یہ بھی احساس کیا تھا کہ کملیش کی گھریلو زندگی اب ہنسی خوشی سے بھرپور تھی۔ جب وہ وقت سونے کے لئے لیٹا تو اُسے آٹھ نو برس پہلے کی باتیں یاد آگئیں۔ یہ کافی عرصہ تھا جو اس اثنا میں بیت گیا تھا۔ اُس کی بھی شادی کبھی کی ہوگئی تھی۔ اور وہ بھی اب دو بچوں کا باپ تھا۔ مگر جیسے کملیش کی کہانی کل ہی کی بات ہو۔ وہ احساسات کی ایک دُھندلی دنیا میں کھو گیا۔

کملیش کے بھائی رندھیر سے اجے کی پہلی ملاقات کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ ان دنوں اجے راما پبلشرز کے ہاں ترجمے اور پروف بینی کا کام کرتا تھا۔ اور رندھیر بیکار تھا۔ اُسے سٹیج کے لئے ڈرامے لکھنے کی دُھن تھی۔ لیکن کبھی اُس کا کوئی ڈرامہ سٹیج ہوا نہ اُس کے ذریعے اُسے کوئی آمدنی ہوئی۔ اجے نے رندھیر کے ڈراموں کے بارے میں راما پبلشرز سے بات کرنے کا وعدہ کیا۔ اور وہ دونوں دوست ہوگئے۔

کملیش ایک آزاد خیال گریجویٹ لڑکی تھی۔ جو مردوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے بالکل نہ جھجکتی تھی۔ وہ انگریزی اور ہندوستانی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔ اور بلاکی ذہین تھی۔ اُس میں بحث کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ہر ایک مسئلے پر بات کر سکتی تھی۔ اُس کے لئے جہاں تک جھجک اور آزادی کا تعلق تھا، ایک اجنبی اور واقف کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ گھر آنے والے ہر شخص سے بات چیت کرتی۔ اجے پہلی بار اُن کے ہاں آیا تو کملیش نے اُس کی اور رندھیر کی باتوں میں خوب حصّہ لیا۔

کملیش کے پتا ریٹائرڈ ہیڈ کلرک تھے۔ اور اُن کا کام شہر میں کہیں بھی ہونے والے ست سنگ میں شریک ہونے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کملیش کے تین بھائی تھے۔ رندھیر اور رندیو دونوں بیکار تھے۔ رندیو نے بی۔اے میں فیل ہونے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ کیا کرے۔ سب سے بڑا بھائی رنجیت

سنجیدہ مزاج تھا اور وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اوپر کے کمرے میں الگ رہتا تھا۔ وہ شیڈول بینک میں کلرک تھا اور اُس کی روش سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رندھیر اور رندیو کی دن بھر کی آوارگی، گھر میں دوستوں کے ساتھ دھما چوکڑی اور کملیش کی آزاد روی سے بالکل خوش نہ تھا۔

کملیش کوئی تیئس چوبیس سال کی تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ اور اُس کے چہرے کے خدوخال دلکش تھے۔ اُس کی آرائش اور پوشاک کا انداز بہت ہی دلکش تھا۔ اُس کی ذہانت اور تعلیم اُس کی مزید خوبیاں تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک نہایت اچھی لڑکی تھی۔ جس نے اجے کو پہلی ہی ملاقات میں متاثر کر لیا۔ اجے اپنی نئی دوستی پر خوش تھا کیونکہ اُس کے دامن میں اُسے کئی خوشیاں نظر آئیں۔ رندھیر اور رندیو دونوں اُس کے اچھے دوست بن گئے۔ اور وہ کئی دن لگاتار اُن کے یہاں جاتا رہا۔

ایک دن کملیش نے اپنے شوہر کا ذکر کیا تو اجے چونکا۔ کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ کملیش کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اُسے کچھ افسوس سا ہوا۔ حالانکہ اُسے کملیش کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ کملیش کی وجہ سے گھر میں رونق اور دلچسپی وہ کچھ دیرپا سمجھتا تھا۔ اگر کملیش کی شادی ہو چکی ہے تو وہ صرف تھوڑے دنوں کی مہمان ہوئی۔ اور اُس کے بعد رندھیر اور رندیو دونوں مل کر بھی اس خلاء کو پُر نہ کر سکیں گے۔

اجے کملیش کے گھر آتا رہا۔ اُس کی عادتیں کملیش، رندھیر اور رندیو کے علاوہ اُن کے پتا اور ماتا جی کو بھی پسند تھیں۔ اجے کے لئے اُس گھر کے سبھی افراد اچھے تھے۔ اور اُن سب نے ہی اُس کی زندگی کے سونے پن کو کچھ دُور کیا تھا۔ وہ راما پبلشرز سے فارغ ہوتا تو سیدھا انھیں کے یہاں چلا آتا۔ اگر رندھیر اور رندیو گھر پر نہ بھی ہوتے جب بھی وہ کملیش سے باتیں کرتا رہتا۔ اور وہ اتنے آزاد ہو گئے تھے کہ کملیش اپنی کئی ذاتی قسم کی باتیں اُسے بتا دیتی۔ اجے کو پتہ لگا کہ کملیش کی شادی تو آج سے پانچ چھ برس پہلے ہی ہو گئی تھی۔ جب وہ پڑھ رہی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ کملیش کی شادی "لَو میرج" تھی۔ اور اُس کا شوہر ایک پڑھا لکھا خوبصورت نوجوان تھا۔ جو امرتسر میں ایک اچھے عہدے پر ملازم تھا۔ کملیش کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے بے حد پریم کرتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجے کی اُس گھر میں دلچسپی بڑھتی رہی۔ وہاں سب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا رہا۔ کملیش تقریباً دو سال سے یہیں تھی۔ اور اس دوران میں اُس کا شوہر ارون صرف ایک دو بار یہاں آیا تھا۔ کملیش کی شادی بھی پوشیدہ طور پر کسی مندر میں ہوئی تھی۔ اور ارون کے گھر والے اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ اور ارون میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ علانیہ اپنے گھر والوں کی مخالفت کرتا۔ اور وہ اپنی ماں کے زیر اثر اب آہستہ آہستہ کملیش سے دُور ہو رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار کملیش کو کوئی چٹھی ڈال دیتا۔ لیکن اُسے لیجانے کا نام نہ لیتا۔ وہ چٹھی اس طریقے سے لکھتا کہ ثابت نہ ہو سکے کہ کملیش اور اُس کی کبھی شادی ہوئی تھی!

اجے کو یہ سب کچھ جان کر بہت دُکھ ہوا۔ کملیش بہت ہی اچھی لڑکی تھی۔ اور اجے کے دل میں اُس کے لئے ایک گہری ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ کملیش کے زیادہ قریب آ گیا لیکن اِس قربت کا کوئی تعلق کسی پیار، عشق یا فریب سے نہیں تھا۔ یہ بات کملیش نے ظاہر کر دی تھی کہ اُسے ارون سے بے حد پیار تھا اور وہ اِس پیار کو کبھی نہ کھو سکے گی۔ وہ اجے سے بات کرتی کرتی کبھی کبھی خیالات میں کھو جاتی اور ارون کے بارے میں ایسی باتیں کرتی جنھیں سُن کر کملیش کے دل میں جھانکا جا سکتا تھا۔ اجے نے کئی بار اُس کی کٹورہ سی آنکھوں میں آنسوؤں کی درد آمیز جھلمل دیکھی تھی۔

ایک دن کملیش نے اجے سے پوچھا، کیا وہ اُسے کوئی نوکری دلا سکتا ہے؟

اجے کے دل کو ایک ٹھیس لگی۔ وہ جانتا تھا کہ کن حالات میں کملیش کے دل میں نوکری کا خیال پیدا ہوا ہے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ کملیش مالی طور پر بھی تنگ تھی۔ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا احساس اُس کے غم کو ہلکا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہو گا۔ اجے نے نوکری کے لئے کوشش کی لیکن کہیں بات بنتی نظر نہ آئی۔ جس قسم کی نوکری فوراً کملیش کو آسانی سے مِل سکتی تھی۔ اُس کے لئے نہ اجے کہہ سکتا تھا۔ نہ کملیش تیار ہوتی۔ اجے کا کوئی خاص رسوخ بھی کہیں نہ تھا۔ لیکن اجے کملیش کے لئے سب کچھ کرنا چاہتا تھا کوئی خاص جذبہ اُسے اُکسا رہا تھا۔ اور اُس نے آخر راما پبلشرز سے یہ اجازت لے لی کہ وہ کملیش کو اپنے ہاں لا کر اُس سے اپنے کام میں مدد لے سکتا ہے۔ اُس نے کملیش سے جھوٹ بولا کہ راما پبلشرز کے ہاں ترجمے اور پروف ریڈنگ کا ایک بڑا کام اُسے کانٹریکٹ پر مِل رہا ہے۔ اور اُس کے لئے اکیلا کرنا مشکل ہے۔ اگر کملیش اُس کے ساتھ کام کرے گی تو کوئی سو روپے ماہوار اپنے حصے کے طور پر کما سکے گی۔ پہلے تو وہ ہچکچائی لیکن اجے کے زور دینے پر مان گئی۔ گھر میں بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

دو ایک دن تو کملیش بس میں گئی۔ لیکن پھر اجے کے ذریعے اُس نے ایک سائیکل کرائے پر لے لی۔ اور دونوں ساتھ ہی جانے لگے۔ راما پبلشرز کی دکان اوپر تھی

اور برآمدے میں اجے اکیلا بیٹھا تھا جے اور پروف ریڈنگ کا کام کرتا تھا۔ اب کملیش بھی اُس کی ساتھی تھی۔ وہ کام بھی کرتے تھے اور باتیں بھی۔ کافی وقت ساتھ گزار کر وہ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ گئے تھے۔ کملیش اب اروِن کے بارے میں کم باتیں کرتی اور کئی بار اجے کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس میں ایک خاص دلچسپی لے رہی ہے۔ اجے تو واقعی اُس میں دلچسپی لے رہا تھا لیکن یہ کس طرح کی دلچسپی تھی، اِس کا کوئی واضح خیال ابھی اُس کے ذہن میں نہیں بنا تھا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ کملیش کی شادی ہو چکی ہے۔

اجے اور کملیش کافی ساتھ گھومنے لگے۔ وہ آسانی سے اِدھر اُدھر جا سکتے تھے۔ اور کملیش کے گھر والوں کی اس بارے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ دراصل تمام گھر والے اجے کی قربانی سے متاثر تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ کملیش اجے کی وجہ سے اب کافی خوش ہے۔ اور یہ اُس کی غم آلود زندگی میں ایک اچھی تبدیلی تھی۔ اجے اِس شہر میں اکیلا رہتا تھا۔ کملیش کے گھر والوں نے زور دیا کہ وہ اُن کے ساتھ ہی رہا کرے۔ کملیش کی بھی یہی خواہش تھی۔ کیونکہ اجے کو کھانے وغیرہ کی بہت تکلیف تھی۔ اور اِس کا سب کو بہت احساس تھا۔ اگرچہ اجے اب تقریباً اُن ہی کے یہاں رہا کرتا تھا لیکن اُس نے قطعی طور پر چلے آنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ لیکن ایک دن رندھیر زبردستی اپنی سائیکل پر اُس کا ٹرنک اور بستر لے آیا۔ اور اِس طرح اجے اُن کے گھر ہی کا ایک فرد بن گیا! اجے کے اِس طرح اُن کے گھر ہی چلے آنے پر اڑوس پڑوس میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ خود اجے کے کئی واقف کاروں نے اُس پر آوازے کسے۔ راما پبلشرز کے تو ہر ملازم کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی اور اُن کی آنکھوں میں ایک سوال ہوتا۔ کملیش کے چال چلن اور اُس کے گھر والوں کے رویّے کے بارے میں بھی کئی باتیں اجے کے کانوں میں پڑیں۔ لیکن اجے جانتا تھا کہ جہاں تک کملیش کا تعلق ہے وہ ایک بلند اخلاق لڑکی ہے۔ اور اُس کی طرف اُس کا جھکاؤ محض حالات کی پیداوار ہے۔ کملیش کے گھر والے کیا سوچ رہے تھے اور اُن کی اجے کے معاملے میں ڈھیل کہاں تک مناسب تھی، اجے کو اِس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ اب خود جذبات کی تیز رَو میں بہہ رہا تھا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کملیش سے شدّت سے پیار کرتا ہے اور جیسے کملیش کو وہ بچپن سے جانتا ہے۔ اور جیسے کبھی اروِن سے اُس کا کبھی بیاہ نہیں ہوا!

ایک دن وہ کام پر سے لوٹتے ہوئے ایک پارک میں بیٹھ گئے۔ اُس روز کملیش کچھ اُداس سی تھی اور اُس نے اروِن کا ذکر کیا۔ اب تو بہت عرصے سے اروِن کی کوئی چٹھی بھی نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کب تک کملیش کی زندگی ایسے چلے گی۔ کملیش نے بھری بھری سی آنکھوں سے اجے کی طرف ایسے دیکھا جیسے اُس کے پاس اِس مشکل کا حل تھا لیکن کملیش کی مشکل بہت بڑی تھی۔ اور اجے نے اروِن کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہاں اجے نے سوچا، اروِن کملیش جیسی بیوی کو کھو کر بہت بدقسمت ہے اور کاش وہ اروِن بن سکتا!

کملیش گھاس ہی پر لیٹ گئی اور اُس نے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ یہ پارک کا ایک سنسان سا ٹکڑا تھا۔ اُن کی سائیکلیں برابر برابر پڑی تھیں۔ فضا میں ایک خوشگوار خنکی تھی۔ اور ڈوبتی ہوئی شام کی ایک دھندلی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ اجے بھی پاس ہی لیٹ گیا۔ ایک انجانے جذبے کے تحت اُس نے اپنا ہاتھ کملیش کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور کملیش چُپ رہی۔ چند لمحوں کے بعد کملیش اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اُسے اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں میں سما لیا۔ وہ دیر تک اِسی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے یہاں تک کہ اندھیرا زیادہ ہو گیا۔ کملیش جانے کے لئے اُٹھی تو اجے بھی کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کملیش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کملیش اُس کے زیادہ قریب آ گئی۔ اور اُس کا سر اجے کے سینے سے چھونے لگا۔ اجے نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا سر اُٹھایا۔ اُس نے شدّت سے محسوس کیا کہ وہ اُسے چوم لے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتا کملیش تیزی سے الگ ہو گئی اور زور سے بولی۔ "خبردار! یہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ بھول گئے کہ میں کسی دوسرے کی بن چکی ہوں؟" اجے کو جیسے کسی نے ایک خواب کی دُنیا سے کھینچ کر نکالا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ کملیش کسی اور کی ہے اور اُس نے ایک گہری شرمندگی کا احساس کیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کملیش نے بھی تو کئی ایسی باتیں کی تھیں جو ایک شادی شدہ لڑکی کے لئے مناسب نہیں تھیں۔ وہ کیوں ہر روز اُس کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ کیوں آج اتنے قریب آ گئی تھی۔ اُس نے اپنا سر میرے سینے سے کیوں لگا دیا تھا؟

اجے خیالات میں اُلجھ گیا۔ اور کملیش سائیکل اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ اُس نے آواز دی لیکن وہ نہیں رُکی۔ اُس نے سائیکل اُٹھائی اور اُس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دُور پر اُسنے کملیش کو آ لیا۔ اور اُس سے کہنے کی کوشش کی کہ اُس کا ارادہ ہمدردی کے ایک اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن کملیش بالکل نہیں بولی اور اُس دن وہ

جاتے ہی اپنے کمرے میں چُپ چاپ لیٹ گئی۔

اُس رات اجے کو نیند نہیں آئی۔ وہ اب تک کے گزرے ہوئے واقعات پر سوچتا رہا۔ وہ اِسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک بالکل غلط راستے پر ہے۔ محض ایک دلچسپی کے لئے وہ ایک بڑی قیمت ادا کر رہا تھا۔ کسی دوسرے کی بیوی میں دلچسپی لینے کا اُسے حق بھی کیا ہے۔ اور پھر اِس دلچسپی کا نتیجہ کیا ہے؟ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح ہی اپنا سامان لے کر واپس اپنے کمرے میں چلا جائے گا۔ اور پھر کبھی یہاں نہ آئے گا۔ لیکن وہ کملیش سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کل وہ کام پر نہیں آئے گی۔ اُس نے ایک پرچہ لکھا

"میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی تھی۔ اِسلئے میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے کل تمھارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ میں یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کسی اور کی امانت ہو۔ اور اگر میں تمھیں اِسی طرح دیکھتا اور تم سے باتیں کرتا رہا تو یہ ہم دونوں کے واسطے اچھا نہ ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ تم آج جس بات پر قابو پا سکتی ہو کل نہ پا سکو اِس لئے میں اب کبھی نہ آؤں گا۔ کاش ارون تمھارے بارے میں کچھ سوچے اور تم ایک ہنسی خوشی کی زندگی گزارو۔"

وہ صبح سویرے ہی کملیش کے کمرے میں اُسے یہ پرچہ دے کر چلا گیا۔ اُس کا خیال صحیح تھا۔ اُس روز کملیش کام کرنے نہیں آئی۔ رندھیر نے ضرور پوچھا، کیوں چلے آئے؟ لیکن اُس نے بھی واپس آنے پر زور نہیں دیا۔ اجے کا جی بالکل نہیں لگا۔ اور وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ کملیش اُس کی زندگی کا حصّہ بن گئی تھی۔ اور اُس سے اچانک علیحدگی اُس کے ذہن کے لئے ناقابلِ برداشت ٹھیس تھی۔ وہ کملیش کے مستقبل کے بارے میں برابر سوچتا رہا۔ اُسے صرف دو راستے نظر آئے۔ یا تو وہ ارون کے ساتھ چلی جائے یا پھر وہ دونوں شادی کر لیں۔

کوئی چار پانچ دن کے بعد کی بات ہے، شام کے وقت کملیش اُس کے پاس آئی۔ اُس کے چہرے پر کسی بڑے صدمے کی گہری جھلک تھی۔ وہ چُپ چاپ اُسکے پاس بیٹھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، اُس کے یہ دن بہت اُداسی میں بیتے ہیں۔ اور وہ کچھ سوچتی رہی ہے۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں اِن دنوں آپ کے اور ارون کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ میں نے اُس روز آپ سے کچھ بھی کہا ہو لیکن میں یہ چھپانا نہیں چاہتی کہ میرے دل میں بھی آپ کے لئے جگہ بن چکی ہے۔ آپ کی نیکی اور ہمدردی کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ارون سے پہلے آپ میری زندگی میں داخل ہوتے تو میں آپ کی بننا چاہتی۔"

وہ ایک منٹ چپ رہی اور پھر بولی۔

"پتہ نہیں اُن کے دل میں کیا ہے۔ وہ مجھے چاہتے ہیں یا پیار تو اب نہیں ہے مجھے تو اب اُمید نہیں کہ وہ مجھے لے جائیں گے۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتے ہیں اور اُن کی ماں نہیں چاہتی کہ ہماری شادی ہو۔ میں نے اُنھیں تین چار روز ہوئے آپ کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے۔"

اجے چونک پڑا اور آہستہ سے بولا۔

"میرے بارے میں؟"

"ہاں میں نے اُنھیں صاف لکھ دیا ہے کہ میری زندگی میں اُنھیں کی طرح ایک ہمدرد داخل ہو رہا ہے۔ میں نے اُنھیں لکھ دیا ہے کہ یا تو مجھے لے جائیں یا مجھے آپ سے شادی کرنے کی اجازت دے دیں۔ پتہ نہیں میں نے ٹھیک لکھا ہے یا نہیں۔"

"یعنی تم مجھ سے شادی کر لو؟!"

اجے نے پوچھا۔

"ہاں، آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں نا؟"

اجے چپ ہو گیا۔

کملیش پھر بولی۔

"میں آپ سے یہی پوچھنے آئی تھی۔ میں نے پتاجی سے بھی اِس کا ذکر کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے واقعی پیار کرتے ہیں۔ اور ایک اور بھنورا بننا نہیں چاہتے؟ کیا آپ مجھ سے شادی کر سکیں گے؟"

"میں تمھاری ہر مدد کے لئے تیار ہوں۔"

اجے بولا۔

"میں جانتی ہوں آپ کے سینے میں ایک بڑا دل ہے۔ اور آپ یہ کہہ کر ایک بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ شاید مجھ ابھاگن کی قسمت میں دو آدمیوں سے پیار کرنا ہی لکھا تھا لیکن میں نے اپنا بہترین پیار اور وقت ارون کو دیا ہے۔ آپ سے شادی کر کے بھی میں اُسے بھول سکوں گی، میں یہ نہیں کہہ سکتی۔" اور یہ کہہ کر کملیش نے

ندامت کو تو جانے دیجئے۔ گھڑوں پانی پڑ کر رہ گیا اور جی چاہا کہ اپنے ان دوست
گھر جا کر یہ صابن کی ٹکیہ اُن ہی کے منہ پر مار آؤں جن کے مشورے پر یہ انگلستانی حرکت
گزرا تھا کسی سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہ تھا۔ اور سب سے زیادہ شرمندہ
اُس احمق سے تھا جس نے یہ قیمتی بے بی کارنے کر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے تھے
پارٹی میں مگر اس پارٹی کے بعد میں اس تقریب کی تجارتی صورت پر اس سنجیدگی
سے غور کرتا ہوا گھر تک پہنچا کہ گھر پہنچنے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بیوی کو بلا کر اُن
سے پوچھا کہ ــــ

"آپ کو کچھ یاد ہے آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں ؟"

وہ حیرت سے بولیں ــــ

"خیریت تو ہے میری تاریخِ پیدائش کی آج کیا ضرورت پیش آگئی۔ کوئی اُڈو واڈو کرانا ہے مجھ پر ؟"

میں اِس قسم کے غیر سنجیدہ جواب کے لئے اُس وقت تیار نہ تھا۔ لہٰذا پوری سنجیدگی سے کہا ــــ

"کبھی کچھ ایسی ہی ضرورت ہے۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

وہ بدستور اِس کو معمولی بات سمجھ کر بولیں ــــ "لو بھلا مجھے کیا معلوم کہ میں
ن تاریخ کو پیدا ہوئی ہوں کبھی اِس بات پر غور ہی نہیں کیا۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا ــــ

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ بات غور کرنے سے طے نہیں پاتی۔ بلکہ طے شدہ ہوتی ہے۔ بہر حال آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کس تاریخ پیدا ہوئی تھیں۔"

وہ سادگی سے بولیں ــــ "ہاں مجھے تو پتہ نہیں۔"

میں نے کہا ــــ "اچھا تو آپ ۴ رمارچ کو پیدا ہوئی تھیں۔"

وہ حیرت سے بولیں ــــ "۴ رمارچ کو ! یہ آپ کو کیسے معلوم ؟"

میں نے کہا ــــ "بس کہہ جو دیا کہ آپ ۴ رمارچ کو پیدا ہوئی تھیں۔ آج ۲۷ر
ردی ہے اور پانچ دن کے بعد آپ کی سالگرہ ہے۔"

وہ ایک دم چونک کر بولیں ــــ "میری سالگرہ ؟ لو اور سنو۔ بوڑھے منہ
ہاسے لوگ چلے تماشے۔ یہ آخر سوجھی کیا ہے ؟"

میں نے کہا ــــ "سوجھی نہیں ہے بلکہ یہ طے ہے میں آج ہی کارڈ چھپواتا
ہوں اور آپ پارٹی کے انتظامات کیجئے میں سب کو بلاؤں گا کسی کو نہ چھوڑوں گا
ناک میں دم کر رکھا ہے ان سب نے سالگرہ کی پارٹیاں کر کر کے۔ ایک ایک سے بدلا لوں
گا۔ بہت بن چکا بے وقوف۔ اور بہت دے چکا تحفے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھ سے بجتی
ہے۔ میں نے تحفے دیئے ہیں تو وصول کیوں نہ کروں۔"

بیوی نے حیرت سے مجھ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مگر بیٹھے بٹھلائے یہ خیال کیسے آ گیا۔"

میں نے کہا ــــ "ہزار بارہ سو روپے سے کم کے تحفے نہ تھے۔ جو سراج کے لڑکے کی سالگرہ میں سب نے دیئے ہیں۔ وہ چاہے تو نوکری چھوڑ کر کھلونوں کی دکان کھول سکتا ہے۔ چھٹانک بھر کے اُس لونڈے کو اگر ہزار بارہ سو روپے کے تحفے مل سکتے ہیں تو آپ کو کیوں نہ ملیں گے تحفے۔ بخدا اُس نے دو ڈھائی سو روپے سے زیادہ اِس پارٹی پر صرف نہ کیا ہوگا اور تحفے بٹورلئے ہزاروں کے۔"

بیوی نے وہی عورتوں کی سی بات کہی ــــ "اچھا خیر آپ میرا تماشا تو بنائیے نہیں۔ ایسا ہی تحفے بٹورنے کا شوق ہے تو اپنی سالگرہ کر لیجئے۔"

مگر میں طے کر چکا تھا اور میرا ارادہ اٹل تھا۔ لہٰذا میں نے بیوی کو تو کوئی جواب نہ دیا۔ لکھنے کی میز پر بیٹھ کر دعوت نامے کا مضمون لکھا اور سیدھا پریس جا کر کارڈ چھپنے کو دے آیا۔ ذہن میں فہرست تو پہلے ہی سے تیار تھی مگر لفافے لکھتے وقت بیوی کو بھی مشورے میں شریک کر لیا۔

"یہ سب لفافے دیکھ کر بتلائیے کہ کوئی نام رہا تو نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ رضوی کا نام رہ گیا تھا۔ وہ ضرور بنارسی ساری دے گا۔"

بیوی نے کہا ــــ

"یہ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ سچ مچ لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

میں نے لفافے لکھتے ہوئے کہا ــــ

"یعنی ہم سنجیدگی سے تحفے دیتے پھریں اور ہم سالگرہ منائیں تو لوگ مذاق اُڑائیں۔ چہ خوش۔ دُرانی کا نام رہ گیا تھا۔ حالانکہ وہ کلائی کی گھڑی دے گا۔ اور کیا عجب کہ سونے کی گھڑی دے۔"

بیوی نے منہ بنا کر کہا ــــ "دی نہ ہو اُس نے گھڑی۔ ڈیڑھ دو سو روپے پارٹی میں لگ جائیں گے اور بے وقوف الگ بننا پڑے گا۔"

ں کے سینے پر سر رکھ دیا اور رونے لگی۔ وہ بہت دیر تک اُسی طرح روتی رہی۔ اجے نے ں کا سر اُٹھا کر پُوچھا۔

"لیکن تم نے اروِن کو لکھ کر کہیں معاملہ اور پیچیدہ تو نہیں بنا لیا؟"

"نہیں۔ میں ہر کام صاف دلی سے کرنا چاہتی ہوں۔ اُنھوں نے مجھے شدت سے پیار کیا ہے۔ اور اُنھیں میرے پیار پر بڑا غرور تھا۔ شاید یہ سُن کر کہ میں کسی اور سے ار کر سکتی ہوں، اُن کے غرور کو ٹھیس لگے۔ اور وہ مجھے لے جانے کا ہی فیصلہ کر لیں۔"

کملیش اجے سے وعدہ لے کر چلی گئی۔ اور وہ ایک اُلجھن میں پڑ گیا۔ اِس میں ی شک نہیں کہ اُسے کملیش بے حد پسند تھی۔ لیکن شادی کی بات اُس کے ذہن میں ی نہیں آئی تھی۔ اُس نے بہت سوچا، اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ اگر وہ اُس سے پیار تا ہے تو اُس کے ساتھ شادی بھی کر سکتا ہے۔ اُسے اطمینان ہو گیا کہ اُس نے کوئی ھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔

اِس کے بعد کملیش اُس کے یہاں برابر آنے لگی۔ اجے کی زندگی میں ایک ھی رونق داخل ہو گئی۔ اروِن کا ایک خط آیا تھا کہ وہ جلد ہی خود آ کر ساری بات یت کرے گا۔ اور اِس خط نے کملیش کو بہت خوش کیا تھا۔ کیونکہ کوئی بھی فیصلہ ں کی زندگی کے لئے بہت اہم تھا۔

کملیش دو تین دن نہیں آئی۔ پتہ لگا اروِن آیا ہوا ہے۔ ایک دن جب اجے بہت ہی اُداس بیٹھا ہوا تھا کملیش آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ وہ اُس کے الکل قریب بیٹھ گئی اور بولی۔

"میں اِن دنوں بالکل نہیں آ سکی۔ وہ آئے ہوئے ہیں اور بہت ہی ناراض یں۔ اُنھیں مجھ پر شک بھی ہے۔ وہ شاید آپ سے بھی ملیں۔ بہرحال وہ کہتے ہیں اُن کا گھر والوں سے فیصلہ ہو گیا ہے۔ اور وہ مجھے لے جائیں گے۔ اِس کے علاوہ وہ کہتے ہیں کہ وہ اب باقاعدہ برات لے کر آئیں گے۔ اور میری پھر شادی ہو گی ان کی ماں کو مندر میں ہوئی شادی منظور نہیں۔"

"یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔"

"ہاں، لیکن وہ بہت کچھ بدلے سے گئے ہیں۔ یا شاید میں بدل گئی ہوں۔ مجھے بارہ کر خیال ہوتا ہے کہ میں اُن کے ساتھ خوش نہیں رہوں گی۔ وہ تو مجھ سے خفہ ں ہیں۔ لیکن مجھے بھی بہت غصّہ ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ میں چھُپانا نہیں چاہتی کہ آپ سے مجھے اب زیادہ پیار ہے۔ ویسے میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ لیکن مجھے یہ احساس ہے گا کہ میں آپ میں کچھ کھو چکی ہوں۔ میں نے سوچا، آپ سے بھی پُوچھ لوں۔"

"کیا؟"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا آپ میرا جانا برداشت کر لیں گے؟ آپ نے میرے ساتھ اتنی ہمدردی کی ہے کہ آپ چاہیں تو میں اُن سے صاف کہہ دوں کہ وہ میرا پیار کھو چکے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔ صرف اُن کا حق تم پر ہے۔ میں میرا بالکل خیال نہ کرو۔"

اور اجے نے سر جھکا لیا۔

وہ مرد ہو کر بھی رونے لگا تھا۔

کملیش کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر گئے۔ وہ رُندھے ہوئے گلے سے بولی "میں آپ کو کبھی بھُول نہ سکوں گی۔ یا شاید بھُول جاؤں۔ یہ دُنیا بہت انوکھی ہے اِس میں کتنے ہی راستے اور کتنے ہی موڑ ہیں۔ اروِن سے پیار ہوا تھا تو یہ خواب میں بھی نہیں تھا کہ کسی اور سے بھی اِتنا پیار ہو سکتا ہے۔ اور پھر آپ کو بھی بھول جاؤں گی۔ اروِن یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ میں پھر آپ سے کبھی بھی ملوں یا بات کروں۔ میں اِس وقت ایک بہانے سے آئی ہوں۔ اُنھوں نے صرف ایک بڑی قسم پر اعتبار کیا ہے کہ میرا آپ کا پیار کسی گراوٹ کا حامل نہیں ہے۔"

اجے کے آنسوؤں سے اُس کے دل کا غبار دھُل گیا۔ وہ حوصلے کے ساتھ اُٹھا اور بولا "تم اب جاؤ اور ہنسی خوشی رہو۔ وہ میرے پاس آئے تو میں اُنھیں تمھارے بارے میں کیا کہوں گا یہ تم جانتی ہو۔ اُن کی یہ مانگ کہ تم اب مجھ سے کبھی نہ ملو۔ شاید ٹھیک ہی ہے۔"

کملیش باہر نکل گئی۔ اور اُسنے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے اب بھی وہ کسی چوراہے پر کھڑی ہو۔ اُس کی آنکھیں نمناک تھیں اور اجے نے صرف ہاتھ اُٹھا کر الوداع کی۔ وہ تھوڑی دُور جا کر اندھیرے میں گُم ہو گئی۔ اجے بہت دیر تک دروازے پر کھڑا رہا اور آنسو اُس کی آنکھوں سے جھڑتے رہے۔

عقل و عشق

ایک یک طرفہ مناظمہ

از

جناب پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بی۔اے

عقل .... میں رازِ حیات ہوں۔

عشق ....

مجھ کو یہ تسلیم ہے عقل ہے رازِ حیات
عشق سے ہے گرمیٔ معرکۂ کائنات

حضرتِ اقبال کا قول ہے یہ معتبر
"عقل مقامِ صفات عشق تماشائے ذات"

عقل ہے تہذیب کی نکتہ طرازی کا نام
عقل نکات آفریں عشق ہے حلِّ نکات

عقل ہے جہد و عمل عقل ہے کارآگہی
عشق سے پلتے ہیں یہ زندگی یا ثبات

عقل کناروں کا نام عشق سمندر تمام
عقل اسیری فقط عشق سراسر نجات

عقل .... جذبے کی تخلیق مجھ سے ہے۔

عشق ....

باعثِ تخلیق جذبہ عقل ہے
حاصلِ تحقیق جذبہ عقل ہے

زور پر آتا ہے جب دل کا گداز
عقل سے ہوتا ہے جذبہ بے نیاز

سخت عاجز ہیں یہاں دانائیاں
کون ناپے عشق کی پہنائیاں

راز اس کا چل کے پروانے سے پوچھ
کُن فیکاں کی بات دیوانے سے پوچھ

کیا بتائے عقل تجھ کو گُل کا راز
دُور ہے ادراک سے بلبل کا راز

دیکھ کر بادل کو چِلّاتا ہے مور
چاندنی میں رقص کرتا ہے چکور

مرد و زن ہوں یا ہوں کاہ و کہربا
عقل کا ان سے نہیں ہے واسطا

عقل کا ہے عشق کے دم سے ظہور
عشق کب ہے پرتوِ شمعِ شعور

عشق جوہر عشق اصلِ انس و جاں
عقل وقفِ امتیازِ این و آں

عقل ہے محض ایک بابِ اکتساب
عشق ہے دراصل فطرت کی کتاب

عشق ہے عرفانِ حُسنِ معتبر
اِس کے آگے عقل کے جلتے ہیں پر

عقل ہے ناسوت میں بھی سُست گام   عشق طے کرتا ہے لاہُوتی مقام

عقل...... میں انسانی تگ ودو کی موجب ہوں۔

عشق......

ازل سے تگ ودو میں غلطاں ہے عقل   بہت جُستجُو سے پریشاں ہے عقل
نہ رازِ جہاں آج تک پا سکی   نہ عرفاں کی دہلیز تک جا سکی
ہلاکت کے ساماں بناتی رہی   یہ قوموں کو باہم لڑاتی رہی
یہ ہیں عقل کی کارفرمائیاں   یہ ہیں عقل کی طُرفہ دانائیاں
یہ تفریق و تقسیم کرتی رہی   پراگندہ تنظیم کرتی رہی
بہت اُس نے دُنیا کی تزئین کی   بہت اُس نے انساں کو تلقین کی
یہ مرّیخ کا نام لیتی تو ہے   ستاروں کو پیغام دیتی تو ہے
مگر کون اُڑ کر وہاں جائے گا   وہاں کی فضاؤں سے ٹکرائے گا
وہی عشقِ بے باک وگردوں پناہ   بنائے گا افلاک کو گردِ راہ
کرے گا وہی جا کے پرچم بلند   ستاروں پہ ڈالے گا جا کر کمند
وہی عشق ہے اصلِ خیر الانام   ہوس کا اُسے کون دیتا ہے نام
سُن اے دوست بے لاگ توصیفِ عشق   بالفاظِ اقبال تعریفِ عشق

تیز و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو   عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا   اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ   عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہِ حرم عشق امیرِ جنود   عشق ہے ابن السبیل اِس کے ہزاروں مقام

"آجکل" دہلی

خوشتر صاحب!
سالنامہ یا کوئی نامہ آتے
آپ تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ روز نئی نظم کی فرمائش
لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی فرمائش
ہمیشہ بجا لاؤں۔ اِس لئے کہ اب
ہماری رفاقت کی سلور جوبلی بھی
تو ہو چکی ہے۔

مخلص
عرش ملسیانی

گوری چنبیلی

افسانہ

از

جناب کوثر چاندپوری

بھوپال ——— ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء

بھائی جان!

دن گزر رہے ہیں۔ کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ پھر بھی زندگی غیر دلچسپ نہیں، رنگین ہے۔ اور روز نئے نئے رنگ ابھرتے رہتے ہیں۔ اگر اس میں کہکشاں کے سے یہ رنگ نہ ہوتے تو غمِ دوراں میں۔۔ اتنی کشش اور مٹھاس کہاں سے آتی کہ آدمی ہر لمحے کڑوے گھونٹ پیتا ہے۔ اور سنورتا رہے۔ بلکہ سنوارتا بھی رہے۔ اور زندگی سے محبت کرتا رہے ——— نہ جانے میں کیا لکھ رہا ہوں۔ آپ سال میں ایک افسانہ نمبر نکالتے ہیں۔ اِن حقائق سے آپ کو کیا تعلق؟ ——— مگر نہیں، آپ حقیقت پرست ہیں۔ آج کی کہانی نرا افسانہ نہیں رہی۔ وہ ایک ٹھوس حقیقت بن چکی ہے۔ ممکن ہے "گوری چنبیلی" میں بھی یہ حقیقت جس پر کہانی کا غلاف چڑھا ہوا ہے اپنے اصل روپ میں نظر آجائے ——— عنوان کے لئے مولانا آزاد کا شکریہ ضروری نہیں۔ انھوں نے ہمارے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔

——— بس اب میں دہلی آنے ہی والا ہوں۔ آپ کتنا ہی مضحکہ اُڑائیں، لیکن میں سمجھتا ہوں دِلّی اب دُور نہیں ہے تین دن کے بعد بھوپال بڑا ہو کر راجدھانی بن جائے گا۔ اور یکم نومبر کی صبح نئی حکومت میں ہوگی۔ خدا کرے اُس دن ہر چیز نئی ہو جائے۔ یہاں کا ریڈیو اسٹیشن بھی اُسی روز جنم لے گا۔ یہ پتہ نہیں اُردو کا اس میں کیا حصہ ہوگا۔ لیکن نئی حکومت کے کانوں میں اگر پنڈت جواہر لال کے تازہ الفاظ کی گونج موجود رہی تو یقین ہے کہ اُردو کو اُس کا حق ملے گا۔ کاش ہمارے ملک کے ہر آدمی کے دل اور دماغ میں پنڈت جی کے دل ودماغ کی سی روشنی اور وسعت پیدا ہو جائے۔ میری رائے میں ملک اُسی وقت عظیم ہو سکے گا!

آپ کا

کوثر چاندپوری

وہ ایک مشہور کہانی کار تھا ———

سانولا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، بھنچا ہوا سینہ اور پتلی سی لمبی گردن۔ اُس میں مجموعی حیثیت سے کافی کشش تھی۔ اگرچہ ہر چیز کو الگ الگ دیکھنے سے بہت روکھے پن کا احساس ہوتا تھا۔ خاص طور پر اُس کی آنکھوں میں بہت ہی جاذبیت تھی۔ اُن میں مقناطیس چھپا ہوا تھا۔ اور غور کرنے پر دونوں آنکھوں سے مختلف قسم کے جذبات ظاہر ہوتے تھے۔ شراب سے بھرے دو جام تھے۔ جن کا کیف الگ الگ تھا۔ شعر وہ نہیں کہتا تھا۔ البتہ سُنتا ضرور تھا۔ اور بہت غور اور انہماک سے سُنتا تھا۔ جب کسی شعر میں کوئی دل دھڑکتا سُنائی دیتا تو اُس کی آواز خود اُسکی چھاتی

میں بھی گونج جاتی۔ وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی گھر سے نکل جاتا۔ اور ایک پارک میں جا بیٹھتا۔ جس کے سامنے جھیل کے شفاف پانی کی سطح پر لہریں مچلتی رہتیں اور مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں اُن پر کچوکے لگاتی رہتیں۔ وہ پتھر کی چکنی اور ٹھنڈی بنچ پر تکیئے کے سہارے بیٹھ جاتا۔ اور کہانیوں کے پلاٹ آگے پیچھے ذہن میں دوڑتے رہتے۔ عین اُسی وقت اُس کے شعور میں مچلتی ہوئی ایک کہانی مجسم ہو کر قریب آجاتی۔ اور شانہ جھنجھوڑ کر کہتی۔

"کیا اونگھ رہے ہیں آپ؟"

"نیند میرے حصے میں کہاں زاہدہ!" وہ چونک کر کہتا۔ "زندگی عجیب دور سے گزر رہی ہے۔ اس میں دو چیزیں برائے نام ہی رہ گئی ہیں۔ ایک نیند، دوسری مسکراہٹ۔"

"اور میں نے آپ کو سوتے بھی دیکھا ہے اور ہنستے بھی۔"

"میری ایک آنکھ سوتی ہے اور ہنستی ہے زاہدہ! جب، دوسری جاگتی اور روتی ہے، میرے ایک پہلو میں جنت ہے، دوسرے میں دوزخ!"

"بڑی عجیب بات ہے جاوید صاحب!"

"ہاں، عجیب، نہایت عجیب، اور یہ عجوبہ کبھی میری زندگی سے الگ نہ ہوگا ہمیشہ اس سے چپٹا رہے گا۔"

"میں خوب جانتی ہوں کہ رونے والی آنکھ کون ہے۔ اور ہنسنے والی کون؟"

"بتاؤ کون ہے؟"

"زاہدہ، اور کون۔ اور جو آنکھ ہنستی ہے وہ . . . ."

"اُس کا نام تمھاری لغت میں شاکرہ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟" جاوید جلدی سے بول اُٹھا۔

زاہدہ چپ ہو گئی۔ اُس کی نمناک نگاہیں جھیل پر مچلتی سیمابی لہروں سے باتیں کرنے لگیں۔ اور لبوں پر مہر سی لگ گئی۔

وہ سوچنے لگی —

"شاکرہ میری زندگی کے پُرسکون سمندر میں پتھر بن کر کہاں سے گر پڑی۔ اُس کے گرنے سے لہروں کے ہزاروں دائرے بن بن کر پھیلتے جا رہے ہیں۔"

زاہدہ جوان بھی تھی اور حسین بھی۔ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت کنول سے کھلے رہتے۔ اور رُخساروں پر گلاب مسکراتے۔ کوئی نوجوان اُس کی دوشیزگی کے حُسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا لیکن جاوید، نہ جانے اُس کے سینے میں دل تھا یا پتھر کی کوئی سِل رکھی ہوئی تھی۔ وہ اُسے دیکھتا اور بار بار دیکھتا لیکن ایک بار بھی وہ اظہارِ محبت نہ کرتا۔ جیسے زاہدہ صرف دیکھنے ہی کی چیز ہو۔ اُس سے محبت نہ کی جا سکتی ہو۔ جس زمانے میں جاوید سے ملاقات ہوئی ہے وہ نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی اور دوسری لڑکیوں کو نہ جانے کیونکر یقین ہو گیا تھا کہ وہ کہانیاں بہت اچھی لکھتی ہے اور اسی خیال سے زاہدہ کو کہانیوں کے ایک مقابلے میں حصہ لینے کے لئے مجبور کیا گیا وہ بہت حیران ہوئی۔ دراصل اُس نے کبھی کہانی نہیں لکھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اُسے دیکھ کر لوگوں نے افسانے لکھ دیئے ہوں۔ اُسی دن اُس کی ایک سہیلی نے اُس سے جاوید کا ذکر کیا۔ وہ جاوید کی اکثر کہانیاں پڑھ چکی تھی۔ اور انھیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے جاوید عورتوں کی بے کسی پر بہت کُڑھتا ہو۔ اور اُسے ان سے بہت ہمدردی ہو۔ زاہدہ جاوید کے تذکرے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ بہت غور سے سُنتی رہی۔ آخر میں بولی۔

"جاوید رہتے کہاں ہیں؟"

"میرے ہی محلے میں رہتے ہیں۔"

اُس کی سہیلی نے کہا۔ اور پھر جلدی سے اُس نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے ایک پتلے دُبلے آدمی کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ ہیں دیکھئے جاوید صاحب۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انھیں عورت ذات سے بہت ہمدردی ہے۔ وہ کہتے ہیں عورت کوئی مرمر کا کھلونا نہیں۔ وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ جس کے بغیر نہ صرف زندگی میں بلکہ کائنات میں خوبصورتی پیدا نہیں ہو سکتی۔"

جاوید کے پچکے ہوئے سانولے گالوں پر گنید سے کے خشک پھولوں کی سی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور بکھرے ہوئے سوکھے بالوں سے مردانہ وقار نمایاں تھا جس وقت تانگہ آگے بڑھ گیا۔ اور جاوید دھیرے دھیرے سڑک پر بڑھتا رہا تو زاہدہ کو اُس کی آنکھوں سے ایک ملکوتی حُسن جھانکتا محسوس ہوا۔ لمبی پلکوں کے زیرِ سایہ ایک گہری جھیل کروٹیں لے رہی تھی۔ اُس کی دھیمی دھیمی موجیں رنگوں کے جال میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ اُسی دن کالج سے واپسی پر وہ جاوید سے ملی۔

اور اگلے دن اُسے اپنے گھر چائے پر بلالیا۔ جاوید آیا۔ بالکل اُسی سادہ اور والہانہ انداز سے جو شروع سے اُس کی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ ململ کا اُجلا کرتہ اور لٹھے کا پائجامہ۔ پیروں میں بھاری بھاری پشاوری چپل۔ ماتھے پر بہت سی سلوٹیں جو کبھی بالکل مٹ جاتیں، کبھی بہت اُبھر آتیں۔ بائیں ہاتھ کی کلائی پر چھوٹی سی سُنہری گھڑی۔ اور کرتے کے گریبان میں سبز رنگ کا شیفر اُلجھا ہوا۔ ہاتھ میں چمڑے کا پٹھانی بیگ۔ اُسے دیکھتے ہی زاہدہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اب تک اُس نے جاوید کی ایک کہانی بھی نہیں پڑھی تھی۔ لیکن وہ اُس کی شخصیت سے مرعوب ہوئی جا رہی تھی اُس کی پیشانی پر بار بار بننے اور بگڑنے والی سلوٹیں ہر لمحہ کہانی لکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور جاوید کا وجود بھی ایک بہت ہی دلچسپ افسانے میں ڈھل گیا تھا۔ وہ آپ ہی اُس کا پلاٹ اور موضوع تھا۔ جس میں انقلابیت بھی تھی اور رومانیت بھی اِن دونوں کو ملا لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ وہ ایک انقلابی رومانیت کا ترجمان تھا۔

"سُنا ہے آپ افسانے بہت اچھے لکھتے ہیں" زاہدہ نے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

"افسانے تو ضرور لکھتا ہوں لیکن ضروری نہیں کہ وہ بہت اچھے بھی ہوں"

"میں نے تو یہی سُنا ہے"

"پھر تو ضرور ایسے ہی ہوتے ہوں گے"

"نہ جانے آپ کون سی چائے پسند کرتے ہیں۔ یہ اچھی نہ ہو تو دوسری منگواؤں"

"یعنی مولانا آزاد والی وہائٹ جیسمن! (WHITE JASMINE)"

جاوید اُس کی طرف نگاہیں اُٹھا کر بولا۔ وہ سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس تھی اور درمیان اُس کا ہلکا گلابی چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سفید بادلوں کے نقاب سے سُورج جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ زاہدہ بہت زیادہ شرما گئی۔ ابھی ابھی جب وہ چائے لا رہی تھی اُس کی چچازاد بہن نے مذاق میں کہا تھا۔

"زاہدہ! تم تو بالکل گریس چنبیلی بنی ہوئی ہو"

اور اب اُسی لفظ کا جاوید نے انگریزی میں ترجمہ کر دیا تھا جیسے دونوں نے اُسی وقت غبارِ خاطر میں چائے کی کہانی پڑھی ہو۔ اور وہ سچ مچ اِسی کے لئے لکھی گئی ہو۔

"میں چاہتی ہوں ایک کہانی آپ میرے لئے لکھ دیں"

"آپ کے لئے لکھ دوں یا آپ پر لکھ دوں؟ ذرا صاف صاف کہئے!"

"نہیں میرے لئے لکھ دیجئے!"

"یہ بات ذرا مشکل ہے۔ البتہ آپ پر آسانی سے کہانی لکھی جا سکتی ہے تھیم تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میٹر بھی موجود ہے۔ بس کوئی عمدہ سی تکنیک ڈھونڈنی پڑے گی"

وہ ایک بار اور جھینپ گئی۔

جاوید چائے پی کر چلا آیا۔ اور اُسی دن شاکرہ سے اچانک اُس کی ملاقات ہوئی۔ وہ اُس کے قریب ہی اپنے کسی عزیز کے یہاں رہتی تھی۔ جاوید زاہدہ کے لئے کہانی لکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کاغذ سامنے رکھا تھا اور قلم انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ خیالات کی آندھی دماغ میں سنسنا رہی تھی۔ اُسی وقت ایک چھوٹا سا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"کوئی دوا ہوگی آپ کے پاس؟"

اُس کی آواز میں گھبراہٹ کے ساتھ ہی ایک عجیب بھولپن تھا۔

"کیسی دوا؟"

"جس سے امّی جان اچھی ہو جائیں"

"کیا ہوا انھیں؟"

"دَورہ پڑ گیا ہے ــــ ابا جان کا خط پڑھتے ہی وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ رہیں۔ خالہ جان کہتی ہیں دَورہ پڑ گیا ہے"

جاوید نے قلم میز پر ڈال دیا اور بے تابی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"کہاں ہیں تمھاری امّی؟"

"خالہ جان کے یہاں۔ اور خالو جان آفس گئے ہیں ــــــ امّی اب تک بے ہوش پڑی ہیں!"

"بیہوش پڑی ہیں ــــــ اور میری سائیکل پنکچر ہے ــــ ڈاکٹر

حکیم ——— دوا ——— اچھا میں ایک دوا دیتا ہوں۔" جاوید کو یاد آ گیا کہ اُس کے یہاں گلاب کی بوتل رکھی ہے۔ وہ گرمیوں میں شربت میں ڈالنے کو لایا تھا۔ جلدی سے ایک گلاس میں تھوڑا عرق انڈیل کر اُس نے لڑکے کو دے دیا

"دوڑ کر جاؤ بیٹا۔ اور یہ دوا اپنی امّی کو پلا دو۔"

"اچھی ہو جائیں گی ہماری امّی ؟" اُس نے بہت ہی معصومانہ انداز سے پُوچھا۔ اُس کی آنکھوں میں شکریے کے جذبات مچل رہے تھے۔ جنھیں وہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔

"ضرور اچھی ہو جائیں گی۔"

لڑکا چلا گیا۔ اور جاوید نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ آدھ گھنٹہ گزرنے سے پہلے ہی لڑکا خالی گلاس لے کر آیا۔ اور خوشی سے بولا۔

"تم بہت اچھے ڈاکٹر ہو ——— ہمارے ابا جان سے بھی اچھے ——— تمھاری دوا سے امّی جان اچھی ہو گئیں ——— کتنے پیسے ہوئے ؟" اُس نے دو روپے کا ایک نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

"دوا پیسوں کی نہیں تھی بیٹا !"

"جب ہی تو میں روپے دے رہا ہوں۔"

جاوید ہنس پڑا اور اُسے گود میں اُٹھا کر پوچھا۔

"کیا نام ہے تمھارا ؟"

"میرا نام کمال ہے !"

"کمال ! ——— کاش میں تمھیں اپنا سکتا۔"

کمال جلدی ہی واپس چلا گیا۔ اور ذرا دیر بعد شاکرہ نے جاوید کو ڈھونڈ کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

کمال اب روز ہی جاوید کے پاس آنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے باپ کا نام جمال ہے۔ وہ لاہور میں پریکٹس کرتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ کمال اور اُس کی امّی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن جلد ہی ایک اور امّی بھی گھر میں آ گئیں اور ابا نے اُس کی امّی کو یہاں بھیج دیا۔ اب وہ کبھی اُنھیں نہیں بُلائے گا۔ اپنے تازہ خط میں اُس نے نہ جانے کیا لکھا ہے کہ اُسے پڑھتے ہی امّی جان۔ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جاوید کو شاکرہ کے حالات جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ اور جلد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر جمال سے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُسے شاکرہ سے [illegible] تھی لیکن اب وہ ایک اور عورت کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اور شاکرہ کو اُس نے بالکل چھ[وڑ] دیا ہے۔ وہ زندگی کے سمندر میں بغیر بادبان کی کشتی کے مانند موجوں پر ڈول [رہی] ہے ——— !

اور جاوید نے اِسی موضوع پر ایک اچھی سی کہانی لکھ کر زاہدہ کے پا[س] بھیجدی۔

زاہدہ کو پہلا انعام مل گیا۔

اور جب وہ شکریہ ادا کرنے جاوید کے پاس آئی۔ تو بار بار دورا[ن] گفتگو میں پُوچھتی رہی۔

"کیا سچ مچ شاکرہ کسی عورت کا نام ہے ؟"

"کیا اُس کا کوئی وجود ہے ؟"

"ہر اچھی کہانی ایک حقیقت ہوتی ہے۔" جاوید نے کہا۔ "وہ زند[گی] اور ہمارے سماج کی اصل تصویر پیش کرتی ہے۔ اگر شاکرہ نام کی عورت مو[جود] نہیں ہے تو اُس جیسا کوئی نہ کوئی کردار ہمارے آس پاس ضرور ہوگا بہر حا[ل] شاکرہ کا وجود ہو یا نہ ہو مجھے اُس سے اور اُس جیسی دوسری عورتوں سے نہا[یت] گہری ہمدردی ہے۔"

"ہمدردی مجھے بھی ہے۔ میں اُس کے اور کمال کے لئے بڑی سے بڑ[ی] قربانی کر سکتی ہوں۔ کس قدر المناک ہے اُس کی داستانِ حیات !"

جاوید روز ہی تفریح کرنے کا عادی تھا۔ اور وہی پارک اُس کی ج[ولانگاہ] تھا جہاں زاہدہ کی شکل میں ایک دلچسپی کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی اُسی و[قت] پارک میں پہنچ جاتی۔ کبھی جاوید سے پہلے کبھی اُس کے بعد۔ دیر تک [باتیں] کرتے رہتے۔ لہروں کی باتیں۔ آس پاس کھلے ہوئے پھولوں کی باتیں، اُن [کی] پتّیوں پر لرزتی ہوئی اوس کی باتیں۔ اور کبھی کبھی شاکرہ کی باتیں۔ جس کے [متعلق] معلومات حاصل کرنے کا زاہدہ کو بہت اشتیاق تھا۔ وہ جاننا چاہتی [تھی] کیا شاکرہ واقعی کسی عورت کا نام ہے ؟ زاہدہ اب جاوید سے محبت کر[تی تھی] اور چاہتی تھی کہ دُنیا کی کوئی عورت اِس محبت میں شریک نہ ہو۔ وہ [illegible]

ادہ کرکے آتی کہ آج ضرور جاوید کو اِس راز سے آگاہ کر دے گی۔ وہ صاف صاف دے گی کہ ایک ایسی کہانی بھی لکھ دے جو حقیقت سے ہم آغوش ہو۔ لیکن جاوید طرح کی باتیں کرتا اور عشق و محبت کی باتوں سے ہمیشہ بچتا۔ زاہدہ جب گفتگو کا موضوع اُدھر موڑتی وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچکر کسی مظلوم کا قصہ چھیڑ دیتا۔ اور زاہدہ دل کا راز دل ہی میں چھپائے ناکام واپس چلی جاتی۔ جاوید نے غم دوراں کے اتنے قصّے بیان کئے تھے کہ زاہدہ اب اِس لفظ ہی سے چڑنے لگی تھی۔ وہ اکثر سوچتی کہ اُس کی ریشمی زُلفیں جاوید کی نگاہوں کے سامنے بکھیلی ہوئی گھر کی جیادر کیوں نہیں چاک کر دیتیں۔ اِس کے حسین اور گلابی رُخسار اُس کے دل میں رُومانی آگ ہی کیوں پیدا نہیں کرتے۔ وہ روز ایک نہ ایک واقعہ بیان کرکے اُس کے شانوں پر لہراتے ہوئے بالوں کی توہین کر ڈالتا ہے۔ اور اُس کے خوبصورت رُخساروں کو گردآلود کر دیتا ہے۔ جاوید کا دل کیوں نہیں پسیجتا۔ وہ اِس بے التفاتی کے باوجود اُسے دل میں بٹھائے پُوجتی رہی۔ جاوید اُسی طرح چُپ رہا۔

وہ روزانہ پارک آتا۔ زاہدہ سے باتیں کرتا۔ اُس کی کسی بات میں کبھی زاہدہ محبت کا والہانہ پن محسوس نہ کرتی۔ جاوید نے اکثر اُسے اشعار سُنائے تھے۔ لیکن وہ شعر بھی کچھ عجیب طرح کے ہوتے تھے۔

"تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں بہت دُور جا رہا ہوں! تم میرے ساتھ نہ چل سکو گی۔ اِن کالی زلفوں کا سایہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے! یہ مجھے راستے ہی میں سو جانے کی ترغیب دیتا ہے ۔۔۔!"

ایک بھی ایسا شعر اُس نے نہ سُنایا تھا جس میں محبت کا پیام ہوتا۔ دل کی دھڑکن ہوتی۔ ہجر و فراق کے اضطراب و بے قراری کا بیان ہوتا۔ کبھی کبھی زاہدہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ جاوید نے اُسے بھی کہانی کا ایسا کردار بنا رکھا ہے جس کا کوئی وجود نہ ہو!

جاوید پارک سے اُٹھ کر سیدھا اپنے دفتر چلا جاتا۔ اور بارہ بجے تک وہاں کام کرتا رہتا۔ پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ اور کھانے کی میز پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ سگریٹ پیتا۔ اُس کے بعد پھر دفتر چلا جاتا۔ شام کو وہ شاکرہ کے یہاں جاکر کمال سے باتیں کرتا۔ اور اُس سے دن بھر کے حالات معلوم کرتا۔

کمال کا چہرہ آہستہ آہستہ بے رونق ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کا جسم پہلے ہی کافی گھُل چکا تھا۔ وہ نوکروں کی طرح اپنی خالہ کے یہاں کام کر رہا تھا۔ ایک دن جاوید پہنچا تو وہ رو رہا تھا۔ جاوید کو دیکھتے ہی اُس نے زور سے ایک چیخ ماری۔ اور بے اختیار اُس سے لپٹ کر بولا۔

"ڈاکٹر! ـــــــ خالو جان نے آج ہمیں خوب مارا۔ وہ ہمیں اپنے گھر نہیں رکھنا چاہتے۔"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں تم منحوس ہو۔ جس روز صبح کو میں تمھاری صورت دیکھ لیتا ہوں دن بھر دفتر میں ڈانٹ پڑتی ہے۔ آج یوسف میاں نے اُن سے ہماری شکایت کر دی۔ وہ انھیں بہت چاہتے ہیں۔ اُس سے بھی زیادہ جتنا ہمارے ابا جان ہمیں چاہتے تھے"

وہ جھُوٹ کہتے ہیں کمال! تم منحوس نہیں ہو۔ تم تو ایک خوشنما پھول ہو۔ تمھارے خالو جان آپ ہی نالائق ہیں۔ وہ اپنی ہی صورت آئینہ میں دیکھ کر دفتر جائیں تو یقیناً نوکری سے الگ کر دیئے جائیں۔ یہ تمھاری صورت ہی کا اثر ہے کہ معاملہ صرف ڈانٹنے تک پہنچکر ختم ہو جاتا ہے۔"

کمال ہنسنے لگا۔

"تمھاری امی کا کیا خیال ہے؟"

"وہ بہت رو رہی ہیں۔ سوچتی ہیں کسی طرح جلد ہی خالو جان کے گھر سے چلی جائیں۔"

"گھبراؤ نہیں ہم اپنے گھر لے چلیں گے تمھیں۔"

"اور امی کہاں جائیں گی؟"

"وہ بھی وہیں چلیں گی۔"

جاوید نے شاکرہ اور کمال کے لئے اپنا مکان خالی کر دیا۔ اُس رات وہ اپنے ایک دوست کے یہاں رہا۔ سویرے ہی وہ بہت سی مٹھائی لے کر گھر پہنچا تو کمال بہت خوش تھا۔ ایک ہی رات میں اُس کی حالت بدل گئی تھی۔

"امی کہتی ہیں اب ہم یہیں رہیں گے!"

"وہ ٹھیک کہتی ہیں۔"

"اور میں چاہتا ہوں آپ بھی یہیں رہیں!"

غزل

از

جناب سردار جلیل شیرکوٹی

صہبا کہاں گئی، وہ مرا جام کیا ہوا
آخر یہ آج، ساقیِ گلفام کیا ہوا

وہ جانِ گلستاں، وہ گل اندام کیا ہوا
سچ سچ بتا یہ گردشِ ایام کیا ہوا

منزل نشیں کو جادۂ منزل کی کیا خبر
رہرو سے پوچھیے، کہ ہر گام کیا ہوا

رکھ حوصلے بلند، عزائم بلند تر
یہ غم نہ کر کہ سعی کا انجام کیا ہوا

بجلی سی اِک ضرور نظر آئی تھی جلیل
پھر کچھ خبر نہیں کہ سرِ بام کیا ہوا

سردار جلیل

شاکرہ دُور بیٹھی کمال کی باتیں سُن رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر اُسکے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ جاوید اُس کی ذہنی کشمکش سے واقف تھا۔ وہ اُس کے چہرے پر سب کچھ پڑھ رہا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے شاکرہ سے کہا۔

"آپ ہی بتلایئے میں کمال کی یہ آرزو کیونکر پوری کر سکتا ہوں؟"

شاکرہ نے گردن جھکالی۔

جاوید اُس روز پارک نہیں گیا۔

اگلے روز وہ شاکرہ اور کمال کے ساتھ بہت سویرے وہاں پہنچ گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ زاہدہ سنگِ مرمر کی اُسی چینی اور ٹھنڈی بینچ پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ اُس کی پلکوں میں آنسو اُلجھے ہوئے ہیں۔ جاوید اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"زاہدہ! ——— زاہدہ! تم رو رہی ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ نہایت گہری اور بیکراں محبت!"

"کل آپ کیوں نہیں آئے؟"

"یہ نہ پوچھو زاہدہ! ہو سکتا ہے آئندہ بھی اس پابندی سے نہ آ سکوں۔"

"کیوں؟ ——— کیا محبت ہمیں ایک دوسرے سے دُور کر دے گی؟"

"ہاں دُور ——— بہت دُور ——— صرف مرد اور عورت کی حیثیت سے اور اُن تعلقات کے اعتبار سے جو لازمی طور پر محبت کا انجام فرض کر لئے گئے ہیں!"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جاوید صاحب؟"

"صرف یہی کہ میں نے شاکرہ سے شادی کر لی ہے۔"

"کون شاکرہ؟"

"وہی تمھاری کہانی والی۔ دراصل اس شادی کا محرک کمال ہے ——— میں چاہتا ہوں اب اُسے کوئی منحوس نہ کہے۔ زاہدہ! ایک بچہ جو بڑی نسل اور اُس کے مستقبل کا باپ ہو اُسے منحوس کہنا کتنی بُری بات ہے۔ میں چاہتا ہوں زاہدہ! تم بھی اس وقت اپنا وعدہ پورا کرو۔ اور شاکرہ اور کمال کے لئے بڑی سے بڑی نہیں، ایک چھوٹی سی قربانی کر ڈالو۔"

زاہدہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ وہ اپنے آنسوؤں کو شاکرہ سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس وقت بھی وہ بالکل شفاف لباس پہنے ہوئے تھی لیکن اُس کا چہرہ گلابی نہیں تھا، وہ چنبیلی کے پھولوں کی مانند سفید تھا۔ وہ سچ مچ گوری چنبیلی معلوم ہو رہی تھی

میں نے کہا ـــ

"مجال ہے جو کوئی بے وقوف بنا جائے۔ جتنے تحفے دیئے ہیں سب اُگلوا کر چھوڑوں گا۔ دُرانی کی بچی کی سالگرہ میں اُونی سُوٹ دیا تھا میں نے چالیس رُوپے کا۔"

بیوی نے کہا ـــ "لوگ یہ نہ کہیں گے کہ اب تک تو کبھی سالگرہ ہوئی نہیں۔ یہ ایک دم کیسے پیدا ہوگئیں۔ اپنی پینتسویں سالگرہ منانے۔"

میں نے کہا ـــ "کہدینگے کہ ہر سال مناتے تھے سالگرہ، اب کی ذرا شاندار طریقے پر منائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کارڈ میں آپ کی عمر پینتس برس نہیں بلکہ تیّس لکھی گئی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے۔ اِس لئے کہ اب ہر سال یہ تقریب منائی جائے گی۔"

کارڈ تقسیم کر دیئے۔ پارٹی کے انتظامات مکمّل ہو گئے۔ اور اپنے نزدیک کوئی ایسا عزیز یا دوست نہیں چھوڑا جو تحفے کے سلسلے میں مقروض نہ ہو۔ سب ہی کو دعوت دی گئی اور ہمارے گھر کو گھر دلہن کی طرح سجادیا گیا۔ ایک نہایت شاندار کیک بھی بنوالیا جس پر چھوٹی چھوٹی بتّیس شمعیں لگی ہوئی تھیں۔ پارٹی کا جو بجٹ بنایا تھا اُس سے بڑھ کر رقم خرچ کرنا پڑی۔ اِس لئے کہ شاندار تحفے وصول کرنے کو پارٹی بھی شاندار ہی ہونا چاہیئے۔

جہاں مہمانوں کی نشست کا اہتمام تھا وہاں وسط میں ایک بڑی سی میز تحفوں کے لئے رکھ دی۔ اور اُس پر سب سے پہلا تحفہ خود اپنا سجادیا۔ یہ ایک نیکلس تھا جو دراصل بیوی کو جہیز میں ملا تھا۔ صرف اُس کا خوبصورت سا ڈبہ اب خرید لائے تھے تاکہ باقاعدہ تحفہ معلوم ہو۔ اُس پر یہ فقرہ لکھ دیا ـــ

"اُس کے لئے ہار جو گلے کا ہار ہے۔"

مقررہ وقت پر مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اور جو آتا وہ بغل سے ایک پیکٹ نکال کر میز پر رکھ دیتا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں تحفوں کی میز تحفوں سے لد گئی۔ اور پارٹی اُس کیک کو کاٹنے سے شروع ہوئی جو اِسی تقریب کے لئے پچاس روپے صرف کرکے بنوایا تھا۔

سہ پہر سے چراغ جلے تک اِس پارٹی کی چہل پہل رہی۔ اِس کے بعد ایک ایک کرکے مہمانوں نے رخصت ہونا شروع کر دیا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ یہ مہمان اب رخصت ہوں تاکہ میں اِن قیمتی تحائف کو دیکھ سکوں چنانچہ سب مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں بیوی کو لے کر تحفوں کی میز پر آیا۔ اور سب سے پہلے درّانی کا تحفہ ڈھونڈ کر کھولا۔

میں نے ایک دم چونک کر کہا ـــ

"یہ کیا، یعنی بس تین رومال۔ زیادہ سے زیادہ تین روپے کے ہوں گے!"

بیوی نے رضوی کے تحفے کا بکس بڑھا کر کہا ـــ "یہ دیکھئے، یہ کوئی چیز ہے۔"

میں نے یہ پیکٹ بھی کھولا تو اُس میں سے ایک مٹی کا گلدان نکلا جو عام طور پر ڈیڑھ روپے کا لاہور میں اور چودہ آنے کا ملتان میں ملتا ہے۔ بیوی نے ایک پیکٹ کھول کر ایک عدد تولیا دکھائی ـــ

"یہ احسان صاحب کا تحفہ ہے۔"

میں نے جل کر کہا ـــ "رکھ دو۔ یہ عرقِ انفعال پونچھنے کے کام آئے گا۔ اور یہ کیا ہے، سینٹ کی شیشی۔ بخدا یہ دس بارہ آنے کی ہوگی۔"

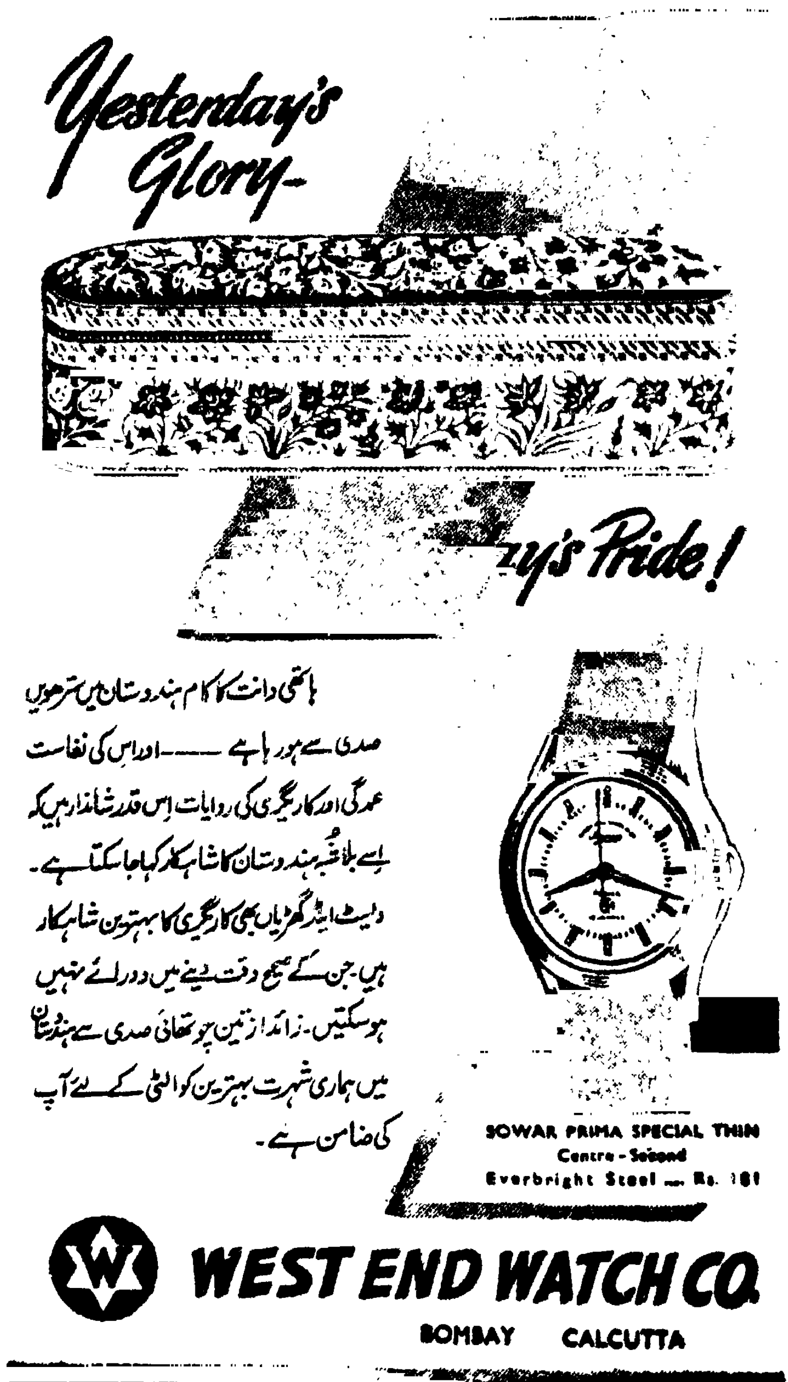
بیوی نے ایک ڈبہ کھول کر لپ اِسٹک دکھائی ـــ "یہ ہے البتہ تین روپے کی۔"

میں نے گھبرا گھبرا کر اب تمام پیکٹ کھولنا شروع کر دیئے۔ کسی میں کنگھی تو کسی میں ازاربند ڈالنے کی تیلی۔ کسی میں تیل کی شیشی تھی تو کسی میں دھوبی کا حساب لکھنے کی کاپی۔ کسی میں اچار کی بوتل تھی تو کسی میں دستی آئینہ۔ اور جب تمام تحفے دیکھ لئے تو اندازہ یہ ہوا کہ "یہ مال ملے گا چھ آنے" قسم کے تحفے مجموعی طور پر چالیس روپے سے کسی طرح زیادہ کے نہ تھے۔

پارٹی پر صرف ہوئے تھے پونے تین سو۔ بیوی کو ساری اِسی پارٹی کے لئے لاکر دی تھی ایک سو ساٹھ کی۔ گویا صرف کئے تھے ساڑھے چار سو کے قریب اور آمدنی ہوئی تھی صرف چالیس کی۔

بیوی تو ہنس ہنس کر دوہری ہوگئیں مگر میں نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا ـــ

"اب کوئی بُلائے سالگرہ میں، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے!"


Yesterday's
Glory—
y's Pride!
ہاتھی دانت کا کام ہندوستان میں سترھویں
صدی سے ہو رہا ہے ——— اور اس کی نفاست
عمدگی اور کاریگری کی روایات اس قدر شاندار ہیں کہ
اسے بلاشبہ ہندوستان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔
ویسٹ اینڈ گھڑیاں بھی کاریگری کا بہترین شاہکار
ہیں جن کے صحیح وقت دینے میں دو رائے نہیں
ہو سکتیں۔ زائد از تین چوتھائی صدی سے ہندوستان
میں ہماری شہرت بہترین کوالٹی کے لئے آپ
کی ضامن ہے۔
SOWAR PRIMA SPECIAL THIN
Centre - Second
Everbright Steel ... Rs. 181
WEST END WATCH CO.
BOMBAY CALCUTTA

غزل

افسانہ

از

جناب پروفیسر شکیل الرحمٰن ایم اے

سری پرتاپ کالج - سرینگر کشمیر

برادرم!

آپ کا خط ملا - پرچے بھی رجسٹری سے مل گئے ہیں ـــــــ غزل میں غزل کی تکنیک سے کہاں تک فائدہ اٹھایا گیا ہے - اسے پڑھنے والے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں - اس افسانے کے دونوں کردار مس شہلا اور شکیل صاحب فرضی ہیں - میرے پاس میرے افسانوں کے متعلق جو خط آتے ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرے فرضی کرداروں کو کچھ لوگ فرضی سمجھنے کو تیار نہیں ہیں - اب اُن کی یہی خوشی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ کشمیر کب تشریف لا رہے ہیں؟ ـــــــ بچوں کو پیار - بھابی کو آداب -

مخلص

شکیل الرحمٰن

وہ ایک غزل تھیں!

اُن کی آنکھوں میں مطلع کا کوئی شعر گم ہو گیا تھا ـــ!!

کبھی وہ آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ "حریم ذات" ہمیں میری "نوائے شوق" سے شور ہے - اور "بت کدۂ صفات" میں "غلغلہ ہائے الاماں" ہے - اور کبھی یہ کہتی تھیں کہ اُن "شوق" کو دل میں بھی "تنگیٔ جا" کا گلہ ہے - اور دریا کا "اضطراب" "گہر" میں جذب ہو ... کے ہونٹوں کو دیکھ کر بھی یہ خیال آتا تھا کہ کسی غزل کے دو خوبصورت مصرعے ... کے ساتھ مل کر کسی ایک خاص تصور کو پیش کر رہے ہیں - اُن کے مصرعوں ... "شوق" "موج بہار" اور "موج شراب" چاروں موجیں تھیں غالب ... کرنے والے ہونٹ شاید یہی ہوں گے - زلفوں ... "فرد" اور "قلب و نظر" کو شکار کرنے کے لئے ... چاہئے - اور کبھی یہ کہنے کو جی چاہتا تھا کہ اگر اس طرح ... توقعات کی مداری کا بھرم کھل جائے - اُن کے رخسار پہ

دھانی آنچلیں اور اُن آنچلوں کا نام ایک ایسے "عنوان" کو پیش کر رہا تھا جس میں داستان کے ابتدائی عناصر کی پرچھائیاں مل رہی تھیں - لیکن "عروج" اور "تکمیل داستان" کا کوئی نشان نہ تھا - اُن کے رخسار میں پوری رقص کا کنوارا پن تھا - اور وہ شرم تھی جو کسی کی کسمساہٹ سے ابھی ابھی باہر آئی تھی - جہاں بھی نظر جاتی تھی ایک مکمل شعر نظر آتا تھا - دو مصرعے، ایک دلفریب اور پیارے تخیل کے ساتھ ـــــ وہ واقعی ایک غزل تھیں!

میں اکثر سوچتا تھا کوئی عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟؟ کبھی یہ بھی خیال آتا تھا کہ وہ غزل نہیں ہیں - یہ سب کچھ میری نگاہوں کا فریب ہے لیکن جب دوسرے لوگ اُن کے حسن کی تعریف کرتے تھے تو مجھے اپنی سادگی کا احساس ہو جاتا تھا - اس لئے کہ اُن میں کسی پیاری غزل کا سارا سوز و گداز موجود تھا ـــ!

میں نفسیات کا لیکچرار تھا - اور وہ انگریزی پڑھاتی تھیں جب انھوں نے کالج میں اپنے شعبے کا چارج لیا اُس وقت ہمیں محسوس ہوا کہ رات جو کسی سوچ

میں ڈوبی ہوئی تھی چونک گئی ہے۔ کچھ ہی دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ دلچسپی لے رہی ہیں۔ ایک روز جب ہم دونوں اسٹاف روم میں بیٹھے تھے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا کچھ اس طرح جیسے انھوں نے مجھے دیکھا نہ ہو۔ مجھے "تیر نیم کش" اور "خلش" کی بات یاد آگئی۔ میں کچھ چونک سا گیا۔

"موسم کی جو تبدیلی ہو رہی ہے اُس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟"

اُنھوں نے سوال مجھ سے کیا تھا۔ لیکن اُن کی نگاہیں میک نیس کی نظم پر تھیں اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اُنھوں نے دوسرا سوال سامنے رکھ دیا۔

"کشمیر آنے سے پہلے آپ کہاں تھے ؟"

"اڑیسہ میں، وہاں ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار تھا۔"

"سردیوں میں وطن جائیں گے ؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"نہیں، خیال تو جانے کا نہیں ہے !" میں نے جواب دیا۔

"کیوں ! — یہاں کی سردی تو برداشت نہیں کی جا سکتی۔ آپ ضرور چلے جائیے !"

"میرا وطن بہت دُور ہے مس شہلا ! میری جو موجودہ حالت ہے اُس میں تو آنا جانا ناممکن ہی ہے ! آپ کو کیا بتاؤں ؟"

اب اُن کی نگاہیں میکس نیس کی نظم پر نہیں تھیں۔ وہ میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میری صورت سے میرے دل کا حال جاننا چاہتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ میری صورت سے بہت کچھ سمجھ چکی ہیں۔ پھر گھنٹہ بج گیا اور میں اُنھیں کامن روم میں چھوڑ کر کلاس چلا گیا۔

کلاس میں "لاشعور اور خواب" پر ایک لیکچر دینا تھا۔ میں لیکچر دیتا رہا۔ میں نے بتایا کہ کس طرح لاشعور میں دبی ہوئی باتیں خواب میں آتی ہیں۔ اور اُس روز میں نے ایک ایسا خواب دیکھا جسے میں اب تک بھولا نہیں ہوں۔

میں نے دیکھا۔

میں مصر کے اہرام کے درمیان کھڑا ہوں۔ اور میرے سامنے ایک کمسن دوشیزہ ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"تم کون ہو ؟"

"نیند کی کاجل،"

"کیوں آئی ہو ؟"

"تمھیں ایک تحفہ دینے !"

"کیسا تحفہ ؟"

اور اُس نے ایک چھوٹا سا صندوق دیا۔ نہایت ہی خوبصورت صندوق

اُس نے کہا۔

"اس صندوق میں پنچ تنتر کی ایک کہانی بند ہے۔ اِس کہانی سے دوستی کرو گے ؟"

'پنچ تنتر کی ایک کہانی ؟ اِس کہانی سے دوستی کروں گا ؟' میں سوچنے لگا۔ وہ کمسن دوشیزہ چلی گئی۔ میں نے صندوق کھولا۔ اُس میں سے ایک نہایت ہی پیارا خرگوش نکلا۔ میں نے خرگوش کو پیار کیا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھل کر بھاگ گیا۔ میں نے دیکھا، ایک ٹوٹے ہوئے اہرام کے نزدیک ایک دوسرا خرگوش اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا اور اہراموں کے درمیان نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ میری نگاہوں کے سامنے مصر کے ٹوٹے ہوئے اہراموں کے سوا اور کچھ نہ تھا —— میں بیدار ہو گیا۔

دوسرے دن میں نے اپنا خواب مس شہلا کو سنایا تو وہ مسکرائیں۔ اُنھوں نے کہا "شکیل صاحب ! آپ نفسیات کی دُنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔ اب تو آپ کو اپنی بھی خبر نہ رہے گی !"

اِس کے باوجود اُنھیں سگمنڈ فرائیڈ اور ینگ کے بعض ایسے خیالات سے اتفاق تھا جن خیالوں سے مجھے اختلاف تھا۔ میں تحلیلِ نفسی نہیں کر سکا۔ کوشش کرنے سے کچھ باتیں ضرور سمجھ میں آ جاتیں لیکن میں اس گورکھ دھندے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی میرے لیے کیا کم بات تھی کہ مس شہلا مجھ سے اور میری زندگی سے دلچسپی لے رہی تھیں۔ مجھے تو بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجھے کوئی سہارا ملا ہے۔ مجھے اپنی بیکاری کے دن اور بیکاری کی راتیں یاد تھیں۔ میں سوچتا تھا، اگر مس شہلا اُن دنوں میرے قریب ہوتیں تو کتنی ڈھارس اور کتنا اطمینان ہوتا۔ میں اب بھی اپنی بیکاری کے دن یاد کر کے اکثر کانپ جاتا ہوں —— !

ایک دن مس شہلا سے میری ملاقات ٹول گیٹ پر ہوئی۔ اور ہم دونوں شکارے سے نہرو پارک گئے۔ اُس روز اُنھوں نے میری زندگی کی پوری داستان سُن لی

جھیل کی لہروں پر شکارے کی وہ سیر مجھے اب تک یاد ہے۔ مس شہلا نے کچھ اس طرح میرے حالات پوچھے کہ کوئی بات چھپا نہ سکا۔ فلاتے کی راتوں سے بعض لڑکیوں کی محبت تک ساری باتیں کہہ دیں۔ مس شہلا نے سب کچھ سنا۔ اُن کی سانس میری کہانی کی رفتار سے بہت قریب تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میری کہانی کا ہر عنصر اپنے دل تک لئے جا رہی ہیں۔ اُس دن کی شام نہرو پارک میں گزری۔ وہاں ہم دونوں نے کافی پی۔ لوٹتے وقت میں تنہا تھا۔ اِس لئے کہ پارک میں اُن کے کسی عزیز سے اُن کی ملاقات ہو گئی تھی اور اُنھوں نے مجھ سے معذرت چاہی تھی۔ میں لوٹتے وقت کھو گیا تھا۔ چاند کی روشنی ہاؤس بوٹوں پر پڑ رہی تھی۔ ہاؤس بوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اُن کے سفید کپڑے برف کی طرح چمک رہے تھے۔ کسی ہاؤس بوٹ سے ریڈیو سے جلترنگ کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ جھیل میں چپّو کی آواز میں بھی عجیب لطف آ رہا تھا۔ دوسری طرف شنکر آچاریہ کی پہاڑی تھی۔ اور اُس کی چوٹی کے مندر کی روشنی!! میں خاموش تھا۔ میں نے سوچا جھیلم کی لہروں میں کتنی نغمگی ہے۔ شنکر آچاریہ کے مندر پر کتنا جلال ہے۔ ہاؤس بوٹوں کے سفید کپڑوں میں نہ جانے کتنے چاند پگھل گئے ہیں۔ شکارے میں آگے بڑھنے کی کتنی لپک ہے۔ مس شہلا نے مجھے کتنا قریب کر لیا ہے۔ جب میں نے اُن سے ایک دن کہا تھا کہ آپ عورت نہیں، غالبؔ کی کوئی غزل ہیں! تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اُن کے رخساروں پر اور سُرخی آ گئی تھی۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔۔۔!" جب میں ڈل گیٹ واپس آیا تو میں واقعی کھو گیا تھا۔

وہ جب سے آئی تھیں، کالج میں عجیب زندگی آ گئی تھی۔ مجھے تو ایک خاص دوست مل گئی تھی۔ میں کلاس میں لیکچر دیتا تھا تو اُن میں کچھ عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ فرصت کے لمحوں میں مس شہلا بہت ساری باتیں کرتی تھیں۔ کبھی حبہ خاتون کے گیتوں کے ترجمے سُناتی تھیں۔ اور کبھی کوئی دلچسپ کہانی۔۔۔!

یوسفؔ شاہ نے جب حبہ خاتون کو پہلی بار دیکھا تھا اور کہا تھا کہ گاؤں کی ایک دوشیزہ نے میری دُنیا فتح کر لی ہے۔ کیا اُس گاؤں میں محبت کا موسم آ گیا ہے؟ تو حبہ خاتون نے جواب دیا تھا۔

"میرے شہنشاہ!۔۔۔ رات کی پرچھائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میرا شوہر تنہا ہے!۔۔۔ مجھے جانا چاہئے!"

حبہ خاتون کے اِس جواب کو مس شہلا ہمیشہ گنگناتی رہتی تھیں۔ اور مجھے کچھ عجیب لطف ملتا تھا۔ حبہ خاتون کی شاعری کی لطیف نزاکتوں پر وہ بحث کرتیں تو میں اکثر چونک پڑتا۔ عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر مس شہلا کی نگاہیں کس طرح رہتی تھیں۔

اور ایک دن اُنھوں نے مجھے ایک چینی کہانی سنائی۔ اُنھوں نے کہا "شمالی چین کے قدیم رقص میں "تتلی کی تلاش" کی اہمیت بہت زیادہ ہے! اِسی طرح یونان کے رقص "پتنگ کی اڑان" کی بھی بہت اہمیت ہے۔ اِس لئے کہ دونوں رقص انسانی نفسیات کے اہم پیچ و خم کو نمایاں کرتے ہیں۔ محبت کی انتہا اِن دونوں رقصوں سے سامنے آ جاتی ہے۔ عام طور پر شادیوں سے پہلے محبت بھرے دل گیت گاتے ہیں اور اِن رقصوں کے ذریعے اپنی رُوح کی خوشبو پھیلاتے ہیں۔ آنکھوں کے خاص اشاروں، سر کی جنبشوں، پاؤں کی آہٹوں سے وہ اپنے احساسات کی ساری کیفیت بکھیر دیتے ہیں۔ اِن دونوں رقصوں میں بڑی سرمستی ہے اور آہنگ ہے تتلی والے رقص میں محبت کے اشارے تتلی کی حرکتوں میں ہیں۔ اِس رقص میں ایک نوجوان آدمی ایک تتلی کو گرفت میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور اُس وقت بہار آ جاتی ہے اُس نوجوان انسان کی وہ ساری کیفیت جو محبت کے سہارے اُبلتی ہے اِس رقص میں خاص اداؤں میں اُبھرتی ہے۔ اِسی طرح پتنگ کی اُڑان میں ایک دوشیزہ باغ میں پتنگ اُڑاتی ہے۔ اور اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہے۔ اُس انتظار کی شدّت اُس میں اچھی طرح نمایاں ہے۔" میں اُن کی یہ کہانی بغور سنتا رہا۔ اُن کے ہونٹوں میں عجیب لرزش تھی۔ اُن کی آنکھوں میں نئی چمک تھی۔ اُنھوں نے کہانی آگے بڑھائی لاؤ چن شان یہ رقص اچھی طرح جانتا تھا۔ تتلی رقص کی ہر دھمک کا اُسے گہرا احساس تھا۔ لاؤ چن کو ایک دوشیزہ سے گہری محبت تھی۔ کوئی حادثہ ہوا اور لاؤ چن اپنی محبوبہ سے دُور ہو گیا۔ وہ ایسی دُوری کے متعلق کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ لیکن ماحول کے ہنگاموں نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے رُومانی ماحول سے الگ ہو جائے ایک طرف لاؤ چن تنہا تتلی رقص پر جھومتا رہا اور اپنی محبوبہ کو یاد کرتا رہا۔ اور دوسری طرف اُس کی محبوبہ تنہا پتنگ رقص پر اپنی ادائیں نثار کرتی رہی۔ اور اپنے محبوب کی یاد میں تڑپتی رہی۔ اِس طرح یہ بات صرف تنہائی تک نہ رہ سکی۔ دونوں کو ایک خاص

ڈھارس کی ضرورت تھی۔ اور اس کے لئے دونوں تنہائی سے باہر آ گئے۔ اور پھر یہ دونوں رقص دو مختلف علاقوں میں مقبول ہونے لگے۔ ایک طرف "تلی رقص" مقبول ہوا اور دوسری طرف "پتنگ رقص"۔ دونوں رقصوں میں ایک ہی تڑپ کا احساس تھا۔ تلی رقص دیکھنے والے اس تڑپ کو محسوس کرتے تھے۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ یہ تڑپ حقیقی ہے! اور چین کے کسی گوشے میں اس رقص کے لئے سہارا موجود ہے یہی حال پتنگ رقص کا تھا۔ اس رقص کی بے چینی کو سب محسوس کرتے تھے لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ رقص نامکمل ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ایک گوشے سے لاؤ چین کو آنا ہوگا۔

جب حالات خوشگوار ہوئے۔ اور ماحول کے بھیانک سائے ڈھل گئے تو لاؤ چن شان اپنی محبوبہ کے قریب آ گیا۔ اور پھر لوگوں نے دیکھا۔ رقص مکمل ہو گیا تھا۔

جب کہانی ختم ہو گئی تو انھوں نے پوچھا۔

"شکیل صاحب! کیسی کہانی ہے؟"

"بہت پیاری!"

"واقعی پسند آئی آپ کو؟"

"جی ہاں۔ بہت پسند آئی۔"

"ایسی کوئی کہانی نامکمل ہے تو کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے؟"

"مس شہلا! نہ جانے ایسے اور کتنے رقص ابھی نامکمل ہوں گے۔"

میں نہیں جانتا تھا میں کوئی بھیانک بات کہہ رہا ہوں۔ جس دن میں نے یہ کہانی سنی تھی اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مس شہلا نے بتایا کہ وہ بہت جلد ماسکو جا رہی ہیں۔ ان کے ہونے والے شوہر وہیں ریڈیو پر ملازم ہیں۔ وہ ماسکو میں زبان کے ارتقا پر تحقیق کریں گی۔ اُن کی شادی بھی وہیں ہوگی۔ وہ بہت خوش تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اُن کی خوشی میں اسی طرح شریک رہوں میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرے کانوں میں حبہ خاتون کا نغمہ گونج رہا تھا۔

"میرے شہنشاہ! رات کی پرچھائیاں بڑھتی جا رہی ہیں — میرا شوہر تنہا ہے — مجھے جانا چاہئے!"

مس شہلا کا لہجہ، اور حبہ خاتون کا خیال — کتنے قریب تھے دونوں میں سوچ رہا تھا۔

کیا رقص کو اسی طرح مکمل ہونا تھا — لاؤ چن کے قریب اُس کی محبوبہ کو جانا چاہئے تھا یا لاؤ چن کو اپنی محبوبہ کے قریب آنا چاہئے تھا؟ میں نے مس شہلا کو اپنی تمام باتوں سے آگاہ کیوں کر دیا؟ اپنی دکھ بھری کہانی کیوں سنا دی؟ وہ میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھیں؟ وہ مجھ سے اس قدر قریب کیوں تھیں؟

جس دن وہ ہوائی جہاز سے سرینگر چھوڑ رہی تھیں، اُس روز میں ایئرڈرام نہیں گیا۔ اُس روز میں نے ایک کلاس میں ایک خواب کا تجزیہ کیا۔

"کمسن دوشیزہ" — "خواب کی کاجل" — "خوبصورت صندوق" — "پنج تنتر کی ایک کہانی" — "خرگوش سے پیار" — ٹوٹے ہوئے اہرام کے قریب ایک دوسرے خرگوش کا انتظار — "دولہا کا گم ہونا" میرے تجزیے سے کلاس میں جو خاموشی پھیلی ہوئی تھی، اُس خاموشی کو یاد کر کے میں اب بھی سہم جاتا ہوں۔

ماسکو سے اُن کا ایک خط ملا۔ انھوں نے لکھا تھا مجھے اُن سے ملنے ایئرڈرام جانا چاہئے تھا۔ انھیں سخت شکایت تھی۔ وہ اپنی دوستی کا واسطہ دے کر خط و کتابت جاری رکھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ میں نے نہرو پارک سے شکارے پر لوٹتے ہوئے اُن کا خط جھیل میں ڈال دیا۔ میں نے سوچا جھیل کی لہروں میں کتنی بے ہنگم آوازیں ہیں شنکر آچاریہ کا مندر بادلوں میں چھپ کر کیوں شرمندہ ہے۔ ہاؤس بوٹ کفن پہن کر کیوں کھڑے ہیں؟ شکارے میں آگے بڑھنے کی طاقت اور لچک کیوں نہیں ہے؟ مس شہلا سے میں کیوں دور ہوں؟

وہ ایک غزل تھیں!

لیکن مقطع میں کوئی سخن گسترانہ بات تو نہ آ پڑی تھی۔ کیا اس بات کا تعلق "نرگیت" سے ہے؟

میں ڈل گیٹ واپس آ کر "نرگیت" کے تصور پر نہ جانے کیوں غور کر رہا تھا —!

ڈھارس کی ضرورت تھی۔ اور اس کے لئے دونوں تنہائی سے باہر آگئے۔ اور پھر یہ دونوں رقص دو مختلف علاقوں میں مقبول ہونے لگے۔ ایک طرف "تتلی رقص" مقبول ہوا اور دوسری طرف "پتنگ رقص"۔ دونوں رقصوں میں ایک ہی تڑپ کا احساس تھا۔ تتلی رقص دیکھنے والے اس تڑپ کو محسوس کرتے تھے۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ یہ تڑپ حقیقی ہے! اور چین کے کسی گوشے میں اس رقص کے لئے سہارا موجود ہے یہی حال پتنگ رقص کا تھا۔ اُس رقص کی بے چینی کو سب محسوس کرتے تھے لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ رقص نامکمل ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ایک گوشے سے لاؤ چین کو آنا ہوگا۔

جب حالات خوشگوار ہوئے۔ اور ماحول کے بھیانک سائے ڈھل گئے تو لاؤ چین شان اپنی محبوبہ کے قریب آگیا۔ اور سب لوگوں نے دیکھا۔ رقص مکمل ہو گیا تھا۔

جب کہانی ختم ہوگئی تو انھوں نے پوچھا۔

"شکیل صاحب! کیسی کہانی ہے؟"

"بہت پیاری!"

"واقعی پسند آئی آپ کو؟"

"جی ہاں۔ بہت پسند آئی"

"ایسی کوئی کہانی نامکمل ہے تو کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے؟"

"مس شہلا! نہ جانے ایسے اور کتنے رقص ابھی نامکمل ہوں گے"

میں نہیں جانتا تھا میں کوئی بھیانک بات کہہ رہا ہوں۔ جس دن میں نے یہ کہانی سُنی تھی اُس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مس شہلا نے بتایا کہ وہ بہت جلد ماسکو جا رہی ہیں۔ اُن کے ہونے والے شوہر وہیں ریڈیو پر ملازم ہیں۔ وہ ماسکو میں زبان کے ارتقا پر تحقیق کریں گی۔ اُن کی شادی بھی وہیں ہوگی۔ وہ بہت خوش تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اُن کی خوشی میں اسی طرح شریک رہوں میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرے کانوں میں حبہ خاتون کا نغمہ گونج رہا تھا۔

"میرے شہنشاہ! رات کی پرچھائیاں بڑھتی جا رہی ہیں — میرا شوہر تنہا ہے — مجھے جانا چاہیئے!"

مس شہلا کا لہجہ، اور حبہ خاتون کا خیال — کتنے قریب تھے دونوں میں سوچ رہا تھا۔

کیا رقص کو اسی طرح مکمل ہونا تھا — لاؤ چین کے قریب اس کی محبوبہ کو جانا چاہیئے تھا یا لاؤ چین کو اپنی محبوبہ کے قریب آنا چاہیئے تھا؟ میں نے مس شہلا کو اپنی تمام باتوں سے آگاہ کیوں کر دیا؟ اپنی دکھ بھری کہانی کیوں سُنائی وہ میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھیں؟ وہ مجھ سے اس قدر قریب کیوں تھیں؟

جس دن وہ ہوائی جہاز سے سرینگر چھوڑ رہی تھیں، اُس روز میں ایئر ڈرام نہیں گیا۔ اُس روز میں نے ایک کلاس میں ایک خواب کا تجزیہ کیا۔

"کمسن دوشیزہ" — "خواب کی کاجل" — "خوبصورت صندوق" — "پنچ تنتر کی ایک کہانی" — "خرگوش سے پیار" — "ٹوٹے ہوئے اہرام کے قریب ایک دوسرے خرگوش کا انتظار" — "دونوں کا گم ہونا" میرے تجزیے سے کلاس میں جو خاموشی پھیلی ہوئی تھی، اُس خاموشی کو یاد کرکے میں اب بھی سہم جاتا ہوں۔

ماسکو سے اُن کا ایک خط ملا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ مجھے اُن سے ملنے ایئر ڈرام جانا چاہیئے تھا۔ اُنھیں سخت شکایت تھی۔ وہ اپنی دوستی کا واسطہ دے کر خط و کتابت جاری رکھنے کی تاکید کر رہی تھیں میں نے نہرو پارک سے شکارے پر لوٹتے ہوئے اُن کا خط جھیل میں ڈال دیا۔ میں نے سوچا جھیل کی لہروں میں کتنی بے ہنگم آوازیں شنکر آچاریہ کا مندر بادلوں میں چھپ کر کیوں شرمندہ ہے۔ ہاؤس بوٹ کفن پہن کر کیوں کھڑے ہیں؟ شکارے میں آگے بڑھنے کی طاقت اور لپک کیوں نہیں ہے؟ مس شہلا سے میں کیوں دُور ہوں؟

وہ ایک غزل تھیں!

لیکن مقطع میں کوئی سخن گسترانہ بات تو نہ آپڑی تھی۔ کیا اس بات کا تعلق "نرگیت" سے ہے؟

میں ڈل گیٹ واپس آکر "نرگیت کے تصور" پر نہ جانے کیوں غور کر رہا تھا —!

نامور مصنفین کے بلند پایہ افسانے۔ دل چسپ ادبی اور معرکہ خیز جاسوسی ناول

کتاب	مصنف	قیمت
گئودان (ناول)	منشی پریم چند	۶/-
بیوہ 〃	〃	۲/-
[illegible] 〃	〃	۲/-
پریم پچیسی	〃	۶/-
چوگان ہستی حصہ اول	〃	۵/۸/-
چوگان ہستی حصہ دوم	〃	۵/۸/-
میدان عمل (ناول)	〃	۵/-
[illegible] 〃	〃	۵/-
بازار حسن 〃	〃	۴/۸/-
فردوس خیال 〃	〃	۳/-
حب وطن (افسانے)	〃	۲/-
آخری تحفہ 〃	〃	۲/۱۲/-
زاد راہ 〃	〃	۳/-
گوشۂ عافیت اول 〃	〃	۵/-
گوشۂ عافیت دوم 〃	〃	۵/-
دیہات کے افسانے 〃	〃	۳/-
خواب و خیال 〃	〃	۲/۸/-
دل کی وادیاں سو گئیں (ناول)	کرشن چندر	۳/-
ان داتا (ناول)	〃	۲/۱۲/-
طوفان کی کلیاں 〃	〃	۴/۴/-
میں انتظار کروں گا 〃	〃	۲/۸/-
ہم وحشی ہیں 〃	〃	۱/۸/-
نغمے کی موت (افسانے)	〃	۲/۱۲/-
کتاب کا کفن (افسانے)	〃	۳/-/-
نئے افسانے 〃	〃	۳/-
نئے غلام 〃	〃	۲/۱۲/-
ہائیڈروجن بم کے بعد 〃	〃	۲/۱۲/-
دروازہ 〃	〃	۲/-
تڑپ (ناول)	دت بھارتی	۳/-
جانور 〃	〃	۳/-
چوٹ اول 〃	〃	۳/-
چوٹ دوم 〃	〃	۳/۸/-
شکن 〃	〃	۲/۸/-
سہارا 〃	〃	۴/-
انقلاب زندگی (جاسوسی ناول)	مترجمہ رام فیروزپوری	۲/۸/-
انمول ہیرا	〃	۲/-/-

کتاب	مصنف	قیمت
محبت سے پہلے (ناول)	دت بھارتی	۴/-
گناہ کے دھبے (افسانے)	〃	۲/-
پیاسی سکھیں 〃	〃	۲/۸/-
آنسو (ناول)	جمنا داس اختر	۲/۱۲/-
آگ 〃	〃	۱/۱۲/-
بردہ فروش 〃	〃	۱/۴/-
کشمیر کی بیٹی 〃	〃	۲/۸/-
جلن 〃	〃	۲/-
چھایا 〃	〃	۳/۸/-
چندر کلا 〃	〃	۲/-/
[illegible] 〃	〃	۲/-
سونا گاچھی 〃	〃	۳/۸/-
پائل 〃	〃	۳/۸/-
اور خدا دیکھتا رہا 〃	〃	۲/-
شیطان (افسانے)	سعادت حسن منٹو	۳/۸/-
پردے کے پیچھے 〃	〃	۲/۸/-
شادی 〃	〃	۲/-
لاؤڈ اسپیکر 〃	〃	۴/۸/-
زہرہ 〃	〃	۲/۸/-
سسرال (ناول)	شوکت تھانوی	۲/-/-
بقراط 〃	〃	۲/۸/-
سانچ کو آنچ 〃	〃	۳/۸/-
مولانا 〃	〃	۳/۸/-
مسکراہٹیں 〃	〃	۲/۸/-
انشاء اللہ 〃	〃	۳/-/-
جوڑ توڑ 〃	〃	۴/-/-
بیوی 〃	〃	۲/۱۲/-
دو لاکھ کا نوٹ (افسانے)	عادل رشید	۳/۸/-
میر صاحب 〃	〃	۳/۸/-
ڈوبتے سائے (ناول)	〃	۳/-
آدمی اور سکے 〃	مہندر ناتھ	۲/۱۲/-
یہاں سے وہاں تک 〃	〃	۲/۸/-
چوٹیں (ناول)	عصمت چغتائی	۳/-
سرخ آنچل (افسانے)	پرکاش پنڈت	۳/۱۲/-

کتاب	مصنف	قیمت
وادیاں اور ویرانے (ناول)	[illegible]	۴/-/-
ڈیڈی 〃	〃	۲/-
کڑوی کہانی 〃	گوہک	۳/۸/-
ماں 〃	〃	۴/۸/-
اغوا 〃	کرشن پلنپوری	۳/-
سب کی بیوی 〃	〃	۲/۸/-
عورت 〃	رئیس احمد جعفری	۲/۸/-
تصویر 〃	اے۔ آر خاتون	۴/-
افشاں 〃	〃	۶/۸/-
شمع 〃	〃	۵/-
نادرہ 〃	زبیدہ خاتون	۵/-
موت کے بعد 〃	اظہار اثر	۲/۴/-
تازیانے (افسانے)	الطاف مشہدی	۲/۴/-
ایک پیسے کی خاطر 〃	ابراہیم جلیس	۲/۱۲/-
دو ملک ایک کہانی 〃	〃	۲/۸/-
انمول آنسو 〃	کوثر میرٹھی	۲/-/-
مالوہ (ناول)	نریش کمار شاد	۱/۱۲/-
راکھ تلے 〃	〃	۲/-
بے نام گلیاں (افسانے)	کلام حیدری	۲/۴/-
پیار (ناول)	زکی انور	۲/۸/-
گھاٹ کا پتھر 〃	گلشن نندہ	۳/-
میری بھابی 〃	جمیل احمد	۲/۸/-
ملکۂ صحرا 〃	اوم پرکاش	۲/۸/-
خونی چکر (جاسوسی ناول)	مترجمہ رام فیروزپوری	۴/-
مہر خاموشی 〃	〃	۳/۸
کارنامہ جات آرسین لوپن 〃	〃	۳/-
آزادی 〃	〃	۳/-
نقلی نواب 〃	〃	۳/۸/-
دست قضا 〃	〃	۳/۸/-
شاہی خزانہ 〃	〃	۳/۸/-
کالی نقاب 〃	〃	۳/۸/-
تہہ خانے کا راز 〃	〃	۳/۸/-
دیوتا کی آنکھ 〃	〃	۴/۸/-
وادیٔ خوف 〃	〃	۴/-

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری

وہ کتاب جو یورپ کی بہترین کتب کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانی عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف چار روپے۔

شبنم کشیدہ کاری	۱/-
حسین کشیدہ کاری	۲/۸/-
دلچسپ کشیدہ کاری	۲/۸/-
قدسیہ کشیدہ کاری	۱/-
رضیہ کی مشرقی و مغربی کشیدہ کاری مع [illegible]	۴/-
چمن کشیدہ کاری	۲/-
گلشن کشیدہ کاری	۲/-

صحت و زندگی

اس مفید کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اتنا مفید ثابت ہوگا کہ آپ اسے خود پڑھنے کے بعد اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ مرض کو بلا دقت دور کرنے کے ایسے آسان طریقے تدابیر اور علاج درج کئے گئے ہیں، جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ غذا، صحت، شباب اور تندرستی کے متعلق وہ باتیں تفصیل سے لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ نفیس کتابت وطباعت، ولائتی کاغذ، پختہ جلد، دیدہ زیب سہ رنگا ٹائٹل کور۔ قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے۔

رسالہ بیسویں صدی دہلی

آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

نیم تراشیدہ صنم

از
محترمہ ثریا جبین ایم اے

چاند سوئے ہوئے ٹیلوں میں کہیں ڈوب گیا
رات سنسان ہے میرے دلِ محزوں کی طرح
یہ فضاؤں کی اُداسی یہ ہواؤں کی تھکن
راہ ویراں ہے ترے گیسوئے شب گوں کی طرح

پھر وہی سوچ کہ بے نام جنوں کے ہاتھوں
اِسی صحرا میں بھٹکتی ہوئی مر جاؤں گی
آج اِک راہ ہے، دُھندلی ہی سہی پُر پیچ سہی
کل کوئی راہ نہ ہوگی تو کدھر جاؤں گی

یہ سُلگتی ہوئی شب اُف یہ دہکتی ہوئی شام
اب ترے پھول سے دامن کو کہاں سے لاؤں
تیری آنکھوں پہ وہ اُلجھی ہوئی زلفوں کی گھٹا
اُس مہکتی ہوئی چلمن کو کہاں سے لاؤں

تلخ حالات کے سنگین تقاضوں سے پرے
سخت ماحول کی بڑھتی ہوئی یلغار سے دُور
میں نے کچھ گیت بُنے، رقص و ترنّم کی قسم
میں نے کچھ جام اپنے کیفِ وفا سے معمور

آج لیکن مرا ماضی، مرے نغموں کا وطن
میرا شاداب چمن، میری محبت کا دیار
گنگناتی ہوئی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں
دُور جیسے کوئی جھرنوں میں بجاتا ہو ستار

یہ مرے نیم تراشیدہ صنم ٹوٹ نہ جائیں
یہ اَدھورے ہی سہی پھر بھی مرے سپنے ہیں
میں حقائق کے کڑے کوس نہیں چل سکتی
تُو مرا ہو نہ سکا، خواب مرے اپنے ہیں

باریابی

از

جناب بسمل سعیدی

دہلی

کل رگِ عشق میں بسمل جو ہوئی جوششِ خوں
دل میں اِک درد اُٹھا سر میں ہوا جوششِ جنوں

دلِ بیتاب چلا مرکزِ تسکیں کی طرف
لے چلا شوق تجلّی گہِ رنگیں کی طرف

دردِ دل، دردِ جگر، باغ میں جا کر ٹھہرا
ایک فردوسِ نظر باغ میں جا کر ٹھہرا

باغ میں خُلد سرِ فرش نظر آتا تھا
خُلد میں حُسن کا اِک عرش نظر آتا تھا

بن کے قسمت مری دروازے کُھلے جاتے تھے
کسی مُشتاق کا آغوش بنے جاتے تھے

جُرأتِ شوق کا نشّہ سا چڑھے جاتا تھا
پاؤں کے ساتھ مرا دل بھی بڑھے جاتا تھا

حُسن کے جلووں میں جلوے نظر آتے تھے مُجھے
اور جلووں میں کرشمے نظر آتے تھے مُجھے

نگہِ شوق نہ تھی، عشق کی تھیں دو لہریں
مِل گئیں حُسن کے دریا میں وہ دونوں لہریں

تیر برسانے لگے جلوے نظر پر اب تو
بجلیاں گرنے لگیں قلب و نظر پر اب تو

جلوے کہتے تھے کہ بس حُسن کی غایت ہے یہی
دل یہ کہتا تھا محبت کی نہایت ہے یہی

دل کا یہ حال کہ اب شوق سے گھبراتا تھا
میرا یہ حال کہ میں خوف سے تھرّاتا تھا

طائرِ شوق کے نظّاروں نے پر باندھ دیئے
حیرتِ جلوہ نے اب پلئے نظر باندھ دیئے

میرے احساس نے اُسوقت اِک آواز سُنی
جیسے مجھ سے کوئی کہتا ہو کہ "اُدْنُ مِنّیِ"

کیا کہوں کیا تھی وہ آواز جو آتی تھی مُجھے
اِک کشش تھی کہ جو کھینچے لئے جاتی تھی مجھے

دلِ بربادِ محبت نے وہاں کیا دیکھا
اُنھیں دیکھا، اُنھیں، اور حسبِ تمنّا دیکھا

حُسن اِک جلوہ ہے جس کا وہ تجلّی دیکھی
اور تجلّی میں محبت مُتجلّی دیکھی

لبِ رنگیں پہ تبسّم کی جھلکتی جنّت
مست آنکھوں میں وہ مستی کی چھلکتی جنّت

وصل کا شوق، مچلتی ہوئی حسرت میری
حُسن کا رعب، جھجکتی ہوئی جُرأت میری

رُو کشِ صد گل فردوس تھا غنچہ دل کا
دامنِ بادِ صبا میں تھا شگوفہ دل کا

بوسہ

افسانہ

از

محترمہ نکہت اقبال بی۔اے۔بی۔ٹی

۱۱۶۔گاندھی گارڈن۔ویسٹ کراچی ـــ یکم ستمبر ۱۹۵۶ء

خوشتر بھائی صاحب! سلام عرض ہے۔

سالنامہ کے لئے ایک تازہ ترین تخلیق ارسالِ خدمت ہے۔ عنوان بہت ہی چونکا دینے والا ہے۔ لیکن پڑھنے اور اندازہ لگائیے کہ ُبوسہ' کا وہ زاویہ بھی تو ہے جو میں نے پیش کیا ہے۔ افسانہ بہت سنبھل کر لکھنا پڑا۔ کیونکہ جو مشکل نازلی کی تھی اُس سے زیادہ مشکل افسانہ لکھتے وقت میرے سامنے تھی۔ معلوم نہیں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہوں۔ ویسے اپنا دہی کسے کھٹا معلوم ہوتا ہے؟!

چار ماہ ہندوستان میں گزرے۔ ہندوستان کو میں نے ترقی کی راہ پر دیکھا ہے لیکن ایک کانٹا بھی دل میں چبھا۔ ایک خاص طبقہ اقتصادی بحران میں بُری طرح مبتلا ہے۔ یہ بحران ملک کی ترقی کی رفتار کو سُست کر سکتا ہے۔ ویسے میں بہت متاثر ہو کر آئی ہوں۔

میری عدم موجودگی میں درجنوں خطوط آچکے تھے۔ مجھے پھر شرمندہ ہونا پڑ رہا ہے کہ اپنی مجبوری کے باعث کسی کو جواب نہیں لکھ سکی۔ سوچتی ہوں تو شرمندہ ہوتی ہوں۔ کہ سب بھائی بہنوں نے انتظار کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ صبر کر لیا ہوگا۔ خصوصاً چنڈی گڑھ کے اُن بھائی سے میں بہت ہی شرمندہ ہوں جنھوں نے کراچی میں مجھے ایک کام سونپا تھا۔ جو انتہائی ضروری تھا کام تو انجام دینا درکنار، میں جواب بھی نہیں لکھ سکی۔ معلوم نہیں وہ بھائی چنڈی گڑھ میں ہیں یا ڈنیلکے دورے پر روانہ ہوگئے؟ ـــ وہ بھائی ملاقات کے بھی خواہاں تھے۔ لیکن میں ہندوستان میں تھی۔ ملاقات کیسے ہو سکتی تھی؟ ـــ ان تمام بھائی بہنوں سے میں معافی چاہتی ہوں جنھیں میں اپنی بے بسی کے باعث جواب نہ دے سکی۔ ـــ اور آپ سے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔ کیونکہ آپ کے کتنے بلاووں کے بعد بھی آپ سے نہ مل سکی۔ جب دہلی پہنچی تو گاڑی تیار تھی۔ اِس لئے مجبور ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں بندگی بے چارگی ہوتی ہے۔ ملازمت پر ایک دن بعد پہنچی۔ اور اِس تاخیر کا خمیازہ بُھگتنا پڑا۔ بھلا بتائیے۔ پھر کیسے آسکتی تھی؟ ـــ بھابی کو بھی گلہ ہے۔ اور بجا گلہ ہے۔ آؤں گی تو دست بستہ معافی مانگ لوں گی۔ بھابی کی ذات ظالم نہیں ہوا کرتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور معاف کر دیں گی۔ بھابی کی خدمت میں میرا مودبانہ سلام پیش کیجئے۔ اور اُن پیارے بچوں کو بہت سے پیار کیجئے جو میری راہ دیکھتے دیکھتے مایوس ہو کر سو گئے تھے!

آپ کی بہن
نکہت اقبال

دوست محمد خان نازلی کا آہستہ آہستہ سر دبا رہا تھا۔!

ایک وہ وقت تھا جب نازلی دوست محمد خان کے سامنے شرماتی تھی۔ اُس کے سامنے منہ کھولتی نہ بات کرتی۔ اور نہ ہنستی لیکن آج دوست محمد خان اُسکے سرہانے بیٹھا سر داب رہا تھا! اُس کے سر میں درد تھا۔ نازلی نے اپنے شوہر کیپٹن اعجاز سے سر دبانے کے لئے کہا تو اُس نے یہ کام دوست محمد خان کے سپرد کر دیا تھا۔ نازلی نے انکار کیا تو اعجاز کہنے لگا۔

"کیا ہرج ہے؟ دوست محمد خان تو ہمارے گھر کا ایک فرد بن چکا ہے۔ اس سے کیا شرمانا؟"

اور اعجاز نے اپنی موجودگی ہی میں دوست محمد کو آواز دے کر بلایا۔ اور کہا۔

"دوست خان!"

"جی صاحب!"

"تمھاری بی بی جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں بی بی جی کیا ہو گیا؟"

"سر میں درد ہے۔ تم پٹھان ہو۔ اور تم لوگوں نے انگریزوں کے سر کا درد نکال دیا تھا۔ اب اپنی بی بی جی کے سر کا درد نکالو۔"

یہ کہہ کر اعجاز ہنسنے لگا۔ اور دوست محمد بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔

"ام لوگ تو انگریز کا بھیجا نکال لیتا تھا۔"

"لیکن خان کہیں بی بی جی کا بھیجا نہ نکال لینا؟"

"او توبہ توبہ صاحب! ایسی بات مت بولو!"

یہ کہہ کر دوست محمد نے نازلی کا سر دبانا شروع کیا اور ساتھ ہی نصیحت شروع کر دی۔

"بی بی جی! تم چلنے کا شوقین ہے۔ اِسی لئے درد ہوتا ہے۔"

"لالہ! سر پر نہ بولو۔"

"او بی بی جی! سمجھ گیا۔ معاف کرنا۔"

اور دوست خان خاموشی سے سر دبانے لگا۔ اور نازلی سوچنے لگی۔ اُس کی شادی ہوئی تھی تو وہ دوست خان سے کتنا شرماتی تھی؟ اعجاز سمجھاتا بھی لیکن اُسے لالہ سے شرم آتی تھی۔ اُسے لالہ کی وہ بات یاد تھی کہ رونمائی جب ختم ہو گئی تو لالہ نے اپنے آقا اعجاز سے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"صاحب! ام اپنی مالکہ کو نہیں دیکھے گا؟ ہمارا حق کوئی نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں!"

یہ کہہ کر اعجاز نے نازلی کا گھونگھٹ اُٹھانا چاہا تو نازلی نے چپکے سے کہا تھا۔

"رہنے بھی دیجئے!"

"دوست محمد نے میری بہت خدمت کی ہے۔ میں اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں!"

اور جب گھونگھٹ اُٹھ گیا تو دوست محمد خان نے ہنستے ہوئے کہا تھا

"صاحب! کپڑا ڈال دو۔ ماشاء اللہ مالکہ کا چہرہ چاند ہے چاند!"

اعجاز نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ اور خود اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُسے فوراً گھونگھٹ گرا لیا تھا۔ اب نازلی سوچتی تھی تو اُسے اپنی شرم پر شرم آتی تھی۔ دوست محمد خان کا تعلق اُس کے شوہر سے بہت عرصے کا تھا۔ اور دس پندرہ سال سے تو وہ دوست خان کو دیکھ رہی تھی۔ اب تو اُسے اُس سے شرم نہیں آتی تھی۔ جب وہ گھر کا ایک فرد بن گیا تو پھر شرم کیسی؟ پھر دوست خان نے اپنی بے لوث خدمت اور خلوص سے سب کا دل موہ لیا تھا۔ گھر کے بچے بچے کے دل میں اُس کی نہ صرف بے حد عزت تھی بلکہ بے حد احترام بھی تھا۔

یہ دوست خان ہی تو تھا جب اعجاز کا تبادلہ ایک سال کیلئے کوئٹہ ہوا تھا تب اُس نے نہ صرف خدمت کی تھی بلکہ حفاظت بھی کی تھی۔ اُسے دوست خان سے کبھی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ دوست مجسم شرافت تھا۔ پھر وہ دن بھی آئے کہ نازلی کا جب دل گھبراتا تو وہ اکثر دوست خان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ دوست خان کا دلچسپ موضوع شادی تھا۔ ایک دن نازلی نے پوچھا۔

"لالہ! تم کب شادی کرو گے؟"

"جب روپیہ ہو گا بی بی جی!"

"روپیہ کس لئے؟"

"لڑکی والے کے باپ کو دینے کے لئے۔ ورنہ شادی نہیں ہوگا۔"

"ارے!" نازلی نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "تمھارے ملک میں لڑکی والا نقد روپیہ لیتا ہے؟"

"ہاں بی بی جی!" دوست خان نے بچے کو ٹہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ روپے دیتا ہے!"

"تمھیں شادی کے لئے کتنا روپیہ دینا ہے؟"

"جیسی شادی کرو اتنا روپیہ دو۔۔۔!"

"جیسی شادی سے کیا مطلب ہے؟"

"دیکھو بی بی جی!" دوست خان نے بچے کو کاندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "لڑکی اگر بدصورت ہے تو روپیہ کم۔ اگر سیب مافق ہے تو پیسہ زیادہ۔۔۔!"

یہ کہہ کر دوست ہنسنے لگا۔

"اچھا تم سیب جیسی بیوی چاہتے ہو یا جامن جیسی؟"

"سیب مافق بی بی جی!"

"نوکری اسی لئے کر رہے ہو؟"

"جی بی بی جی!"

دوست خان نے شادی کے لئے روپیہ جمع کرنے کی سعی میں اپنی زندگی تو نوکری میں بتا دی تھی۔ لیکن پھر بھی روپیہ جمع نہیں ہو سکا تھا۔ بہت تندہی، محنت اور دلچسپی سے دوست خان نے گھر کا کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نازلی اور اعجاز دونوں لالہ کے مدّاح تھے۔ اُس نے کام ہی محنت سے نہ کیا تھا۔ اُسے اُن سے بے حد خلوص اور گہری ہمدردی تھی۔

کبھی کبھی تو وہ کہہ دیتا تھا۔

"بی بی جی! اب تو ہم شادی نہیں کرے گا!"

"کیوں؟"

"دیکھو بی بی جی! شادی کرے تو بی بی کا کام کرے گا۔ پھر ہم آپ کا صاب اور بچوں کا کام کیسے کر سکے گا؟"

"نہ کرنا؟"

"نہیں بی بی جی! ہم اپنے گھر کا کام کرتا رہے گا اور مر جائے گا۔"

"پھر شادی کون کرے گا؟"

"ہمارا شادی پھر اللہ کے گھر میں ہوگا!"

یہ کہہ کر دوست خان ہنسنے لگا۔

نازلی نے کہا۔

"لالہ! تم ہم سے پیسے لو۔ ہم دیں گے۔ اور شادی کر لو!"

"بی بی جی! ہم اپنا گھر نہیں چھوڑے گا!"

"اچھا، جانا نہیں لیکن شادی تو کر لو!"

"اب کیا کرے گا؟ ہم تو اپنے بچوں کا شادی کرے گا بس!"

اور نازلی نے اکثر دوست خان کی زندگی پر نظر ڈالی تھی۔ وہ ملازم تھا۔ وہ کام کرتا تھا تو اُسے تنخواہ مل جاتی تھی۔ لیکن تنخواہ کے باوجود دوست خان کا کام بہت عظیم تھا۔ اُس نے تنخواہ لے کر اپنا فرض ہی نہیں انجام دیا تھا۔ جان نکال کر رکھ دی تھی۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو لالہ جوان تھا۔ لیکن اب تو ادھیڑ ہو چکا تھا۔ لالہ کی عمر تو کام کرتے کرتے آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لیکن گھر کے کام ذرا بھر کم نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اُن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کتنی عظیم قربانی تھی دوست خان کی۔ نازلی کے دل میں دوست خان کی عزت اور بڑھ گئی تھی۔ جب اُسے دوسری جگہوں سے زیادہ تنخواہ پر بلایا جا رہا تھا تو نازلی کے کہنے پر بھی وہ اس لئے نہیں گیا تھا کہ "یہ نمک حرامی تھی"۔ یہی نہیں، گھر کا خرچ جوں جوں بڑھتا گیا، دوست خان کی تنخواہ بتدریج کم ہوتی گئی۔ لیکن وہ اُس میں بھی مگن تھا۔ اور نہایت خلوص سے کہتا تھا

"بی بی جی! ہم تنخواہ نہیں لے گا!"

"کیوں؟"

"نہیں بی بی جی! ہم اب گھر کا ایک آدمی ہے۔ پھر تنخواہ کیوں۔ بس کھائے گا، پئے گا، پہنے گا۔ اور پیسے لے کر کیا کرے گا؟"

"بھلا کوئی تنخواہ چھوڑتا ہے؟"

"ہم چھوڑتا ہے نہ ہم!"

یہ کہہ کر دوست خان نے ہنسنے پر اکتفا کیا لیکن نازلی اور خود اعجاز کے بہت اصرار پر معمولی سی تنخواہ قبول کرتا تھا۔ باقی واپس کر دیتا تھا۔ اور جو رقم لیتا تھا وہ بچوں پر خرچ کر دینے میں اُسے لطف آتا تھا!

جُوں جُوں دن گزرتے جاتے تھے، دوست خان کا خلوص بڑھتا جاتا تھا۔ ور زیادہ بے لوث بنتا جاتا تھا۔ اِس طرح دِلوں میں اُس کے لیے اور جگہ بنتی جاتی تھی اور ن گئی تھی۔ اگرچہ قانونی اور شرعی طور پر دوست خان کا گھر میں کوئی درجہ ملازم کے سوا نہ تھا لیکن اخلاقی حیثیت سے اُس کا گھر میں بڑا مقام تھا۔ وہ خورد ہونے کے ساتھ ساتھ بزرگ بھی تھا۔ اور بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ چھوٹا۔ چھوٹا اسلئے کہ معمولی سے کام سے لے کر بڑا کام تک کرتا تھا۔ اور بزرگ اِسلئے کہ اکثر اعجاز اور خود نازلی کو موقع موقع سے سمجھاتا رہتا تھا۔ کہتا تھا۔

"دیکھو بی بی جی! جس گھر میں لڑائی نہیں ہوتا، وہ خوش قسمت ہوتا ہے!"

اور اعجاز کو سمجھاتا۔

"صاحب! تم مرد ہو۔ بی بی جی عورت ہیں۔ تم بڑے ہو کر غصہ نہ کیا کرو جہاں میاں بیوی خوش رہتا ہے وہاں نیکی کے فرشتے آتے ہیں!"

اور بچوں کا تو وہ واقعی بزرگ بھی تھا۔ باہر کی کوئی چیز بچے دوست خان کی اجازت کے بغیر نہیں لا سکتے تھے۔ اور جب بچے شور مچاتے تو دوست خان اُنھیں قابو میں رکھتا تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں مشورے دینا بھی دوست خان کا حق تھا۔ کیونکہ اُس کی خدمات اُس گھر کے لیے اِتنی تھیں کہ دوست خان اب ملازم نہیں عزیز سمجھا جاتا تھا۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود دوست خان کو اپنی اِس اخلاقی برتری اور بلندیٔ مقام کا احساس تھا۔ اور یہ احساس اُس میں روز بروز خلوص اور ہمدردی پیدا کرتا جاتا تھا۔

نازلی کو اکثر دوست خان پر بہت ترس آتا تھا۔ اُس کی زندگی خدماتی لحاظ سے جہاں شاندار تھی، وہیں اُس کی زندگی حسرت ناک پہلو بھی رکھتی تھی۔ اعجاز تو نہیں، لیکن نازلی اِس دوسرے رُخ کو اکثر دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔ دوست خان کے سینے میں اُمنگوں اور آرزوؤں کا مدفن تھا۔ دوست خان کے وجود میں زندگی ہچکیاں لے کر ختم ہو چکی تھی۔ وہ اُس سرسبز درخت کی طرح تھا جو بھری برسات میں جل گیا ہو۔ اور اُس کے بعد پھر کبھی ہرا نہ ہوا ہو۔ نازلی دوست خان پر ترس کھایا کرتی تھی۔ لیکن واہ رے دوست خان! اُس نے کبھی اپنی آنکھوں سے زندگی کے اس رُخ کو دیکھنے کی کوشش کی ہی نہیں۔ لیکن نازلی سے زندگی کا یہ موڑ پوشیدہ نہیں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ روز بروز نازلی کی ہمدردیاں دوست خان کیلئے بڑھتی جاتی تھیں

اُنھیں دنوں اکثر اعجاز جھلاہٹ میں طعنے دیا کرتا تھا۔

"آجکل دوست خان کا درجہ کچھ مجھ سے بڑھا ہوا ہے"

لیکن نازلی جانتی تھی کہ اعجاز کے دل کی یہ آواز نہیں ہے کیسی جھلاہٹ میں اُس کے مُنھ سے بات نکل رہی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اعجاز کی نظروں میں دوست خان کا کیا درجہ تھا!

اچانک دوست خان بیمار ہو گیا۔۔۔!

نازلی کو اُس کی بیماری کی بڑی فکر تھی۔ چوبیس گھنٹے تو یوں ہی گزر گئے لیکن جب دوسرے دن بھی بُخار نہ اُترا تو نازلی کو فکر ہوئی اور دوست خان کو دیکھنے کے لیے نازلی خود گئی۔ جا کر دیکھا تو وہ بُخار میں بھُن رہا تھا۔ نازلی نے اُسے مخاطب کرنا چاہا اور کہا۔

"کیسے ہو دوست خان؟"

دوست خان گُم سُم پڑا تھا۔ نازلی نے پھر پُوچھا۔

"دوست خان! طبیعت کیسی ہے؟"

دوست خان نے کراہتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی! ہم اچھا نہیں ہے۔ درد بہت ہوتا ہے!"

"درد؟" نازلی نے اُس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا "کہاں درد ہے بلا؟ مجھے بتاؤ میں ڈاکٹر کو ابھی بلواتی ہوں"

"نہیں بی بی جی!" دوست خان نے بہت آہستہ سے کہا۔ "اللہ ٹھیک ہے ہم ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو۔ کوئی فکر نہ کرو!"

نازلی دوست خان کو دیکھ کر آئی تو فکرمند تھی۔ آخر فکرمند کیوں نہ ہوتی سیدھی اعجاز کے کمرے میں پہنچی۔ اور کہنے لگی۔

"دوست خان بہت بیمار ہے!"

اعجاز نے کتاب پڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا!"

"اُس کا کچھ انتظام کیجئے۔ آپ تو خاموش ہو گئے!"

"کمال کرتی ہو نازلی!" اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چٹانوں اور پہاڑیوں کا بھی کبھی علاج ہوتا ہے؟"

نازلی خاموشی سے اعجاز کو دیکھ رہی تھی۔

اعجاز نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

"دوست خان پہاڑ ہے پہاڑ! پشاور کا رہنے والا ہے۔ پھر پٹھان ہے آپ کی طرح دھان پان نہیں ہے۔ پٹھان کبھی علاج ہی نہیں کراتے ہیں۔ اور نہ اُن کا علاج ہوتا ہے۔ آپ تو بلا وجہ دردسری بڑھا رہی ہیں"

"نہیں نہیں" نازلی کہنے لگی۔ "دوست خان شدید بیمار ہے۔ پھر یہ تو خیال کیجیے کہ اُس نے ہماری اور ہمارے بچوں کی کتنی خدمت کی ہے؟"

"کون سی خاص بات ہوئی؟"

نازلی چلی آئی۔

لیکن شام کو جب اعجاز کو علم ہوا کہ نازلی اسپتال ڈاکٹر کے پاس دوست خان کو لے گئی ہے تو اُسے بہت بُرا معلوم ہوا۔ جب وہ اسپتال سے آئی تو اعجاز کا لہجہ بدلا ہوا دیکھا۔ وہ بھی اعجاز کی بے مروتی اور احسان فراموشی سے دل برداشتہ ہوئی۔ خاموش نہ رہ سکی۔ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے بے لوث خادم کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ وہ عورت تھی۔ اُس میں ہمدردی کا جذبہ زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود جا کر لالہ کو دوا پلاتی تھی۔ تاکہ لالہ جلد اچھا ہو جائے۔ اُس کے بیمار ہونے سے جیسے گھر بیمار ہو گیا تھا۔

تین دن ہو گئے۔

لالہ کو کوئی افاقہ نہ ہوا تو نازلی نے ڈاکٹر کو گھر بُلا لیا۔ اور دوست خان کو دکھایا ڈاکٹر نے اُمید ضرور دلائی لیکن اُس صورت میں جبکہ علاج طویل ہو اور باقاعدگی کے ساتھ۔

نازلی نے کہا۔

"آپ فکر نہ کیجیے ڈاکٹر صاحب! علاج ہوگا"

لیکن اِس دَوران میں دوست خان یہی کہتا رہا "بی بی جی! فکر نہ کرو۔ ہم اچھا ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے!"

لیکن نازلی جانتی تھی کہ علاج ضروری ہے۔ علاج کی فکر تھی تو صرف نازلی کو۔ حالانکہ دوست خان ملازم اعجاز کا تھا لیکن اعجاز نے ذرا سی بھی انسانی ہمدردی نہیں برتی تھی — ؟!

نازلی نے پوری توجہ سے علاج کرایا تو دوست خان کو تھوڑے آرام ہوا۔ آرام ملتے ہی دوست خان کہنے لگا۔

"بی بی جی! ہم اچھا ہے۔ اب علاج ختم . . . !"

"نہیں ابھی پُورے طور پر آرام نہیں ہوا ہے"

"فکر نہیں بی بی جی! ہم لوگ سارا آرام کی پروا نہیں کرتے!"

دوست خان مصر تھا کہ وہ کل سے کام کرے گا لیکن نازلی نے مشکل اُسے روکا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے گھبرا گیا تھا۔ لیکن اُسے مالکہ کا بھی تو کہنا ماننا تھا۔ اِس لئے مجبور تھا۔ وہ لیٹے لیٹے مالکہ کی ہمدردی پر غور کیا کرتا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے سوچا کرتا تھا، اگر وہ شادی کر لیتا تو اُس کی بیوی بھی اتنی ہمدردی نہ کرتی جتنی اُس کی مالکہ کر رہی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا تھا، شادی نہ کر کے اُس نے بڑی غلطی کی تھی لیکن اِس ہمدردی اور محبت کو پا کر اُس نے اپنا خیال بدل دیا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی جس کی خدمت میں گزاری تھی وہ اُس خدمت اور ایثار کی حقدار تھی۔ نازلی کو دوست خان کی طرف سے اطمینان ہو چکا تھا کہ اب وہ اچھا ہو جائے گا۔ اُس کی محنت اببار آور ہونے والی تھی۔ نازلی یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ دوست خان اگر بے پروائی کا شکار ہو جاتا تو خدا کو وہ کیا مُنہ دکھاتی؟

لیکن اعجاز کچھ خاموش خاموش سا تھا۔ نازلی اِس ناخوشی کو نہ تو سمجھ سکی تھی اور نہ سمجھنا چاہتی تھی۔ اور اگر اپنے قدیم اور بے لوث خدمت گزار کا علاج جُرم تھا تو اُسے اِس جُرم پر ناز تھا۔ اُس نے نہ تو اعجاز کو منانے کی کوشش کی تھی اور نہ ابھی منانا چاہتی تھی۔ جب تک کہ دوست خان اچھا نہیں ہو جاتا تھا۔ لیکن نازلی کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ دوست خان جسے اعجاز بھی عزیز رکھتا تھا، اِس کے علاج سے کیوں بے پروا تھا؟ اور اگر وہ علاج کرا رہی تھی تو اعجاز کو بُرا کیوں لگتا تھا؟

ایک دن جب نازلی دوست خان کی عیادت کو گئی تو وہ کہنے لگا۔

"بی بی جی! ایک بات بولوں؟"

"ہاں ہاں!"

"بی بی جی! ہم نے تمھارا کتنا خدمت کیا؟"

"بہت — بہت زیادہ لالہ!"

"تم ہم سے خوش ہے؟"

کیونہیں!"

"بی بی جی!" دوست خاں کہنے لگا۔ تم گال پر پیار کرو — بی بی جی!"

نازلی نے چونک کر دوست خاں کو دیکھا۔ تو وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اور اُس کے چہرے پر مُردنی چھائی تھی۔

نازلی جھکی اور دوست خاں کے بائیں گال پر بوسہ دیا۔ دوست خاں کے سرد گال پر!

جب نازلی باہر نکلی تو ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ جب دوست خاں گھر کا ایک فرد بن گیا تھا تو اُس میں بُرائی ہی کیا تھی۔

وہ دل میں کہہ رہی تھی، اُس نے دوست خاں کو نہیں، انسانی ایثار، خدمت اور ہمدردی کو بوسہ دیا ہے۔

صبح نازلی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

دوست خاں کا انتقال ہو گیا تھا۔

وہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ اعجاز اُسے تسکین ہی نہیں دے رہا ہے مسرور بھی نظر آرہا ہے۔ وہ اُس کے ادائے فرض سے خوش ہے۔ یہ دیکھ کر دوست خاں کے گالوں کی ٹھنڈک نازلی کے ہونٹوں پر بڑھتی جاتی تھی —!!

غزل

از

جناب پروفیسر تلوک چند محروم بی۔ اے

۲۰ء نیا محلہ پل بنگش دہلی —— ۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء

عزیز خوشتر!

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا رسالہ دورِ حاضر کی فضولیات سے پاک ہے۔ غزلیں بے عیب اور دلکش! اور افسانے پاکیزہ اور "پُرفن" ہوتے ہیں۔ اسی روش پر قائم رہیے۔ ... ہاں بیسویں صدی کا طرۂ امتیاز جو خاص فیچر ہے "تیر و نشتر"، اُس کا ذکر تو میں بھول ہی گیا۔ سب سے پہلے یہی پڑھتا ہوں اور آپ کے حُسنِ مزاج کی داد دیتا ہوں۔ غزل حاضر ہے۔

خیر اندیش

تلوک چند محروم

یہی انجام مسرت ہے کہ خنداں ہوکر
شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہوکر

دیکھئے حُسن کا اعجاز کہ بے جاں ہوکر
آئینہ دیکھ رہا ہے اُنھیں حیراں ہوکر

قیس و فرہاد کے انجام پہ روتا ہے دل
غمِ جاناں نے رُلایا غمِ دوراں ہوکر

پھُوٹ نکلا کہیں پھولوں میں کہیں تاروں میں
دل کی تسکیں نہ ہُوئی حُسن کو پنہاں ہوکر

رہ گئی عالمِ حیرت میں دمِ نظارہ
نگہِ شوق نقابِ رُخِ جاناں ہوکر

دیکھتے دیکھتے آباد ہوئے ویرانے
دل کی بستی نہ بسی پھر کبھی ویراں ہوکر

پھر وہیں شوق اُسے کھینچ کے لے آتا ہے
جو تری بزم سے جاتا ہے پشیماں ہوکر

زندگی یُوں تو ہے لاریب ہر انساں کو عزیز
زندگی اُن کی ہے جیتے ہیں جو انساں ہوکر

عمرِ فانی نے دیا ساتھ مگر اے محروم
رنج و غم، درد و الم حسرت و ارماں ہوکر


LUX TOILET SOAP
LUX TOILET SOAP
کمال امروہی کی فلم "پاکیزہ" کی حسین اداکارہ
مینا کماری
ہمیشہ
لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کرتی ہیں
"یہ جتنا سفید ہے اتنا ہی خالص ہے"
پردۂ سیمیں پہ دیکھئے یا اسٹوڈیو کے باہر، میناکماری ویسی ہی حسین نظر آتی ہیں۔ وہ اِسلئے کہ وہ اپنے رنگ روپ کی حفاظت کی اہمیت کو بخوبی جانتی ہیں اور یہ ذمہ داری انھوں نے خالص، سفید لکس ٹائلیٹ صابن کے سپرد کر رکھی ہے اسی لئے تو اِن کی جلد ایسی ملائم اور نازک ہے۔ اپنی جلد بھی ایسی ہی رکھئے۔ باقاعدہ لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے۔
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
ہندوستان میں بنا
LTS. 490-XM UD

افسانہ

دو گریٹ عورتیں

از

جناب رام لعل

فلیٹ نمبر ایس ۴/۶ چندر نگر عالم باغ۔ لکھنؤ

۲۲ اگست ۱۹۵۶ء

جناب خوشتر صاحب!

آداب۔ گزشتہ ماہ دہلی جاکر بھی آپ سے نہ مل سکا۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ فون پر جو تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی اُس کا لطف ابھی تک آرہا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میں وعدے کے مطابق بہت جلد دہلی نہ آسکوں گا۔ یہاں آکر حالات ہی ایسے ہو چکے ہیں۔

افسانہ نمبر اور اُس کے بعد کا شمارہ ملا۔ میں نے ایک مدت سے بیسویں صدی میں نہیں لکھا، پھر بھی آپ مجھے بیسویں صدی کا ہر شمارہ باقاعدہ اور بذریعہ رجسٹری بھیجتے رہے ہیں۔ اس نوازش کا شکریہ کیسے ادا کروں؟ —— ایک افسانہ "دو گریٹ عورتیں" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ پسند کریں گے۔

آپ کا

رام لعل۔

یہ واقعہ ڈیڑھ سال پہلے کا ہے۔ بھاگیرتھ ناتھ مصرا دفتر سے گھر آتا تھا تو ں کے ماتھے پر تیوریاں چڑھی ہوتی تھیں۔ موٹر سائیکل گیرج میں کھڑی کر کے یدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اُس کے تین بچے۔ ستائیس برس کی جوان ، در خوبصورت بیوی۔ اور ادھیڑ ماں، جو دن بھر اُس کے واپس آنے کا انتظار کرتے ہتے تھے۔ اُس کا بگڑا ہوا موڈ دیکھکر اُداس اور مایوس ہو جاتے۔ اُس کے کمرے یں جانے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی۔ اُس کی آمد کے بعد گھر بھر پر جیسے سکوت طاری ہو جاتا۔ ہر ایک حرکت رُک جاتی۔ کوئی سرگرمی باقی نہ رہتی۔ سجیوا جو اکثر اُس وقت بلوں وسنوارنے میں مصروف ہوتی تھی۔ ڈرینگ روم سے نکل کر برآمدے میں ساس کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ اُس کی ساس کرسی پر لیٹے لیٹے سر گھما کر کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو گھورتی۔ کچھ لمحوں تک اسی طرح گھورتی رہتی۔ پھر منہ گھما کر بہو کی طرف بہت پیار اور ہمدردی سے دیکھتی۔ اور اُس کے کان میں پڑا ہوا بُندہ چھو کر آہستہ سے کہتی۔ "جاؤ اندر جاؤ بٹیا۔ شاید اُسے چائے ضرورت ہو"

مصرا نے شام کو گھر پر چائے پینا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ ٹیلیفون پر اطلاع دیا کرتا تھا "میں آرہا ہوں۔ چائے تیار رکھو!" اب جب دفتر میں فون پر اُس کی آمد کا وقت پوچھا جاتا تھا تو مصرا کا کلرک جواب دیتا۔ "صاحب دفتر میں نہیں ہیں، کیا معلوم کہاں گئے ہیں ——!"

سجیوا ساس کے مجبور کرنے پر ساڑی کا پلّو درست کرتی ہوئی اندر چلی جاتی۔ شوہر کو بغیر کپڑے تبدیل کئے کوچ میں لیٹے انگریزی کا کوئی فلمی رسالہ پڑھتے ہوئے پاتی۔ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہتی۔ پھر ہمت کر کے کہتی۔

"کپڑے تو بدل لیجئے!"

کوئی جواب نہ ملتا۔

"آج دفتر سے بہت تھکے ہوئے آئے ہیں!"

وہ مطالعے میں کھویا رہتا۔

"چائے لے آؤں؟"

"نہیں!"

بلاآخر ایک لفظ کا جواب مل جاتا۔ اور وہ زخمی دل لے کر لوٹ آتی۔

اکثر پہننے کے کپڑوں کے بارے میں بھی جھگڑا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ شجیوا اس بات کیلئے بہت محتاط رہتی تھی کہ دھوبی سے کپڑے واپس لینے کے بعد کوئی قمیص یا پتلون ٹوٹے ہوئے بٹن کے ساتھ سوٹ کیس میں نہ رکھی جائے لیکن کبھی کبھی غلطی ہو ہی جاتی تھی۔ اسی طرح جب نوکر کھانا لے کر دفتر پہنچتا تھا تو کبھی کبھی اُسے کھانا واپس لے آنا پڑتا۔ جب اُس نے کھانے کے متعلق ہدایات ہی دینا چھوڑ دیا تھا تو شجیوا کیا کر سکتی تھی۔ جو بہتر سمجھتی تھی تیار کر کے بھجوا دیتی تھی۔

مصرا نے بچوں سے دلچسپی لینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ باپ کی محبت سے محروم رہ کر بچے اُداس اور غمگین رہتے تھے۔ اُن پر ماں کا اثر زیادہ تھا۔ اس لئے خاموش رہتے تھے۔ باپ جیسی طبیعت پائی ہوتی تو شرارتوں سے مصرا کی ناک میں دم کر دیا ہوتا۔

بیوہ ماں اپنے شوہر کی موت کے بعد ہی بیٹے کے پاس آئی تھی۔ اس لئے وہ مصرا کو ڈانٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی طرح وہاں باقی زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔

پینتیس برس کا وجیہہ، دراز قد، اور چھریرے بدن کا جونیئر گزیٹیڈ افسر لوسرمال کے سرکاری بنگلے میں اس طرح رہ رہا تھا، جیسے اُس کی زندگی میں ایک بہت بڑا بحران آ گیا ہو۔ بہت بڑا کرائسس! اُس نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ دل کا راز کسی سے نہ کہا۔

ایک دن رات کو آٹھ بجے برآمدے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھانے کے لئے بیک وقت تین آدمی جلدی سے آگے بڑھے۔ کچن میں سے نوکر اور اپنے اپنے کمرے میں سے مصرا اور شجیوا۔ شجیوا کو زکام تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی پہلے ریسیور اُس نے اٹھایا۔ اور پھر اچانک کسی گہری سوچ میں ڈوب کر اُس نے ریسیور اپنے خاوند کی طرف بڑھا دیا۔ جو اُس کے سامنے ذرا فاصلے پر رُک گیا تھا

"آپ کا فون ہے!"

"کون ہے؟"

اُس کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کال کا دیر سے منتظر تھا۔ شجیوا نے کچھ نہ بتایا۔ رومال سے ناک پونچھی اور سفید کشمیری شال میں گردن کو اچھی طرح لپیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں بچے کو اُن کی دادی کوئی کہانی سُنا رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد بھاگیرتھ کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور نوکر سے کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

رات کو وہ دو بجے لوٹا۔ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نوکر کے علاوہ کسی کو نہ جگایا۔

سونے سے پہلے نوکر سے پوچھا۔

"شجیوا کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جب سے بستر سے نہیں نکلیں صاحب!"

"کچھ کھایا؟"

"ایک بار چائے پی تھی۔"

"کتنے بجے؟"

"شاید ساڑھے نو بجے۔"

"ڈاکٹر کو بلا لیا ہوتا!"

نوکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے قدرے حیرانی سے صاحب کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے صاب کا موڈ ٹھیک ہوتا سمجھ کر خوش ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی مصرا نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر بیس منٹ کے بعد آ پہنچا۔ شجیوا کا معائنہ ہو جانے کے بعد دونوں چائے کی میز پر بیٹھے غور کر رہے تھے۔ مصرا نے اچانک ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے ڈاکٹر کہ میں اپنی بیوی کی صحت خراب ہونے کے لئے ذمہ دار ہو سکتا ہوں لیکن میرے ساتھ یہ ٹریجڈی بھی تو ہے کہ وہ مجھے صحیح طور پر سمجھتی نہیں۔ ایک شوہر کے لئے اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر نے اُس کی بیوی کی بیماری کے علاوہ اور کسی بات سے دلچسپی نہ لی۔

افسانہ

شہر سے دُور

از

جناب لئیق اختر فیض آبادی

امام باڑہ ۔ فیض آباد ——— ۱۱ رمئی ۱۹۵۵ء

بھائی جان! تسلیم

ایک کہانی بھیج رہا ہوں، اُمید ہے پسند آئے گی۔ اس میں خالد اور رانی دو کرداروں کو پیش کر کے شہر اور گاؤں کو سامنے لایا ہوں۔ پتہ نہیں کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہوں۔ اگر پسند آجائے تو شائع کر دیجئے۔

آپ کا مخلص بھائی ——— لئیق اختر

خالد تمام رات جاگتا رہا ——— نیند آنکھوں سے دُور تھی اور دماغ یادوں کی دنیا میں خوش خرام ——— یادیں آتی رہیں، ہرے بھرے کھیتوں کی بل کھاتی ہوئی دریائے ٹونس کی، جھیل کے سبز پانی کی، آموں کے باغ کی، ساون کے جھولوں کی ——— یاد صف در صف چلی آرہی تھی۔ اُس نے سر کو جھٹکے دیے، دماغ کو دوسری باتوں میں لگانا چاہا، کتابوں کی الماری سے کتابیں نکالیں۔ لیکن دو چار سطروں سے زیادہ کسی کتاب کو پڑھ نہ سکا۔ کتنی ہی بھولی بسری یادیں تھیں جو دل کی گہرائیوں سے ذہن کی سطح پر اُبھر آئی تھیں۔ انھیں یادوں میں ایک یاد رانی کی بھی تھی جو آگئی ——— گاؤں کی وہ الھڑ لڑکی۔ دماغ کے ہر روزن اور ذہن کے ہر دریچے سے جھانکنے لگی۔

جب یونیورسٹی بند ہوگئی تھی۔ جب ہاسٹل ویران ہو رہا تھا۔ اور کمرے سُنسان۔ خالد بھی گاؤں گیا اور وہاں اُسے رانی مل گئی ——— گلاب ایسے عارضوں، رسیلے ہونٹوں، کاجل ایسی آنکھوں والی رانی ——— چودہ سال بعد خالد اپنے ماموں کے یہاں گیا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچا تو اُس کی بہت آؤ بھگت ہوئی، ماموں نے سر آنکھوں پر بٹھایا، ممانی نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے، ماموں زاد بہنوں نے شکر کے سجدے کیے۔ بڑی بڑی خاطریں کی گئیں ——— اور ایک دن خالد جب صبح کی تفریح سے واپس آرہا تھا تو چارٹلیا کے پوربی کنارے پر اُس نے رانی کو دیکھا۔ دو گاگریں سر پر، ایک گھڑا بغل میں، وہ آہستہ آہستہ پنگھٹ کی سیڑھیوں سے اتر رہی تھی، گلابیاں چھلکاتی ہوئی جوانی، سُرخ گہرے چھینٹ کی چولی، سیاہ اور سفید پھولوں کا لہنگا۔ اُڑتا ہوا آنچل، بکھرے ہوئے بال ——— خالد نے رانی کو دیکھا اور رانی نے خالد کو۔ نگاہیں چار ہوئیں، جوانیوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی ——— خالد خاموش، سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ کتابی چہرہ، گندمی رنگ، نیم خواب آنکھوں والی رانی چلی گئی۔ لیکن جاتے جاتے کئی بار اُس نے خالد کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا ——— وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی ——— ایک اُلجھن اور ایک اضطراب میں وہ سارا دن خالد نے گذارا ——— وہ سمجھتا تھا حسُن صرف شہر میں ہے، حسُن صرف کولتار کی سڑکوں پر، کافی ہاؤس میں، پکچر ہاؤس میں، اونچی اونچی کوٹھیوں میں، پارکوں میں، بازاروں میں ہے ——— لیکن اُس دن اُسے اپنے اِس خیال سے خود ہی بغاوت کرنی پڑی۔ شہروں کا حسُن مرہونِ غازہ ہوتا ہے۔ آرائش ہی آرائش، پوڈر، لپ اسٹک ——— لیکن یہ حسُن ——— حسنِ سادہ، ——— کتنا پیارا، کتنا پُرکشش ہے ———

زدی ہدایات دے کر چلا گیا۔ اُس دن بھاگیرتھ نے سجیولا کے پلنگ کے پاس کرسی
الا اخبار پڑھا۔ اُسے کچھ دلچسپ خبریں بھی سنائیں۔

سجیولا اتنی زیادہ بیمار نہیں تھی۔ زکام، سردی اور جسم کے کئی حصّوں کا
، کچھ روز بعد ٹھیک ہو گئی۔ وہ قدرے خوش بھی رہنے لگی۔ کیونکہ تین چار دن سے
لیرتھ اُس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آ رہا تھا۔

ایک رات وہ بہت دیر تک اپنے شوہر کے ساتھ اُس کے کمرے میں باتیں
ں رہی۔ سجیولا کا بھائی امریکہ سے ایک خاص صنعتی کام کی ٹریننگ لے کر واپس آ
تھا۔ دن میں اُس کا تار ملا تھا۔ وہ چاہتی تھی بھاگیرت اور وہ دونوں اُس کا سواگت
نے کے لئے بمبئی پہنچیں۔ بھاگیرتھ نے کچھ سوچ کر ہاں کہہ دی۔ سجیولا اتنی خوش تھی
ہ اپنے شوہر کی گزشتہ سرد مہری بالکل بھول گئی۔ اور اُس کی کلائی پر اُگے ہوئے
، سیاہ اور ملائم بالوں پر اپنا گال رگڑ کر بولی۔

"اچھا یہ بتائیے اُس دن شام کو کس لڑکی کا فون آیا تھا؟"

مصر نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے اُس کے سیاہ ریشمی بالوں کو ہاتھ میں
ہا۔

"بمبئی جائیں گے تو تم اپنے بالوں کو تاج میں پمپ بھی کرا لینا۔"

"نہیں۔ اب میں بالوں کو ذرا لمبا ہونے دوں گی۔ میری عمر کی عورتیں بالوں کو
رف جوڑے کی شکل میں رکھتی ہیں۔"

"عمر کی نہیں، مزاج کی عورتیں کہو۔ کل بنوانی کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا
یس برس کی عمر میں بھی بالوں کی دو چوٹیاں بنائے ہوئے تھی۔"

سجیولا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور جلدی سے بولی۔ "ہاں ہاں —— اور
پال سنگھ کی بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ چھ بچوں کی ماں، سر پر لال ربن کی بو لگا
لی تھیں۔"

بھاگیرتھ بھی ہنسا۔ بولا۔ "اور پاؤڈر اور لپ اسٹک کی بہار نہیں دیکھی
ی؟"

دونوں جی بھر کر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔ سجیولا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر
چھا۔

"آپ نے بتایا نہیں وہ لڑکی کون تھی؟"

مصر سنجیدہ ہو کر ایک لمحے تک اُسے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "تم نے اُس سے
خود ہی کیوں نہ پوچھ لیا؟"

"پوچھ تو لیتی۔ لیکن آپ کے موڈ کے اور زیادہ بگڑ جانے کا ڈر تھا نا۔"
وہ مسکرا کر بولی۔

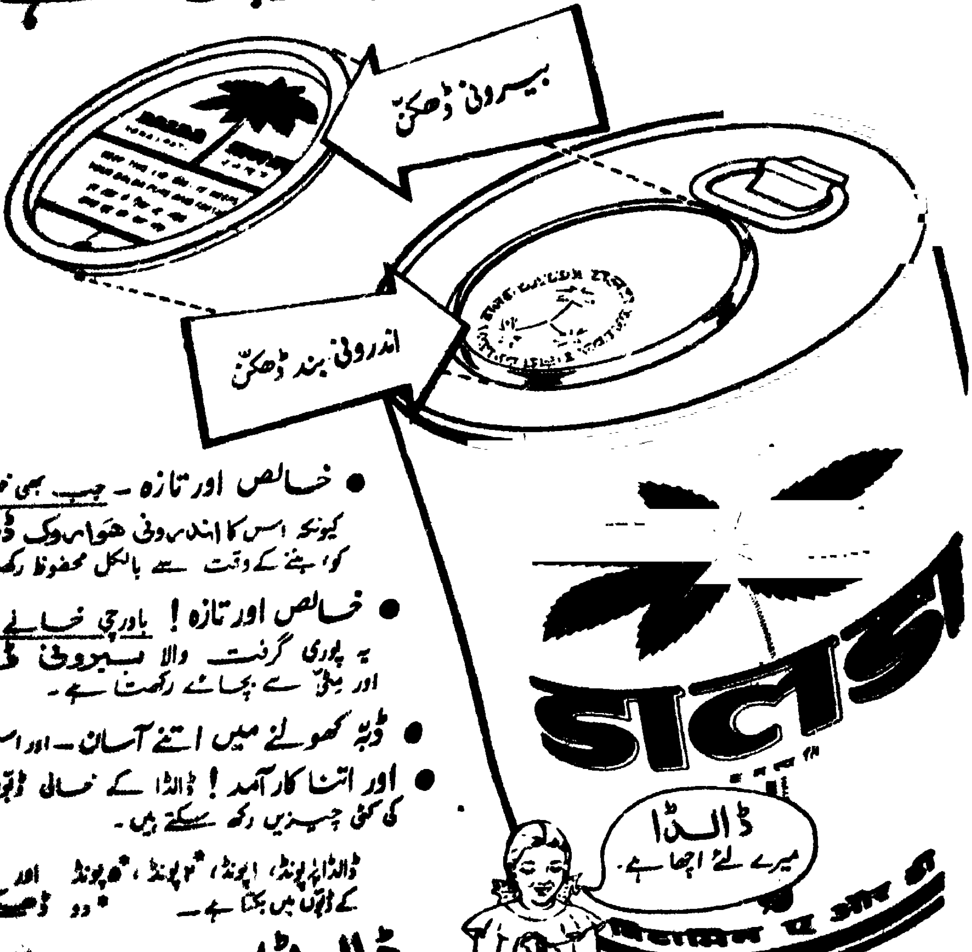
مصر نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اُس کے بالوں کے ساتھ
کھیلتا رہا اور خلا میں گھورتا رہا۔ سجیولا اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اُس کی طرف دیکھ
رہی تھی۔ بھاگیرت کے خوبصورت نقوش کی طرف۔ سر کے بیچ میں سے پورے
بال جھڑ جانے پر بھی وہ بے حد خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ کنپٹیوں سے لے کر
پیچھے گردن تک نہایت خوبصورتی سے ترشے ہوئے سیاہ چمکیلے بال تھے۔ سجیولا کی
آنکھوں میں اپنے شوہر کے خوبصورت ہونے کا غرور جھلکتا تھا جب اُس کا موڈ
درست رہتا تو سجیولا کی بھی گردن تنی رہتی تھی۔ وہ اُس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔
نو سال تک اُن کی ازدواجی زندگی بغیر کسی ناخوشگوار حادثے کے گزری تھی۔ لیکن
اب ایک سال سے بھاگیرتھ نے کچھ ایسی کیفیت دکھائی تھی جیسے سجیولا کے حسن اور اُسکی
دلکشی سے اُس کا جی بھر چکا ہو۔ اُس دن اُس لڑکی کے فون نے سجیولا کے شک کو کچھ
تقویت دے دی تھی۔ لیکن ابھی تک اُس کے دل میں رشک کی آگ نہیں بھڑکی تھی
وہ اپنے شوہر کے منھ سے اپنے شک کی تردید چاہتی تھی۔

بھاگیرتھ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"بمبئی چلیں گے تو اُس کے بارے میں وہاں باتیں ہوں گی۔ اب اور کچھ
مت کہنا۔"

بمبئی میں وہ تین دن ٹھہرے۔ سجیولا کا بھائی آ گیا تھا۔ تینوں کو فوراً لکھنؤ
واپس چلا جانا چاہئے تھا جس دن واپس جانے کا پروگرام تھا اُس دن اچانک مصر نے
اپنا پروگرام بدل دیا۔ اُس نے بتایا کہ لکھنؤ کے دفتر سے اُس کے لئے ایک ٹرنک کال
آ گئی تھی۔ اُسے وہاں مزید ہدایات کے لئے دو روز اور رُکنا ہوگا۔ سجیولا کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ
بھاگیرتھ سے اتنی زیادہ محبت کرتی تھی کہ اُس نے بمبئی میں جا کر اُسے اُس لڑکی کے بارے
میں کچھ بتانے کے لئے اُس کا وعدہ بھی یاد نہ دلایا۔ جب دیکھا کہ اُس کا شوہر اُن کا ساتھ
نہیں دے سکتا تو اُس نے اجازت مانگی کہ وہ لکھنؤ سے بچوں کو لے کر ایک ہفتے کے لئے
بھائی کے ساتھ ڈیرہ دون چلی جائے۔ اُس کے والدین کا بھی ایک خط آ چکا تھا۔ بھاگیرتھ

آہا ہے! نیا
دو ڈھکنا ڈبّہ
اس میں ڈالڈا
خالص اور تازہ رہتا ہے



- خالص اور تازہ ـ جب بھی خریدیں! کیونکہ اس کا اندرونی ہوابند ڈھکنا ڈالڈا کو بننے کے وقت سے بالکل محفوظ رکھتا ہے۔
- خالص اور تازہ! باورچی خانے میں ڈالڈا کو یہ پوری گرفت والا بیرونی ڈھکنا مکھی اور مٹی سے بچائے رکھتا ہے۔
- ڈبہ کھولنے میں اتنے آسان ـــ اور استعمال میں بھی!
- اور اتنا کارآمد! ڈالڈا کے خالی ڈبوں میں آپ گھر کی کئی چیزیں رکھ سکتے ہیں۔

ڈالڈا ½ پونڈ، ۱ پونڈ، *۲ پونڈ، *۵ پونڈ اور *۱۰ پونڈ کے ڈبوں میں بکتا ہے ـــ * دو ڈھکنے ڈبے

ڈالڈا چھاپ وناسپتی

HVM. 300-X56 UD

نے اجازت دے دی۔

جس دن وہ وکٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پر لکھنؤ جانے والی میل گاڑی پر اپنی بیوی اور اس کے چھوٹے بھائی کو چھوڑنے آیا تھا اس وقت ریلوے بک اسٹال کے سامنے شانوں تک ترشے ہوئے بالوں والی سفید جارجٹ کی ساڑھی اور گہرے سرخ رنگ کے ریشمی بلاؤز میں ملبوس ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی بہت بے چینی سے کئی کتابوں کو جلدی جلدی دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ خریدنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی اس نے پانچ چھ فیشن اور کلب کی زندگی کے ہفتہ وار اور ماہنامے خرید لئے۔ وہ بائیس برس کی اونچے قد کی پتلی سی لڑکی تھی۔ جس انداز کے اس کے بال تھے، جس طرح کے اس نے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جیسی بے چینی اس کے چہرے پر عیاں تھی اس سے وہ بے حد دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی ناک کی نوک ذرا موٹی تھی لیکن آنکھوں، گالوں اور بھرے بھرے ہونٹوں کے بیچ میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب گاڑی کا انجن ایک دہشت ناک سیٹی بجا کر بھاپ چھوڑتا ہوا گاڑی کو پلیٹ فارم سے گھسیٹنے لگا تو بھاگ کے وہ ناگہاں قریب قریب بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اور اس کے ہاتھ میں رسالوں کا بنڈل دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا وبال ہے؟"

اور پھر بنڈل کو اسٹال کے اندر پھینک کر بولا۔

"پلیز — اسے رکھیئے، ہم پھر لے جائیں گے۔"

اور اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا ٹیکسی لی اور شہر کی سڑکوں پر اندھیرے میں بھاگتی ہوئی بے شمار موٹروں کے بیچ میں دونوں کھو گئے۔

دوسرے دن اس نے شجیوا کے والدین کو تار بھیجا "شجیوا آ رہی ہے۔ اُسے اپنے پاس ایک مہینے تک رکھئے۔ اتنا عرصہ میں دفتر کے کام سے بمبئی رہوں گا۔"

پھر دفتر کو ایک تار بھیجا — "چھٹی کی میعاد ایک ماہ تک بڑھا دیجئے۔ بیوی سخت بیمار ہے۔"

اور ایک دن گرم اور خوش گوار دوپہر کو جوہو کے کنارے ریت پر اس لڑکی کے قریب بیٹھا ہوا بھاگیرتھ کہہ رہا تھا "تمہیں اپنے قریب لانے کے لئے مجھے پورا ایک سال لگا۔ اور اب جب کہ تم میرے بالکل قریب ہو، میرے قبضے میں ہو، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنا بہت مشکل ہے۔"

لڑکی نے اس کی طرف بہت پیار سے دیکھا۔ پھر شرم سے نظریں جھکا کر بولی۔ "اب کچھ سوچنا اور کہنا میری طاقت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔"

"تم کچھ نہیں کہتیں۔ لیکن پھر بھی تم میری کتنی بڑی قوت ہو۔ حرارت ہو تحریک ہو۔ تم میرے دفتر میں نہ آئی ہوتیں تو آج میں دفتر کی فائلوں میں گم ہوتا۔ آج اس طرح خود کو چست، ہشاش بشاش اور نوجوان محسوس نہ کرتا۔ بلکہ چند سال اور بوڑھا ہو چکا ہوتا عورت کی محبت مرد کو کتنا جوان رکھتی ہے! پھر جب عورت بھی مرد سے اتنی ہی سرگرمی سے محبت کرنے لگے تو مرد پر ایک جادو سا ہو جاتا ہے۔ سدرشن! تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ میں محسوس کرتا ہوں اگر کسی وجہ سے تم مجھ سے دور ہو گئیں تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ میں اپنی موت کا تصور بخوبی کر سکتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے سدرشن! کیا تم کچھ بتا سکتی ہو کہ میں ایسا کیوں محسوس کرنے لگا ہوں؟"

سدرشن جواب تک دونوں گھٹنوں کو سینے سے ساتھ لگائے اور دونوں بازو ان سے باندھے ہوئے بیٹھی تھی، ریت پہ کہنی کے بل لیٹ گئی، ٹانگوں پر سے اڑتی ہوئی ساڑھی کو پاؤں کے نیچے پھنسا کر پاؤں تک لے گئی۔ اور رخسار پر گرے ہوئے بالوں کو پیچھے گردن پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"آج میں بھی اسی طرح محسوس کرتی ہوں لیکن اگر آپ نے میری طرف اتنی توجہ نہ کی ہوتی اور مجھے مجبور نہ کیا ہوتا تو میرے دل کی کیفیت بالکل دوسری ہوتی۔ ہماری محبت پہلی نظر کا نتیجہ تو تھی نہیں۔ یہ اتفاق اور ساتھ ساتھ کام کرنے کا نتیجہ ہے میں آپ کو الزام نہیں دیتی۔ الزام دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنی محبت کا اقرار نہ کروں میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ میں اپنی پوری زندگی آپ پر نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کی محبت پر بھی مجھے پورا بھروسہ ہے لیکن پھر بھی — پھر بھی مجھے خیال آتا ہے میں محسوس کرتی ہوں، میرا دل — کبھی کبھی جب ڈرنے لگتا ہے تو میں سوچنے لگتی ہوں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے۔ آپ کے تین بچے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، خوبصورت اور پڑھی لکھی بیوی ہے۔ جو آپ پر جان چھڑکتی ہے۔ میں تو صرف آپ کی ایک معمولی سی اسٹینو ہوں۔ یہ سب کچھ کیسے حل ہوگا! اتنی بڑی مشکل، اتنی بڑی پرابلم! سچ مچ میرا جی ڈوب ڈوب جاتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے سدرشن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں لڑھک کر

ریت میں جذب ہو گئیں۔

بھاگیرتھ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ کسی الگ تھلگ مقام پر ہوتا تو اُس کی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اُس کا سارا خوف، سارے شبہات اور سارے آنسو پی جاتا لیکن اُس کے آس پاس بہت سے لوگ دھوپ کھا رہے تھے۔ ریت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ٹہل رہے تھے۔ نہا رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے۔ پھر بھی اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان والہانہ دبا کر بولا۔

"سدرشن! اِس مشکل کا حل ضرور ہے۔ میں سجیو اکو طلاق دوں گا۔ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ اُسے طلاق ضرور دوں اور تم سے شادی کروں۔ طلاق نہیں ہو سکی جب بھی میں تم سے شادی کروں گا۔"

"یہ کہتے وقت آپ پھر بھول جاتے ہیں کہ آپ سرکاری ملازمت میں ہیں۔ اور سرکاری ملازم ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔"

سدرشن کو اپنے آنسوؤں پر کوئی اختیار نہ رہا۔ دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر ریت پر لیٹ گئی۔

مصرا نے بہت بے چارگی سے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ سدرشن کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "میں سجیوا سے صاف صاف کہہ دوں گا، اُسے سب کچھ بتا دوں گا، اُس سے بھیک مانگوں گا۔ وہ انکار نہیں کرے گی۔ وہ اتنی نیک ہے، مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے۔ میرے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جائے گی۔ وہ تمھیں اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھے گی کبھی اُس کے دل میں رشک و رقابت کا جذبہ نہ جاگے گا۔"

سدرشن اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھنے لگی۔ بھاگیرتھ کی باتوں نے اُسے نئے خوابوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بھاگیرتھ مسکرانے لگا۔ بولا۔

"چلو چلیں۔ آج کوئی اچھی سی فلم دیکھیں۔ کسی اچھے ریسٹوران میں بہت اچھا کھانا کھائیں۔ میرے دل میں ایک نئی اُمید پیدا ہو گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں، ہمارا یہاں چھُپ کر رہنا فضول ہے۔ لکھنؤ واپس جا کر کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ساتھ رہ سکیں۔ کیا ہم کل واپس چلے جائیں؟"

میری ماں اگلے ہفتے اندور سے لوٹے گی۔ اُس کے آنے سے پہلے مجھے لکھنؤ میں ہونا چاہیے۔"

دونوں کی محبت رنگ لائی۔ دفتر کے کلرک ایسی باتوں کی کھوج میں رہتے ہی ہیں۔ پہلے اِس محبت کے بارے میں صرف اشاروں سے باتیں ہوتی تھیں۔ پھر کھُلے عام بحث ہونے لگی۔ لکھنؤ واپس آکر مصرا اور سدرشن دونوں کو طویل رخصت لینی پڑی۔ سجیوا ڈیرہ دون نہیں گئی تھی۔ اُس نے اپنے بھائی کے ساتھ صرف اپنے بچوں کو بھیج دیا تھا۔ یہاں آکر اُسے اپنے شوہر کے رومان کی خبر مل گئی تھی۔ دفتر کے ایک کلرک نے ایک خط کے ذریعے اُسے سب کچھ لکھ دیا تھا۔ وہ دونوں کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ رشک و رقابت کی آگ اُس کے اندر پوری طرح بھڑک اُٹھی تھی۔ لیکن اُس نے یہ بات ابھی تک اپنی ساس کو نہیں بتائی تھی۔ اُس کی زندگی میں پہلی بار ایسا موقعہ آیا کہ وہ خود اپنے شوہر سے لڑنے کے لئے تیار ہوئی۔ دفتر میں بدنامی ہو جانے کے بعد مصرا اپنے آپ کو صد درجہ کمزور اور حقیر سمجھنے لگا تھا جب بیوی نے اُس سے اُس کی بے وفائی کے لئے جواب طلب کیا تو وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ سجیوا جب اپنے غصّے کی بھڑاس نکال چکی تو اُس نے اُسے سمجھانے اور خوشامد کے انداز میں کہا۔

"مجھے تمھارے الزام کا اعتراف ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ تمھارے ہوتے ہوئے ایک اور لڑکی میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میں بالکل بے بس ہو گیا۔ کیا ایک مرد دو عورتوں سے محبت نہیں کر سکتا؟ میرے دل میں تمھاری محبت بھی اُسی طرح موجود ہے۔ میں تم سے کبھی دُور نہیں جانا چاہتا سجیوا! تم نے ایسا کیوں سمجھ لیا ہے کہ میں تمھیں بھول جاؤں گا۔ تم سے الگ ہو جاؤں گا۔ تم سوچو، میری اِس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم ٹھنڈے دل سے اور پُوری سچائی سے اِس معاملے پر سوچو گی تو یہ مشکل ضرور آسان ہو جائے گی۔"

سجیوا جو چند لمحے پہلے شعلہ بنی ہوئی تھی روتی ہوئی اُس کی گود میں گر پڑی۔ سسکیاں لیتے ہوئے بولی "یہ سچی محبت نہیں ہے۔ آپ مجھے دھوکا دینا چاہتے ہیں آپ نہیں جانتے میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"تم کیسی بیوقوف ہو۔ اِس واقعے پر جذباتی ہونے کی بجائے سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نے تمھارے سامنے ساری حالت بیان کر دی ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ

…اُس لڑکی کو تمھارے پاس کس طرح لے آؤں ؟ میں چاہتا ہوں تم اُس سے ایک… لو۔ تم دونوں مل کر ساتھ رہنے کی کوئی صورت نکالو۔"

"نا ممکن ہے ! میں اُسے اِس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی ——!" سجیوا بپھر… پڑی گئی۔ اُس نے شوہر کی گود سے سر اُٹھالیا اور کمرے سے باہر چلی آئی۔

کئی دن گزر گئے۔ جہانگیر تھ گھر سے باہر نہ نکلا۔ وقت کا زیادہ حصہ وہ کتابیں… پڑھنے میں گزارتا تھا۔ بیوی کے ساتھ بہت کم بات چیت ہوتی تھی۔ دونوں خاموش… رہتے تھے۔ مصرا اپنے آپ کو بہت اُداس اور تنہا محسوس کرتا تھا۔ اتنے دن تک سدرشن… سے اُس کی ملاقات نہ ہوئی۔ اُسے سدرشن کے مکان کا نمبر معلوم تھا لیکن آج تک… نہ گیا تھا۔ اُسے ہمیشہ اپنے دفتر یا شہر کے اونچے درجے کے ریستورانوں میں ملتا… تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی روز اُس کے گھر جا کر اُسے اپنے گھر لے آئے۔ اپنی بیوی… سے ملائے لیکن وہ اتنا غمگین رہتا تھا کہ وہاں جا نہ سکتا تھا۔

ایک دن اچانک سجیوا نے آ کر کہا۔ کیا آپ مجھے اُس لڑکی سے ملا سکتے… ہیں ؟"

مصرا حیران رہ گیا۔ سجیوا کے تیور بتلاتے تھے کہ وہ وہاں جا کر اُس کے ساتھ… لڑے گی۔ لیکن پھر بھی وہ اُسے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسے یقین تھا… سدرشن اتنی معصوم اور پیاری لڑکی ہے کہ سجیوا اُسے کوئی سخت لفظ کہہ بھی نہ سکے گی۔… اُسے ساتھ لے کر چل پڑا۔

سدرشن کا مکان ایک چھوٹے سے محلّے میں تھا۔ بہت تنگ گلی تھی۔ جب… وہاں پہنچے تو دروازے پر ایک اجنبی نوجوان نے اُن کا سواگت کیا۔

وہ اُنھیں اندر لے گیا۔

سدرشن کی ماں کو جہانگیر تھ جانتا تھا۔ وہ سامنے برآمدے میں کھڑی تھی… انہیں دیکھ کر اُس نے سدرشن کو آواز دی۔

دوسری منزل کے جنگلے پر سے جھک کر سدرشن نے اُنھیں دیکھا تو مسکرا دی… ہاتھ جوڑ کر نمستے کہی۔ اور نیچے آ کر بولی۔

"یہ ہماری بھابی ہیں نا ؟ بچوں کو ساتھ نہیں لائے ؟"

مصرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سدرشن کو کئی دنوں کے بعد دیکھا تھا۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ لیکن اچانک اُس کی نظر سدرشن کے سر پر گئی۔ اُس کی مانگ میں سیندور کی ایک گہری لکیر تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ گھبرا کر سجیوا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران ہو کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ سدرشن کی ماں نے اُنھیں کمرے کے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

"مصرا صاحب ! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو سدرشن کی شادی پر دعوت نامہ نہ بھیج سکی۔ دراصل یہ شادی مجھے اچانک کر دینی پڑی کسی کو بلا بھی نہ سکی۔ اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ آج سدرشن میرٹھ جا رہی ہے۔ آپ میرے داماد سے نہیں ملے ؟ یہی تو ہیں شری رگھوناتھ سنگھ باجوہ۔ میرٹھ میں ٹیچر ہیں۔"

جہانگیر تھ اور سجیوا جب گھر لوٹ رہے تھے تو سجیوا نے راستے میں اُس سے پوچھا۔

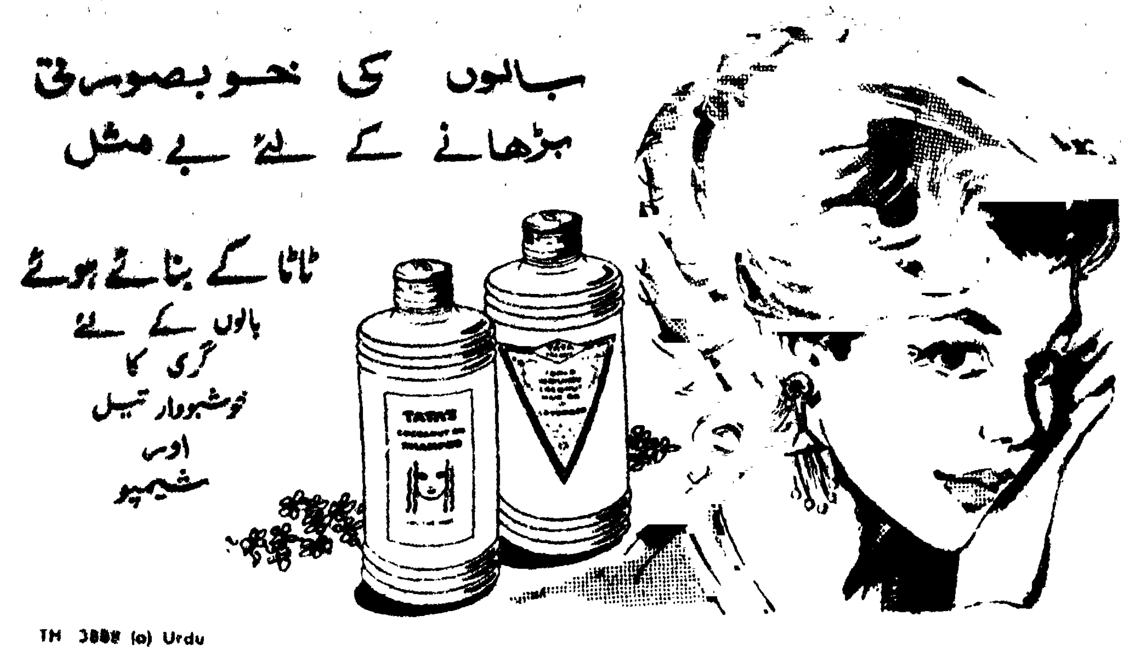
"اب آپ کس سے محبت کرتے ہیں ؟"

جہانگیر تھ نے اُس کا ہاتھ زور سے دبایا اور کہا۔

"دونوں سے —— کیونکہ تم دونوں گریٹ ہو۔ تم دونوں کے مقابلے میں میں بہت حقیر ہوں ! —— بہت چھوٹا !!"

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (مینیجر)


بالوں کی خوبصورتی
بڑھانے کے لئے بے مثل
ٹاٹا کے بنائے ہوئے
بالوں کے لئے
گری کا
خوشبودار تیل
اور
شیمپو
TATA'S
TH 3882 (a) Urdu


ایک زمانے سے مشہور ....
قدیم زمانہ سے ہندوستان میں نیم کو حیرت انگیز زہرمار اور دوا کی سی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور نیم ٹوتھ پیسٹ میں نیم کی ان تمام خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جدید دور کے صحت دندان، دانتوں اور مسوڑھوں کو مضبوط رکھنے والے عناصر بھی اس میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی دوسرا ٹوتھ پیسٹ، نیم ٹوتھ پیسٹ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔
Neem
TOOTH-PASTE
Alchemic
نیم
ٹوتھ
پیسٹ
دی کلکتہ کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔ کلکتہ ۲۹

زندگی

افسانہ

از

محترمہ آمنہ سراج بی۔اے

۶۳ ویسٹرن ہاؤس نئی دہلی

بھائی صاحب! تسلیم

سالنامے کے لئے ایک کہانی "زندگی" بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی "سوکھے پتے" کے متعلق بھی جس گرمجوشی سے تنقیدی اور تعریفی خطوط آ رہے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کو ہر طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں اور ترقی پسند ادیبوں کے حلقے میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ رسالہ ہمیشہ یونہی اُردو زبان کی خدمت کرتا رہے۔ یہ افسانہ میں نے خاص طور پر سالنامے کے لئے لکھا ہے، اس لئے اُسی میں شائع کیجئے۔ اُن سب کا ممنون ہوں بصمیم قلب شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے اپنی گرانقدر رائے سے نوازا۔

آمنہ سراج

گیلی گیلی لکڑیوں کا گٹھا دونوں بازوؤں پر اُٹھائے وہ زینے پر چڑھتی گئی۔ دو چار قدم چلنے کے بعد اُسے دم لینے کو ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ تھک جاتی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ لکڑیاں گیلی تھیں اور پتھر کی طرح بھاری۔ اور پھر سیڑھیوں پر دلی کی ملگجی سی شام کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے صاف نظر بھی نہ آ رہا تھا۔ آخر اُسنے ہانپتے ہوئے آخری زینہ بھی طے کر لیا۔ اور چھوٹے سے تختے کے برآمدے میں آ گئی۔ یہیں اُسے لکڑیاں جمع کرنی تھیں۔ غلام رسول، چوکیدار کا لڑکا گیلے چیلر کو کاٹ کاٹ کر رکھ رہا تھا۔ جونہی کلہاڑا اُٹھتا ننھے ننھے لکڑی کے ٹکڑے فضا میں بہت دُور دُور تک رقص کرتے چلے جاتے۔ اور پھر ایک کرخت آواز کے ساتھ کلہاڑا لکڑی پر گرتا۔ اور وہ کاغذ کے گیند کی طرح ٹوٹ کر رہ جاتی۔ جب اُس کے بازو اوپر اُٹھتے اور سینے اور بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ کر اُبھر آتیں تو رفیقہ اپنی آنکھیں تھوڑی سی بند کر لیتی تاکہ وہ ایک ہی نظر میں ساری مچھلیوں کو تڑپتا نہ دیکھ سکے لیکن پھر بھی وہ ایک طوفان کی طرح اُس کی نظروں کے سامنے اُبھر اُبھر کر غائب ہو جاتیں اور

راتوں کو بھی اکثر جب اُسے ابھی نیند نہ آئی ہوتی تو اُن کا خیال اُس کے دل میں ایک لطیف درد آمیز گدگداہٹ پیدا کرتا ہوا خیالات کے سمندر میں غرق ہو جاتا ــــ رفیقہ ابھی تک بازوؤں میں ہی لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے کھڑی تھی۔ دفعتہً اُس نے ایک بھرپور سانس لے کر لکڑیاں ایک کونے کے سپرد کر دیں۔ لکڑیوں کے گرنے کی آواز کچھ دیر تک مکان کے ہر کونے کا چکر کاٹتی رہی اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔ اُس کے ہاتھ اور بازو ٹھنڈک کی وجہ سے بالکل شل ہو رہے تھے۔ اور ننگے ننگے سُرخ گوشت پر جہاں جہاں لکڑیاں پڑی تھیں بڑے بڑے نیل اُبھر آئے تھے۔ بڑے بڑے جیسے کسی نے چمڑے کی قینچی سے اُس کے بازوؤں پر اَن گنت چوٹیں لگائی ہوں اور کھولتا ہوا خون اُن میں لال لال دھاریاں ڈالتا ہوا تیزی سے آ جا رہا ہو۔ اُس نے اپنی قمیص کی آستینیں نیچی کر لیں۔ اور دیر تک بٹن بند کرنے میں مصروف رہی۔ اُس کا جی واپس نیچے جانے کو نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک تو تمام زینے پر ایک دم سے بے پناہ تاریکی چھا چکی تھی۔ اور دوسرے وہ آج آدمی ہی لکڑیاں اُٹھا کر تھک ہار رہی گئی تھی۔

اپ آستینوں کے بٹن بھی بند ہو چکے تھے۔ سر پر چادر بھی ٹھیک کی جا چکی تھی پھر بھی رفیقہ کھڑی ہی رہی۔ اُسے معلوم تو تھا ہی کہ اگر اُس نے جلدی سے کام ختم نہ کر لیا تو اُسے کتنی جھڑکیاں پڑیں گی۔ اور اگر ماں نے باپ سے کچھ کہا سنا تو شاید مار بھی پڑے لیکن پھر بھی کچھ دیر وہ کھڑی رہی۔ خیالات کا ایک طوفان سا تھا جو اُس کا پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا۔ وہ اُس طوفان میں گھری رہی۔

رفیقہ نے ابھی ابھی سترھویں سال میں قدم رکھا تھا اور اس طرح خیالات میں ڈوبے رہنا اُس کا شیوہ نہ تھا لیکن پھر بھی آج اُس کی سانس تیزی سے آ جا رہی تھی اور سانس اتنی مشقت کے باعث پھولی ہوئی تھی۔ اور ایک اور ننھا سا واقعہ بھی تھا جو اُسے یوں بُت بنائے کھڑا کر رہا تھا۔ اور وہ تھا صرف یہ کہ —— لکڑیاں اُس کے بازوؤں پر جاتے وقت نہایت ہی غیر شعوری طور پر غلام رسول کا ہاتھ اُس کے گال سے چھو گیا تھا۔ رفیقہ کی زندگی میں آج تک کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تھا زندگی اُس کے لئے صبح سے لے کر شام تک ایک مسلسل کام اور مسلسل مشقت کی تصویر تھی۔ اُس کا باپ ایک معمولی سا چپراسی تھا جس کے دانت نہایت گندے، پیلے اور ٹوٹے ہوئے سے تھے۔ اور اُس کی ماں ایک خوفناک قسم کی عورت تھی۔ سوکھی ہی اور بالکل ایک بانس کی طرح لمبی۔ آج تک رفیقہ سے اُس نے کبھی پیار سے بات تک نہ کی تھی۔ ہاں البتہ ڈانٹ کر اور کرخت آواز میں حکم دینا ہی اُسے آتا تھا۔ اور غلام رسول، وہ محلے کے چوکیدار کا لڑکا تھا۔ اُن کے مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے پھر بھی رفیقہ نے اُسے بہت کم دیکھا تھا۔ وہ اکثر کام ہی میں مصروف رہتی یا پھر اپنے مکان کے پچھواڑے جہاں اُس کی ماں نے کچھ مکئی اور ساگ کی کیاریاں بنا رکھی تھیں، شالی کو کُوٹ کُوٹ کر چاول بنایا کرتی تھی۔ غلام رسول دسویں جماعت میں پڑھتا تھا لیکن پڑھے لکھے جوانوں کی طرح اُس کا دل محنت اور مشقت سے نہ کتراتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے گھر کی، ہمسایوں، بلکہ بے جان پہچان کے لوگوں کی بھی لکڑیاں کاٹ دیا کرتا تھا بازار سے سودا سلف لے آتا۔ یہاں تک کہ شام کے وقت اپنے محلے کے غریب بچوں کو سبق پڑھایا کرتا تھا۔ اِس وقت بھی وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں کلہاڑا اُٹھائے گیلے چنار کے تنوں کو پھاڑ پھاڑ کر ننھے ننھے ٹکڑے بنا رہا تھا۔

دفعتہً لکڑیاں چیرنے کی آواز بند ہو گئی۔ رفیقہ کان لگائے سُننے لگی۔ ہاں آواز بند تھی۔ شاید سب لکڑیاں کٹ چکی تھیں۔ رفیقہ نے بادلِ ناخواستہ نیچے کا رُخ کیا۔ دیر تک روشنی میں کھڑے رہنے کے بعد ایک دم سے اندھیرے میں آ جانے سے اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اور وہ آنکھیں ملنے لگی۔ ملتے ملتے کسی گوشے میں ایک عجیب سا ڈر بھی انگڑائیاں لے رہا تھا جیسے کوئی چُپکے ہی چُپکے اُس کا پیچھا کر رہا ہو اچانک اُسے لکڑی کی سیڑھیوں پر دھپ دھپ بھاری قدموں کی چاپ سُنائی دی رفیقہ مجسم گوش بن کر کھڑی ہو گئی۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ ماں تو نہیں۔ وہ تو اس وقت چاولوں کو جوش دے کر پانی نچوڑ رہی ہوگی۔ اور باپ تو رات گئے تک گھر آتا ہی نہیں۔ اور آواز بھی کچھ جانی پہچانی۔ ہاں غلام رسول —— وہی تو تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی وہی تھا۔ اُس نے لکڑیاں کمرے میں پھینک دیں اور واپس جانے لگا۔ موٹے کھدر کے کُرتے اور شلوار میں بھی وہ ایک نواب کی طرح جوڑا چکلا دکھائی دے رہا تھا۔ غلام رسول رفیقہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چُپ چاپ بُت بنی کھڑی تھی نظریں جھکائے۔

”رفیقہ!“

اُس نے اپنی تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

وہ کچھ نہ بول سکی۔ اُس کی سانس تک گلے تک اٹکی جا رہی تھی۔ وہ اور قریب آ گیا اور رفیقہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے بڑھ کر بڑی نرمی سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اِس وقت کوئی اور ہوتا تو وہ ایسی حرکت پر تھپیڑ رسید کرتی۔ لیکن غلام رسول کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔

”غلامے! —— او —— غلامے!“

یک لخت رفیقہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بھاگی۔ یہ اُس کی ماں کی آواز تھی۔ کرخت اور گرجدار۔

”آیا —— یہ لکڑیاں ڈال کر!“

غلام رسول جھٹ سے برآمدے کے باہر نکل آیا۔

اِس حادثے کے کئی دنوں بعد تک غلام رسول نظر نہ آیا۔ رفیقہ کی نظریں دروازے کی طرف لگی رہتیں۔ لیکن گوالے اور اُس کے باپ کے سوا اور کوئی نہ آیا۔ وہ حیران تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جس طرح اُس کے دل میں غلام رسول کی ایک میٹھے سے درد کی طرح چھُپی بیٹھی ہے، اِسی طرح وہ بھی ہر وقت اِس کی یاد میں

ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ کسی بہانے سے بھی نہ آیا۔ آخر اُس نے سوچ لیا کہ وہ اُسے بھُلا چکا ہے۔ اور اب کبھی نہ آئے گا لیکن پھر بھی وہ اُسے دل سے نہ بھُلا سکی آخر ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ غلام رسول اُسے بھُولا نہیں۔ علالت کی وجہ سے اُس کے گھر نہ آسکا۔ وہ سبزی دینے کے بہانے سے اُس کے گھر کی طرف چل دی۔ غلام رسول کی ماں اُس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اور وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی رفیقہ کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کی ماں نے اُسے دیکھ کر کہا۔

"اوہ! آؤ، آؤ بیٹی!"

رفیقہ نے ساگ کی ٹوکری زمین پر رکھ دی۔ اور کھڑی رہی۔ غلام رسول کی ماں ٹوکری اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور اُس نے رفیقہ کی طرف دیکھا۔

"اِدھر آؤ!"

وہ نحیف آواز میں پکارا۔

رفیقہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری پڑی تھیں، یہ بھی اُس کے لئے ایک نئی بات تھی۔ کیونکہ آج تک وہ کبھی نہ روئی تھی۔ مصیبت زدہ زندگی گزارتے ہوئے بھی اُس کی آنکھیں کبھی آنسوؤں سے نم نہ ہوئی تھیں لیکن آج غلام رسول کو چارپائی پر پڑا دیکھ کر اُس کے دل نے تڑپ کر اُس کی آنکھوں کو بھی تڑپا دیا۔ ایک انجانی سی حدت سے منجمد آنسوؤں کو پگھلا دیا۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اُس کے قدم غیر اختیاری طور پر چارپائی کی طرف اُٹھ گئے۔ اور غلام رسول کا بُخار میں پھُنکتا ہوا ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اُس دن تمھارے گھر میں سردی لگ گئی۔ لیکن میں تمھیں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھُولا۔"

رفیقہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"بہت عجیب سی بات ہے رفیقہ! نہ تمھیں ماں باپ کا پیار ملا۔ نہ مجھے۔ اور پھر ہم دونوں کے ماں باپ زندہ ہیں۔ ایسے ماں باپ کسی کے بھی نہ ہوں گے میری اور تمھاری زندگی ایک سی ہے۔ بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ میں بچپن سے لکڑیاں کاٹتا آرہا ہوں۔ تم بچپن سے شالی کو کوٹ کوٹ کر چاول بنانے میں لگی ہوئی ہو بچپن سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن پہچان نہیں پائے۔ میں نے کئی بار تمھیں قریب سے دیکھنے کی کوشش کی۔ تم سے باتیں کرنے کی خواہش کی۔ لیکن میرا چوکیدار باپ بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ اُس نے راستہ روک لیا۔ میں بہت غریب ہوں۔ آج میں اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ لیکن ایک دن بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ پٹواری، سکول ماسٹر اور.... اور...."

رفیقہ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

غلام رسول نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے آنسو آنکھوں میں آنے سے پہلے ہی بُخار کی تپش سے سُوکھ رہے تھے۔ وہ دیر تک خاموش رفیقہ نے رُندھے ہوئے گلے سے بات شروع کی۔

"میں نے تمھیں دیکھا ضرور۔ میں نے تمھارے متعلق سوچا ضرور۔ لیکن یہ محبت، یہ پیار کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتی تھی۔ میں اَن پڑھ ہوں۔ ایک بات تمھیں بتا دیتی ہوں کہ تم نے ایک بار صرف ایک بار مجھے چھُوا۔ وہ لمس میرے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام بن گیا۔ میں سب کو چھوڑ سکتی ہوں۔ سب کو بھُول سکتی ہوں لیکن اُس لمس کو نہیں جس میں چاندنی راتوں کی ملائمت اور اندھیری تاریکیوں کی کسک پوشیدہ تھی۔ آج تم پہلی بار مجھے بولتے دیکھ رہے ہو۔ لیکن آج میں نہیں بول رہی۔ میری رُوح تم سے مخاطب ہے۔ اور پھر یہ رُوح کسی سے نہیں ڈرتی، کسی سے نہیں دبتی۔ موت سے بھی نہیں۔ ماں باپ کی باتوں سے بھی نہیں۔"

رفیقہ اُس کے تپتے ہوئے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چومتی رہی۔

"میں نے جھیل کے قریب رہتے ہوئے بھی اُس کی لہریں نہیں دیکھیں ریت کے ذرّے ہی گنتا رہا۔ صرف یہ تمنا لئے کہ ایک دن یہ ساری جھیل اپنی ہوگی تمام لہریں میرے اشاروں پر ناچیں گی۔ دیکھو رفیقہ ہماری بدقسمتی۔ ہم ایک دوسرے کے قریب بھی آئے تو کب۔ جب ہم کہیں بھی نہیں بھاگ سکتے۔ کسی لہر کو نہیں اپنا سکتے۔"

رفیقہ نے اپنے ماحول کو بھول کر جیسے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ تمھارے سوا میرا اس دُنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تمھیں بچپن سے دیکھ رہی ہوں اب میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ تم ہی وہ میرے ساتھی ہو جس کے ساتھ مجھے اپنی زندگی کے سفر کی تاریک راہیں کاٹنی ہیں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں اپنے ماں باپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ وہ جھُوٹ مُوٹ کا رشتہ ہے۔ حقیقی رشتہ تمھارے ساتھ ہے۔ تم میرے ہو۔ میری زندگی تمھارے پاس ہے۔ تمھیں پاکر

زندہ رہوں گی۔ ورنہ . . . .“

رفیقہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں نے کتابوں میں پڑھا ہے“ غلام رسول نے اپنی تیز دھڑکنوں کو دبانے کی کوشش کی۔ ”مرد بناتے وقت خدا نے اُس کا ایک حصّہ کاٹ کر عورت بنائی تھی اور پھر دُور دُور اُنھیں پھینک دیا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کوئی پا لیتا ہے۔ کیونکہ وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ کوئی نہیں پاتا۔ گھبرا کر کسی دوسری ایسی ہی عورت کو اپنا لیتا ہے۔ اور پھر زندگی میں ادھورا پن محسوس کرتا ہے۔ تلاش جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور وہ اپنی ادھوری زندگی کو لے کر مر جاتا ہے موت کو اپنا لیتا ہے۔ کیونکہ زندگی سے حقیقی پیار کرنے والی صرف ایک چیز ہے۔ اور وہ ہے موت۔ زندگی عورت کی ہو یا مرد کی۔“

”میں تمھاری زندگی کا حصّہ ہوں۔ تمھیں میری تلاش تھی؟“ رفیقہ نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

”ہاں!“ غلام رسول نے اُسی رو میں جواب دیا۔ ”تم میری زندگی کا حصّہ ہو تمھیں جب بھی میں نے دیکھا میرا دل شدّت سے دھڑکا اور کہا۔ رفیقہ ہی میں تمھاری مکمّل زندگی ہے۔ اُسے اپناؤ۔“

”تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟“

”کیونکہ میں ایک چوکیدار کا بیٹا ہوں۔ اور چوکیدار باپ بہت غریب ہے وہ میرے متعلق کچھ نہیں سوچ سکتا۔ نہ پہلی زندگی کے متعلق نہ آئندہ زندگی کے بارے میں۔ لیکن میرا دل سوچتا ہے، میری رُوح سوچتی ہے میرے جسم کا ایک ایک حصّہ سوچتا ہے۔ کیونکہ وہ غریبی اور امیری کی تقسیم سے بالاتر ہے۔ وہ نہ کسی کے بیٹے ہیں، نہ اُنھیں اپنے غریب ماحول کا احساس ہے۔“

رفیقہ کے آنسوؤں نے شدّت اختیار کر لی۔ اُس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

”تم رو رہی ہو رفیقہ! مت روؤ!“ وہ منت کر رہا تھا۔

رفیقہ نے بہت مشکل سے آنسو پونچھے۔

”تم جلدی اچھے ہو جاؤ نا۔“ بہت مشکل سے رُندھی رُندھی آواز میں اُس نے کہا۔

”رفیقہ! کیا ایک بات کہوں؟“

”کیا؟“ رفیقہ ہمہ تن گوش تھی۔

”میں نے تم سے بہت کچھ کہا۔ تم نے سُنا لیکن کیا تم . . . کیا تم . . . .“

وہ رُک گیا۔

رفیقہ سمجھ گئی۔ جذبات کی شدّت سے اُس کا مُنھ بھی لال ہو گیا۔

”رفیقہ! تم نہیں جانتیں۔ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا رفیقہ نے اُس کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شی —— ! اماں آجائے گی!“

لیکن وہ بڑبڑاتا ہی گیا۔

”میں —— میں تم سے پیار کرتا ہوں رفیقہ! خدا کے لئے مجھے ٹھکرانا مت۔ میں اچھا ہو جاؤں تو ہم دونوں کی . . . .“

رفیقہ سمجھ گئی۔ وہ ہذیان میں سب کچھ کہے جا رہا تھا۔ اِتنے میں اُس کی ماں آگئی۔ وہ بھی غلام رسول کو دیکھ کر رونے لگی۔ دونوں عورتوں کے رونے کی آواز سُن کر باہر سے اُس کا باپ آگیا۔ اُس نے پکڑ کر غلام رسول کو لٹایا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ اور دونوں ماں بیٹی کو باہر جانے کو کہا۔ رفیقہ کے قدم اپنے گھر کی طرف نہ اُٹھتے تھے۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ غلام رسول کی چارپائی سے لگی بیٹھی رہے۔ لیکن مجبوراً وہ اپنے گھر واپس آگئی۔

”اتنی دیر کہاں لگا دی؟“ اُس کی ماں نے نہایت کرخت لہجے میں کہا۔ تاکہ اُس کا باپ بھی سُن لے جو آج غلام رسول کی غیر موجودگی میں لکڑیاں چیر رہا تھا۔ رفیقہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر گم سُم بیٹھ گئی۔ سر مُنھ اپنے دوپٹے میں لپیٹ لیا اور خدا کے حضور میں دعا مانگنے لگی۔

”خدایا! تُو نے مجھے سہارا دیا ہے۔ محبت دی ہے۔ غلام رسول میری زندگی ہے میری زندگی اُس کے پاس ہے۔ محبت نام کی جو چیز ہے، وہ اُس کی دھڑکنوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ میں وہی محبت چاہتی ہوں۔ اگر تُو زندگی دینے والا ہے تو مجھے میری محبت دے۔ مجھے میرا غلام دے دے۔ ورنہ میں یہ جان لوں گی کہ تُو کہیں بھی نہیں ہے تُو ایک جھوٹ ہے، ایک چھلاوہ ہے۔ ایک بہکاوا ہے۔ اے میرے خدایا! تُو مجھے اپنا نور بخش، میری محبت بخش —— !“

اِس حُسن کی دنیا غازہ و آرائش سے آشنا ہی نہیں۔ یونیورسٹی کی سب سے حسین لڑکی آشا بھی اس کے حُسن کے آگے پانی بھرے۔

یوں ہی تمام دن خالد رانی کے حُسن کا شہر کے حُسن سے موازنہ کرتا رہا۔ اور پھر دیکھنے کی تمناؤں میں بار بار کروٹیں لیتی رہی۔ شام آئی تو وہ پھر اُسی طرف چل کھڑا ہوا پنگھٹ پر گاؤں کی اور جوانیاں تھیں۔ جھولتے ہوئے بدن، بجھتے ہوئے چراغ تھے۔ لیکن رانی نہ تھی۔ وہ آہستہ خرامی کے ساتھ گزر گیا۔ سب نے خالد کی طرف دیکھا۔ آپس میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ وہ کٹھل کے باغ تک جاکر پھر واپس ہوا۔ پنگھٹ پر اب گاؤں کے دو چار لڑکے بیٹھے تھے۔ وہ واپس آیا لیکن سینے میں ایک ہلکی ہلکی جلن لئے ہوئے۔ ایک نامعلوم سی کسک، ایک چھپی ہوئی سی اُلجھن۔ وہ ہنستا رہا۔ بولتا رہا لیکن رانی کی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔

صبح وہ اور دنوں سے پہلے ہی جاگ گیا۔ جلدی جلدی پتلون پہنا۔ نیلے سلک کی قمیص پہنی اور اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔ پنگھٹ پر دو ایک عورتیں تھیں لیکن گھونگھٹ کاڑھے ہوئے۔ وہ آگے بڑھ گیا لیکن جب وہ واپس ہو رہا تھا تو اُس نے گلی کے موڑ پر رانی کو دیکھا۔ وہ بیلے کی کلی۔ وہ چمپلی کا پھول۔ نگاہیں دونوں کی چار ہوئیں۔ خالد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ رانی کے قدم لڑکھڑائے لیکن سنبھل گئے۔ وہ فوراً پاس والی دوسری گلی میں مُڑ گئی۔

یوں ہی خالد روز صبح شام پنگھٹ کی طرف سے گزرتا رہا۔ رانی سے نگاہیں ملکراتی رہیں۔ دل دھڑکتا رہا۔ گاؤں والے اب اُس سے واقف ہو چکے تھے۔ اجنبیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ خالد اُن کے میلے کچیلے سُتلی سے بنے ہوئے تیل آلودہ بستروں پر بیٹھنے بھی لگا تھا۔

"سرکار سلام!" "بابو جی نمستے!" کی آوازیں اب وہ قدم قدم پر سُنتا۔

اُنھیں دنوں میں ایک دن جب وہ پنگھٹ کی طرف سے گزرا تو اُس نے رانی کو دیکھا وہ اپنے میلے کپڑوں کو دھو رہی تھی۔ دو چار عورتیں آس پاس بیٹھی تھیں۔ خالد آگے بڑھنے کے بجائے اُن سب کے پاس پہنچ گیا۔ سب کی نگاہیں اُٹھیں، حیرت اور تعجب کے ساتھ! اُجلے اُجلے کپڑوں والا شہر کا بابو ہم سے اتنا قریب؟ وہ اُن سب سے اور قریب ہو گیا۔ ان کے کمھلائے جسم چھوئی مُوئی کی طرح سمٹنے لگے۔ خالد نے کہا —

"یہاں پر کپڑے دھونا صحت کیلئے مضر ہے۔"

نگاہیں پھر اُٹھیں اور جھک گئیں۔ لیکن رانی کی نیم باز آنکھیں خالد کے چہرے پر سوالیہ نشان بنکر پوچھ رہی تھیں —

"تم کون ہو؟"

اُن لڑکیوں میں سے ایک دُبلی پتلی لڑکی نے جو بہت ہی تیز اور طرار معلوم ہوتی تھی اُس نے خالد سے پوچھا —

"آپ کون ہیں بابو جی!"

"تمھاری طرح ایک انسان ہوں۔"

"آپ ہمارے گاؤں کے تو نہیں ہیں۔"

"میں یہاں سے بہت دُور ایک شہر کا رہنے والا ہوں۔"

"یہاں کس کے یہاں آئے ہیں؟"

"میاں کی حویلی میں۔"

"بڑے سرکار کے یہاں؟"

"ہاں وہ میرے ماما ہیں۔"

رانی نے خالد کو دیکھا، کچھ عجیب نگاہیں — جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خالد کی نگاہیں بھی بار بار رانی کے چہرے کا طواف کرتیں۔ شوخ و شنگ لڑکی نے پھر سوال کیا —

"بابو! یہاں آپ کو بھلا کیا اچھا لگتا ہوگا؟"

"اب سے پہلے مجھے دیہاتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اب میں نے دیکھا، ہمارے شہروں سے یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں بہت اچھے ہیں۔ یہ پگڈنڈیاں اُن کشادہ سڑکوں سے بہت اچھی ہیں جہاں جھوٹ ہے، دھوکہ ہے، فریب ہے یہ جھونپڑیاں اُن محلوں سے بہت اچھی ہیں جہاں رعونت ہے، ظلم ہے، لُوٹ ہے۔ وہاں گرد اُڑانے والی کاریں ہیں۔ زہر پھیلانے والی گاڑیاں ہیں۔"

استعجابیہ نگاہوں اور متجسس نظروں میں اب ایک اطمینان تھا، ایک ٹھہراؤ تھا۔ سب غور سے خالد کی باتیں سُن رہی تھیں۔ دو چار مرد بھی میلے کچیلے کپڑوں کے گٹھر لادے وہاں پہنچ چکے تھے۔ خالد کہہ رہا تھا —

"کسانوں کے ہاتھوں میں انسان کی زندگی ہے۔ وہ زمین کے سینے سے دھرتی کی چھاتی سے اپنا خون اور پسینہ ایک کرکے اناج پیدا کرتا ہے اور پھر وہ غلہ

رفیقہ خدا کے حضور میں سربسجود رہی۔

اچانک محلے میں چیخوں کی آوازیں چلچلا اٹھیں۔ کوئی زور زور سے رو رہا تھا۔

رفیقہ خاموش بیٹھی رہی۔

ماں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"چھ کیدار کے گھر جانا پڑے گا۔"

باپ نے پوچھا "کیوں؟"

"رونے کی آواز آرہی ہے۔ غلام بیمار تھا۔ شاید۔ ۔ ۔"

باپ نے دل ہی دل میں کچھ پڑھا۔

"رفیقہ کہاں ہے؟"

"اندر بیٹھی ہے!"

دونوں غلام رسول کے گھر چلے گئے

رفیقہ دعا کرتے کرتے سوگئی۔

سوتے میں بھی خدا کے حضور میں اپنے غلام کے لئے التجا کرتی رہی۔

صبح ماں نے اسے جگایا۔

"غلام مرتے مرتے بچا۔"

رفیقہ نے جیسے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ ماں نے بات جاری رکھی۔

"گھر والے رو دھو بیٹھے تھے لیکن وہ بچ گیا۔ خدا کی قدرت ہے جسے چاہے رکھ لے۔"

رفیقہ کے چہرے پر زندگی کی رمق اجاگر ہوئی۔ زندگی کا حقیقی احساس جاگا۔ آنکھوں میں حقیقی مسرت کا رنگ نکھرا۔ اس نے اپنے میلے دوپٹے کو اپنے سر کے گرد لپٹا۔ آنکھیں بند کرکے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور تیزی سے غلام رسول کے گھر کی طرف نکل گئی —— اپنی زندگی کی طرف! —— اپنی زندگی کے پاس!!

غزل

از

جناب اثر لکھنوی

مستانہ قدم رکھ تو ہی راہِ فنا میں
سو مرحلے طے ہوتے ہیں اک لغزشِ پا میں

اے بلبلِ شوریدہ ہے دھیان بس اتنا
گل تا فلک رنگ نہ ہو تیری نوا میں

ہر ذرہ ہے محرابِ خلش زارِ تمنا
شاید دلِ مجنوں ہے تپاں شورِ درا میں

اُف شرمِ معاصی کہ پسِ نذرِ کرم ہیں
دم توڑتی کچھ سسکیاں آغوشِ دعا میں

وہ عکس کا محتاج نہ یہ صورت گرِ معنی
آئینے کو نسبت نہیں کچھ دل سے جلا میں

وابستہ ہیں اعمال سے جب دوزخ و جنت
ڈھونڈوں تری رحمت کو سزا میں کہ جزا میں

پامال کیا عشق کی غیرت نے انھیں بھی
کچھ پھول تھے امید کے دامانِ وفا میں

"دشمن جو قوی ہے تو نگہبان قوی تر"
جو مرد ہیں گھبراتے نہیں گھر کے بلا میں

رعنائی گلزار ہے جس طرح شفق سے
کچھ ہرج ہے اک تہہ جو ہو شوخی کی حیا میں

نغموں میں بدل جاتی ہے کُل عشق کی دنیا
رس ایسا گھلا ہے کسی کافر کی صدا میں

جوہر جبھی کھلتے ہیں اثر ترک و طلب کے
جب سوز سے ہو ساز ہم آہنگ دعا میں

اثر لکھنوی


دیکھئے!
سنلائٹ کی
صرف آدھی ٹکیہ نے
یہ ساری
دُھلائی کی ہے
یہ صرف زیادہ جھاگ کا کمال ہے!
سنلائٹ
صابن
سفید اور اُجلا دھوتا ہے!
SUNLIGHT SOAP
ہندوستان میں بنا

نواب منجھو صاحب

اَفسانہ

از

جناب شوکت تھانوی

اعلیٰحضرت فلک منزلت ثریا جاہ، عالم پناہ نواب منجھو صاحب بپا سلمن کا
ڈھا ہوا کرتا خود اپنے ہی دستِ مبارک سے دھو کر سوکھنے کے لئے الگنی پر ڈال چکے
تھے۔ اور اب دو پلی ٹوپی پر صابن مل رہے تھے کہ دروازے پر پڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ اٹھا
ر چھوٹی شہزادی صاحبہ اپنے جھوٹے دونوں ہاتھوں سے کھجاتی ہوئی برآمد ہوئیں
ر فرمایا۔

"ابا حضور! امی سرکار فرماتی ہیں کہ راشن والا کہتا ہے، پچھلے دام ادا کرنے گے
راشن ملے گا۔ ورنہ نہیں۔"

نواب صاحب کی پیشانی پر جہاں ستارۂ اقبال چمکا کرتا تھا، ایک شکن پیدا
ہوئی۔ اور آپ کے چہرے پر تمام شاہی جلال یکلخت پھٹ پڑا۔

"دیکھ لیجئے جناب والا! اسے کہتے ہیں موری کی اینٹ کا چوبارے چڑھنا۔
ہماری پر جا ہے جواب یوں منہ آنے لگی ہے۔ اسی قسم کی باتوں پر آپ کے سرِ عزیز کی
قسم جی چاہتا ہے کہ ان گستاخوں کو زن بچہ سمیت کولھو میں پلوا دیا جائے۔ ہائے نہ
ہوئی اپنی حکومت!"

عرض کیا۔ "مگر عالیجاہ! وہ بے چارہ بھی کیا کرے۔ معلوم نہیں کب سے
اس کا حساب نہیں ہوا ہے۔"

نواب صاحب نے تنک کر فرمایا۔

"کون سے سال دو سال ہو گئے ہیں۔ مشکل سے دو ڈھائی مہینے کا حساب
ہو گا۔ مگر ذرا غور تو کیجئے، آپ کے سرِ عزیز کی قسم یہ وہ لوگ ہیں جو اس کی تمنا کیا کرتے
تھے کہ کبھی ہماری نظر ان کی طرف اٹھ جائے۔ جس عمارت میں یہ ٹٹ پونجیہ راشن کی
دکان کھولے بیٹھا ہے دادا جان جنت مکانی کی مردانہ بیٹھک تھی۔ جس میں دن عید
اور رات شبِ برات کا عالم تھا۔ آج بٹیروں کی پالی کا ہنگامہ ہے تو کل تیتر اچھوا کا
مجرا ہو رہا ہے۔ آج مشاعرے کی محفل گرم ہے تو کل انتخابِ زمانہ شطرنج کے
کھلاڑی جمع ہیں۔ اور دادا جان جو مکھی اڑا رہے ہیں۔ رندیہ ہاتھ کا میل، دولت
بہتا پانی۔ یہ جتنے آپ کو آج بڑے ساہوکار نظر آ رہے ہیں، سب ہمارے ہی دسترخوان
پر بھنکا کرتے تھے۔ مگر خدا کی شان کہ اب یہ ہماری بلیاں ہم ہی سے میاؤں کہتی
ہیں۔"

دست بستہ عرض کیا۔

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ عالم پناہ! وہ زمانہ تو گیا۔ بلکہ اسے
خود آپ کے اولوالعزم بزرگوں نے ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا۔ اب محض اس وضعداری
اور اپنی ان روایات کے سہارے تو ذرا مشکل ہی سے زندگی بسر ہو سکے گی۔"

نواب صاحب نے پہلو بدل کر شاہزادی صاحبہ سے فرمایا۔ "جاؤ کہہ دو کہ
ہو جائے گا کچھ انتظام۔ مگر ذرا یہ پوچھنا کہ آج نہ سیچوان آیا اب تک نہ خاصدان، یہ
ماجرا کیا ہے؟"

شاہزادی صاحبہ کے جانے کے بعد نواب صاحب نے اپنی دو پلی ٹوپی
نچوڑ کر مونڈھے پر پھیلا دی۔ اور خود عرق سنبھالتے ہوئے کچھ کبیدہ خاطر سے مسند نشین
ہوتے ہوئے بولے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہونے والا کیا ہے۔ وہ زمانہ آلگا ہے کہ عقل کام نہیں
کرتی۔ محل بکے، حویلیاں نیلام پر چڑھیں۔ تمام گرہستی ختم ہوئی۔ بیگمات کے زیوروں
کے تار تار تک نوبت آئی۔ مگر آخر کب تک؟"

دست بستہ عرض کیا۔ "حضورِ والا! اسی دن کے لئے یہ غلام ہمیشہ عرض
کرتا رہا کہ عالم پناہ اب ایوانِ خسروی سے نکلیں اور کچھ ہاتھ پیر ہلائیں۔ بیٹھے بیٹھے جہاں
تک کھا سکتے تھے کھا چکے۔ یہاں تک کہ اس بیکاری نے دو دو بار خود حضور ہی کے دشمنوں

کو کھانا شروع کر دیا۔"

نواب صاحب نے جل کر کہا۔

"یا مولانا! تم اور بھی جلے پر تیل چھڑکتے ہو۔ آخر میں کیا کام کرنا شروع کر دوں؟ تمہارے ہی کہنے سے یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ حکومت کرنے کے بجائے اب غلامی شروع کر دینگے۔ خود تمہارے ساتھ ہی دو تین دفتروں کی بھی خاک چھانی لیکن ہر جگہ وہی صبح دس کی حاضری اور چار بجے کی چھٹی۔ آدمی نہ ہوا کولھو کا بیل ہو گیا۔ صبح دس بجے دفتر پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اندھیرے منھ زیادہ سے زیادہ نو بجے ضرور بستر چھوڑ دے فرض کر لیجئے کہ میں نے کبھی نیند اُٹھنے کی عادت ڈال لی تو بھی ایک بجے میرے یہاں دستر خوان چُنا جاتا ہے۔ اور اس وقت میں ہوں گا گویا دفتر میں۔"

عرض کیا۔ "نواب صاحب! گستاخی معاف یہ دستر خوان تو اب آپ کو دفتر ہی میں بچھانا پڑے گا۔ تمام دفتری لوگوں کا دوپہر کا کھانا دفتروں ہی میں جاتا ہے اور آدھ گھنٹے کی کھانے کی جو چھٹی ہوتی ہے اُسی میں سب کھا پی لیتے ہیں۔"

نواب صاحب نے اُوپر والی اُنگلی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر فرمایا۔ "اماں غضب ہی تو کرتے ہو۔ اسی آدھ گھنٹے میں کھانا، اسی میں حقہ اور اسی میں گویا قیلولہ۔ پھر یہ کہ میں دوپہر کو بھی دو گھڑی سونے کا عادی ہوں۔"

عرض کیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ملازمت کرنے کو تو تیار ہیں لیکن ملازمت ایسی چاہتے ہیں کہ جب حضور دوپہر کے کھانے کے لئے دستر خوان پر تشریف لائیں تو حکام بالا جوتیر برداری کریں۔ اور جب حضور خاصہ نوش فرما چکیں تو وہ خاصدان برداری شروع کر دیں۔ اور جب عالیجاہ آرام فرمانے کے لئے لیٹیں تو وہ مُکی اور چپی شروع کر دیں۔"

نواب صاحب نے اُلجھ کر کہا۔ "بھئی یہ میں کب کہہ رہا ہوں میرا مدعا تو یہ ہے کہ میری عادات کچھ اسی قسم کی ہیں۔"

اُسی وقت ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر علیا حضرت شاہزادی صاحبہ پھر جھونٹے کھسوٹتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ "ابا حضور! امی سرکار فرماتی ہیں کہ نہ پان ہے کل سے نہ کتھا!"

نواب صاحب نے بیزاری سے فرمایا۔ "اچھا بھائی نہ سہی۔ دفع ہو یہاں سے!"

اور پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آ جائے جلدی سے اپنے دونوں کان ٹٹول کر ایک ادھ جلی بیڑی ایک کان سے برآمد کر ہی لی۔

مجھے نواب صاحب کی اِن باتوں پر اب بالکل ترس نہ آتا تھا۔ ترس آنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ شروع شروع میں میرا دل بھی مسلکتا تھا اُن کے لئے کہ خدا تو کسی کو اچھے دن ہی نہ دکھلائے یا پھر یہ بُرے دن نہ دکھلائے۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے اُن کی مدد بھی کی۔ اُن کے قرض کے ہر مطالبے کی میں نے تعمیل کی اور یہ سمجھ کر تعمیل کی کہ یہ قرض نہیں ہے۔ بغیر اُن کے مانگے بھی جو کچھ میرے امکان میں ہوا پیش کرتا رہا۔ مگر جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ در اصل میں دوستی کے پردے میں یہ دشمنی کر رہا ہوں، اُس وقت سے میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ابھی پچھلے ہی دنوں نواب صاحب کا ایک پرچہ میرے پاس آیا کہ پچاس روپے کی شدید ضرورت ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر میرا روپیہ آنے والا ہے۔ فوراً ادا کر دوں گا۔ ہر چند کہ مجھ کو معلوم تھا کہ روپیہ آنے والا بھلا کہاں سے ہوتا۔ میں نے پچاس روپے حاضر کر دیئے۔ لیکن تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ جب اُسی دن نواب صاحب نے خود آواز دے کر مجھے بُلایا۔ اور جب میں پہنچ گیا تو چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں ترتیب دیتے ہوئے بڑی غمازِ مسکراہٹ سے فرمایا۔

"چلئے آج آپ کو گانا سنواؤں۔"

میں سمجھا کہ ہوگا کہیں گانا وانا۔ اس لئے معذرت خواہ ہو کر عرض کیا۔ "معاف کیجئے گا، میں بغیر براہِ راست دعوت کے کہیں جانے کا قائل نہیں ہوں۔"

نواب صاحب نے بُرا مان کر کہا۔ "اور براہِ راست دعوت کسے کہتے ہیں۔ دعوت دے تو رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بی چھمی جان نے اب واقعی ناک میں دم کر دیا ہے۔ مہینوں سے بُلا رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں اُن سے یاد اللہ رہ چکی ہے۔ اب وہ سمجھتی ہیں کہ میں بے وفا نکل گیا۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ع

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں؟

کل اُن کا بہت ہی طنز آمیز خط آیا ہے کہ اب تم میرے جنازے ہی پر آؤ گے! اس لئے آج جانا ہی پڑا۔ مگر روح تازہ ہو جائے گی آپ کی اُس کا گانا سن کر۔ کیا گلا پایا ہے اور کیا طبیعت داری ہے اور ٹھمری میں تو وہ کمال حاصل ہے




Rexona
اب... ریکسونا
پہلے سے کہیں زیادہ خوشبودار ہے

کہ "بن پانی چلا جلائے رے بجرا" کی نرت ایک مرتبہ اس نیک بخت نے رات کو دس بجے سے جو شروع کی تو صبح کے چار بجا دیئے۔ مصوری کرتی ہے بخدا! بہرحال اب آپ دیکھ ہی لیجئے گا۔"

جی تو نہ چاہتا تھا اس لغویت میں مبتلا ہونے کو لیکن چھمی جان سے زیادہ خود حضور نواب صاحب کی نرت دیکھنے کا اشتیاق تھا کہ یہ لنگوٹی میں پھاگ کیسے کھیلتے ہیں۔ اس لئے میں تیار ہو گیا۔ مجھے تو خیر تیار ہونا ہی کیا تھا تیار تو نواب صاحب ہو رہے تھے۔ اور دراصل یہ تیاریاں صبح سے جاری تھیں۔ پہلے جوتے کی مرمت کرا کے اس پر پالش کرائی۔ پھر انگرکھا نکال کر دھویا۔ اس میں کلپ دیا۔ اور جب وہ سوکھ گیا تو اس کی آستینیں چُنی گئیں سلوٹیں برابر کی گئیں۔ کرتے کی آستینیں بھی پاندان کے ڈھکنے سے گاؤ تکیئے پر چُنی گئیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگا چنبیلی کے تیل سے پٹیاں چکنائی گئیں نہ جانے کب کا چکٹا ہوا عطر ملا گیا۔ اور اب چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب فرما کر وہ مرمت شدہ جوتا پہنا گیا۔ اتنے میں علیا حضرت شاہزادی صاحبہ محلسرا سے پان بنوا کے لے آئیں۔ یکشت تین چار گلوریاں گلے میں دبائی گئیں۔ تاکہ سچ مچ کا نوابی کلّہ پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد دیر تک آئینے سے مشورہ کر کے دوپلی ٹوپی کا زاویہ قائم کیا گیا۔ مختصر یہ کہ غارت گری کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر آپ تشریف لے چلے۔ اور اب جو چھمی جان کے بالاخانے پر پہنچے ہیں تو شان ہی کچھ اور تھی۔ اُدھر سے بے وفائی کے طعنے، اِدھر سے مصروفیت کے ایسے ایسے عذر کہ میں چوندھیا کر رہ گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ گواہی میری پیش ہو رہی تھی۔ مثلاً کہنے لگے۔

"تمہاری قسم چھمی جان سر کھجانے کی مہلت نہیں ملتی۔ ریاست کے جھگڑے بکھیڑے تو تھے ہی اس پر طرّہ یہ کہ ان حضرت کے ایسے کرم فرماؤں نے الکشن میں کھڑا کر دیا ہے۔ دوٹروں کی فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔ مختلف محلّوں میں جلسے ہو رہے ہیں۔ ابھی یہاں ہوں تو ابھی وہاں۔ اِس وقت بھی ایک جلسے میں جاتا تھا۔ مگر تمہارا یہ خط دیکھ کر میں نے کہا کہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے گی مگر آج حاضری ضرور دوں گا۔ ارے بھئی یہ بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو کہ مقابلہ کس قدر سخت ہے۔"

چھمی جان نے کہا۔

"بھاڑ میں جائے ایسا الیکشن مُوا۔ کہ آدمی کو تن بدن کا ہوش نہ رہے۔ ذرا اپنی صحت تو دیکھیے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔"

نواب صاحب نے بات ٹالنے کو کہا۔

"خیر چھوڑو اِس ذکر کو۔ ذرا دل بہلانے کا سامان کرو میرے یہ دوست بھی گانے کے رسیا ہیں۔ بس وہ کمال دکھاؤ کہ یہ بھی قائل ہو کر جائیں یہاں سے۔"

اِس اشارے کی دیر تھی۔ سازندے جو اُونگھ چکے تھے چونک اُٹھے۔ سارنگی ریں ریں کرنے لگی۔ طبلے پر طبلچی کے ہاتھ اُچھلنے لگے۔ اور چھمی جان نے بڑے نخروں کے بعد اب جو آواز نکالی ہے تو اندازہ ہوا کہ آج گانے کا غالباً پہلا اتفاق ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی آواز چورن بیچنے کے لئے جتنی مناسب ہو سکتی ہے اُتنی ہی گانے کے لئے نامناسب ہے۔ مگر ہمارے نواب صاحب نے، خدا انھیں غارت کرے نوٹ پر نوٹ دینا شروع کئے۔ اگر میرا حساب درست ہے تو نواب صاحب نے چالیس روپے کے لگ بھگ اُس بیہودہ گانے پر اُس نامعقول گانے والی کو دے دیئے۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ دس روپے کے لگ بھگ یہاں آنے کی تیاری میں نواب صاحب نے صرف کئے ہوں گے۔

قصہ مختصر یہ کہ جب یہ جھک مار کر نواب صاحب رات کو واپس تشریف لائے تو گھر پہنچ کر انھیں مجھ ہی سے کہنا پڑا کہ۔

"تانگے والے کو کرایہ دے دیجئے۔ میں تو سب کچھ صرف کر آیا۔ مگر شکر ہے کہ بات بنی رہی۔ چھمی جان کی نظروں میں ذلیل نہیں ہوا۔"

اب آپ ہی بتلائیے کہ اس تجربے کے بعد مجھے نواب صاحب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں اُن کی یہ حالت دیکھتا رہتا ہوں اور اِس طرح کی ہر حالت کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ رہ گیا محلسرا اور رہ گئی حرم کی حالتِ زار، اُس کی اصلاح کی میرے نزدیک تو صرف ایک صورت ہے کہ نواب صاحب تبدیل آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں کے واسطے جیل چلے جائیں۔ مگر قید با مشقت ہونی چاہیئے!

جواب طلب اُمور کیلئے ہمیشہ جوابی کارڈ یا اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی کارڈ اور لفافے ہندوستان میں کارآمد نہیں ہیں اس لئے پاکستانی بھائی اِس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

مقدر

از

جناب مخمور سعیدی

مژدہ اے دل کہ وہ سلمائے بہار آتی ہے
اپنی نظروں میں لئے قلبِ قرار آتی ہے

باغِ گجرات سے سوئے چمنِ ٹونک پھر اب
وہ جمالِ رخِ گیتی کا نکھار آتی ہے

چھوڑ کر ساحلِ بمبئی کے سکوں زاروں کو
ارضِ پاتاس پہ وہ موجِ قرار آتی ہے

رخصت اے شامِ خزاں سوئے گلستانِ وطن
مسکراتی ہوئی وہ صبحِ بہار آتی ہے

اس کے قدموں کی نچھاور کو شمیمِ فردوس
اپنے دامن میں لئے پھولوں کے ہار آتی ہے

سرسراتی ہوئی ہر نخل کی شاخوں میں صبا
اپنے ہمراہ لئے چنگ و ستار آتی ہے

اس نے آتے ہوئے زلفوں کو سنوارا تو نہیں؟
دامنِ شب سے بوئے مشکِ تتار آتی ہے

کہکشاں فرشِ رہِ ناز ہوئی جاتی ہے
پھول برساتی ہوئی بادِ بہار آتی ہے

چودھویں رات کے مہتاب کی ایک ایک کرن
سجدے کرنے کو سوئے راہ گزار آتی ہے

ایک عظمت سی فضاؤں پہ ہے طاری ہر سمت
کعبہ و دیر و کلیسا کا وقار آتی ہے

آج راس آ ہی گئی گردشِ ایام مجھے
حاصلِ بے کسیِ لیل و نہار آتی ہے

آج وہ چارہ گرِ دردِ جدائی اے دل
صدمۂ ہجر سے خود سینہ فگار آتی ہے

لاکھ شکووں کی مجھے جس سے تھی حسرت اب تک
اب وہ خود ہی بہ لبِ شکوہ گزار آتی ہے

جس نے اک حشر مرے دل میں اٹھایا تھا کبھی
پھر وہی فتنہ گر و شعبدہ کار آتی ہے

جس نے لوٹی تھی کبھی ہوش و خرد کی دنیا
پھر وہ غارت گرِ تمکین و وقار آتی ہے

خرمنِ عقل پہ کوندی تھی جو بجلی بن کر
پھر وہی با نگہِ صاعقہ بار آتی ہے

حوصلے جس نے دلِ زار کو بخشے تھے کبھی
پھر وہی تاب و توانِ دلِ زار آتی ہے

بن کے جو روحِ سکوں مجھ میں سمائی تھی کبھی
پھر وہی پیکرِ تسکین و قرار آتی ہے

جو اجالا تھی کبھی میرے سیہ خانے کا
پھر وہی برق وش و شعلہ عذار آتی ہے

میری راتیں تھیں کبھی حسن سے جس کے روشن
پھر وہی ماہ جبینِ شبِ تار آتی ہے

میرے انفاس میں جو مہکی ہوئی ہے اب تک
پھر وہ گل پیکر و نکہت بکنار آتی ہے

رونقِ بزمِ تصور ہیں بہاریں جس کی
پھر وہ فردوسِ نظر خلد کنار آتی ہے

قلبِ مایوس میں یہ رنگِ نمودِ امید
جیسے تاراجِ گلستاں میں بہار آتی ہے

خلوتِ روح میں گلبانگِ مسرت کی یہ گونج
جیسے ویرانے میں آوازِ ستار آتی ہے

میں ہوں مخمور اور اب سحر نگاری میری
مدعائے قلمِ سحر نگار آتی ہے

مخمور سعیدی


آئینہ حسن
AFGHAN SNOW
افغان
اسنو
مشرقی دنیا
کا بہترین کریم
پاٹن والا
خوبصورتی اور سنگھار کیلئے
خوشبودار۔ تازہ افغان اسنو چہرے کی
تازگی اور خوب صورتی کا آسان طریقہ
جو جلد کو دن بھر نرم اور ملائم
رکھتا ہے

ملک ملک، دیس دیس، شہر شہر بھیجا جاتا ہے۔ ہم شہروں میں بیٹھ کر ہوٹلوں، کافی ہاؤسوں، ریسٹورانٹوں اِس گیہوں کی رنگ برنگی چیزوں کو کھاتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اُس کے تعمیر ہوں، گرمی کی شدت، محنت، پسینے کا ایک انبار اِس گیہوں کے ایک ایک دانے میں یہاں سے۔"

رانی خاموشی کے ساتھ اُٹھی اور اُس نے ایک خشک جگہ پر اپنی وہ میلی دھوتی دوہری کر کے بچھا دی جسے وہ دھونے لائی تھی۔

خالد نے پوچھا ــــ

"یہ کیوں؟"

رانی خاموش رہی۔ شوخ و شنگ لڑکی نے جواب دیا ــــ

"آپ کے بیٹھنے کے لئے۔"

"میں اِس جگہ پر بیٹھ سکتا تھا۔ اِس کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ اُجلے کپڑے پھر اتنے اُجلے نہ رہتے۔"

خالد بیٹھ گیا۔ لیکن بیٹھتے وقت اُس نے رانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ــــ

"تمہارا شکریہ!"

رانی مسکرا دی۔ چہرے کے کنول کھل اُٹھے۔ گلاب ایسے عارضوں پر رنگِ حیا دوڑا۔ مجبوب آنکھیں اور جھک گئیں۔ رگوں میں دوڑتا ہوا جوان لہو اور رواں ہو گیا۔ خالد نے رانی سے پوچھا ــــ

"کیا نام ہے تمہارا؟"

رانی اور سمٹ گئی۔ لیکن اُسی لڑکی نے جواب دیا ــــ

"رانی۔"

"میں تم سے نہیں، اِن سے پوچھ رہا ہوں۔"

"یہ گونگی ہے۔"

"آئیں۔ گونگی ہے؟"

شرمائی ہوئی رانی اب ضبط نہ کر سکی۔ اور وہ بے تاب ہو کر بول اُٹھی۔

"جھوٹ مت بول۔"

جوان لڑکیوں کے قہقہوں سے پنگھٹ کی فضا ہنس پڑی۔ خالد نے کہا۔

"خیر تم بولیں تو۔"

ہر دوسرے تیسرے دن دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ــــ اجنبیت کم ہوتی گئی۔ راہ کے پتھر ہٹتے گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے ــــ یہ چھپا نہ ملاقاتیں اب ویرانوں کو تلاش کرنے لگیں۔ جھیل کا کنارا۔ آموں کے باغ، بانس کا جھنڈ۔ میاں کا پوکھرا۔ پہلے نگاہیں لڑی تھیں، پھر دل سے دل ٹکرایا۔ دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہونے لگیں۔ رانی کا حُسنِ سادہ اپنی تمام دلکشی سمیت خالد کا ہو گیا۔ پیار کی باتیں، محبت کا طوفان۔ وعدے پیمان، اب اِن دونوں کی زندگی یہی تھی اور ایک رات ــــ تاریک رات ــــ میاں کی حویلی میں رانی آہی گئی۔ گرمیوں کی اُس رات میں ہوا سبک خرام تھی۔ گاؤں سو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے بالیوں سے درختوں سے، پودوں سے کھیل رہے تھے۔ دبے قدموں، کنارے کنارے، دُنیا کی نگاہوں سے بچتی ہوئی، انجام سے بے خبر رانی بڑے پھاٹک سے ہوتی ہوئی دیوان خانے کے مغربی نیچے کوٹھے کے اُس کشادہ کمرے میں پہنچ گئی جہاں خالد محوِ انتظار تھا۔ لیمپ کی روشنی میں دونوں کے چہرے دلی جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔ آہستہ خرام ہوا چلتی رہی۔ رات گزرتی رہی دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوتی رہیں۔ صبح کا جھٹپٹا ہونے کو آیا تو رانی کمرے سے نکلی۔ بکھرے بکھرے بال، لڑکھڑاتی چال، جب وہ میاں کی حویلی سے نکل کر دبے قدموں شیخ پورہ کی گلی کے قریب پہنچی تو رامو نے دیکھا، نصیبن نے دیکھا، اللہ یار نے دیکھا۔ اور سب نے بیک وقت یہی سوچا ــــ یہ کہاں سے آرہی ہے اور کون ہے؟ سمت نے بڑھ کر یہ بتا دیا کہ میاں کی حویلی سے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اِس خیال کی پختگی میں کوئی شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ رانی ہے خون کھولا۔ آنکھیں غضبناک ہوئیں بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکیں لیکن لبوں پر سکوت کا پہرہ تھا۔ اور دل پر بڑے سرکار کے قہر و غضب کا خطرہ۔ زمیندار سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ پلک جھپکتے ہی گھر نذرِ آتش ہو جاتے۔ بیدخلی ہوتی۔ قُرقی آتی کس کی ہمت تھی جو ایک لفظ بھی زبان پر لا سکتا خوف کے تالے زبان پر تھے۔ رانی گھر پہنچ گئی۔ وہ یُوں ہی آتی رہی۔ دبے قدموں، بدن چُرائے اور پھر صبح سے پہلے ہی چلی جاتی۔ لوگ دیکھتے رہے۔ خاموشی کے ساتھ۔

دن گزرتے رہے۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں۔ وہ آخری رات تھی جب خالد اور رانی میاں کی حویلی میں نہیں، جھیل کے کنارے جدا ہونے کو ملے۔ رانی کی آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔ بھرے ہوئے پیمانے چھلک رہے تھے۔ چہرے پر [illegible]

محبّت کے مُسافِر

افسانہ

از

جناب ذکی انور

تاتارپور، بھاگل پور ۲ ——— ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء

برادر گرامی قدر، تسلیمات!

آپ کو میرا افسانہ جھوٹ نہیں ملا، حیرت ہے، میں نے خود پوسٹ کیا تھا۔ لیکن حیرت بھی کیوں ہو۔ ایک آزاد مملکت کا ہر فرد آزاد ہوتا ہے چاہے وہ عام آدمی ہو یا کسی اہم ادارے کا رکن۔ اگر ڈاک کہیں وقت پر پہنچے نہ پہنچے یا سرے سے غائب ہی ہو جائے تو باز پرس نہ کرنی چاہئے۔

آج ایک اور افسانہ محبت کے مسافر ارسال خدمت ہے۔ افسانے کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ عنوان کے بارے میں عرض ہے کہ مجھے کچھ زیادہ نہیں جچ رہا۔ حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ آج عموماً "عشق" کا ماحول ایک مذبح ہی ہوتا ہے۔ کبھی عاشق ذبح ہو جاتا ہے، کبھی معشوق اور کبھی صرف "عشق" ہی پر چھری پھر کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یوں نہ کوئی ذبح ہوتا ہے اور وہ بھی غالباً نہ چھوڑے۔ آپ چاہیں تو عنوان بدل دیں۔

اس افسانے میں آپ ایک نئی تکنیک پائیں گے۔ اگر آپ نے پسند فرمالیا تو پھر میں سمجھوں گا کہ میری کوشش رائگاں نہ گئی۔ اپنے بارے میں کیا عرض کروں، لکھنا پڑھنا مدت تک بند رہا اور اس وقفے کے بعد "جھوٹ" میں نے پہلا افسانہ لکھا تھا جو آپ کی نذر کیا تھا۔ میں جس محکمے میں ملازم ہوں، بہت ہی عجیب محکمہ ہے۔ یہاں اس بات کا اندازہ کبھی نہیں لگایا جاتا کہ ایک آدمی زیادہ سے زیادہ روزانہ کتنے گھنٹے کام کر سکتا ہے۔ اور اس وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ کتنا کام کر سکتا ہے؟ چھٹیاں یا اتوار میں AVAIL نہیں کرتا۔ صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ نو بجے تک کام کرتا ہوں، پھر بھی PENDING WORKS کی فائل کافی تنومند رہتی ہے۔ اور اس ماحول اور ان حالات میں لکھ لینا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ مشکل کام میں کروں گا کیونکہ دو ڈھائی سال لکھنے پڑھنے سے الگ تھلگ رہ کر میں اب بہت اکتا گیا ہوں۔ ذہنی طور پر کافی بے مایہ بھی ہو گیا ہوں۔

ڈاکٹر گرامی صاحب سلمہٗ کے بارے میں یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ انشاء اللہ صحیح معنوں میں ڈاکٹر بنا رہے ہیں۔ ان سے میرا سلام ضرور کہئے۔ بھوٹی اور گڈی کو دعائیں! خدا کرے آپ سب بخیر ہوں۔

آپ کا بھائی

ذکی انور

فرسٹ کلاس کے اُس کمپارٹمنٹ میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھے مرد کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بوڑھا مرد کوئی مارواڑی سیٹھ تھا جو اوپر کی ایک برتھ پر پڑا سو رہا تھا اور حد سے زیادہ تکلیف دہ انداز میں خرّاٹے لے رہا تھا، اُس کے خرّاٹے کی آواز، ذبح کرتے وقت بکرے کی آہ و بکا کی آواز سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ اُس کے خرّاٹوں سے تنگ آکر لڑکی کبھی کبھی بہت خشمگیں نظروں سے اوپر اُس برتھ کی طرف دیکھتی لیکن خاموش رہ جاتی۔ وہ اُسے جگا بھی

کہہ سکتی تھی کیسی بھی انداز میں خراٹے لینے کی آزادی تو ہر شہری کو ہے اور پھر اُس لڑکی نے تو بڈھے کے آدھے کمپارٹمنٹ میں پھیلے ہوئے سامان کی نگرانی کا بھی وعدہ کر لیا تھا۔ جو نے سے پہلے بڈھے نے اُسے بتایا تھا کہ وہ مسلسل تین راتوں سے قرض دیئے ہوئے روپوں کے سُود کے حساب کرنے کیلئے جاگتا رہا تھا۔ دیوالی چڑھ آئی تھی اور اُسے سُود کا حساب ختم کرنے کے بعد اپنے کسی عزیز کی شادی میں جانا تھا۔ سو وہ جا رہا تھا۔ پھر اُس نے لڑکی سے بہت سماجت سے کہا تھا کہ وہ اُس کے سامان پر نظر رکھے۔ لڑکی نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اُس کے سامان کی نگرانی کرے گی، اور تب بوڑھے نے کمپارٹمنٹ کو اندر کر بند کیا تھا پھر اوپر کی ایک برتھ پر جا کر بکرے ذبح کرنے لگا تھا! وہ جوان لڑکی تھی۔ شاعری کرنے کو تو بہت کچھ کی جا سکتی ہے ——— لیکن جہاں تک صورت شکل کا تعلق ہے وہ کچھ زیادہ حسین تو نہ تھی مگر اُس نے بہت زیادہ حسین بننے کی کوشش کی تھی۔ اور اُسے بدصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ نیچے کی ایک برتھ پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی جب پڑھتے پڑھتے اُس کا ذہن اوپر کی برتھ پر سوئے ہوئے مارواڑی بڈھے کے خراٹوں کی طرف چلا جاتا تو وہ خراٹوں کے بارے میں سوچنے لگتی۔ اُسے اپنی نانی کے خراٹے یاد آتے جو ایسے لگتے تھے جیسے ٹرین اسٹیشن چھوڑ رہی ہو۔ پھر اُسے اپنے ہاں کے ایک بوڑھے ملازم کے خراٹے یاد آتے جو ویسے تو کوئی خاص نہیں تھے لیکن کبھی کبھی جیسے اُس کی ناک سے بہت سے بچے ہوئے خراٹے گڈمڈ ہو کر نکل پڑتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ گراموفون پر ریکارڈ بج رہا ہے اور اچانک اسپرنگ ٹوٹ گئی ہو ——— لیکن اُس لڑکی کی آنکھیں اسی طرح پڑھتی ہی جاتیں اور اس طرح جب وہ کئی صفحے پڑھ لیتی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تو اُس کا ذہن اوپر کی برتھ پر ذبح ہوتے ہوئے بکروں کی طرف منتقل ہو جاتا اور وہ بہت خشمگیں نظروں سے اوپر کی اُس برتھ کی طرف دیکھتی اور دانت پیس کر رہ جاتی۔ لیکن اُس وقت وہ کسی قدر زیادہ خوب صورت نظر آنے لگتی۔ جس کا پتہ اُسے نہیں تھا ورنہ جب اُس نے حسین ترین بننے کی بہت سی کوششیں کی تھیں تو ایک یہ بھی ضرور کرتی کہ ہر وقت اپنی نظریں خشمگیں بنائے رکھتی اور دانت پیستی رہتی!

ایک چھوٹے سے اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی تو اُس کمپارٹمنٹ میں ایک ٹکٹ چیکر بھی سوار ہو گیا۔ لڑکی اُٹھ بیٹھی لیکن اُس کی نظریں ٹکٹ چیکر کی طرف ایک سکنڈ کے لئے اُٹھنے کے بعد پھر کتاب پر آ جمیں۔ اور اسی طرح کتاب پر نظریں جمائے جمائے لڑکی نے پاس پڑے پرس سے ٹکٹ نکالا اور ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھا دیا۔

ٹکٹ ہاتھ میں لے کر وہ مسکرایا، پھر بہت سنجیدگی سے اُس نے پوچھا

"میڈم اِس کمپارٹمنٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیوں؟" لڑکی نے بہت حیرت سے پوچھا لیکن اُس کی نظریں اُسی طرح کتاب پر جمی رہیں۔ "کیا اب کے مسافروں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کمپارٹمنٹ کے بارے میں اپنی رائے دیں!"

"جی نہیں"۔ وہ بولا۔ "میں صرف یہی پوچھ رہا تھا کہ کیسا کمپارٹمنٹ ہے؟"

"اچھا خاصہ ہے" لڑکی بولی۔ "مگر وہ اُوپر والے سیٹھ کے خراٹے..."

اب کے اُس کی نظریں سیٹھ والی برتھ کی طرف اُٹھیں تو پھر واپس کتاب پر نہیں آئیں بلکہ ٹکٹ چیکر کی نظروں سے جا ٹکرائیں جو مسکرا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

"خراٹے تو اُس شخص کے اپنے ہیں اور خراٹوں کے بارے میں نہ تو ریلوے کا کوئی قانون ہے اور نہ ملک کی قانون ساز اسمبلی نے اس سلسلے میں کبھی غور کیا ہے، میں صرف کمپارٹمنٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"اچھا خاصہ تو ہے" لڑکی نے کہا۔ "کافی آرام دہ!"

"جی میڈم!" وہ بولا۔ "میرا اپنا خیال ہے کہ اس قسم کا تھرڈ کلاس کا کمپارٹمنٹ کسی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ملک میں بھی نہ ہوگا!"

"جی؟" لڑکی چونک اُٹھی۔ "تو یہ تھرڈ کلاس ہے، میں نے تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ منگوایا تھا۔ مجھے ڈبہ بدلنا ہوگا۔"

"جب آرام ہے ہی تو بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟" ٹکٹ چیکر پھر مسکرایا۔ "اور فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ اِس سے کچھ زیادہ اچھا تو ہوگا بھی نہیں!"

"کیا کیا بکتے ہیں صاحب!" لڑکی بوکھلائی۔ "کیا آپ مجھے پریشان تو نہیں کر رہے خواہ مخواہ؟"

"توبہ کیجئے"۔ وہ اب کے ہنسا۔ "میری کیا مجال کہ کسی فرسٹ کلاس کے مسافر کے ساتھ خواہ مخواہ بکواس کروں۔"

"تو پھر کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" لڑکی کے لہجے میں فرسٹ کلاس کا مسافر ہونے کا غرور نمایاں تھا۔ "عجیب تماشہ ہے۔ کیا بکواس ہے!"

"میڈم" ٹکٹ چیکر نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "نہ تماشہ ہے نہ بکواس صرف اتنا عرض ہے کہ یہ فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ ہے..."

"جب تو آپ مجھے اتنی دیر سے پریشان کر رہے تھے؟" لڑکی اُس کی بات کاٹ کر

"میں اگلے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر سے آپ کی شکایت کروں گی، جب یہ فرسٹ کلاس [کمپا]رٹمنٹ ہے ہی تو پھر آپ ......"

"آپ نے خاکسار کی پوری بات سنی کہاں" ٹکٹ چیکر نے کہا "میں یہ عرض کر رہا [تھا کہ] یہ کمپارٹمنٹ فرسٹ کلاس کا ہے لیکن حضور مسافر ہیں تھرڈ کلاس کی!"

"جی؟ ــــ" لڑکی چیخی

اور ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــــ "نو روپے بارہ [آ]نے ــــ!"

لڑکی نے دیکھا ٹکٹ سچ مچ تھرڈ کلاس کا تھا۔ وہ اپنے پرس سے نو روپے گیارہ [آ]نے نکالنا چاہ رہی تھی لیکن اُس کے ہاتھ پاؤں کچھ اس طرح سُن ہوئے جا رہے تھے جیسے اُس کا دم نکل جائے گا۔ جیسے اچانک اُس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ اُسے اس بات کا افسوس قطعی نہ تھا کہ اُسے نو روپے بارہ آنے دینے پڑ رہے ہیں۔ اُس کا دل تو یہ سوچ کر دھک دھک کر رہا تھا کہ اُس کے محبوب نے اُس کے ساتھ فریب کیا تھا۔ اُسے اگر پیسوں کی ضرورت تھی تو اُس سے مانگ لینا چاہئے تھا۔ اُس نے ایسا فریب کیوں کیا جس نے اسے خواہ مخواہ ذلیل کیا۔ [illegible] ہوئی کہ کمپارٹمنٹ میں اُس کے اور ٹکٹ چیکر کے علاوہ صرف وہ بڈھا تھا جو اوپر کے برتھ [پر بی]ٹھے ذبح کر رہا تھا ورنہ خفت سے اُس کی کیا حالت ہو جاتی۔ اُس کی ٹیپ ٹاپ کو ذبح ہوتے کوئی اور دیکھتا تو کیا کہتا اور کیا سوچتا۔ ٹکٹ چیکر بھی شریف آدمی تھا جس نے اُسے کچھ زیادہ ذلیل نہیں کیا۔ لیکن اُس کے محبوب نے ایسا کیوں کیا؟ یہ بات تو درست تھی کہ اُسے آجکل پیسوں کی سخت تکلیف تھی۔ لیکن وہ تو ایک اعلیٰ کردار کا آدمی نظر آتا تھا اُس نے ایسا کیوں کیا؟

کیوں ــــ کیوں؟

"کیوں میڈم آپ کو میری باتیں کچھ بری تو نہیں لگیں؟" ٹکٹ چیکر نے پوچھا اور سامنے کی برتھ پر بیٹھ کر ٹکٹ بنانے لگا، اور ٹکٹ بنانے کے لئے جب اُسے تھرڈ کلاس کے اُس ٹکٹ کی ضرورت ہوئی جو لڑکی کے ہاتھ میں پڑا کانپ رہا تھا تو اُس نے اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھا دیا اور جب لڑکی ٹکٹ واپس دینے لگی تو اُس نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اُس کی ناک پر پسینے کے ایسے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے جیسے ستاروں کی قاشیں کسی باریک کپڑے میں لپیٹ کر آہستگی کے ساتھ دبائی جائیں۔ ٹکٹ چیکر نے کہا۔

"کیا آپ کے پاس اتنے پیسے نہیں؟ میں بخوشی آپ کے ساتھ اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ اگلے اسٹیشن پر آپ کو کسی تھرڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں جگہ دلوا دوں۔"

"شکریہ!" لڑکی کچھ عجب کھسیانے انداز میں مسکرائی "پیسے میں دے رہی ہوں، آپ ٹکٹ بنائیے۔"

لڑکی نے اپنے پرس کے اندر ہاتھ ڈال کر منی پرس نکالا اور اُس میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھا دیا۔

ٹکٹ چیکر نے اپنی جیب سے چار آنے نکال کر لڑکی کو دیئے۔ پھر اُس نے پرانا ٹکٹ اور نیا بنایا ہوا ٹکٹ لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے چہرے کے نقوش اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ دیدہ و دانستہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ رکھ کر فرسٹ کلاس میں سفر نہیں کر رہی تھیں بلکہ شاید آپ کے ملازم سے بھول ہوئی یا آپ نے کسی غیر کو ٹکٹ لانے کو کہا ہوگا اور اُس نے پیسے مار لئے۔"

"نہ وہ ملازم تھا نہ غیر بلکہ ......" لڑکی جیسے بے ہوشی میں کہنے لگی تھی۔ لیکن فوراً ہی اُسے ہوش آگیا اور وہ کسی قدر خفیف ہو کر چپ ہو گئی۔

ٹکٹ چیکر مسکراتا ہوا سامنے اوپر کی برتھ کی طرف بڑھا جہاں بکرے ذبح ہو رہے تھے۔ اُس نے بڈھے کو جگایا، بکرا ایک بار زور سے گرج کر خاموش ہو گیا۔ بڈھا اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنی فتوحی کی جیب سے ٹکٹ نکال کر دکھایا۔ چیکر نے اُسے چیک کیا، جب تک گاڑی کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی اور پھر اسٹیشن پر وہ اُتر گیا۔

لڑکی اُسی طرح کتاب پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ لیکن اب وہ بیٹھی ہوئی تھی اور خراٹوں کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی، اپنے محبوب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جس سے اُسے بے پناہ محبت تھی اور جو ہر وقت اس پر مر مٹنے کو تیار تھا۔ ایک بار تو بے شک اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اُسے ایک غنڈے سے بچایا تھا۔ دراصل جب ہی تو اُن کی محبت کی دیوار [illegible] کافی مضبوط پشتے لگ گئے تھے، اُس سے پہلے تو بس ویسی ہی روز مرہ کی سی محبت تھی جیسی ایک جذباتی لڑکی کو ایک خوبصورت طالب علم سے ہو سکتی ہو، جو اُس لڑکی کے مکان کے ایک باہر کے کمرے میں رہ رہا ہو۔ لیکن جان پر کھیل کر غنڈے سے بچانے کے واقعے کے بعد سے وہ محبت نہ صرف مستحکم ہی ہو گئی تھی بلکہ اُس محبت کی ایک افادی حیثیت بھی قائم ہو گئی تھی۔ ہیرو صاحب کو صبح کے ناشتے اور چائے سے تقریباً پچاس فی صدی حد تک بے فکر ہو جانا پڑا۔ اور کمرے کا کرایہ معاف ہو گیا تھا۔ اور ہیروئن صاحبہ کا خیال تھا کہ اُن کے پہلے کے گانے سے اب کے گانے بہت مختلف ہونے لگے تھے، اُن کے گلے میں بلا کا سوز اور رس دونوں بیک وقت سمو گئے تھے اور اُن کے اندر کافی پھرتی اور چستی آگئی تھی۔

"میں تم پر جان دیتی ہوں"۔ لڑکی نے ٹکٹوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا لیکن یہ تم نے کیا کیا ڈارلنگ، وہ سوچنے لگی شاید اُس نے بلند کردار نے اُسے اتنا نیچے گرا دیا اُسے پیسوں کی بے شک بڑی ضرورت تھی لیکن وہ بلا کا خوددار تھا اور اپنی خودداری کو برقرار رکھنے کے لئے ہی اُس نے اپنی اِس ضرورت اور تکلیف کو کبھی ظاہر ہونے نہ دیا۔ ورنہ وہ اُس کی کافی مدد کر سکتی تھی۔ بغیر اُس کے کچھ کہے اُس نے اپنی ماں سے سفارش کر کے اُس کے کمرے کا کرایہ معاف کرا دیا تھا۔۔ لیکن اب ـــــ اب تو وہ اپنی ماسی کے ہاں سے آتے ہی اُسے کمرے سے نکلوا دے گی ـــــ کمینہ ذلیل، بے آدمی! وہ اُس کی صورت بھی نہ دیکھے گی ـــــ اور ماسی جب ہمیشہ کی طرح اُس کا اچھا سا بر ڈھونڈنے کی بات کرے گی تو وہ ہمیشہ کی طرح احتجاج نہ کرے گی بلکہ نظریں نیچی کر کے پرے ہٹ جائے گی، جس کا مطلب ماسی سمجھ جائے گی ـــــ اب اُس ذلیل لڑکے سے بیاہ کرنے کی بات سوچنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی تھی ـــــ کمینہ ذلیل، پنچ آدمی!

ساری راہ وہ اپنے محبوب کے بارے میں سوچتی رہی؛ محبت کے قول و قرار اور دوسری لغویات کے بارے میں سوچتی رہی کہ دنیا کتنی فریبی ہے! اور جوں جوں وہ یہ سب کچھ سوچتی جاتی اُس کے دل میں اپنے محبوب کے خلاف نفرت کا جذبہ اور شدید ہوتا چلا۔ اتنا شدید کہ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچنے لگتی کہ اگر اُس کے بس میں ہوتا تو وہ اُسے ذبح کر دیتی۔

وہ اپنے محبوب کو تو ذبح نہ کر سکی۔ لیکن اُس کی محبت ایک چیخ کے ساتھ اُس نے ذبح کر ڈالی۔ یہ چیخ اُس کی اپنی تھی۔ محبت نہیں چیخی تھی۔ لیکن اُس کے اپنے خیال کے مطابق چیخ اُس کی محبت کی تھی۔ وہ تو مسرور تھی، کیونکہ اُس نے ایک فریبی محبت کو ذبح کر ڈالا تھا۔ لیکن دراصل چیخ نہ تو محبت کی تھی نہ اُسکی اپنی، بلکہ اُس کی انتہائی جذباتیت یہ سب کچھ سوچ رہی تھی ـــــ اور اب وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ اُس کی فریبی محبت پورے طور پر ذبح ہو سکی ہے یا نہیں۔ کاش وہ محبت کی کٹی ہوئی شہ رگ ٹٹول کر دیکھ سکتی۔ یہ ممکن نہ تھا پھر بھی اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر کچھ ٹٹولنے لگا اور اُس کے ہاتھ میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ اور فرسٹ کلاس کا بنایا ہوا ٹکٹ آ گیا۔ وہ جیسے تلملا سی گئی۔ لیکن یہ تلملاہٹ اِس لئے بھی تھی کہ اسٹیشن بالکل قریب آ گیا تھا اور تیز رفتار گاڑی بتدریج دھیمی ہو رہی تھی۔ یہ اُس کی ماسی کا اسٹیشن تھا۔ یعنی یہیں، اِسی قصبے میں اُس کی ماسی رہتی تھی اور یہیں اُسے اترنا تھا۔

کچھ لمحے پہلے کچھ دیر کے لئے بکرے ذبح ہونا رک گیا تھا، لیکن پھر ذبح ہونے لگے تھے اور اب تک مارواڑی سیٹھ کے تکلیف دہ خراٹے جاری تھے۔

لڑکی نے اُسے جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اُس کا سامان اُس کے حوالے کیا اور اپنا مختصر سا سامان سمیٹنے لگی۔ اور اسٹیشن پر وہ ڈبے سے اُتری تو اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ بھول رہی ہو ـــــ کچھ ڈبے میں تو نہیں رہ گیا؟ ـــــ ایک بار پھر اندر جا کر اُس نے چاروں طرف دیکھا ـــــ کچھ بھی نہ تھا۔

لیکن اُس کے دل میں اب تک کُرید سی تھی۔

"اوہ ـــــ" اُس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور مسکرا دی ـــــ "ڈبے میں اُس فریبی محبت کی لاش چھوڑے جا رہی ہوں"۔ وہ مطمئن ہو گئی اور اُس نے پھر اپنے محبوب کو گالیاں دیں۔

مُرلی دھر اپنے دوست، جگدیش کو خط لکھ رہا تھا

ڈیر جگدیش!

اِس وقت میں بہت جلدی میں ہوں، ٹیلر کو پتلون کا ناپ دینا ہے۔ آج سنیچر ہے کل کم بخت کی دوکان بند رہے گی اگر ابھی ناپ نہ دوں گا تو پھر سوموار کی شام کی پارٹی میں نئی پتلون نہیں پہن سکوں گا۔ یہ خط میں صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تمہیں اطمینان نصیب ہو تم ہمیشہ میری محبت کے بارے میں فکرمند رہتے کہ آخر یہ محبت کب دودھ دے گی۔ پیارے آج میری محبت نے آٹھ روپے بارہ آنے مجھے عنایت فرمائے۔ رتنا نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدنے کو دس کا نوٹ دیا، میں نے تھرڈ کلاس کا خرید کر اُس کے بیگ میں ڈال دیا؛ اور آٹھ روپے بارہ آنے میری جیب میں آ گئے۔ فکر نہ کرو اُس کے پاس کافی پیسے تھے ٹرین میں وہ آسانی سے ٹکٹ بنوا لے گی۔

تمہارا

مرلی دھر

اور چند دنوں کے بعد ایک دن مُرلی دھر خوشبو میں بسے ہوئے ایک رنگین کاغذ پر جس کے اوپر بائیں طرف بہت ہی خوب صورت بیل بوٹے بنے تھے۔ جن کے درمیان میں لکھا تھا "FORGET ME NOT" رتنا کو خط لکھ رہا تھا۔

رتنا، میری زندگی!

تم اپنے خط میں جس قدر غصہ نظر آرہی ہو، ہمت تو نہیں ہوتی کہ تم سے ہم کلام ہوں اور تم نے منع بھی کیا ہے۔ لیکن اتنی ساری گالیاں لینے کے بعد ایک بار مجھے بے غیرت بن کر پھر تم سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔

یاد کرو رتنا! میں تو تمہارے ساتھ ساتھ تھا، ٹکٹ میں نے خریدا ہی کب تھا۔ میں نے تو پیسے اپنے ایک دوست ہری شنکر کو دیئے تھے کہ وہ ٹکٹ لا دے، میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میں نے ٹکٹ دیکھا نہیں اور تمہارے بیگ میں ڈال دیا۔ لیکن اس غلطی میں تو تم بھی برابر کی شریک ہو۔ تم نے بھی تو ٹکٹ نہیں دیکھا۔

بس تم سے اتنا ہی کہنا تھا۔ اب مجھے جو کچھ کہنا سُننا ہے وہ ہری شنکر سے جس نے میری زندگی تباہ کی اور جس کی وجہ سے میری محبت کو جانے کتنی بے رحمی اور بے دردی سے تم نے ذبح کر ڈالا۔

تم آکر مجھے کمرے سے نکلوانے کی تکلیف کیوں گوارا کرو گی میں پرسوں تک کمرہ خالی کر دوں گا جب دل میں جگہ نہ پا سکا تو تمہارے مکان کے ایک حصے میں جگہ پا کر کیا لینا ہے۔

رتنا! تم نے تو میری محبت کو ذبح کر ڈالا، لیکن میں جانتا ہوں۔ محبت کبھی نہیں مرتی میری محبت امر ہے۔ اور میں اپنی اس امر محبت کی یاد ہی میں زندگی گزار دوں گا لیکن تمہیں بھولنے کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے۔

کاش تم ایک بار پھر حالات پر غور کرتیں!

ایک خانماں برباد، مُرلی

اُس کے دوسرے دن مُرلی دھر کو رتنا کا تار ملا:

"کمرہ مت چھوڑو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ خط بھی لکھ رہی ہوں۔"

اور تیسرے دن مُرلی دھر کو رتنا کا خط ملا۔ لفافہ معطر تھا۔ خط بہت طویل تھا اور خط کے کاغذ کے اوپر بائیں طرف حسین ترین بیل بوٹوں میں لکھا تھا EVER YOURS اور خط کے آخر میں لکھا تھا "ہمیشہ تمہاری"

اور چوتھے دن مُرلی دھر نے اپنے دوست جگدیش کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے جگدیش کی بے چینی دُور کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ رتنا جیسی مالدار لڑکی کی محبت پا کر وہ اب تک پیسوں کے لئے اتنا ضرورت مند کیوں رہا۔ وہ تو حالات سازگار بنا رہا تھا اور اب حالات سازگار ہو گئے ہیں۔ اب کے رتنا واپس آئے تو کبھی جگدیش سے قرض نہیں منگوائے گا!

اب وہ اپنی محبت کو ایک ایسے مقام پر لا چکا ہے کہ حد سے زیادہ خود دار بنا رہنے پر بھی رتنا اُس کی مدد کرتی رہے گی!

فرسٹ کلاس کے اُس کمپارٹمنٹ میں دو جوان لڑکیاں اور ایک بڈھی عورت کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

جوان لڑکیوں میں سے ایک بڈھی عورت کے ساتھ تھی جس کے بلاؤز کا ایک بٹن کھلا رہ جانے پر بوڑھی عورت تقریباً ایک گھنٹے سے موجودہ زمانے کی جوان لڑکیوں پر لعنت بھیج رہی تھی اور اپنے ساتھ کی جوان لڑکی کی حیا اور شرم پر لکچر پلا رہی تھی۔

دوسری جوان لڑکی بوڑھیوں پر لعنت بھیج رہی تھی۔ خاص طور پر وہ دل ہی دل میں اپنی ماسی سے جھگڑ رہی تھی جو اُس کے لئے اپنی پسند کا اچھا سا بر ڈھونڈنے کی درپے تھی۔ اُس لڑکی نے اِس سلسلے میں بہت پُر زور احتجاج کیا تھا، پھر بھی اُس کی ماسی کی ہٹ قائم رہی تو وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ جہاں اُس کا محبوب اُس کے انتظار میں تڑپ رہا تھا!

غزل

از

جناب جگن ناتھ آزاد ایم اے

۸۸۲۸، نیا محلہ، پل بنگش۔ دہلی

۱۵ نومبر ۱۹۵۶ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

حسب ارشاد اپنی غزل بھیج رہا ہوں۔ والد محترم کی غزل کل تک آپ کو موصول ہو جائے گی۔ ساحر ابھی ہوشیارپور سے واپس نہیں آئے۔ آئیں گے تو آپ کا پیغام پہنچا دوں گا میری غزل تازہ بھی ہے اور غیر مطبوعہ بھی۔ دیکھئے آپ کے حکم کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے۔

نیازمند

جگن ناتھ آزاد

کب لفظ و بیاں میں کھلتے ہیں کب لے سے نمایاں ہوتے ہیں
ہم اہلِ نوا کے سینوں میں اسرار جو پنہاں ہوتے ہیں

تعمیرِ چمن کے شیدائی! تخریبِ چمن سے خوف نہ کھا
تخریبِ چمن کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں[1]

اے موسمِ گل تو راز سہی یہ راز بھی رسوا ہوتا ہے
جب دوشِ ہوا پر دیوانوں کے جیب و گریباں ہوتے ہیں

پلکوں پہ ستارے تابندہ سینوں میں کنول سے رخشندہ
تاریکیٔ ہجراں میں اکثر اس طرح چراغاں ہوتا ہے

ذرّوں کو زباں مل جاتی ہے ہر بند کلی کھل جاتی ہے
جب مُہرِ خموشی توڑ کے ہم آزاد! غزلخواں ہوتے ہیں

غزل

از

جناب گوپال متل بی اے

دفتر "تحریک" انصاری مارکیٹ

دریا گنج۔ دہلی

مکرمی خوشتر صاحب!

یہ اشعار برگ سبز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لیکن اُمید ہے کہ آپ اِنھیں تحفۂ درویش سمجھ کر قبول فرمالیں گے۔

نیازمند

گوپال متل

خوشا بخت میسر میکدے کی شام آتی ہے
کبھی تو راہ پر بھی گردشِ ایام آتی ہے

بڑی مشکل سے ملتی ہے نگاہِ لطفِ ساقی
شراب اِس بزم میں اکثر بقدرِ جام آتی

جلاؤ شمعِ میخانہ کہ شاید روشنی پھیلے
بھیانک شب کا دیباچہ نہ ہو جو شام آتی ہے

تصور میں تمھاری یاد کے جگنو چمکتے
شبِ ہجراں فقط یہ روشنی ہی کام آتی

یہ میخانہ ہے زاہد اچھے اچھے لڑکھڑا جائیں
یہاں تو ہر ریاضت لرزہ براندام آتی ہے

---

[1] اس مصرعے کے بارے میں مجھے کچھ ایسا خیال ہے کہ شاید یہ میرا نہیں جگر صاحب کا ہے۔ (آزاد)

برف اور آگ

افسانہ

از

جناب دیوندر ستیارتھی

۵ سی، ۴۷/۴، روہتک روڈ، نئی دہلی ——— ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء

محترم خوشتر صاحب!

آپ کی خدمت میں اپنا ایک تازہ افسانہ "برف اور آگ" بھیج رہا ہوں۔ سالنامہ بیسویں صدی آنے سے اردو ادب میں ایک نیا سندیش لے کر آتا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ آہستہ آہستہ بیسویں صدی کے پڑھنے والوں میں معیاری چیزیں پڑھنے کی عادت ڈال رہے ہیں۔ لکھنے والوں سے یہ تقاضا کرنا اور پیش کرنے والے سے یہ امید رکھنی کہ وہ ہمیشہ سہل پسندی کو مدِ نظر رکھیں بڑی زیادتی ہے۔ اگر کوئی تحریر لکھنے والے کے تجربے کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی تو اُسے اعلیٰ درجے کے معیاری ادب میں کیسے جگہ مل سکتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کا تجربہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور معیاری ادب کی روایات کے پیشِ نظر اُسے نئی سے نئی تکنیک اپنانے کے لئے کمربستہ رہنا پڑتا ہے۔ اسلئے پڑھنے والوں سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کی گہرائی تک اترنے کیلئے تیار رہیں۔ "برف اور آگ" لداخ کے ایک گاؤں کی کہانی ہے لیکن اس کا موضوع لداخ تک محدود نہیں۔ انسانیت کی کسوٹی پر بھائی بہن کا پیار کتنی اہمیت رکھتا ہے یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے لیکن اس افسانے میں اس موضوع کو بالکل اچھوتے پیرائے میں نبھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر قارئین بیسویں صدی کو یہ افسانہ پسند آیا اور ساتھ ہی انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ "برف اور آگ" پڑھتے پڑھتے لداخ جا پہنچے ہیں۔ یا یہ کہ انھیں بھی اپنی کسی بہن کی یاد آ گئی۔ یا یہ کہ کسی بہن کے سامنے بھائی کا چہرہ گھوم گیا، اور بھائی بہن کے پیار کی روایت اُجاگر ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہوں — امید ہے آپ بیسویں صدی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرتے جائیں گے۔

آپ کا

دیوندر ستیارتھی

ہنستی مچلتی چھومو نے برفانی ہوا کی ذرا پرواہ نہ کی اور وہ برف پر کھیلنے کیلئے گھر سے باہر نکل گئی۔ چھومو یعنی چھبیل، یہی تھا اُس نٹ کھٹ لڑکی کا نام۔ گلی کے بچے برف کا گھوڑا بنانے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ برف پہاڑوں سے نیچے اُتر آئی تھی جیسے وہ گاؤں میں پہرہ دے رہی ہو۔ لوگ چلتے تو برف پیروں کے نیچے چرمراتی۔ جیسے وہ اُن سے باتیں کرتی، ہاتھ اُٹھا کر اشارے کرتی۔

کھڑکی میں کھڑے کھڑے سکارما نے چھومو کو برف کے گولے بناتے دیکھا اور اُس نے چیخ کر کہا "ماں! چھومو نے مرنے کی ٹھان لی ہے۔" اب ماں کیا جواب دیتی۔ اُس کی نگاہ میں تو جیسا سکارما ویسی چھومو۔ بھائی بہن کی نوک جھونک سے وہ تنگ آ جاتی لیکن یہ سوچ کر کہ ابھی سکارما اور چھومو کی عمر ہی کتنی ہے۔ وہ چپ رہتی۔ سکارما یعنی ستارہ، یہ نام ماں نے گاؤں کے بڑے لاما سے پوچھ کر رکھا تھا۔ چھومو کا نام تو بے سوچے سمجھے رکھ دیا تھا۔ لاما نے کہا تھا کہ سکارما سچ مچ ستارہ بن کر چمکے گا۔ کسی حد تک لاما نے ٹھیک کہا تھا۔ مڈل تک کی تعلیم اُس نے اسی برس ختم کر لی تھی

نویں جماعت میں داخل ہونے کے لئے اُسے لیہہ جانا ہوگا۔ بیٹے کے یہاں سے چلے جانے کا خیال کسی قدر اطمینان بخش تھا۔ پھر بھائی بہن کا جھگڑا تو نہ ہوا کرے گا۔ لیکن سکارما کے بچھڑنے کا خیال ماں کے دل پر تھوڑے چلا رہا تھا۔ کیونکہ یہ پہلا موقعہ ہوگا جب اُس کا بیٹا اُس کی آنکھوں سے دُور لیہہ چلا جائے گا۔

جب سے سکارما نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا تھا، چھومو نے اُسے چڑانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لئے تھے۔ کبھی وہ اُس پر برف کا گولہ پھینک کر بھاگ جاتی۔ کبھی وہ ہاتھ مار کر اُس کے ہاتھ سے چھنگ (جَو کی شراب) کا پیالہ گرا دیتی۔ سکارما اُسے پیٹ ڈالتا تو وہ رُوٹھ کر گلی میں برف پر جا لیٹتی۔ اور جب تک ماں جا کر اُسے اُٹھا نہ لاتی وہ ٹھنڈ سے اکڑنے کی ذرا پروا نہ کرتے ہوئے برف ہی پر لیٹی رہتی۔

دروازے پر برفانی ہوا دستک دیتی رہتی۔ لوگ دن بھر گھر سے باہر نہ نکلتے لیکن بچے تو گھر کے اندر ٹِک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ گھر کے اندر چھنگ کے پیالے حلق میں انڈیلے جاتے۔ تاکہ جسم ذرا گرم رہے۔ ہر وقت آگ جلتی رہتی۔ آگ کے گرد بیٹھ کر کسی بیاہ پر اُڑائی ہوئی دعوت کا قصہ چھڑ جاتا۔ یا کسی ہونے والے دُولھے یا ہونے والی دُلہن کی کہانی تصویر میں رنگ بھر دیتی۔

چھومو کی ماں کو ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اب اُس کی بیٹی کی شادی میں بہت دن نہیں ہیں۔ گھوڑے پر سوار ہو کر چھومو کا دُولھا آئے گا۔ وہ آ کر کہے گا، چھومو اِس گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ پکے ہوئے سیب سے گال جھیل میں کھلے ہوئے کنول سا رُوپ۔ چہرہ ٹھیک برف کا پھول!

سکارما بولا۔

"چھومو کو اندر بلا لو ماں! اُسے ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

پہلے تو ماں نے سکارما کی بات اَن سُنی کر دی۔ پھر پلیٹ کر بولی۔

"جب تم لیہہ چلے جاؤ گے پڑھنے کے لئے تو سچ سچ بتاؤ چھومو یاد آیا کرے گی یا نہیں؟"

سکارما نے نہیں میں سر ہلا دیا۔

ماں کو سکارما کا یہ انداز بالکل اچھا نہ لگا۔ بہن تو بہن ہے۔ چاہے وہ بھائی سے کتنا بھی لڑے جھگڑے۔

سارے موسموں میں جاڑے ہی کا موسم سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ماں یہ جانتی تھی۔ پھر بھی بچے تو اِس موسم میں بھی گھر کے اندر ٹِک کر نہیں بیٹھ سکتے۔

ماں نے سکارما کو پاس بٹھا کر کہا۔

"جس بھائی کو بہن کا پیار نہیں ملا، وہ بھائی ابھاگا ہے۔"

سکارما نے مُنہ پھیر لیا۔

پاس سے باپ نے چھنگ کا پیالہ چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تیرا اُوپدیش تیرے بیٹے کو اچھا نہیں لگتا تو کیوں مُنہ کے بول بیکار نشٹ کیا کرتی ہے؟"

ماں نے بات کا رُخ بدل کر کہا۔

"ہمارا سکارما تحصیلدار بنے گا۔"

"ٹھیک، بالکل ٹھیک!" باپ گردن اکڑا کر بیٹھ گیا۔ جیسے وہ نہیں چھنگ کا ساتواں پیالہ بول اُٹھا ہو۔

گلی سے برف کا گھوڑا بنانے والے بچوں کا شور آ رہا تھا۔ ماں نے کھڑکی پاس جا کر دیکھا کہ برف کے گھوڑے پر اُس کی چھومو سوار ہے۔

"اِس طرح تو میری چھومو ٹھنڈ سے اکڑ جائے گی۔"

کہتے ہوئے ماں لپک کر گلی میں چلی گئی۔ اور چھومو کو برف کے گھوڑے سے اُتار لائی۔

گلی سے برابر شور آتا رہا۔ کوئی بچہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز نکالتا۔ بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ چھومو کو پاس بٹھا کر ماں نے چائے کا پیالہ اُسکے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "آگ ہماری مترا سویکار کر چکی ہے تو برف بھی ہماری شترو تو نہیں ہے۔ برف ہمارا سبھاؤ جان گئی ہے۔ برف سے ہمارے بھید چھپے ہوئے نہیں ہیں۔"

باپ بولا۔ "تو چھومو کو برف کے گھوڑے پر کیوں نہیں چڑھنے دیتی؟"

گلی میں بچے کلکاریاں مار رہے تھے۔ کئی دن سے برف پڑ رہی تھی۔ آج سویرے تھوڑی دیر کے لئے سُورج نے مُنہ نکالا تھا۔ اب پھر غائب ہو گیا تھا۔ سو بچے برف کے گھوڑے پر چڑھ کر سُورج کو بُلا رہے تھے۔ ماں کے پاس بیٹھی چھومو چاہتی تھی کہ وہ چائے کا پیالہ ختم کر کے بھاگ کر گلی میں چلی جائے۔

"برف کیوں گرتی ہے؟" سکارما نے پُوچھ لیا۔ پہلے اُس نے باپ کی طرف دیکھا، پھر ماں کی طرف، اور پھر چھومو کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "تو بتا سکتی ہے برف کیوں گرتی ہے؟"

ہاروشوں کے گلاب مُرجھا چکے تھے۔ خالد نے رانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔۔۔

"کل میں جا رہا ہوں"۔

"کیوں ؟"

"چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ جانا ضروری ہے"۔

"آئیے گا کب ؟"

"بہت جلد"۔

رانی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جمنا اُمڈ پڑی۔ آنسوؤں کی طغیانی تھی۔ سیلاب تھا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اُس نے کہنا شروع کیا۔۔۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اب آپ نہیں آئیں گے شہزادہ دہاں کی گہماگہمی آپ کو مجبور کر دے گی کہ آپ مجھے بھول جائیں۔ آپ اپنے وعدے، اپنے پیمان، اپنی باتیں سب بھول جائیں گے"۔

"نہیں رانی، ہرگز نہیں۔ میں آؤں گا۔ اور ضرور آؤں گا۔ تمہارے بغیر میری دُنیا تاریک رہے گی۔ اب میرے لئے شہر کچھ نہیں۔ یہ جھیل میری مایا ہے، یہ کھیت میری دولت ہیں۔ یہ پنڈا میری کائنات ہے۔ اور تم اِس مایا کی، اِس دولت کی، اِس کائنات کی رانی ہو میں آؤں گا"۔

رانی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خاموش تھی۔ فضا میں سکوت تھا۔ ماحول پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی غمگین تھی اور رات بھی افسردہ۔ رانی روتی رہی سسکتی رہی اور خالد سمجھاتا رہا۔ دُور آم کے کسی درخت پر کوئل کوکی۔ فضا کا سکوت ٹوٹا۔ خالد نے ہلکے ہلکے رانی کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔۔۔

"یہ ڈیڑھ مہینہ، پیارے پیارے سہانے سہانے دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ میں اِن دنوں کی یاد کو سینے سے لگائے شہر میں رہونگا اور جیسے ہی فرصت ملی میں آ جاؤں گا"۔

رانی نے اپنی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھے، خالد کو دیکھا اور کہنے لگی۔

"جن دنوں کو آپ سہانے کہہ رہے ہیں وہ میرے لئے کھٹکتا ہوا کانٹا ہیں۔ یہ پیارے دن، سہانے دن اور آپ کا انتظار شاید مجھے جینے نہ دے"۔

"بُری بات۔ تم زندہ رہو گی اور میں آؤں گا۔ سمجھ گئیں ؟"

یہ کہہ کر خالد نے جیب سے پرس نکالا۔ اور دس دس کے پانچ نوٹ رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا۔۔۔

"شاید تمھیں کوئی ضرورت پڑے تو یہ کام آئیں گے"۔

"یہ کیا ؟"

"انھیں رکھ لو"۔

آنسو تھم گئے۔ پیشانی کے بل اُبھر پڑے۔ آنکھوں میں جلال نے کروٹ لی۔

"میں نے اِن روپوں کیلئے پیار نہیں کیا۔ اگر آپ انھیں پیار کا بدلہ سمجھ کر دے رہے ہیں تو مجھے جینے کا اب کوئی حق نہیں۔ اور اگر آپ میری غریبی کا مذاق اُڑانا چاہتے ہیں تو مجھے آپ سے یہی اُمید بھی تھی"۔

خالد پریشان ہوگیا۔۔۔

"رانی تم غلط سمجھیں میرا مطلب یہ نہ تھا"۔

"ہوسکتا ہے میں غلط سمجھی ہوں۔ اب آپ انھیں رکھ لیجئے۔ مجھے ضرورت نہیں"۔

خالد خاموش تھا۔ رانی پھر رونے لگی۔ پیار کے لمحے ختم ہوئے۔ جُدائی کی گھڑیاں آ گئیں۔ دونوں رخصت ہوگئے۔ وہ اپنی پھونس کی جھونپڑی کی طرف اور یہ اپنے اُونچے محل، اُونچی کوٹھی کی طرف۔

غربت اپنی جھونپڑی میں رو رہی تھی اور امارت اپنے ساز و سامان کو دُرست کر رہی تھی۔ سُورج کی کرنیں جب گاؤں پر پڑ رہی تھیں تو خالد یکے پر بیٹھا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔

اکبارگی خالد چونک پڑا۔۔۔

رات ختم ہوچکی تھی۔ چوک کے گھنٹہ گھر کی گھڑی پانچ بجا رہی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔۔۔

دو سال سے اُوپر ہوگئے۔ وہ اُس گاؤں میں نہ جاسکا۔ نہ اُس نے رانی کی خبر لی۔۔۔

اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے پگڈنڈی پر آنکھیں بچھائے رانی اب بھی اُس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ پنگھٹ پر گھڑا لئے اُس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس نے دل میں کہا، گاؤں کی لڑکیاں کتنی سادہ دل ہوتی ہیں۔۔۔!

چھوموکھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو، پڑھ لکھ کر تم اور بھی بدھو بن گئے۔ ماں نے گیان بگھارا۔ "برف کوئی پالتو کتیا تو نہیں ہے کہ ہماری آگیا ماننے۔ ایسا تو ہونے سے رہا کہ جب ہم کہیں، برف! برف! اب تم گرو! تو وہ گرنے لگے۔ اور جب ہم کہیں برف! برف! اب تم مت گرو! تو برف گرنا بند ہو جائے!"

"اب بولو سکارما!" چھومو نے چھیڑا۔ "پھر تو چھومو برف کیوں گرتی ہے؟"

باپ نے بیٹی کی سمجھ بوجھ کی داد دی۔ "بہت سیانی ہو گئی ہے چھومو۔ اِسے برف بھی اچھی لگتی ہے۔ اور آگ بھی!"

"سکارما کو بھی تو برف اور آگ دونوں اچھی لگتی ہیں۔" ماں نے سکارما کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔ "جب میرا بیٹا تحصیلدار بن جائے گا تو میں تحصیلدار کی ماں کہلاؤں گی۔"

چھومو بولی۔ "سکارما تو ابھی نہیں جانتا کہ برف کیوں گرتی ہے۔ وہ تحصیلدار کیسے بنے گا؟"

سکارما کو جیسے آگ لگ گئی۔ اُس نے چھومو کے بال نوچ لئے۔

چھومو رونے لگی۔ ماں نے سکارما کو ڈانٹا۔ "تیری بہن ہے چھومو۔ کوئی اور تو نہیں ہے۔" اور پھر بات کا رُخ بدلنے کے لئے وہ کہتی چلی گئی۔ "سکارما ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ سُورج بن کر چمکے گا۔ اِس گھر کو سونے سے بھر دے گا۔"

سکارما کی آنکھوں میں ایک نئی چمک آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ برف کے پگھلنے کی دیر ہے۔ نئی رُت کے آتے ہی وہ لیہہ کے لئے گاؤں چھوڑ دے گا۔ گلی سے بچوں کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

آگی لاچم چھپ سیمپا!
یِل مالا سگوز کھر پھینگ!
رِشین لا دانگ گیوچنگ!
رِشین چین نک پوئے، گوچوک گوچوک!

(اے بُوڑھی ستو! سورج کے لئے دروازہ کھول دو۔ بادل کے تیر مار دو گھور کالے بادل کا سر توڑ دو۔ سر توڑ دو!)

سکارما نے ماں کو خوش کرنے کیلئے کہا۔ "میں تحصیلدار بن کر دکھاؤں گا۔ میں سُورج کے لئے دروازہ کھول دوں گا۔"

"تم کدھر کے بوڑھی ستوا ہو؟" چھومو چپ نہ رہ سکی۔ "کیا تم بادل کے تیر مار سکتے ہو؟ کیا تم گھور کالے بادل کا سر توڑ سکتے ہو؟" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے وہ سکارما کی ساری لکھائی پڑھائی کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ اِس سے پہلے کہ ماں ڈانٹ ڈپٹ کرے چھومو گھر سے نکل کر پھر گلی میں چلی گئی۔

باپ نے ہنس کر کہا۔ "برف کے گھوڑے کا کھیل ہی ایسا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میں نے بھی کھیلا تھا یہ کھیل۔ میں نے بھی گایا تھا یہ گیت۔ میں نے بھی بوڑھی ستو سے پرارتھنا کی تھی کہ وہ سُورج کے لئے دروازہ کھول دے۔"

"میرا بیٹا بادل کے تیر مار دے گا۔ گھور کالے بادل کا سر توڑ دے گا۔" ماں نے سکارما کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "پڑھ لکھ کر تحصیلدار بنے گا میرا بیٹا!"

باپ بڑ بڑھے پاس سے اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے پکار کر کہا۔ "شاباش چھومو! شاباش!"

ماں سمجھ گئی کہ چھومو جا کر پھر سے برف کے گھوڑے پہ سوار ہو گئی۔ گلی کی سب سے خوبصورت لڑکی کو ہی برف کے گھوڑے پہ سوار ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ اپنے گاؤں کی گلی میں وہ بھی کئی بار برف کے گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ بچپن میں اُس نے بھی یہ گیت گایا تھا۔ جب تک بوڑھی ستوا سورج کے لئے دروازہ نہیں کھولتے تھے۔ بادل کے تیر نہیں مارتے تھے۔ گھور کالے بادل کا سر نہیں توڑتے تھے، سُورج کے لئے کسی بھی طرح یہ ممکن نہ ہوتا تھا کہ وہ برف سے ڈھکے ہوئے راستوں کو صاف کرے۔ جب آگ بھٹ پہ جلتی تھی تو برف پگھلتی چلی جاتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ جب ہوش سنبھالنے پر پہلی بار اُس نے برف کو پگھلتے دیکھا تھا تو وہ سُورج کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ سُورج، جو کروڑوں کرنوں کو حکم دے رہا تھا کہ وہ برف سے اَٹے ہوئے راستوں سے نیچے اُتریں۔ اور کچھ ہی دنوں میں برف کی چٹانوں کا صفایا کر دیں۔

باپ نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے کہا۔ "ہماری چھومو تو برف کی راجکماری ہے۔ دیکھو تو سہی یہاں آکر چھومو کی ماں! ارے سکارما کے تحصیلدار بننے میں تو ابھی دیر ہے۔ چھومو کو دیکھو کس طرح برف کے گھوڑے پر بیٹھی ہے۔ گلی کے بچے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اب بوڑھی ستوا سورج کے لئے دروازہ کھولنے میں دیر نہیں کریں گے۔" ماں بھی کھڑکی میں چلی آئی۔

سکارما غصے میں جلا بُھنا چُولھے کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس کا بس چلتا تو گلی میں جاکر برف کے گھوڑے کو توڑ پھوڑ ڈالتا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ماں چھومو کو زیادہ چاہتی ہے۔ یا اُسے۔ پھر بھی اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ خوب دل لگا کر پڑھے گا۔ اور اپنے گھر کے لئے ایسا سورج چڑھائے گا جس سے برسوں کی جمی ہوئی برف پگھل جائے۔ اور سارا گھر سونے سے بھر جائے۔ بیچ بیچ میں وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگتا جہاں اُس کے باپ کے قریب اب اُس کی ماں بھی کھڑی گلی میں کھیلتے بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈُگار گاؤں کے بچے برف کے گھوڑے کا گیت گا رہے تھے۔ سکارما جانتا تھا کہ ان بچوں کو بہار کا انتظار ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بہار ضرور آئے گی۔ گاؤں کی گلی ہمیشہ تو برف سے اَٹی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ تو چھت سے برف اُتارنے کی بپتا نہیں ہوگی۔ اُس کے ہاتھ ابھی تک درد محسوس کر رہے تھے۔ کل اُس نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر گھر کی چھت سے برف اُتاری تھی بیلچہ چلاتے ہوئے وہ بہت پھُرتی دکھا رہا تھا۔ باپ نے ہنسکر کہا تھا۔

"بیٹا! اتنی ہی پھُرتی سے تم تحصیلدار بن جاؤ تو ہمارے گھر میں سونا بسنے لگے!"

اِس کے جواب میں اُس نے یہی کہا تھا۔

"پہلے مجھے لیہہ کے اسکول میں جاکر تو پڑھنے دو۔ پھر وہ دن بھی ضرور آئے گا۔ آخر برف کو ایک دن پگھلنا ہوتا ہے۔ سورج کے لئے دروازہ کھُل کر رہتا ہے۔ بادل کے تیر لگ کر رہتا ہے۔ کالے گھور بادل کا سر نہ توڑا جائے تو ہمیشہ برف سے اَٹی رہے۔ گاؤں کی گلی اور چھت سے برف اُتارنے کی بپتا بھی نت نت ستاتی رہے۔"

کھڑکی کے پاس کھڑی ماں ہنس رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ اُٹھتی۔ "دیکھو! دیکھو! ہماری چھومو تو چاند کی راجکماری معلوم ہو رہی ہے!"

"چاند کا راجکمار ہی اُسے بیاہنے آئے گا" باپ نے گمبھیر ہو کر کہا۔ "ہم تو بھاگوان ہیں۔ چھومو کے بیاہ کی چنتا تو مجھے کبھی نہیں ستاتی۔ اُس کے لئے اچھے سے اچھا لڑکا مل سکتا ہے!"

"بڑی نٹ کھٹ ہے چھومو۔ میں ڈرتی ہوں کہیں وہ اپنے دولہے کو بھی کان سے پکڑ کے اُٹھانے بٹھانے کا کھیل نہ کھیلنے لگے" کہتے کہتے ماں گمبھیر ہو گئی

سکارما نے ماں کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ سوچنے لگا، ماں تو ویسے ہی گھبرا رہی ہے۔ آج کل کے لڑکے ایسے تو نہیں ہوتے کہ دُلہن کے ہاتھوں اُٹھک بیٹھک کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

"تھوڑا سمے اور بیت جائے" ماں نے کہنا شروع کیا۔ "چھومو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گی۔ ہر بات اپنے ٹھکانے پر آجائے گی۔"

"بچپن میں تو بھی ایسی ہی نٹ کھٹ رہی ہوگی۔"

"شاید؟"

"شاید نہیں، ضرور!"

باپ کی آنکھوں کے سامنے بیٹی کا رُوپ سچ مچ چاند کی راجکماری سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے حال پر خوش تھا۔ وہ زندگی پر سوار تھا۔ جیسے اُس کی بیٹی برف کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اُس نے چھومو کی ماں کی طرف دیکھا۔ "بہت اچھا سمے آرہا ہے چھومو کو بیاہنے کے لئے چاند کا راج کمار آئے گا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر۔ اور تم ہی سوچو کیوں نہیں آئے گا؟ کیا اُسے معلوم نہیں کہ چھومو کا بھائی سکارما تحصیلدار ہونے جا رہا ہے!"

سکارما نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ابھی تو انڈے سے چوزہ نکلنے میں بہت دیر ہے۔

"آنے والے سمے کا دھیان کر چھومو کی ماں! آج سے تو ہم ہر دشا میں اچھے ہی رہیں گے۔"

"کیسے؟"

"ہمارا داماد ہوگا چاند کا راجکمار اور بیٹا ہوگا تحصیلدار!"

"ابھی تو بُودھی ستو انے سورج کے لئے دروازہ نہیں کھولا۔ ابھی تو گھور کالے بادل کے تیر نہیں مارا گیا، اُس کا سر نہیں توڑا گیا۔"

"برف ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔ سورج آگ برسائے گا تو برف پگھل جائے گی۔ جیسے سورج کی ضرورت ہے برف پگھلانے کے لئے، ویسے ہی بُدھی چاہئے جھنجھٹوں کو دور بھگانے کے لئے۔ تم دیکھتی رہو۔ اب ہمیں کوئی کشٹ نہیں رہے گا!"


جب دوست احباب آئیں۔
چائے سے
ان کی خاطر کیجئے
چائے کی سماجی خصوصیات کیا ہیں؟
اوّل یہ ہے کہ وقتی تقویت حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی دن میں جتنی بار چاہے پی سکتا ہے۔ دوم چائے دوستانہ فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس طرح باہمی گفت و شنید کے فن کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس لئے مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ چائے اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔
میں چائے ہوں — میزبانی کی علامت
TEA BOARD INDIA

اِتنے میں گلی سے گھوڑوں کا ایک قافلہ گزرا۔ گھوڑوں کے سموں کے نیچے برف کے چرچرانے کی آواز سکار ما کے کانوں پر دستک دے رہی تھی۔

ماں نے چلّا کر کہا۔

"نئی رُت شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں سکار ما! تُو لیہہ جانے کی تیاری کر لے۔"

اِتنے میں باپ بول اُٹھا۔

"ہاں ہاں اب دیر نہیں۔ سورج کے لئے دروازے کھلنے میں اب دیر نہیں۔ یہ کہتے کہتے اُس نے اپنے دانت میں لگی سونے کی کیل کو نمایاں کر دیا۔ اُس کی بتیسی چمکنے لگی۔ گھوڑوں کے سُموں کی آواز اب تک آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، یہ قافلہ بہت لمبا ہے۔

ماں نے چھوموکو آواز دی۔

"اندر آ کر ایک بات تو سُن جا چھومو!"

وہ بالکل نہیں آئے گی۔" باپ نے ٹنکار لگائی۔ "میں چھوموکا سُبھاؤ جانتا ہوں۔"

لیکن باپ کا خیال غلط نکلا۔ چھومو برف کے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگا کر قافلے کے گھوڑوں کے بیچ سے نکل کر گھر میں آ گئی۔

"کہو تو تمھیں اس قافلے کے ساتھ ہی لیہہ بھیج دیں؟" چھومو نے سکار ما کے نزدیک ہو کر کہا۔

"کیوں؟ تمھیں میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟" سکار ما بھی چُپ نہ رہ سکا۔

ماں نے سکار ما کو ڈانٹ پلائی۔ "چھومو کی بات پر تمھیں ہمیشہ غصہ کیوں آ جاتا ہے؟ میں کہتی ہوں بہن بھائی کا پیار تو بہت پوِتر ہوتا ہے۔ اس پر تو بُدھی ستوا کا آشیرباد بھی نچھاور ہونے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور تم ہو کہ ہمیشہ بہن سے لڑنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے رہتے ہو۔"

چھومو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کے گال اور بھی لال ہو گئے۔ آنکھوں کی جھیلوں میں جیسے کمل کھل گئے۔ اُس نے اپنے بالوں کی لٹوں کو ہاتھ سے پرے کیا اور سکار ما کے اوپر جھک گئی۔ "اب بولو سکار ما!" وہ سکار ما کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ "میری بات کیا تمھیں اتنی بُری لگی؟ میں تو کہتی ہوں کہ تم کبھی لیہہ جانے کی تیاری ہی نہ کرو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" باپ نے ڈانٹ پلائی۔ "سکار ما لیہہ نہیں جائے گا تو وہ تحصیلدار کیسے بنے گا؟" اور پھر اُس نے اپنی آواز میں مٹھاس لا کر کہا۔ "اور تمھیں بھی چاند کا راجکمار بیاہنے نہیں آئے گا۔ اگر ہم پہلے سے ہی اُسے یہ نہ بتا سکے کہ چاند کی راجکماری کا بھائی تحصیلدار بننے جا رہا ہے۔"

"بھاگ کا لکھا تو پورا ہو گا۔" ماں نے پُچکارا۔ "سکار ما تحصیلدار بنے گا۔ اور ہماری بیٹی بھی اچھے گھر بیاہی جائے گی۔"

لیکن بیاہ کی بات چھومو کو اتنی اچھی نہ لگتی تھی۔ وہ بھاگ کر باہر نکل گئی اور پھر برف کے گھوڑے پر جا بیٹھی۔ چپڑے کی کاٹھی نہ رکھی ہوتی تو برف کے گھوڑے پر بیٹھنا آسان نہ ہوتا۔

بچوں نے مل کر آواز لگائی۔

"ٹنگار گاؤں کی بہار!"

گھوڑوں کا قافلہ دُور نکل گیا تھا۔ ماں نے باپ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، اب چھومو کے لئے لڑکا ڈھونڈنے میں کتنے دن لگیں گے۔

ٹنگار گاؤں کے اس گھر کے بارے میں لوگ سوچا کرتے تھے ــــ نہ جانے کہاں سے انھیں اتنا سُکھ چین نصیب ہو گیا۔ اگر سکار ما کا باپ گاؤں کا مُکھیا ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن وہ تو مُکھیا نہ ہوتے ہوئے بھی مُکھیا سے بڑا تھا۔ اور جب سے لوگوں نے سُنا تھا کہ سکار ما تحصیلدار بن کر ہی دم لے گا۔ گاؤں میں اس گھر کی عزت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

چھومو برف کے گھوڑے پر بیٹھی تھی۔ اور اب بچے دوسرا گیت گا رہے تھے جو خاص طور پر ٹنگار گاؤں کی بہار کی سُندرتا کا بکھان کرنے کے لئے جوڑا گیا تھا۔

"چھومو کی مسکراہٹ نیلی جھیل کے نیل کمل کی سُگندھ چھوڑ رہی ہے۔ برف پگھل رہی ہے۔ ایک طرف ہے برف، دوسری طرف آگ! اب برف کے پھول کھلیں گے!"

باپ بولا۔ "ارے سکار ما! تحصیلدار پیچھے بننا۔ پہلے یہ کھیل تو دیکھ لے!"

"دیکھ لے یا کھیل لے؟" ماں نے خوشی سے اُچھل کر کہا۔ "ارے سکار ما بیٹا! جا کر دیکھ، کس طرح ٹنگار گاؤں کے بچے مست ہو رہے ہیں۔"

سکارما باہر نہ گیا۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھا ہوا آگ کی لپٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ سکول کی ایک کتاب میں اُس نے وہ کہانی پڑھی تھی۔ وہ یونانی کہانی جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح پہلے پہل انسان نے آگ کی تلاش کر لی تھی۔ اُس نے برف پر قابو پانے کا اُپائے ڈھونڈ لیا تھا۔

باپ نے چیخ کر کہا۔ "ارے سکارما! آگ کے سامنے بیٹھا کیا سوچ رہا ہے اب یہاں ہوا کا چکر سماپت ہو رہا ہے۔ ارے یا تو چھنگ کا پیالہ پیو اِس خوشی میں یا یہاں آ کر اِن بچوں کا کھیل دیکھو!"

سکارما ٹس سے مس نہ ہوا۔

باہر سے بچوں کا گیت سُنائی دے رہا تھا۔ جس میں یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ پربت کی چوٹی پہ تین چیزیں ملتی ہیں۔ ہنجپی، آندھی اور درّہ، درّے کے سرے پہ سرائے جو سدا سے وہاں موجود ہے۔

باپ بولا۔

"یہ گیت میں نے بھی گایا تھا۔"

"اِس گیت کا بول کتنا اچھوتا ہے" ماں بولی "کہ آندھی طوفان میں سُنائی دیتی ہے ہوا کی سائیں سائیں۔ درّے کی چوٹی پر آرام کرتا ہے ہنجپی!"

"اور اُس بول کی طرف بھی تو دھیان دو کہ مسافر کو راستے میں ملتی ہیں تین چیزیں۔ ندی، قلعے کا کھنڈر، اور پُل!"

"ندی بہتی رہتی ہے، قلعے کا کھنڈر کھڑا رہتا ہے۔ اور پُل کو بھی بھلا کون اُٹھا لے جائے گا؟"

"مسافر اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو اُسے بھی تین ہی چیزیں ملتی ہیں۔ سڑک کا موڑ، گھر، اور کنواریاں۔"

ماں نے مسکرا کے دیکھا۔ "سڑک کا موڑ سماپت ہوا۔ کیونکہ مسافر اپنے گھر پہنچ گیا۔"

"گاؤں اپنی جگہ سے نہیں سرکتا۔"

"کنواریاں اِسے چھوڑ کر نہیں جاتیں۔"

"گاؤں میں کتنا سُکھ ہے!" کہتے کہتے باپ رُک گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ سے ہے تو ٹھیک۔ چھومو بھی نگار کو چھوڑ کر نہ جائے تو ٹھیک ہے۔ چاند کا راجکمار کہیں باہر سے کیوں آنے لگا۔ یہاں لگار گاؤں میں بھی کوئی اچھا سا لڑکا مل سکتا ہے۔ برف کے گھوڑے کے گرد گھومتے بچے برابر گاتے جا رہے تھے۔ اب ساتھ گیت میں یہ دُھن الاپی جا رہی تھی۔

"کتنا کشٹ ہے اِس دیش میں آنا!"

چھومو نے بھی ایک بول گا سُنایا جس کا مطلب تھا کہ میدان میں بڑے اور چھوٹے خیمے گڑے ہیں۔ میدان کے سرے پر بندھے ہیں ننانوے سو گھوڑے اور اِن گھوڑوں کی کاٹھیاں سونے کی ہیں۔"

ماں بولی۔ "یہ تو جھوٹ ہے۔ اتنا سونا کہاں سے آئے گا کہ ننانوے سو گھوڑوں کی کاٹھیاں سونے سے بنائی جائیں؟"

"بیٹی کو تحصیلدار بننے دو۔ پھر بتاؤں گا۔" باپ مسکرایا۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ برف پگھلنے لگی تھی۔ اب تو برف کا گھوڑا اور بھی انمول نظر آنے لگا۔ آج کے بعد شاید ایسا گھوڑا نہ بنایا جا سکے۔ چھومو کے سر پر کسی نے سنہری مکٹ باندھ دیا۔ اب وہ سچ مچ چاند کی راجکماری نظر آنے لگی۔ باپ نے چلا کر کہا۔

"ارے سکارما! دیکھو ہماری چھومو کے سر پہ سونے کا مکٹ کتنا سُندر لگتا ہے!"

"اُونہہ، سونے کا مکٹ اُسے کہاں ملے گا؟" کہہ کر سکارما چولھے کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگرچہ اب برف پگھلنے کا موسم آ رہا ہے۔ پھر بھی ابھی اتنی ٹھنڈ ہے کہ گھر کے اندر آگ کی ضرورت ہے۔

برف کے گھوڑے کے گرد بچے اب وہ گیت گا رہے تھے کہ آسام سے آتی ہے چائے کی پتی۔ اُتر سے آتا ہے نمک اور گاؤں میں ملتا ہے دودھ۔ اِن تینوں چیزوں کا دیش ایک نہیں ہے۔ پھر بھی سماوار میں مل کر یہ تینوں چیزیں ایک ہو جاتی ہیں۔

گھر کے اندر آگ کے سامنے بیٹھا سکارما سوچنے لگا۔ برف کا گھوڑا فضول ہے۔ اصل چیز ہے گرم چائے کا پیالہ۔ جو ٹھنڈ سے بچاتا ہے۔

ماں بولی "مجھے تو وہ گیت پسند ہے — دُور اُڑتی ہے کوئل گھونسلے کی تلاش میں۔ کتنی پیاری لگتی ہے گھونسلے کے لئے بھٹکتی ہوئی کوئل کی بولی۔"

"چھمو کو بھی گھر چاہئے۔" باپ مسکرایا۔ "ایک وہ گیت بھی تو ہے برف سے ڈھکے ہوئے پربت میں نے کچھ اور پربتوں سے اونچے دیکھے۔ سفید چٹانوں میں کچھ اونچی اونچی تھیں۔ اُن کے اندر گدھ کے بچے گھونسلوں میں آرام کر رہے تھے۔ بڑھنے لگے تھے اُن کے پنکھ اور وہ اُڑنے لگے تھے۔"

"گدھ کے کسی بچے کو تو تحصیلدار نہیں بننا ہوتا۔" ماں نے چٹکی لی۔

سکارما کو لگا جیسے ماں اُس کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا۔ چھومو الگ اسے بدھو سمجھتی ہے۔ اور اب ماں بھی تیر چلا رہی ہے اُسی کو نشانہ بنا کر!

برف کے گھوڑے کے گرد بچے اُچھل اُچھل کر ناچ رہے تھے۔ اور سنہری ٹنکٹ پہنے بیٹھی تھی چھومو۔ جیسے اُس کے اشارے پر یہ گھوڑا چلنے لگ جائے گا۔ بچوں کا ناچ ختم ہوا تو چھومو نے برف کے گھوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے گانا شروع کیا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

پربت پر چمک رہا سورج، اب ہلو برف کے گھوڑے!
اب پگھل جائے گی برف، کھلیں گے پھول۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
کھلیں گے نیلے پھول۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
برف کے پھول کھلیں گے۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
کون ہے کیا، کیا ہیں اُن کے نام، برف کے پھول کھلیں گے۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
بہے گا پُل کے نیچے نیلا نیلا جل۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
نیلے جل میں تیرے گی مچھلی، اب ہلو برف کے گھوڑے!
نیلی آنکھوں والی مچھلی جانے جل کی بھاشا۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
اب کوئل نے بنالیا ہے نیا گھونسلا۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
اب راج ہنس اُوپر آئیں گے۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!
چاندی کی مچھلی ہے سُندر، اب ہلو برف کے گھوڑے!
میری ماں سونے کی بطخ۔ اب ہلو برف کے گھوڑے!

باپ بولا۔ "اسے کہتے ہیں بیٹی کا پیار۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بیٹی کا پیار ماں باپ کے لئے، بیٹے کے پیار سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں بہت سچائی معلوم ہوتی ہے!"

"یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں۔" ماں نے کھڑکی سے ہٹ کر سکارما کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میرا سکارما تحصیلدار بنے گا تو میری بہت سیوا کرے گا۔"

"تیری سیوا کرے گا سکارما تو کیا میری سیوا نہیں کرے گا؟" باپ نے آگے بڑھ کر سکارما کو گلے سے لگا لیا۔ "ارے میرا بیٹا تو میرا نام اونچا کرے گا گاؤں میں! آج تک تو یہاں کا کوئی لڑکا تحصیلدار بنا نہیں۔ یہ ضرور بنے گا تحصیلدار۔"

اتنے میں چھومو کھیت سے اندر آ گئی۔ اُس نے سر پر سنہری ٹنکٹ پہن رکھا تھا۔

ماں بولی۔ "میرا جی تو چاہتا ہے کہ چھومو کو آج ہی بیاہ دوں۔"

"لیکن چاند کا راجکمار تو ابھی آیا نہیں ہمارے گھر دولہا بن کر۔" باپ ہنس پڑا۔

چھومو نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

ماں بولی۔ "سکارما! اب تم لیہ جانے کی تیاری کرو۔ برف پگھلتے اب دیر نہیں لگے گی۔ راستہ کھل جائے گا۔ راستہ تو سمجھو کھل گیا۔ راستہ نہ کھل گیا ہوتا تو گھوڑوں کا اتنا بڑا قافلہ لیہ کی طرف کیسے چل پڑتا؟"

"ماں ٹھیک کہتی ہے سکارما!" چھومو، بھی خاموش نہ رہ سکی۔

"کیا ٹھیک کہتی ہے ماں؟" سکارما کا غصہ ایک دم بھڑک اُٹھا۔ اور اُس نے چھومو کے سر سے سنہری ٹنکٹ اُتار کر اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالا۔ اور ہاتھ بڑھا کر چھومو کی مینڈھیاں کھینچ لیں۔

"بڑی آئی ہے برف کے گھوڑے کی رانی!"

"بڑا آیا ہے تحصیلدار!" چھومو نے روتے ہوئے کہا۔

لیہ پہنچ کر سکارما نویں جماعت میں بھرتی ہو گیا۔ جب بھی گھر کی یاد آتی وہ جیسے کاغذ کی پڑیا میں باندھ کر اسے کسی پہاڑی ندی میں پھینک دیتا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے تحصیلدار بن کر دکھلائے گا۔ پھر ماں باپ سے بات کرے گا۔ کبھی بھولے سے گھر چٹھی لکھتا بھی تو چھومو کے لئے پیار کا ایک بھی لفظ لکھنا ضروری نہ سمجھتا۔ ایک بار اُس نے پورے تین مہینے تک گھر چٹھی لکھنے کا خیال من میں دبائے رکھا لیکن اتنی جلد تحصیلدار بن جانا تو آسان نہ تھا۔ اُس کے سامنے لمبی سڑک تھی۔ اُس پر چلتے

پہنے کا اُس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

ساتھ والے لڑکے پوچھتے۔

"تمھارا کوئی اور بھی بھائی ہے سکارما؟"

سکارما ہمیشہ نہیں میں سر ہلا دیتا۔

"کیا تمھاری کوئی بہن ہے سکارما؟"

اِس سوال کے جواب میں بھی سکارما ہمیشہ نہیں میں سر ہلا دیتا۔

چھومو سے اُسے نفرت تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ چھومو ہی کو اُس کے تحصیلدار بننے میں شک ہے۔ وہ اُسے نرا بدھو سمجھتی تھی۔ ماں باپ چھومو کو "چاند کی راجکماری" کہتے پھولے نہ سماتے تھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے تھے کہ چاند کی راجکماری کو بیاہنے کیلئے "چاند کا راجکمار دُولھا بن کر آئے گا۔ وہ یہ بھی دلیل دیتے تھے کہ "چاند کے راجکمار کو چھومو کا دُولھا بنانے کے لیے سب سے بڑا لالچ تو یہی دیا جا سکتا ہے کہ چھومو کا بھائی تحصیلدار بننے جا رہا ہے لیکن چھومو ہے کہ گھمنڈ میں پھولی جا رہی ہے۔" ڈگار گاؤں کے چھوکروں نے اُس کے سر پر سنہری مکٹ رکھ دیا تھا۔ اور اُسے برف کے گھوڑے پر سوار کرا دیا تو وہ سمجھنے لگی ہے ڈگار گاؤں ہی میں کیوں، آس پاس کے کسی دوسرے گاؤں میں بھی اُس جیسی خوبصورت لڑکی نہیں ہے۔ کبھی کبھی اُسے باپ کے بول یاد آنے لگتے جو اُس نے اُسے لیہہ کے لئے گھوڑے پر سوار کراتے ہوئے کہے تھے۔ "جیسے برف سے اَٹی ہوئی ندی کے نیچے سے پانی بہتا رہتا ہے بیٹا! ویسے ہی اُن لوگوں کے دل میں بھی جو اوپر سے کٹھور معلوم ہوتے ہیں نیچے، بہت نیچے محبت کی جل دھارا بہتی رہتی ہے۔"

اِن دنوں وہ کسی حد تک چھومو کو بھی معاف کر دینا چاہتا تھا۔ خاص طور پر جب اُسے باپ کا یہ اُپدیش یاد آتا۔

"برف، برف ہے۔ اور آگ، آگ۔ برف بھی اپنی عزت پہچانتی ہے جب وہ دیکھتی ہے کہ لوگ اُس کے ہاتھوں تنگ آ گئے تو وہ گرنا بند کر دیتی ہے اِسی طرح آگ بھی اپنی حد کے اندر ہی اچھی لگتی ہے۔ آگ سے دوستی گانٹھنے کا مطلب ہے "سمجھ سوچ کر آگ سے کام لینا!"

اُسے اُس دن کی یاد برابر آنے لگتی جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ڈگار گاؤں سے لیہہ کے لئے چل پڑا تھا۔ بہار کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ جہاں جہاں برف کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں، پگھل رہی تھیں۔ برف پگھلنے سے ڈگار گاؤں کی گلیوں میں کیچڑ کی بھرمار ہو گئی تھی۔

ماں نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا تھا۔

"ہمیں ایک ساتھ رہتے کتنے برس بیت گئے۔ تم سمجھتے ہو میں سر پھری عورت ہوں۔"

باپ نے اِس کے جواب میں آہستہ سے کہا تھا۔

"اب یہ بھی رعب جمانے والی بات ہے!"

ماں نے اور بھی نرم ہو کر کہا تھا۔ "میں برف کی سِل نہیں ہوں۔ اپنے آپ سوچو۔ میں تمھارے کتنے کام کرتی ہوں۔ میرے اندر بھی تو ممتا کی آگ ہے۔"

اب اِن ہی باتوں کا دھیان کرتے ہوئے سکارما نے گھر والوں کو بار بار چٹھی لکھنے کا طریقہ اپنا لیا۔ "تحصیلدار تو میں بنوں گا ہی!" اُس نے اپنے من ہی من میں فیصلہ کیا۔ "لیکن گھر والوں کو چٹھی نہ لکھنا تو حماقت ہے۔"

چھٹیوں میں وہ گھر بھی ہو آتا۔

لیکن چھومو اُس سے برابر کٹی کٹی رہتی۔

ایک بار سکارما بیمار پڑ گیا۔

پچھلے سات مہینوں سے وہ گھر نہیں جا سکا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو چٹھی لکھی کہ "وہ آ کر اُسے گھر لے جائے۔"

دس دن تک تو گھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر یہ چٹھی آئی کہ تین دن بعد اُس کا باپ ڈگار سے لیہہ کے لئے چل پڑے گا۔ لیکن پندرہ دن ہونے کو آئے نہ دوسری چٹھی آئی، نہ اُس کا باپ ہی لیہہ پہنچا۔

کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے سکارما کو ہمیشہ خیال رہتا کہ اُس کا باپ گھوڑے پر سوار ہو کر آ رہا ہو گا۔

کھاٹ پر پڑے پڑے اُس کی آنکھوں میں ڈگار گاؤں کی گلی میں برف کے گھوڑے کا کھیل کھیلتے بچے گھوم جاتے۔ اِن بچوں میں چھومو بھی ہوتی۔ کلپنا کے چتر پٹ پر چھومو کا مسکراتا ہوا چہرہ اُبھرتا۔ جیسے چھومو کہہ رہی ہو۔ "اب وہ سکارما کو کبھی بدھو سمجھنے کی بھول نہیں کرے گی۔ برف کے گھوڑے کا کھیل کھیلنے و

ـبھی جیسے اُس کے کانوں میں گونجنے لگتا "اے بُوڑھی ستو! سورج کیلئے
د۔ بالی کے تیر مار دو۔ گھور کالے بادل کا سر توڑ دو۔ سر توڑ دو" پھر ایک دن
ہنچا۔ اُسے اِس بات کا افسوس تھا کہ گھر سے چلتے ہوئے دیر ہو گئی "گھر کی
و باندھ کر رکھتی ہیں بیٹا! گھر کے کام ختم ہونے ہی میں نہیں آتے" اُس کو
یا۔ تمھاری ماں تو ہر روز زور دیتی تھی کہ سب کام چھوڑ کر چلے جاؤ! ابھی
ا چلے جاؤ!"

دیکیا کہا تھا ماں نے؟"

ُس نے کہا تھا سکارما کو لے کر آنا!"

ور چھومو نے کیا کہا تھا؟"

چھومو نے کہا تھا...." کہتے کہتے باپ رُک گیا۔

بتاتے کیوں نہیں، کیا کہا تھا چھومو نے؟"

چھومو نے ــ چھومو نے۔ چلو جانے دو۔ چھوڑو اُس کی بات۔ وہ نری
!"

"پگلی بھی کیوں نہ ہو چھومو" سکارما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جیسے برف پیار کی آگ سے پگھلنے لگی "آخر وہ میری بہن ہے!"

"یہ تو سارا گاؤں جانتا ہے اور پھر چھومو کیا یہ نہیں جانتی؟" باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے "اُس کیلئے چاند کا راجکمار دولھا بن کر آئے گا تو اِسی بات کو سامنے رکھ کر چھومو کا بھائی سکارما تحصیلدار بننے جا رہا ہے"

"پر یہ تو بتاؤ کہ چھومو نے کیا کہا تھا؟"

"چھومو نے ــ چھومو نے" باپ رُک رُک کر کہا۔ "نہ پوچھتے تو اچھا تھا۔ پوچھتے ہو تو بتاتا ہوں۔ چھومو نے.... چھومو نے تو کہا تھا سکارما.... چھومو نے کہا تھا.... سکارما.... ٹھاگر گاؤں میں نہ آئے!"

سکارما کچھ نہ بولا لیکن باپ کے منھ سے چھومو کا یہ بول سُن کر بھی اُسکی کلپنا میں چھومو کی تصویر گھوم گئی۔ جیسے وہ برف کے گھوڑے پہ سوار بازو اُچھال اُچھال کر کہہ رہی ہو۔

"پربت پہ چمک رہا سورج، اب چلو برف کے گھوڑے!"

تیرے شہر میں

از

جناب پریم وار برٹنی

تجھ سے ملنے کی دل آویز تمنا لے کر | آج پھر تیرے حسیں شہر میں آیا ہوں میں
کچھ نئے غم بھی اُٹھائے ہیں نئے صدمے بھی | اپنے سینے میں نئے زخم بھی لایا ہوں میں

○

میری تقدیر میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں | پھر بھی ہنستی ہوئی کلیوں سے محبت ہے مجھے
تیری سکھیاں تری ہمجولیاں رہتی ہیں یہاں | اِس حسیں شہر کی گلیوں سے محبت ہے مجھے

○

اِنہی گلیوں اِنہی کوچوں کے تقدس کی قسم | اِنہی مخمور فضاؤں میں اِنہی راہوں میں
تُو نے اقرار محبت کا کیا تھا مجھ سے | جھول کر میرے تخیل کی جواں باہوں میں

○

تُو نے لکھے تھے محبت کے دل آویز خطوط | تُو نے کھائی تھی قسم موت سے ٹکرانے کی
سُن کے شہنائی کی آواز ترے گھر سے مگر | ہر کڑی ٹوٹ گئی پیار کے افسانے کی

○

گھیر رکھا ہے ستم کوش حصاروں نے تجھے | میں ترے شہر میں ہوں تجھ سے بہت دور نہیں
دو محبت بھری معصوم سی رُوحوں کا وصال | ہم کو منظور سہی وقت کو منظور نہیں

○

اپنے ماحول کو ٹھکرا نہیں سکتی تُو بھی | میں بھی ہیروں سے تری گود نہیں بھر سکتا
کتنے مجبور ہیں نیرنگیٔ حالات سے ہم | تُو بھی مر سکتی نہیں، میں بھی نہیں مر سکتا

○

خون چاٹیں گے محبت کا نہ جانے کب تک | یہ مظالم یہ روایات یہ رسمیں یہ رواج
ہم کو جینا ہے کہ جاری ہے ابھی مشقِ ستم | اپنے مرنے سے نہ ہوگا غمِ دوراں کا علاج

مالیر کوٹلہ — ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مکرمی خوشتر صاحب! آداب و نیاز

سالنامہ کیلئے ایک خاص نظم "تیرے شہر میں" ارسال کر رہا ہوں۔ اگرچہ اسے میری ذاتی زندگی کے تلخ تجربات نے جنم دیا ہے پھر بھی اِس میں محبت کے اجتماعی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو لوگ محبت کی مسلسل ناکامیوں سے گھبرا کر خود کشی کی بات سوچتے ہیں یہ نظم اُن کیلئے تازیانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دو جوان دلوں کی تباہی اور دو زندگیوں کی موت کسی بھی صورت میں محبت کے مجموعی مسائل کا حل نہیں بن سکتی۔ اِسی لئے اِس بات پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ

ع اپنے مرنے سے نہ ہوگا غمِ دوراں کا علاج

اُمید ہے آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ آپ اکثر یاد آتے ہیں اور دوستوں میں آپکا تذکرہ ہوتا ہے مگر عرصے سے آپکا کوئی خط نہیں ملا پہلی فرصت میں اپنے قلم سے خط لکھکر خیریت سے مطلع فرمایئے آپکی تحریر کا منتظر رہوں گا۔ کار لائقہ؟

نیاز آگیں

پریم وار برٹنی

غزل

از

حضرت مولانا اطہر ہاپوڑی

شوخی کا مزا جب ہے کہ ہر ناز نیا ہو
ہر ناز میں انداز ہو، انداز نیا ہو

تم جان اگر ڈال دو تصویر میں میری
اعجازِ مسیحا سے یہ اعجاز نیا ہو

درد اُٹھے دلِ غیر میں تعظیم کو میری
میرے لئے اس بزم میں اعزاز نیا ہو

جو باتوں ہی باتوں میں سُنادے اُنھیں سب حال
ایسا کوئی ہمدردِ سخن ساز نیا ہو

آمیزشِ سَم چاہیے تھوڑی سی دوا میں
اب چارۂ دردِ دلِ ناساز نیا ہو

زاہد تری حوروں میں ادائیں ہیں پُرانی
میرے لئے ہر بات میں انداز نیا ہو

کچھ حضرتِ ناصح کا بھروسا نہیں ہم کو
اُلفت میں ہمارا کوئی ہمراز نیا ہو

سو مرتبہ دیکھا ہے تمھیں پھر وہی پردہ
پردہ تو ہوا اُس سے جو نظرباز نیا ہو

دشمن سے نیا عشق، نیا ربط ہوا ہے
جو ظلم ہو اب خانہ براندازِ نیا ہو

وہ غیر کے پہلو میں ہیں اِس دم فلکِ پیر
چکّر کوئی اب تفرقہ انداز نیا ہو

اطہر تمھیں کیا ہو گیا کیوں ہو گئی وحشت
مجھ سے تو کہو کوئی اگر راز نیا ہو

غزل

از

جناب پروفیسر نفیس سندیلوی

اُس نے ہم کو نہ اِک نظر دیکھا

جذبۂ دل ترا اثر دیکھا

طالبِ دید نے دمِ آخر

کیسی حسرت سے سُوئے در دیکھا

میری اُس دن سے آنکھ ہی نہ لگی

آپ کو جب سے اِک نظر دیکھا

میکدے والوں کے سوا ہم نے

سب کو دُنیا میں بے خبر دیکھا

ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا نفیس

عِشق میں رنج عمر بھر دیکھا

اور سائیں بابا نے کہا

طنزیہ فیچر

از

جناب فکر تونسوی

١ — تعلیم

بہتر نعمت ——— •

اگر تمہارے بچے اَن پڑھ رہ سکتے ہیں تو اس سے بہتر نعمت اور کوئی نہیں ہے۔ ان پڑھ آدمی دیانت دار رہتا ہے، بات کا دھنی ہوتا ہے۔ صاف گو ہوتا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بد دیانت بنیں؟ بزدل بنیں؟ مکّار بنیں؟

بغیر بادشاہوں کے ——— •

اتہاس کی کتاب پڑھنے سے پہلے یہ اطمینان کر لیجئے کہ اُس میں بادشاہوں اور اُن کی باہمی جنگوں کا ذکر ہے کہ نہیں ہے؟ اگر یہ ذکر موجود نہ ہو تو کتاب اٹھا کر نالی میں پھینک دیجئے۔ اور کتاب کے مصنف کو دو چار گالیاں عرض کر دیجئے۔ جس نے بغیر بادشاہوں کے اتہاس کی کتاب لکھ ڈالی۔

پروفیسر کی بے ہوشی ——— •

چند دن پہلے کی بات ہے، حفظانِ صحت پر لیکچر دیتے دیتے ایک پروفیسر اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُسے گزشتہ تین ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ جس کی وجہ سے اُس کی صحت بُری طرح گر گئی تھی۔

سچ کی تلاش ——— •

مجھے وہ گریجویٹ کبھی نہیں بھولتا جس نے ایک ہزار کتابیں پڑھنے کے بعد سادھو کا بانا پہن لیا تھا۔ اور اپنے والدین کے نام یہ چند سطریں چھوڑ گیا تھا "ہر کتاب ایک دوسرے کے خلاف جھوٹ بولتی ہے۔ اس لئے میں سچائی کی تلاش میں کتابوں سے دامن چھڑا کر بھاگ رہا ہوں۔"

دُو اور دُو ——— •

حساب کی کوئی کتاب یہ نہیں بتاتی کہ دُو اور دُو کہاں سے اور کیسے حاصل کئے جائیں کہ مل کر چار بن سکیں؟ اس لئے جب تک حساب کی کتابوں میں یہ راز نہ بتایا جائے گا، اُس وقت تک حساب کا علم پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

کرو نہ کرو ——— •

اے لوگو! علم حاصل کرو کیونکہ علم کے بغیر انسان اندھا ہے۔ اور اے لوگو! علم حاصل نہ کرو کیونکہ جو انسان علم حاصل کر لیتا ہے وہ دوسرے انسان کو اندھا بنانے لگتا ہے۔

پیارے لعل ——— •

ایک طالب علم نے فلسفہ، سائنس، ہسٹری اور جیومیٹری پر دنیا بھر کی کتابیں چاٹ ڈالیں۔ لیکن وہ ساری زندگی کسی محبوب کے پیار کے دو بول کو ترستا رہا۔

مسکراؤ ننھے! ——— •

ایک بہت بڑا عالم ایک چھوٹے سے بچے کے سامنے گڑگڑا کر کہہ رہا تھا "مسکراؤ ننھے! ذرا مسکرا دو۔ کیونکہ میں علم پڑھ کر مسکرانا بھول گیا ہوں" یہ سن کر

تھا سکر لے کو بجائے زار و قطار رونے لگا۔

دو آتشہ علم ———— •

اے لوگو! پہلے یہ علم سیکھو کہ کسی مکان کو آگ کیونکر لگائی جاتی ہے؟ اور اسکے بعد یہ علم سیکھو کہ وہ آگ بجھائی کیونکر جا سکتی ہے۔ دونوں طرح کے علم سیکھو۔ تاکہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔

۲ ——— محبّت

گھومتی ہوئی نگاہیں ———— •

ایک نوجوان حسینہ ایک فٹ پاتھ پر آن کھڑی ہوئی۔ ساری نگاہیں اُس حسینہ پر جم گئیں۔ نوجوان حسینہ نے درخت پر بیٹھے ہوئے کوّے کی طرف دیکھا۔ ساری نگاہیں کوّے پر جم گئیں۔ نوجوان حسینہ نے بجلی کے کھمبے کی طرف دیکھا۔ ساری نگاہیں بجلی کے کھمبے کی طرف چلی گئیں۔ نوجوان حسینہ نے ملبے کے ایک ڈھیر کی طرف دیکھا۔ ساری نگاہیں ملبے کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اور نوجوان حسینہ نے ایک نوجوان مرد کی طرف دیکھا۔ اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ——— اور ساری نگاہیں اُس نوجوان مرد کی طرف گھوم گئیں۔ اور اُس کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے اُسے کھا جائیں گی۔

عادت ———— •

"ہیلو رشید ———!"

"ہیلو ہیش ———!"

ایک ہوٹل میں اچانک پندرہ سال کے بچھڑے ہوئے دو دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں بے ساختہ فرطِ محبت سے چُور چُور ہو کر اُٹھے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ پُرانی محبت کی یادیں اُن کی رگ رگ سے پھوٹ نکلیں۔ اور جب وہ مل کر الگ ہوئے تو دونوں کے بٹوے ایک دوسرے کی جیب میں پہنچ چکے تھے۔ کیونکہ اُن پندرہ برسوں میں وہ عادی جیب کترے بن چکے تھے۔

سالم محبت ———— •

دکھا ہیں تمھیں ——— ایک ہاتھ پاؤں مکمل حالت میں مل سکتی ہے۔ ایک سوٹ کیس مکمل حالت میں مل سکتا ہے۔ ایک مرغی مکمل حالت میں مل سکتی ہے لیکن محبت کبھی بھی مکمل حالت میں نہیں مل سکتی! اِس کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن میں کہتا ہوں اگر محبت تمھیں اپنی پوری اور سالم شکل میں مل جائے تو تمھارا سارا لطف ادا کرا ہو جائے اور محبت پیدا کرنے والے خدا پر سے تمھارا یقین اُٹھ جائے۔

درخت اور پھل ———— •

جب تک تمھیں کسی سے محبت نہ ہو، تم اُس سے نفرت کیسے کر سکو گے؟ مجھے اُن لوگوں پر ہمیشہ رحم آتا ہے جو محبت کئے بغیر نفرت کا پروگرام بنا لیتے ہیں اور ہمیشہ اُن کی نفرت کا محل دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے۔ کیونکہ نفرت کا پھل تو ہمیشہ محبت کے درخت پر لگتا ہے۔

شادی بمع محبت ———— •

صرف اُسی نوجوان لڑکی سے محبت کا آغاز کرو جس سے بعد میں شادی کر سکو۔ اور یاد رکھو، کسی ایسی نوجوان لڑکی سے شادی نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ کیونکہ محبت ایک ایسا شجرِ ممنوعہ ہے جس کا پھل کھاتے ہی آدمؑ اور حواؑ کو جنت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا۔ اور اُس کے بعد اُن کی شادی کر دی گئی۔ آہ! محبت اور شادی دونوں کا خمیازہ نسلِ انسانی آج تک اُٹھا رہی ہے۔

زلفوں کا قیدی ———— •

دیکھئے، وہ سامنے ایک کافر ادا دوشیزہ چھت پر کھڑی ہو کر دھوپ میں اپنی زُلفیں سُکھا رہی ہے اور جوشِ محبت سے آپ کا دل اُچھل کر لبوں تک آ پہنچا ہے۔ یہ آپ کی نری حماقت ہے۔ آپ اپنے دل کو قابو میں رکھنے کا ڈھنگ سیکھئے۔ کیونکہ یہ دوشیزہ بال سُکھانے کا بہانہ کر کے صرف اِسلئے چھت پر آئی ہے کہ اُس کے عین سامنے کھڑکی میں اُس کا محبوب کھڑا ہے۔ آپ کا دل دوشیزاؤں کی زلفیں لہراتے دیکھ کر ہمیشہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ اُسے سمجھا دیجئے کہ ہر زلف کی زنجیر آپ ہی کے دل کو باندھنے کیلئے نہیں لہراتی۔

۳ ــــ مذہب

بانی اور پیروکار ــــــ •

اے لوگو! ہر مذہب کے بانی کو احترام کے ساتھ یاد کرو لیکن اُس مذہب کے پیروکار کے سینے میں چاہے خنجر اُتار دو۔ کیونکہ اگر تم اُس مذہب کے بانی کے خلاف ایک بھی نازیبا لفظ کہو گے تو اُس مذہب کے پیروکار تمھاری تکا بوٹی کر دیں گے۔ مذہب میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ اپنے بانی اور پیروکار میں بھی امتیاز روا رکھتا ہے۔

میرا مذہب ــــــ •

میری شریمتی میری میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس میں ہے۔ جو نہایت خوبصورت ہے۔ نہایت صحیح وقت دیتا ہے اور مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتا ــــــ تو کیا میں اپنے ٹائم پیس کو اپنا مذہب مان لوں؟

شہید ــــــ •

"تمھارے مذہب نے انسان کو بزدلی سکھائی ہے"

"اور تمھارے مذہب نے انسان کو خونخوار بنا دیا ہے"

"تم بکواس کرتے ہو۔ ہم خونخوار نہیں ہیں۔ بہادر ہیں"

"بکواس تم کرتے ہو۔ کیونکہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ شریف ہیں"

"تم میرے مذہب کی توہین کر رہے ہو"

"اور تم ہمارے مذہب کو ذلیل کر رہے ہو"

"تم اپنی بک بک بند کر دو"

"اور تم بھی بند کر دو!!"

یہ کہہ کر دونوں نے بک بک بند کر دی۔ اور پتھر اُٹھا کر ایک دوسرے کے سر پھوڑ ڈالے۔ اور پھر دونوں مذہب کے شہید بنا کر دفن کر دیئے گئے۔

نئے نئے مذہب ــــــ •

ایک دن میں نے صبح سے شام تک مذہب کے تمام اصولوں پر عمل کیا اور شام کے بعد میری یہ حالت ہو گئی کہ کوئی بھی انسان مجھے مُنھ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے دنیا کو مُنھ دکھانے اور مُنھ کا مزہ بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ نئے نئے مذہب ایجاد ہوتے رہیں۔ تاکہ کسی بھی مذہب کو اپنے اصولوں پر پوری طرح عمل کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

سر اور دھڑ ــــــ •

ایک دوست نے مجھ سے پوچھا "تم کون سے مذہب سے تعلق رکھتے ہو؟" میں نے جواب دیا "مذہب انسانیت سے"۔ یہ سُن کر میرے وہ دوست ہنس دیئے۔ میں نے پوچھا "ہنسے کیوں؟" تو بولے "ہر مذہب کا کوئی نہ کوئی پیغمبر ہوتا ہے۔ لیکن تمھارے مذہب کا تو کوئی پیغمبر ہی نہیں ہے۔ اور میں ہنسا اسلئے ہوں کہ تم بغیر سر کے اپنا دھڑ لئے پھرتے ہو" میں واقعی شرمندہ ہو گیا۔ اور کیا کرتا؟

میرا دعویٰ ــــــ •

ہر مذہب والا دوسرے مذہب والے سے بہتر کرنا سکھاتا ہے۔ اور جو لوگ اس بات کو نہیں مانتے وہ یا تو انتہائی شریف ہیں یا جاہل۔

چاند کا غم ــــــ •

ایک مذہب والے نے ایک دن چاند سے پوچھا۔ "چاند! تمھارا کون سا مذہب ہے؟" چاند نے کہا "تاریک آسمان پر چمکنا ہی میرا مذہب ہے"۔ اُس مذہب والے نے خوش ہو کر کہا "پھر تو تم ہمارے ہی مذہب میں شامل ہو"۔ یہ سُنتے ہی چاند غمگین ہو گیا اور ایک بدلی نے چاند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔

تلوار کے کرتب ــــــ •

مذہب ایک تیز دھار تلوار ہے۔ جو دولت مند کے ہاتھ میں آئے تو اُسے حاکم بنا دے اور غریب کے ہاتھ میں آئے تو اُس کی اپنی گردن کاٹ دے ــــــ آپ ناراض نہ ہوں میں تلوار کو تلوار ہی سمجھتا ہوں۔ پھول نہیں!

۴ ــــ سیاست

ڈر کس سے ہے؟

میں اُس سیاست داں سے کبھی نہیں ڈرتا جو اپنے دشمن سے دشمن کا سا سلوک کرتا ہے۔ بلکہ میں تو صرف اُس سیاست داں سے ڈرتا ہوں جو دشمن کے ساتھ دوست کا سلوک کرتا ہے اور اُسے دشمنی کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔

خطرہ

اگر تم کامیاب سیاست داں بننا چاہتے ہو تو دُنیا کو ہمیشہ جُل دیتے رہو یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی جُل دیتے رہا کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تمہارے اپنے اندر بھی کوئی کھرا اور سچا آدمی چھپا ہوا ہو۔

ایک عذاب

اے اللہ کے سادہ لوح بندو! سیاست کے بغیر تمہاری نجات نہیں۔ اور تمہارے بغیر سیاست بیکار چیز ہے۔ تم عجیب مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو۔ اس لئے کبھی کبھی رات کی تنہائی میں لیٹ کر یہ ضرور سوچا کرو کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر کیوں نہیں جی سکتے؟ آخر کب تک ایک دوسرے پر عذاب کی طرح ٹوٹتے رہوگے؟؟؟

لازم و ملزوم

میں نے ایک سیاست داں سے پوچھا۔

"تم نے ڈھٹائی کہاں سے سیکھی؟"

وہ بولا "سیاست سے"

"اور سیاست کہاں سے سیکھی؟"

"ڈھٹائی سے!"

ایک چیلنج

دُنیا بھر کے تمام سیاست دانوں سے جاکر کہہ دو، اگر وہ ایک بار بھی صاف گوئی سے کام لے لیں تو دُنیا انھیں دو کوڑی کا آدمی بھی نہ سمجھے۔

دل کا مطالبہ

ایک حسین لڑکی نے ایک سیاست داں سے کہا۔ "تم مجھے اپنا دل دے دو"

لیکن سیاست داں نے یہ سوچا کہ یہ میرا دل آخر کیوں لینا چاہتی ہے؟ اس مطالبے کے پیچھے کون سی طاقتیں کام کر رہی ہیں؟ میرے دل کی بدولت طاقت کے توازن میں کیا تبدیلی آجائے گی؟ اور مستقبل میں میرے دل کے اثرات اُس کے حُسن اور میرے عشق میں کیا کریں گے؟ اور کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ یہ میرا دل پاکر میرے کسی رقیب کو دکھادے اور وہ دل کی کمزوریوں سے آگاہ ہوکر مجھ پر کوئی سخت وار کردے۔

سیاست داں نے دل دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ بعد میں اُسے بتایا گیا کہ اُس کے پاس تو دل ہی نہیں ہے!

افسانہ

دو جُوتے

از

جناب عادل رشید

فقیر محمد بلڈنگ۔ مروشی روڈ۔ ماڈول بمبئی ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء

خوشتر بھائی! مزاج شریف

آپ کا گرامی نامہ ملا تھا۔ جواب میں تاخیر کا باعث بڑی حد درجہ مصروفیت تھی۔ دہلی سے آتے ہی یکے بعد دیگرے کئی پروڈیوسر گھر پر آدھمکے۔ اور کئی فلموں کے کنٹریکٹ ہاتھ لگ گئے اور اب اُن فلموں کے اسکرپٹ میں سر کھپا رہا ہوں۔ —— "قیدی" اینگل فلمز کی تصویر ہے جو تین چوتھائی مکمل ہو چکی ہے۔ اور خاصی بن رہی ہے۔ اس کے مکالمے میں نے لکھے ہیں —— "فرشتہ" دھیرو بھائی ڈیسائی کا۔ ان کے گانے ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ کہانی اور مکالمے میرے ہیں —— "بمبئی ریس کورس" پی۔ ایم۔ فلمز کی تصویر ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی ہے۔

لیکن دیکھئے میں آپ کو اور اپنے "بیسویں صدی" کو نہیں بھولا۔ وقت نکال کر آپ کے لئے کہانی لکھی۔ اور اب اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ اور پھر میں "بیسویں صدی" کو بھول بھی کیسے سکتا تھا۔ افسانہ نمبر میں "حُسن جو رُوح میں ہے" لے کر پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہوا۔ اور اس کہانی کے سلسلے میں مجھے اب تک سو سے زیادہ خطوط موصول ہو چکے ہیں۔ خطوط جو ہندوستان سے آئے تھے۔ اور وہ خطوط، جو پاکستان سے ملے۔ اور وہ بھی بیرونِ ہند سے ملے، مجھے اس حقیقت کا اندازہ لگانے میں معاون ثابت ہوئے کہ ماشاء اللہ "بیسویں صدی" کتنا مقبول کتنا ہمہ گیر ہے۔ اسے کن کن حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ بہت ہی خوش ذوق اور بلند خیال حلقہ ہے صاحب اس رسالے کا۔ میں مان گیا۔ اور اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ اب تک میں نے اس میں کیوں نہیں لکھا تھا۔ کاش آپ کی محبت اور آپ کا خلوص مجھے اس سے پہلے ہی اسمیں لکھنے پر آمادہ کر چکا ہوتا!

"حُسن جو رُوح میں ہے" چھپنے کے بعد جب "بیسویں صدی" کا دوسرا اور تیسرا شمارہ آیا تو خطوط آنے شروع ہوئے کہ آپ نے "بیسویں صدی" میں لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟ —— اور اب پڑھنے والے دوستوں اور چاہنے والوں کی خواہش کا احترام کیسے نہ ہوتا —— یہ کہانی "دو جُوتے" شاید آپ کو بھی پسند آئے۔ اور اگر پسند آگئی تو میرے خوش ذوق پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش فرما دیجئے

آپ کے لئے ناول جلد شروع کر دوں گا —— ۲۶ر دسمبر سے آپ کے شہر دہلی میں ایشین کانفرنس ہو رہی ہے شرکت ضروری ہے۔ اور پھر آپ کی ملاقات بھی۔ اور اس بار آپ کی دعوت پکّی رہی۔

آپ کا اپنا —— اور اپنے پڑھنے والوں کا بھی

عادل رشید

جگموہن بمبئی آگیا تھا۔ مسوری جیسی خوبصورت جگہ چھوڑ کر وہ بمبئی کیوں آیا؟ بس یہ نہ پوچھئے۔ فلم کا شوق! بھائیوں نے تو بی۔اے اور ایم۔اے کے بعد بزنس سنبھال لئے۔ اور یہ بی۔اے کے بعد بمبئی آگیا۔ دادر مین روڈ کے اُس نے اتنے چکر کاٹے کہ اُس کے کئی جوڑ جوتے گھس گئے۔ جوتے گھستے رہے۔ لیکن جگموہن کی ہمت میں ایک ہلکی سی خراش بھی نہ پڑی۔ وہ ہر روز صبح سے شام تک دادر مین روڈ کی ہر فلم کمپنی میں چکر لگاتا۔ اسٹوڈیو کے مہنگے ہوٹلوں میں اپنی غرض کے لئے اسسٹنٹ ڈائرکٹروں، اکسٹرا سپلائیروں اور پروڈکشن منیجروں کو کھانا کھلاتا۔ فلمی رائٹر جو ازل سے ننگے اور بھوکے ہوتے ہیں اب اکثر و بیشتر جگموہن ہی کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اور لقمہ چبا کر یہ وعدہ کرتے جاتے کہ جس طرح بھی ہو وہ اس بار اُسے ضرور اپنی کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر سے کہہ کر اُسے کوئی نہ کوئی کام دلا دیں گے جگموہن پڑھا لکھا تھا۔ خوبصورت تھا اور اچھے ڈیل ڈول کا نوجوان تھا لیکن اُسے کسی فلم کمپنی میں کسی پروڈیوسر یا کسی ڈائرکٹر نے کوئی کام نہ دیا۔ فلمی چمچے اُس کے ساتھ کھاتے پیتے رہے ہنستے بولتے رہے۔ لیکن اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو اُسے کام دلا سکتا۔ اور اب خود جگموہن بھی جیسے یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اُسے کسی کے ذریعے کوئی کام نہ مل سکے گا۔ اور اب اُس کی جیب بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ اِس لئے اُس نے تھک کر فلم کمپنیوں کے طواف کم کر دیئے تھے۔ اور اب وہ زیادہ تر اپنی کھولی ہی میں پڑا رہتا تھا۔

اچانک ایک دن اُس کا دوست منوہر لال آیا اور اُس نے اُسے یہ خوشخبری سنائی کہ اگر وہ چاہے تو اُسے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دے سکتا ہے۔ اور جگموہن نے اپنے دوست منوہر لال اکسٹرا سپلائیر کی یہ پیش کش قبول کر لی۔ اور اب وہ بے کاری کے دور سے نکل چکا تھا۔

وہ صبح سے رات گئے تک، اور کبھی دن رات اپنے دوست منوہر لال کے ساتھ اکسٹرا آرٹسٹوں کی چھان بین میں لگا رہتا۔ اکسٹرا لڑکوں اور لڑکیوں کو چھانٹ چھانٹ کر فلم کمپنیوں میں لے جاتا۔ اُن کا میک اَپ کراتا۔ سیٹ پر انھیں ڈائرکٹر کے سامنے پہنچاتا اور کبھی کبھی تو اُسے یہ فرائض بھی انجام دینے پڑتے کہ وہ اُن اکسٹرا آرٹسٹوں کو ڈائیلاگ بھی یاد کرائے۔

اور سچ بات یہ ہے کہ جگموہن کو شروع شروع میں اِس کام میں بڑا فائدہ ہوا مہینے کے ڈھائی تین سو روپے اُس کے حصے کے کہیں نہیں گئے تھے۔ منوہر لال ہر مہینے اُسے اُس کے حصے کا روپیہ دے دیتا تھا اور کام بڑے مزے میں چل رہا تھا۔

جگموہن بی۔اے پاس تھا۔ اچھے گھر اور اچھے خاندان کا لڑکا تھا [illegible] پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کے ساتھ بات کرنے میں جھجک نہ ہوتی تھی۔ [illegible] منوہر لال کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آسانی سے کر لیتا تھا۔ پہلے پروڈیوسروں سے [illegible] میں اُسے کبھی کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ وہ کام اتنے اچھے طریقے سے اور اتنی خوبی کے ساتھ کیا کرتا تھا کہ اُس سے سبھی خوش رہتے تھے۔ وہ بہت جلد پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں اور جونیئر آرٹسٹوں میں ہر دل عزیز ہو گیا۔ اور اِس ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اُسے یہ انعام ملا کہ جل کر اُسے اُس کے دوست اور پارٹنر منوہر لال نے اپنی کمپنی سے الگ کر دیا۔ اور اب ایک بار پھر جگموہن بیکار ہو گیا۔ اور اِس بار اُسے اِس اکسٹرا سپلائیری کا اتنا تلخ تجربہ ہوا کہ اُس نے اِس کام سے توبہ کر لی۔

اور پھر ایک سندھی ڈائرکٹر نے اُسے پروڈکشن منیجری آفر کی۔ وہ فاقوں سے تنگ آچکا تھا۔ اِس لئے اُس نے اِس آفر کو قبول کر لیا۔ اور اب جگموہن پروڈکشن منیجر تھا اُس نے اِس کام کو بہت ہی محنت اور بڑی دیانت داری کے ساتھ کیا۔ اُس نے ڈیپارٹمنٹ میں آکر ہر کام کیا لیکن کسی جگہ سے ایک پیسہ اُس نے نہیں کھایا۔ اگر کسی نے کسی کام کے لئے کمیشن کی بات کی تو اُس نے جھٹ اِس بات سے فائدہ اُٹھا کر کمپنی کا فائدہ کرا دیا ہزار کی جگہ کمپنی کا کام آٹھ سو میں چل گیا۔ اور جگموہن کی باچھیں کھل گئیں۔ لیکن اُس کے سندھی پروڈیوسر نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ایک آرٹسٹ نہیں مل سکتا تھا۔ جگموہن اپنی میٹھی زبان اور اپنے برتاؤ کے بل بوتے پر اُسے لے آیا۔ شوٹنگ ہو گئی۔ لیکن جگموہن کو اِس کا کوئی کریڈٹ نہ ملا۔ اُلٹا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ جگموہن نے ضرور اِس آرٹسٹ کی پےمنٹ میں اپنا کمیشن مار لیا ہو گا۔ اِس لئے کہ یہ اِس لائن کا بندھا ٹکا اُصول ہے کہ پروڈکشن منیجر پیسے کھاتا ہے۔ اور اگر وہ نہ بھی کھائے جب بھی وہ اِس پیشے کی برکت سے اِس الزام سے بچ نہیں سکتا۔

جگموہن بمبئی کی فلم انڈسٹری کا مانا ہوا پروڈکشن منیجر بن گیا۔ لیکن اِس سے اُس کی ذات کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پروڈیوسر ہر جگہ اُس کی تنخواہ مارتے رہے اور وہ اُن کا کام کر کر کے دیانت داری برتتا رہا۔ اور فاقے کرتا رہا۔ ایک ڈریس میکر نے اُس سے کہا۔

"جگموہن جی! تم پندرہ فیصدی کمیشن لے لینا۔"

اور وہ جھٹ سے بول پڑا۔

"تم پندرہ فیصدی میری کمپنی کو چھوڑ دینا۔"

"ساؤ!" ڈریس ڈیپارٹمنٹ کا منیجر غرّایا۔

"تم جمالا ریٹ غرایب کرتا ہے!

"تم جگموہن کسم ساری جندگی پروڈکشن منیجری کروگے۔ اور سوکوں مروگے۔"

دیجی موکل جی ڈریس والا نغصارت سے تھوک کر کہا۔ اور جگموہن مسکرا دیا۔

یہ فلم والے جگموہن کی شرافت اور ایمانداری پر اسی طرح مسکراتے ہیں۔ اور وہ کام کرتا رہا۔ اس نے فلم لائن میں آکر صرف کام کیا۔ اور محنت کی۔ اور اس کے علاوہ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کہ اس لائن کا طرّۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

"یار جگموہن!"

اُس کے ایک ڈائرکٹر دوست نے اُس سے کہا۔

"ہم لوگ چاندنی برج پر اپنی آؤٹ ڈور شوٹنگ رکھ رہے ہیں۔ تم بھی ساتھ چلنا۔ جام شراب کے ساتھ اُس نئی آئی ہوئی سندر حسن لونڈیا کا حُسن گھول گھول کر پینے میں الطف آئے گا۔"

اور ڈائرکٹر کی اس بات پر جگموہن مسکرا دیا۔

"یہاں تو جام شراب ہی کو ہم نے کبھی مُنہ نہیں لگایا۔ پھر لونڈیا کا حُسن گھول کر پینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

"تم یکدم ڈفر ہو یار!" سندھی ڈائرکٹر جس کے بال سن کی طرح سفید ہو چکے تھے ذرا سا منہ بنا کر بولا۔ "تو سالا کبھی اس لائن میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"اگر اس لائن میں آگے بڑھنے کے لئے شراب کے ساتھ جوان اور خوبصورت لونڈیا کا حُسن گھول کر پینا پڑتا ہے تو میں یقیناً آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔"

"جگموہن صاحب!" ایک بالکل نئے آئے ہوئے فلم زدہ نوجوان نے اُس سے کہا۔ جس طرح بھی ہو مجھے فلم کا ہیرو بنوا دو۔ میں آپ کی زندگی بھر غلامی کروں گا۔"

"مگر بھئی!" جگموہن بہت ملائمیت سے بولا۔ "آپ فلم کے ہیرو نہیں بن سکتے۔ آپ کا فیس اور آپ کی پرسنیلٹی اس کے بالکل منافی ہیں۔ اس لائن میں پڑ کر زندگی تباہ کرنے کے بجائے کسی اور جگہ کام کی تلاش کیجئے۔ آپ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ابھی تو شاید آپ کو گورنمنٹ سروس بھی مل سکتی ہے۔ وہاں کوشش کیجئے۔"

اور اُس کے اس جواب پر وہ نوجوان اپنی پہلی ہی ملاقات میں حد سے زیادہ بے تکلف ہوتے ہوئے بولا۔

"یار تم تو ٹال رہے ہو!"

"میں آپ کو صحیح راستہ بتا رہا ہوں!"

وہ اور نزدیک کھسک آیا۔

"یار شام کو گھر پہ آؤ نا۔ تو سی رو ٹی شوٹی بھی اُدھے ہی کھانا بادشاہو! میری بہن بھی میرے ساتھ ہے۔ اتنی خوبصورت ہے کہ دیکھ کر دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

اور نو وارد کے اس حسین آفر پر جگموہن تلملا کر رہ گیا۔ اور بولا۔ "بھائی صاحب آپ نے فلم لائن کے بارے میں بہت غلط قسم کی باتیں یاد کر رکھی ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں کہتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔"

اور پھر وہ اُس نوجوان کو چھوڑ کر سیٹ نمبر ۲ پر چلا گیا۔ جہاں اُس کی زیرِ تکمیل فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ وہ سیٹ پر پہنچ گیا۔ اور اِدھر یہ فلم زدہ نوجوان زور سے زمین پر تھوک کر بولا۔ "فلم میں رہ کر بھگلا بھگت بنتا ہے سالا۔ سمجھتا ہے کہ میں اِن فلم والوں کو نہیں جانتا۔"

اور پھر اُس نے بھی اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"خاک ترقی کرےگا یہ اس لائن میں۔"

اور واقعی جگموہن نے اس فلم لائن میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ وہ اُسی طرح پروڈکشن منیجری کرتا رہا۔ اور یہ فلم زدہ نوجوان جو اُس دن جگموہن کے پاس اندھیری اسٹیشن سے ایم اینڈ ٹی اسٹوڈیوز تک پیدل چل کر آیا تھا ایک دن ایم اینڈ ٹی اسٹوڈیو میں اپنی ذاتی کار پر سوار ہو کر دندناتا ہوا اندر آیا۔ وہ تو ہیرو نہیں بن سکا تھا۔ لیکن اُس کی بہن ہیروئن ضرور بن گئی تھی۔ وہ گاڑی سے اُتر کر رس گُلّے کھانے لگا اور اُس کی بہن کو ڈائرکٹر مہروان کھسروا اپنے ساتھ اپنی گاڑی پر لے کر سنیما چلے گئے۔ اُس کا ڈرائیور اُس کے پاس آکر بولا۔ "صاحب! میم صاحب کہہ گئی ہیں کہ رات کو وہ گھر نہیں آئیں گی۔ مہروانی کھسروا رات بھر اپنے گھر پر ڈائیلاگ کی ریہرسل کرائیں گے۔ کل صبح اُن کی شوٹنگ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ نوجوان بولا۔ اور دل میں کہا۔ کام کی اسی سچی لگن نے تو مجھے یہ گاڑی دلائی ہے۔ اسی طرح لگن سے دن رات کام کرتی رہی تو نئی بیوک کے آنے میں دیر نہ لگے گی۔ اور وہ پھر رس گُلّے کھانے لگا۔

جگموہن بمبئی آگیا تھا۔ مسوری جیسی خوبصورت جگہ چھوڑ کر وہ بمبئی کیوں آیا؟ بس یہ نہ پوچھئے۔ فلم کا شوق! بھائیوں نے تو بی اے اور ایم اے کے بعد بزنس سنبھال لئے۔ اور یہ بی اے کے بعد بمبئی آگیا۔ دادر میں روڈ کے اُس نے اتنے چکر کاٹے کہ اُس کے کئی جوڑ جوتے گھس گئے۔ جوتے گھستے رہے۔ لیکن جگموہن کی ہمت میں ایک ہلکی سی خراش بھی نہ پڑی۔ وہ ہر روز صبح سے شام تک دادر میں روڈ کی ہر فلم کمپنی میں چکر لگاتا۔ اسٹوڈیو کے مہنگے ہوٹلوں میں اپنی غرض کے لئے اسسٹنٹ ڈائرکٹروں، اکسٹرا سپلائیروں اور پروڈکشن منیجروں کو کھانا کھلاتا۔ فلمی رائٹر جو ازل سے ننگے اور بھوکے ہوتے ہیں اب اکثر و بیشتر جگموہن ہی کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اور لقمہ چبا کر یہ وعدہ کرتے جاتے کہ جس طرح بھی ہو وہ اِس بار اُسے ضرور اپنی کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر سے کہہ کر اُسے کوئی نہ کوئی کام دلا دیں گے۔ جگموہن پڑھا لکھا تھا۔ خوبصورت تھا اور اچھے ڈیل ڈول کا نوجوان تھا۔ لیکن اُسے کسی فلم کمپنی میں کسی پروڈیوسر یا کسی ڈائرکٹر نے کوئی کام نہ دیا۔ فلمی چمچے اُس کے ساتھ کھاتے پیتے رہے ہنستے بولتے رہے۔ لیکن اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو اُسے کام دلا سکتا۔ اور اب خود جگموہن بھی جیسے یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اُسے کسی کے ذریعے کوئی کام نہ مل سکے گا۔ اور اب اُس کی جیب بھی ہلکی ہوگئی تھی۔ اِس لئے اُس نے تھک کر فلم کمپنیوں کے طواف کم کردیئے تھے۔ اور اب وہ زیادہ تر اپنی کھولی ہی میں پڑا رہتا تھا۔

اچانک ایک دن اُس کا دوست منوہر لال آیا اور اُس نے اُسے یہ خوشخبری سنائی کہ اگر وہ چاہے تو اُسے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقعہ دے سکتا ہے۔ اور جگموہن نے اپنے دوست منوہر لال اکسٹرا سپلائیر کی یہ پیش کش قبول کرلی۔ اور اب وہ بے کاری کے دور سے نکل چکا تھا۔

وہ صبح سے رات گئے تک، اور کبھی دن رات اپنے دوست منوہر لال کے ساتھ اکسٹرا آرٹسٹوں کی چھان بین میں لگا رہتا۔ اکسٹرا لڑکوں اور لڑکیوں کو چھانٹ چھانٹ کر فلم کمپنیوں میں لے جاتا۔ اُن کا میک اپ کرتا۔ سیٹ پر اُنھیں ڈائرکٹر کے سامنے پہنچاتا اور کبھی کبھی تو اُسے یہ فرائض بھی انجام دینے پڑتے کہ وہ اُن اکسٹرا آرٹسٹوں کو ڈائیلاگ بھی یاد کرا دے۔

اور سچ بات یہ ہے کہ جگموہن کو شروع شروع میں اِس کام میں بڑا فائدہ ہوا مہینے کے ڈھائی تین سو روپے اُس کے حصے کے کہیں نہیں گئے تھے۔ منوہر لال ہر مہینے اُسے اُس کے حصے کا روپیہ دے دیتا تھا اور کام بڑے مزے میں چل رہا تھا۔

جگموہن بی اے پاس تھا۔ اچھے گھر اور اچھے خاندان کا لڑکا تھا۔ پہلے تو اسے پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کے ساتھ بات کرنے میں جھجک ہوتی تھی۔ وہ کام جو اس کی ہوشیار منوہر لال کبھی نہیں کرسکتا تھا، وہ آسانی سے کر لیا کرتا تھا۔ پروڈیوسروں سے روپیہ وصول کرنے میں اُسے کبھی کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ وہ کام اتنے اچھے طریقے سے اور اتنی خوبی کے ساتھ کیا کرتا تھا کہ اُس سے سبھی خوش رہتے تھے۔ وہ بہت جلد پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں اور ہیرو ہیروئن آرٹسٹوں میں ہر دل عزیز ہوگیا۔ اور اِس ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا اُسے یہ انعام ملا کہ جل کر اُسے اُس کے دوست اور پارٹنر منوہر لال نے اپنی کمپنی سے الگ کر دیا۔ اور اب ایک بار پھر جگموہن بیکار ہوگیا۔ اور اس بار اُسے اِس اکسٹرا سپلائیری کا اتنا تلخ تجربہ ہوا کہ اُس نے اِس کام سے توبہ کرلی۔

اور پھر ایک سندھی ڈائرکٹر نے اُسے پروڈکشن منیجری آفر کی۔ وہ فاقوں سے تنگ آچکا تھا۔ اِس لئے اُس نے اِس آفر کو قبول کر لیا۔ اور اب جگموہن پروڈکشن منیجر تھا اُس نے اِس کام کو بہت ہی محنت اور بڑی دیانت داری کے ساتھ کیا۔ اُس نے ہر ڈیپارٹمنٹ میں آکر ہر کام کیا۔ لیکن کسی جگہ سے ایک پیسہ اُس نے نہیں کھایا۔ اگر کسی نے کسی کام کے لئے کمیشن کی بات کی تو اُس نے جھٹ اِس بات سے فائدہ اُٹھا کر کمپنی کا فائدہ کر دیا ہزار کی جگہ کمپنی کا کام آٹھ سو میں چل گیا۔ اور جگموہن کی باچھیں کھل گئیں۔ لیکن اُس کے سندھی پروڈیوسر نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ایک آرٹسٹ نہیں مل سکتا تھا۔ جگموہن اپنی میٹھی زبان اور اپنے برتاؤ کے بل بوتے پر اُسے لے آیا۔ شوٹنگ ہوگئی۔ لیکن جگموہن کو اِس کا کوئی کریڈٹ نہ ملا۔ اُلٹا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ جگموہن نے ضرور اِس آرٹسٹ کی پے منٹ میں اپنا کمیشن مار لیا ہوگا۔ اِس لئے کہ یہ اِس لائن کا بندھا ٹکا اُصول ہے کہ پروڈکشن منیجر پیسے کھاتا ہے۔ اور اگر وہ نہ بھی کھائے جب بھی وہ اِس پیشے کی برکت سے اِس الزام سے بچ نہیں سکتا۔

جگموہن بمبئی کی فلم انڈسٹری کا مانا ہوا پروڈکشن منیجر بن گیا۔ لیکن اِس سے اُس کی ذات کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پروڈیوسر ہر جگہ اُس کی تنخواہ مارتے رہے اور وہ اُن کا کام کر کر کے دیانت داری برتتا رہا۔ اور فاقے کرتا رہا۔ ایک ٹورلیس میکر نے اُس سے کہا۔

"جگموہن جی! تم پندرہ فیصدی کمیشن لے لینا۔"

اور وہ جھٹ سے بول پڑا۔

"تم پندرہ فیصدی میری کمپنی کو چھوڑ دینا۔"

"شٹ اپ!" ڈریس ڈیپارٹمنٹ کا منیجر غرّایا۔

"تم ہمارا ریٹ خراب کرتا ہے؟

"تم جگموہن کسم ساری جندگی پروڈکشن منیجری کروگے۔ اور بھوکوں مروگے۔"

اُدھیڑ عمر ہی ڈریس والا حقارت سے تھوک کر کہا۔ اور جگموہن مسکرا دیا۔

یہ فلم والے جگموہن کی شرافت اور ایمانداری پر اسی طرح مسکراتے رہے۔ اور وہ اپنا کام کرتا رہا۔ اُس نے فلم لائن میں آکر صرف کام کیا۔ اور محنت کی۔ اور اس کے علاوہ اُس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کہ اِس لائن کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

"یار جگموہن!"

اُس کے ایک ڈائرکٹر دوست نے اُس سے کہا۔

"ہم لوگ چاندنی رات میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کر رہے ہیں۔ تم بھی ساتھ چلنا۔ جامِ شراب کے ساتھ اُس نئی آئی ہوئی سندھی لونڈیا کا حُسن گھول گھول کر پینے میں بڑا لطف آئے گا۔"

اور ڈائرکٹر کی اِس بات پر جگموہن مسکرا دیا۔

"یہاں تو جامِ شراب ہی کو ہم نے کبھی مُنہ نہیں لگایا۔ پھر لونڈیا کا حُسن گھول کر پینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟"

"تم یکدم ڈفر ہو یار!" سندھی ڈائرکٹر جس کے بال سَن کی طرح سفید ہو چکے تھے بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "تو سالا کبھی اِس لائن میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"اگر اِس لائن میں آگے بڑھنے کے لئے شراب کے ساتھ جوان اور خوبصورت لونڈیا کا حُسن گھول کر پینا پڑتا ہے تو میں یقیناً آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔"

"جگموہن صاحب!" ایک بالکل نئے آئے ہوئے فلم زدہ نوجوان نے اُس سے کہا۔ جس طرح بھی ہو مجھے فلم کا ہیرو بنوا دو۔ میں آپ کی زندگی بھر غلامی کروں گا۔"

"مگر بھئی!" جگموہن بہت ملائمیت سے بولا۔ آپ فلم کے ہیرو نہیں بن سکتے۔ آپ کا فیس اور آپ کی پرسنیلٹی اس کے بالکل منافی ہیں۔ اِس لائن میں پڑ کر زندگی تباہ کرنے کے بجائے کسی اور جگہ کام کی تلاش کیجئے۔ آپ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ابھی تو شاید آپ کو گورنمنٹ سروس بھی مل سکتی ہے۔ وہاں کوشش کیجئے۔"

اور اُس کے اِس جواب پر وہ نوجوان اپنی پہلی ہی ملاقات میں حد سے زیادہ بے تکلف ہوتے ہوئے بولا۔

"یار تم تو ٹال رہے ہو!"

"میں آپ کو صحیح راستہ بتا رہا ہوں!"

وہ اور نزدیک کھسک آیا۔

"یار شام کو گھر پہ آؤ نا۔ تُوسی روٹی شوٹی بھی اوتھے ہی کھانا بادشاہو! میری بہن بھی ہیرے جیسی ہے۔ اتنی خوبصورت ہے کہ دیکھ کر دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

اور نوجوان کے اِس "حسین آفر" پر جگموہن تلملا کر رہ گیا۔ اور بولا: "بھائی صاحب آپ نے فلم لائن کے بارے میں بہت غلط قسم کی باتیں یاد کر رکھی ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔"

اور پھر وہ اُس نوجوان کو چھوڑ کر سیٹ نمبر ۲ پر چلا گیا۔ جہاں اُس کی زیرِ تکمیل فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ وہ سیٹ پر پہنچ گیا۔ اور ادھر یہ فلم زدہ نوجوان زور سے زمین پر تھوک کر بولا "فلم میں رہ کر بھگلا بھگت بنتا ہے سالا۔ سمجھتا ہے کہ میں اِن فلم والوں کو نہیں جانتا!"

اور پھر اُس نے بھی اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"خاک ترقی کریگا یہ اِس لائن میں۔"

اور واقعی جگموہن نے اِس فلم لائن میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ وہ اُسی طرح پروڈکشن منیجری کرتا رہا۔ اور یہ فلم زدہ نوجوان جو اُس دن جگموہن کے پاس اندھیری اسٹیشن سے ایم اینڈ ٹی اسٹوڈیوز تک پیدل چل کر آیا تھا ایک دن ایم اینڈ ٹی اسٹوڈیو اپنی ذاتی کار پر سوار ہو کر دندناتا ہوا اندر آیا۔ وہ تو ہیرو نہیں بن سکا تھا۔ لیکن اُس کی بہن ہیروئن ضرور بن گئی تھی۔ وہ گاڑی سے اُتر کر رس گُلّے کھانے لگا اور اُس کی بہن کو ڈائرکٹر مہروان کھسر والے اپنے ساتھ اپنی گاڑی پر لے کر سینما چلے گئے۔ اُس کا ڈرائیور اُس کے پاس آکر بولا۔ "صاحب! بیبی صاحب کہہ گئی ہیں کہ رات کو وہ گھر نہیں آئیں گی۔ مہروان کھسر والا رات بھر اپنے گھر پر ڈائیلاگ کی ریہرسل کرائیں گے۔ کل صبح اُن کی شوٹنگ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ نوجوان بولا۔ اور دل میں کہا۔ کام کی ایسی سچّی لگن نے تو مجھے یہ گاڑی دلائی ہے۔ اِسی طرح لگن سے دن رات کام کرتی رہی تو نئی بیوک کے آنے میں دیر نہ لگے گی۔ اور وہ پھر رس گُلّے کھانے لگا۔

لوگ اِس فلم لائن میں آ آ کر دس شخصے کمانے لگے۔ اور جگموہن فاقے کرنے لگا۔ اُسے اِس لائن میں آئے ہوئے دس سال بیت گئے تھے۔ اور وہ ابھی تک پروڈکشن منیجر تھا۔

اور اِس دس سال کے عرصے میں ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ اُس کے گھر والوں نے اُسے پوچھا ہو۔ مسوری میں اُس کے باپ کی چھوڑی ہوئی لاکھوں کی جائداد تھی۔ مکانات تھے اور دوکانیں تھیں۔ ہوٹل تھے اور بازار تھے۔ اور اُس کے بھائی بہن تھے۔ بڑے بھائی صاحب موٹروں کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ اور اُس سے چھوٹا بھائی انجینئر تھا۔ ایک بہن نے ایم۔اے کر لیا تھا۔ دوسری پی۔ایچ۔ڈی کی تیاری کر رہی تھی۔ اور تیسری کی شادی ہو چکی تھی۔ جس کی اطلاع جگموہن کے گھر والوں نے اُسے بالکل نہیں دی تھی۔ اور وہ شادی کے چار ماہ بعد یہ خبر سن کر بہت کڑھا تھا۔ کئی راتیں وہ مارے رنج کے سو بھی نہیں سکا تھا۔ اور پھر اُس نے اپنے کئی دوستوں سے قرض مانگ کر اور اپنے سندھی پروڈیوسر کی خوشامد کر کے کسی طرح بھی پانچ سو روپے اکٹھے کئے تھے اور اُن پانچ سو روپوں میں سے اُس نے اپنے لئے ایک قمیص اور ایک پینٹ بھی نہیں سلوائی تھی۔۔ حالانکہ اُس کی دونوں پینٹیں پھٹ چکی تھیں۔ اور قمیص وہ آجکل اپنے ایک دوست سے مانگ کر پہن رہا تھا۔

اُس نے پانچ سو روپے کا ایک ہار خریدا۔ اور بہن کو بھجوا دیا۔ اِسلئے کہ اِس کی وہ بہن جس کی کہ شادی ہوئی تھی اُس سے عمر میں چار سال چھوٹی تھی۔ اور یہ اُس کا فرض تھا کہ وہ شادی پر اپنی طرف سے اپنی چھوٹی بہن کو کچھ دے۔ اور اب وہ اپنے اِس فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کے دل کا بوجھ اُتر گیا تھا۔ حالانکہ اُس وقت جبکہ اُس نے اپنی بہن کو ہار رجسٹرڈ پارسل سے بھجوایا تھا اُس کی جیب میں اتنے پیسے نہیں بچے تھے کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا سکتا۔ یا اپنے لئے ایک آنے کا ایک سگریٹ خرید لیتا۔

ہار کی رسید بہن کے پاس سے آگئی تھی۔ اور گھر والوں کی شکایت بھی کہ وہ بہن کی شادی پر مسوری کیوں نہیں آیا۔ جب کہ اُسے کئی خطوں کے ذریعے اطلاع دی جا چکی تھی۔ حالانکہ اِس سلسلے میں یا کسی اور سلسلے میں اُسے آج تک اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ بھی نہیں ملا تھا۔ یہ سب فراڈ تھا اور اُسے اپنے گھر والوں کے اِس فراڈ سے کوئی شکایت نہ تھی۔

کچھ دنوں کے بعد اُس کا وہ بھائی مسوری سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں بمبئی آیا۔ وہ رٹز ہوٹل میں آکر ٹھہرا۔ جگموہن کو اُس نے اپنے آنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اُن دونوں کی ملاقات بھی نہ ہوتی۔ اگر جگموہن اپنے ایک دوست کے ساتھ رٹز نہ جاتا۔ اُس کے دوست کا ایک پرانا دوست دہلی سے رٹز میں آکر ٹھہرا تھا۔ اور اُس کا دوست اپنے دوست سے ملنے رٹز گیا تھا۔ یہ دونوں لفٹ سے اُوپر جا رہے تھے۔ اور ابھی وہ چوتھے فلور پر جا کر رُکے ہی تھے کہ جگموہن کی نظر اپنے بڑے بھائی پر پڑی۔ جو کہ لفٹ کے سامنے ہی نیچے جانے کے لیے لفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

"بھائی صاحب!"

جگموہن حیرت اور خوشی میں ڈوب گیا۔ اور اُس کا بڑا بھائی نظروں ہی نظروں میں اُس کے لباس اور اُس کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"جگی تو ——— ؟"

پھر وہ کہنے لگا۔

"مجھے مسوری سے آئے ہوئے دس دن ہو گئے ہیں۔ میں تجھ سے ملے بغیر نہ جاتا لیکن کیا کروں کام بہت ہے۔ اور پھر میں ابھی دو دن اور رہوں گا۔"

"مگر آپ ——— ؟"

وہ جلدی سے بولا ——— میں رُوم نمبر ۴۰۶ میں ٹھہرا ہوں۔ اِس وقت بہت ضروری کام ہے۔ شام کو ضرور ملنا۔"

اور پھر وہ چلا گیا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟"

جگموہن کے دوست نے پوچھا۔

"میرے بڑے بھائی صاحب! مسوری سے آئے ہیں۔"

اور پھر شام کو جگموہن اپنے بھائی صاحب سے ملا۔ دونوں بھائیوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس کے بھائی نے کہا۔

"جگی! تُو شرمانا بالکل مت، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگ لے۔"

وہ اپنے پانچسو پچپن کے ٹِن سے سگریٹ نکال کر پیتا رہا۔ اور جگموہن اِس بات سے شرماتا رہا کہ وہ اپنی جیب سے پیلا ہاتھی کا پیکٹ کس مُنہ سے نکالے۔


بغیر اسپرین (ایسٹل سیلیسی لک ایسڈ) کے ہی حیرت انگیز فائدہ
سیریڈون
درد
کا خاتمہ کر دیتی ہے
درد رفع کرتی ہے
سیریڈون درد کو فوراً رفع کرتی ہے مختصر وقتوں میں صرف ۲ آنے والی ایک ٹکیہ کافی ہوتی ہے
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون درد سے پیدا ہونے والی گرانی کو دور کرنے میں مدد کرتی ہے
تازگی پیدا کرتی ہے
سیریڈون تھوڑی ہی دیر میں آپ کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اور چند ہی منٹوں میں آپ چست و تازہ بن جاتے ہیں
Saridon
۲ آنے
ہر ایک ٹکیہ مکمل خوراک ہے
نہ تو نظام معدہ میں کوئی گڑبڑی پیدا ہوتی ہے
اور نہ ہی کوئی ناخوشگوار ردِ فعل
سر درد، دانتوں کا درد یا کسی بھی دوسرے قسم کا درد ہونے پر فوراً ہی سیریڈون استعمال کیجئے۔ سیریڈون چند ہی منٹوں میں درد رفع کر دیتی ہے۔ اس کے استعمال سے نہ تو معدہ میں کوئی گڑبڑی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ناخوشگوار ردِ فعل مرتب ہوتا ہے۔
لیکن سیریڈون کا عمل صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا یہ درد سے پیدا ہونے والی گرانی کو دور کر کے فوراً مکمل آرام پہنچاتی ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ پھر سے چستی و تازگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔
سیریڈون کی چند ٹکیاں ہر وقت اپنے پاس موجود رکھئے۔ اور خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ سیریڈون محض دافع درد ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی فائدے پہنچاتی ہے۔
VT 1388
سیریڈون ریڈیو ترنگ
سیریڈون کی طرف سے ریڈیو سیلون کے ذریعے نشر کیا جانے والا بہترین ہندوستانی فلموں کا یہ دلچسپ پروگرام ہر دوشنبہ کو رات کے ۸ بجے ۴۱ میٹر بینڈ پر سنئے

اور پھر دوسرے دن اُس کے بھائی نے آپرہاؤس کے ایک شوروم سے اپنے لئے فیاٹ کا ایک نیا ماڈل خریدا۔ اور جگموہن دیکھتا رہا۔

"تو بھی اپنے لئے ایک گاڑی خرید لے۔"

اُس کا بھائی بولا۔

اور جگموہن کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے بڑے بھائی نے اُسے بہت بڑی گالی دے دی ہو۔ یا اُس کے کلیجے میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ وہ اپنے بھائی کی اِس چٹکی پر تلملا گیا۔

موٹر نہ ہوئی مونگ پھلی کا ایک دانہ ہوا۔ کہ جگموہن جب چاہے اُسے خرید لے۔ مگر وہ چُپ رہا۔

دوسرے دن جگموہن کا بڑا بھائی جو کہ اُس کی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا جگموہن سے بولا۔

"یہ کرد کوڈائل شو تجھے پسند ہے؟"

"اچھا ہے۔" جگموہن جُوتے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ میں نے اسی روپے میں مسوری کی سب سے بڑی دکان سے خریدا ہے۔ تجھے بھی جاتے ہی ایک بھجوا دوں گا۔"

"جی ——!"

جگموہن بے چارگی کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

اور پھر جگموہن کا بھائی چلا گیا۔

اُسے گئے ہوئے کئی مہینے بیت گئے۔

ایک دن جگموہن کو اسٹوڈیو میں اپنے بھائی کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ فلاں فلاں دوکان میں جاکر اُس کے نئے موٹر پارٹس بھجوا دے۔ اُسے اُن پُرزوں کی اپنی موٹر لاریوں کے لئے اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ اُس نے اُس کا جُوتا پارسل کر دیا ہے۔ اندھیری پوسٹ آفس میں جاکر وہ وصول کر لے۔

اور پھر اُس دن جگموہن سارا دن اپنے بھائی کی موٹر لاریوں کے اُن پُرزوں کے سلسلے میں پریشان رہا۔ چار دن اُسے اور لگے۔ اور پھر کہیں جاکر یہ کام ختم ہوا اور اُس نے بلٹی مسوری اپنے بھائی کے پاس بھجوا دی۔

اور پھر بلٹی بھجوانے کے ٹھیک دوسرے دن اُسے اندھیری پوسٹ آفس سے جُوتوں کا ایک پارسل ملا۔ اُس نے اُسی جگہ بڑے شوق کے عالم میں وہ پارسل کھول ڈالا۔ دراصل اُسے کرد کوڈائل کے یہ جُوتے بے حد پسند آئے تھے۔ اور وہ بہت بے چینی کے ساتھ اِن جُوتوں کا انتظار کر رہا تھا۔

اُس نے پارسل کھولا اور اُس کے چہرے پر ایک زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی آنکھوں سے دُنیا جہان کا سارا غم ایک ساتھ چھلک پڑا۔ کرد کوڈائل کی جگہ نہایت ہی معمولی قسم کے کاف ڈیزر کے دو جُوتے اُس کے سامنے پھسل کر نیچے گر گئے۔

"ہُنھ ——!"

وہ بڑبڑایا۔

"تو یہ بھیجا ہے بھائی صاحب نے میرے لئے —— دو جُوتے!"

وہ سوچنے لگا —— بھائی صاحب کے بھیجے ہوئے یہ دو جُوتے وہ زندگی بھر نہ بھول سکے گا ——

وہ اُن دو جُوتوں کو اپنی بغل میں دبائے اندھیری پوسٹ آفس سے آہستہ آہستہ باہر آ گیا۔

آج زندگی میں پہلی بار جگموہن کے دل کو کبھی نہ بھول سکنے والی ٹھیس لگی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا —— کیا زندگی میں اُسے صرف دو جُوتے ہی ملیں گے؟ —— اور کچھ نہیں ——؟

غزل

از

جناب سعادت نظیر ایم اے

رہے دل کی دل میں، زباں تک نہ پہنچے
مرا غم حدودِ بیاں تک نہ پہنچے

وہی حال ہے سوزشِ دل کا اب تک
کہیں نوبت آہ و فغاں تک نہ پہنچے

جو شعلے کبھی دل میں بھڑکے ہوئے تھے
وہ شعلے کہاں سے کہاں تک نہ پہنچے

ہیں کیا مشورے رہبر و راہزن میں
یہ سازش کہیں کارواں تک نہ پہنچے

رہائی ہے، یارب! یہ کیسی رہائی!
قفس سے چلے آشیاں تک نہ پہنچے

مری حسرتوں کے دیئے بجھ رہے ہیں
دعا ہے! ترے گھر دھواں تک نہ پہنچے

نہ چھیڑیں وہ تارِ رگِ جاں نظیرؔ آج
کہیں نغمۂ دل فغاں تک نہ پہنچے

غزل

از

جناب کشمیری لال ذاکرؔ

تری تلاش میں یہ کیا مقام آیا ہے
کہ ہر قدم پہ مجھے اِک سلام آیا ہے

سنبھل رہا ہوں کہ نازک مقام آیا ہے
مرے فسانے میں اب تیرا نام آیا ہے

اسی چراغ نے رستے مرے اُجالے ہیں
ترا ہی نام فقط میرے کام آیا ہے

سحر کے رُخ پہ شفق کی بہار نکھری ہے
کہ تیری بزم میں اِک دورِ جام آیا ہے

مری حیات نے راہوں میں پھول بکھرائے
تری نگاہ کا جب بھی پیام آیا ہے

ترے جمال کی لَو سے چراغ جلتے ہیں
غمِ حیات یہ کیسا مقام آیا ہے

غزل

از

جناب ڈاکٹر پریم لال شفاؔ محمودی

بہارین کے وہ صحنِ چمن سے گزرے ہیں
چمن گواہ ہے جس بانکپن سے گزرے ہیں

تجھے نہ دیکھ سکے ہم ترے کرم کے بغیر
ہزار بار اِسی انجمن سے گزرے ہیں

جدید طرزِ جفا سے بھی دُوبدُو ہوں گے
ابھی وفاؤں کی طرزِ کہن سے گزرے ہیں

نہ ذکرِ آہ و فغاں ہے نہ ظلم کا چرچا
رہِ وفا میں ہم ایسے چلن سے گزرے ہیں

تجھے تلاش کیا اشکہائے پیہم میں
تری تلاش میں گنگ و جمن سے گزرے ہیں

تمھاری راہ میں دل کو تھا نفس کا خطر
اِسے بچاتے ہوئے راہزن سے گزرے ہیں

حضورِ دوست کبھی ہوں گے باریاب شفاؔ
ابھی تو منزلِ دار و رسن سے گزرے ہیں

نیلا لفافہ

افسانہ

از

جناب مختار الرحمن راہی بی۔اے

باسٹر میہ منزل۔ نکلزار مسجد۔ گھاٹ دروازہ۔ جے پور۔

۵؍اکتوبر ۱۹۵۵ء

محترم خورشید صاحب! تسلیم

"آنکھیں میری باقی اُن کا" کے عنوان سے آپ نے جو نیا سلسلہ جاری کیا ہے وہ واقعی ایک دلچسپ اضافہ ہے۔ اور خوب ہے۔ آپ کی نکتہ سنج ہر چیز کو خواہ وہ ایک ہو یا گوہر، فوراً پہچان لیتی ہے۔ اور اس میں طنز و مزاح کی چاشنی ملا کر اس انداز سے پیش کرتی ہے جسے پڑھ کر قاری کے منہ سے بے ساختہ "واہ واہ!" اور "خوب بہت خوب!" کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ آپ اس سلسلے کو جاری رکھیں یہ ایک قابل قدر اور دلچسپ اضافہ ہے۔ "بیسویں صدی" کے لئے "نیلا لفافہ" بھیج رہا ہوں۔ افسانے کی تھیم بہت پرانی ہے۔ لیکن کردار جیتے جاگتے ہیں۔ اور ہماری اسی دنیا کے انسان ہیں۔ افسانے کی رسید اور رائے سے مطلع فرمائیے۔

خلوص کار

مختار الرحمن راہی

جے پور — ۲؍اکتوبر ۵۵ء

محترمہ سعیدہ، حمیدہ، جمیلہ، عقیلہ صاحبہ!

(جو کوئی بھی آپ ہوں)

آداب!

مہربانی فرما کر آپ مجھے اپنی کھڑکی سے جو میری اسٹڈی میں کھلتی ہے گھور گھور کر نہ دیکھا کریں۔ اگر آپ نے میری اس التجا کو رد کر دیا تو مجبوراً مجھے کھڑکی بند کرنی پڑے گی۔

اسلم

جے پور — ۳؍اکتوبر ۵۵ء

اسلم صاحب!

شکایت نامہ ملا۔ عجیب اتفاق ہے۔ اگر یہی شکایت میں آپ سے کروں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اجی جناب! اگر میں اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھتی ہوں تو اس میں کون سا جرم ہے؟ آنکھیں ہیں ہی اس لئے کہ ان سے دیکھا جائے۔ آپ کھڑکی بند کر سکتے ہیں لیکن میری آنکھوں پر آپ پٹی نہیں باندھ سکتے۔ اور پھر اگر میں کھڑکی سے دیکھتی ہوں تو آپ کی بلا سے۔ آپ اس طرف کیوں دیکھتے ہیں؟

نسیم

۷؍اکتوبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

میں آپ سے ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس طرح مجھے دیکھنا بند کر دیں۔ میرے خیال میں آپ کے مکان میں کئی کھڑکیاں ہوں گی۔ مہربانی فرما کر آپ اُن کھڑکیوں پر رہیں . . . . ہاں اس کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ آپ فلمی نغمے نہ گایا کریں۔ کیونکہ کسی کو گاتے سن کر میری طبیعت بھی نغمہ سرا ہونے کیلئے بے طرح مچلنے لگتی

ہے۔ اور اگر کسی دن میں بھی بہک گیا تو پھر دوسرے ہی دن مجھے یہ مکان خالی کر دینا پڑے گا۔ کیونکہ آپ کے والدِ بزرگوار نے گانے، سیٹی بجانے اور اِس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے کی سخت ممانعت کر رکھی ہے۔ میرا خیال ہے آپ میری مجبوریاں سمجھتی ہیں

اسلم

۱۵ر اکتوبر ۵۵ء

اسلم صاحب!

آداب! حضور! پہلے آپ نے میری آنکھوں پر پابندی عائد کی اور اب میرے منہ پر! میں پوچھتی ہوں آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا کیا حق ہے؟ اگر میں گاتی ہوں تو یہ میرا اپنا فعل ہے۔ اِس سے آپ کو کیا واسطہ؟ اگر آپ کی کچھ مجبوریاں ہیں تو ہوا کریں۔ میں بھی اپنی عادتوں سے مجبور ہوں۔ بندہ پرور! دوسروں پر پابندی عائد کرنے یا زور دینے کی بجائے اپنی زبان اور آنکھوں کو قابو میں رکھیئے۔ پھر میرا خیال ہے آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔

نسیم

یکم نومبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

آپ بے حد ضدی قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ آخر آپ میری مجبوریاں کیوں نہیں سمجھتیں۔ کل میں نے کھڑکی میں پردہ لگا دیا تھا۔ آپ نے اُسے ہٹا دیا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ میں پڑھائی میں مشغول ہوں آپ نے کرسی کی کیل کو اِس قدر زور سے ٹھوکنا شروع کیا کہ مجھے اپنے کان بند کرنے پڑے۔ اِس کے بعد آپ نے اِس کھڑکی سے جھانکا اور منہ چڑا کر چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد آپ کے والد حضور میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کرایہ نامہ کی شرائط پر پابند رہنے کے لئے یاد دہانی کی۔ اگر وہ آپ کو اِس طرح کھڑکی سے جھانکتے دیکھ لیتے تو میرا مختصر سا سامان اور کتابیں باہر پڑی نظر آتیں۔ کیا آپ اِس طرف غور فرمائیں گی؟

اسلم

۸ر نومبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

خدا کی پناہ! آپ کتنی نڈر ہیں۔ آپ کے والدِ بزرگوار جب میرے کمرے میں پند و نصائح کے دفتر کھول رہے تھے۔ اور میں ہمہ تن گوش تھا تو آپ کھڑکی سے جھانکنے لگیں۔ میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ میری گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے آپ کے ابا حضور نے مجھ سے کہا۔

"کیوں صاحبزادے خیریت تو ہے؟"

"جی کچھ نہیں"

میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

اچانک آپ کو چھینک آ گئی۔ اور فوراً آپ کے ابا حضور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور غصّے سے بولے۔

"یہ کون ہے گنوار کا لٹھ جسے چھینکنے کی بھی تمیز نہیں؟"

آپ وہاں سے غائب تھیں۔ جانتی ہیں اگر آپ کے ابا حضور اگر آپ کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیتے تو کیا ہوتا؟ خدارا مجھ پر ترس کھائیے۔ بڑی دقتوں سے یہ ایک کمرہ کرائے پر ملا ہے۔ اور اسے میں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں مگر آپ ہیں کہ . . . . .

اسلم

۱۰ر نومبر ۵۵ء

اسلم صاحب!

آپ کے دونوں خط ملے۔ میں نے قصداً اُن کا جواب نہیں دیا۔ اگر میں آپ کو اُن کا کچھ جواب دیتی تو یقیناً آپ کے دل کو سخت ٹھیس پہنچتی۔ اِس لئے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ خیر آئندہ مجھے کھڑکی میں نہ دیکھیں گے۔

نسیم

۲۲ر نومبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

سُنا ہے آپ ایک ہفتہ سے بیمار ہیں۔ خدا آپ کو جلد صحتِ کُلی عطا فرمائے۔

ن یقین کیجئے جب سے آپ نے کھڑکی سے دیکھنا بند کیا ہے نظریں بار بار اُس طرف اُٹھتی ب۔ اور جب وہاں پردہ پڑا نظر آتا ہے تو عجیب بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ کھڑکی میں ب کی مسکراتی ہوئی آنکھیں نظر نہیں آتی ہیں تو طبیعت اُداس اُداس سی رہنے لگتی ہے۔ آپ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ یہ بھی عجیب شخص ہے۔ لیکن دراصل میرا مطلب نہیں تھا کہ آپ کھڑکی سے دیکھنا بند کر دیں۔ بلکہ وہ تو آغازِ کششِ شوق کا صرف بہانہ تھا۔ ورنہ دل تو یہ چاہتا تھا کہ آپ اُسی طرح کھڑکی سے دیکھا کریں۔ اور میں و نظارۂ حُسن رہوں۔

اسلم

یکم دسمبر ۵۵ء

اسلم صاحب!

ہمدردی کا شکریہ! میں اب تندرست ہوں۔ جیسا کہ آپ چاہتے تھے۔ اب ابا حضور نے کھڑکی پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اور میں اس پردے کو ہٹا کر نہیں دیکھ سکتی۔ اب آپ اطمینان سے پڑھا کریں، اور امن چین کی بنسی بجائیں۔

نسیم

۳ر دسمبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

آج دو دن بعد آپ کے خط کا جواب دے رہا ہوں۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کیا لکھوں؟ کبھی سوچا پردہ ہٹا کر آپ سے دو باتیں کر لوں۔ لیکن پھر "کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے" سوچ کر باز رہا۔ آخر آج آپ کو خط لکھنے بیٹھ ہی گیا۔ محترمہ! آپ نے میرے خط کا جواب مکمل طور پر نہیں دیا۔ آپ قصداً جواب طلب حصہ اُڑا گئیں۔ اِس جگہ مجھے کسی منچلے شاعر کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ؎

پھر بتا دیں گے اِس اندازِ تغافل کا مزہ
کششِ شوق کی تکمیل ذرا ہو جائے

ہاں ایک بات آپ سے کہنا بھول گیا۔ اور وہ یہ کہ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کے قبلہ والد صاحب مجھ سے کچھ خفا نظر آتے ہیں۔ آخر مجھ سے ایسا کونسا قصور ہوا ہے؟ — کل رات آپ نے جو رُومال کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پھینکا تھا، اُس کا شکریہ اُمید ہے آپ اسی طرح مجھ پر چشمِ عنایت رکھیں گی۔

اسلم

۱۰ر دسمبر ۵۵ء

نسیم صاحبہ!

تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ آخر گزشتہ رات میں نے کھڑکی کے پردے کو بلیڈ سے پھاڑ کر دیکھا آپ مسہری پر تکیے کے سہارے پڑی ہوئی تھیں۔ "بیسویں صدی" کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں تھا۔ اور آپ کے ہونٹوں پر میری غزل کے یہ اشعار تھے ؎

دیکھنی تاثیر تھی جذبِ نظر کی دیکھ لی
اب وہ جا سکتے ہیں جائیں شوق سے پردا کریں
میں سمجھتا ہوں شکستِ حُسن کا نقشہ اسے
حُسن کو انگڑائیاں لے کر نہ وہ رُسوا کریں
ہے ہماری زندگی کا اب تمہیں پر انحصار
تم نہ کہہ دینا کہیں بیساختہ ہم کیا کریں؟

کہئے آپ کو یہ غزل پسند آئی؟ اوہ! آپ کو پسند تھی جب ہی تو اس کے یہ اشعار آپ اپنی فسوں ساز آواز میں گنگنا رہی تھیں۔ ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ مہربانی فرما کر آپ اس پھٹے ہوئے پردے کو سی دیں۔ ورنہ آپ کے والدِ بزرگوار نے دیکھ لیا تو پھر خدا جانے کیا ہو۔

اسلم

۲۲ر دسمبر ۵۵ء

اسلم صاحب!

آداب۔ آپ کے دونوں خط ملے۔ کچھ خانگی پریشانیوں کی وجہ سے جواب نہ دے سکی۔ پردہ سی دیا گیا ہے۔ ابھی مٹو کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ دو روز سے بیمار ہیں۔ بخار کافی تیز ہے اور ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب دوا اور انجکشن دے گئے ہیں۔

دا آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ ایسے موقعے پر آپ کی تیمار داری کرنے والا بھی تو کوئی نہیں۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔

پریشان حال

نسیم

۲۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء

اسلم صاحب! آداب

کل تمام رات میں نے آپ کا کراہنا سنا۔ آپ تو خیر رات بھر جاگے ہی ہوں گے لیکن مجھے بھی پل بھر نیند نہ آئی۔ رات کے تقریباً دو بجے آپ کا کراہنا بند ہو گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ آپ بے ہوش پڑے تھے۔ اُس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی، بس میں ہی جانتی ہوں۔ مجھے خود پر تعجب ہوتا ہے کہ میں نے کیونکر اتنی جرأت کی کہ مسہری پر اسٹول رکھ کر کھڑکی سے کود کر آپ کے کمرے میں آگئی۔ میں نے دیکھا، آپ اُس وقت بخار میں توے کی طرح تپ رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ غشی طاری تھی۔ میز پر رکھی ہوئی دوا میں نے آپ کے منہ میں اُنڈیل دی۔ کچھ دیر بعد آپ نے اچانک کروٹ بدلی۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اُف! میرے خدا! ابا حضور کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں سہم گئی۔ پھر ابا حضور وہاں سے چلے گئے۔ میں بمشکل تمام واپس اپنے گھر آئی۔ صبح ابا حضور نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن امی جان پر بے حد گرم ہوئے۔ اور اب یہ طے پایا ہے کہ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو آپ کو مکان خالی کرنے کا نوٹس مل جائے گا۔

ہاں تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم
تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

آپ سے میری آخری التجا ہے کہ آپ میرے خطوط واپس کر دیں۔

نسیم

جے پور ـــــ یکم جنوری ۱۹۵۶ء

نسیم صاحبہ!

یہاں آ کر میں نے بہت سی اُمیدیں کی تھیں۔ اپنی آرزوؤں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ آج میں ایک ٹوٹا دل لئے ہوئے بھاری قدموں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ میں تمہیں بھول جاؤں، یہ ممکن نہیں۔ تمہیں اپنانے کیلئے میں پوری کوشش کروں گا۔ اور مجھے اُمید ہے وہ دن ضرور آئے گا جب تمہارے والد بزرگوار میرا پرتپاک استقبال کریں گے میں برات لیکر آؤں گا۔ اگر ہو سکے تو اُس وقت تک میرا انتظار کرنا۔ یہ خط تمہارے جملہ خطوط کے ساتھ اُس وقت ملے گا جب میں جے پور کی سرحد کو پار کر چکا ہوں گا۔

الوداع۔

تمہارا اپنا

اسلم

اِن خطوط کو سلسلے وار یکجا کرنے کے بعد میں نے نسیم کی طرف دیکھا۔ وہ بکس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔ اُس نے بکس کے تمام کپڑے باہر نکال ڈالے۔ اچانک کسی کپڑے سے ایک نیلا لفافہ نکل کر گرا۔ نسیم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ اور اُس نے نیلا لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"جب آپ ان خطوط کو افسانہ کی شکل دیں۔ تو یہ خط اُس کہانی کی آخری کڑی ہو گا جہاں سے ایک کہانی ختم ہوتی ہے اور دوسری کہانی جنم لیتی ہے"

میں نے خط پڑھا۔ یہ خط اسلم کے والد صاحب کا نسیم کے والد کے نام تھا۔ جو آجکل میرے خسر ہیں۔

"مکرمی! تسلیم

نہایت رنج و ملال کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ کل بروز اتوار بوقت دو بجے شب میاں اسلم تقریباً ایک ہفتہ بیمار رہنے کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ شادی کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ اب آپ شادی کا انتظام نہ کریں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ آپ کو مزید لکھ سکوں۔ میاں اسلم کی موت نے میری کمر توڑ ڈالی ہے۔ آپ عزیزی نسیم کا نکاح جہاں مناسب خیال فرمائیں کر لیں۔

آپ کا

ذاکر محمد"

خط ختم کرتے ہی میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ واقعی اِس نیلے لفافے نے ایک کہانی کا گلا گھونٹا تھا۔ جہاں ایک کہانی نے دم توڑا تھا وہاں سے ہماری ایک نئی کہانی کی ابتدا ہو رہی تھی۔ کون جانے اس نئی کہانی کا کیا انجام ہو۔

زل

از

جناب بشیر ملاٹھوی

عادلِ سوزاں ہے دیکھیے کیا ہو
ساتھ بہ داماں ہے دیکھیے کیا ہو

وہ بات کہنے پہ جس کے زبان کٹتی تھی
نظر نظر سے نمایاں ہے دیکھیے کیا ہو

نے اِس کی ستاروں کو کر لیا ہے نگوں
ے عروج پہ انساں ہے دیکھیے کیا ہو

وہ ایک شے جسے توہینِ جذبِ دل کہیے
نگاہِ ناز میں رقصاں ہے دیکھیے کیا ہو

بشیر! آپ کی باتوں میں رنگِ عشق ہنوز
کہیں کہیں سے نمایاں ہے دیکھیے کیا ہو

بشیر ملاٹھوی

غزل

از

جناب محسن زیدی ایم اے

جینے کا سہارا دلِ ناکام بہت ہے
تھوڑی بھی اگر ہے مئے گلفام بہت ہے

یہ صبح کا ہنگام سہی اہتمام!
کیا کہیے مگر تیرگیٔ شام بہت ہے

کچھ گردشِ افلاک، نہ کچھ گردشِ دوراں
شیشے میں ابھی بادۂ گلفام بہت ہے

وہ دل کہ جو ہے عارض و گیسو کا پجاری
وہ دل حرم و دیر میں بدنام بہت ہے

ہم آج بھی محرومِ مے و جام ہیں محسن
کہنے کو تو ساقی کا کرم عام بہت ہے

محسن زیدی

غزل

از

جناب وشوا ناتھ درد

تری بے رخی میں مروت سی ہے
تجھے مجھ سے شاید محبت سی ہے

بتا اے محبت تجھے کیا کہوں
انھیں آج مجھ سے شکایت سی ہے

بڑے کام کی ہے یہ بے گانگی
انھیں آج میری ضرورت سی ہے

کبھی اُن کو پانے کی تھی آرزو
مگر اب بھلانے کی حسرت سی ہے

تری بے نیازی کا شکوہ نہیں
مجھے بھول جانے کی عادت سی ہے

وشوناتھ درد

قطعات

از

جناب خمار انصاری ایم اے

گلشن بکنار ہو گئے ہو
موسم کا نکھار ہو گئے ہو
یہ حسن و شباب، یہ جوانی
تصویرِ بہار ہو گئے ہو

یوں اُبھرتی ہوئی جوانی پر
شوخ رعنائیاں بکھرتی ہیں
جیسے سورج کی اولیں کرنیں
صبح میں رنگ و نور بھرتی ہیں

خمار انصاری

صحت و زندگی

۱ —— سفید چینی —— سفید زہر!

میں جو بات کہنا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے آپ کو عجیب اور نا قابلِ قبول معلوم ہو۔ لیکن یہ اتنی ہی سچّی ہے جتنی سچی یہ بات کہ زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے! غذا سے متعلق آج سب سے بڑی جو غلطی کی جا رہی ہے وہ ہے سفید چینی کا بے دریغ استعمال۔ چینی اور میدہ (چوکر نکلا ہوا آٹا)، یہ دونوں مل کر انسان کے لئے لعنت ثابت ہو رہے ہیں۔ صرف ان کے استعمال کی وجہ سے آج کا مہذب انسان کئی طرح کے لاعلاج امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

سفید چینی چاہے وہ دانے دار ہو یا اُس کی مصری بنالی گئی ہو، دونوں ہی گنے میں ملنے والی قدرتی مٹھاس سے مختلف ہیں۔ وہ اِس قدرتی مٹھاس کی ساری رُوح نکال کر بنائی جاتی ہیں۔ گنے کے اِس رس سے گڑ بھی بنتا ہے۔ جس میں گنے کی حقیقی روح اپنی قدرتی حالت میں موجود رہتی ہے۔ لیکن اسی گڑ کو صاف اور سفید چینی بنانے کی کوشش میں اسے بے جان بنا دیا جاتا ہے۔

سفید چینی خون میں ترشی پیدا کرتی ہے۔ اور جسم کو کئی طرح سے نقصان پہنچاتی ہے۔ سائنس کی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ سفید چینی اور میدے کا زیادہ استعمال ہی ذیابیطس اور گردے کے امراض پیدا کرتا ہے۔ تجربہ اور معلوماتی اطلاعات بھی سائنس کے اِس بیان کو صحیح ثابت کرتی ہیں۔

آج جو ہر آدمی کے دانت خراب اور متاثر نظر آتے ہیں اِس کا سبب بھی چینی ہی ہے۔ جسم کی ہڈیاں اور دانت جن چیزوں سے بنتے ہیں اُن میں کیلشیم (چُونا) خاص ہے۔ جن لوگوں کے دانت صحت مند اور مضبوط ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اُن کی غذا میں کیلشیم کافی مقدار میں رہتا ہے۔ کمزور دانت والوں کی غذا میں اِس کی کمی ہوتی ہے۔

سفید چینی ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت اور مضبوطی کے لیے جسم میں جمع شدہ کیلشیم نکما بنا دیتی ہے۔ اور ہڈیاں اور دانت اُس چیز سے جس کی اُن کی مضبوطی کے ضرورت ہوتی ہے، محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دانتوں میں کمزوری آجاتی ہے ان کی چمک ختم ہو جاتی ہے اور وہ جلد گھسنے اور گرنے لگتے ہیں۔

یہ سارا نقصان وہ چینی پیدا کرتی ہے، جو سفید ہوتی ہے۔ اور جو گنے رس سے مشین کے ذریعے بنتی ہے۔ اپنی فطری حالت میں جو مٹھاس شہد، کشمش، انجیر، کھجور، گڑ، اور راب میں ملتی ہے، صحت کیلئے بہت ضروری ہے۔ یہ مٹھاس جسم کو طاقت دیتی ہے۔ ضروری گرمی پہنچاتی ہے۔ جن غذائی اجزا میں وہ ملتی ہے ان میں دوسرے قدرتی نمکوں کے علاوہ کیلشیم بھی کافی ہوتا ہے۔

سفید چینی کی مضرت کے پیشِ نظر ایک مشہور ماہرِ غذا نے سفید چینی کو سفید زہر کہا ہے۔ اس لئے اگر آپ کو اپنی اور اپنے بچوں کی صحت عزیز ہے تو انھیں اس سفید زہر سے بچایئے!

۲ —— نیبو سائنس کی نظر میں

نیبو اوصاف و صفات کا خزانہ ہے۔ جاپان کے مشہور ماہرِ غذا نے کہا ہے "گھر میں نیبو ہمارا خادم ہے۔ سماج کے لیے اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر ہے۔ اور پورے ملک کے لئے بہت بڑا سائنسداں ہے۔"

نیبو زخموں اور جلد کے امراض کے لئے سب سے بہتر علاج ہے۔ یہ ناک سے آنے والے خون کو پل بھر میں روک دیتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں کچھ جرمن قیدی بلجیم لائے گئے تھے۔ اُس وقت اُن کے تھیلے میں ایک سفید سفوف پایا گیا۔ قیدیوں نے بتایا کہ زخموں سے جاری ہونے والے خون کو فوراً روک دینے کے لئے یہ سفید

...بہت بہتر ترکیب ہے جیسا کہ انگریزی نے فرمایا۔ ...
...بدن کو صاف کرنے کے لئے روزانہ صبح غسل آفتابی کرنا چاہیے"
...موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

—— کردار کی تعمیر

...کی پرورش اور پرداخت لاڈ پیار کے بجائے مشکلات میں ہوئی ہے ...ت سمجھئے۔ سخت مزاج کے ماں باپ، غریبی، تعلیم کا غیر تسلی بخش ...ی، بڑا کنبہ۔ یہ سب باتیں کردار کی تعمیر کی اچھی معاون ہیں۔ لاڈ پیار میں کچھ ہی لوگ کامیابی حاصل کر پاتے ہیں۔ مشکلات پر فتح پاتے ہوئے ...بڑے بڑے کام کرنے کے قابل جسمانی اور ذہنی طاقت نشو ونما پاتی ہے ...ز اور عظیم انسان بنانے والے کردار کی تعمیر عیش و راحت کے گہوارے ...۔ مشکلات اور مصائب کے طوفان میں ہوتی ہے۔

—— کامیابی

...نیات کے زبردست عالم امرسن نے لکھا ہے۔ "زندگی کی آندھیوں کا ...کرتے انسان اور بھی طاقتور ہو جاتا ہے۔ مسلسل ٹکر سے اُس کی قوت ...بھی بڑھ جاتی ہے۔" وہی پودا تناور درخت بن جاتا ہے جو آندھی، پانی ...ژالہ باری میں کھڑا رہ سکے۔ اگر حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے ...آپ کو کچل کر رکھ دیں گے۔ مشکل اور ناسازگار حالات میں باہمت اور ...انسان زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا ہے۔ مشکلات کی ٹکر اور حالات کے ...سے وہ تیزی آتی ہے جو انسان کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ کامیابی ...اور پست حوصلہ لوگوں سے نفرت ہے۔ کامیابی و کامرانی باہمت اور ...ملہ لوگوں کو پیار کرتی ہے۔

۸ —— پھلوں کی اہمیت اور ضرورت

پھلوں میں قدرتی طور پر ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جن سے صحت قائم رکھنے ...د ملتی ہے۔ پھل جسم کی اندرونی مشین کو صاف کر کے جسم کے فاسد مادے کو خارج کرنے میں بہت معاون ہوتے ہیں۔

جسم کے تین حصوں پر پھلوں کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ پیٹ، گردے اور جگر۔ یہ اثر اس طرح ہوتا ہے کہ پہلے تو پھلوں کا رس پیٹ کے فاسد مادے کو دور کر دیتا ہے۔ دوسرے گردے سے زہریلی چیزیں رقیق ہو کر نکل جاتی ہیں۔ پھلوں کا تیسرا اثر جگر کو قوی بنا کر اُس کی قوت میں اضافہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھلوں کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم ہر طرح کے فاسد مادے سے پاک ہو کر صحیح طور پر اپنا کام کرتا ہے۔

پھلوں میں خالص پانی، چینی، وٹامن، نمک، ترشی، کچھ پروٹین اور ان چیزوں کے بھی کچھ اجزا رہتے ہیں جن کی وجہ سے اُن میں ذائقہ اور مہک کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

تازہ پھلوں میں حیات بخش طاقت کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ کافی مقدار میں پھل کھانا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری کھانا کھانا ہے۔ جسم کی بہت سی خرابیوں کی اصلاح روزانہ پھلوں کے استعمال سے دُور ہو سکتی ہے۔ خاص کر قبض دُور کرنے اور قبض سے محفوظ رہنے کے لئے تو پھل اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ پھل جسم کے فاسد مادے کو رقیق بنا کر خارج ہونے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پھل بڑھاپے کو روکتے ہیں۔ دراصل بڑھاپا ایک طرح کا مرض ہے جو جسم میں فاسد مادے جمع ہو جانے سے لاحق ہوتا ہے۔ پھل اُن فاسد مادوں کو جسم سے خارج کر دیتے ہیں۔

۹ —— بھول جانا سیکھئے

تکلیف دہ بات کو بھلا دینا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا اچھی بات کو یاد رکھنا۔ یورپ کے ایک مشہور ڈاکٹر نے لکھا ہے۔

"غم و اندوہ اور فکر و پریشانی کو دُور کرنے کیلئے "بھول جاؤ" سے بڑھ کر کوئی دعا نہیں ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا جسم اور ذہن صحت مند رہے تو ساری تکلیف دہ باتوں کو بھول جاؤ۔ دُکھ کی، فکر و پریشانی کی۔ بیماری کی باتیں نہ کرو۔ نہ سُنو۔ صحت کی، شکم کی، شادمانی کی باتیں کرو۔

فکر و پریشانی سے چھٹکارا پانے کی سب سے بہتر تدبیر تکلیف دہ، اور پریشان کن باتوں کو بھول جانا ہے۔"

۵ — سورج کی زندگی بخش کرنیں

ہماری زندگی اور صحت کے لئے آفتاب بہت مفید ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو ذی روح اور پیڑ پودے کھلی ہوا اور روشنی میں رہتے ہیں وہ اُن جان داروں اور پیڑ پودوں کی بہ نسبت زیادہ صحت مند، لہلہاتے اور شاداب رہتے ہیں جنھیں آفتاب کی روشنی اور ہوا کم ملتی ہے۔ کھلی فضا اور کھلی روشنی میں گائے، بچھڑے اور دوسرے ذی روح کیسے خوش اور مسرور رہتے ہیں۔ یہ بات کسی سے چھپی ہے؟ جو ساگ سبزیاں دھوپ میں نشو و نما پاتی ہیں اُن میں آفتاب کی شعاعوں سے حیات بخش قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور انھیں کھانے سے بہت سے امراض دُور ہو جاتے ہیں۔ جن پیڑ پودوں کو آفتاب کی روشنی نہیں ملتی وہ یا تو بڑھتے پنپتے ہی نہیں۔ اور اگر بڑھے پنپے بھی تو اُن میں تازگی نہیں رہتی۔ جن مزدوروں کو کان کے اندر کام کرنا پڑتا ہے، اندھیرے جیل خانوں میں برسوں گزارنے پڑتے ہیں۔ کھلی دھوپ اور ہوا نہیں مل سکتی وہ ٹھگنے رہ جاتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر اُداسی چھائی رہتی ہے۔ اُن کی صحت بُری طرح گر جاتی ہے۔ اور جسم طرح طرح کے امراض کا شکار بن جاتا ہے۔ جسم کو صحت مند اور امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے آفتاب کی روشنی کی ناگزیر ضرورت ہے۔

آفتاب کی روشنی سے محروم تاریک کمروں میں رہنے والے کھلے مکانوں میں رہنے والوں کی بہ نسبت زیادہ بیمار ہوتے اور مرتے ہیں۔ ایک انگریزی کہاوت ہے جس گھر میں آفتاب کی روشنی نہیں آتی وہاں ڈاکٹروں کو آنا ہی ہوگا۔

ہندو مذہب کے شاستروں اور آیور ویدوں کی کتابوں میں سورج کی روشنی کی بہت بڑائی کی گئی ہے۔ اس سے بہت سے امراض دُور ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے انسان بہت سے امراض سے محفوظ رہ کر سَو سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ غذا میں جن اجزا کی کمی رہتی ہے وہ بہت حد تک ہمیں سورج کی کرنوں سے مل جاتے ہیں۔ آج سے دو ہزار سال پہلے یونان کا ایک مشہور طبیب ہیپو کریٹز آفتاب کی شعاعوں سے خوفناک امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اب تو مغربی ممالک میں آفتاب کی کرنوں سے امراض کے علاج کا کام عام طور سے لیا جا رہا ہے۔ مہلک امراض کے لئے آفتاب کی رنگ برنگ شعاعوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دق جیسے خوفناک مرض کے بھی اس سے دُور ہونے کی مثالیں ملی ہیں۔ ڈاکٹر روڈ لیر تو آپریشن کے بجائے

… غسلِ آفتابی سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فیسن بھی آفتاب کی شعاعوں … امراض کا علاج کرتے ہیں۔

غسلِ آفتابی کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال …

(۱) غسلِ آفتابی کرتے وقت سر کو ٹھنڈے رومال یا ہرے پتوں سے … لینا چاہیے۔

(۲) غسلِ آفتابی کا سب سے بہتر وقت طلوعِ آفتاب کا وقت … اگر غسل کا موقعہ نہ ملے تو آفتاب غروب ہوتے وقت کرنا چاہیے۔ تیز … اس کے لئے صبح یا شام کی ہلکی شعاعیں ہی بہتر ہوتی ہیں۔

(۳) غسلِ آفتابی کا آغاز ہوشیاری سے کریں۔ پہلے دن ۵ منٹ … پھر روزانہ پانچ منٹ بڑھاتے جائیں لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں۔

(۴) جتنی دیر غسل کرنا ہو اُس وقفے کے چار حصے کر کے پیٹھ … کے بل، دائیں کروٹ اور بائیں کروٹ سے دھوپ لیں۔ جس سے … لگ سکے۔

(۵) غسلِ آفتابی کرتے وقت جسم پر لنگوٹ کے علاوہ کوئی … رکھیں۔

(۶) کھلی جگہ میں جہاں تیز ہوا نہ آتی ہو غسلِ آفتابی کریں۔

(۷) کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے اور دو گھنٹے بعد تک غسل … کریں۔

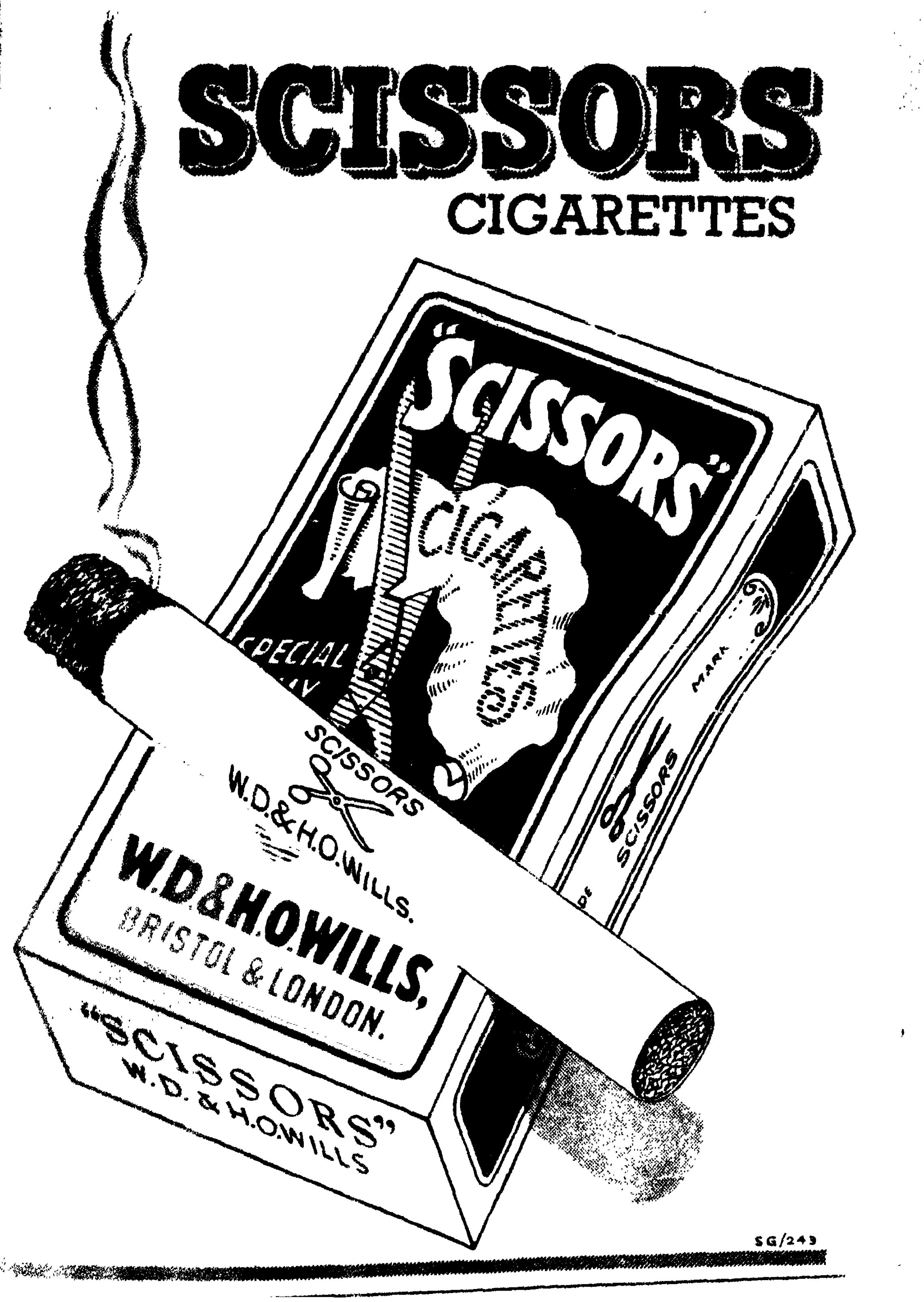
(۸) غسلِ آفتابی کرنے کے بعد ٹھنڈے پانی میں بھیگے ہوئے … کا ہر حصہ خوب رگڑنا فائدہ بخش ہے

(۹) غسلِ آفتابی کے بعد اگر جسم میں چستی اور اُمنگ آتی … ٹھیک ہے۔ اگر سر میں درد یا کسی طرح کی تکلیف محسوس ہو تو غسلِ آفتابی … کر دینا چاہیے۔

(۱۰) ہمیشہ بلاناغہ غسل کریں [illegible] غسل کا پورا فائدہ روز باقاعدہ [illegible] سے حاصل ہوتا ہے۔

عورتیں، مرد سبھی کو غسلِ آفتابی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یورپ، امریکہ [illegible]


SCISSORS
CIGARETTES
"SCISSORS"
CIGARETTES
SPECIAL
SCISSORS
W.D.&H.O.WILLS.
W.D.&H.O.WILLS,
BRISTOL & LONDON.
"SCISSORS"
W.D.&H.O.WILLS
SCISSORS
SG/243

یہ سفید سفوف نیبو کی روح "پکٹین" تھا۔ یہ چیز سبھی پھلوں میں پائی جاتی ہے لیکن
ب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہنگری کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر البرٹ جنھیں ۱۹۳۷ء میں طب کا نوبل پرائز
کے بعد وہ امریکہ میں لیکچر دینے کے لئے گئے تھے۔ اُن کے لیکچر کا خاص موضوع
ی خصوصیات اور اُس کا استعمال"۔

ڈاکٹر سی گلین کنگ نے نیبو سے سب سے پہلے وٹامن سی حاصل کیا تھا لیکن بعد
ں معلوم ہوا کہ کیمیاوی طریقے سے نیبو کے عرق سے نکلا ہوا وٹامن پوست سمیت نیبو
اے ہوئے غیر صاف شدہ وٹامن کی طرح اثر انگیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی
ں آجکل پورا نیبو کھانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ میکسکو کے قدیم باشندے
خیال سے دو نیبو سالم روزانہ کھاتے ہیں۔ ایک ماہر غذا سائنسداں کا کہنا ہے، ان
شندوں کو شاید ہی کبھی دل اور گردے کے امراض ہوتے ہوں۔

نیبو کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ موسموں کے مطابق اپنے
ں و خواص بدلتا رہتا ہے۔ موسموں کی ضرورتوں کے مطابق اثر کرتا ہے۔ یہ غذا کے
اجزا میں ملتا ہے اُن کے اوصاف میں اضافہ کر دیتا ہے۔

نیبو میں ½ حصہ وٹامن، ا حصہ چکنائی، ۸ حصہ کاربوہائیڈریٹ، آدھا حصہ معدنی
اور ۹۰ حصہ پانی ہوتا ہے۔ اِس میں وٹامن بی اور سی زیادہ مقدار میں اور وٹامن
معمولی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

گزشتہ سال جب سرایڈمنڈ ہیلری اور تن سنگھ ایورسٹ کی چڑھائی کے لئے
تھے تو اپنے ساتھ نیبو بھی لے گئے تھے۔ ایورسٹ فتح کرنے کے بیان میں بتایا
کہ اِس مہم میں خاص طور پر جس مشروب کا استعمال کیا گیا وہ تھا نیبو کا شربت۔ اِس
پہاڑی سیاحوں کے کلبوں میں آپ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنیں گے۔ کبھی آلپس کو
کھینچا۔ اور اِس زمانے میں دُنیا کی سب سے اُونچی پہاڑ کی چوٹی کو "نیبو" نے

۳ ——— بُری عادتیں

بُری عادتیں اُس گھاس پھوس کی طرح ہیں۔ جن سے پودوں کی نشوونما رک جاتی
بُری عادتوں کی اِس گھاس پھوس کو دُور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے اِنھیں
جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا۔ اور اُن کی جگہ پر اچھی عادتوں کے پودے لگانا۔ اِس گھاس پھوس
کی پتیوں کو اُوپر سے صرف نوچنے سے کام نہ چلے گا۔ اُنھیں جڑ سے اُکھاڑ کر نیست و
نابود کر دینا ضروری ہے۔

اچھی عادتیں اُن پودوں کی طرح ہیں جن میں بلند خیالی، نیک کرداری اور مستقل
مزاجی کے حسین پھول کھلتے ہیں۔ ان اوصاف سے ہماری زندگی میں حُسن و رعنائی
ہی نہیں آتی، قوت و طاقت بھی آتی ہے۔ اور ہم اپنی منزل کے قریب پہنچتے
ہیں۔

بُری عادتیں ہماری زندگی کا سارا حُسن، ساری تابش برباد کر کے اُسے بدنما
بنا ڈالتی ہیں۔ اچھی عادتوں سے ہماری شخصیت پُرکشش، ہماری زندگی حسین بنتی ہے
لیکن بُری عادتوں کی گھاس پھوس کی جگہ اچھی عادتوں کے خوبصورت پودے کس طرح
لگائے جائیں؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک بُری عادت کو چھوڑ کر اُس کی جگہ
ایک اچھی عادت اختیار کر لینے سے جو ترغیب و تحریک ملے گی وہ عجیب طاقت سے
معمور ہوگی۔ اس طرح ساری بُری عادتوں کو چھوڑ دینا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ ضرورت صرف
مستقل مزاجی کی ہے۔

۴ ——— آپ کا خیال

آپ کا خیال آپ کی سب سے قیمتی دولت ہے۔ تمام مشکلات میں آپ کو فوری
مدد اُسی سے ملتی ہے۔ آپ کی زندگی کی ساری کامیابی، آپ کے خیالات کی نوعیت
آپ کے اپنے عمل اور مستقبل سے متعلق تصورات پر موقوف ہے۔ یہ خیالات سے سوچنے
لینے کا آپ کا طریقہ ہے جو آپ کو کامیاب اور ناکام بناتا ہے۔ آپ زندگی میں جو کرنا
چاہتے ہیں اُس پر زیادہ سے زیادہ غور کیجئے۔ جو آپ نہیں کرنا چاہتے ہیں اُس سے
متعلق خیالات کو اپنے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ دیجئے۔ اُن کے لئے اپنے
ذہن کا دروازہ بند کر دیجئے۔

ہر دن کے وقت کا بہتر استعمال کیسے ہو؟ اپنی طاقتوں کو کس خاص کام
کی طرف لگائیں؟ زندگی کا صحیح استعمال کیسے ہو؟ اپنی صحت کو زیادہ بہتر کیسے بنائیں؟
یہ آپ کو ہمیشہ نہیں بلکہ ہر روز سوچنا چاہئے۔ خیال کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیجئے۔ آپ
کا خیال آپ کی سب سے قیمتی دولت ہے۔

۵ — سورج کی زندگی بخش کرنیں

ہماری زندگی اور صحت کے لئے آفتاب بہت مفید ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو ذی روح اور پیڑ پودے کھلی ہوا اور روشنی میں رہتے ہیں وہ اُن جان داروں اور پیڑ پودوں کی بہ نسبت زیادہ صحت مند، لہلہاتے اور شاداب رہتے ہیں جنھیں آفتاب کی روشنی اور ہوا کم ملتی ہے۔ کھلی فضا اور کھلی روشنی میں گائے، بچھڑے اور دوسرے ذی روح کیسے خوش اور مسرور رہتے ہیں۔ یہ بات کسی سے چھپی ہے؟ جو ساگ سبزیاں دھوپ میں نشو و نما پاتی ہیں اُن میں آفتاب کی شعاعوں سے حیات بخش قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور انھیں کھانے سے بہت سے امراض دُور ہو جاتے ہیں جن پیڑ پودوں کو آفتاب کی روشنی نہیں ملتی وہ یا تو بڑھتے پنپتے ہی نہیں۔ اور اگر بڑھے پنپے بھی تو اُن میں تازگی نہیں رہتی۔ جن مزدوروں کو کان کے اندر کام کرنا پڑتا ہے، اندھیرے جیل خانوں میں برسوں گزارنے پڑتے ہیں۔ کھلی دھوپ اور ہوا نہیں مل سکتی وہ ٹھگنے رہ جاتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر اُداسی چھائی رہتی ہے۔ اُن کی صحت بُری طرح گر جاتی ہے۔ اور جسم طرح طرح کے امراض کا شکار بن جاتا ہے۔ جسم کو صحت مند اور امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے آفتاب کی روشنی کی ناگزیر ضرورت ہے۔

آفتاب کی روشنی سے محروم تاریک کمروں میں رہنے والے کھلے مکانوں میں رہنے والوں کی بہ نسبت زیادہ بیمار ہوتے اور مرتے ہیں۔ ایک انگریزی کہاوت ہے جس گھر میں آفتاب کی روشنی نہیں آتی وہاں ڈاکٹروں کو آنا ہی ہوگا۔

ہندو مذہب کے شاستروں اور آیور ویدوں کی کتابوں میں سورج کی روشنی کی بہت بڑائی کی گئی ہے۔ اِس سے بہت سے امراض دُور ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے انسان بہت سے امراض سے محفوظ رہ کر سَو سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ غذا میں جن اجزا کی کمی رہتی ہے وہ بہت حد تک ہمیں سورج کی کرنوں سے مل جاتے ہیں۔ آج سے دو ہزار سال پہلے یونان کا ایک مشہور طبیب ہپو کریٹز آفتاب کی شعاعوں سے خوفناک امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اب تو مغربی ممالک میں آفتاب کی کرنوں سے امراض کے علاج کا کام عام طور سے لیا جا رہا ہے۔ مہلک امراض کے لئے آفتاب کی رنگ برنگ شعاعوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دق جیسے خوفناک مرض کے بھی اِس سے دُور ہونے کی مثالیں ملی ہیں۔ ڈاکٹر رولیر تو آپریشن کے بجائے غسلِ آفتابی سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فنسن بھی آفتاب کی شعاعوں ... امراض کا علاج کرتے ہیں۔

غسلِ آفتابی کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خاص ...

(۱) غسلِ آفتابی کرتے وقت بھیگا تولیہ یا ہرے پتے ... لینا چاہیے۔

(۲) غسلِ آفتابی کا سب سے بہتر وقت طلوعِ آفتاب کا وقت ... اگر غسل کا موقعہ نہ ملے تو آفتاب غروب ہوتے وقت کرنا چاہیے ... اِس کے لئے صبح یا شام کی ہلکی شعاعیں ہی بہتر ہوتی ہیں۔

(۳) غسلِ آفتابی کا آغاز ہوشیاری سے کریں۔ پہلے دن ... پھر پانچ پانچ منٹ بڑھاتے جائیں لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں۔

(۴) جتنی دیر غسل کرنا ہو اُس وقفے کے چار حصے کر کے پیٹھ ... کے بل، دائیں کروٹ اور بائیں کروٹ سے دھوپ لیں۔ جس سے ... لگ سکے۔

(۵) غسلِ آفتابی کرتے وقت جسم پر لنگوٹ کے علاوہ کوئی ... رکھیں۔

(۶) کھلی جگہ میں جہاں تیز ہوا نہ آتی ہو غسلِ آفتابی کریں۔

(۷) کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے اور دو گھنٹے بعد تک غسل ... کریں۔

(۸) غسلِ آفتابی کرنے کے بعد ٹھنڈے پانی میں بھیگے ہوئے ... کا ہر حصہ خوب رگڑنا فائدہ بخش ہے۔

(۹) غسلِ آفتابی کے بعد اگر جسم میں چستی اور اُمنگ آتی ... ٹھیک ہے۔ اگر سر میں درد یا کسی طرح کی تکلیف محسوس ہو تو غسلِ آفتابی ... کر دینا چاہیے۔

(۱۰) ہمیشہ بلا ناغہ غسل کریں۔ بیچ بیچ میں ناغہ کرنے سے ... غسل کا پورا فائدہ روز باقاعدہ ہی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ... عورتیں، مرد سبھی کو غسلِ آفتابی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

بوبٹ، ڈبلیو، آر، لوکس، جانسن، رولیر، لوئس، رڈوک، ...

یہ سفید صوف لیموں کی رنگ پیکٹین تھا۔ یہ چیز سبھی پھلوں میں پائی جاتی ہے لیکن
ب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہنگری کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر البرٹ جنھیں ۱۹۳۷ء میں طب کا نوبل پرائز
ہے کے بعد وہ امریکہ میں لیکچر دینے کے لئے گئے تھے۔ اُن کے لیکچر کا خاص موضوع
ل خصوصیات اور اُس کا استعمال"

ڈاکٹر سی گلین کنگ نے لیموں سے سب سے پہلے وٹامن سی حاصل کیا تھا لیکن بعد
معلوم ہوا کہ کیمیاوی طریقے سے لیموں کے عرق سے نکلا ہوا وٹامن پوست سمیت لیمو
لے ہوئے غیر صاف شدہ وٹامن کی طرح اثر انگیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی
ب آجکل پورا لیموں کھانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے میکسیکو کے قدیم باشندے
یال سے دو لیموں سالم روزانہ کھاتے ہیں۔ ایک ماہرِ غذا سائنسدان کا کہنا ہے، ان
غذوں کو شاید ہی کبھی دل اور گردے کے امراض ہوتے ہوں۔

لیموں کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ موسموں کے مطابق اپنے
و خواص بدلتا رہتا ہے۔ موسموں کی ضرورتوں کے مطابق اثر کرتا ہے۔ یہ غذا کے
جزا میں ملتا ہے اُن کے اوصاف میں اضافہ کر دیتا ہے۔

لیموں میں ½ حصہ وٹامن، ا حصہ چکنائی، ۸ حصہ کاربوہائیڈریٹ، آدھا حصہ معدنی
ور ۸۹ حصہ پانی ہوتا ہے۔ اِس میں وٹامن بی اور سی زیادہ مقدار میں اور وٹامن
عمولی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

گزشتہ سال جب سر ایڈمنڈ ہیلری اور تن سنگھ ایورسٹ کی چڑھائی کے لئے
ئے تھے تو اپنے ساتھ لیموں بھی لے گئے تھے۔ ایورسٹ فتح کرنے کے بیان میں بتایا
ہے کہ اِس مہم میں خاص طور پر جس مشروب کا استعمال کیا گیا وہ تھا لیموں کا شربت۔ اِس
ئے پہاڑی سیاحوں کے کلبوں میں آپ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سُنیں گے کبھی ایلپس کو
لیموں نے جیتا۔ اور اِس زمانے میں دُنیا کی سب سے اُونچی پہاڑ کی چوٹی کو "لیموں" نے
یا"

۳ —— بُری عادتیں

بُری عادتیں اُس گھاس پھوس کی طرح ہیں۔ جن سے پودوں کی نشو و نما رک جاتی
ہے۔ بُری عادتوں کی اِس گھاس پھوس کو دُور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے اِنھیں
جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا۔ اور اُن کی جگہ پر اچھی عادتوں کے پودے لگانا۔ اِس گھاس پھوس
کی پتیوں کو اُوپر سے صرف نوچنے سے کام نہ چلے گا۔ اُنھیں جڑ سے اُکھاڑ کر نیست و
نابود کر دینا ضروری ہے۔

اچھی عادتیں اُن پودوں کی طرح ہیں جن میں بلند خیالی، نیک کرداری اور مستقل
مزاجی کے حسین پھول کھلتے ہیں۔ اِن اوصاف سے ہماری زندگی میں حُسن و رعنائی
ہی نہیں آتی، قوت و طاقت بھی آتی ہے۔ اور ہم اپنی منزل تک جلد پہنچتے
ہیں۔

بُری عادتیں ہماری زندگی کا سارا حُسن، ساری تابش، برباد کر کے اُسے بدنُما
بنا ڈالتی ہیں۔ اچھی عادتوں سے ہماری شخصیت پُرکشش، ہماری زندگی حسین بنتی ہے
لیکن بُری عادتوں کی گھاس پھوس کی جگہ اچھی عادتوں کے خوبصورت پودے کس طرح
لگائے جائیں؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک بُری عادت کو چھوڑ کر اُس کی جگہ
ایک اچھی عادت اختیار کر لینے سے جو تر غیب و تحریک ملے گی وہ عجیب طاقت سے
معمور ہو گی۔ اِس طرح ساری بُری عادتوں کو چھوڑ دینا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ ضرورت صرف
مستقل مزاجی کی ہے۔

۴ —— آپ کا خیال

آپ کا خیال آپ کی سب سے قیمتی دولت ہے۔ تمام مشکلات میں آپ کو فوری
مدد اُسی سے ملتی ہے۔ آپ کی زندگی کی ساری کامیابی، آپ کے خیالات کی نوعیت
آپ کے اپنے عمل اور مستقبل سے متعلق تصورات پر موقوف ہے۔ یہ خیالات سے کام
لینے کا آپ کا طریقہ ہے جو آپ کو کامیاب اور ناکام بناتا ہے۔ آپ زندگی میں جو کرنا
چاہتے ہیں اُس پر زیادہ سے زیادہ غور کیجئے۔ جو آپ نہیں کرنا چاہتے ہیں اُس سے
متعلق خیالات کو اپنے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ دیجئے۔ اُن کے لئے اپنے
ذہن کا دروازہ بند کر دیجئے۔

ہر دن کے وقت کا بہتر استعمال کیسے ہو؟ اپنی طاقتوں کو کس خاص کام
کی طرف لگائیں؟ زندگی کا صحیح استعمال کیسے ہو؟ اپنی صحت کو زیادہ بہتر کیسے بنائیں؟
یہ آپ کو ہمیشہ نہیں بلکہ ہر روز سوچنا چاہئے۔ خیال کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیجئے۔ آپ
کا خیال آپ کی سب سے قیمتی دولت ہے۔

آنکھوں کی حفاظت نامی کتاب مصنفہ پروفیسر مہر چند کھنہ ایم اے خط لکھ کر مفت حاصل کیجئے۔ اپنی آنکھوں کو مختلف امراض سے بچانے کے طریقے اور بینائی تیز کرنے کے راز درج کئے گئے ہیں۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی"

۱۰ —— قدرت انسان کو صحت مند رکھنا چاہتی ہے

آپ یقین کریں چاہے نہ کریں، صحت دنیا کی سب سے زیادہ قدرتی چیز ہے۔ ہم سب انسان قدرت کا انگ، قدرت کا حصہ ہیں۔ اِس لئے قدرت ہمیں صحت مند رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ ہم سے کام لینا چاہتی ہے۔ دوسروں کی مدد کے کام، دوسروں کی بھلائی کے کام۔

۱۱ —— اُمید کی شمع نہ بجھنے دو

نامساعد حالات کے طوفان میں بھی اُمید کی شمع کو نہ بجھنے دو۔ حالات کے بھیانک اندھیرے میں اُمید کی شمع تمہاری تاریک راہوں کو روشن کردے گی۔ نامساعد حالات کے طوفان میں بھی اُمید کی شمع نہ بجھنے دو۔

۱۲ —— ہمتِ مرداں مددِ خدا

زندگی کا پودا ہمت کی کھاد مانگتا ہے۔ لیکن آپ اسے بازار میں جاکر خرید نہیں سکتے۔ کوئی دوست آپ کو اُس کی سوغات، اُس کا تحفہ نہیں بھیج سکتا۔ کوئی جادو منتر بھی اُسے لاکر آپ کے ہاتھ پر نہیں رکھ سکتا۔ ہمت کا سبھاؤ شرمیلا اور ذرا پیچھے رہنے کا ہے۔ اِس دوشیزہ کا پیار آپ آگ میں کود کر اور اپنے سب کچھ کی بازی لگا کر ہی حاصل کرسکتے ہیں اور جب وہ آپ کی ہو جائے گی تو پھر آپ سب کچھ پاجائیں گے۔ کامیابی و کامرانی، عزت و وقار، قوت و اقتدار۔!!

۱۳ —— پڑھتے وقت

اگر آپ کو زیادہ پڑھنا پڑتا ہو تو پڑھتے وقت کبھی کبھی کتاب سے نظر اُٹھا کر آسمان میں یا دور کی کسی چیز کو دیکھ لینے سے آپ کی آنکھوں کو نئی قوت ملے گی۔ جن لوگوں کو زیادہ پڑھنا پڑتا ہے اُن کے لئے ایک اور اچھا تجربہ یہ ہے کہ ایک بار آسمان کی طرف دیکھیں۔ دوسری بار اپنی ناک کی نوک پر نظر مرکوز کریں۔ اِسی طرح ایک بار آسمان کی طرف دوسری بار اپنی ناک کی نوک کی طرف دیکھنے کا یہ عمل کئی بار کریں۔ دن میں چند بار یہ عمل تھوڑی دیر تک کرنے سے آنکھوں کو نئی طاقت ملتی رہتی ہے۔

۱۴ —— تاروں کا گیت

تاریک راتوں میں چمکنے والے تاروں کا گیت آپ نے سنا ہے؟ تم بھی گوشِ دل سے سنو، خاموش تاروں کا گیت ——

"ہم تاریک راتوں میں بھی مسکراتے ہیں۔
ہم تاریکی سے خوف نہیں کھاتے۔
ہم تاریکی سے ڈر کر افسردہ نہیں ہوتے۔
تاریکی ہمارے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں چھین سکتی۔
حالات کے اندھیرے سے تم بھی خوف نہ کھاؤ۔
حالات کے اندھیرے میں تم بھی مسکراؤ۔
تم بھی ہماری طرح گیت گاؤ!!"

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدّنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کیے جاتے ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے۔ ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی

ق - و - قادری وارث

س۔ انسان نہ ہوتا تو؟

ج۔ دنیا سُونی سُونی ہوتی۔ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے دھماکے ہوتے، نہ مشین گنوں کی گونج ہوتی، نہ امن اور انسانیت کے تحفظ کے نام پر جنگ کے نعرے ہوتے۔

س۔ دنیا میں غریبی نہ ہوتی تو؟

ج۔ امیروں کے قصر و محل بنانے کے لئے مزدور نہ ملتے۔

س۔ دل کی تمنا کب بر آتی ہے؟

ج۔ جب اِس کے لئے دل سے جد و جہد کی جاتی ہے۔

علاءالدین احمد ساغر داناپور پٹنہ

س۔ تنہائی کا بہترین ساتھی؟

ج۔ سرمایہ دار کے لئے ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی نئی راہ سوچنا
لیڈر کے لئے اپنے حریف کو شکست دینے کے لئے کوئی شاطرانہ چال سوچنا
کسی وزیر یا منسٹر کے لئے پُرانے ٹیکسوں میں اضافہ کرلے اور نئے ٹیکس لگانے کے لئے پلان سوچنا!

س۔ کیا زندگی اضطرابِ پیہم ہے؟

ج۔ ہاں، آج زندگی اضطرابِ پیہم ہے، کبھی سکون بداماں تھی۔

محمد یوسف اعوان ہری پور ہزارہ

س۔ جب کسی قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو اُس میں بڑے بڑے مائیہ ناز شعراء و ادبا جنم لینے لگتے ہیں۔ اِس راز کو افشا کیجئے۔

ج۔ یہ کوئی راز نہیں، جسے افشا کیا جائے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ تخریب کی انتہا کے بعد تعمیر کی ابتدا ہوتی ہے۔

ش - شرقی - پٹنہ

س۔ انتخابات کے لئے چُنے جانے والے اُمیدوار صاحبِ دولت اور صاحبِ سوجھ ہی

کیوں ہوتے ہیں ؟

ج۔ اس لئے کہ کامیاب ہونے کے لئے اپنی دولت خرچ کریں، اپنے اثر و رسوخ سے کام لیں۔ ایسے ایثار پیشہ، لوگ آپ کو کیوں پسند نہیں جو ایثار و قربانی آج کرتے ہیں اور اس کا صلہ بعد میں وصول کرتے ہیں۔

س۔ کیا دولت عقل کو بھی خرید سکتی ہے ؟

ج۔ ہاں آج یہی ہو رہا ہے، ورنہ کبھی عقل دولت خریدتی تھی۔ آج کتنے صاحب علم و عقل حالات سے مجبور ہو کر دولت کے ہاتھ بک رہے ہیں۔

س۔ کیا موجودہ حالت میں مصر کا ساتھ دینا، حق اور سچائی کا ساتھ دینا نہیں ہے ؟

ج۔ آج ساری دنیا کہہ رہی ہے، مصر کا ساتھ دینا حق اور صداقت کا ساتھ دینا ہے۔

بھیم پرکاش۔ حیدرآباد (دکن)

س۔ زندگی سے زیادہ قیمتی چیز کون سی ہے ؟

ج۔ وہ موت جو باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت میں آئے۔

س۔ دنیا میں دولت سے بڑی بھی کوئی چیز ہے ؟

ج۔ عزت !

ایس۔ اے۔ نعیمی۔ منی ہاری۔ پورنیہ

س۔ دنیا کے مہذب ملکوں میں سب سے زیادہ تہذیب یافتہ باوقار ملک کون سا ہے ؟

ج۔ تہذیب اور وقار کے دعوے دار تو مغربی ممالک ہیں، لیکن درحقیقت ہندوستان سب سے زیادہ مہذب اور باوقار ہے۔

س۔ علامہ اقبال کا یہ خیال کہاں تک درست ہے ؟

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ج۔ سو فیصدی صحیح ہے۔

س۔ عورت اور دولت میں کیا فرق ہے ؟

ج۔ عورت ماں، بہن، بیٹی، بیوی ہے اور محبوبہ بھی ہے۔ دولت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی نہیں، صرف محبوبہ ہے اور وہ بھی بے وفا !

سید حبیب الرحمٰن۔ ڈونڈ۔ پونہ

س۔ آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے ؟

ج۔ ہر انسان آدمی ہوتا ہے، لیکن ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔

س۔ انسان کا فرض کیا ہے ؟ اگر وہ اپنا فرض بھول جائے تو ؟

ج۔ انسان کے بہت سے فرائض ہیں، ان میں سے سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض ہے، انسانیت کی خدمت۔ جو انسان اپنا یہ فرض بھول جائے اُسے انسان نہ کہنا چاہئے۔ وہ انسان نہیں۔

ایم۔ جے۔ صدیقی۔ شاہ پور

س۔ حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک اس کا دوسرا مصرعہ لکھئے ؟

ج۔ کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فیض سہسرامی۔ سہسرام

س۔ کیا ہر انسان کا ابن الوقت، ہونا ضروری ہے ؟

ج۔ ہر انسان کا ابن الوقت ہونا ضروری نہیں، اگر ہر انسان ابن الوقت ہو تو دنیا کا بیڑا غرق ہو جائے۔ ہاں، ہر دور میں ابن الوقت ہوئے ہیں۔ آج بھی ایسے کتنے ابن الوقت ہیں جو جنگِ آزادی میں جے چند اور میر جعفر کو شرما رہے تھے، اور آج قوم کی قیادت کے دعوے دار ہیں۔

راجندر پرکاش۔ بتورہ۔ نورٹ بمبئی

س۔ مانا کہ عورت ایک پھول ہے، لیکن بعض حالتوں میں کانٹا کیوں بن جاتی ہے ؟

ج۔ مرد اس پھول کو کانٹا بنا دیتا ہے۔

س۔ بے چینیوں کا واحد علاج ؟

ج۔ بے چینیوں کو چین بنا لیجئے !

افتخار احمد ۔ چھبا چھا

س ۔ انگریزوں کے زمانے میں ہم غلام ہوتے ہوئے بھی آرام کی زندگی گزار رہے تھے، اور اب آزاد ہو گئے لیکن آرام کی زندگی نصیب نہیں؟

ج ۔ آزادی اور غلامی کا فرق اُن زندۂ جاوید سرفروشوں سے پوچھئے جو وطن کی آزادی کے لئے جنگِ آزادی میں قربان ہو گئے، جنہوں نے جوش کی زبان سے یہ پیامِ سروش سنا تھا ؎

"سُنو اے ساکنانِ خاکِ پستی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ہے اِک لمحہ بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے"!!

س ۔ لوگوں کے کام اور عمل کس وقت ضائع اور بے نتیجہ ہو جاتے ہیں؟

ج ۔ کام اور عمل کبھی بے نتیجہ اور ضائع نہیں ہوتے۔

دوارکا پرشاد باگھ ۔ سمبلپور

س ۔ بیاہ کا نام سُن کر جوان لڑکیوں کے دل کی دھڑکنیں کیوں بڑھ جاتی ہیں۔؟

ج ۔ وہ سوچنے لگتی ہیں، اپنی بہن کے ساتھ اچھے سلوک کا متمنی اُن کا جیون ساتھی اُن کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟ ان کے لئے کیسا ہوگا؟

س ۔ جب انسان کے اندر سے اُس کی انسانیت نکل جاتی ہے تو اور کیا رہ جاتا ہے؟

ج ۔ ایک ایسا پنجر جسے انسان کہنا انسان کی عظمت کی توہین ہے۔

س ۔ اے سیمتن ۔ سیمیں بدن ۔ خوش پیرہن ۔ شاخِ سمن ۔ صبحِ چمن ۔ جانِ وطن ــــ اور ۔۔۔۔ ؟

ج ۔ مہرِ وطن پہ دیوانہ ساں ہو جا نثار!

عین الحق سیروی ۔ بیسرا ۔ سُندرگڑھ

س ۔ عورتیں بے شرم کیوں ہو گئیں؟

ج ۔ اس لئے کہ مرد بے شرم ہو گئے۔

س ۔ مرد کا دل کمزور کیوں ہو گیا ہے؟

ج ۔ غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں کا بوجھ اٹھاتے اُٹھاتے!

س ۔ بے قصور قصوروار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟

ج ۔ قانون اندھا ہوتا ہے۔

محمد اعجاز تبسّل ۔ پٹنہ

س ۔ بھائی صاحب! کچھ لوگ کہتے ہیں، شادی کا دوسرا نام موت ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج ۔ یہ بالکل غلط ہے۔ شادی ایک حسین زندگی کا آغاز ہے ۔ شادی زندگی کی تکمیل ہے۔

ایم ۔ جی ۔ ایم ۔ مرتضیٰ ۔ پٹنہ

س ۔ کیا ہندوستان ہر لحاظ سے بالکل آزاد ہے؟

ج ۔ کیا آپ کو شک ہے؟ یہ اور بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں ؎

اب بھی ہے مُردہ و پامال دِ خزاں دیدہ ہے
کتنے ہونٹوں کے جواں سال تبسم کی بہار
زندگی آج بھی غمناک دھندلکوں میں ہے گم

س ۔ میں کالج میں مسرور رہتا ہوں، گھر میں مغموم ۔ ایسا کیوں؟ کوئی تدبیر بتائیے۔

ج ۔ آپ ہی جیسے نوجوانوں کے لئے اکبر مرحوم نے کہا تھا ؎

ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر!

آپ اِس حقیقت کو کیوں بھولتے ہیں کہ کالج تعلیم گاہ ہے تفریح گاہ نہیں۔

س ۔ آجکل عریانیت شباب پر ہے، اِسے کس طرح نیست و نابود کیا جا سکتا ہے؟

ج ۔ لوگوں میں اچھے خیالات پیدا کرکے۔

س ۔ افسانہ نگار بننے کے لئے کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے؟

ج ۔ یہ بہت ہی تفصیل طلب سوال ہے۔ اس کا جواب سرگوشیوں میں دینا مشکل ہے مطالعہ اور کسی ماہرِ فن سے استفادہ آپ کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

کے۔ سی۔ کلوی

س۔ کسی سے تھوڑی سی محبت ہو جائے تو محبت بڑھانے کا طریقہ؟

ج۔ اُس کے ساتھ اخلاص سے پیش آیئے

س۔ آجکل شادی شدہ انسان سُکھی رہ سکتا ہے یا کنوارا؟

ج۔ اس بیکاری کے دَور میں کنوارہ! اور اگر ہو سکے تو اپنی جان کے بوجھ سے بھی سبکدوش ہو جانے والا!! اس بیکاری کے دَور میں شادی کر کے انسان اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے ــــ دو گونہ رنج و عذاب ست جانِ مجنوں را!

س۔ لڑکیاں مطلب کی یار ہوتی ہیں یا لڑکے؟

ج۔ کبھی لڑکیاں کبھی لڑکے۔

شیخ بابن حیدرآبادی عرف بابو پان والے شکر نگر

س۔ انسان اپنے مقصد میں کب کامیاب ہوتا ہے؟

ج۔ جب اُس کے عزم میں استقلال اور دل میں سچی لگن ہوتی ہے۔

میر سمیع اللہ۔ سرینواس پور

س۔ ایک اچھے دوست کی پہچان؟

ج۔ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

س۔ انسان کونسا راستہ اختیار کرے جسمیں کامیابی ہی کامیابی ہو۔

ج۔ ایمانداری اور سچائی کا راستہ!

س۔ ہمارا ایک دوست کہتا ہے ــــ انسان فطری طور پر خود غرض ہوتا ہے؛ لیکن میں کہتا ہوں، خود غرض نہیں ہوتا حالات اور ماحول اُسے خود غرض بنا دیتے ہیں۔ فیصلہ آپ پر چھوڑا۔

ج۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔

سردار قریشی کٹیہار

س۔ زندگی کی ضروریات کو کس طرح پورا کیا جائے؟

ج۔ محنت اور مستقل مزاجی سے پیسے کما کر۔

س۔ کسی کو کھو کر پانے کی راہ بتلایئے۔

ج۔ سچے پیار اور سچی لگن سے تلاش کیجئے۔

محمد خلیل انجم۔ رانچی

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ محبت اور موت کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا؟

ج۔ محبت کا تو ہمیں تجربہ نہیں، جو لوگ مرنا نہیں چاہتے موت اُن کے پاس آکر لوٹ جاتی ہے۔ موت اُن کے پاس آکر زندگی بن جاتی ہے۔

س۔ دنیا کا امیر ترین شخص کون ہے اور کہاں ہے؟

ج۔ کیا آپ اُس سے مل کر غریبوں کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر امیر تو غریبوں کی بات نہیں سنتے۔

ایم۔ اے۔ مظلوم۔ سی۔ ایم کالج دربھنگہ

س۔ عورت کی سب سے بڑی آرزو؟

ج۔ اُس کے حسن و شباب کا چمن کبھی خزاں آشنا نہ ہو۔

س۔ یہ جانتے ہوئے کہ شمع جلا کر خاک کر دیتی ہے پروانے اُس پر کیوں جلتے ہیں؟

ج۔ جذبۂ بے اختیار اُنہیں کھینچ کر لے جاتا ہے

سراج تسنیم۔ حیدرآباد دکن

س۔ دوست کے انتخاب میں کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے؟

ج۔ ایسے شخص کو دوست بنانا چاہیئے جو نیک کردار، پُر خلوص اور سمجھدار ہو۔

زبیدہ غنی۔ مدراس

س۔ میں سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں کیا میں بیسویں صدی کی سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر روانہ کر سکتی ہوں؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ بیسویں صدی کے لئے آپ نے جو حسین اور دلکش تصاویر بھیجنے کا سلسلہ کیا ہے

د کس طرح بھیجی جاسکتی ہیں ؟ میرا مطلب ہے تصویر بھیجیں یا نگیٹو ؟

ج۔ تصویر گلیزڈ کاغذ پر۔

انوار اسلم ۔ نیلو تھو ۔ شاہ آباد

س۔ ہر سویز کو قومیانے پر فرانس اور برطانیہ انسانیت کے جامے سے باہر کیوں ہوگئے؟!

ج۔ یہ انصاف و دیانت کے دعوے دار۔ امن و انسانیت کے علمبردار جو ہوئے !

عبد الحلیم صدیقی ۔ علی گڈھ

س۔ خوشتر صاحب آسمان پر ٹمٹمانے ہوئے ستارے کس کے منتظر رہتے ہیں ؟

ج۔ دامن افق سے مسکرانے والی صبح کے !

س۔ اگر منزل کے پاس پہنچ کر راہی بھٹک جائے تو ؟

ج۔ حوصلہ نہ ہارنا چاہئے۔ منزل تک پہنچنے کی سچی لگن ہے تو اسے ضرور راہ مل جائے گی۔

ایم ۔ شفیع احمد نگری ۔ احمد نگر

س۔ عورت تیرا نام بے وفائی ؟

ج۔ عورت کے متعلق ہمارا خیال بہت بلند ہے۔ عورت کی وفاداری عدیم المثال ہے۔ کتنی عورتیں اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہوگئیں۔ کیا کوئی مرد بھی اپنی بیوی کے ساتھ ستی ہوا ؟

س۔ عشق و فرض میں کیا فرق ہے اور آخر میں جیت کس کی ہوتی ہے ؟

ج۔ عشق تباہی کے غار میں گرا دیتا ہے اور ادائے فرض زندگی میں سربلند اور مرنے کے بعد لافانی بنا دیتا ہے ۔۔۔ جیت فرض کی ہوتی ہے۔

ایم ۔ ایم ۔ ضیاء ۔ کٹیہار

س۔ انسان متعصب کب ہوجاتا ہے ؟

افسانہ

جہاں زندگی حسین ہے

از

جناب اختر عادل رُوپ

جامع مسجد قلعہ۔ بریلی۔ اُتر پردیش

محترمی! آداب

پچھلے دنوں اپنے وطن مارہرہ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جب میں یہاں واپس آیا تو مجھے وہاں کے قدرتی مناظر اور سادہ ماحول کی یاد آنے لگی۔ وہاں رہ کر میں سچ مچ اپنی زندگی کے دُکھ بھول گیا تھا۔ اور سبزہ زاروں میں گھومتے ہوئے میں نے عجیب سکون کا احساس کیا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ انسان کی بنائی ہوئی مصنوعی دُنیا اُس کے سامنے کتنی جھوٹی اور تکلیف دہ ہے۔ میرے دل میں اُسی قدرتی ماحول میں زندگی گزار دینے کی چاہت ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ اسے مکمل کرنے کے بعد مجھے کسی حد تک تسکین مل گئی ہے۔ اگر آپ بھی اسے پڑھ کر ایسا ہی محسوس کریں گے تو میں سمجھوں گا میری محنت کامیاب ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے سچ کہا ہے۔ اپنی رائے ضرور لکھئے۔

مخلص

اختر عادل رُوپ

مجبور ہو کر آپ کو یہ پرچہ لکھ رہی ہوں تاکہ آپ بے خود بنے وہاں تک نہ پہنچ جائیں جہاں سے آپ کو تنہا لوٹتے ہوئے دُکھ ہو۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے میں اپنے کمرے کے بنگلے میں صرف اس لئے آ بیٹھتی ہوں کہ ذرا ہوا پا سکوں۔ اور کچھ پڑھ سکوں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی راہ گیر سے ہو سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ آپ سامنے اپنے کمرے میں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کریں گے۔ اور مجھے بھی خواہ مخواہ کی اُلجھن سے نجات دیں گے۔ شکریہ!

آپ نے بھی مجھے غلط سمجھا ہے۔ آپ سے مجھے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ پڑھنے والی کسی لڑکی سے ہو سکتی ہے لیکن میرے فن کو آپ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے میرا نام المنظر ہے اور میں تصویریں بنایا کرتا ہوں۔ ممکن ہے کسی نمائش میں آپ نے میری بنائی ہوئی تصویریں بھی دیکھی ہوں۔ آجکل میں آپ کی ایک تصویر بنا رہا ہوں۔ اُس کی تکمیل کے بعد آپ مجھے اس طرح بیٹھا نہ پائیں گی۔ اور اگر ارشاد ہو گا تو میں یہ کمرہ بھی چھوڑ دوں گا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ تصویر مکمل ہونے تک آپ مجھے اسی طرح بیٹھی نظر آئیں گی۔ شکریہ!

المنظر صاحب!

بہت خوشی ہوئی آپ کا پرچہ پڑھ کر۔ میں نے آپ کی بنائی ہوئی چند تصویریں دیکھی ہیں۔ بہت اچھی تھی وہ تصویر جس میں ایک لڑکی پھولوں کے پودے کے نیچے

ج۔ جب تنگدل اور تنگ نظر ہو جاتا ہے۔

س۔ متعصب شخص کی پہچان کیا ہے۔

ج۔ متعصب شخص تنگدل اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

سید عرفان علی۔ لالوکھیت کراچی

س۔ خوشتر بھائی! آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں؟ آپ سے ملاقات کرنے کے لئے بہت سے شیدائی آرزومند ہیں۔

ج۔ دیکھئے حالات اور حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات کب دل کا ساتھ دیتی ہیں۔ ہمیں بھی پُرخلوص دوستوں اور بھائیوں سے مل کر بے حد مسرت ہوگی۔

س۔ اکیسویں صدی جب شروع ہوگی تو آپ بیسویں صدی کا نام یہی رہنے دیں گے یا اِسے بھی تبدیل کر دیں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" قارئین کا ہے۔ یہ تو اُن کی پسند اور اُن کی مرضی پر موقوف ہوگا۔

مسز رقیہ بانو خطیب۔ پروانگر

س۔ میری ایک سہیلی رضیہ سینما دیکھنے کی بہت ہی شوقین ہے۔ اُس کی اِس عادت کو کس طرح چھڑایا جائے؟

ج۔ نفسیاتی طور پر سینما کی بُرائیاں بتاکر۔

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ شوہر کی خدمت کرنا خدا کی عبادت کے برابر ہے؟

ج۔ اگر یہ صحیح نہیں ہے، تو یہ بالکل صحیح ہے کہ شوہر کا درجہ بہت بڑا ہے۔ اُس کی خدمت و اطاعت بیوی پر فرض ہے۔ ساتھ ہی بیوی کی دلجوئی اور دلنوازی بھی شوہر پر واجب ہے۔

س۔ محبت ایک پاک لفظ ہے، لیکن ہوس پرستوں نے اِس لفظ کو ناپاک بنا دیا۔ یہ سب کیونکر ہوتا ہے؟

ج۔ جیسے بھی ہوا، لیکن اچھا ہوا۔ اُس پر سے حسین ملمع اُتر گیا۔

دلشاد نبی صدیقی۔ بمبئی

س۔ براہ کرم مندرجہ ذیل الفاظ کے معنے بتائیے:۔
آریہ ستیہ چتشٹیہ۔ کُشل دھرم۔ دھمم پد۔ بگیہ۔

ج۔ بہت سوچنے کے بعد ہم تو یہی کہیں گے ـــــ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

س۔ آج کی ارزاں شے؟

ج۔ لیڈری!

عبدالرشید ترابی۔ سرینگر

س۔ اگر زندگی میں انسان کے لئے ساتھی ہونا ضروری ہے تو آپ فرمائیں کہ میں کس کو ساتھی بناؤں۔

ج۔ اگر اب تک آپ نے کسی کو شریکِ حیات نہیں بنایا ہے تو ایسی عورت کو جیون ساتھی بنا لیجئے، جو زندگی کے سفر میں خلوص و محبت اور وفاداری سے آپ کا ساتھ دے۔ ایک ساتھی کے بغیر زندگی کا سفر طے ہونا بہت مشکل ہے۔

رام کشن بجاج۔ پانی پت

س۔ کیا شاعر کے اِس خیال پر عمل پیرا ہونا چاہیئے؟ ع

کسی کو نہ تُو اپنا راز آشنا کر
کسی سے نہ انصاف کی التجا کر
کسی سے نہ اخلاص کا مدعا کر
خودی سے خودی کے لئے مانگو دعائیں
خبردار! آنکھوں میں آنسو نہ آئیں

ج۔ شاعر کا خیال تو اچھا ہے۔ اشعار کچھ اچھے نہیں ہیں۔

س۔ کیا دان دینا کارِ ثواب ہے؟ اور کس کس کو اس کا مستحق سمجھنا چاہیئے؟

ج۔ دان دینا بے شک کارِ ثواب ہے۔ جو واقعی معذور اور مجبور ہوں، وہ اُس کے مستحق ہوتے ہیں۔

س۔ میں نے مڈل تک اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اب میری خواہش ہے کہ اس زبان

ہیں اور استعداد بڑھاتی ہیں۔ براہ کرم کچھ کتابوں کے نام تحریر فرمائیں، جن کے مطالعے سے میری استعداد میں اضافہ ہو۔

ج۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں۔ جن کے مطالعے سے آپ کی استعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اچھے رسائل کا مطالعہ بھی کچھ کم مفید نہ ثابت ہوگا۔

ایم۔ زین العابدین۔ جھاجھا

س۔ اگر دکھ اور مصیبت پہاڑ بن کر سامنے آجائے تو اُس وقت اپنی قسمت سے شکوہ کرنا چاہیئے یا خدا سے یا اپنے اعمال سے؟

ج۔ کسی سے شکوہ نہ کرنا چاہیئے۔ دکھ اور مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرنا چاہیئے۔

س۔ اگر مستقبل تاریک نظر آئے تو؟

ج۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔ عزم و عمل کی شمع روشن رکھنی چاہیئے ——— صبح پھوٹے گی اِسی رات کی تاریکی سے۔

س۔ اردو کا مستقبل؟

ج۔ ہندی کے تنگ دل حامی اردو کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ حکومت اُردو کی سرپرستی نہیں کر رہی ہے۔ پھر بھی اردو کا مستقبل روشن و تابناک ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی ۳۳ ہزار زبانوں میں جس زبان کا نمبر تیسرا ہو، اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔ دنیا کی کوئی طاقت اُس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی۔

ایس۔ ایم۔ قریشی۔ سرگودھا

س۔ دنیا میں سب سے اچھی عورت کون سی ہے؟

ج۔ جو امن و انسانیت کا پرچم بلند کرنے والے بیٹوں کو جنم دے ——— جو ظلم کوشی و امن و انسانیت سوزی کے خلاف جہاد کرنے والے سرفروشوں کو جنم دے!

س۔ میونسپلٹی کمیٹی والے مسجد کے بجائے لیڈیز پارک کیوں بنا رہے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ کہیں لیڈیاں مسجدوں سے منبر و مُصلّے ہٹا کر اُنہیں لیڈیز پارک نہ بنا دیں! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

س۔ خداوند کریم جناب محمد صلعم پر دن رات کون سے درود کی تسبیح کرتا ہے؟

ج۔ یہ پوچھنے کے بجائے آپ یہ کیوں نہیں پوچھتے ——— سرورِ کائنات پر میں کونسا درود دن رات بھیجا کروں؟

ابواللیث جاوید رُہتاسی۔ رہتاس

س۔ کیا دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے ہائیڈروجن بم وجود میں آیا؟

ج۔ جی ہاں! امن و انسانیت کی تاریخ میں ہائیڈروجن بم کا ایجاد کرنے والوں کا نام بڑا پُر عظمت ہوگا! امن و انسانیت کی تاریخ اُن کے اِس کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتی!

س۔ پنج سالہ پلان ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟

ج۔ بہتوں کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ بہتوں کے لئے غیر مفید! ——— پلان کو عملی جامہ پہنانے والوں کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے اور جن کے لئے پلان بنایا گیا ہے اُن کے لئے غیر مفید ثابت ہو رہا ہے۔

ایس۔ اے۔ نعیمی۔ پورنیہ

س۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے، خوشتر صاحب ہندو ہیں۔ میں کہتا ہوں، نہیں مسلمان ہیں۔ آخر اِس معمّہ کا صحیح حل کیا ہے؟

ج۔ ہم انسان ہیں! ویسے قریب سے دیکھنے والے کہتے ہیں، ہماری ——— ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری!

س۔ دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت اور قیمتی مسجد کہاں ہے؟

ج۔ معلوم ہوتا ہے آپ حد سے زیادہ رجعت پرست ہیں جو مسجد اور مندر کی بات پوچھتے ہیں۔ یہ پوچھئے دنیا میں سب سے خوبصورت سنیلال کہاں ہے؟

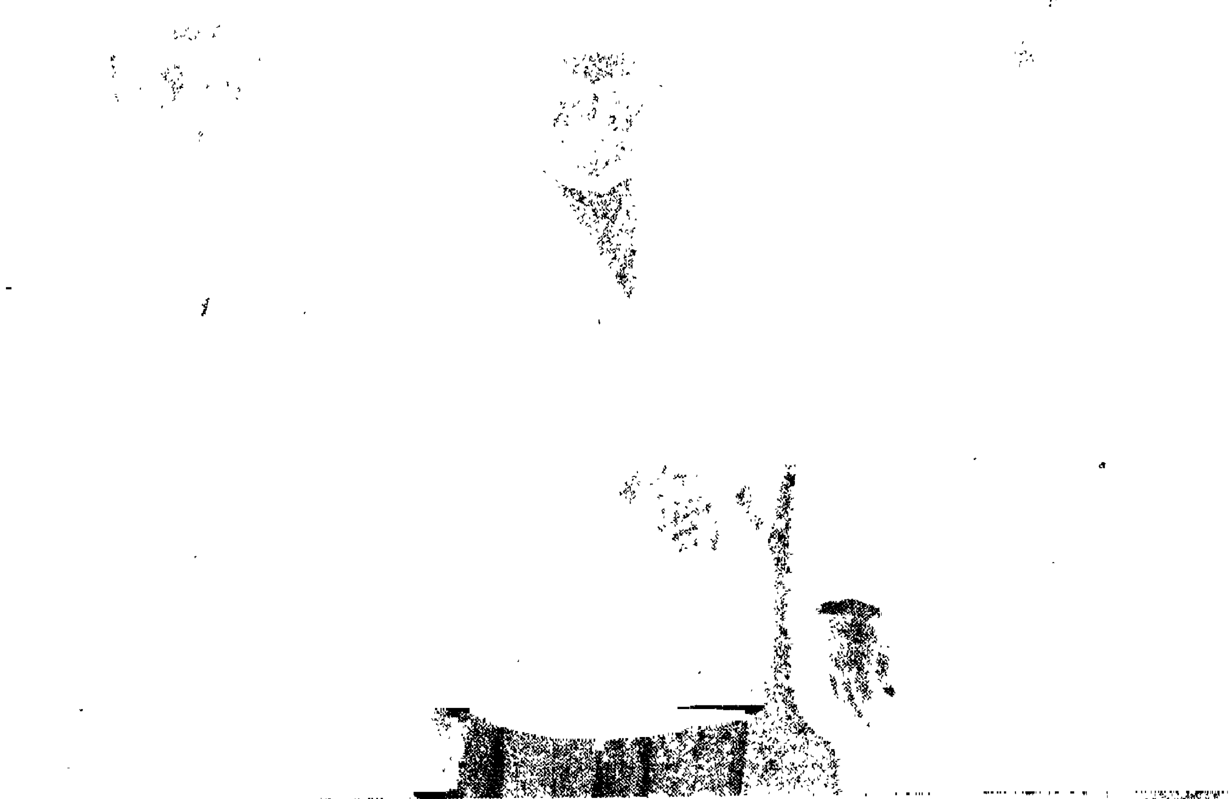

21st Year of Publication
آنکھوں کی حفاظت زندگی کی حفاظت ہے
ریڈیم آئی ڈراپس
آنکھوں کی بہت سی بیماریوں میں مفید
لاکھوں گھروں میں استعمال ہوتی ہے
تندرست آنکھوں والے استعمال کریں
تو بینائی بڑھاپے میں بھی تیز رہتی ہے
باریک اور کثرت سے کام کرنے والوں کو تو ریڈیم آئی ڈراپس کا استعمال ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ آنکھوں کی آنیوالی بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں
Radium
DROPS
The World known
سول ایجنٹس

فروری

21-(2)



اینگلو فرنچ بربریت کی آماجگاہ پورٹ سعید کی بندرگاہ پرخانۂ خدا جو مسجدِ عباس کے نام سے مشہور ہے



قصرِ اُردو کے دو ستون ——— سالک اور فیض



اعجاز بٹالوی ۔ عبدالمجید سالک ۔ خوشتر گرامی ۔ فیض احمد فیض ۔ مہندر ناتھ ۔ عادل رشید ۔ عبادت بریلوی ۔ قتیل شفائی



ایشین ادیب کانفرنس میں شریک ہونے والے پاکستانی ڈیلیگیشن کے اعزاز میں بیسویں صدی دہلی کی طرف سے ڈنر

بیسویں صدی دہلی

فروری ۱۹۵۷ء

ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
قیمت
فی پرچہ
آٹھ آنے

جلد ۲۱
شمارہ ۲

سالانہ قیمت خاص نمبر سمیت
ہندوستانی اور پاکستانی سکوں میں
پانچ روپے
ششماہی
تین روپے
ممالک غیر سے سالانہ قیمت ۹ شلنگ
فون دفتر ۲۶۶۳۷
فون رہائش ۲۸۰۲۵

ایڈیٹر
خوشتر گرامی

مستقل خریداروں کو پانچ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں جن کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ ہوتی ہے

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی ۔ دہلی

...ھی ہے اور پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کی گود میں گر رہے ہیں۔ اچھی تصویر تھی۔ آپ کا نام سُنا تھا۔ اب دیکھ بھی لیا۔ اگر آپ میری تصویر بنا رہے ہیں تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ لیکن آپ اُسے نمائش میں نہ بھیجیں۔ ... ہمارے گھر کا ماحول کچھ ایسا ہے جہاں لڑکیوں کی شہرت معیوب سمجھی جاتی ہے۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

تصویروں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ میں آپ کی تصویر آپ ہی کو دے دوں گا۔ کل سے ایک وقت مقرر کیجئے۔ صبح کا وقت کیسا رہے گا؟

المنظر

المنظر صاحب!

صبح کا وقت مناسب نہیں۔ حالانکہ گھر کے کام کاج میرے سپرد نہیں۔ لیکن میں کسی نہ کسی طرح آپا کا ہاتھ بٹاتی رہتی ہوں۔ دس بجے کے بعد میں تصویر بنواؤں گی۔ لیکن آپ اُسے جلد مکمل کرلیں۔

عصمت

المنظر صاحب!

پورے پندرہ روز ہو گئے آپ کو کاغذ اور پنسل ہاتھ میں لئے بیٹھے ہوئے۔ اب تک تو ہزاروں تصویریں بن سکتی تھیں۔ میں دو چار روز اور دے سکتی ہوں۔ اگر اتنے عرصے میں آپ پورا نہ کر پائیں گے تو کام ادھورا ہی چھوڑ دیجئے گا۔ وہ آئندہ بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

آپ کی تصویر مکمل ہو چکی ہے لیکن میں اس وجہ سے آپ کو نہیں دے سکتا کہ آپ کی پچھلی تحریروں کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ مجھ پر کوئی احسان کر رہی ہیں۔ حالانکہ آپ غور کریں تو میں نے ہی آپ پر احسان کیا ہے کہ آپ کے نقش و نگار ہمیشہ کو محفوظ کر دیئے ہیں۔ اِسلئے میں اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہوں۔ اور آپ کے ہاتھوں میں دینا نہیں چاہتا۔ آپ آئندہ مجھے نظر بھی نہ آئیں تو بھی کوئی حرج نہیں تصویر تو اتنی اچھی بنی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ آپ کے چہرے پر جو حزن و ملال چھایا رہتا ہے اُس نے اُسے لازوال کر دیا ہے۔ میں کوشش بھی کروں تو شاید اس سے اچھی تصویر نہ بنا سکوں گا۔ آپ کی تکلیف کا شکریہ!

المنظر

المنظر صاحب!

آپ کے پرچے کا پہلا جملہ پڑھ کر میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ اور شاید اس لمحے میرے چہرے پر حزن و ملال کی جگہ شگفتگی آئی ہو گی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آپ وہ ایک لمحہ بھی محفوظ کر لیتے۔ لیکن دوسرے لمحے پھر آگے پڑھ کر بہت زیادہ ملال ہوا۔ اگر میری تحریروں کا لہجہ آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں لیکن آپ نے مجھ پر تصویر بنا کر احسان کیا ہے۔ یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر میں آپ کے سامنے نہ ہوتی آپ کیسے وہ لازوال تصویر بنا سکتے تھے۔ اِس لئے میں سمجھتی ہوں کہ اُس پر میرا بھی حق ہے وہ سرتاپا میری اپنی ملکیت ہے۔ خدا کیلئے اُسے بھیج دیجئے میں واپس کر دوں گی۔ اس کا وعدہ کرتی ہوں۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

تصویر بھیج رہا ہوں۔ دیکھ کر واپس کر دیں اب میں یہ نہیں چاہتا۔ اسے آپ اپنے پاس ہی رکھ سکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ جب کبھی دیکھا کریں گی تو ہنسا کریں گی شگفتگی کے بے شمار لمحے آپ کو مل جائیں گے۔ اور میں اُسی کو اپنی محنت کا صلہ سمجھتا رہوں گا۔ آپ کے حزن و ملال نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ممکن ہو تو اس کی وجہ بھی بتایئے کیا ہے؟

المنظر

المنظر صاحب!

آپ کی بنائی ہوئی تصویر ملی۔ دیکھتے ہی میں بے اختیار ہنستے ہنستے لوٹ گئی

تیر و نشتر

از

ادارہ

یو۔پی میں تعلیمی معیار کی ایک دلچسپ مثال سامنے آئی ہے۔ وہاں سول جوڈیشیل سروس امتحانات میں جن وکیلوں نے شرکت کی وہ عام قانونی اصطلاحوں کے بھی صحیح ہجے نہ لکھ سکے ——— یہ اور بات ہے کہ وہ اس امتحان میں فیل ہو گئے۔ لیکن وہی اگر اہل سیاست میں آ جاتے تو وزارت کہیں نہیں گئی۔ اور اگر انہیں وزارت مل جائے تو پھر درآمد لائی اتنی ڈگریاں انہیں بغیر کسی زحمت کے مل جائیں گی کہ ان کے اٹھانے کے لئے ایک جیپ والے کی ضرورت ہو گی ——— اور اگر اس میں کچھ شبہ ہے تو ہندوستان کے وزیروں کی دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں شناختی پریڈ کرا لیجئے۔ اور دیکھ لیجئے کتنے ایم وکیل وزیر بنے ہیں۔

لوک سبھا میں ایک الزام لگایا گیا ہے کہ "وزیر سالوں اور دامادوں کو بڑے بڑے عہدے دلا رہے ہیں" ——— کبھی جنگ آزادی کے زمانے میں جیل خانہ سسرال تھا۔ اور اب وزارت سسرال ہے۔ سالے بھی مستفید ہوں گے اور داماد بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ شاید کہ

وزارت باز آید کر نہ آید

پنڈت جواہر لال نہرو نے واشنگٹن میں فرمایا کہ "ہندوستان ایشیا کی لیڈری کا خواہاں نہیں ہے" ——— پنڈت جی نے صرف اپنی ترجمانی فرمائی ہے۔ ورنہ بہت سے لیڈر ایسے ہیں جو یہ خدمت سر کے بل انجام دینے کو تیار ہیں۔

مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نے یوتھ لیگ کے اجلاس کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا کہ نوجوانوں کو بے روزگاری، معاشی عدم تحفظ اور کئی شدید مشکلات کا سامنا ہے" ——— یہ مشکلات تو پاکستان کیا ہندوستان کے نوجوانوں کو بھی ہیں لیکن یہاں کے وزیروں کو ان مشکلات کا سامنا نہیں جن کا پاکستان کے وزیروں کو ہوتا ہے۔ ان کو بے روزگاری کا سامنا بھی ہوتا ہے اور وزارتیں پائیدار نہ ہونے کی وجہ سے معاشی عدم تحفظ کا سامنا بھی رہتا ہے۔ اس لئے یہ پیغام یوتھ لیگ کی بجائے سابق وزراء و سفراء کی لیگ کے نام جاتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔

ایک خبر کا عنوان ہے "نئی گری حکومت کے سیاہ کارنامے" ——— کیا مضائقہ ہے۔ چاند میں بھی تو سیاہ داغ ہوتا ہے۔

مدراس کے میڈیکل کالج میں ایک بڑا غیر رومانی حکم جاری کیا گیا ہے۔ لڑکیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ کالج میں اپنے بالوں میں پھول لگا کر نہ آیا کریں۔ کیونکہ کالج کے سنجیدہ ماحول میں پھولوں کی خوشبو رومانی فضا پیدا کرتی ہے ——— اور کالج کے باہر اور ہوسٹل میں کیا نئے رومان کنٹرول کے اقدامات کئے جائیں گے۔ اور اگر پھول رومان انگیز کیفیت پیدا کرتے ہیں تو پھر ایک ہی کالج میں کیوں، سب کالجوں میں یہ حکم جاری ہونا چاہئے۔ کاش یہ حکم جاری کرنے والوں کو مرزا غالب کا یہ شعر معلوم ہوتا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

جے پور میں تقریر کرتے ہوئے راجستھان کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر جے نرائن شاستری نے کانگریس کو تنبیہ کی ہے کہ "کانگریس کا جنازہ نکل رہا ہے" ——— لیکن

تیرونشتر

از

ادارہ

یو۔پی میں تعلیمی معیار کی ایک دلچسپ مثال سامنے آئی ہے۔ وہاں سول جوڈیشیل سروس امتحانات میں جن وکیلوں نے شرکت کی وہ عام قانونی اصطلاحوں کے بھی صحیح ہجے نہیں لکھ سکے ——— یہ اور بات ہے کہ وہ اس امتحان میں فیل ہو گئے۔ لیکن وہی اگر میدانِ سیاست میں آجائیں تو وزارت کہیں نہیں گئی۔ اور اگر انھیں وزارت مل جائے تو پھر ڈاکٹر آف لاء کی اتنی ڈگریاں انھیں بغیر کسی زحمت کے مل جائیں گی کہ ان کے اٹھانے کے لئے ایک جیپ والے کی ضرورت ہوگی ——— اور اگر اس میں کچھ شبہ ہے تو ہندوستان بھر کے وزیروں کی دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں شناختی پریڈ کرا لیجئے۔ اور دیکھ لیجئے کتنے ناکام وکیل وزیر بنے ہیں۔

لوک سبھا میں ایک الزام لگایا گیا ہے کہ "وزیر سالوں اور دامادوں کو بڑے بڑے عہدے دے رہے ہیں" ——— کبھی جنگِ آزادی کے زمانے میں جیل خانہ سسرال تھا۔ اور اب وزارت سسرال ہے۔ سالے بھی مستفید ہوں گے اور داماد بھی بہتی گنگا سے ہاتھ دھو لیں۔ شاید ع

وزارت باز آید کہ نہ آید

پنڈت جواہر لال نہرو نے واشنگٹن میں فرمایا کہ "ہندوستان ایشیا کی لیڈری کا خواہاں نہیں ہے" ——— پنڈت جی نے صرف اپنی ترجمانی فرمائی ہے۔ ورنہ یہاں بہت سے لیڈر ایسے ہیں جو یہ خدمت سر کے بل انجام دینے کو تیار ہیں۔

مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نے یوتھ لیگ کے اجلاس کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا "نوجوانوں کو بے روزگاری، معاشی عدم تحفظ اور کئی شدید مشکلات کا سامنا ہے" ——— یہ مشکلات تو پاکستان کیا ہندوستان کے نوجوانوں کو بھی ہیں لیکن یہاں کے وزیروں کو ان مشکلات کا سامنا نہیں جن کا پاکستان کے وزیروں کو ہوتا ہے۔ ان کو بے روزگاری کا سامنا بھی ہوتا ہے اور وزارتیں پائیدار نہ ہونے کی وجہ سے معاشی عدم تحفظ کا سامنا بھی رہتا ہے۔ اس لئے یہ پیغام یوتھ لیگ کی بجائے سابق وزراء دسفراء کی لیگ کے نام جاتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔

ایک خبر کا عنوان ہے "کیرالا حکومت کے سیاہ کارنامے" ——— کیا مضائقہ ہے۔ چاند میں بھی تو سیاہ داغ ہوتا ہے۔

مدراس کے میڈیکل کالج میں ایک بڑا غیر رومانی حکم جاری کیا گیا ہے۔ لڑکیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ کالج میں اپنے بالوں میں پھول لگا کر نہ آیا کریں۔ کیونکہ کالج کے سنجیدہ ماحول میں پھولوں کی خوشبو رومانی فضا پیدا کرتی ہے ——— اور کالج کے باہر اور ہوسٹل میں کیا رومان کنٹرول انتظامات کئے جائیں گے۔ اور اگر پھول رومان انگیز کیفیت پیدا کرتے ہیں تو پھر ایک ہی کالج میں کیوں، سب کالجوں میں یہ حکم جاری ہونا چاہئے۔ کاش یہ حکم جاری کرنے والوں کو مرزا غالب کا یہ شعر معلوم ہوتا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

جے پور میں تقریر کرتے ہوئے راجستھان کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ہیرا لال شاستری نے کانگرس کو تنبیہ کی ہے کہ "کانگرس کا جنازہ نکل رہا ہے" ——— لیکن

[illegible] تعجب کی بات کون سی ہے۔ ہونہار [illegible]

بقول علامہ اقبال جب لڑکیاں انگریزی پڑھ لیں اور قوم ڈھونڈے فلاح کی راہ تو پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیوی منسٹر بن جاتی ہے اور میاں کو اس سے ملنے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑتی ہے۔ آپ یقین کیجئے نہ کیجئے مگر پنجاب سکریٹریٹ میں ایک ایسا واقعہ پیش آچکا ہے ——— پچھلے دنوں جب پنجاب کی لیڈی وزیر شریمتی پرکاش کور جب اُن کے شوہر سکریٹریٹ میں ملنے گئے تو چپراسی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ بلا اجازت اندر جانا منع ہے۔ اور جب کسی شخص نے چپراسی کو توجہ دلائی کہ موصوف شریمتی جی کے شوہر ہیں۔ تو اُس نے برجستہ جواب دیا کہ "سرکاری کاموں میں رشتہ داریاں نہیں چلتیں" چنانچہ جب تک اُس نے منسٹر صاحبہ سے اجازت نہیں حاصل کر لی اُن کو اندر نہیں جانے دیا ——— یہ بیسویں صدی ہے۔ "پتی درتا" کا زمانہ ختم ہو گیا۔ پتنی درتا کا دور ہے اب گھر کی حکومت صوبے کی حکومت بن گئی ہے۔

یو۔پی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اپوزیشن لیڈر مسٹر گیندا سنگھ نے کہا کہ لاکھوں افراد خصوصاً وہ لوگ جن کے پاس زمینیں نہیں ہیں تلاشِ معاش میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر جنوبی ریاستوں میں چلے گئے ہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ مشرقی یو۔پی کے سیلاب زدہ علاقوں میں شدت کے ساتھ قحط کا دور دورہ ہے ——— تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ یو۔پی مسٹر سمپورنانند نے کہا کہ مخالف ممبر نے قحط کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے قحط کا ثبوت ملے۔ نہ ہی لوگوں کے تلاشِ معاش میں دوسری ریاستوں میں چلے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اُنھوں نے ایسا قحط کے سبب سے کیا ہے ——— بالکل بجا فرمایا۔ اگر مسٹر گیندا سنگھ بھوک اور فاقے سے نڈھال ہو کر اسمبلی میں تشریف لاتے تو قحط کا ثبوت ملتا۔ یا تلاشِ وزارت میں سمپورنانند جی کو کسی دوسری ریاست میں جانا پڑتا۔ تو سمجھ میں آسکتا تھا کہ ریاست میں تلاشِ معاش میں لوگ پریشان ہیں یا بھوک سے بے حال ہیں۔

"نوجوان سماجی کام کریں"۔ مسٹر سہروردی کی تقریر ——— اور سن رسیدہ سیاسی کام کریں۔ ہمارا مشورہ۔

مسٹر ڈلیس کی رائے میں امن اور جنگ کا چولی دامن کا [illegible] ہے اور اگر مجبوری اصول پہ جنگ کا امکان اگر واقعی [illegible] ہو گیا تو ——— مسٹر ڈلیس گھی کے چراغ جلائیں گے۔

کراچی کے ایک اخبار میں دو خبریں نیچے اوپر ایک ساتھ چھپی ہیں۔ پہلی کی سرخی ہے۔ "آٹا دے کر مزدوروں کی پریشانی دور کرنے کی اپیل"۔ اور دوسری خبر کا عنوان ہے "آٹا نہ ہونے سے لالوکھیت کی دکانیں بند کر دی گئیں" ——— گویا یہ اپیل کا جواب ہے۔

ہندو مہاسبھا کی انتخابی سرگرمیوں کی نگرانی کے لئے سب کمیٹی کا تقرر ——— ایک کمیٹی سے کیا ہوگا۔ اس کے لئے تو سی آئی ڈی کے پورے محکمے کو مقرر کرنا ہوگا۔

مسٹر کرشنم آچاری نے ایک تقریر کے دوران کہا ہے "جو لوگ ٹیکسوں کا بوجھ برداشت کر سکتے ہیں وہ نئے ٹیکسوں کے لئے تیار رہیں" ——— بوجھ اُٹھانے والے گدھے ہندوستان میں بہت ہیں۔ وزیرِ خزانہ چنتا نہ کریں۔

"سیلاب اور زلزلے کی تباہ کاریوں سے بھی سرمایہ دار ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں" ——— گویا اِس ضرب المثل کو عملی جامہ پہنایا ہے "کسی کا گھر جلے اور کوئی ہاتھ سینکے"۔

"طلبا کو نباتات اور حیوانات کی زندگی کا زیادہ مطالعہ کرنا چاہیئے"۔ بوائے اسکاؤٹس کیمپ میں کرنل زیدی کی تقریر ——— بہت بروقت مشورہ ہے۔ انسانی زندگی کے مطالعے سے تو طلبا بے نیاز ہو چکے ہیں۔ وحشیانہ حرکات کے لئے حیوانات کی زندگی کا مطالعہ یقیناً ہونا چاہیئے۔

مدھیہ پردیش اسمبلی میں ایک خاتون ممبر نے مچھروں اور چوہوں کے برتھ کنٹرول کی تجویز پیش کی ہے۔ موصوفہ نے اپنے علاقے میں چوہوں اور مچھروں کی

...اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "مچھر آدمیوں کو تو کاٹتے ہی ہیں۔ اُن سے جانور بھی محفوظ ... اس لئے حکومت کو اُن کے برتھ کنٹرول کی اسکیم بنانی چاہئے" ——— ...انوں میں تو برتھ کنٹرول کا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ اب جانوروں کی باری ہے۔ ...حت اودھکاری امرت کور پچھلے دنوں چین کے دورے پر گئیں تو وہاں سے ...وں کے خلاف مہم چلانے کے لئے نسخے لکر آئی تھیں۔ اب اُنھیں ایک دورہ ...امریکہ میں برازیل یا کسی اور مچھروں والے علاقے کا کر لینے دیجئے تو مچھروں کے ...کنٹرول کا نسخہ معلوم کر لائیں گی۔

ایک خبر کا عنوان ہے "عشق کا نتیجہ ٹکٹ سے محرومی" ——— غنیمت ہے ...پر بات ٹل گئی۔ ورنہ میر نے تو یہ کہا ہے ؏

اِس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

مدراس میں وزیرِ خزانہ مسٹر ٹی ٹی کرشنم آچاری نے اشارہ کیا کہ ابھی اور ...ہ ٹیکس لگیں گے ——— ؏

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

"یو۔ پی میں آنکھوں کے علاج کے لئے سالِ رواں میں نو مزید کیمپ کھولے ...ں گے" ——— لیکن جو بینائی درست ہوتے ہوئے بصیرت سے محروم ہیں ...ن اُن کے لئے بھی کیمپ کھولنے کی ضرورت ہے۔

"ریوالور چرانے والے کو نو ماہ قید سخت کا حکم" ——— نو ماہ کی سزا میں غالباً ...مجسٹریٹ نے بڑی حسین رعایت رکھی ہے۔ شاید اِس کے بعد وہ اخلاقی طور پر جنم لے

"حملہ آوروں کو کیا ملا؟" ——— ذلّت و خواری۔ دُنیا کے گوشے ...گوشے سے تھو تھو۔

صوبہ بمبئی میں دماغی ہسپتالوں کی سالانہ کارگزاری میں بتایا گیا کہ ۱۹۵۵ء میں تقریباً ۵۰۰ پاگل صحتیاب ہوئے ——— اور اگر ۱۹۵۶ء کی سیاسی اور حد بندی کے ہنگاموں کی رپورٹ تیار کی جائے تو اِس سے کئی گُنا زیادہ صحت مند پاگل نظر آئیں گے۔

"حملہ آوروں نے پورٹ سعید کے شہریوں کی املاک اور موٹریں وغیرہ چرالیں" ——— یعنی بھاگتے چور کی لنگوٹی کی ضرب المثل پر بھاگتے چور نے خود عمل کیا۔

"عورتیں سماجی، اخلاقی، اور رُوحانی قدروں کی محافظ ہیں"۔ شریمتی مینن کی تقریر ——— اور مرد گویا ساری بُرائیوں کی جڑ۔

ایک عنوان ہے "امریکہ اور رُوس کے تعلقات بہتر ہو جانے کا زبردست امکان ہے" ——— لیکن چچا سعدیؒ فرماتے ہیں ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

"ریل کے ڈبّے میں کرنسی نوٹوں کی دستیابی" ——— ریل کا ڈبّہ کیا ٹکسال تھا؟

ایک معاصر کو اعزازی ڈگریوں پر اعتراض ہے کہ اِس طرح اُن ڈگریوں کی کوئی وقعت نہیں رہتی ——— یہ لیڈروں سے مہذب فریب کاری ہے۔

"انصاف کا خون" ایک اخباری عنوان ——— چلو اچھا ہوا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اگر انصاف باقی رہتا تو آئے دن انصاف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا۔ اب دُنیا انصاف سے بے نیاز ہو گئی۔

"ایک عورت کنوئیں میں ڈوب گئی" ——— کنوا تو بڑی چیز ہے۔ غیرتمند کے ڈوبنے کے لئے تو چُلّو بھر پانی کافی ہوتا ہے۔

افسانہ

ایک پلیٹ مچھلی

از

جناب نیاز قومی ایم۔اے (علیگ)

گونڈہ ـــــ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء

مکرمی خوشتر بھائی! آداب و تسلیمات

"ایک پلیٹ مچھلی" حاضر ہے۔ شاید کسی قابل ہو۔ دیکھئے تو سہی ہماری آج کی زندگی میں ہوٹلوں کا کس قدر دخل ہوتا جا رہا ہے۔ اور تو اور ہوٹلوں کا ماحول ـــــ معاذ اللہ! صاف ستھرے ماحول کے ہوٹل تو مشکل ہی سے ملتے ہیں بڑے شہروں کے بڑے ہوٹل تو بہت ہی خطرناک ہیں۔ میری زیر نظر تخلیق کچھ اسی ضمن سے متعلق ہے۔ پچھلے سالنامے سنہ ۵۶ء کے بعد سے اب تک بدقسمتی سے بیسویں صدی کی بزم میں شریک نہ ہو سکا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ کچھ دن ہوئے پنڈت ہری چند اختر سے یہیں گونڈے میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا تذکرہ ہوتا رہا اور پھر آپ کے لئے اپنے بیسویں صدی کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑا۔ میری یہ پیش کش بیسویں صدی کے شایانِ شان کس حد تک ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا جواب ملنے پر ہی اس کا فیصلہ ہو سکے گا ـــــ "ایک پلیٹ مچھلی" اگر پسند کریں تو سالنامے کے ادبی خوانِ نعمت میں اسے جگہ دیجئے گا۔ ممنون ہوں گا ـــــ یہ جانتے ہوئے کہ آپ جواب نہ دیں گے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

نیازمند

نیاز قومی

.... یہاں کی شامیں اپنی رنگینی کا جواب نہیں رکھتیں۔ ایک طرف لپ اسٹک کی سرخی ہے تو دوسری طرف دق کے مریضوں کا تھوکا ہوا خون۔ کسی کی مانگ میں سیندور پڑا تو کسی کا سہاگ لٹ گیا۔ کوئی ماں بنی تو کسی کی گود سونی ہو گئی۔ غرض ایک مسکراتا ہے تو ہزار روتے ہیں۔ اور انھیں آنسوؤں سے ٹھنڈی سڑک پر چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ بنارسی باغ میں فوارے اُبلتے ہیں اور گومتی کی گود میں لہریں مچلتی ہیں۔

اجنبی ـــــ ایک دو نہیں ـــــ یہاں سب کے سب اجنبی۔ یہاں کے مرد اجنبی، عورتیں اجنبی، یہاں باہر سے آنے والے اجنبی۔ اور ستم یہ کہ خود یہاں کے بسنے والے اجنبی۔ اس میں نہ ہمارا قصور ہے اور نہ ان کا بلکہ ان کے رہنماؤں کی غلطی ہے کہ

دو گھنٹے کے لئے بھی انھیں گھر کی چہار دیواری میں چین نہیں آتا۔ انھیں گھر سے زیادہ ہوٹل عزیز ہیں۔

ہوٹل ـــــ عجیب چیز ہے ان کے لئے۔ جنت سے زیادہ حسین، پارلیمنٹ سے زیادہ اہم اور گھر سے زیادہ آرام دہ۔ یہاں گھروں سے زیادہ ہوٹل ہیں۔ اوپر ہوٹل نیچے ہوٹل، دائیں ہوٹل، بائیں ہوٹل، سڑک پر ہوٹل، گلی میں ہوٹل، شہر میں ہوٹل اور شہر کے باہر ہوٹل۔

"یہ تین آدمی ـــــ جیسے انہیں کوئی کام کوئی فکر ہی نہیں۔" ایک اجنبی نے سوچا۔ "سویرے سے یہاں اسی میز پر بیٹھے ہیں۔ ہم اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے کہیں جانا ہی نہیں"

بات کرتے ہیں تو ایک گہرا فلسفہ چھیڑ دیتے ہیں۔ کبھی غالب اور اقبال کا نام لیتے ہیں، تو ہر ایک کا چہرہ بدلا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی روٹی اور محنت کا ذکر آتا ہے تو ہر چہرہ بیگانگی کی تصویر بن جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ کون لوگ ہیں؟"

"ارے تم نہیں جانتے انہیں، شعر و ادب کی ان نامور ہستیوں کو نہیں جانتے۔ یہ کوئی تمہارا قصور نہیں۔ یہ ان کا اڈا کا دستور ہے۔ شہر کا چپہ چپہ چھان مارو تو ان کا سایہ تک نہ پا سکو گے۔ لیکن یہاں جب دیکھو یہ موجود ملیں گے۔"

اور اجنبی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے؟

آگے اُسے ایک اور بڑی عمارت ملی۔ یہ بھی ہوٹل۔ شیشے کی دیوار، شیشے کی میزیں شیشے ہی کا سب کچھ۔ وہ اندر گیا تو اُسے اپنی صورت ہر طرف دکھائی دی۔ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اُسے اُسی کے سائے نے ہر طرف سے گھیرا۔ وہ بوکھلا کر بیٹھ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی عجیب تھی۔ کسی کو کسی سے لگاؤ نہیں۔ ایک آیا، ایک گیا۔ برتنوں کی جھنکار کے ساتھ زندگی کا سیلاب بہت ہی رنگین، بہت مصروف ——— دونوں ہوٹلوں میں کتنا فرق ہے۔ جیسے نئے اور پرانے ہندوستان کا فرق!

اوسط درجے کے ہوٹلوں میں بہت زندگی ملتی ہے۔ ایک کمرے میں سیاست ہے دوسرے میں شعر و ادب! ایک ٹولی کسی خوشی میں مٹھائی کھاتی ہے تو کوئی چائے کے گھونٹ اور سگریٹ کے کش سے اپنا غم غلط کرتا ہے۔ یہاں بہت ہم آہنگی ہے [illegible] اور صرف چھ پیسے میں ایک پیالی چائے بھی مل جاتی ہے۔

پھٹی ہوئی ایک میلی پتلون اور چیتھڑوں سے گتھی ہوئی قمیص پہنے ایک ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور دوسرے میں ایک ٹیڑھا میڑھا ڈنڈا عجیب ہیئت سے ہوٹل میں داخل ہوا۔ اور [illegible] لنگڑا کر بیٹھ گیا۔ اجنبی چونکا لیکن اور لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ شاید یہ شخص یہاں ہمیشہ آتا ہو۔

"[illegible] سال کا آدمی [illegible]"

"مگر کرکٹ میں انگلینڈ اور آسٹریلیا کا کیا مقابلہ؟"

"کل ایک ایٹم بم اور چلے گا!"

اور ان لوگوں کے بہت سے [illegible]

اچانک دیوار پر لٹکتے ہوئے گھڑیال نے گھنٹہ بجایا۔

"غلط ——— بالکل غلط!"

وہ آدمی گرج پڑا۔

"نان کو خود ہی خانہ برو ——— خانہ برو، خانہ برو، خانہ برد..." اور فاقہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

اُس کی حرکتوں پر ہوٹل کا مالک بھی خاموش رہا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے نواب صاحب کی میز ابھی خالی تھی۔ اُن کے جوتے اُلٹے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں ایک خوبصورت سی تسبیح رقص کر رہی تھی۔

"ارے ——— کوئی ہے!"

جیسے ویران خانے سے کوئی پکارے۔ اس طرح نواب صاحب نے بیرے کو بلایا۔

بیرے نے الماری سے کچھ مخصوص برتن نکالے اور میز پر چُن دیئے۔

"ایک کیک بھیجو!"

"میاں سنو! پیسٹریاں بھی لگی ہیں ——— تازی؟"

"اچھا رہنے دو ——— ابھی ——— دو انڈے فرائی کرو... اور ٹوسٹ"

بیرا چلنے لگا۔

"دیکھو ——— ٹھہرو ابھی بتاتا ہوں" نواب صاحب نے اُسے چونکایا۔

——— پھر وہ ٹہلے اور تسبیح ناچی ———

"ہاں ابھی ——— ہاف بوائل انڈے [illegible]"

پھر اس کے بعد چائے آئی بغیر شکر اور دودھ کی۔

نواب صاحب نے فرائی انڈے بھی کھائے۔ اور کیک پیسٹریاں بھی۔ جیسے جیسے تسبیح اچھلتی گئی آرڈر ہوتا رہا۔

پھر برتن سمٹنے لگے۔ اُسی الماری میں بند ہو کے میز صاف ہوئی۔ انگریزی اور اردو کے اخبار، [illegible] کے ناول، میر انیس کا مرثیہ۔ سب اس میز پر سب کتابیں بکھر گئیں۔

اور نواب صاحب ان میں ڈوبنے لگے۔

اُن کا بچپن ایران میں گزرا، تعلیم فرانس اور روم میں پائی۔ جوانی مصر میں گزری۔

ایک پلیٹ مچھلی

افسانہ

از

جناب نیاز قومی ایم۔اے (ملیگ)

گونڈہ ——— ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء

مکرمی خوشتر بھائی! آداب و تسلیمات

"ایک پلیٹ مچھلی" حاضر ہے۔ شاید کسی قابل ہو۔ دیکھئے تو سہی ہماری آج کی زندگی میں ہوٹلوں کا کس قدر دخل ہوتا جا رہا ہے۔ اور فی زمانہ ہوٹلوں کا ماحول ——— معاذ اللہ! صاف ستھرے ماحول کے ہوٹل تو مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ بڑے شہروں کے بڑے ہوٹل تو بہت ہی خطرناک ہیں۔ میری زیرِ نظر تخلیق کچھ اسی ضمن سے متعلق ہے۔ پچھلے سالنامے ۵۶ء کے بعد سے اب تک بدقسمتی سے بیسویں صدی کی بزم میں شریک نہ ہو سکا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ کچھ دن ہوئے پنڈت ہری چند اختر سے یہیں گونڈے میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا تذکرہ بہت رہا اور پھر آپ کے لیے اپنے بیسویں صدی کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑا۔ میری یہ پیش کش بیسویں صدی کے شایانِ شان کس حد تک ہے، میں نہیں کہہ سکتا۔ آپ کا جواب ملنے پر ہی اس کا فیصلہ ہو سکے گا ——— "ایک پلیٹ مچھلی" اگر پسند کریں تو سالنامے کے ادبی خوانِ نعمت میں اسے بھی جگہ دیجئے گا۔ ممنون ہوں گا ——— یہ جانتے ہوئے کہ آپ جواب نہ دیں گے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

نیاز مند

نیاز قومی

.... یہاں کی شامیں اپنی رنگینی کا جواب نہیں رکھتیں۔ ایک طرف لپ اسٹک کی سرخی ہے تو دوسری طرف دق کے مریضوں کا تھوکا ہوا خون۔ کسی کی مانگ میں سیندور پڑا تو کسی کا سہاگ لٹ گیا۔ کوئی ماں بنی تو کسی کی گود سونی ہو گئی۔ غرض ایک مسکراتا ہے تو ہزار روتے ہیں۔ اور انھیں آنسوؤں سے ٹھنڈی سڑک پر چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ بنارسی باغ میں فوارے اُبلتے ہیں اور گومتی کی گود میں لہریں مچلتی ہیں۔

اجنبی ——— ایک دو نہیں ——— یہاں سب کے سب اجنبی۔ یہاں کے مرد اجنبی، عورتیں اجنبی، یہاں باہر سے آنے والے اجنبی۔ اور تم یہ کہ خود یہاں کے بسنے والے اجنبی۔ اس میں نہ ہمارا قصور ہے اور نہ ان کا بلکہ ان کے رہن سہن کی خطا ہے کہ دو گھنٹے کے لیے بھی انھیں گھر کی چہار دیواری میں چین نہیں آتا۔ انھیں گھر سے زیادہ ہوٹل عزیز ہیں۔

ہوٹل ——— عجیب چیز ہے۔ عاشق کے لئے جنت سے زیادہ حسین، پارلیمنٹ سے زیادہ اہم اور گھر سے زیادہ آرام دہ۔ یہاں گھروں سے زیادہ ہوٹل ہیں۔ اوپر ہوٹل نیچے ہوٹل، داہنے ہوٹل، بائیں ہوٹل، سڑک پر ہوٹل، گلی میں ہوٹل، شہر میں ہوٹل اور شہر کے باہر ہوٹل۔

"یہ تین آدمی ——— جیسے انھیں کوئی کام کاج نہیں" کلرک نے سوچا تھا "ایک اجنبو نے سوچا۔ سویرے سے ہماری میز پر بیٹھے ہیں۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے [illegible]

...کی بات کرتے ہیں تو ایک گھونٹ چائے پی لیتے ہیں۔ کبھی غالب اور اقبال کا نام لیتے ہیں، تو کسی کا شعر بول کر مسکرانے لگتا ہے۔ کبھی سعدی اور حافظ کا ذکر آتا ہے تو ہر چہرہ [illegible] تسبیح چلتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ کون لوگ ہیں؟"

"ارے تم نہیں جانتے انھیں۔ شہر والے بھی ان نامور ہستیوں کو نہیں جانتے۔ یہ [illegible] کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان کا روز کا دستور ہے۔ شہر کا چپہ چپہ جہاں اور ان کا سایہ [illegible] سمٹ جائے گا لیکن یہاں جب دیکھو یہ موجود ملیں گے۔"

اور ابھی تک یہ سمجھ نہ سکا یہ کیا ہے؟

آگے بڑھے ایک اور بڑی عمارت ملی۔ یہ بھی ہوٹل۔ شیشے کی دیوار، شیشے کی میزیں شیشے کا سب کچھ۔ وہ اندر گیا تو اُسے اپنی دوست ہر طرف دکھائی دی۔ ایک [illegible] لئے۔ اُسے اُس کے سائے نے ہر طرف سے گھیرا۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی عجیب تھی۔ کسی کو کسی سے لگاؤ نہیں۔ ایک آیا۔ ایک گیا۔ برتنوں کی جھنکار کے ساتھ ہنسی کا سیلاب بہت ہی رنگین، بہت مصروف ——— دونوں ہوٹلوں میں کتنا فرق ہے۔ جیسے نئے اور پرانے ہندوستان کا فرق!

اوسط درجے کے ہوٹلوں میں بہت زندگی ملتی ہے۔ ایک کھلی ہوئی سیاست ہے دوسری جانب شعر و ادب۔ ایک لڑکی کسی کونے میں منہ چھپا کر [illegible] تو کوئی چائے کے [illegible] اندر سگریٹ کے گہرے کش سے اپنا غم غلط کرتا ہے۔ یہاں بہت ہم آہنگی ہے۔ [illegible] دستر خوان بھی بچھ سکتا ہے اور صرف چھ پیسے میں ایک پیالی چائے بھی مل جاتی ہے۔

ہیٹ پہنے ایک میلی پتلون اور دھجیوں سے گتھی ہوئی قمیص پہنے، ایک ہاتھ میں [illegible] دوسرے میں ایک ٹیڑھا میڑھا ڈنڈا عجیب ہیئت سے [illegible] داخل ہوا۔ [illegible] لگا کر بیٹھ گیا۔ [illegible] لیکن اور لوگوں کے لئے کچھ نیا نہیں۔ شاید یہ شخص یہاں ہمیشہ آتا رہتا ہو۔

"پینسٹھ سال کا آدمی ہو گیا۔"

"[illegible] کا کیا مطلب؟"

"کل ایک ایٹم بم اور پھٹے گا!"

اور [illegible] کے بہت سے بے ربط جملے [illegible] پھینکا کرتے

اچانک دیوار پر لٹکے ہوئے گھڑیال نے گھنٹہ بجایا۔

"غلط ——— بالکل غلط!"

وہ آدمی گرج پڑا۔

"تم نے کہا خدا خانہ برد ——— خانہ برد، خانہ برد، خانہ برد ..." اور غصہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

اُس کی حرکتوں پر ہوٹل کا مالک بھی خاموش رہا۔

کونے میں بیٹھے ہوئے نواب صاحب کی میز ابھی خالی تھی۔ اُن کے ہونٹ ہل رہے تھے اور ہاتھوں میں ایک خوبصورت سی تسبیح رقص کر رہی تھی۔

"ارے ——— کوئی ہے؟"

جیسے ویران خلا سے کوئی پکارے۔ اس طرح نواب صاحب نے بیرے کو بلایا۔

بیرے نے الماری سے کچھ مخصوص برتن نکالے۔ اور میز پر چن دیئے۔

"ایک کیک بھیجو!"

"میاں سنو! پیسٹری بھی ملے گی ——— تازی؟"

"اچھا رہنے دو ——— ابھی ——— دو انڈے فرائی کرو ...... اور ٹوسٹ!"

بیرا جانے لگا۔

"سنو دیکھو ——— ٹھہرو! ابھی بتاتا ہوں۔" نواب صاحب نے اسے پھر بلایا۔

——— پھر ہونٹ ہلے اور تسبیح ناچی ———

"ہاں بھئی ——— ان چیزوں کے ساتھ ایک [illegible]"

پھر اس کے بعد چائے آئی بغیر شکر والی۔

نواب صاحب نے [illegible] اُٹھا کر [illegible] ایک پیالی پی۔ جیسے جیسے تسبیح [illegible] آنکھ [illegible] رہا۔

پھر برتن سمٹنے لگے۔ اُسی الماری میں بند ہو کے میز صاف ہوئی۔ انگریزی اور اردو کے اخبار، [illegible] کے ناول، میر انیس کا مرثیہ۔ سب اس میز پر [illegible] بکھر گئیں۔

اور نواب صاحب اُن میں ڈوبنے لگے۔

[illegible] ایران میں گزرا۔ تعلیم فرانس اور روم میں پائی۔ جوانی مصر میں گزری۔

...تو کہتا ہندوستان واپس آ جاتا۔ ویسے یہاں ان کی عالیشان عمارت ... میں خود بھی رہتے ہیں۔ اور سینکڑوں روپیہ ماہوار کرایہ بھی وصول ہوتا ہے لیکن وقت کی بات ہے کہ جن سے زیادہ انھیں اس غریب نواز ہوٹل ہی میں سکون ملتا ہے۔

کچھ عجیب بات ہے کہ ہوٹل میں جو بھی آتا ہے بہت اطمینان بڑی فرصت میں بیٹھتا ہے۔ بیچ والی میز پر کچھ نو عمر لڑکے کسی کالج کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ چار ٹہنیوں والا لڑکا اپنے آگے کسی کو بولنے ہی نہیں دیتا۔ اس کی بغل میں داڑھی والا نوجوان تو کچھ سنجیدہ ہے لیکن اس کی لال لال آنکھیں بہت خطرناک معلوم ہوتی ہیں۔ ایک کھدر پوش بھی ہے۔ مہینوں سے جس کے بال نہیں کٹے۔ پاجامے کی مہری جگہ سے پھٹی ہوئی ہے کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے۔

چھ پیسے والی چائے اور چار مینار کے سگریٹوں پر جیسے کوئی میٹنگ سی ہو رہی تھی کسی اسٹرائک کا پروگرام بن رہا تھا۔

"اوہو ——!" اجنبی کو یاد آیا، یہ تو وہی ٹولی ہے جو رات کے تین بجے اسٹیشن کے قریب اس "تہہ خانے والے ہوٹل" میں جمی ہوئی تھی۔ وہاں تو جتنے تھے سب اسی قماش کے لوگ تھے۔ کوئی کمیونسٹ تو کوئی انقلابی سوشلسٹ۔ کوئی مقرر تو کوئی رضا کار، کوئی شاعر تو کوئی ادیب۔ کوئی لڑکا تو کوئی لڑکی۔ ہاں اس تہہ خانے والی ٹولی میں تو لڑکیاں بھی تھیں۔

"اسٹرائک کا پروگرام تو طے ہوگیا۔ اب مولانا کچھ شعر سناؤ یار۔" دو تین ملی جلی آوازوں نے تقاضا کیا۔

رس بھری آنکھوں والے پیر نابالغ نے ایک گلاس پانی پیا اور فرمایا ؎

حالانکہ وہ اب مرحمت ناز نہیں ہے
خوش ہوں کہ مرا غم نظر انداز نہیں ہے (جگر)

لوگوں نے تعریف کے پل باندھ دیئے لیکن اجنبی کے برابر بیٹھے ہوئے جنٹلمین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہوگیا۔

"وہ تو مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ لیکن کم بخت اس کے گھر والے بڑا ستم ڈھاتے ہیں۔" جنٹلمین نے اپنے ساتھی سے کہا۔ اور زبردستی اپنی داستانِ عشق سنانے کی خاطر چائے اور بسکٹوں کا آرڈر دے دیا۔ اس کے ساتھیوں کو اکثر اس کی بے ہنگم داستان سننے کے لئے اچھی خاصی دعوتیں ملا کرتیں۔

"جب وہ کالج جاتی ہے اور میں دفتر کے لئے گھر سے نکلتا ہوں تو بہت اٹھلاتی منہ چڑاتی ہے۔"

"میرے دفتر کے قریب آتی ہے۔ اور اگر اکیلی ہوتی ہے تو کچھ دیر ضرور ٹھہر جاتی ہے۔ اور وہ ایک لڑکیوں کا ساتھ ہو جاتا ہے جب آگے بڑھتی ہے!"

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ ہم دونوں کیا چاہتے ہیں؟"

اور اس ادھیڑ عمر جنٹلمین کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے کالے کالے مسوڑھوں میں سب دانت چمک اٹھے۔ شاید تین ہی دانت کل بچے ہیں اور ان میں بھی ایک سونے کا۔ بیچارہ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار تھا۔ پھر اس کے احباب فائدہ اٹھانے سے کیوں چوکتے۔ اسی طرح نہ جانے کتنی داستانیں یہاں ہر روز دہرائی جاتی ہیں۔ کتنی اسکیمیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ ایک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔

"یہاں لڑکیاں سروس کرتی ہیں؟"

اجنبی کا شانہ دباتے ہوئے اس کے ساتھی نے کہا۔

"لڑکیاں؟ ہندوستانی ہوٹلوں میں بھی یہ وبا آپہنچی!" اجنبی کو حیرت ہوئی۔

"ابھی ہندوستان اب آزاد ہوگیا ہے۔ اور اس ہوٹل کا نام بھی تو ہے آزاد ہوٹل!"

وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ابھی آنے والی ناخن پالش کی شیشی اور افغان اسنو کی ڈبیہ جس کا ڈھکنا ہی غائب تھا اور جس کے اندر کی کریم سوکھ رہی تھی، میز پر اوندھی پڑی تھی۔ میز کے نیچے ایک میلی سی چوٹی اور اس کے گرد سیاہ اور سنہری ریشمی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ تین چار بے ترتیب کرسیاں آڑی ترچھی یہ اشارہ کر رہی تھیں کہ ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر کوئی گیا ہے۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے تھے۔ جن میں پردے لٹک رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا سا ہال خالی پڑا تھا جس کے سرے پر غالباً منیجر کا کاؤنٹر تھا لیکن وہ بھی خالی تھا۔ اجنبی سمجھا کہ غلطی سے کسی کے گھر میں گھس گیا اور گھبرا کر لوٹنے لگا تو اس کے ساتھی نے کہا۔

"ارے بڑے بدھو ہو یار اڈّہ کس کا؟"

اور وہ دونوں ایک خالی کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔

"بیلا —— چمیلی —— شانتی —— ساوتری —— جلدی آرڈر لو

ہو گئی۔ آپ نے تو شنکر اور پریچ کے کارٹونوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اللہ میں سوچتی ہوں اگر میں سچ مچ ایسی ہی ہوتی تو کیا ہوتا۔ اِس گھر کی بجائے کسی عجائب خانے میں ہوتی۔ مجھے ہنسی مدت بعد ملی ہے۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر یہ عارضی نہ ہوتی مستقل طور سے میری اپنی ہی بن جاتی لیکن ——آپ نے مجھ سے میرے غم کا سبب پوچھا [illegible] بتا سکتی تھی لیکن ابھی وقت مناسب نہیں۔

عصمت

عصمت!

آج پہلی بار تمھیں کچھ زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں میرے [illegible] تبدیلیاں ہیں۔ میں نے صرف عصمت لکھا ہے اور آپ کی بجائے تمھیں [illegible] ہے لیکن نہ جانے کیوں میں نے تمھیں اپنا سمجھ لیا ہے اور اِس طرح رسمیات کے [illegible] اُٹھا دیئے ہیں جو اب تک ہمارے درمیان حائل تھے۔ ایک پردہ ابھی اور باقی [illegible] میں اپنے اوپر سے اُٹھانا چاہتا ہوں۔

میں المنظر نہیں ہوں۔ وہ نہیں ہوں جس کی تصویریں تمھیں بہت پسند ہیں۔ میں ایک چڑیا کی تصویر بھی نہیں بنا سکتا۔ میرا نام شاہد ہے۔ اور یہاں کالج کا ایک چھوٹا سا طالب علم ہوں۔ تمھارے کمرے کے سامنے مجھے بھی اتفاقاً کمرہ مل گیا ہے۔ جس میں میری چھوٹی سی دُنیا آباد ہے۔ کبھی کبھی اُکتا کر باہر نکل آتا ہوں۔ میں نے تمھیں دیکھا، جبکہ تم بے پروا، خاموش سی، کتاب سے نظریں ہٹا کر آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں اُنھیں ڈبو دیتی تھیں۔ تو میں نہ جانے کیوں تمھیں تکنے لگتا۔ تمھیں دیکھ کر مجھے شاخ سے ٹوٹے ہوئے گلاب کی یاد آتی۔ اگر تمھارے پاس یہ بے پناہ اُداسی نہ ہوتی تو شاید میں اتنی محویت سے کبھی نہ دیکھتا۔ اور تمھیں بھی ایک عام لڑکی سمجھ کر اپنے کام میں لگ جاتا۔ لیکن اِس اُداسی نے مجھے جیت لیا ہے۔ اسی لئے تمھیں اپنے سامنے رکھنے کے لئے میں نے المنظر کا روپ بھرا۔ لیکن جب میں کاغذ لے کر بیٹھتا تو کچھ نہ جانتا تھا کہ کیا بنا رہا ہوں۔ جب تمھارے جانے کے بعد اُس پر نظر ڈالتا تو ٹیڑھی لکیروں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ میں نے ایسے تمام کاغذ جمع کر رکھے ہیں۔ کیونکہ ان لکیروں میں تمھاری خوشبو بسی ہوتی ہے۔

میں بھی عجیب آدمی ہوں عصمت! کالج سے واپس آ کر میں کسی کلب،

رستوران یا تفریح گاہ نہیں جاتا۔ ان ہنگاموں میں میرا دل بے حد گھبراتا ہے۔ میں زندگی میں سکون چاہتا ہوں۔ اور اس سکون کی تلاش میں شہر سے دُور قدرت کے حُسن سے دل بہلایا کرتا ہوں۔ یہ حُسن کبھی تو شفق بن کے آسمان پر مسکراتا ہے۔ کبھی پرندوں کی چہکار میں بولتا ہے۔ کبھی ندی بن کے کناروں سے کھیلتا ہے۔ کبھی چرواہے کی بانسری کا نغمہ بن کے ہری بھری چراگاہوں پر پھیل جاتا ہے۔ اور کبھی میرے دل کے گوشے میں ایک اُمنگ بن کے سمٹ آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں مجھے شاعر بنا سکتی تھیں۔ مجھے غالب یا ٹیگور کا دل دے سکتی تھیں لیکن ابا مجھے کالج میں پڑھوا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں، میں اپنے کو خود قتل کر رہا ہوں جب میں مصنوعی دنیا کو نفرت سے ٹھوکر مارنا چاہتا ہوں [illegible] شاید میں کسی دن یہ سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں۔ تمھیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ [illegible] اُمنگ کا جزیہ مجھے مل

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ مجھ سے قریب رہو۔ میں کبھی یہ نہیں کہوں گا کہ چھپ کر راتوں میں مجھ سے ملو۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے یہ سمجھنے دو کہ تم میری ہو۔

تمھارا شاہد

یہ خط لغیر القاب کے ہے کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ آپ نے جس خلوص اور اعتماد کے ساتھ مجھے لکھا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ آپ کو شاہد صاحب کی بجائے کچھ اور لکھا جائے لیکن میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتی کہ یہ کچھ لکھ سکوں۔ آپ کے خط کو میں نے کئی بار پڑھا۔ اُسے پڑھ کے میرے ذہن میں اور دل میں اتنے اُلجھے ہوئے خیالات آئے ہیں کہ ابھی انھیں نہیں سُلجھا سکی ہوں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ ابھی دیکھئے کہ قطرے پہ گُہر ہونے تک کیا گزرتی ہے۔

عصمت

عصمت!

تم نے سب سے پہلے مجھے لکھا تھا کہ میں بے خود بنا وہاں تک نہ پہنچ جاؤں جہاں سے تنہا لوٹتے ہوئے مجھے دُکھ ہو۔ میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ اب میری

تبسم میں:

ایک آواز نے ہوٹل کی ساری خاموشی کو ختم کر دیا۔

کیبن کا پردہ ہلا۔

"کیا حکم ہے صاحب؟"

ایک گول مٹول عورت بھونڈے بناؤ سنگھار سے آراستہ، بولی۔

"کسی دوسرے کو بھیجو!" اجنبی کا ساتھی بولا۔

"مجھے یاد کیا آپ نے؟" دوسری آئی۔

"جی نہیں، وہ جو لال ساری میں ہے۔ ذرا اُسے بھیجنا" اجنبی کے ساتھی نے اتنا
سوچ میں آ کر اُس سانولی سلونی چیچک زدہ لڑکی کو بھی پسند نہیں کیا۔

"لال ساری حاضر ہے سرکار!"

"ارے یار۔ لاحول ولا۔ یہ لال ساری تھوڑے ہی ——— ارے بھئی ——— وہ
جو ——— وہ کیا نام ہے اُس کا ——— اجی ——— تمہارے یہاں کوئی اور
میں ہے؟"

اور وہ بھنا کر باہر چلی گئی۔ ساتھی نے کافی اُستادی سے کام لیا۔ ورنہ وہ لال
اری بڑھیا تو گلے ہی پڑ گئی تھی۔

اجنبی اِس انٹرویو سے گھبرا کر ایک بار پھر اُٹھا۔ اور باہر جانے لگا تو اُس کے ساتھی
نے زبردستی پکڑ لیا۔ یہ ہاتھا پائی ہو ہی رہی تھی کہ دونوں چونک پڑے۔

"شانتی! ——— شانتی سے کام لیجئے ——— میرا نام شانتی ہے۔ آپ
کے لیے چائے آئے گی؟ بیرا چائے لاؤ صاحب کے لیے! اجنبی ہیں تو مچھلی کھانے کے حق
میں ہوں گے کیوں جی؟ ایک پلیٹ مچھلی لانا میرے لئے۔ بولئے اور کیا کھائیں گے آپ؟"

اور دیکھتے ہی دیکھتے میز بھر گئی۔ تین کھانے والے اور تیرہ کی خوراک! شانتی نے
پان کی پیک سے کیبن کی دیوار رنگ دی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اُن دیواروں پر پہلے
سے کافی گل بوٹے بنے تھے۔ شانتی نے چائے شروع کرنے سے پہلے ایک انگڑائی کے
ساتھ لمبی سی سانس لی۔ شراب کی بُو سے سر چکرا اُٹھا۔

"تم نے شراب پی ہے کیا؟"

اجنبی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، تم اِسے شراب کہتے ہو لیکن میرے لئے یہ غم غلط کرنے کی دوا ہے ———
منگاؤں؟ ——— پیو گے؟"

"توبہ ——— اجی تمہیں کس بات کا غم ہے؟" اجنبی نے اُسے چھیڑ دیا۔

"بابوجی! یہ جو گلاب آپ کے سامنے ہے نا! اِس میں کانٹے بھی ہیں۔ آپ کانٹے کیوں
نہیں دیکھتے" شانتی لہرا کر بولی۔ "ہاں اچھا ہی ہے جو آپ کانٹوں سے نظر بچائے رکھیں"

"تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

اجنبی اُسے جیسے پہیلا بنا رہا تھا۔

"مطلب؟ بابوجی مطلب تو صاف ہے۔ سال بھر میں میرا باپ مرا۔ میں بیوہ ہوئی
میری گود ٹھنڈی۔ میں خاندان میں کلموہی ہو گئی۔ شبھ موقعوں پر لوگ میری صورت نہ دیکھتے۔
شادی بیاہ میں میری شرکت بدشگونی ہوتی" شانتی سنجیدہ ہو گئی۔ "میں نے کچھ دن تو یہ
سب برداشت کیا لیکن جوانی اِس کی تاب نہ لا سکی۔"

شانتی نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"میرے سرکار! پھر ——— پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟ میں نے آپ کے
اِس بے ڈھنگے سماج کے منہ پر اِس زور کی لات ماری کہ اُس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔"

وہ سینہ تان کر بولی۔

"اور اب ——— اب بڑے بڑے بھاگوان آ کر میری صورت دیکھتے ہیں۔ مجھ
سے باتیں کرتے ہیں۔ اب میں بدشگون نہیں۔ اب میں کلموہی نہیں۔ اب میں ایک آزاد لڑکی
ہوں ——— شانتی ——— آپ کی ڈارلنگ!" اور اُس نے آنکھ دبا کر اجنبی کی ٹھوڑی
پر اُنگلی ماری۔

"تو کیا تم اِس زندگی سے خوش ہو؟"

اجنبی نے پوچھا۔

"خوش ہوں، مُسکراتی ہوں۔ لیکن اپنے لئے نہیں۔ آپ کے لئے، آپ کے دل
کے لئے۔ اور ہاں، اپنے پیٹ کے لئے۔ کیوں؟ آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

"اجی چھوڑو بھی۔ تم نے کیا حماقت چھیڑ دی" شانتی سنبھل کر بولی۔

پھر وہ زمین اور آسمان کی باتیں کرتی رہی۔ اور بغل کے کیبن سے کبھی لپک
جھپک کے ساتھ برتنوں کی کھنکھناہٹ گونجتی کبھی ہلکے ہلکے قہقہے اُٹھتے . . . اور تھوڑی
تھوڑی دیر پر وہی گرجتی ہوئی آواز ———

"چلو آٹھ نمبر ——— دو نمبر میں ——— چار نمبر میں ——— چھ نمبر میں"

شانتی نے مچھلی کی پوری پلیٹ صاف کر دی۔ صرف کانٹوں کی ایک شاخ بچی پڑی تھی۔ لیکن اجنبی نے ابھی اپنی پیالی میں چائے تک نہ انڈیلی تھی۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بیرا! بل لاؤ۔ پانچ نمبر کا۔"

شانتی نے کیبن سے آواز دی۔

بل آ گیا۔ اجنبی نے چپ چاپ بل ادا کر دیا۔ اور بیرے کو ٹپ بھی کر دیا۔

"اور میری بخشیش؟" شانتی نے مچل کر کہا۔

"بخشیش کس بات کی؟ بل تو تمہارا بھی ہم نے دے دیا ہے۔" اجنبی کا ساتھی بولا۔

"وہ تو تمہارا اخلاقی فرض تھا۔ اور بخشیش یہاں کا قاعدہ ہے۔"

شانتی کا لہجہ ترش ہو گیا۔ اجنبی برداشت نہ کر سکا۔ اور اٹھ کر چل پڑا۔ شانتی جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ اور میز پر ایک لات مار کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے اس نے سماج کے منہ پر لات ماری تھی۔ سماج کیا، اس کا بس چلے تو وہ گاہکوں کے منہ پر بھی لات مار سکتی تھی۔

اجنبی نے یہاں کے نظام سے تنگ آ کر وہ جگہ ہی چھوڑ دی۔ اس نے سوچا تیتے ہوئے ناہموار راستے ٹھنڈی سڑک سے زیادہ آرام دہ ہیں۔ دھان کے لہکتے ہوئے کھیت بنارسی باغ سے زیادہ حسین ہیں۔ اور اس کے گاؤں سے نکلی ہوئی نہر گومتی سے زیادہ مقدس ہے۔

جاتے جاتے اس نے پھر ایک بار وہ منظر دیکھا جو ایک شہر کی عظمت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مسکراتی ہوئی گومتی کے ایک سرے پر سرخ گھنٹہ گھر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف شاہی عمارتوں کے گنبد غرور میں پھولے کھڑے تھے۔ اجنبی مسکرا پڑا۔

لیکن شانتی کے پلیٹ میں بکھرے ہوئے مچھلی کے کانٹے یکبارگی اس کے ذہن میں چبھ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

——— اور گاڑی ان تمام باتوں سے بے نیاز زمانے کے چکر کی طرح اپنی ہی رنگ میں مگن تالیاں بجاتی، قہقہے لگاتی چلی جا رہی تھی ——— !

آنکھیں میری — باقی اُن کا

طنز و مزاح

از

جناب ظفر پیامی ایم۔ اے

ایک اداریہ —— "نااہل اور نکمّے لوگوں کو کانگرس کے ٹکٹ نہ دیئے جائیں"۔ —— تو پھر وزیر بنانے کے لئے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

ایک پریس نوٹ —— "یونسکو کے اسٹاف میں ہندوستان کا کوٹہ بڑھا دیا گیا ہے" جو اس وقت تک خالی رہے گا جب تک کہ وزارت تعلیم کے افسروں کے سالوں اور دامادوں کے بھائیوں کے بیٹے بالغ نہ ہو جائیں۔ کیونکہ فی الحال تو کوئی سالا یا کسی داماد کا بھائی اِس کام کے لئے فارغ نہیں ہے۔

ایک خبر —— "برطانوی سائنسداں پروفیسر ہالڈین کی بیگم نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں کچھ عرصے کے بعد ہندوستان جا رہی ہوں اور مجھے خوشی ہوگی کہ میں وہاں لوگوں سے کہہ سکوں گی کہ میں بھی انگریزوں کی جیل میں رہ چکی ہوں"۔ —— اُس وقت تک سیٹ تو کوئی خالی نہیں رہے گی لیکن نائب وزارت کا چانس شاید مل جائے۔ کیونکہ جیل کا نام اِسی لئے لیا جاتا ہے۔

ایک خبر —— "برطانیہ میں دار العوام کی ایک کمیٹی موت کی سزا کو زیادہ آسان بنانے کے طریقوں پر غور کر رہی ہے"۔ —— مجرموں کو ہندوستان بھیج دیا جائے اور یہاں پر انھیں ادگھاٹن کرتے ہوئے وزیروں کے بھاشن سنائے جائیں یا سرکار کی طرف سے شائع شدہ "ادبی و ثقافتی" رسالے پڑھنے کو دیئے جائیں۔ یا آل انڈیا ریڈیو کے دو چار قومی پروگرام سُنوا دیئے جائیں۔ بڑی آسانی سے موت واقع ہو جائے گی۔

ایک خبر —— "بہار میں مرکز کے نمائندے شری مرارجی ڈیسائی کے سامنے کانگرسیوں نے ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے کئی جتن کئے۔ مثلاً سرکار کے سامنے لیٹے۔ کانگرس کے اجلاسوں میں شرکت کی تاریخ پیش کی اور بھوک ہڑتال کی دھمکی دی"۔ —— ہمارے خیال میں انھیں یہ سب کچھ کرنے کے بجائے مندرجہ ذیل ترکیبوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا چاہئے تھا۔ کامیابی یقینی تھی (۱) یہ کہتے کہ میرا کانگرس سے کوئی سروکار کبھی نہیں رہا۔ (۲) اگر آپ نے ٹکٹ نہ دیا تو مخالف پارٹی کا اُمیدوار بن جاؤں گا (۳) حلف ادا کرتا ہوں کہ ممبر بن کر وزیر بننے کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ (۴) اگر وزیر بنا دیا گیا تو جہالت اور نااہلیت کا وہ ریکارڈ قائم کروں گا کہ لوگ باقی سب وزیروں کے گناہ بھول جائیں گے

ایک اداریہ —— "پنجاب کیمونسٹ پارٹی نے کبھی اکالی فرقہ پرستوں سے اتحاد کیا تھا، اب ہندو سبھائی اور جن سنگھی فرقہ پرستوں سے اتحاد کر رہی ہے۔ یہ موقعہ پرستی کیوں؟" —— اِس سے پہلے مسلم لیگ سے بھی اتحاد کیا تھا۔ کیمونسٹ پارٹی اِن اتحادوں سے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اُسے ہندو مُسلم اور سکھ سبھی فرقہ پرستوں سے یکساں محبت ہے۔

"ایک اشتہار —— "رُوسی سرکس ہندوستان آرہا ہے"۔ —— لیکن ہماری پارلیمنٹ کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟

ایک تقریر —— "رُوس والوں نے "جارحانہ حملے" کا لفظ ہی اپنی ڈکشنری سے خارج کر دیا ہے"۔ —— اور انگریزوں نے "حملے" کا نام "دوستانہ مداخلت" رکھ دیا ہے۔ گویا ساری دُنیا میں حملے کا وجود ختم کر کے امن و امان پھیلا دیا گیا ہے۔

روسی خبر رساں ایجنسی "طاس" نے ہنگری کے دار الحکومت بوڈاپسٹ میں حالات بہتر ہونے کے ثبوت میں کہا ہے کہ "اب تو وہاں ذبح خانے بھی کھل گئے ہیں" ـــــ یہ بیان یقیناً ناقابلِ تردید ہے۔

پنڈت نہرو ـــــ "غیر ملکوں میں لوگ ہمارے کلچرل ڈیلی گیشنوں میں مداریوں کی بھی مانگ کرتے ہیں" ـــــ اسی لئے تو کہا تھا کہ کوئی ٹیم وزیروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

ایک خبر ـــــ "علامہ مشرقی نے اپنی اسلام لیگ کا نام مسلم لیگ رکھ کر سردار عبدالرب نشتر صدر لیگ کو مصیبت میں ڈال دیا ہے کہ وہ کیا کریں" ـــــ اپنا نام سردار عبدالرب نشتر سے علامہ مشرقی رکھ لیں۔

پنڈت نہرو ـــــ "شری لال بہادر شاستری کا استعفےٰ ایک قابلِ قدر مثال ہے" ـــــ مگر اب کون قابلِ مثال بننے کے لئے تیار ہوگا؟

ایک سوال ـــــ "بم اور پٹاخے میں کیا فرق ہے؟" ـــــ دہلی پولیس کی اصطلاح ہے جس دھماکے میں لوگ صرف زخمی ہوں وہ صرف پٹاخہ ہے۔ اور جس میں ہلاک ہو جائیں وہ بم ہے۔

ایک خبر ـــــ "امید ہے کہ کیرالا مسلم لیگ جلدی کانگرس میں شامل ہو جائے گی" ـــــ ہمارے خیال میں تو مسٹر جناح کی یہ جائدادِ متروکہ ماسٹر تارا سنگھ کو الاٹ ہو جانی چاہئے جو "اکالی دل" کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد "رفیوجی" ہو بیٹھے ہیں۔

سیلون لائیڈ وزیرِ خارجہ برطانیہ ـــــ "مصر سے اتنی کامیابی سے واپس آنے پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں" ـــــ کامیابی سے پیچھے ہٹ آنا برطانوی فوجوں کی پرانی روایت ہے۔

ایک تقریر ـــــ "جو کلچرل ڈیلی گیشن باہر جاتے ہیں ان میں بعض فضول محض نمائشی ہوتے ہیں" ـــــ لیکن اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی نمائش بھی نہیں ہو سکتی۔

ایک خبر ـــــ "برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں پیشگوئیاں ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ سر انتھونی ایڈن کے بعد برطانیہ کا وزیرِ اعظم کون ہوگا" ـــــ جناب شہید سہروردی اپنی موجودہ ذمہ داری سے فارغ ہونے ہی والے ہیں۔

ایک خبر ـــــ "شری کرشنا مینن وزیرِ تجارتِ خارجہ بنائے جائیں گے" لیکن پنج شیل کا اسٹاک تو اب ختم ہو چکا ہے۔

"ٹریبیون" لندن ـــــ "ایڈن کی بیماری کی خبر جھوٹ تھی" ـــــ مالیخولیا کی خبر آتی تو سچ ہو سکتی تھی۔

شری پرشوتم داس ٹنڈن ـــــ "جنوبی ہندوستان میں لوگ ہندی کو شمالی ہندوستان کی زبان سمجھ کر نفرت کرتے ہیں" ـــــ مگر ہم شمالی ہندوستان والے تو اس کے اسی لئے گرویدہ ہیں کہ وہ جنوبی ہندوستان کی بھاشا ہے۔

ایک خبر ـــــ "دہلی میں مسٹر چو این لائی نے چینی زبان میں جو تقریر کی اس کا بڑی شدھ ہندی میں ترجمہ بھی کیا گیا" ـــــ اور پنڈت نہرو نے اسی شدھ ہندی کا "سیدھا اردو" میں ترجمہ کر دیا۔

ایک خبر ـــــ "برطانیہ میں پٹرول کا راشن ہو گیا" ـــــ شاید یہ بھی فیرینبہ کے حملے کا اثر ہے۔

ایک خبر ـــــ "مسٹر چو این لائی نے مارشل چیانگ کائی شیک کو بہت بڑا عہدہ دینے کی پیشکش کی ہے" ـــــ اسی مثال سے فائدہ اٹھا کر علامہ مشرقی بھی سردار عبدالرب نشتر کو اپنی مسلم لیگ کا نائب صدر بنانے کی پیشکش کر سکتے ہیں۔

ایک خبر ——— "پلاننگ کمیشن نے ایک بجٹ کمیٹی بنائی ہے جو سرکاری تعمیرات پر بچت کے طریقوں پر غور کرے گی" ——— ہمیں ایک نئی کمیٹی کا انتظار ہے جس کا کام بجٹ کمیٹی کے اخراجات پر بچت کے طریقوں پر غور کرنا ہو۔

ایک اطلاع ——— "مسٹر چو این لائی نے کلکتہ میں آم کا ایک پودا لگایا جس کے پھل کا نام چو این لائی آم رکھا جائے گا" ——— کیونکہ اشالن کے لگائے ہوئے پودے کمیونسٹ پارٹی کا پھل گل سڑ چکا ہے۔

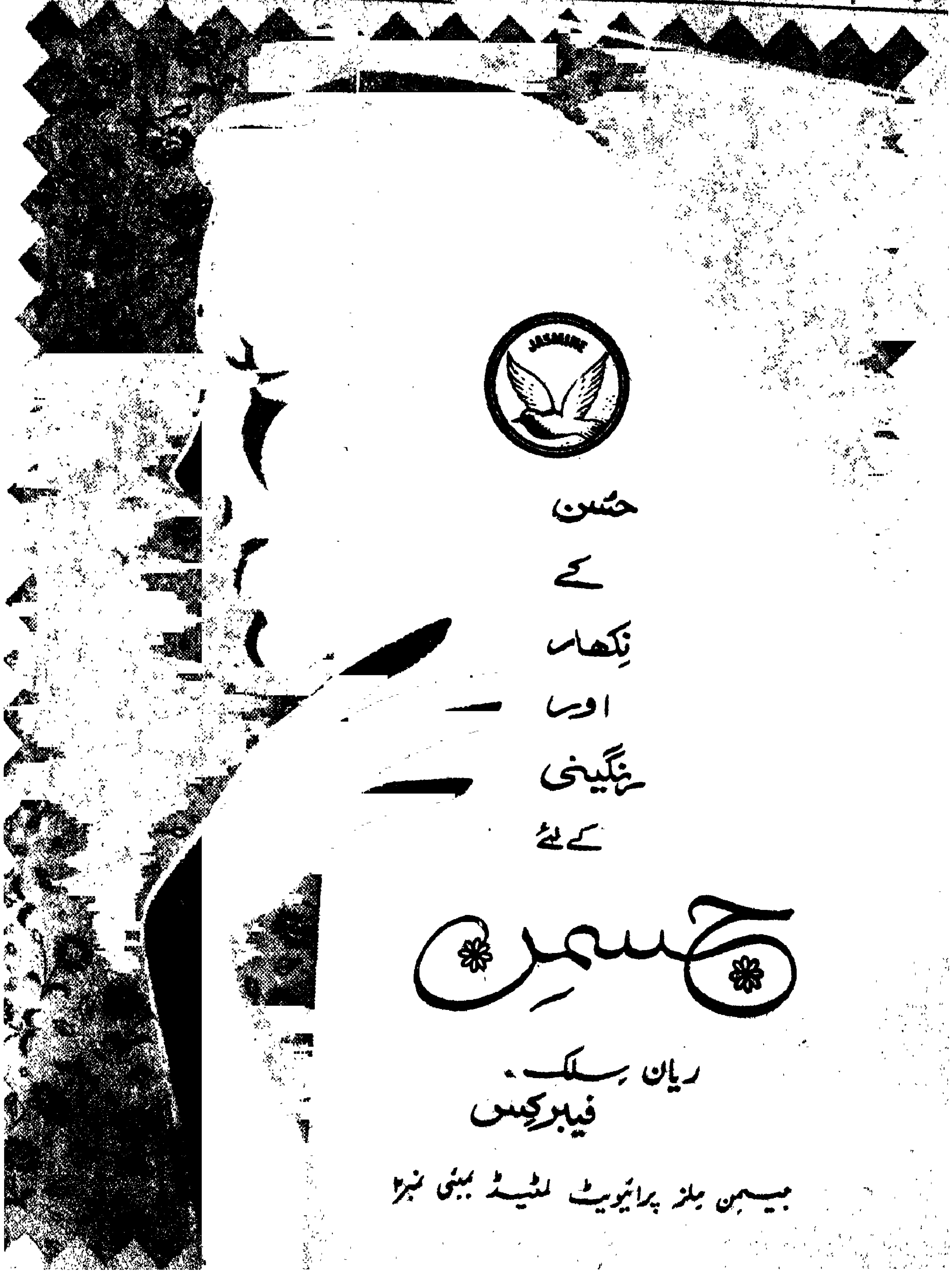
ایک بیان ——— "نہ جانے کیوں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں اُن لوگوں کو بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا ہے جو ہرگز ہرگز ادیب نہیں ہیں" ——— تاکہ ادیبوں کو اُس میں شامل ہونے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔

ایک خبر ——— "برطانیہ کی کنسرویٹو پارٹی نے مطالبہ کیا ہے کہ برطانیہ مصر کا تین کروڑ پونڈ قرض ادا کرنے سے انکار کر دے" ——— کیونکہ اتنی شہ بیسا نی مفت تو نہیں کی جاسکتی۔

راجکماری امرت کور ——— "کام کرنے والوں کے دشمن اِس دُنیا میں بہت ہیں" ——— اور آپ نے جس خوبی سے دہلی والوں کا کام تمام کیا ہے اُس نے تو دوسری دُنیا میں بھی آپ کے دشمنوں کی تعداد دوگنی کر دی ہے۔

مسٹر چو این لائی ——— "چین ہندوستان سے بہت کچھ سیکھ کر فائدہ اُٹھا سکتا ہے" ——— اور ہندوستان کمیونسٹوں سے تھوڑا سا بھی سیکھ لے تو بڑی آسانی سے اپنا بیڑا غرق کر سکتا ہے۔

نائب وزیر خارجہ برطانیہ ——— "مصر میں جنگ بند کروانے میں بغداد پیکٹ کے ارکان کا بڑا ہاتھ تھا" ——— ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔



JASMINE
حُسن
کے
نِکھار
اور
رنگینی
کے لئے
جسمن
ریان سِلک
فیبرکس
جیسمن ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ بمبئی نمبر۲

افسانہ

پروفیسر بھاٹیہ

از

جناب جگدیش بمل

بمبئی ــــــ ۳ نومبر ۱۹۵۶ء

محترم بھائی خوشتر صاحب! سلام محبت

بہت دنوں کے بعد "پروفیسر بھاٹیہ" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اس وقت جب کہ زندگی کی مانگیں بڑھ رہی ہیں اور محنت سے کمانے کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے پروفیسر بھاٹیہ کی نئی راہ دلچسپ اور کارآمد ثابت ہوگی۔ آپ لکھیں کیا میں ملک کے ہزاروں پروفیسروں اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ایک نئی راہ نہیں کھول رہا ہوں ــــــ آپ کی رائے کا مجھے انتظار رہے گا۔

آپ کا اپنا
بمل

پہلے سال تو اس بات کی سب کو حیرت ہوئی لیکن یہ سمجھ کر کہ کسی لاولد قریبی رشتہ دار کی اچانک موت پر اُس کی جائداد کا حق پروفیسر صاحب کی قسمت کے بند دروازے کھول گیا ہے سبھی نے اپنی حیرت کو مطمئن کر لیا لیکن دوسرے سال جب پھر یہی بات بنک منیجر کے اکلوتے لڑکے نے کالج میں آکر بتائی تو کالج میں ہر طرف چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ جہاں چند لڑکے کھڑے ہوتے پروفیسر بھاٹیہ کی بات زبان پر آجاتی کئی لڑکوں نے اشاروں میں پروفیسر بھاٹیہ سے اس بارے میں پوچھنا چاہا لیکن پروفیسر بھاٹیہ کی دلکش مسکراہٹ کے سوا اُنھیں کوئی جواب نہ ملا۔ کچھ دنوں تک یہ بات سب کی زبان پر رہی لیکن آہستہ آہستہ کالج کی رُومان پرور فضا اس بات پر چھا گئی۔ لڑکوں کا فراموش کار ذہن آہستہ آہستہ اسے بھولنے لگا۔ کالج کی دوسری مصروفیات نے بھی اُنھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فائنل ایئر کے لڑکے امتحان کی تیاری میں لگ گئے۔ فرسٹ اور تھرڈ ایئر کے طلبا فیلوشپ کے چناؤ، ڈیبیٹ سوسائٹی، ہسٹاریکل فنکشن وغیرہ میں مصروف ہو گئے۔ اور جو طلبا ان مصروفیات سے الگ رہ گئے وہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے یا پریڈ مِس کر کے کالج لانز میں ٹہلنے اور سگریٹ پینے میں دلچسپی لینے لگے۔ پروفیسر بھاٹیہ کی بات کے بجائے اب انگریزی فلموں کی باتیں ہونے لگیں۔ کلارک گیبل کی شہری مونچھوں اور اُس کی مسکراہٹ کے انداز کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ ریٹا ہیورتھ کے جسم اور اُس کے چہرے کی سیکس اپیل اُن کی باتوں کا موضوع بن گیا۔ تھوڑی ہی ماہ کی مدت میں پروفیسر بھاٹیہ کی بات لڑکوں کے ذہن سے پر لگا کر اُڑ گئی۔ لیکن تیسرے سال چھٹیوں کے بعد جب بنک منیجر کے لڑکے نے پھر وہی بات آکر بتائی تو کالج میں جیسے زلزلہ آگیا۔ سارے طلبا کے چہروں پر حیرت اِس طرح پھیل گئی جیسے حیرت کوئی چھوت کی بیماری ہو اور زہریلے اور زکام کی طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچی سبھی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہو۔ اب یہ بات کالج کے پروفیسروں اور پرنسپل صاحب تک جا پہنچی۔ لڑکوں میں چہ می گوئیاں تو پچھلے ہی سال بہت ہوئی تھیں لیکن اب تو لڑکیاں بھی کھلے عام آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ جہاں سے پروفیسر بھاٹیہ نکل جاتے طلبا کی نگاہیں اُن کی طرف اُٹھ جاتیں لیکن پروفیسر بھاٹیہ اپنی دلکش مسکراہٹ لیے ہوئے سب سے بے پروا گزر جاتے

"پروفیسر بھاٹیہ کی قسمت آگے سے نکھر گئی ہے۔ اور اب تو بہت سمت منہ نظر آ رہے ہیں" کوئی لڑکا کہتا۔

"ہاں صاحب روپیہ سب سے بڑی رونق ہے" دوسرا کہتا۔

"مگر یہ سب۔ یہ سب کہاں سے آ رہا ہے ــــ ؟" کوئی جھنجھلا اُٹھتا۔

"کسی پوشیدہ خزانے کا پتہ مل گیا ہے!"

کوئی کہتا۔

"میں نے حال ہی میں ایک فرنچ ناول پڑھا ہے۔ اُس میں ایک چور کی داستان ہے۔ جو سوسائٹی میں بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں نت نئے طریقوں سے چوریاں کیا کرتا تھا۔"

لڑکیاں پروفیسر بھاٹیہ کے نت نئے سوٹ اور بالوں کے انداز کی باتیں کرنے لگیں۔ پروفیسر بھاٹیہ یوں تو پہلے ہی بہت خوبصورت تھے لیکن گزشتہ تین سال کی مُدت میں اُن کی جوانی پہ جیسے بہار آگئی تھی۔ اُن کا سفید اور زرد سا رنگ کچھ کچھ سُرخ ہو گیا تھا۔ تھا۔ جیسے آٹے میں کسی نے سیندور گھول کر ایک خوبصورت پیکر بنا دیا ہو۔ پہلے وہ سیدھی مانگ سے بال بنایا کرتے لیکن اب ٹیڑھی مانگ بناتے اور اُن کے بالوں میں نہ جانے کیسے چھوٹے چھوٹے گھونگھر بن گئے تھے۔

پروفیسر بھاٹیہ جو پہلے ذرا بھی فیشن ایبل لباس نہ پہنتے، اب قیمتی سے قیمتی سوٹ پہننے لگے۔ اور جوتے تو ہر روز الگ۔ ایک سوٹ کے ساتھ ایک جوتا، دوسرے کے ساتھ دوسرا۔ لڑکیاں پہلے تو ہلکی ہلکی سرگوشیاں کرنے لگیں۔ پھر کھلے بندوں یہ بات ہونے لگی۔ یہاں تک کہ لڑکیوں نے مل کر ایک ایکشن کمیٹی بنالی۔ جس میں کالج کی سبھی شریر لڑکیاں ممبر چُنی گئیں۔ قدرتی طور پر ایکشن کمیٹی کا صدر مس اوما تھر ڈائیر کو بنا دیا گیا۔ جو کالج کی ساری شریر لڑکیوں کی سرتاج تھی۔

نئے نئے طریقوں سے پروفیسر بھاٹیہ کا راز جاننے کی ترکیبیں نکالی گئیں لیکن ہر ترکیب پروفیسر بھاٹیہ کی خاموشی، اور دل کش مسکراہٹ کے سامنے شکست کھا کر رہ گئی۔ لڑکیاں تھک گئیں۔ اور اب بہت سے دوسرے پروفیسروں کے ذریعے اِس بات کی چھان بین کرنے لگیں۔ لیکن پروفیسر بھاٹیہ کے اِس راز کو جاننے کیلئے پہلے ہی بہت سے پروفیسر ناکام کوشش کر چکے تھے۔

ایک دن پرنسپل صاحب نے پروفیسر بھاٹیہ سے یہ بات اشاروں میں کہلوانی چاہی۔ پروفیسر بھاٹیہ کو طلب کر کے اُنھوں نے کہا۔

"بھاٹیہ صاحب! تین ماہ کی چھٹیاں آپ نے کہاں گزاریں؟"

پروفیسر بھاٹیہ مسکرا پڑے۔

"مگر سر! کالج کھلے تو اب ایک ماہ ہو گیا۔ یہ بات تو بہت پُرانی ہو گئی ہے"

پرنسپل صاحب جھینپ گئے۔ اُن کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ نے بتا دیا کہ وہ پروفیسر بھاٹیہ کے راز کو اگلوانے کی کوشش میں ہیں۔ پرنسپل صاحب نے ایکدم چلنا ہی اچھا سمجھا۔

"بھاٹیہ! کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں یہ کیا بات اُٹھ رہی ہے۔ پروفیسروں سے لے کر چپراسی تک اِس بات کو جاننے کے لئے پریشان ہیں۔ آخر یہ بات کیا ہے؟"

پروفیسر بھاٹیہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ جیسے وہ شرما گئے ہوں۔

"اگر کسی کے پاس روپے کا آنا حیرت انگیز بات ہے تو دُنیا کے سبھی کاروباری آدمی اور امیر لوگ باعثِ حیرت ہیں۔"

"لیکن بھاٹیہ! روپیہ تمھارے پاس ہونا تو کوئی قابلِ حیرت بات نہیں۔ لیکن تین ماہ کے قلیل عرصے میں ہر سال اتنی بڑی رقم کا آجانا ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔"

پروفیسر بھاٹیہ نے سنجیدگی سے ایک بار پرنسپل صاحب کی طرف دیکھا پھر خود ہی مُسکرا پڑے۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کو میری قابلیت پر یقین نہیں۔ کیا میں اتنا قابل اور ذہین نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح یہ معمولی رقم اپنے لئے پیدا کر سکوں میرا خیال ہے آپ کو اس بات کا شک نہ ہو گا کہ میں اَن پڑھ بنیوں اور لالوں سے زیادہ قابل اور ذہین ہوں۔ اگر بغیر پڑھے لکھے وہ دو تین ہزار روپے ماہانہ بہت آسانی سے کما سکتے ہیں تو کیا میں اتنا پڑھنے لکھنے کے باوجود اِس قابل نہیں کہ تین ماہ میں دس بارہ ہزار کی رقم اپنی آسائش اور آرام کے لئے پیدا کر لوں۔"

پرنسپل صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ پروفیسر بھاٹیہ باتوں میں نہ ہاریں گے۔ اِس لئے اُنھوں نے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔ اور ایک اچھے کھلاڑی کی طرح مسکرا کر اُنھوں نے کہا۔

"بھاٹیہ، مجھے تمھاری قابلیت پر رشک ہے، آئی وِش یُو ایوری سکسیس —

"I WISH YOU EVERY SUCCESS

اور جب پروفیسر بھاٹیہ پرنسپل کے کمرے سے باہر نکلے تو اُنھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کتنے ہی لڑکے کمرے کے باہر کان لگائے کھڑے ہیں۔ باہر کھڑے ہونے والوں کی صف میں دو پروفیسر، کالج کے آفس کا ہیڈ کلرک اور چپراسی بھی موجود ہیں۔ پروفیسر بھاٹیہ کو اچانک سامنے دیکھ کر جیسے سبھی جھینپ گئے۔ پروفیسر بھاٹیہ نے اپنی حیرت کا

مسکراہٹ کے پردوں میں چھپالیا۔ اور مسکراتے ہوئے وہ لائبریری کی طرف نکل گئے۔

پروفیسر بھاٹیہ کالج میں فلسفہ اور سائیکولوجی کے ہیڈ تھے۔ ایک سلجھے ہوئے اور سنجیدہ مزاج ہونے کے علاوہ وہ ایک باعمل آدمی تھے۔ چار سال پہلے جب وہ اس کالج میں فلسفہ کے ہیڈ بن کر آئے تھے تو کالج میں نہ کوئی ڈیبیٹ کلب تھی۔ نہ بزم ادب، اور نہ کوئی "سوسائٹی میٹافزکس اینڈ دی نیچر آف گاڈ"۔

ایک ہی سال کے قلیل وقت میں انھوں نے ان تینوں سوسائٹیوں کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ وہ انھیں بوٹنگ کلب کا بھی پریزیڈنٹ چن لیا گیا۔ بوٹنگ کرنے میں تمام کالج میں ان کا حریف کوئی نہ تھا۔ اور سب سے زیادہ حیرت کالج کے پرائز ڈسٹری بیوشن اور اسپورٹس کے وقت ہوئی۔ جب اسٹاف کی اور لڑکوں کی لمبی دوڑ میں وہ تمام کالج میں اوّل رہے۔ ان کے جسم کی ساخت، قد و قامت اور شکل و صورت سے یہ کبھی بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اس شکل و صورت اور خد و خال کے پیچھے ایک نہایت ہی تنومند اور گٹھیلا جسم چھپا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب کی شخصیت ایک سال میں اتنی پاپولر ہو گئی کہ وہ سارے کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کے محبوب پروفیسر بن گئے۔

دوسرے سال سائیکولوجی اور فلسفہ کی کلاس میں پہلے سے تین گنا زیادہ لڑکے ہو گئے۔ لڑکیوں کے لئے فلسفہ ہمیشہ خشک مضمون سمجھا گیا ہے۔ لیکن تھرڈ ایئر کی سترہ آرٹ کلاس کی لڑکیوں میں سے چودہ نے فلسفہ لے رکھا تھا۔

ان ساری باتوں کے باوجود نہ جانے پروفیسر بھاٹیہ میں کون سی ایسی خاص بات تھی جس سے ان کی شخصیت پُراسرار بن کر رہ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے بارے اور اپنی زندگی کے بارے میں کبھی بھی ایک لفظ کسی کو نہیں بتایا تھا۔ یوں تو وہ تنہائی پسند مشہور ہی تھے۔ پھر بھی لیکچر کے دوران میں یا ڈیبیٹ کے وقت کبھی بھی اپنے بارے ان کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ ان کے بارے میں کوئی بھی بات لڑکوں اور پروفیسروں کو معلوم ہوتی تو سارا کالج چونک جاتا۔ کیونکہ ان کا عمل ان کی زبان تھا۔ اور ان کی زبان پروفیسر کی زبان تھی جو صرف لڑکوں کو تعلیم دیتے وقت کھلتی تھی۔

پروفیسر بھاٹیہ کو جب کالج میں آئے ہوئے پورا ایک سال گزر گیا تو ایک لڑکے نے یہ خبر سنائی کہ شہر کے دو تین مہاجنوں سے پروفیسر بھاٹیہ نے قرضہ لے رکھا ہے۔ کالج کے طلبا کے لئے یہ بہت ہی حیرت انگیز بات تھی کیونکہ پروفیسر بھاٹیہ ابھی تک بالکل اکیلے تھے۔ دور یا نزدیک سے کوئی انھیں ملنے کے لئے بھی کبھی نہ آیا تھا۔ ان میں کوئی بری عادت ہو سکتی ہے اس کے بارے میں لڑکوں کو کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا کیونکہ پروفیسر بھاٹیہ کو آج تک کسی نے سگریٹ پیتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا۔ کبھی وہ شہر کے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں نہیں دیکھے گئے۔ کالج کے پاس ہی انھوں نے دو روم کا ایک بلاک لے رکھا تھا جس کا وہ تیس روپے ماہوار کرایہ ادا کرتے تھے۔ وہ اور ان کا باورچی۔ دو آدمیوں کے کھانے کا خرچ ہی کیا ہو سکتا ہے۔

کئی لڑکوں نے پروفیسر بھاٹیہ کی غیر حاضری میں ان کے باورچی سے اس بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن اس سے زیادہ انھیں اور کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کالج سے سیدھے گھر اور گھر سے سیدھے کالج آتے جاتے ہیں۔ گھر میں بھی وہ سارا دن پڑھتے رہتے ہیں۔ ان دنوں تو وہ کچھ ایسے فیشن ایبل بھی نہ تھے کہ اپنے کپڑوں وغیرہ کے لئے اتنا خرچ کر سکتے۔

کالج کے تمام طلبا کو ان کی باتوں کی خبر تھی لیکن ان باتوں سے ان کی شخصیت اور بھی پُراسرار بن کر رہ گئی۔ پھر اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اچانک لڑکوں میں یہ بات گشت کرنے لگی کہ پروفیسر صاحب نے اپنا تین چار ہزار کا نہ صرف قرضہ اتار دیا ہے بلکہ مقامی بنک میں انھوں نے چھ ہزار روپے سے اپنا حساب کھلوایا ہے۔ اور تین سال مسلسل ہر تین مہینے کی چھٹیوں کے بعد ان کے حساب میں آٹھ دس ہزار روپے کا اضافہ ہو جاتا اور آج ان کے پاس چوبیس پچیس ہزار روپے کی رقم بنک میں محفوظ تھی۔ کالج کے تمام پروفیسر ان کی ہر دلعزیزی سے پہلے ہی حسد کرتے تھے۔ اب ان کے روپے کی بات سن کر ان کا حسد رشک میں تبدیل ہو گیا۔

ایک دن پروفیسر بھاٹیہ تھرڈ ایئر کی کلاس کو انسان کی سمجھ میں نہ آنے والی کمزوریوں پر لیکچر دے رہے تھے۔

"بہت سی کمزوریاں انسان میں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہزار چاہنے پر بھی انسان نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ ایسی کمزوریاں دو ممکن طریقوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی ممکن بات تو ماں باپ کا خون ہوتا ہے۔ جس سے انسان کو بہت سی کمزوریاں اور اوصاف ملتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ مچھلی پکڑنے والے اگر پیدا ہوتے ہی اپنے بچے کو پانی

[illegible] بچہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے لگے۔ دوسری ممکن بات بہت پیچیدہ ہے۔ وہ [illegible] ہے یعنی سوسائٹی سے۔ بچپن کے کسی غیر معمولی حادثے سے اُس کے ذہن کے [illegible] حصے پر ایک ایسی لکیر سی کھنچ جاتی ہے جسے بہت سمجھنے پر بھی نہیں سمجھ پاتا۔ آدمی کا ذہن فراموش کر دیتا ہے لیکن واقعات کے نتائج کا ردِ عمل اُس کی تمام زندگی کے ساتھ لپٹا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک ایسے انسان کے بارے میں تحقیق کریں جو ایک مضبوط اور بے خوف ہونے کے باوجود پانی میں اُترنے سے گریز کرتا ہے، وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بہت ہی بے خوف اور بے باک ہے۔ لیکن دوسروں کو تیرتے دیکھ کر یا کشتی چلاتے دیکھ کر بھی پانی میں اُترنے سے گھبراتا ہے۔ ہمیں اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کے ماں باپ اچھے تیراک ہیں۔ پھر پانی سے ڈرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ایک ایسے ہی کیس کی ایک جرمن سائیکلوجسٹ نے جب تحقیق کی تو اُسے پتہ چلا جب اُس آدمی کی عمر صرف چالیس دن کی تھی تو اُس کی آیا ٹب میں نہلاتے وقت اپنے ہاتھ چھوڑ دیا کرتی تھی اور بچہ ڈر کر چیخنے لگتا تھا۔ یہ عمل ایک ماہ تک جاری رہا۔ اور یہی چھوٹی عمر کا خوف بڑا ہونے پر بھی اُس آدمی کے تحت الشعور سے نہ جا سکا۔"

اُسی وقت آما جو پروفیسر بھاٹیا ز ایکشن کمیٹی کی صدر تھی کھڑی ہو کر کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب! ایک سوال!"

"یس!"

"پروفیسر صاحب! اگر ہم ایک ایسے آدمی کا سائیکلو اینلیسس (PSYCHO ANALYSIS) کریں جو اپنی زندگی کے بارے میں بالکل بتانا نہ چاہتا ہو، ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو ایک راز بنانا چاہتا ہو تو اُس کے پیچھے پہلی ممکن بات ہوتی ہے یا دوسری؟"

کلاس کے ہر کونے سے قہقہے بلند ہو گئے۔ پروفیسر بھاٹیہ نے ایک بار آما کی شرارت سے مسکراتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگے۔

"یہ سوال آپ لوگوں کا امتحان ہے۔ آپ سب لوگوں کے سامنے ایسا آدمی موجود ہے۔ ایسے آدمی کی تفتیش آپ اپنی عقل سے کریں۔"

اور جب پروفیسر بھاٹیہ اپنے لیکچر پھر شروع کرنے لگے تو کلاس کے سبھی کونوں سے آواز آنے لگی۔

"نوسر — اباؤٹ یو سر!"

اتنے میں پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ پروفیسر بھاٹیہ مسکرا کر اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ طلبا آج زندگی میں پہلی بار گھنٹی بجنے پر پچھتائے۔

اُسی شام آما نے لیک روم میں ایکشن کمیٹی کی میٹنگ طلب کی۔ اور زبردست بحث و مباحثے کے بعد پروفیسر بھاٹیہ کا چیلنج منظور کر لیا گیا۔

آما نے بہت جوش سے کہا۔

"اِس بار چاہے جو بھی ہو، چاہے کتنا ہی روپیہ خرچ ہو یا مجھے دنیا کے کسی حصے میں پروفیسر بھاٹیہ کے ساتھ جانا پڑے، پروفیسر صاحب کے چھپے ہوئے کا راز میں ضرور معلوم کروں گی۔ اِن چھٹیوں کے بعد اُن کا یہ راز راز نہیں رہے گا۔ آپ لوگوں سے وعدہ کرتی ہوں۔"

چھ سات ماہ کا یہ عرصہ انتظار میں گزر گیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں سر پر آ گئی تھیں۔ جس طرح ایک محنتی طالب علم امتحان آنے سے پہلے امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے اُسی طرح آما چھٹیوں کی آمد پر تیاریوں میں مصروف تھی۔ ریلوے بکنگ کلرک کو رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ پروفیسر بھاٹیہ جیسے ہی ٹکٹ لیں، اُن کی منزل کا پتہ سٹیشن کے پاس والے ریسٹورنٹ میں پہنچا دے۔ آما نے گھر خط لکھ دیا کہ وہ ان چھٹیوں میں کالج کے ساتھ ٹرپ پر جا رہی ہے۔ اِس لئے گھر نہ آ سکے گی۔ چھٹیاں ہوتے ہی آما اور اُس کے ساتھی پروفیسر بھاٹیہ کی تاک میں رہنے لگے۔ دو دن کے بعد ہی جب آما کو اطلاع ملی کہ پروفیسر بھاٹیہ اپنا سامان لے کر اسٹیشن پر گئے ہیں۔ وہ بھی تین دن پہلے کا بندھا ہوا سامان لے کر اُن کے پیچھے سٹیشن کے پاس والے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھی۔ اور پروگرام کے مطابق آما کو اطلاع پہنچ گئی۔ پروفیسر بھاٹیہ نے بمبئی سنٹرل کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا۔ آما خوش خوش لڑکیوں سے رخصت ہوئی اور لڑکیوں نے اُس رات دعائیں مانگیں کہ اُن کا مشن کامیاب ہو جائے۔ گاڑی کے سفر کے دوران میں آما نے کوشش کی کہ وہ زیادہ باہر نہ نکلے۔ اور پروفیسر بھاٹیہ کی اچھی طرح نگرانی بھی کرتی رہے اُن کے ڈبے کے ساتھ والے دو ڈبوں کو چھوڑ کر آما فرسٹ کلاس کے ایک زنانہ ڈبے میں سفر کر رہی تھی لیکن دو دن کا یہ سفر جب بمبئی سنٹرل پر ختم ہوا تو اچانک پروفیسر بھاٹیہ کو نہ پا کر آما کی بُری حالت ہو گئی۔ اُس نے پہلے چھپ کر مجمعے میں تلاش کیا پھر کھلے انداز میں ڈھونڈنا چاہا لیکن پروفیسر بھاٹیہ تو یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر

واپس بھی نہیں۔ اگر مجھے دُکھ بھی اٹھانا پڑے گا تو وہ بھی مجھے پیارا ہوگا۔

شاہد

میرے اپنے شاہد!

ایک مختصر سی تحریر مجھے ملی ہے۔ لیکن اُس میں آپ نے اپنے دل کا تمام درد بھر دیا ہے۔ اور مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں جو لکھنے کی مجھ میں کبھی ہمّت نہ ہوتی۔ آپ نے مجھے بالکل بدل دیا۔ میں آپ سے ہار مانتی ہوں۔ خدا جانے کیا کہنا چاہتی ہوں۔ کیسے کہوں؟

آپا کل شام کو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں کہ عصمت! ان دنوں تمھیں کیا ہو گیا ہے تمھیں اپنا دل بہلا کر خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اس طرح تم کھوئی کھوئی رہنے لگی ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ مجھے اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بہت جلد مر جاؤں گی۔ پھر خیال کیا رکھوں۔ یہی میں آپ سے بھی کہنا چاہتی ہوں کہ اگر ممکن ہو تو لوٹ جایئے۔ کیا فائدہ کہ میری آپ کی کہانی ایک غمگین انجام پر ختم ہو جائے۔

آپ کی۔ عصمت

میری عصمت!

آج کا دن کتنا مبارک ہے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ایک دن تم مجھے اپنا کہو گی۔ اور ہار مان لو گی۔ یہ بات میں نے تمھارے پہلے ہی خط سے سمجھ لی تھی۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل!

کھیل بچوں کا ہوا ، دیدۂ بینا نہ ہوا

تم موت کی باتیں بہت آسانی سے کر لیتی ہو، اس سے مجھے دُکھ ہوا لیکن پھر خوشی بھی ہوئی یہ سوچ کے کہ جو بہادر موت کے نام سے ذرا بھی خوف نہ کھائے اُسے موت جلد آ ہی نہیں سکتی۔ آخر وہ کون سی بات ہے جو تمھیں اس حد تک غمگین بنائے ہوئے ہے کہ تم نے فانی کی یاسیت کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے دُکھ اپنوں ہی سے کہے جاتے ہیں۔ پھر مجھے بھی بتا دو۔

تمھارا شاہد

شاہد صاحب!

مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں ہے۔ خدا نے مجھے ایسی ہی طبیعت کا بنایا ہے۔ میں نے آپ کو سچ مچ اپنا سمجھ لیا تھا لیکن مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کے جذبات نے مجھے بہکا دیا تھا۔ اب میں اس خیال سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں میرے پچھلے خطوط مجھے واپس کر دیجیے۔

میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس خیال سے بہت دُکھ ہوگا لیکن بعد میں سسکنے سے یہ بہتر ہے کہ ابھی خاتمہ کر لیجیے۔ میں جانتی ہوں آپ بہت نازک دل کے انسان ہیں لیکن میری اس بے وفائی سے یہ مطلب نکال لیجیے گا کہ دُنیا کی تمام عورتیں فریبی ہوتی ہیں۔ اگر آپ یہ مطلب لیں گے تو یہ میری مجبوریوں کا اور میری فطرت کا مذاق اُڑانا ہوگا۔

آج میں نے اپنی تمام کتابیں جن میں محبت کے جذبات تھے الماری میں ہمیشہ کے لئے بند کر دی ہیں۔ یہ میری زندگی کا حل نہیں بن سکتیں۔

عصمت

میری عصمت!

کئی ہفتے گزر گئے ہیں کہ تم نظر نہیں آتی ہو۔ آخری بار مجھے اُس چہرے کو دکھا دو جس کی پرستش کرنے کے بعد کبھی مجھے کچھ نہ ملا تاکہ میں معافی مانگ سکوں۔ میں کالج اور تمھارا شہر چھوڑ کر چلا جانا چاہتا ہوں۔ اور کہیں تنہائی میں بیٹھ کر قدرت کے حسن سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ کبھی مجھ سے بے وفائی نہ کرے گی۔ اُس کے آبشار اور سبزے میرے اِس غم کو مٹا سکیں گے۔ جو تم نے مجھے دیا ہے۔

شاہد

عصمت!

صد شکر کہ مدت بعد تم پھر نظر آئیں۔ چند لمحوں کے لئے اور میں کچھ کہہ بھی نہ سکا اس کی شکایت نہیں۔ شکایت صرف یہ ہے کہ تم نے اُس عصمت کو کہاں چھپا دیا ہے جو پہلے مجھے ملتی تھی۔ حزن و ملال اِس چہرے پہ گہرا کیوں ہو گیا ہے۔ یہ تو پہلے ہی شاغ

بیٹھ گئی۔ ایک گھنٹہ کی شدید تلاش کے بعد اسٹیشن کی ایک بنچ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اب وہ کیا کرے۔ اتنے میں ووڈ لینڈ ہوٹل کا ایجنٹ اپنی خوبصورت وردی میں وہاں آ پہنچا۔

"مس صاحبہ! آپ ہوٹل میں ٹھہرنا پسند فرمائیں گی؟"

آما نے ایک بار ایجنٹ کی طرف دیکھا۔ پھر بے دلی سے ووڈ لینڈ ہوٹل کا کارڈ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس نے سوچا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ میں یہاں ہوٹل میں ٹھہر جاتی ہوں۔ اور پروفیسر بھاٹیہ کی تلاش جاری رکھوں۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ وہ تو پروفیسر بھاٹیہ ہیں"

اُس نے ایجنٹ سے پوچھا۔

"کہاں ہے ہوٹل؟"

ایجنٹ نے کنوینسنگ کرنے کے انداز میں کہا "مس صاحبہ! ہمارا ہوٹل بمبئی کی بہترین لوکیلیٹی قلابہ میں واقع ہے۔ اور تاج کے بعد بہترین ہوٹلوں میں ہمارا نمبر پہلا آتا ہے۔ ہر رُوم کے ساتھ باتھ فلش سسٹم ٹیلیفون اور۔۔۔۔"

"اچھا اچھا۔۔"

آما نے اُکتائے لہجے میں کہا۔ اور سامان اُٹھوا کر وہ ٹیکسی میں ایجنٹ کے ساتھ روانہ ہو کر ووڈ لینڈ ہوٹل کے ایک رُوم میں قیام پذیر ہو گئی۔ دو گھنٹے تقریباً اُسے نہانے، میک اَپ کرنے اور لنچ کھانے میں گزر گئے۔ اُس کے بعد وہ چار پانچ گھنٹہ بمبئی کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتی رہی، بمبئی کی وسعت، اُس کی بلند اور عظیم عمارتوں کو دیکھ کر آما کو بہت مایوسی ہوئی۔ اِتنے بڑے شہر میں وہ ایک ساڑھے پانچ فٹ کے آدمی کو کہاں سے تلاش کرے گی۔ ناممکن! اُس کا دل اپنی شکست کا احساس کر رہا تھا۔

اُس رات آما بہت اُداس تھی۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل شام کی گاڑی سے اپنے گھر لَوٹ جائے گی۔ کاغذ اور پین لے کر اُس نے شیاما کو خط لکھا۔ اور پروفیسر بھاٹیہ کے کھو جانے کا سارا قصہ بیان کیا۔ آخر میں اُس نے لکھا۔

"مجھے بے حد مایوسی ہوئی ہے اور میں کل رات فرنٹیئر میل سے واپس آ رہی ہوں۔ الیکشن کمیٹی کی صدر کی حیثیت سے میں نے اپنی نااہلی کا زبردست ثبوت دیا ہے اور اسی لئے میں اِس منصب سے الگ ہو رہی ہوں۔"

خط لکھ کر آما پلنگ پر آ گری۔ اُس کا جی چاہا وہ رو پڑے۔ اتنے بڑے شہر میں اُس سے بات کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اچانک اُسے یاد آ گیا۔ ایک بار پروفیسر بھاٹیہ نے کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا "کتابیں انسان کی سب سے بڑی دوست ہیں۔ اُداسی اور غم میں بہک کر بُری عادتوں میں گر جانا کم عقلی ہے۔ کتابیں ہمارے غم میں ایک اچھے دوست کی طرح شریک ہو کر ہمارے خیالات کے دھاروں کو موڑنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ آما نے سوچا، وہ کیوں نہ کوئی کتاب پڑھ کر اپنی شکست کے احساس سے نجات حاصل کرے۔ یہ سوچ کر وہ پلنگ سے اُٹھی۔ اور ڈسکوری آف انڈیا نکال کر کرسی پر آ بیٹھی۔

اُس نے پھر سوچا۔ اگر ساتھ ساتھ کافی کے گھونٹ پئے جائیں تو لطف آ جائے اُس نے کال بیل بجائی۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ کُھلا اور بیرہ داخل ہوا۔ آما نے بیرے کو دیکھا تو ایک لمحہ ایسا محسوس کیا جیسے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہو بیرے نے بھی جب آما کو دیکھا تو اُس کا چہرہ فق ہو گیا۔ پلٹ کر وہ واپس جانے لگا۔ اُسی وقت آما نے اُسے پہچان لیا۔ تھرتھراتی ہوئی آواز میں وہ بولی۔

"پروفیسر صاحب! کہاں جا رہے ہیں؟"

بیرہ کھڑا ہو گیا۔

لیکن پلٹ کر آما کو دیکھنے کی اُس میں ہمت نہ رہی۔ آما نے کرسی سے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اُس کا چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا تھا۔ اور ٹانگیں تو جیسے کانپ رہی تھیں

"پروفیسر صاحب! میں تو سمجھی تھی کہ آپ کے پیچھے بمبئی کا یہ ٹرپ بالکل اکارت چلا گیا۔ لیکن آپ کے ستارے میرے ستاروں سے خود ہی آ ٹکرائے!"

پروفیسر بھاٹیہ بیرے کی پوشاک میں بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک بار ہمت کر کے آما کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی مسکراہٹ میں وہ دلکشی نہ تھی۔

آما نے پھر کہا۔

"اوہ! پروفیسر صاحب! آپ کھڑے ہیں؟ بیٹھئے نا"

پروفیسر بھاٹیہ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "آپ نے بیل بجائی تھی، آپ کو کیا چاہیئے؟"

آما قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ پھر جب اُس نے پروفیسر کی طرف نگاہ کی تو اُسے رحم

سنجیدہ ہو کر وہ بولی۔ آپ یہاں آ کر چاہے کچھ ہو گئے ہوں لیکن میرے لئے تو ویسے ہر دلعزیز پروفیسر بھاٹیہ ہی ہیں۔"

پروفیسر بھاٹیہ اب پلنگ پر بیٹھ گئے۔ انھیں اب کھڑے رہنے کی سکت بھی باقی نہ تھی۔ پھر اپنے حواس کو مجتمع کر کے وہ بولے۔

"آما مجھے تمھاری جیت کی خوشی ہے!"

ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر آما بولی۔

"لیکن پروفیسر صاحب! آپ ــــ آپ کو اس سے کیا آمدنی ہو سکتی ہے؟"

پروفیسر بھاٹیہ اپنے آپ پر قابو پا چکے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر وہی پہلی سی دلکش مسکراہٹ بکھر چکی تھی۔ "ہاں آما میں اپنی قسم کا ایک ہی بیرا ہوں۔ اس شاندار ہوٹل میں بڑے بڑے رئیس اور راجے یا باہر کے دیشوں کے ٹورسٹ ٹھہرتے ہیں۔ میں اپنے نالج سے انھیں متاثر کر دیتا ہوں۔ موقعہ محل دیکھ کر انھیں بائرن، شیکسپیر، اور شیلے کی پوئٹری سناتا ہوں یا ٹینی سین اور لانگ فیلو کے اشعار پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی غالب اور اقبال کے اشعار سنا کر انھیں انگریزی میں سمجھاتا ہوں۔ کبھی کبھی پلاٹو، سقراط، ارسطو، بیکن اور سپنوزا کی فلاسفی بیان کرتا ہوں۔ کینٹ، ڈارون، جیمز، برٹرنڈ رسل، خلیل جبران اور عمر خیام کا فلسفۂ زندگی بیان کر کے انھیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ میری شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ پھر میرے رتبے کو دیکھ کر اور بھی حیرت کرتے ہیں۔ اپنے روز کے ٹپس کے علاوہ وہ چلتے وقت مجھے پچاس پچاس روپے، سو سو روپے انعام دے جاتے ہیں۔ کئی کئی نوابوں اور رئیسوں نے مجھے دو دو سو روپے سے لے کر چار چار سو روپیہ بھی انعام دیا ہے۔"

پروفیسر بھاٹیہ کو آج پہلی بار اپنی زندگی کے بارے میں آما نے بیان کرتے سنا تھا۔ ان کا یہی راز تمام کالج جاننے کے لئے کتنا بے چین ہے۔ آما سارے کالج میں پہلی خوش قسمت سٹوڈنٹ ہے جس نے پروفیسر بھاٹیہ کا یہ اہم راز جان لیا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ پروفیسر بھاٹیہ کی باتیں سنتی ہی رہنا چاہتی تھی۔ ان کی زندگی کی تمام باتیں جاننے کے لئے وہ اب بھی متمنی تھی۔

"لیکن پروفیسر صاحب! آپ نے پہلے پہل یہ کیسے سوچ لیا کہ ــــ کہ اسی کام . . ."

پروفیسر بھاٹیہ کے ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ آ گئی۔ "آما! تم مجھے پوری طرح

سے بچا لینے کی کوشش کر رہی ہو [illegible] کر دیتا ہے تو اس سے اس شخص کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی شخصیت کو پُراسرار اور عجیب بنانے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ بہت سی باتوں کو ایک راز بنا کر چھپایا جائے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آج میں کالج میں اتنا ہر دلعزیز نہ ہوتا۔ تمھارا ہر دلعزیز پروفیسر نہ ہوتا۔ اور یہ تو بتاؤ اگر تمھیں میرے بارے میں سبھی کچھ پتہ ہوتا تو کیا تم چار سو میل کا سفر طے کر کے یہ سب دیکھنے یہاں تک آتیں؟ اتنی چھوٹی سی بات سے میں نے اپنے آپ کو کتنا پُرکشش بنا لیا۔ جب تم جیسی لڑکی میرے پیچھے یہاں تک بھاگی آئی!"

آما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اسے ایک لمحے کے بعد احساس ہوا کہ پروفیسر بھاٹیہ بہت خوبصورتی سے اس کے سوال کے جواب کو ٹال گئے ہیں۔ لیکن آما کا پیاسا دل اب بھی پیاسا تھا۔ وہ نہ رہ سکی۔

"تو پھر اتنا روپیہ کما لینے کے بعد آپ یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟ پروفیسری میں کیا رکھا ہے!"

پروفیسر بھاٹیہ پھر مسکرانے لگے۔

"آما! دنیا میں روپیہ کمانا ہی انسان کی زندگی کا مقصد و مدعا نہیں۔ علم اور فلسفہ میری زندگی کی سب سے بڑی بھوک ہے۔ میں نت نئی چیزیں پڑھتا ہوں۔ ان سے نئی نئی باتیں سیکھتا اور سوچتا ہوں۔ اپنا نالج اور فلسفہ تم لوگوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔ روپیہ میری مادی خوشیوں کو خریدتا ہے۔ مادی ضرورتوں کو تشنہ رکھ کر روحانی سکون کو پا لینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن اب آما میں سوچ میں ہوں کہ شاید اب کبھی بھی کالج واپس نہ جاؤں۔ یہ سبھی باتیں جان لینے کے بعد والدین اپنے بچوں کو میرے پاس تعلیم دینے کے لئے نہیں بھیج سکتے۔ ہمارا سماج ابھی اتنا بلند نہیں ہوا ہے کہ وہ پروفیسر اور بیرے کو ایک ہی نظر سے دیکھ سکے۔"

آما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے چہرے پر اب بھی سرخی تھی۔ ایک لمحے تک وہ پروفیسر بھاٹیہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

"آپ نے مجھے بہت مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ ایک طرف تو آپ کا یہ دلچسپ راز ہے جسے افشا کر دینے سے کالج کو آپ جیسے قابل اور ہر دلعزیز پروفیسر کو کھونا پڑے گا۔ اور دوسری طرف مجھے الیکشن کمیٹی کا خیال آ رہا ہے۔ مجھے اس سے غداری کرنا [illegible]

نہیں معلوم ہوتی۔

خیر اس کے بارے میں دو چار دن میں میں سوچ لوں گی، اب جب کہ اتنی دور سے بمبئی آئی ہوں تو سوچتی ہوں دس پندرہ دن بمبئی میں رہ کر سیر ہی کر لوں۔ لیکن مجھے سیر کرانے کا سارا بار آپ پر ہوگا۔"

آپ ہی آپ آما مسکرا دی۔

لیکن جب مسکرا کر پروفیسر بھاٹیہ نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب پروفیسر بھاٹیہ کمرے سے باہر گئے تو آما نے شیاما کو لکھا ہوا خط پھاڑ کر باہر پھینک دیا۔

تین ماہ کی چھٹیوں کے بعد جب کالج کھُلا تو ایڈمیشن کمیٹی کے تمام ممبر، تمام لڑکیاں اور تمام لڑکے، یہاں تک کہ کالج کے پروفیسروں کی زبان پر بھی پروفیسر بھاٹیہ کا ذکر تھا۔ لڑکیوں میں سے یہ بات نکل کر تمام کالج میں ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی پھیل چکی تھی کہ آما پروفیسر بھاٹیہ کا راز جاننے کے لئے بمبئی گئی ہوئی تھی۔ اور آج اس کے آنے پر پروفیسر بھاٹیہ کا راز راز نہیں رہے گا۔ سارا کالج آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر آما کے آنے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر بھاٹیہ کالج میں آ چکے تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اور اُن کا سفید رنگ گلابی ہو چلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ حسین ہو گئے ہیں۔ کالج کے گوشے گوشے میں اُن کے بارے میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن جب آما نہ آئی تو ہر طرف مایوسی چھا گئی۔

دوسرے دن صبح ہی آما آ گئی۔ کالج کے طلباء میں پھر وہی جوش پیدا ہو گیا۔ لڑکے اور لڑکیوں نے آما کو گھیر لیا۔ لیکن آما اپنے ہونٹوں پر پروفیسر بھاٹیہ جیسی دلکش مسکراہٹ لئے بھیڑ کو چیرتی ہوئی پرنسپل کے کمرے کی طرف بڑھتی گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ پرنسپل کے کمرے سے باہر نکلی تو اُس نے دیکھا، سارے طلباء اپنی کلاسوں میں جانے کی بجائے پرنسپل کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ آما کو دیکھتے ہی سب نے شور مچا دیا۔ آما ایک لمحے کے لئے جھجکی پھر کھڑی ہو کر زور سے کہنے لگی۔

"میں آج کالج سے ہمیشہ کے لئے رخصت لے رہی ہوں۔ اور آپ ـــ آپ جس بات کو سننے کے لئے بہت بے قرار ہیں وہ آپ کو میں کبھی نہیں بتا سکتی۔ اس لئے کہ وہ راز اب میرے شوہر کا راز ہے۔"

یہ کہہ کر آما تیزی سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کالج کے گوشے گوشے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ـــ اور آج بھی پروفیسر بھاٹیہ کا وہ راز ـــ آما اور اُن کی شادی کا راز کالج کے لڑکے لڑکیوں اور پروفیسروں کے لئے ایک راز ہی بنا ہوا ہے!

مرکز

از

جناب پریم وار برٹنی

مدتوں میرے تخیل نے کیا جس کو تلاش | عمر بھر میری نظر کو رہی ہے جس کی جستجو
وہ سراپا ناز وہ شہباز وہ نوخیز شباب | وہ پری پیکر، وہ گل رخ، وہ مہ پارہ ہے تو

سرمگیں پلکوں میں لرزیدہ ہیں خوابوں کے طلسم | مست آنکھوں سے برستی ہے جوانی کی شراب
تیرے جلوے ہیں کہ تاروں کی سنہری جنتیں | تیری زلفیں ہیں کہ خوشبوؤں کے آوارہ سحاب

سرسراتی ہے ترے آنچل میں پھولوں کی بہار | گنگناتی ہیں گھٹائیں گیسوؤں کی چھاؤں میں
تو نے اہلِ دل کو سمجھایا ہے رازِ زندگی | تو نے پہنائی ہیں زنجیریں اجل کے پاؤں میں

تیری ٹھوکر میں ہیں فردوس بریں کی رفعتیں | تیرے ہاتھوں میں ہے سازِ گردشِ لیل و نہار
عظمتِ گنگ و جمن پنہاں ہے تیری چال میں | تیرے قامت سے لرزتا ہے ہمالہ کا وقار

ماہتابوں کے جزیروں کی حسیں ملکہ ہے تو | تو درخشندہ ستاروں کا سنہرا خواب ہے
میرے سینے ہیں تری شبرنگ زلفوں کے اسیر | میرے نغموں میں ترے جلووں کی آب و تاب ہے

کہکشاں، پرویں، ثریا، مشتری، زہرہ، شہاب | یاسمیں، نسریں، ریحاں، جعفری، نرگس، گلاب
پھول اور تارے بھی تیری دلکشی سے ماند ہیں | دونوں عالم میں نہیں تیری جوانی کا جواب

ناز کرتی ہیں تری آواز پر موسیقیاں | تیری سانسوں میں نہاں ہیں جیسے گیتوں کی لَے
ایک شاعر اس سے بڑھ کر کچھ بھی کہہ سکتا نہیں | تو مجسم شاعری ہے، تو سراپا شعر ہے


حسن کا نکھار پاکر دلفریب اور جاذب نظر
بن جائیے۔ "ہزلین، سنو" سے
آپ کو اطمینان ہوجاتا ہے کہ آپ کی
جلد نکھری اور حسین بنی رہتی ہے
"ہزلین" پر پاؤڈر بھی اچھی طرح لگتا ہے۔
"'HAZELINE' SNOW"
(TRADE MARK)
"ہزلین' سنو" (ٹریڈ مارک)
بروز ویلکم اینڈ کمپنی (انڈیا) پرائیویٹ لمیٹڈ۔ پی۔ او۔ بکس نمبر ۲۹ بمبئی

طنزیہ افسانہ

اُمیدوار

از

جناب پروفیسر ست پرکاش سنگر ایم اے

کالج کالونی۔ بھوپال

خوش تر بھائی!

سالنامے کے لئے ایک تازہ تخلیق ارسالِ خدمت ہے۔ جس کے پسند ہونے کی میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ یوں بھی عام چناؤ نزدیک ہیں اور بے شمار اُمیدوار میدان میں اُترنے اور غریب اور معصوم جنتا کے لئے درد سر بننے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ میں اپنے علاقے کے نمائندہ شری دین دیال بھکڑ کی وکالت کا محض اس لئے دم بھر رہا ہوں کہ اُن کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر بھولی بھالی جنتا انھیں ایک بار ٹھوس سیوا کرنے کا موقعہ دے اور کسی غلط قسم کے رہبر کے چنگل میں پھنسنے سے بچ جائے۔

آپ کا

ست پرکاش سنگر

اس بار ہمارے علاقے سے لالہ دین دیال بھکڑ لوک سبھا کے لئے اُمیدوار ہیں۔

لالہ دین دیال نگر کے مشہور سیٹھ لبھو داس کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ بچپن ہی سے اُن کے اندر بڑا بننے کے آثار اور ایک باغی لیڈر کے جملہ اوصاف موجود تھے۔ آپ نے سول نافرمانی کا پہلا سبق گھر ہی پر سیکھا اور کبھی بھی اپنی ماں کا حکم نہیں مانا۔ جب اُن کے پتاجی حکم عدولی پر ڈانٹ پلاتے، آپ گھر سے بھاگ کر رشتہ داروں کے ہاں چھپ جاتے تھے۔ آپ کے دل میں نیتا بننے کی خواہش بچپن ہی سے بدرجۂ اُتم موجود تھی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب وہ اپنے بھائی بہنوں سے لڑ کر چیزیں نہ چھین لیتے ہوں۔ سکول میں جا کر آپ نے لیڈرشپ کی اس تعلیم کو مکمل کیا۔ وہاں اُن کی کوشش و کاوش سے ایک سوسائٹی وجود میں آئی۔ جس کا پہلا اور آخری صدر بننے کا آپ ہی کو شرف نصیب ہوا۔ اُس سوسائٹی کے کچھ قدیمی اصول یہ تھے۔

۱۔ سکول میں حاضری کا سسٹم بند ہو۔

۲۔ وہاں پڑھائی کے بجائے کھیل کود پر زیادہ زور دیا جائے۔

۳۔ امتحانات یک دم بند کر دیئے جائیں۔

۴۔ سکول میں لڑکوں کے لئے مٹھائی کا بندوبست ہو۔

اب ظاہر ہے کہ انگریزی زمانے کے غلام ہیڈ ماسٹر ایسی جمہوری مانگوں کو کب ماننے والے تھے لیکن ٹلنے والے دین دیال بھی نہ تھے۔ اپنے جائز حقوق منوانے کے لئے آپ نے ہیڈ ماسٹر کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ سکول کے زیادہ تر لڑکوں نے اس دیش بھگتی کے کام میں آپ کا ساتھ دیا۔ چند غدار قسم کے لڑکے چوری چھپے سکول جاتے رہے۔ لیکن جب دیش بھگتوں نے اُن کی مرمت کر ڈالی تو ہیڈ ماسٹر کو مداخلت کرنی پڑی۔ اور اُنھوں نے سزا دینے کی دھمکی دی۔ لیکن دین دیال محض تصویری پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ہیڈ ماسٹر کی اس دھمکی کو اُن ہی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے، اُسے عملی جامہ پہنا دیا۔ اُن کی قیادت میں لڑکوں نے ہیڈ ماسٹر پر حملہ کر دیا۔ پہلے تو اُن کی خوب دُرگت بنائی لڑکوں کے جائز اور جمہوری حقوق کو ٹھکرانے کی پاداش میں اُن کے کپڑے اُتار کر اُنھیں بالکل

ٹکا کر دیا گیا۔ اور ایک ہاتھی پر باندھ کر شہر میں اُن کا جلوس نکالا گیا۔ انگریزی حکومت بھلا اپنے کسی ملازم کی ایسی توہین کب گوارا کر سکتی تھی۔ دین دیال اور اُن کے چند ساتھیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے۔

دین دیال کی زندگی میں اب وہ وقت آ گیا جب اُنھوں نے اپنی قابلیت کے جوہر نمایاں طور پر دکھلائے۔ انگریزی سامراج وادیوں کے ہتھکنڈوں سے بچنے اور اُن کی چال کو ناکام بنانے کے لئے وہ انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ بھیس بدل کر دوستوں اور رشتہ داروں کے گھر میں بیٹھے رہے۔ انگریزی امپریلزم کے خلاف اِس گوریلا جنگ کو جاری رکھتے، اگر والدِ محترم نے پولیس کے افسران کو خوش کر کے سمجھوتہ نہ کر لیا ہوتا۔

اب لالہ جی کے سامنے کیریر کے انتخاب کا سوال تھا۔ دیش بھگتی کے جذبے سے متاثر ہو کر اُنھوں نے جرنلزم کے مقدس پیشے کو مشرکت بنانے کا فیصلہ کیا۔ جرنلزم سے آپ کے تعلقات کا آغاز اُس وقت ہوا جب آپ نے شہر کے مشہور ہفت روزہ گالی" کو اپنی خدمات بطور ہاکر پیش کیں۔ یہ اُن ہی کے دم قدم کی بدولت ہوا کہ ہاکر جیسا معمولی پیشہ بھی باعزت گردانا جانے لگا۔ ہاکر یونین کو جنم دے کر صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جس وقت گلی کے نکڑ اور بازار میں کھڑے ہو کر وہ بلند آواز سے چلا چلا کر مقامی افسران کے خلاف لکھی ہوئی موٹی سُرخیوں کو پڑھتے، اُس وقت اِس بات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جرنلسٹ کے علاوہ وہ ایک کامیاب مقرر بھی بن سکتے ہیں۔

والدِ محترم کی اچانک موت کا لالہ جی کو زبردست صدمہ پہنچا۔ اور اُن کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اِس غم کو بھلانے کے لئے دوستوں کے اصرار پر آپ نے ایک شاندار پارٹی دی۔ بعد میں اِن پارٹیوں کا اکثر اعادہ ہوتا رہا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایسی پارٹیاں اکثر گیلی ہوتیں اور اُن میں نیتا لوگ بھی مدعو ہوتے۔ اُن ہی کے صلاح مشورے سے دین دیال جی نے ایک پریس خرید لیا۔ اور اپنا اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا ابتدائی دشواری صرف یہ تھی کہ پڑھنے لکھنے میں آپ ایک دم کورے تھے۔ یہ کمی پوری کرنے کے لئے ایک اسکول ماسٹر سے آٹھ آنے فی ایڈیٹوریل کے حساب سے معاملہ طے کیا۔ خبریں منیم جی ریڈیو سُن کر لکھ دیتے۔ اُن کے خیال میں آٹھ آنے والا سودا مہنگا تو تھا لیکن قربانی کے بغیر دیش سیوا ممکن بھی تو نہیں۔

اُن دنوں ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ دین دیال جی اُس میں اُصولاً حصہ نہیں لیتے تھے۔ آندولن میں حصہ لینے والوں کو انگریزی سرکار جیل بھیج دیتی تھی لیکن جیل میں سڑنے اور وہاں کی ناکارہ زندگی گزارنے کے بجائے لالہ جی جیل سے باہر رہ کر ملک اور قوم کی خدمت کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ اِن تحریکوں کو وہ ایک دم پسند کرتے تھے۔ اور ایسے وقت حتی الامکان گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالتے تھے۔ ایک بار جب مٹھائی کے لئے دوا لینے گئے تو اُن کی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سامنے سے لوگوں کا ہجوم بھاگا چلا آ رہا ہے، اُن کے پیچھے لال وردی والے لاٹھیاں لئے آ رہے ہیں۔ لال وردی، لاٹھی، جن سے اتنا بچتے تھے، وہ دونوں سامنے تھیں۔ لالہ جی مُڑ کر بھاگنے لگے۔ اگر اُنھیں پہلے خبر ہوتی کہ اِس طرح بھاگنا پڑے گا تو وہ کپڑے کا جوتا پہن کر چلے جاتے۔ وہ تو چپل پہنے تھے۔ بھاگتے بھاگتے وہ پاؤں سے نکل گئی۔ اُنھوں نے اُسے چھوڑنا مناسب نہ سمجھ کر ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ ایک مصیبت ہو تو، اب دھوتی پاؤں میں پھنسی اور اُلجھ کر گر پڑے۔ اُنھوں نے دھوتی کو کھول کر، گول مول کر، بغل میں دبایا اور لگے بھاگنے۔ اُس دن اُنھوں نے اِس بات کا تہیہ کیا کہ چڈی کے بغیر دھوتی کبھی نہ باندھیں گے۔ وہ تو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے اور کُرتہ بھی کافی لمبا ہے۔ اگر کُرتہ چھوٹا اور ململ کا ہوتا اور لوگوں کی نگاہیں اُن کی طرف ہوتیں، تو غضب ہی ہو جاتا۔ آج تو بھگوان نے لاج رکھ لی۔ آج ہی جا کر دو چڈیاں سلواؤں گا۔ لیکن یہ کیا! سامنے سے گھوڑے آ رہے ہیں۔ اُن پر پولیس کے جوان! اُن کے ہاتھ میں ریوالور! ہے بھگوان! یہ کیا؟ لوگ پیچھے مُڑے۔ ایک اِس زور سے بھاگا کہ دین دیال جی سے ٹکرا کر اُنھیں نیچے گرا دیا۔ دوسرا اُن کے اوپر سے گزر گیا پھر ایک اور۔ اِس کے بعد اُنھیں ہوش نہ رہا۔ جب آنکھ کھلی تو حوالات میں تھے۔ پورے دو ہفتے بعد باہر آئے تو آپ کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ "دیش بھگت" کا ایک خاص نمبر نکلا۔ اِس "دین دیال ہیکڑ" نمبر میں ملک کے بڑے بڑے لیڈروں کے پیغامات اور تصویریں تھیں۔ بیچ میں آرٹ پیپر پر دین دیال جی کی پورے صفحے کی تصویر تھی تاکہ شیشے کے فریم میں جڑوا کر شکر گزار جنتا اُسے اپنے گھروں میں، ہوٹلوں اور دوکانوں پر لٹکا سکے۔ دین دیال جی کی دیش سیوا پر چار صفحات کا ایک آرٹیکل تھا اُن کی زندگی متعلق چند تفاصیل تھیں۔ لیکن یہ بات صرف پولیس ہی کو معلوم تھی کہ جیل سے چھوٹتے وقت لالہ جی نے لکھ کر معافی مانگی تھی۔ اور معافی نامے میں یہ وعدہ کیا تھا کہ کانگرس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے۔ لیکن دین دیال جی اِس سے بھی ایک قدم

آگے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے کانگرس کی طرف جب بھی دیکھا تو بنظرِ عتاب۔ اُنھیں ضبط ہونے سے محض اِسلئے بچا کہ انگریزی زمانے کی غدار پولیس کو ایک بھاری رقم بطور رشوت دینا پڑی۔ اب آپ کا اخبار ہندو سبھا کا پرچہ تھا۔ اور اُس میں کانگرس کے خلاف آرٹیکل چھپتے لیکن جب لگاتار لکھنے کے بعد بھی ہندو سبھا کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ پڑا۔ تو دین دیال جی اپنی پالیسی میں تھوڑی بہت ضروری تبدیلی کیوں نہ کرتے؟ مستقبل کو بھی تو دیکھنا تھا۔ "دیش بھگت" میں کانگرسی نیتاؤں کی تصویریں چھپنے لگیں۔ وزیروں کی افتتاحی تقریروں کے ساتھ اُن کے قصیدے گائے جانے لگے۔ اور جب اِن جاہل فرقہ پرستوں نے لالہ جی کی اِس دانش مندی کو خوشامد سے تعبیر کیا۔ تو "دیش بھگت" نے اُنھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ اور جیسے اُنھیں اِس بدزبانی کی سزا دینے کے لئے لالہ جی نے کھادی پہننا شروع کر دیا۔ جب صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں ایک ہندو سبھائی کے الیکشن کے روشن امکانات نظر آئے تو پارٹی نے اُنھیں کھادی پہننے پر کانگرسیوں کی حمایت کے الزام میں ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا لیکن آپ تو اصول پرستی پر، ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ "دیش بھگت" نے اِن کی اِس قربانی کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ کیا یہ معمولی بات تھی کہ لالہ جی نے حق پرستی کے لئے اسمبلی کی ممبری پر لات مار دی۔ لیکن بُرا ہو اِن ہندو سبھائی لیڈروں کا جنھوں نے بھگتو جی کو ہی لات مار دی۔ اور اُنھیں پارٹی سے نکال دیا۔ اب اُن کے لئے اِس کے سوا کیا چارہ تھا کہ اپنی اور اخبار کی خدمات کانگرس کو مستعار دے دیں اور خود سچے اور مخلص کانگرسی بن جائیں۔ لیکن پھر وہی حق و باطل کی لڑائی۔ اصول پرستی اور موقعہ پرستی کی جنگ۔ آپ نے صرف اپنی آتما کی آواز کو سُنا اور اُسی پر عمل کیا۔ چاہے وہ آواز آپ کو کھائی کی طرف ہی کیوں نہ لے جائے۔ کانگرس کی مسلم پرست نیتی سے بدظن ہو کر لالہ جی نے اُس کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ پھر قربانی دینی پڑی۔ کانگرس نے بھی ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اُنھوں نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور کانگرس کے ٹکٹ کی پروا کئے بغیر گزشتہ چناؤ میں آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے میدان میں کود پڑے۔ "دیش بھگت" کے مطابق آپ نے کانگرس ٹکٹ کو ٹھکرا دیا تھا۔ الیکشن کے زمانے میں آپ کی فراخ دلی قابلِ دید تھی۔ اِن کی فیاضی کو دیکھ کر دشمن بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ اپنے کارکنوں اور ووٹروں کے لئے آپ نے خزانے کے دروازے کھول دیئے۔ دل کھول کر روپیہ بانٹا۔ وہ ضیافتیں دیں کہ یادگار بن گئیں۔ گزشتہ پانچ سال میں قصبے میں اتنی شراب نہ بکی ہوگی جتنی ایک ماہ میں دعوتوں میں اُڑ گئی۔ بکرے اِتنے کٹے کہ اُن کی تعداد کم پڑنے پر باہر سے منگوائے گئے اور قربانی کی یہ انتہا کہ لالہ جی نے دوسروں کے سامنے شراب کو جیتے جی گوشت کو ہاتھ لگایا۔ ایسا ہی اصول پرست اور ایثار پیشہ تو اسمبلی میں جنتا کی سچی سیوا کر سکتا ہے لیکن مناسب تعلیم کی کمی کے باعث جنتا کھرے اور کھوٹے میں پرکھ نہ کر سکی۔ دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکی۔ لالہ جی لوگوں کی خدمت کرنے سے پھر محروم رہ گئے۔ دراصل ایک مقامی سب جج نے عین موقعہ پر اُنھیں دھوکہ دے دیا۔ خیر! "دیش بھگت" نے اُس کی خوب خبر لی۔ الیکشن کے بعد کانگرس نے اپنی غلطی کا احساس کیا۔ اور بھگتو جی کو اپنی جماعت کا ممبر بنا لیا۔ لیکن جب اصول پرستی کا سوال آیا آپ کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے جب بھی اسمبلی میں زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف بل پیش ہوئے۔ آپ کے اخبار نے پوری طاقت سے اُن کی مخالفت کی۔ چپراسیوں اور پرائمری سکول ٹیچروں کی تنخواہ بڑھانے کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ مخلوط تعلیم کے تو آپ شروع ہی سے دشمن رہے۔ لوگوں میں سماجی تعلیم کو عام کرنے کی بات اُنھیں کبھی پسند نہیں آئی۔ سرودے جیسی ترقی پسند تحریکوں کا آپ نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ جب ونوبا بھاوے بھودان آندولن کے سلسلے میں شہر میں تشریف لائے تو آپ شہر سے دس میل دُور اُن کے سواگت کے لئے گئے۔ وہاں سے کار واپس بھیج کر اُن کے ساتھ شہر تک پیدل واپس آنے کی تکلیف گوارا کی۔ پبلک میٹنگ میں بھودان کی جگہ، سمے دان دینے کا اعلان کیا۔ اور آئندہ الیکشن کے بعد جیون دان، ویسے تو زندگی کے آغاز ہی سے لالہ جی اِن سنہرے اصولوں پر کاربند تھے۔ اُن کا سارا سمے اخبار میں، اور سارا جیون جنتا کی سیوا میں صرف ہوتا تھا۔ "میں آپ سے پُوچھتا ہوں کہ کیا سمے دان اور جیون دان سے بڑھ کر بھی کوئی بڑا دان ہے؟" اُنھوں نے اُسی میٹنگ میں پُوچھا۔ جیون دان اور سمے دان سے بڑا کوئی اور دان نہیں ہے۔ لوگوں نے خاموش رہ کر اِس بات کی تائید کی تھی۔ میٹنگ کے بعد اِسی اصول کی پابندی کرتے ہوئے آپ ونوبا بھاوے کے ساتھ شہر سے دس میل باہر تک پیدل گئے۔ اُنھیں واپس لانے کے لئے اُن کا ڈرائیور خواہ مخواہ کار لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ ظاہر تھا کہ اُنھیں اُس میں مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ لوگوں میں سے ایک نے آوازہ کسا "سیٹھ جی اب پٹرول دان کر رہے ہیں!" احمق کہیں کا! بغیر سمجھے بُوجھے بات کرنا ہی تو نادانی ہے۔ لیکن وہ کب ایسی بکواس کی پروا کرتے ہیں۔ کانگرس کے سوشلسٹ پیٹرن کے وہ پُورے معتقد ہیں۔ اِس کا اُنھوں نے عملی ثبوت دیا۔ اپنے پانچ نوکروں میں سے تین کو الگ کر دیا۔ ڈرائیور کو اِس لئے برطرف کر دیا کہ وہ برتن مانجھنے اور جھاڑو لگانے سے انکار کرتا تھا۔ اب اُس سے پانچ روپے کم تنخواہ پر ایسے آدمی کو ملازم رکھا ہے جو ڈرائیوری کے

علاوہ گھر کا کام بھی کرتا ہے۔ اور موقعہ بے موقعہ سر کی مالش اور پاؤں دابنے کا کام بھی کرتا ہے۔

دھرم کرم کے سیٹھ جی بہت پابند ہیں۔ مندر جاکر ہنومان جی کی پوجا کرتے ہیں۔ اور چیونٹیوں کے سوراخوں پر تِل اور چاول چھڑکتے ہیں۔ کھانے کے بعد کُتوں کو روٹی ڈالتے ہیں۔ مسلمان کے ہاتھ کا چھوا پانی تک نہیں پیتے۔ بھنگی چماروں کی کیا مجال کہ پاس پھٹک سکیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ جب ان کا کوئی نمائندہ اسمبلی کا ممبر یا وزیر بن جائے تو اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھائیں۔ یہ تو سیاسی بات ہے۔

مخالف پارٹی سے تعلق رکھنے کی بنا پر آپ نے پہلی پنچسالہ یوجنا کے متعلق لٹریچر پڑھنے سے اصولاً پرہیز کیا تھا۔ ہاں دوسری یوجنا کی کاپی ایک ممبر سے آدھی قیمت پر خرید لی ہے۔ آپ نے اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ الیکشن کے لئے ٹکٹ ملنے کے بعد اسے پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ اور ایک آدھ باب ضرور ختم کریں گے۔ کچھ تو پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ کانگرس میں شامل ہو کر سیٹھ جی نے اپنے مشہور اخبار میں اس بات کا کھلم کھلا اعلان کیا کہ فرقہ پرست جماعتوں سے وہ دُور کا واسطہ بھی نہ رکھیں گے۔ لیکن اُن کے سیاسی صلاح کار نے انھیں مشورہ دیا کہ اس اعلان میں نزدیک کا واسطہ رکھنے کی پوری گنجائش ہے۔ اور پریکٹیکل ہونے کے باعث آپ نے اس بات سے پورا اتفاق کیا۔ جن سنگھ اور ہندو سبھا کو خفیہ طور پر چندہ دینا جاری رکھا۔ خیر! یہ تو ہندو جماعتیں تھیں۔ مسلم فرقہ پرست جماعتوں کو بھی چندہ دینے سے گریز نہیں کیا۔ بلکہ موقعہ بے موقعہ اُن کی فرقہ پرست پالیسی کی حمایت کی۔ کئی ایسے نازک دَور آئے جب ہندو سبھا عوام میں بے حد پاپولر ہو گئی۔ اب اگر ایسے موقعوں پر آپ کا اخبار، پاپولر رائے کا ساتھ نہ دیتا تو یہ دیش کے ساتھ غداری کے سوا اور کیا تھا۔ اگر عوام نے اُن کی اس دو رُخی یا سہ رُخی پالیسی پر آوازے کسے تو سیٹھ جی نے اُن کی کب پروا کی، وہ ان جاہلوں سے زیادہ سمجھدار تھے۔ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ اگر کانگرس کا ٹکٹ نہ ملا، ہندو سبھا تو ہے ہی اور اگر آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے لڑنا پڑا تو مسلم ووٹوں کو ہاتھ میں رکھنا کتنا ضروری ہے۔

اپنی شادی تو انھوں نے شہر کے کپڑے کے مشہور بیوپاری اور سائنٹفک بلیک کے موجد رائے صاحب مُرلی دھر کی لڑکی سے کی تھی۔ اپنے بڑے لڑکے کے لئے کپڑا مِل کے منیجر کی لڑکی کو قبول کیا۔ اور پچاس ہزار سے زیادہ جہیز نہ لے کر ایک بار پھر اپنی اصول پرستی کا ثبوت دیا۔

دین دیال جی کے دوسرے سُپتر کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ بی۔ اے میں لگاتار فیل ہونے کی وجہ سے آپ نے انھیں کالج سے ہٹا لیا۔ دینو جی نے جگت میں موجودہ طریقۂ تعلیم پر ایک سخت آرٹیکل لکھا۔ اور پریم دیال کے فیل ہونے کا سبب پرنسپل کی ذاتی دشمنی پر محمول کیا۔

اگرچہ پریم دیال نے کالج کے خلاف سٹرائک آرگنائز کرائی تھی جو کوئی سامنے جمہوری کام کیا تھا۔ اب انھوں نے پریم دیال کے لئے کتابوں کی دکان کھول دی ہے جس میں صرف کمیونسٹ لٹریچر فروخت ہوتا ہے۔ پریم دیال کھلا پاجامہ اور کھلا کُرتا پہنتا ہے۔ کھادی کوئی خاص شرط نہیں۔ صرف فیشن کے لئے وہ چشمہ لگاتا ہے اور بائیں طرف کے عینک کے شیشے پر بالوں کا ایک گچھا ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ سکول اور کالج کے لڑکوں کو آرگنائز کر کے سٹرائک کرانا، قومی لیڈروں کی بے عزتی کرنا۔ اور دیواروں پر پوسٹر لگانا اس کے خاص مشاغل ہیں۔ قوم کی اور پارٹی کی ایسی خدمات کے لئے اسے کافی کی ضرورت پڑتی ہے۔ سیٹھ جی اپنے اخبار کے کالم کبھی کبھی پریم دیال کو پارٹی پراپیگنڈہ کے لئے مفت میں دے دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وقت آنے پر وہ سُود سمیت سُود وصول کر لیں گے۔

سوشلسٹ پارٹی کو لالہ دین دیال جی اس لئے پسند نہیں کرتے کہ کانگرس نے سوشلسٹ پیٹرن کو قبول کر لیا ہے۔ ہاں اگر مقامی سوشلسٹ لیڈروں نے اپنے آپ کو سمجھدار ثابت کر دیا تو وہ اپنی پالیسی میں خاطر خواہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ لیکن قوی اُمید ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کو بھگوان روشنی عطا کرے گا تاکہ وہ لالہ دین دیال جی جیسے کو ٹکٹ عنایت کر کے انھیں دیش سیوا کا موقعہ دے۔ ویسے تو اُن کی نذریں خدمات ہی ٹکٹ کے لئے کافی ہیں۔ اُن کا اخبار جنتا کا اپنا پرچہ ہے۔ اب تو آپ نے ایک سو روپیہ فی ایڈیٹوریل کے حساب سے ایک کالج کے پروفیسر سے طے کر لیا ہے۔ آپ شُدھ کھادی پہنتے ہیں۔ سیاسی جلسوں میں باقاعدہ شرکت کرتے ہیں۔ گاندھی جینتی پر برت رکھتے ہیں کبھی کبھی اپنی تیس ہزار میں خریدی ہوئی نئی کار میں بیٹھ کر مزدور سبھا میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کے سیلاب فنڈ میں چندہ دیتے ہیں۔ اودگھاٹن کی تقریبوں میں حصہ لیتے ہیں۔ آپ کا سابقہ ریکارڈ کتنا شاندار ہے۔ جیل، کھادی، بھاشن، غرضکہ تمام ضروری شرائط پوری کر چکے ہیں۔ پھر آپ کی زندگی پبلک سیوا کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ اگر ٹکٹ مل گیا تو آپ کا جیت جانا تو سو فیصدی یقینی ہے۔ آپ ایک آدھ دوسرے اُمیدوار کی بھی مدد کر سکتے ہیں اور آپ پارٹی کو نہ صرف روپے سے بلکہ جیبوں سے بھی نواز سکتے ہیں اور لوک سبھا میں جا کر فرض شناسی کا جو ثبوت دیں گے۔ جس طریقے سے آپ اپنے حلقے کی نمائندگی کریں گے اُس کی مثال پارلیمنٹری ہسٹری میں نہ ملی ہے۔ نہ ملے گی ——!!

سے ٹوٹتا ہوا گلاب ستارا ہے یہ گلاب مرجھا کیوں گیا ہے ؟ تمھارے اندر سے زندگی کا رس کون نچوڑ رہا ہے عصمت! کون ہے جس نے میری سوہنی کی تصویر کے رنگ دھو ڈالے ہیں صرف آخری بار مجھے اتنا اور لکھ دو۔ پھر میں تمھیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

سب سے پہلے میں آپ کو یہ خوشخبری سُنا دوں کہ آج پھر جیت گئے اور میں ہار گئی ہوں۔ جو ارادہ کہ میں نے کیا تھا وہ آپ نے ختم کر ڈالا۔ میں آپ کو دل کی گہرائیوں کیساتھ چاہتی ہوں لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ محبت نہ کروں۔ میں ڈرتی ہوں یہ سوچ کر کہ میں نے آپ کو یہ احساس ہی کیوں دیا۔ میں آپ کو کیوں نظر آئی۔ میں آپ کی گنہگار ہوں۔ اور معافی چاہتی ہوں۔

میں نے اب تک کوشش کی کہ اپنے سر بے وفائی کا الزام لے کر یہ کہانی ختم کر دوں۔ لیکن جب آپ کسی طرح نہیں مانتے تو پھر پورے یقین کے ساتھ وہی بات دہرانا چاہتی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی مجھے بے معنی سمجھ کر بھولنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح مجھے سکون مل جائے گا کہ میں نے اپنے محبوب کو بچالیا۔

میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ فطرت نے مجھے غم کا مریض بنایا ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق میں اچھی ہوں لیکن اپنے یقین کے مطابق میں زندگی کے مختصر ترین راستے پہ چل رہی ہوں۔ کیونکہ غمِ ہستی کا علاج موت کے سوا کون کر سکتا ہے؟ اس گلاب کی ساری سُرخی تو اُس نے چھین ہی لی ہے۔ اب آپ کسی دن سُن لیں گے کہ اُسے خاک میں بھی ملا دیا۔

خدا کے لئے اس کہانی کو یہیں ختم کر دیجئے۔ میرے لئے محبت کی معراج یہی ہے۔ شاید خدا کے حضور میں شرمساری سے اِسی طرح بچ سکوں کہ میں نے ایک انسان کو بچالیا۔

آپ کی عصمت

میری عصمت!

تمھارا خط پانے کے بعد میں شام سے اب تک یوں ہی بیٹھا رہا ہوں۔ رات جانے کیسے چُپکے سے گزر گئی۔ شاید نیند نے اپنے مخملیں قدموں میں میری پلکوں کو چُھپتے محسوس کیا ہوگا۔ جب ہی وہ ایک بار جانے کے بعد پھر تمام رات نہیں آئی۔ اس طرح میں نے رات کے ہر لمحے کو تمھارے لئے سوچنے پہ وقف کر دیا تھا۔ اب آبادی سے دُور گیدڑوں کی ہُوہُو کی آوازیں کم ہو گئی ہیں۔ اور قریب کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگی ہیں وہاں بُتوں کو جگایا جا رہا ہے۔ میں بھی اپنے بُتِ نامہرباں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہوں تم نے شاید مجھے نہیں سمجھا۔ میں تمھارے غمِ ہستی سے گھبرا کے یہ کہانی یہیں ختم کر دوں۔ ایسے میرا دل کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تم محبت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ پھول سے خوشبو جدا کر دی جائے۔ بلبل سے نغمہ سرائی کیسے چھینی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں تمھیں نہیں مرنے دوں گا۔ تم زندہ رہوگی میرے لئے اور اپنے لئے۔ لیکن آج میں تم سے وہ بات کہوں گا جسے اپنے پہلے کسی خط میں نہ کہنے کا وعدہ کر چکا ہوں کہ میرے ساتھ یہاں سے چلی چلو۔ تمھارا غم بے نام، بے معنی نہیں ہے۔ آدمی کی بنائی ہوئی دُنیا میں زندگی کا حُسن نہیں ملتا۔ نہ خوبصورتی ملتی ہے۔ اس کے مصنوعی پن نے ہر انسان کو دُکھی کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ دن اس سے دُور رہو۔ میں تمھیں اپنے گاؤں لے چلوں گا۔ اور وہاں سے دُور کھجوروں کے ہرے بھرے پیڑوں کے نیچے ہم دونوں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہیں گے۔ ذرا سوچو تو جب جھیل کے پانی میں مرغابیاں اپنے پروں کو بھگو کر اُڑا کریں گی۔ جب سُورج طلوع ہوا کرے گا۔ جب سُورج ڈوبے گا۔ جب چاندنی پھیلے گی۔ جب بادل اُمڈیں گے۔ جب تم پرندوں کی چہکار سنوگی۔ جب تم آہو کے بے پروا خرام کو دیکھوگی۔ جب تم سبزے پر شبنم کے موتی دیکھوگی۔ جب تم آبشاروں کے گیت سُنوگی۔ جب تم ایسے سُہانے ماحول میں رہوگی تو کیا تمھارے غم تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔ عصمت! کائنات کا سارا حُسن ہمارے لئے ہے۔ اور اسی میں ہمارے دُکھوں کا مداوا ہے۔ بولو، تیار ہو؟

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

آپ کا خط پڑھنے کے بعد اور پڑھنے سے پہلے بھی میں اتنا تو سمجھتی تھی کہ میرے اِس نامعلوم غم کا علاج اِن دُنیا والوں کے پاس نہیں ہے لیکن میں یہ بھی نہیں مانتی کہ یہاں سے جا کر میں سکون پا سکوں گی۔ آپ جس زندگی کی طرف مجھے لے جانا چاہتے ہیں

۱۰ کے ۱۵
۲۰ کے ۳۰



جی ہاں ــــــ ایسا کسی جادوگر کے کرتب کے بغیر بھی ممکن ہے۔ اگر آپ آج نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹوں میں دس روپے لگائیں تو آپ کو ۱۲ سال کے بعد پندرہ روپے ملیں گے آپ کی رقم محفوظ ہے اور سرکار سود دینے کی ذمہ دار ہے



دو طرفہ فائدہ

آپ کی بچت پانچ سالہ پلان کی مختلف سکیموں کی تکمیل میں استعمال ہوگی جس سے تمام ملک کا معیارِ زندگی بلند ہوگا سود کے علاوہ آپ مجموعی خوشحالی میں شریک ہو کر مددگار ہوتے ہیں . . . . .

نئے بھارت کی تعمیر میں

مزید تفصیل کے لئے نیشنل سیونگز کمشنر شملہ یا اپنے صوبے کے ریجنل نیشنل سیونگز افسر کو لکھئے

غزل

از

جناب نثار اٹاوی ایم اے

وہ جب تک اسیرِ وادیٔ مشکل نہیں ہوتا
مسافر آشنائے عظمتِ منزل نہیں ہوتا

نہ جانے آج کس عالم میں ہوں اے جانِ بیتابی
ترا حسنِ کرم بھی غمگسارِ دل نہیں ہوتا

تغافل کیشیٔ محبوب تو رنگیں بہانہ ہے
وہ اُٹھ جاتا ہے خود جو درخورِ محفل نہیں ہوتا

دلِ خود دار اُس در سے طرب کی بھیک کیا مانگے
جہاں غم بھی عطا حسبِ مذاقِ دل نہیں ہوتا

محبت اے نثار انسانیت کی شرطِ اول ہے
محبت کے بغیر انسان کوئی کامل نہیں ہوتا

غزل

از

جناب منشاء الرحمٰن منشا ایم شبلی

کتنی تاریک رہگزاروں سے
صبح کی منزلوں تک آئے ہیں

غم تو یہ ہے کہ آنکھ والوں نے
روشنی کے فریب کھائے ہیں

جب زمانے نے پھیر لیں نظریں
کس قدر آپ یاد آئے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ اُن کے خانہ خراب
وسعتِ دو جہاں پہ چھائے ہیں

وحشتِ دل کے حوصلے منشا
موسمِ گل میں رنگ لائے ہیں

غزل

از

جناب ایاز صدیقی

غرورِ حسن ہے یا شانِ دلبری کیا ہے؟
حضور کچھ تو کہیں وجہ بے رُخی کیا ہے؟

حیات نام ہے اک شورشِ مسلسل کا
جو شورشوں میں نہ گزرے وہ زندگی کیا ہے؟

کسی کے نقشِ کفِ پا کا فیض ہے ورنہ
میں کیا ہوں اور مرا ذوقِ بندگی کیا ہے؟

کہاں تک اُن کے تغافل کی سختیاں جھیلے
لہو کی بوند ہے دل کی بساط ہی کیا ہے؟

ہم اُن کے در کے گدا ہیں وہ بادشاہِ جہاں
ایاز! اپنی اور اُن کی برابری کیا ہے

قصّہ پانچویں درویش کا

افسانہ

از

جناب پرکاش پنڈت

"فنکار" ۹۳۰، چاندنی چوک دلی ——— ۵ اگست ۱۹۵۶ء

برادرم خوشتر صاحب آداب!

"قصۂ چہار درویش" آپ نے بچپن میں پڑھا ہوگا۔ اب قصۂ پانچویں درویش کا پڑھئے۔ اور دادِ زورِ قلم کی دیجئے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! اُمید ہے کہ آپ حسبِ دستور بطور حسبِ عادت مزے میں ہوں گے۔ اور موجودہ پریشانیوں میں بھی خوشتر ہوں گے!

مخلص

پرکاش پنڈت

پانچواں درویش کہ اب تک مارے نقاہت کے چت لیٹا تھا۔ اوّل دوزانو اور پھر چار زانو ہو بیٹھا۔ اور ایک آہِ جگر سوز کھینچ کے بولا ؎

یہ داستاں سُنانا تو ہے ایک ست سُنو
مرضی تمھاری چاہے سُنو چاہے مت سُنو
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
کس طرح اِس فقیر کی بنتی ہے گت سُنو

اے یاران! یہ عاجز نہ تو بادشاہ زادہ فارس کے ملک کا ہے۔ نہ قبلہ گاہ اِس حقیر کے امیر عجم کے تھے۔ اور راست پوچھو اور راست نہ پوچھو جب بھی یہ کمترین راست سے باز نہ آئے گا۔ کہ فارس، عجم، رُوم، یمن وغیرہم جو ولایتیں مُرشدوں نے گنوائی ہیں وہ فدوی تو فدوی مخدوی کے مُورثِ اعلیٰ نے کبھو نہ دیکھیں نہ سُنیں۔ فدوی کوئی سوداگر بچہ بھی نہیں کہ اوّل زر و جواہر کی ریل پیل ہو۔ اور اب ڈاکے کی مار کھا کے اور عشق میں لُٹ لُٹا کے جنگل میں آ پڑا ہو۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں اور بہت باتیں بنانی فقیر کو خوش نہیں آتی ہیں۔

فقیر روزِ پیدائش سے فقیر ہے۔ فقیر کے ولیٔ نعمت بھی روزِ پیدائش سے فقیر تھے۔ اور یہ فقر و فاقہ روزِ اوّل سے فقیر کے خاندان کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ مُدّعا فقیر کے سخن کا یہ ہے کہ فقیر آپ چاروں فقیروں کے مماثل نہیں۔ گستاخی معاف ہو، آپ صرف نام کے فقیر ہیں اور بندہ نام سے زیادہ دام کا فقیر ہے۔ دام کا فقیر نہ ہوتا تو بلخ بخارے کو ہیچ گردانتا۔ اور کہیں بھی چار اینٹ کا چوبارہ کھڑا کر کے بندگی اپنے معبود کی بجا لاتا کہ حاجت اِس حقیر و ذلیل کو تخت و تاج کی تھی نہ منصب و معراج کی۔ دو ٹکڑے صبح، دو شام درکار تھے۔ کہ قبلہ و کعبہ کی زندگی میں تو کسی طور نصیب ہوتے رہے۔ پر اُدھر اُن کا وصال ہوا اِدھر قرض خواہوں نے ڈیوڑھی پکڑی اپنا بیگانہ اِس یتیم کا کوئی نہ تھا کہ آڑے آتا۔ کوٹھے میں نقد و جنس نہ تھی کہ قرض خواہ تسلّی پکڑتے۔ مارے رنج کے بُرا حال تھا۔ اور بھوک نقصان تن بدن کا کر رہی تھی۔ بہت سوچا، بہت غم کھایا۔ کوئی حیلہ پلّے نہ پڑا۔ آخرش جوانمردی نے ایک شب کو کہ آدھی اِدھر تھی آدھی اُدھر۔ رختِ سفر یعنی یہ گودڑ باندھا اور خدا پہ توکّل کر کے پا پیادہ بدعمر کو رُخ ہوا چل نکلا۔ چند سے تغافل اور ہوتا تو پٹ کے نکلتا۔ جانے کے دن اور کے راتیں منزلیں ماراکیں۔ پاؤں سُورج کے پھوڑا ہو گئے۔ خاک صحراؤں کی چھان کے حلق پڑ گیا۔ کبھو کوئی جھڑ بیری مل گئی تو بیر کھا کے جُگالی کر لی۔ ورنہ نہار مُنہ لمبی تان دی

سفر سے اور سفر کی صعوبتوں سے فقیر نہ گھبراتا۔ پر بزرگ بول گئے ہیں آدم آرام کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عاجز بھی بہت جلد آدم کی صورت کو ترس گیا۔ جان جسم مارے ناطاقتی کے ایک تھے۔ پر وہ منزل کی ایک منزل، پھر تین منزل کی ایک منزل اور پھر نہ جانے کتنی منزل کی ایک منزل کرنے لگا۔ بارے آبادی کے آثار دکھائی دیئے اور یہ عاجز خدا کی درگاہ میں سجدۂ شکر بجا لایا۔

جب نزدیک اُس شہر کی فصیل کے پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ پر یارو کیسی فصیل اور کیسی رات۔ دروازہ اس شہر کا چوپٹ کھلا تھا۔ نہ کوئی دربان نہ نگہبان۔ اور رات تھی کہ دنوں کے اُجالے کو مات دیتی تھی۔ جا بجا تارے سے ٹنگے تھے کہ اصل تارے کیا کھا کے روشن ہوں گے۔ عقل بڑی چکرائی کہ الٰہی ایسا طلسماتی شہر تو کبھو دیکھا نہ کسو سے سُنا۔ اور عقل اور بھی چکرائی جب نفوسِ شہر کو بڑی بے رُخی کے ساتھ بغل سے نکلتے دیکھا۔ اوّل اوّل جو ہم نفس بغل سے نکلا وہ ایک مردِ بے ریش تھا کہ عبا و قبا کے بجائے نامانوس جامہ زیبِ تن کئے دو پہیوں کی ایک عجیب سی کل پہ بیٹھا آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح نکل گیا۔ اور نظر اِس کمترین پہ نہ ڈالی۔ نظر اِس کمترین پہ اُس مردِ خدا نے بھی نہ ڈالی جو مردِ بے ریش نہیں تھا جس کے بدن پر عبا و قبا بھی تھے اور سر پہ عمامہ بھی۔ اور جو فقیر کی طرح پا پیادہ تھا ایک نہیں، دو نہیں، سینکڑوں نفوس آئے اور اندھا دھند نکل گئے۔ کیا مجال جو کسو نے جھوٹوں شفقت کی ہو اور مہمان داری کے ناتے ہی پوچھ لیا ہو کہ بول تیرے مُنہ میں کے دانت ہیں؟

اوّل خیال کیا کہ منہ اُٹھا کے داخل شہر میں ہو جاؤں۔ اور واسطہ مہمان داری کا در در کے انتظام خورد و نوش اور ٹھکانے کا کروں۔ پر پھر غلبہ دل پہ خوف نے کیا کہ ان دیکھے شہر میں رات کو جانا خوب نہیں۔ یہ بات دل میں مقرر کر کے پتھر پیٹ پہ باندھا اور سونا فصیل کے سائے تلے مناسب جانا۔ کہ جب مُرغ بولے گا رُخ اندر کا کروں گا۔ پر یارو سوچنے اور کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا وہ ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ خدا کو منظور اِس بندے کا بے آب و دانہ پڑا رہنا نہ تھا۔ واللہ اعلم کیا منظور تھا کہ کہیں سے ایک مردِ تنومند رُو نما ہوا۔ ہاتھ میں اُس کے عصائے نصف تھا۔ اور کمر نہ معلوم کس بات پہ کس کے باندھ رکھی تھی۔ کھانس کے، کھنکار کے اور غور سے میرے تئیں دیکھ کے بولا۔

”اے مردِ مشٹنڈے تو کون ہے، اور کیوں ہے؟“

کون ہے کے جواب میں تو اِس عاجز نے اپنا ماجرا بے کم و کاست کہہ سُنایا۔ آخر میں کا جبر بھی باندھی پر کیوں ہے کا جواب اس کم عقل سے نہ بن پڑا۔ تب یہ اُس مردِ تنومند نے اپنے عصائے نصف سے کمترین کی پسلی میں دو تین ٹہوکے دیئے اور بولا ”بالکا تجھ پہ ترس کھانے والا ہوں اِس لئے فقیر جان کے چھوڑے دیتا ہوں۔ ورنہ کوڑے لگاتا اور ساری چھال اُتروا تا!“

یہ بول کے اُس جوانمرد نے شہر کی طرف اشارت کی کہ جا اب چلتا نظر آ۔ فقیر بموافق حکم اُس جوانمرد کے چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ عاشق ہوتے ہوتے بچا۔ ایک معشوقِ خوبصورت کامنی سی مُورت کہ نظر اُس کے جمال پہ ٹکی تھی۔ اور دیکھے سے ہوش جانے اور دل سنسانے لگتا تھا، فقیر کا راستہ کاٹ گئی۔ اللہ بڑا کارساز ہے یارو! وگرنہ نظر اُس کے جمال پہ ٹک جاتی تو فقیر اب تک وہیں پڑا ہوتا۔ اپنے تئیں بہ زور سمجھایا کہ دیارِ غیر میں یک جست اور وہ بھی خالی پیٹ عاشق ہونا خوب نہیں۔ کہ کوئی نام لیوا ہے نہ پانی دیوا۔ عشق کھا گیا تو کوئی لحظہ تک نہ سُونگھنے آئے گا۔

سڑک کہ جس پہ فقیر چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا بڑی پختہ اور صاف ایسی کہ کہیں تنکا تک پڑا دکھائی نہ دیتا تھا۔ مرد و زن کا سیلاب تھا کہ زرق برق لباس پہنے اپنی دُھن میں دوڑے چلا جاتا تھا۔ بیل گاڑیاں تھیں کہ بیلوں گھوڑوں کے بغیر سرپٹ تھیں۔ وہ وہ فلک بوس عمارتیں اور شور اِس زوروں کا کہ قیامت میں کیا برپا ہو گا۔ دل یہ دیکھ کے بڑا کبیدہ ہوا اور سوچ آئندہ کی ستانے لگی۔ کہ اِس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنے گا۔ اِسی دلگیری میں بڑھا چلا جاتا تھا کہ مقابل ایک مسجد کے پہنچ گیا۔ گنبد جس کے آسمانوں کی خبر لاتے تھے اور ڈیل بے نظیر ہونے پہ دلیل کرتا تھا۔ مسجد کو دیکھ کے یادِ خدا کی آئی۔ سوچا دو رکعت نفل پڑھ کے وہیں چٹائی پر پڑ رہوں گا۔ اور صبح بمقدور اپنے کچھ تلاش کام کی اور کچھ سبیل طعام کی کروں گا۔ کہ کان میں کٹورا بجنے کی آواز آئی۔ دیکھا کئی مردِ خدا مشکیں کندھے سے لٹکائے کٹورے بجا بجا کے اور راہ گیروں کو روک روک کے پانی پلا رہے ہیں اور ثواب کما رہے ہیں۔ دیکھ کے زبان مارے پیاس کے چٹخنے لگی۔ اور بھوک بھی عود کر آئی۔ بڑھ کے ایک پیالہ آب کی فرمائش ایک مشک بردار سے کی۔ آب کیا تھا، شہد ناب تھا خوب سیر ہو کے پیا۔ وہ مردِ دریا دل بھی تابڑ توڑ بھر بھر کے دیتا رہا۔ جب پیٹ میں مزید گنجائش پانی کی نہ رہی اور حلق تک آیا تو فقیر دعا دے کے آگے بڑھا۔ پر نہیں، فقیر آگے نہیں بڑھا۔ اُس مردِ دریا دل نے فقیر کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ کٹورا بجا کے اور گدّی میں ہاتھ دے کے بولا ”نکال چہرہ شاہی!“

فقیر بہت حیران اور خاطر پریشان ہوا کہ یہ کیا شہر کا مقام ہے۔ پانی کی قیمت وصول کرنا ہر مذہب میں حرام ہے۔ فقیر کا یہ وعظ سُن کے ایک ہجوم در آیا کہ پہلے سے آمادہ نظر آتا تھا اور لعن طعن اُس مشک بار کے بجائے فقیر پر کرنے لگا۔ کہ کدھر سے فصیل توڑ کے گھس آئے ہو۔ یہ پائے تخت اِس ملک کا ہے۔ یہاں پانی تو پانی بات تک بے دام نہیں ہوتی۔ یہ سُن کے فقیر سخت شرمندہ ہوا اور نالہ و زاری اپنی کس مپرسی کی کرنے لگا کہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی کہ پانی پی گیا۔

میرا یہ بول سُن کے ہجوم نے پہلے بغلیں جھانکیں پھر بغلیں بجانے کا عمل کیا۔ یہ عمل نہ جانے کب تک جاری رہتا۔ اور فقیر کس کردار کو پہنچتا کہ ایک مرد بزرگ کہ حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی مشکل کشائی کو اُترا۔ اپنے کیسے سے ایک عدد کلدار نکال کے اس مشک بار کو تھما دیا۔ اور مجھ کو پکڑ کے ہجوم سے نکال کے اپنی دوکان پہ لے گیا کہ کباڑ کی تھی۔

دوکان پہ لے جا کے اُس مرد بزرگ نے گرم گرم قہوے سے تواضع میری کی اور بملائمت بولا۔

"اے فرزند! یہ تُو نے کیا حماقت کی کہ اپنے پاؤں سے گور میں آیا۔ کب کوئی شخص اِس شہر میں بے دام کے آتا ہے؟"

کمترین نے ایک آہ نامرادی کی مار کے قصہ بے کسی اور مفلسی کا اپنا بیان کیا کہ چاروں کھونٹ میں سوائے مولا کی ذات کے اِس یتیم کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ وہاں بھی زندہ در گور تھا۔ یہاں بھی زندہ در گور ہوں۔ اتنی عنایت کی ہے، اتنی اور کیجئے کہ کسو لائق ہو جاؤں اور دو ٹکڑے حق حلال کے کما کے کھاؤں۔ اور گُن آپ کے گاؤں۔"

یہ لیاقت کا جواب میرا سُن کے اُس مردِ خردمند نے تبسم کیا اور بولا۔

"فن سوداگری کا جانتے ہو؟"

اس مجبور و معذور نے معذوری ظاہر کی کہ نہیں۔

"کھاتہ روزنامچہ سیکھا ہے؟"

"نہیں"

"کسب سپاہ گری کا تو ضرور ہاتھ میں ہوگا؟"

اس پر فقیر نے ساتھ تفصیل کے شجرہ اپنے خاندان کا گوش گزار کیا کہ آبا و اجداد اس فرزند کے جنگ و جدال سے بڑی نفرت کھاتے تھے۔ اور امن و امان فدوی کی گھٹی میں پڑا ہے۔ گویا کبھی تک نصیب میں نہیں آیا۔

اِس پر وہ مردِ خردمند اپنی نشست سے گز بھر اُچھلا۔ اور مجھ سے لپٹ لپٹ کے بولا۔

"درست! بالکل درست! مجھ کو تیرے جیسے نپٹ مورکھ کی تلاش بہت دن سے تھی۔ آخر آج تُو مل گیا۔"

فدوی نے سرِ تسلیم خم کر کے اور ہاتھ باندھ کے التماس کیا کہ غلام سے جو خدمت حضور کی ہو سکے گی بسر و چشم بجا لائے گا اور بخوبی دیانت داری و ہوشیاری سے انجام دے گا۔

فرمایا کہ تُو ابھی لڑکا ہے۔ اِس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں۔ مبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔

فدوی نے خدا کو حاضر ناظر گردانا کہ ایمان وہی اپنے بندوں کا رکھتا ہے۔

غرض اچھی طرح سے ٹھونک بجا کے جب اُس مردِ خردمند نے مجھے لائق اپنے کام کے جانا تو کمال دریا دلی سے کھانا کھلایا۔ ایک سے ایک مرغن طعام تھا۔ شاہی قورمہ، پسندے بریانی، کباب، شامی بھی اور سیخ کے بھی۔ القصہ وہ سب تھا جو فقیر نے آج تک خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ایسا جھک کے کھایا کہ صبح تک پڑا خراٹے لیا کئے۔ جب آفتاب دو نیزے بلند ہوا تو فقیر کو بڑی شفقت سے خوابِ خرگوش سے جگا کے اور مُنہ ہاتھ دُھلا کے اُس مردِ مہربان نے ایسی زور آور نہاری کھلائی کہ سبحان اللہ! بائیس برس کی سوکھی ہڈیاں تر ہو گئیں۔ ڈکار پہ ڈکار آنے لگی۔ اِس پر وہ مردِ مہربان کہ پہلی گھڑی سے فدوی کو فرزند بول بیٹھا تھا بولا۔

"یہ غذائیں اور میوے خشک و تر بلا ناغہ کھانے کو ملیں گے۔ پان تمباکو اور لوازم دوسرے بھی میسر آئیں گے۔ پر خبردار جو کسو کو کانوں کان خبر ہو کہ تُو کیا کسب کرتا ہے۔ کیوں کرتا ہے اور کس لئے کرتا ہے؟"

فدوی نے ہاتھ چھاتی پہ رکھ کے عہد کیا کہ آزمائش شرط ہے۔ اِس پر اُس مردِ خردمند نے ایک آلہ فولاد کا عاجز کے ہاتھ میں دیا کہ رنچ کہلاتا تھا اور کچھ ٹکڑے عجیب قطع کے کباڑ کے ڈھیر سے اُٹھا کے دکھائے کہ بخوبی غور کرلے۔ اِس رنچ سے ایسی ڈھبریاں اور نٹ تجھے کھڑے موٹروں سے اُتار اُتار کے لانے ہیں۔

اِس بے وقوف کے پلّے اُس مردِ خردمند کی بات نہ پڑی۔ فدوی کا چہرہ

سپاٹ دیکھ کے اُس نے کھول کے سمجھایا اور گُر کام کے بتلائے اور پیشہ ٹھونک کے حق نمک کا ادا کرنے کو کہا۔ فقیر مطابق اُس کے حکم کے کیل کانٹے یعنی اُس آلۂ فولاد سے لیس ہو کے روانہ کام پر ہوا۔ کہ مردِ خردمند کو کام پسند تھا، چام نہیں۔ بے بیل کے چھکڑے وہاں موٹر کہلاتے تھے۔ اور بہ افراط پائے جاتے تھے۔ ایسا بائیں ہاتھ کا کرتب اور کھانے طرح طرح کے۔ اور صحبت اُس مردِ بزرگ کی پا کے گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اِس عاجز کے ہاتھ لگی۔

غایت درجہ خوش و خورسند چلا جا رہا تھا کہ دائیں ہاتھ ایک خوش وضع موٹر آپ ہی آپ آ رُکا۔ اور دعوت اِس کارکُن کو بائیں ہاتھ کا کرتب دکھانے کی دینے لگا فقیر کمر کس کے اور لپک کے نمک حلال اپنے آقا کا کیا چاہتا تھا کہ جیسے ایک دم سناٹا مار گیا۔ ایک زن کہ موٹر سے بھی خوش وضع تھی، موٹر سے نکلی۔ اور جھلک اپنے رُخِ روشن کی دکھا کے اور کوئی کل موٹر کی سیدھی کر کے پھر موٹر میں بیٹھ گئی۔

چندے توقف ہوتا تو آزار فقیر کو زندگی بھر کا دے کے نو دو گیارہ ہو جاتی۔ پر فقیر نے توقف نہ کیا۔ جھپٹ کے سلام اُس گلبدن کو کر کے بولا۔ "بے مہری اِس قدر معشوقوں کو زیب نہیں آتی۔ رُخ اپنا جم کے دکھایئے کہ فقیر کی خاطر جمع ہو۔ اور پھر دہنِ مبارک سے فیصلہ فرمایئے کہ اوّل عاشق ہوؤں یا ڈِھبریاں اور نٹ ڈھیلے کروں؟"

دوستو! اِس کے آگے مت پوچھیئے کہ کیا ہوا؛ زبان اُس کے بیان سے قاصر ہے کہ کس طور اُس کافر ادا نے پٹ موٹر کا کھول کے فقیر کو مقام اپنی بغل میں دیا۔ اور پھر کے اُس اُڑن کھٹولے میں لے اُڑی۔ مارے خوشی کے فقیر اُچھل اُچھل پڑتا تھا اور وہ پری دلاسہ دے دے کے تھامتی تھی کہ بڑی جُستجو کے بعد ہاتھ لگے ہو۔ اب نہیں چھوڑوں گی کب عاشق ایسا میرا اور میرے موٹر کا ہاتھ آتا ہے۔ ہائے ہائے کیا شیریں گفتار اُس پری کی تھی کہ غنچۂ دل کا شگفتہ ہو گیا۔ فوراً پیغام نکاح کا دیا کہ نیک کام میں دیر خوب نہیں۔ اور گزارش قاضیٔ شہر کے پاس چلنے کی کی۔

وہ زنِ مہربان متبسّم ہو کے بولی۔

"خاطر جمع رکھ کہ میں تیرے کہے وہیں چلتی ہوں۔ یہاں قاضی نہیں، کوتوالِ شہر نکاح پڑھاتا ہے۔"

کوتوال شہر جیسا کہ کوتوال شہر ہوتے ہیں بالکل کوتوالِ شہر تھا میری حالت کو دیکھ کر سے جان کے بولا۔ "کچھ کہنا منظور ہو تو کہہ گزر، بعد کو رنج نہ کیجیو!"

فقیر نے برجستہ بیت پڑھی ؎

بشر رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گُل بیکار ہوتا ہے

فقیر کا یہ جواب برجستہ سُن کے کوتوال شہر بہت محظوظ ہوا اور حسب۔ اِس درویش کا قلمبند کر کے بولا۔ "یہ سچ ہے کہ تو موٹروں کی ڈھبریاں اور نٹ نکالنے میں مشّاق ہے؟"

فقیر نے اقرار کیا اور آلہ فولاد کا کہ رینچ کہلاتا تھا بطور سند خدمت میں پیش کیا۔

"یہ سچ ہے،" کوتوال شہر دوبارہ بولا کہ "اب تلک تو سینکڑوں موٹروں کی ڈھبریاں اور نٹ اُتار اُتار کے منڈی میں فروخت کر چکا ہے؟"

درویش نے اقرار نہ کیا۔ کہ سارے ڈیل میں زبان حلال ہے اور دروغ گوئی نزدیک اس درویش کے سخت حرام!

"یہ سچ ہے،" کوتوال شہر نے بالآخر سوال وہ کیا جس کا جواب دینے کو عاجز ترس رہا تھا کہ "تو اِس نازنین پر عاشق ہو گیا ہے؟"

درویش نے بصد عجز و نیاز اقرار کیا کہ جی جان سے عاشق ہوں اور جب تک زمین و آسمان برپا ہیں عاشق رہوں گا!"

"ٹھیک ہے!" کوتوال شہر نکاح پڑھانے کے انداز میں بڑی ملائمت کے ساتھ بولا۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اوّل یہ بتا کہ تیرے چاروں ساتھی یعنی پہلے کے چار درویش مفرور ہو کے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

اِس سوالِ غیر متعلقہ پر اے درویشو! اِس بندۂ بے خطا کی تکرار اُس کوتوال شہر سے ہو گئی۔ وے سمجھے کہ درویش خدانہ کردہ دروغ گوئی برتتا ہے۔ اور درویش کو تم چہار درویشوں کی مطلق خبر نہ تھی کہ عاشق ہو ہو کے اِس باغ و بہار میں چھپے بیٹھے ہو وگرنہ درویش کبھو کوڑے نہ کھاتا۔ قید دو سال کی مشقت کے ساتھ نہ کاٹتا۔ اور ترت گواہ وعدہ معاف بن کے اور نکاح اُس حور سے کر کے ڈھبریاں اور نٹ موٹروں سے اُتارتا۔ اور اپنی عاقبت سنوارتا۔

کتنی کفایت ہے! ایک ہی بار برش کرنے سے

کولگیٹ ڈینٹل کریم

دانتوں میں سڑن اور بدبو پیدا کرنیوالے جراثیم کو ۸۵ فیصدی تک ختم کردیتا ہے!



ہر صبح کولگیٹ سے آپ کی پہلی ہی بار کی برشنگ (برشش) سے دانتوں کی صفائی، بدبو پیدا کرنے والے جراثیم کو ۸۵ فیصدی تک ختم کر دیتی ہے۔ سائنٹفک تجربوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ کولگیٹ ۱۰ میں سے ۷ حالتوں میں سانس کی اس بدبو کو جو منہ میں پیدا ہوتی ہے فوراً ختم کر دیتا ہے!

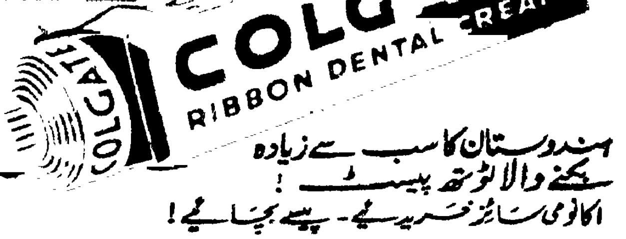


کولگیٹ ڈینٹل کریم سے کی جانے والی ہر برشنگ دانتوں میں سڑن پیدا کرنے والے جراثیم کو ۸۵ فیصدی تک ختم کر دیتی ہے۔ سائنٹفک تجربوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ کھانے کے فوراً بعد برش کر لینے کا کولگیٹ کا اصول دانتوں کے منجن کی پوری تاریخ میں پہلے کے کسی بھی زمانے کے مقابلے میں زیادہ لوگوں کے لئے دانتوں کی سڑن کو زیادہ روکتا ہے!



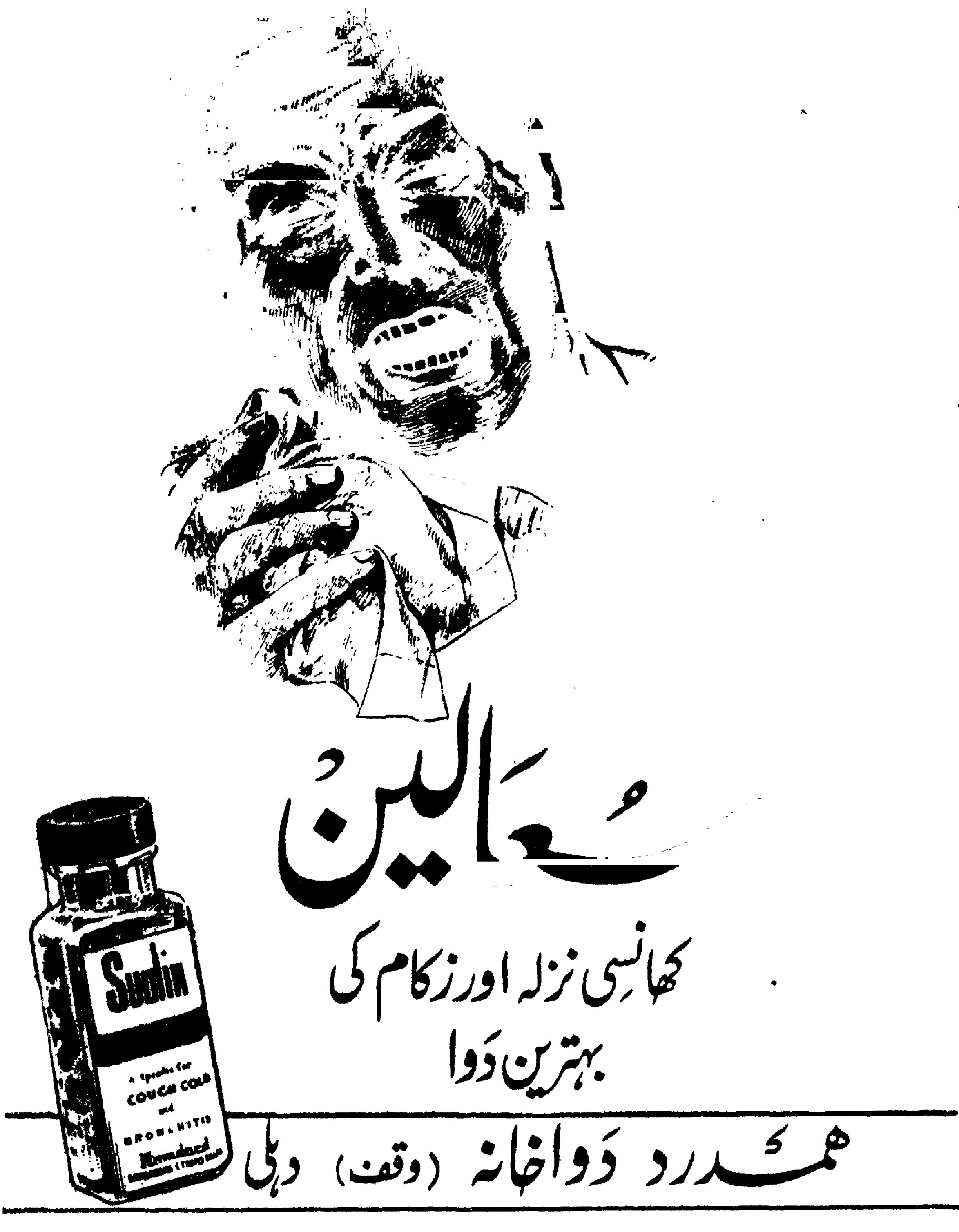
کولگیٹ کی حیرت انگیز فرحت بخش خوشبو سارے ہندوستان میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو یکساں مرغوب ہے۔ اونچے درجے کے ٹوتھ پیسٹوں کے بارے میں ساری قوم کا جائزہ لینے پر ثابت ہوا ہے کہ دوسرے تمام جانچے ہوئے ٹوتھ پیسٹوں کی بہ نسبت کولگیٹ ہی کی خوشبو دینے والی لذت سبھوں کو زیادہ مرغوب ہے۔

صرف کولگیٹ کے اصولوں ہی میں یہ تینوں خوبیاں ہیں!
آپکی سانس کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ
دانتوں کو بھی صاف کرتا ہے
اور انھیں سڑن سے محفوظ رکھتا ہے



ہندوستان کا سب سے زیادہ
بکنے والا ٹوتھ پیسٹ!
اکانومی سائز خریدیے۔ پیسے بچائیے!

DCG/35 R


سعالین
کھانسی نزلہ اور زکام کی
بہترین دوا
Sudin
A Specific for
COUGH COLD
and
BRONCHITIS
Hamdard
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

وہ تو سنیاسیوں اور تارک دُنیا انسانوں کی ہے۔ آپ مجھے ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کے صحراؤں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ اب میرے اندر کوئی تازگی، کوئی اُمنگ نہیں رہی۔ غم پسند طبیعت بھلا کیسے بدلے گی جب کہ اُس نے میرے جسم میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔ میں اپنے آپ کو مٹا چکی ہوں۔ اب جو میں باقی ہوں اُس پر گھر والوں کو اپنی تیمارداری آزمانے دیجئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

آپ کی عصمت

عصمت!

میں نے مان لیا کہ واقعی تم عجیب ہو۔ پگلی میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہم دُنیا کو چھوڑ دیں گے۔ سچ پوچھو تو آجکل ہم نے آدھی دُنیا چھوڑ رکھی ہے۔ کتنے انسان ہیں جو اپنی بنائی ہوئی دُنیا میں سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ بےچین، ناآسودہ اور بےقرار زندگی بسر کرتے ہیں لیکن خدا کی بنائی ہوئی سُہانی دُنیا سے دُور رہتے ہیں۔ جس کا حُسن انھیں تمام آلام سے چھڑا سکتا ہے۔ اور اُن کے دن کے تاروں پر مسرت سے بھر النغمہ گا سکتا ہے۔

تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ آج شام کو مجھ سے ملو۔ اب میں زبانی باتیں کروں گا۔ اگر تم نہیں ملیں تو میں تم سے دُور چلا جاؤں گا۔ پھر تم کبھی مجھے نہ دیکھو گی۔ میرا یہ آخری خط ہے۔

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

میں آج پھر ہار گئی۔ نہ جانے کیوں میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ ملونگی۔

آپ کی عصمت

میری اچھی آپا، آداب

اِتنے عرصے کے بعد آپ میری تحریر دیکھ کر اُچھل پڑیں گی کہ آپ کو کھوئی ہوئی عصمت مل گئی ہیں سمجھتی ہوں کہ میرے اِس طرح چلے آنے کے بعد آپ کے اور امّی اور ابّا کے دل پہ کیا گزری ہوگی اور ہمارے اُن رشتہ داروں نے جو ہمارے دشمن ہیں مجھ پر کتنی بیہودہ تہمت لگائی ہوگی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں ہر طرح خیریت سے ہوں۔ میں شاہد کے ساتھ اِن کے گاؤں چلی آئی ہوں۔ بلکہ گاؤں سے بھی کچھ دُور جہاں ہم رہتے ہیں وہاں اور کوئی آبادی نہیں ہے۔ ہاں ہر طرف بیل گائیوں، خرگوشوں اور پرندوں اور ہرے بھرے درختوں اور جھیل اور آبشاروں کی آبادی ہے۔ مجھے اپنے ان پڑوسیوں سے بےحد محبت ہوگئی ہے۔ میں اِنھیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اِسلئے ہم نے سوچا ہے کہ اب یہیں ایک بنگلہ بنوالیں گے تاکہ یہ ہم سے جدا نہ ہوسکیں۔ آپ مجھے دیکھیں گی تو شاید پہچان بھی نہ پائیں گی کہ یہ وہی دُبلی پتلی زرد رو عصمت ہے۔ جو ہر وقت اُداس رہا کرتی تھی اور پلنگ پہ لیٹی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ یا خلاؤں میں گھنٹوں گھورتی رہتی تھی اور کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ میں خود بھی نہیں سمجھتی کہ اس کی کیا وجہ ہے لیکن اب میں بالکل بدل گئی ہوں۔ اکثر میں چشمے کے پانی میں اپنی صورت دیکھتی ہوں تو حیران رہجاتی ہوں۔ اِتنی سُرخی میرے اندر کس نے بھر دی! میرا دل ہر وقت ہنسنے کو چاہتا ہے بھاگنے دوڑنے کو چاہتا ہے۔ ہرن کی طرح۔ اور میں اکثر سبزے پہ بھاگتی بھی ہوں۔ جب تھک جاتی ہوں تو سستانے کو لیٹ جاتی ہوں۔ اور اس طرح مجھے اتنا سکون ملتا ہے جس کا تصور آپ وہاں کمروں میں بیٹھ کر نہیں کرسکتیں۔ آپ جو زندگی گزارتی ہیں وہ تو بالکل زنداں کی طرح ہے۔ بناوٹی اور تکلیف دہ ہے۔ اچھی زندگی میری آپا یہی ہے جو قدرت کی گود میں گزاری جائے۔ جہاں پہنچکر انسان کے دُکھ درد اُس سے دُور بھاگ جاتے ہیں۔ اور اپنا سایہ بھی نہیں چھوڑتے۔ شاید آپ جانتی ہوں گی شاہد کو میرے کمرے کے سامنے رہتے تھے۔ انھیں نے مجھے یہ نئی زندگی، حسین زندگی دی ہے۔ وہ کتنے اچھے اور پاکیزہ خیالات کے انسان ہیں اسے میں بیان نہیں کرسکتی۔ سچ مچ آپ کو اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اُنھوں نے مجھے زندگی دی ہے۔ ہاں آپ ایک بات پر اُن سے ناراض ہوسکتی ہیں کہ اُنھوں نے اُس عصمت کو کھودیا جو آپ کے سامنے تھی۔ بیمار اور غمزدہ عصمت کو!

امّی اور ابّا کو میرے بارے میں بتا دیجئے۔ وہ اور آپ میری یہ خطا معاف کردیں کہ میں اِس طرح چلی آئی ہوں۔ جب آپ لوگوں کی طرف سے جواب مل جائے گا تب میں آؤں گی۔ ہاں ایک بات آپ کے کان میں کہنا چاہتی ہوں کہ وہاں پہنچنے کے بعد میں اور شاہد ایک ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہمارے دل ایک ہوچکے ہیں۔ لیکن آپ کی دُنیا کا ہم اتنا احترام ضرور کریں گے کہ اُسکے سامنے بھی ایک ہوجائیں۔ آپ جس پتے پر مجھے خط لکھیں گی وہ نیچے درج ہے۔ امّی اور ابّا کو میرا اسلام کہئے۔

آپ کی عصمت

غزل

از

جناب خمار انصاری ایم۔ اے

کچھ غمِ زمانہ ہے کچھ غمِ محبت ہے
اب تو زندگی اپنی غم کی اِک امانت ہے

آدمی میں تھوڑے سے ضبط کی ضرورت ہے
غم بھی وجہِ تسکیں ہے درد میں بھی راحت ہے

دل پہ جو گزرتی ہے وہ کسی کو کیا معلوم
مُسکراتے رہتے ہیں یہ تو اپنی عادت ہے

وقت کٹ ہی جاتا ہے اجتماعِ رنداں میں
دل بہل ہی جاتا ہے میکدہ سلامت ہے

اپنی اپنی تشریحیں اپنے اپنے انداز سے
زندگی ہی دوزخ ہے زندگی ہی جنت ہے

کب نجات ملتی ہے زیست کے اندھیروں سے
چار دن کی ہو پھر بھی چاندنی غنیمت ہے

اُن سے پھر سرِ راہے چار ہو گئیں آنکھیں
کچھ مجھے ندامت ہے کچھ اُنھیں ندامت ہے

غزل

از

جناب برج لال رعنا بگی بی۔ اے

شکست کھا کر بھی میرے دل میں نئے ارادے مچل رہے ہیں
کہ شام کی ظلمتوں کے پردوں سے ماہ و انجم نکل رہے ہیں

شباب آیا ہے جاگ اُٹھیں نئی اُمنگیں نئی ترنگیں
بہار آئی ہے شاخساروں سے پھول پتے نکل رہے ہیں

ہمارے قدموں کے منتظر ہیں نئے مقاصد نئی منازل
مگر ہم آنکھوں کو بند کر کے پُرانی راہوں پہ چل رہے ہیں

پہاڑ سر پر ہزار ٹوٹیں، ہزار نبضِ حیات چھوٹے
مرے ارادے اٹل رہیں گے مرے ارادے اٹل رہے ہیں

غمِ محبت نے زندگی کو بڑا مقدس بنا دیا ہے
یہ داغِ حسرت نہیں ہیں دل میں چراغ کعبے میں جل رہے ہیں

ہوئے سمندر میں غوطہ زن جو وہ کھیلتے ہیں زر و گہر سے
جو صرف کرتے رہے نظارہ وہ دستِ افسوس مل رہے ہیں

اُٹھا رہے ہیں ہزار صدمے مگر جئے جا رہے ہیں رعنا!
سفینے ٹکرا رہے ہیں موجوں سے پھر بھی دریا میں چل رہے ہیں

ترقی کے لئے یوجنا

یہ تاریخی ترقی

دوسرے پلان میں زور فوری صنعتی ترقی پر ہے اور ساتھ ہی ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی توسیع پر تاکہ ضروری خدمات اور مطلوبہ اشیا عوام کو آسانی سے مل سکیں۔ پلان کے دو بڑے نشانے پیداوار اور اس کی تقسیم ہیں۔ اور پلان کی کل رقم کا تقریباً آدھا حصہ ان پر خرچ ہوگا۔

ہر طرف اضافہ

پیداوار میں اضافہ کرنے کیلئے بھاری اور مشینیں تیار کرنے کی صنعتوں کو ترقی دی جائیگی اور ملک کے معدنی ذرائع کا زیادہ اور بہتر استعمال کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے پلان میں ۹۰۰ کروڑ روپے (کل خرچ کا ۱۹ فی صدی) مخصوص کئے گئے ہیں۔ اسمیں گھریلو اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی شامل ہیں۔ دوسرے پلان میں مزید روزگار بہم پہنچانے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس عرصہ میں زراعتی پیشہ کے علاوہ تقریباً ۸۰ لاکھ لوگوں کو روزگار ملنے کی اُمید ہے۔

بہتات کی راہ پر

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء کی تقسیم اور خدمات کا معیار بھی بلند ہوگا چنانچہ ۱۳۸۵ کروڑ روپے یعنی دوسرے پلان کے اخراجات کا ۲۹ فی صدی حصہ ریلوے نئی سڑکوں، مزید بس سروس سیر و سیاحت کی سہولتوں جہاز سازی، ہوائی آمد و رفت، براڈکاسٹنگ اور ڈاک و تار وغیرہ مدوں پر خرچ ہوگا۔

دُوسرا پانچسالہ پلان
قومی خوشحالی کے لئے



افسانہ

بلو سسٹرس

از

جناب اختر عادل رؤپ

ایم۔جی انٹر کالج مارہرہ (ایٹہ) یو۔پی ——— ۱۴ نومبر ۱۹۵۶ء

محترمی! تسلیم

بیسویں صدی کے لئے دو بہنوں کی کہانی بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گی ——— یہ عورت کے ایثار و قربانی کی کہانی ہے۔ جو اُسے مرد سے عظیم اور فرشتوں سے مقدس بنا دیتی ہے۔ بہت دنوں سے میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن پڑھتے رہنے سے یہ اُمنگ پھر جاگ اُٹھی ہے ——— کہانی کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

آپ کا

اختر عادل رؤپ

آپا!

زندگی کا کارواں کتنی تیز رفتاری سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ یہ تم نے زندگی کی راہوں پر اتنی دُور نکل آنے کے بعد کبھی نہ سوچا ہوگا۔ تم نے کبھی مُڑ کے وہ نشاناتِ راہ نہ دیکھے ہوں گے جنھیں ہم دونوں پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ تمھاری یادوں میں کبھی بچپن کی وہ صبحیں نہ آئی ہوں گی جب تم پیار سے مجھے اُٹھایا کرتی تھیں۔ میرا مُنھ دُھلاتی تھیں اور لباس تبدیل کرا کے میرے ماتھے پر کاجل کی ایک ننھی سی بندی لگا دیا کرتی تھیں تاکہ مجھے دوسروں کی نظر نہ لگ جائے۔ اُن دنوں آپا تم کہا کرتی تھیں کہ میں چھوٹی سی گُڑیا کی طرح بھولی بھالی تھی۔ ہر کوئی اس بُری طرح پیار اُتارتا تھا کہ میں گھبرا جایا کرتی تھی یہاں تک کہ جب کوئی بڑا مجھے گود میں اُٹھا کے بھینچ لیتا تو تم فوراً کہہ اُٹھتیں۔

"آپ نے تو سچ مچ سلمیٰ کو گتّا یا ربڑ کی گُڑیا سمجھ رکھا ہے۔ یہ بھی خیال نہیں کہ ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟"

تم نے اپنے بچپن کی ساری گُڑیاں، اُن کے کھلونے، گھروندے اور چینی کا چائے کا سٹ مجھے دے دیا تھا۔ پھر تم کس شوق سے میرے ساتھ کھیلا کرتی تھیں حالانکہ اُن دنوں شاید تمھیں اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اور بقول امّاں کے اب گُڑیوں سے کھیلنے کے تمھارے دن نہ رہے تھے۔ لیکن چاہے میری گُڑیوں کا بیاہ ہوتا، چاہے پکوان ہوتا، چاہے کوئی اور محفل ہوتی تم آگے آگے رہتیں۔ اور امّاں کی جھڑکیاں سُننے کے باوجود تمھارے شوق میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ اس طرح میرے لئے بھی تمھارا وجود اتنا ضروری ہو گیا تھا کہ کسی بھی لمحے تمھیں بھلا نہیں سکتی تھی۔ تمھاری رہنمائی میں یہ پیارے کھیل کھیلتے ہوئے مجھے ایک ٹھنڈے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا ہی سکون جیسا گھاس پر شبنم کے موتیوں کو صبح صبح چھو کر محسوس ہوتا تھا۔ مجھے شبنم ہمیشہ سے پیاری رہی ہے مجھے یاد ہے کہ میں جب ذرا بڑی ہو گئی تھی۔ اور تمھارے ساتھ ساتھ اسکول جانے لگی تھی۔ جب بھی میں بھیگی ہوئی گھاس پر دیر تک لیٹی رہتی تھی۔ جب تمھاری نظر مجھ پر پڑتی اور تم مجھے ایک مفروداوانٹ بتاتیں تو چپکے سے اُٹھ کر کلاس رُوم میں جا چھپتی تھی۔ اسکول کی زندگی میں بھی چند سال میں نے تمھاری رہنمائی میں بہت آرام سے گزارے۔ گھر کا جو کچھ کام مجھے ملتا وہ تم سے کروا لیتی۔ تم مجھے میری بھلائی کے لئے ہی ڈانٹا کرتی تھیں کہ میں خود کوشش کروں ورنہ جاہل کی جاہل رہ جاؤں گی۔ لیکن میری ذرا سی خوشامد پر تمھارا دل پگھل

جاتا تھا اور کہتی تھیں، اچھا خیر آج کے چھوڑ دیتی ہوں۔ آئندہ کبھی نہ کروں گی۔ لیکن تمھارا یہ ارادہ کچے دھاگے کی طرح ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ مجھ پر کسی سسٹر کی ڈانٹ پڑتی یا کسی سہیلی سے جھگڑا ہو جاتا تو بھی میں فریاد لے کر تمھارے پاس آتی۔ اور تم میری بُرائیوں کو اپنی محبت کے ریشمی غلاف میں چھپا لیا کرتی تھیں۔ پھر میرا شعور پختہ ہوا اور وقت کے کارواں نے کچھ اور منزلیں طے کیں۔ تو میرے دل میں تمھاری تقلید کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دراصل جن دنوں میرے دل میں یہ احساس پرورش پا رہا تھا وہ میری زندگی کے خطرناک دن تھے۔ میں اُس وقت یہ کسی طرح نہ سوچ سکتی تھی۔ کہ یہی جذبہ مجھے ایک دن اپنی پیاری آپا کے ساتھ زندگی کے ایک ایسے موڑ پہ لا کھڑا کرے گا جہاں ہم دونوں کا راستہ ایک ہوگا۔ لیکن ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی راہ بدلنا پڑے گی۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمھاری اتھاہ محبت نے تمھیں میرے دل و دماغ پر اس طرح مسلط کر دیا تھا کہ میں بھی وہ کچھ کرنا چاہتی تھی جو تم کرتی تھیں۔ میرے لئے ساری دُنیا کی وسعت سمٹ کر صرف ایک مرکز پر رہ گئی تھی۔ اور وہ مرکز تم تھیں۔ سب سے پہلے میں نے لباس میں تمھاری تقلید شروع کی۔ جس جس رنگ اور جس جس وضع قطع کے کپڑے تمھارے تھے ویسے ہی میں نے اپنے لئے بھی چاہے۔ حالانکہ کئی بار ایسا ہوا کہ تم شاپنگ کے لئے گئیں اور میرے لئے اچھی چیز لے آئیں۔ لیکن میں اُس سے ذرا بھی خوش نہ ہوتی تھی۔ اور جب تک مجھے بھی تمھاری جیسی چیز نہ مل جاتی میرے دل کو قرار نہ آتا۔

اب ہم دونوں اسکول کی زندگی سے نکل کر کالج میں پہنچ چکی تھیں۔ اُن دنوں مجھے بھی تمھاری طرح مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اگر تم کلاسیکل مصنفوں کو سمجھ میں نہیں آتے کہہ کر بالائے طاق رکھ دیتیں تو میرے بھی ہاتھ میں شیکسپیئر، اقبال، عمر خیام کی کوئی کتاب نظر نہ آتی۔ حالانکہ میں چھپ چھپ کے رباعیاتِ عمر خیام کے انگریزی ترجمے کو گھنٹوں پڑھا کرتی تھی۔ اور چغتائی کے بنائے ہوئے غالب کے اشعار کے اسکیچوں میں کتنی راتیں محویت سے تکتے تکتے گزار دیتی تھی۔ لیکن جب کبھی باہر نکلتی تو میرے ہاتھ میں پرل بک، سمرسیٹ ماہم، منٹو یا عصمت کی کوئی کتاب ہوتی۔ مجھے تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ تمھاری ہی وجہ سے میں نے اُن کی عظمت کو سمجھا۔ یہی نہیں، ہمیشہ ایسا بھی ہوتا کہ جو لباس تم نے کالج جانے کے لئے منتخب کیا ہے ویسا ہی میں نے بھی پہنا ہے۔ اگر تمھارے بالوں میں ہیئرپن کے بجائے بیلے کا پھول لگا ہے تو میرے بالوں میں بھی وہی نظر آئے گا۔ مجھے یاد ہے کہ تمھیں نیلے رنگ کی ساری بہت پسند تھی۔ اور تمھارے

سُرخ و سپید رنگ اور دلآویز سراپا پر وہ بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ تم اکثر
تیسرے دن وہی پہنتی تھیں۔ اور تمھاری طرح جب میں بھی وہی پہنتی تو کالج کے لڑکے
کو دُور سے دیکھ کر بلو سسٹرس پکارتے۔ یہ نام ہم دونوں کے لئے اتنا مشہور ہو گیا
لوگ ہمیں ہمارے اصلی ناموں سے بھول کر بھی خطاب نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ
ایک سہیلی نے بلو سسٹرس کا ترجمہ نیلی کنٹھی کی جوڑی کر ڈالا۔ اور اکثر ہم دونوں کو اُن
چھیڑ چھاڑ سے پریشان ہونا پڑتا۔ یہ بات یہاں تک پھیلی کہ بالآخر تم نے نیلی ساڑی
کے لئے بکس میں بند کر دی۔ اور شاید جب سے آج تک اُسے تمھاری رعنائیوں میں
کرنے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔ لیکن میں غلط کہہ گئی۔ یونین کے ایک فنکشن میں تم نے
پہن کر اپنا عہد توڑ ڈالا تھا۔ شاید عزیز کے اصرار سے ۔۔۔۔۔ معاف کرنا آپا! عزیز کا
نوکِ قلم پر آ ہی گیا۔ میں اب تک تمھیں ماضی کی وادیوں میں لئے گھوم رہی تھی۔ اور اُن
باتوں کو تمھارے ذہن میں تازہ کر رہی تھی۔ تم اب تک یہ سمجھتی رہی ہوگی کہ شاید اس
میں عصمت چغتائی بننے کے لئے پہلا قدم اُٹھا رہی ہوں۔ اور یادِ ماضی یا ہمارے
نام کی کوئی کہانی لکھ رہی ہوں۔ لیکن تم نے عزیز کا نام میری زبان سے سُن کر کچھ
محسوس کی ہوگی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، یہ نام تمھارے دل کے نہاں خانے میں
چھپا ہوا ہے۔ اور تم اپنی جگہ بہت مطمئن ہو کہ تمھارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ نام تو ستا
کی کہکشاں میں، کلیوں کے سینوں میں اور بُلبُل کے نغموں میں نہاں تھا۔ میری
پر کیسے آ گیا؟ لیکن آپا! میں نے تمھیں اکثر شفق کے رنگوں میں کچھ تلاش کرتے
ہے۔ سرما کی سرد راتوں میں چاند کو تکتے دیکھا ہے۔ اور اکثر کالج کی لائبریری میں
عزیز کے ساتھ کسی بحث و مباحثے میں مشغول دیکھا ہے۔ یہاں تک بھی کوئی
کہ یکایک تم دونوں بحث ختم کر کے بظاہر کسی ایک فیصلے پر پہنچ کر خاموش ہو جاتے۔
اور پھر ایک دوسرے کی نگاہوں میں کچھ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ وہ کونسے خوابوں کے
تھے؟ کونسی آرزوؤں کے نشیمن تھے۔ وہ کس اُمنگ سے تھرتھراتی ہوئی تمھارے
کی لٹ تھی۔ جسے عزیز سنوار دیا کرتا تھا۔ اور آپا! عزیز کیوں نیلا سوٹ پہن کر آیا کرتا
اُس کے کالر میں بھی بیلے کا پھول نظر آتا تھا۔ وہ جو اکثر کتابوں کو دیکھ کر یہ کہا کرتا تھا
خدا حشر کے دن اُن کے لکھنے والوں سے جواب طلب کرے گا کہ اتنی دقیق اور مشکل
تم نے دُنیا میں میرے بندوں کا دماغ خراب کرنے کے لئے کیوں چھوڑیں؟
پہروں لائبریری میں بیٹھتا تھا۔ اور اُس کی سائیکل کی گنڈی رنگ برنگی کتابوں سے


لیجئے۔ آگیا! نیا
دو ڈھکنا ڈبّہ
اس میں ڈالڈا خالص اور تازہ رہتا ہے
بیرونی ڈھکن
اندرونی بند ڈھکن
• خالص اور تازہ۔
جب بھی خریدیں! کیونکہ اس کا اندرونی ہوا روک ڈھکن ڈالڈا کو، بننے کے وقت سے بالکل محفوظ رکھتا ہے۔
• خالص اور تازہ!
باورچی خانے میں ڈالڈا کو پوری گرفت والا بیرونی ڈھکن مکھی اور مٹی سے بچائے رکھتا ہے۔
• ڈبّہ کھولنے میں اتنے آسان۔
اور استعمال میں بھی!
• اور اتنا کارآمد!
ڈالڈا کے خالی ڈبوں میں آپ گھر کی کئی چیزیں رکھ سکتے ہیں۔
ڈالڈا ½ پونڈ، ۱ پونڈ، *۲ پونڈ، *۵ پونڈ، اور *۱۰ پونڈ کے ڈبوں میں بکتا ہے۔ * دو ڈھکنے ڈبے
ڈالڈا چھاپ وناسپتی
ڈالڈا میرے لئے اچھا ہے۔
HVM. 287-50 UD

نظر آتی تھی . . . .

تم ایسے سوالوں کا جواب نہ دے سکوگی۔ تمھارے چہرے کا رنگ فق ہو جائے گا۔ پسینے چھوٹ جائیں گے۔ اور تم ٹھنڈے پانی کا گلاس طلب کروگی۔ لیکن جب تک کہ ٹھنڈے پانی کا گلاس آئے میں تمھیں یہ اور بتادوں آپا! کہ اِس وقت ہم دونوں زندگی کے ایسے موڑ پر ہیں جہاں ہم دونوں کا راستہ ایک ہے۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں ہم دونوں میں سے کسی ایک کو راہ بدلنی پڑے گی۔ مجھے حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے دل کے صحیفے کا یہ باب تمھارے سامنے کھول دوں . . . .

جس دن عزیز کو تم نے چائے پر بلایا، تم نے لمبے چوڑے الفاظ میں اُس کی تعریفیں کی تھیں۔ تمھاری چند رازدار سہیلیوں کے بیچ میں وہ کیفے کی کرسی پر خاموش مسکین بنا بیٹھا تھا۔ اتفاق سے برابر کے کیبن میں میں بھی موجود تھی۔ میں نے اُسے ایک نظر جھانک کر دیکھا اور کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن اُس کی تعریفیں سُن سُن کر میرے دل میں آپ ہی آپ اُس کے لئے احترام پیدا ہوتا گیا۔ اُس کے بعد ایک دن سر راہے میں نے اُس سے ایک انگریزی نظم کا مطلب پوچھا۔ وہ مجھے الگ لان میں لے گیا۔ اور وہاں سنگِ مرمر کی بنچ پر بیٹھ کر وہ بہت پیارے انداز میں سمجھاتا رہا۔ یہ میری اُس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ بھی بلو سسٹرس کے نام سے خوب واقف تھا، اس کے بعد اکثر موقعوں پر جن کی تفصیل میں یہاں غیر ضروری خیال کرتی ہوں۔ وہ مجھ سے ملتا رہا۔ اور میں یہ جان کر کہ تمھیں بھی اِس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، تم بھی اُسے اچھا سمجھتی ہو۔ کوئی جھجک محسوس نہ کرتی تھی۔

لیکن آپا! مجھے تمھارے دل کی کیا خبر تھی۔ میں نے جہاں تک تمھاری فطرت کا مطالعہ کیا تھا، تمھیں انتہائی غیر رومانی اور اپنے آپ کو ہر وقت لئے دیئے رہنے والی سنجیدہ لڑکی پایا تھا۔ تم اکثر اپنے کلاس کے اچھے لڑکوں سے ملتی رہتی تھیں۔ کالج کے پروفیسروں سے بھی تمھاری راہ و رسم تھی۔ اِس لئے میں کبھی نہ سوچ سکتی تھی کہ عزیز ایک بلند مقام پر ہے۔ اور یہ کہ تم دونوں آسمان کی نیلی وسعتوں میں، خیالوں کے اُفق میں زندگی کی نئی راہیں تلاش کر رہے ہو۔ اور اِس کا پتہ مجھے اُس وقت چلا ہے جب کہ میں خود بھی اپنے دل میں محبت کی ایک شمع روشن کئے بیٹھی ہوں۔ جب کہ کسی جذبے نے میرے سامنے کون و مکاں کی وسعتیں کھول دی ہیں۔ اور زندگی کے آنگن میں لالے کے پھول کھلا دیئے ہیں۔ آپا! اگر تم اب بھی عزیز کو ان راہوں پر اکیلا چھوڑ دو تو وہ میری طرف مُڑ آئے گا۔ اور میری یہ بے چینی، طبیعت کی افسردگی اور ذہنی کشمکش ختم ہو جائے گی . . . . .

اِن دنوں آپا! جب تم میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر میری اُداسی کا سبب پوچھتی ہو، تو سچ کہتی ہوں میں سارے جسم سے کانپ اُٹھتی ہوں۔ یہ خیال کہ میں تمھاری گنہگار ہوں، مجرم ہوں، میرے ذہن پر ہتھوڑے برساتا ہے۔ نہ جانے کتنی راتوں کو جاگ جاگ کر میں نے سوچا کہ میں اپنے آپ کو کچل دوں۔ لیکن میرے اندر جو عورت ہے وہ بہت ظالم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرتی اور تمھاری اِس ننھی مُنی گڑیا کو تم سے بغاوت پر اُکساتی رہتی ہے . . . .

آپا! اب میں شبنم کو چھوتی ہوں تو وہ ٹھنڈک اور سکون نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آگ بن کر دہکنے لگی ہے۔ کالج کی حدود میں کھڑے ہوئے یوکلپٹس کے لمبے درخت مجھے ڈراتے ہیں اور چغتائی کی تصویریں میرے دل کو زخمی کئے ڈالتی ہیں۔ وہ سکون سمندر کی گہرائیوں میں مل سکتا ہے نہ بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں نہ چاند کی کرنوں میں، نہ کنول کے سفید پھولوں میں۔ میں کیا کروں آپا؟ . . . . کچھ تم ہی بتاؤ مجھے . . . .

سلمیٰ!

کل شام جب میں کالج سے لوٹی تو تمھاری پیاری تحریر میز پر رکھی ملی۔ سچ سچ میں اُس وقت اِتنی تھکی ہوئی تھی کہ کچھ بھی پڑھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن "آپا" کا لفظ دیکھ کر میں پڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ تم نے جس انداز میں مجھے مخاطب کیا ہے، اِس ایک ہی لفظ سے تمھاری محبت کی ساری تصویریں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔ مجھے بچپن کی وہ گڑیا بھی یاد آ گئی جس سے محبت کرنے کے سوا میں اُس وقت کچھ نہ جانتی تھی۔ مجھے اسکول میں پڑھنے والی وہ الھڑ شریر بہن بھی یاد آئی۔ جس کی وجہ سے مجھے مسٹریس کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ اور وہ سلمیٰ بھی معاً آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو بالکل میرا ہی دوسرا رُوپ ہے۔ میں آج تک یہ سمجھتی رہی ہوں کہ ہم دونوں کی ایک ہی رُوح ہے۔ ایک ہی خمیر سے ہمارے جسم بنائے گئے ہیں اور ایک ہی فطرت ہمیں ودیعت کی گئی ہے۔ میں اِس وقت عزیز کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ محبت ایک بلند درجہ ہے جو انسانیت کے خزانے سے کچھ ہی لوگوں کو ملتا ہے۔ میرے لئے

اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی کہ میری ننھی منی بہن بھی اپنے دل میں اتنی وسعت رکھتی ہے میں اپنے لئے صرف اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کے ہر حصّے میں میں نے تمھیں دل سے نزدیک رکھا ہے۔ تمھارا کوئی کھلونا بچپن میں ٹوٹ جاتا تھا تو مجھے بے حد دُکھ پہنچتا تھا۔ اب میں کس طرح تمھارے دل کو۔ جو سب کھلونوں سے قیمتی ہے توڑنا چاہوں گی . . . . یہ فیصلہ میں نے آج رات اچھی طرح سوچ کر کیا ہے۔ اب میں نے زندگی کی راہ بدل دی ہے۔ اور چاہتی ہوں کہ تم دونوں، ہو سکے تو منزل تک پہنچ جاؤ۔ میری زندگی کی پہلی اور آخری مسرت تم ہو منی!

اور تمھارے لئے، اپنی بہن کے لئے میں اپنی ساری خوشیاں اور آرزوئیں لُٹا کر تمھارے راستے سے ہٹ آئی ہوں۔ . . . .

تمھاری آپا

آپا!

آج سے پہلے میں تمھیں اتنا عظیم نہیں سمجھتی تھی۔ تمھاری تحریر کے وقار نے میرے سر کو تمھارے سامنے جھکا دیا ہے۔ اور تمھارے پیار نے میرے اندر جاگی ہوئی عورت کو ہمیشہ کی پُرسکون نیند دے دی ہے۔ جس جذبے کو میں ہزار جتن کے باوجود نہ کچل سکی تھی۔ وہ تمھارے چند الفاظ نے ختم کر دیا۔

آپا! یہ سحر کیسا ہے؟ یہ طلسم کیسا ہے؟ جو دلوں کو اس طرح جیت لیتا ہے!

اِس سے پہلے کبھی کبھی جب مجھ پر اُداسی کے دَورے پڑتے تھے۔ تو میں سوچا کرتی تھی کہ محبت ایک درد کا نام ہے۔ ایک مجروح دل کی پکار ہے۔ نغمے کی آہ ہے۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ محبت، خوشی کی مسکراہٹ کا نام ہے۔ دل کے ایثار کی مسرت ہے۔

تم نے یہی ایثار کر کے اپنی محبت سے مجھے جیت لیا۔ میں غلطی پر تھی آپا! مجھے معاف کر دو۔

آپا! تمھاری تحریر پہ جگہ جگہ پانی کے دھبّے کیسے ہیں؟ جس وقت تم مجھے لکھ رہی تھیں تم نے یہ آنسو کیوں گرا دیئے؟ جانتی ہو، نہ جانے کتنی بار میں نے بھی جب سے آنسو گرائے ہیں۔ یہ سب کچھ تم سے بے اختیاری میں ہوا ہے۔ تمھاری خوبصورت آنکھوں کی پلکیں اِن موتیوں کا بوجھ نہ سہار سکی ہوں گی۔ اِس لئے کاغذ پر گر کے بکھر گئے۔ میں اِنھیں پھر سمیٹ کے تمھیں واپس لوٹانا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جب تمھاری آنکھیں چمکتی ہیں تو ستارے آنکھیں جھپکانے لگتے ہیں۔ جب تم مسکراتی ہو تو مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور میں اپنی آپا کی آنکھوں میں وہ چمک اور وہ ہی مسکراہٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔

آپا! عزیز بھائی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اماں سے کہہ کر بات صاف کر دوں۔ اور پھر ایک دن ہمارے گھر شہنائی بجے جب تم دلہن بن کے عزیز بھائی کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر دو۔ تمھارے ہاتھوں میں مہندی کتنی اچھی لگے گی۔ جیسے لالے کے پھول کھل اُٹھے ہوں۔

لیکن آپا! جب تم دُلہن بن کے چلی جاؤ گی تو میں کتنی اکیلی رہ جاؤں گی۔ اُس وقت تمھارا جیسا پیار ڈھونڈنے کہاں جاؤں گی۔ تمھارے جانے کے بعد تو میری زندگی سے ساری خوشبو نکل جائے گی۔ لیکن میں پھر بھی خوش رہوں گی۔ کیونکہ تم نے جو پیار مجھے دیا ہے وہ لازوال ہے!!

غزل

از

جناب سراج گیاوی ط۔ ایل ایل بی

آگیا لب پہ کسی کا نام ہنستے بولتے
ہوگئے ہم مفت میں بدنام ہنستے بولتے

خیر سے اب میکدے میں اسقدر توقیر ہے
خود پہنچ جاتا ہے ہم تک جام ہنستے بولتے

آج تک دیکھا نہیں ہے رُوئے ناکامی کبھی
سب نکل جاتے ہیں اپنے کام ہنستے بولتے

حُسن کی برہم مزاجی میں بھی کتنا لطف ہے
سُن رہا ہوں شوق سے دُشنام ہنستے بولتے

مرنے والے کے لبوں پر مُسکراہٹ آگئی
نامہ بر لایا تھا کچھ پیغام ہنستے بولتے

روز جم جاتی ہے یکتا محفلِ شعر و شراب
یوں گزر جاتی ہے اپنی شام ہنستے بولتے

غزل

از

جناب انصار ناصر قریشی کوٹی بی۔اے

آپ چلے آئے اچھا ہے
کل ہوگی کس نے دیکھا ہے

غیر تماشا دیکھ رہے ہیں
اپنوں نے وہ کام کیا ہے

کیا جانے کیا نکلے مُنہ سے
میں چُپ بیٹھا ہوں اچھا ہے

پھُول ہمیں سو بار گوارا
کانٹوں کو کیا شک گزرا ہے؟

ناصرؔ اس کا نام ہے دُنیا
دیکھ وہ سُورج ڈُوب رہا ہے!

غزل

از

جناب رفعت سلطان بی۔اے

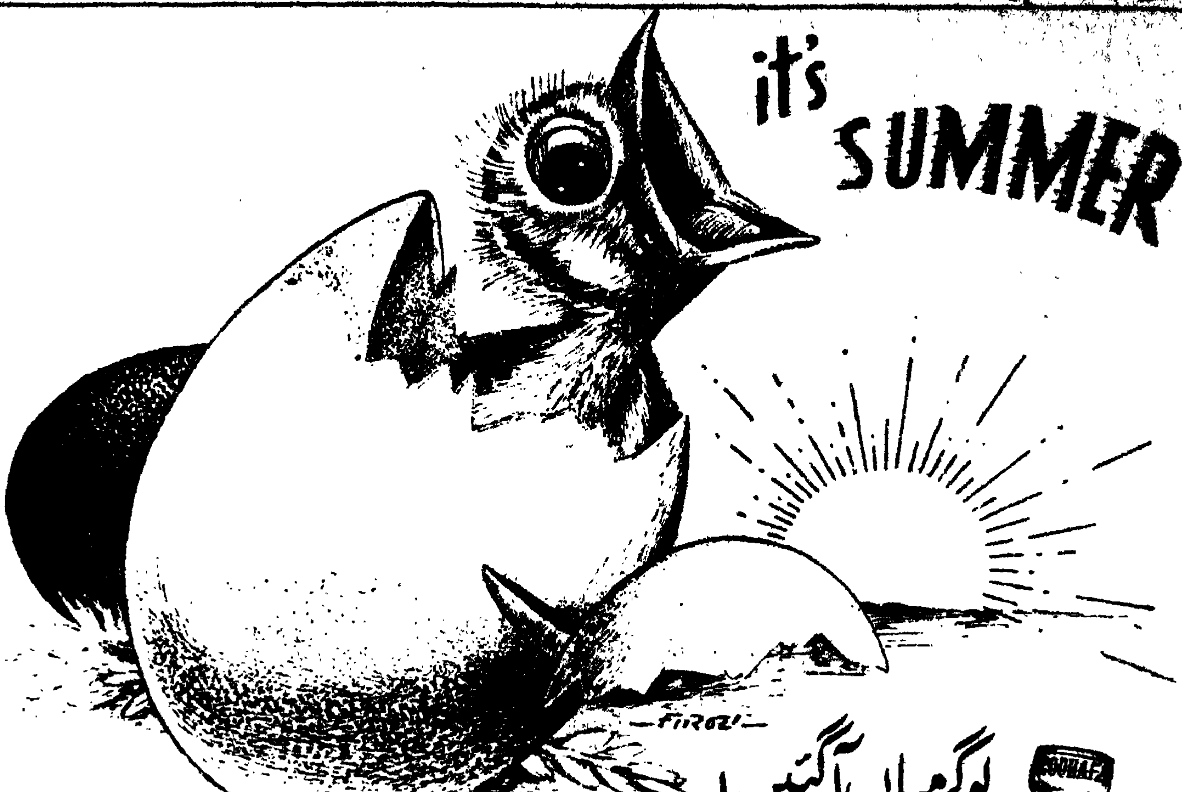
اے موسمِ برسات کی گھنگھور گھٹاؤ
جو آگ مرے دل میں لگی ہے وہ بُجھاؤ

ہم درد کے ماروں سے اُلجھنا نہیں اچھا
اے شعلہ رُخو! گُل بدنو! شوخ اداؤ

آلامِ زمانہ کی تو باتیں ہیں پُرانی
اے ہم نفسو! کوئی نئی بات سُناؤ

خوشیوں کی تمنا ہے تو اے میرے رفیقو!
آلامِ زمانہ کو بھی سینے سے لگاؤ

جینے کی تو اب ایک ہی صورت ہے کہ رفعتؔ
بے بسی کے زمانے کے ستم دیکھتے جاؤ


it's
SUMMER
—FIROZI—

چاند کی بیٹی

افسانہ

از

جناب محمود واجد

یوتھ ایسوسی ایشن بھاگلپور ——— ۵ نومبر ۱۹۵۶ء

محترمی! تسلیمات

بیسویں صدی کے لئے ایک کہانی "چاند کی بیٹی" بھیج رہا ہوں ——— یہ عجیب سی چیز ہے، لیکن فضول نہیں۔ میں نے FANTASY پر ایک تجربہ کیا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں مصنف کسی کہانی کے ذریعے کوئی طنز یا نصیحت آموز بات پیش کرتا ہے۔ دُنیا کے مشہور ادیب ٹالسٹائی نے اس طرح کی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ گورکی نے بھی اپنی کچھ کہانیوں میں اس FORM کو برتا ہے۔ اُردو ادب میں اس کی بہت کمی ہے۔ کرشن چندر صاحب نے "عورتوں کا عطر" جیسی کہانیاں اس ڈھنگ پر لکھی ہیں۔ کچھ اور اسی قسم کی اور بس۔

میں نے اپنی کہانی کے لئے خام مواد جاپانی ادب کی قدیم ترین روایتی کہانی سے لیا ہے۔ جس میں ایک لاولد بانس کاٹنے والے کو ایک بچی ملتی ہے۔ جو آگے چل کر ایک خوبصورت لڑکی ہو جاتی ہے جس سے وہاں کا راجہ تک شادی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اُسے سخت ناکامی ہوتی ہے۔ اور وہ لڑکی یہ کہتی ہوئی آسمان کی طرف چلی جاتی ہے کہ میں چاند کی بیٹی ہوں۔

میرا خیال ہے یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ اور بیسویں صدی کے قارئین کو بھی۔ کہانی کی رسید اور اپنی رائے سے مطلع فرمایئے ——— مجھے اپنے قارئین کی رائے جاننے میں بہت خوشی ہوگی۔ فقط

خلوص کار

محمود واجد

ہزاروں سال ہوئے ———

اِس دھرتی پر صرف دو طرح کے لوگ رہا کرتے تھے ——— راجا اور پرجا ———!!

اُس وقت "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والی کہاوت بہت مشہور تھی۔ لاٹھی والوں کے پاس صرف لاٹھی تھی۔ اور بھینس والوں کے پاس صرف بھینس۔ بھینس کمزور تھی اور لاٹھی مضبوط اس لئے ایک لاٹھی کئی بھینسوں کو ہانک کرلے جایا کرتی تھی۔ آج یہ بات ذرا مختلف ہے۔ اب اکثر بھینسیں لاٹھی کو سمت بتاتی ہیں۔ خیر، تو یہ اُسی زمانے کی بات ہے!

ایک راجہ کے راج میں ایک بُڈھا لکڑی کاٹنے والا رہا کرتا تھا۔ وہ انتہائی غریب تھا۔ وہ لکڑیوں سے کھلونے بنایا کرتا تھا۔ اور اُنھیں فروخت کرکے اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا۔ اُن دونوں کی عمر کافی ہوگئی تھی۔ لیکن اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتے، کاش! ہمارے بھی کوئی اولاد ہوتی۔ جو اِس بڑھاپے کا سہارا بنتی۔ اور جسے دیکھ کر ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔ لیکن خدا کو شاید یہ بات منظور نہ تھی۔

ایک دن بُڈھا ہر روز کی طرح لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ کہ اُس کی نظر ایک چمکیلی چیز پر پڑی۔ بُڈھے کو تجسس ہوا کہ آخر یہ کیا ہے؟ اُس نے کام روک دیا اور اُس طرف بڑھا

اُسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہاں ایک ننھی سی بچی تھی جس کا قد بمشکل چھ انچ ہوگا۔ بڈھے نے سوچا، شاید اللہ میاں کو ہماری مجبوری پر ترس آگیا۔ اور ہمارے لئے اسے بھیجدیا۔ اُس نے بچی کو ٹوکری میں ڈال لیا۔ اور گھر لے آیا۔ آج اُس کے گھر میں گھی کے چراغ جل رہے تھے۔ بڈھا اور بڈھیا بےحد خوش تھے۔

جب سے اس بچی نے گھر میں قدم رکھا تھا بڈھے کی قسمت جاگ اٹھی تھی۔ اس بچی کو دیکھ کر وہ ساری فکر اور پریشانیوں کو بھول جاتا۔ گھر میں روپیہ پیسہ بھی آنے لگا تھا۔ وہ معمول کے مطابق روزانہ لکڑیاں کاٹنے جاتا۔ اور وہاں اُسے ہر روز کوئی نہ کوئی قیمتی چیز ضرور ملتی۔ کبھی سونا، کبھی روپے، کبھی اور کچھ۔ اور پھر بڈھا محنتی جو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ کافی مالدار ہوگیا۔

دوسری طرف وہ بچی بہت تیزی سے جوان ہورہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک حسین و جمیل لڑکی بن گئی۔

اُس کے حسن و جمال کی شہرت سن کر بڑے بڑے رئیس اپنی نسبت اُس بوڑھے کے ہاں بھیجنے لگے۔ بڈھے کے کچھ کہنے سے پہلے وہ لڑکی سبھوں کو سخت جواب دے کر مایوس کردیتی اس لڑکی کو بھینس چرانے والے ایک دیہاتی لڑکے سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ لڑکا جب کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنی بانسری کی تانیں چھیڑتا تو اس لڑکی کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے وہ بےچین ہوجاتی اور اُس کے قدم بے اختیار چراگاہ کی طرف اُٹھ جاتے۔ پھر جوانی جوانی میں ضم ہوجاتی۔ شباب نغمگی میں ڈوب جاتا۔ اور ساتھ ساتھ جینے اور مرنے کی بات ہوتی ایک بار یہی بات ہورہی تھی کہ لڑکے نے کہا۔

"تم چاند جیسی لڑکی کو سورج جیسا لڑکا چاہیے۔ میرا تمہارا کیا جوڑ؟"

لیکن لڑکی کہتی۔

"پگلے مجھے تو تیرا ساتھ چاہیے۔"

اور لڑکے نے سنجیدہ ہو کہا۔

"اور وہ بڑے لوگ جو تیرے اُوپر آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں، اُن کا کیا ہوگا؟"

"تم بدھو ہو! میں نے کہہ دیا نا کہ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ مجھے تو تمہارا ساتھ چاہیے اور بس۔" لڑکی نے چڑ کر کہا۔

اِس بار لڑکے نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

"لیکن میرے دیس کی جو یہ ریت ہے کہ جس چیز کو راجہ پسند کرلے اُسے پرجا کو اپنانے کا حق نہیں۔ اس کا کیا ہوگا؟"

لڑکی ذرا مایوس ہوگئی۔ پھر بھی ہمت کرکے بولی۔

"یہ تو تمہارے دیش کی رسم ہے نا، ہم اپنے دیش میں تمہیں لے چلیں گے۔"

لڑکے کے آخری جواب نے تو لڑکی کو واقعی سوچ میں ڈال دیا۔ اور پھر بابا جو ہیں اِن کی خوفناک آنکھوں سے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

وہ اپنے بابا سے بہت ڈرتی تھی۔

اور پھر سوچنے لگی۔

"دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کب تک چلے گا؟ یہاں رہ کر یہاں کی رسم کو نبھانا ہی ہوگا۔"

وہ چپ چاپ اُٹھ کر چلی آئی۔

آج اُس کے بابا نے بھی کچھ کھری کھوٹی سنائی۔

"بیٹیا! تجھے اپنے برابر کے لوگوں سے ملنا چاہیے۔ چھوٹے لوگوں سے میل جول رکھوگی تو لوگ تجھے اور پھر مجھے کیا کہیں گے؟"

لڑکی سر جھکائے یہ سب سنتی رہی۔ اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹی تو اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خوب روئے۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ اس دیش کے لوگ روایات میں کتنے جکڑے ہیں۔ یہاں پیار پر کتنی کڑی شرطیں ہیں۔ آخر اُسے ہر چیز سے نفرت ہوگئی دُنیا سے۔ دُنیا والوں سے، اپنے بابا سے، اُس لڑکے سے اور پھر اپنے آپ سے۔ اُس نے سوچا، وہ اب اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ ڈالے گی۔ اُس نے فیصلہ کرلیا اب وہ شادی نہیں کرے گی۔

اُس دن کے بعد وہ اُس لڑکے سے ملنے نہیں گئی۔ بانسری اب بھی بجتی تھی اُس کی لے میں اب سوز و گداز بھی آگیا تھا۔ لیکن وہ جیسے پتھر کی مورت بن گئی ہو۔ اُدھر کبھی متوجہ ہی نہ ہوئی۔

اُس لڑکی کا چرچا بڑھتے بڑھتے وہاں کے سب سے بڑے راجہ کے کانوں تک پہنچا۔ اُسے اُس لڑکی کو دیکھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ اپنے چند سپاہیوں کو لے کر بڈھے کے یہاں پہنچ گیا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہوگیا اور بڈھے سے اُس لڑکی کو مانگا۔ بڈھا ذرا ہچکچایا۔ اِس طرح وہ لڑکی اُس سے چھوٹ جاتی۔ لیکن راجہ سے بہتر


سیزرز
سگریٹ
"SCISSORS"
CIGARETTES
SPECIAL
SCISSORS
W.D.&H.O.WILLS.
W.D.&H.O.WILLS,
BRISTOL & LONDON.
"SCISSORS"
W.D.&H.O.WILLS
SCISSORS

ملاقات ہو جانے کے خیال سے اُسے ذرا تقویت ہوئی۔ اور وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ لڑکی بول پڑی۔

"راجہ صاحب! آپ تشریف لیجایئے۔ مجھے آپ پسند نہیں۔"

راجہ نے اِسے اپنی بے عزتی خیال کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو اُسے پکڑ لینے کا حکم دیا۔

سپاہی آگے بڑھے۔ لیکن وہ لڑکی درمیان سے غائب ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ذرا فاصلے سے اُس نے آواز دی۔

"آپ مجھے پکڑ نہیں سکتے۔ روح کو مقید نہیں کیا جا سکتا حضور! آپ زیادہ سے زیادہ جسم خرید سکتے ہیں۔ اور وہ بھی اپنی اولاد در علیا کا۔ میں آپ کی لونڈی نہیں بہتر ہے آپ تشریف لے جائیں ورنہ ناحق پریشانی ہوگی۔"

راجہ پھنکارنے لگا۔ اُس نے گرجدار آواز میں اُسے پکڑ لینے کا حکم دیا۔ لیکن ہر بار وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ بوڑھا بھی حیرت زدہ تھا اور راجہ بھی۔ آخر تنگ آ کر راجہ واپس چلا گیا۔

وہاں سے برابر اس کے خط آتے جس کا کوئی جواب نہ جاتا۔ وہ بہت فکر میں تھا کہ اُسے کس طرح حاصل کیا جائے۔

اِدھر کچھ دنوں سے وہ لڑکی اُداس سی رہنے لگی تھی۔ وہ چاند کو دیکھتی اور روتی بوڑھا پہلے ہی سے حیرت میں تھا لیکن خاموش رہا۔ ایک بار بہت ہمت کرکے پوچھا تو لڑکی نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

ایک دن جب کہ چاندنی ذرا تیز تھی تو وہ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اتنی بے خبر تھی کہ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ کون کب آیا؟ اور کیا ہو رہا ہے؟ بوڑھے نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹیا! آخر کیا بات ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ!"

اب لڑکی کے ضبط کا پیمانہ چھلک چکا تھا۔ اُس نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"بابا! میں نے جو بات اتنے دنوں تک تم سے چھپائی، اب کہنی ہی پڑتی ہے سُنو! اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے..... بابا! بات یہ ہے کہ میں چاند کی بیٹی ہوں، یہ بات شاید تمھیں معلوم نہیں!"

بوڑھا حیرت سے مُنھ کھولے تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔

"اُس دن کے واقعے پر تم نے غور نہیں کیا جس دن راجہ صاحب آئے تھے؟"

اب بُڈھے کو ہوش آیا لیکن اُس نے اُسی طرح کہا۔

"لیکن بیٹیا! ہم نے تو تمھیں اپنی بیٹی کی طرح رکھا ہے۔ پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ تم ہمارے دل میں سا گئی ہو۔ اور اب تم....."

بوڑھے کو ٹوک کر لڑکی نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے بابا! لیکن اب مجھے جانا ہی ہوگا۔ میرے ماں باپ چاند نگر میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"لیکن بیٹیا!" بوڑھے نے کہا "تم ہماری آنکھوں سے اولاد کی محبت کی چمک اس بڑھاپے میں چھین رہی ہو۔"

"کیا کروں بابا!" لڑکی بولی۔ میرا خود جی نہیں چاہتا کہ میں تمھیں چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ لیکن اب تو مجھے جانا ہی ہوگا..... اور کل ہی.....!"

بوڑھے کی زبان گنگ ہو گئی۔

دوسرے دن یہ خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ راجہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے سوچا، یہ بہت اچھا موقعہ ہے۔ اِسے ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے اُس لڑکی کو روکنا چاہیے۔ اور اُس نے ایک بڑی فوج بوڑھے کے مکان کے پاس بھیج دی!

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک کر دن کی سی روشنی پھیلا رہا تھا۔ بوڑھا اور بڑھیا فکر سے جاگ رہے تھے۔ بانسری کی تانیں فضا میں نغمگی گھول رہی تھیں۔ سپاہی اپنے پہرے پر تھے۔ آدھی رات گئی ہوگی کہ آسمان سے ایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ جس کے آگے آنکھ نہ ٹھہر سکتی تھی۔ سپاہیوں پر سنّاٹے کا سا عالم چھا گیا۔ روشنی کا ہالہ قریب آیا تو اُس کے درمیان سے ایک رتھ نکلا۔ رتھ بوڑھے کے مکان کے پاس ٹھہر گیا۔ سارے مقفّل دروازے یک بیک کھُل گئے۔ رتھ سے ایک نورانی چہرے والا شخص اُتر کر بوڑھے سے مخاطب ہوا۔

"تمھاری نیکی اور صبر کے بدلے میں خدا نے تمھیں یہ نعمت عطا کی تھی لیکن دولت کے ساتھ تم میں دولت کا غرور بھی آگیا اور تم اپنی حقیقت کو بھول کر اُس راجہ سے اِس لڑکی کا رشتہ جوڑنے کو تیار ہو گئے۔ اُس بانسری والے لڑکے سے ملنا جلنا ترک کرا دیا۔ اِس لڑکی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب اِس لڑکی کو اُٹھا لیا جائے گا۔"

بوڑھا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ لڑکی نے اُس سے کہا۔ "بابا! اب میں چلی۔ یہ پُرانے کپڑے اُتار کے جاتی ہوں۔ اِنھیں دیکھ کر میری یاد تازہ کر لینا۔"

بوڑھا رونے لگا۔ اِسی درمیان بانسری والا لڑکا آگیا۔ جو اپنی بانسری تحفہ دینے آیا تھا۔ لڑکی کی محبت عود کر آئی۔ اُس نے چاہا کہ اُسے ساتھ لے لے لیکن اُس لڑکے نے کہا۔

"میں یہیں اچھا ہوں۔ تم ہی یہاں رہ جاؤ نا!"

اِس بار لڑکی کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے بانسری کو زمین پر پٹک دیا۔ بانسری کا پٹکنا تھا کہ وہ لڑکا ایک دم ایک پرندکی شکل کا ہو گیا۔ جسے لوگ آگے چل کر چکور کہنے لگے اور اُس لڑکی کے سینے میں داغ سا پڑ گیا۔ اور رشتہ چل پڑا۔ سنتے ہیں کہ اُس دن سے دولت مند کے دل کا قرار چھن گیا اور دُنیا کے سارے سازوں میں سوز بھر گیا۔

اور آج جبکہ لوگ چاند نگر کو جانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ چاند کی بیٹی اِس دھرتی پر اب کبھی نہ آئے گی۔ جہاں دل کو فتح کرنے کیلئے بھی فوج اور طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ وہ اپنے سینے کے داغوں کو چھپائے "چاند نگر" سے چکور کو دیکھا کرے گی۔ اور بس ـــــ!!

کشمیری غزل

از

جناب غلام نبی خیال

کتھ چھک دِوان زہ وُن بی وُچھو کتھ حسین چھُ راتھاہ
وولہ تراؤ پرون تتھ کُن کرو کتھاہ تہ باتھاہ

ترجمہ:۔ تُو کیوں کھوئی کھوئی سی دکھائی دیتی ہے اے مری محبوبہ! دیکھ آج کی رات کتنی حسین ہے۔ آ گزشتہ باتوں کو بھلا کر کوئی نئی داستاں چھیڑیں۔

کیاہ چھۓ خبر مۓ کتھہ کُن رٹھ ہرِدمایہ دود جگر کُـ
مۓ تہ پوشتن شیری بن ژھ تہ سوزمتھ سوغاتھاہ

ترجمہ:۔ تُو کیا جانے کہ میں نے اپنے دردِ جگر کو کس طرح محفوظ رکھا ہے۔ میرا تو اتنا ہی سرمایہ ہے۔ اور یہ درد تم نے اپنے چاہنے والے کو ایک تحفہ بھیجا ہے۔

یُس لول خام طمع پوینتاہ رٹھ چھُو باسان
سُوی لول شاعرس کیُو چھُو بڈ بارہ کائناتھاہ

ترجمہ:۔ جس عشق کو خام طمع ایک ناچیز شے سے تعبیر کرتا ہے، وہی عشق عاشق کے لئے دو جہان کے برابر ہے۔

گاہ چوو تھس نیتُو تے گاہ تھوو تھس بوُ چھُ وُن
کلہ والہ! یار لگہ ہے بدلی چھُ چانی ذاتھاہ

ترجمہ:۔ کبھی تُو نے میری خاطر غم کے گھونٹ پی لئے۔ اور کبھی میری تشنہ لبی سے جام اُٹھایا میرے ساقی! میں تیرے قربان کہ تمھارے رنگ بھی نرالے ہیں۔

لولس چھُو دل سمندر دم پھُٹ حُسن مہ گژھتن
خوش روز نک تہ کانہہ دوہ اوش تراوُن تہ راتھاہ

ترجمہ:۔ عشق کا دل تو سمندر ہی ہے۔ حُسن کو دم نہیں ہارنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی دن خوشی کا ہوتا ہے اور کوئی رات فقط آنسو بہانے کیلئے۔

چانی وُوشاتھ ہردم اسہِ دل چھِ شاد تھوومت
نتہ یُس دوہا کڈُن پیو سُوی اوس حاریتا راتھاہ

ترجمہ:۔ تمھاری ہی اُمید سے ہم نے ہر گھڑی اپنے دلوں کو شگفتہ رکھا ورنہ آج تک جتنا بھی عرصۂ حیات گزرا، ہر دن روزِ محشر کے برابر تھا۔

اور سائیں بابا نے کہا

طنزیہ فیچر

از

جناب فکر تونسوی

جاہل کی تلاش

میں سالہا سال کسی ایسے آدمی کی تلاش کرتا رہا۔ جو اپنے آپ کو اپنے ہی منہ سے جاہل کہہ دے۔ لیکن مجھے ہر ایک نے منہ توڑ جواب دیا۔ ہر آدمی میرے ساتھ نہایت عقلمندی اور ہوشیاری سے پیش آیا۔ آخر تنگ آکر میں نے یہ تلاش چھوڑ دی۔ لیکن ایک دن، جب کہ اپنی تلاش کی ناکامی پر آنسو بہا رہا تھا۔ میرے اندر نور کی ایک کرن چمکی اور میں نے اس کی روشنی میں اس آدمی کو پالیا جو اپنے آپ کو اپنے منہ سے جاہل کہہ رہا تھا ——— اور وہ آدمی میں خود تھا!

بے وفا محبوبہ

میں نے تین چار سال کے ایک ننھے سے بچے سے پوچھا۔

"بیٹا! آؤ تمہارا بیاہ کر دیں۔"

"کر دو!"

وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

"کس سے بیاہ کروگے؟"

"اپنی امی سے!"

"مگر وہ تو تم سے بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ تو اپنا بیاہ کر چکی ہے۔"

یہ سن کر ننھا بچہ رونے لگا۔

اُسے اپنی محبوبہ کی بے وفائی پر سخت رنج ہوا۔ اور وہ رو رو کر کہنے لگا۔

"میں اپنی امی سے کبھی نہیں بولوں گا!"

"کبھی نہیں بولوں گا ———!!"

سچی بھگتی

بھگوان کا ایک بہت بڑا بھگت جب ہر روز مندر جایا کرتا تو پرانے جوتے پہن کر جایا کرتا۔ لیکن ایک دن وہ غلطی سے نئے جوتے پہن کر چلا گیا۔ جب وہ مندر سے باہر نکلا تو جوتے غائب تھے۔ کوئی آدمی اس کے جوتے چرا کر چلا گیا تھا ——— اور رات کو خواب میں بھگوان نے اُسے ساکشات درشن دیئے اور کہا۔

"میرے پیارے بھگت! آج ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ کیونکہ آج تم نے ہمارے پیدا کئے ہوئے ایک انسان کو خوش کیا ہے۔ انسان کو خوش کرنے والا ہی ہمارا سچا بھگت ہو سکتا ہے!"

ایک عاشقانہ خط

ایک عاشق نے اپنی محبوبہ کو خط لکھا۔

"——— اے میری پیاری محبوبہ! تم بجلی کے ایک کوندے کی طرح میری زندگی میں آئیں۔ اور میرا تاریک گھر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ اے میری روشنی! بتاؤ! میں تمہارے اس احسان کا بدلہ کیسے چکا سکتا ہوں؟"

اور دوسرے دن محبوبہ نے اُسے بجلی کا بل بھیج دیا۔

اخلاق

حکومت کے ایک بہت بڑے افسر نے ایک سرمایہ دار سیٹھ کے ساتھ یہ طے کیا کہ اگر آپ مجھے دس ہزار روپے رشوت دے دیں تو میں آپ کو ایک لاکھ روپے کا سرکاری ٹھیکہ دلوا سکتا ہوں ——— معاملہ طے پا گیا۔ لیکن جب رشوت کی

رقم کی ادائیگی کا وقت آیا تو سیٹھ نے کہا کہ میں تو صرف پانچ ہزار روپے دوں گا۔ دس ہزار روپے نہیں دوں گا۔

اس رشوت خور افسر کا منہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اور بولا۔

"بھلا یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ آپ دس ہزار کا وعدہ کر کے پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں؟ سچ کہتے ہیں مزدور کلاس والے کہ سرمایہ دار انسان کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا۔"

تیاگ کا فلسفہ

"لعنت ہے اس دُنیا پر جس میں اندھیرا بھی ہے اور اُجالا بھی۔ میں اُن سڑکوں پر نہیں چلنا چاہتا جہاں موٹروں اور تانگوں کی ٹکر ہو جاتی ہے۔ میں اُن بازاروں کا رُخ نہیں کرنا چاہتا جہاں گناہ کا نرخ سب سے زیادہ مہنگا ہے۔ میں اُن گلیوں سے نفرت کرتا ہوں جہاں حسین دوشیزائیں چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ اور میں اُن گھروں میں قدم نہیں رکھنا چاہتا جہاں ننھے معصوم بچوں کے گلے پر فاقے کی چھری پھیری جاتی ہے۔ میں اُن...."

اور پھر دنیا چھوڑ کر اُس نے جنگل کی راہ لے لی۔ اور خدا نے سوچا۔ "آہ! میں نے ایسا بزدل انسان پیدا کر کے دُنیا میں کیوں بھیجا تھا؟"

آئینے کے سامنے

اپنے آپ کو قدِ آدم آئینے کے سامنے لا کر کھڑا کر دو۔ اور اپنے آپ کو ایڑی سے لے کر چوٹی تک دیکھو۔ پھر دیکھو، پھر دیکھو، اور دیکھو، اور غور سے دیکھو اور دھیان سے بتاؤ کہ کیا تم نے اپنے جیسا حسین آدمی دُنیا میں اور کہیں دیکھا ہے؟

پانچ نصیحتیں

(۱) اے انسان! تمھارے پہلو میں جو انسان بیٹھا ہوا ہے اُس سے خوف کھاؤ کیونکہ جو انسان تمھارے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے وہ بھی تم سے خوف کھاتا ہے۔

(۲) جُرم، دراصل تمھارے ذہن کی ایک انگڑائی ہے۔ کبھی کبھی یہ انگڑائی لے لیا کرو۔ کیونکہ اس سے منجمد رگ اور پٹھے کھل جاتے ہیں۔

(۳) کسی ایسے آدمی سے نفرت مت کرو جس سے بعد میں تمھیں محبت کرنی پڑے۔ اور وہ تمھیں عمر بھر شرمندہ کرتا رہے۔

(۴) جب تم دیوتا بننے کی کوشش کرتے ہو تو انسان کے درجے سے گر جاتے ہو۔ اور جب تم انسان بننے کی کوشش کرتے ہو تو دیوتا کے درجے سے بلند ہو جاتے ہو۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟

(۵) اپنے عیب کو اتنا خوبصورت بنا لو کہ دُنیا اُسے اپنا ہی عیب بنا لے۔ یاد رکھو دنیا عیب سے نفرت نہیں کرتی۔ بلکہ صرف اُس کے بھونڈے پن سے نفرت کرتی ہے!

برتھ کنٹرول

ایک شخص برتھ کنٹرول کا زبردست حامی تھا۔ اُس نے لاکھوں روپے لگا کر برتھ کنٹرول کا ایک کلنک کھولا۔ اور اُس سے لاکھوں روپے کمائے۔ لاکھوں انسانوں کو اس برتھ کنٹرول کلنک سے فائدہ پہنچا۔ سارے سماج میں اُسے نیک نامی اور شہرت ملی۔ حکومت کی طرف سے اُسے بیش قیمت انعامات ملے۔ ساری دُنیا عش عش کر اٹھی لیکن جب وہ مرا تو لاولد تھا!

انسان اور جج

مجھے ایک جج کے بارے میں معلوم ہے کہ اُس نے ایک ملزم کو ہنستے ہنستے پھانسی کی سزا دی۔ اور پھر گھر آ کر تکیے میں منہ چھپا کر گھنٹوں روتا رہا۔

میں نے اُس جج سے پوچھا۔

"تم پہلے ہنسے کیوں اور پھر روئے کیوں؟"

تو وہ بولا۔ "سزا دیتے وقت میں ایک جج تھا۔ لیکن روتے وقت میں ایک انسان تھا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ انسان کو انسان کے ہاتھوں پھانسی پر نہیں چڑھنا چاہیئے!"

اور میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"آہ! انسان نے انسان کو مسخ کر کے اُسے جج بنا دیا ہے۔ کاش! وہ جج کی بجائے ہمیشہ انسان رہتا!"

تقریر کا نتیجہ

ایک لیڈر عوام کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔

"اے لوگو! دُور اُفق کے پار ایک وادی ہے، سرسبز و شاداب! جہاں تمہاری محبوبہ رہتی ہے۔ اُس کی زلفیں سردیوں کی کالی رات کی طرح سیاہ اور لمبی ہیں۔ اُس کے رُخساروں پر اناروں کا گمان ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں تمہاری تمناؤں کی شفاف مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ لیکن وہ ایک خوفناک دیو کی قید میں ہے۔ اُس کا نرم و نازک جسم اُس وحشی کی گرفت میں پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ وہ تمہارے ہجر میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔ وہ اپنی مکھن ایسی بانہیں پھیلا کر تمہیں بلا رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ آؤ اور مجھے یہاں سے آزاد کرا کے لے جاؤ۔ اِس لئے اے لوگو! تم مجھے آشیرواد دو، حکم دو، اجازت دو۔ تاکہ میں تمہاری اُس محبوبہ کو چھین کر لے آؤں۔ اور تمہاری آغوش میں لا پھینکوں۔"

اور عوام نے اُفق کے پار تک جانے کے لئے لیڈر کو ٹرین کے ٹکٹ کے پیسے دے دیئے اور پھر صدیوں تک اُس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

آواز کا خطرہ

اچانک بازار میں چلتے چلتے مجھے ایک شرارت سُوجھی۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا اور عین سڑک کے درمیان پھینک دیا۔ اور زور زور سے چلّانے لگا۔

"راہ گیر حضرات! سڑک پر ایک روپیہ پڑا ہوا ہے۔ براہِ کرم اسے اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیجئے۔"

میں برابر چلّاتا رہا لیکن کسی شخص نے روپے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بلکہ جو راہ گیر بھی میری آواز سُنتا وہ میری طرف دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا۔ اور بغیر روپے کی طرف دیکھے آگے بڑھ جاتا۔

میری شرارت ناکام ہو گئی۔ مجھے اِس کا افسوس ہونے لگا۔

جب چلّاتے چلّاتے میرا گلا بیٹھ گیا۔ تو میں یک دم خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب میری آواز میرے ہی جسم میں قید تھی۔ اور ابھی میری خاموشی کو دو ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک شریف آدمی سڑک سے گزرا۔ اُس نے روپیہ اُٹھایا اور نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

جھوٹ کے پاؤں

ایک بار کسی نے جھوٹ کو یہ طعنہ دیا کہ تمہارے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔ اِس لئے تم تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ فوراً لڑکھڑا کے گر پڑو گے۔ جھوٹ کو اِس طعنے پر بہت غصہ آیا۔ اُس نے میان سے تلوار نکالی اور سچ کے دونوں پاؤں کاٹ کر اپنی ٹانگوں سے لگا لئے۔ اور پھر سرپٹ دوڑنے لگا۔

یہی وجہ ہے کہ اُس کے بعد جھوٹ ہی سچ کے مقابلے میں اِس تیزی سے دوڑتا ہے کہ سچ اُسے پکڑ نہیں سکتا۔

ترقی کی سیڑھی

ایک آدمی سیڑھی پر چڑھ کر کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک ناز اور فخر تھا۔ دوسرے آدمی نے اُس ناز اور فخر کو دیکھا تو اُس نے نیچے سے سیڑھی کھینچ لی۔ پہلا آدمی دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اور دوسرا آدمی خود سیڑھی پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرا ہوا آدمی جھاڑ پونچھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب اُس نے بھی سیڑھی نیچے سے کھینچ لی۔ پہلا آدمی دھڑام سے نیچے گرا اور یہ پھر سیڑھی پر چڑھ گیا۔ اور جب وہ یہ کھیل کھیل رہے تھے تو ایک تیسرا آدمی آیا اور وہ سیڑھی اُٹھا کر بھاگ گیا۔

لاؤڈ سپیکر

"تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔"

"جی ہاں!"

"تم تو بہت جھوٹے آدمی ہو۔"

"جی ہاں۔"

"تو پھر دراصل تم کیا ہو؟"

"جو کچھ آپ چاہتے ہیں!"

میں چائے ہوں

میرا اچھی طرح جائزہ لیجئے

میری چائے دانی کا سارا ظروف سازی کی بڑھتی ہوئی صنعت کی ایک علامت ہے۔ کیونکہ اسی طرح ہر سال لاکھوں لاکھ کی تعداد میں پیالی اور طشتریاں بنتی ہیں اور ہمارے عوام کے اعلیٰ معیارِ زندگی میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔

میرا بدن ۲ پتے اور ایک کلی ہیں جن سے ایک ایسی مشروب تیار ہوتی ہے جو تقریباً سارا کا دُنیا میں یکساں طور پر پی جاتی ہے۔ سبز پتوں کو دیکھ کر آپ کو ان ایکڑوں ایکڑ زمینوں کا ضرور خیال آتا ہوگا جہاں بے شمار تعداد میں پلتے، بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ اس طرح یہ زمین کافی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اسکی مدد سے ہم نے کوئلہ، سیمنٹ، فرٹلائزر، چائے مشینری اور بکس بنانے کی لکڑی اور دوسری بہت سی صنعتوں کو ترقی کرنے میں مدد دی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۶۰ لاکھ چائے کے بکس تیار کئے جاتے ہیں۔

میں ہندوستان کی زرعی اور صنعتی زندگی کا ایک اہم عضو ہوں، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے ورکروں کی دوست اور آپ کے ہر اچھے اور برے وقتوں میں آپ کی صحیح غمگسار ہوں۔

TEA BOARD INDIA



میں چائے ہوں ــ جو ہندوستان کی دولت ہے

DST 171

ہنی مُون

افسانہ

از

جناب پُشکر ناتھ بی۔اے

بٹہ یار سری نگر ——— یکم نومبر ۱۹۵۶ء

برادرم خوشتر صاحب، آداب

ایک افسانہ "ہنی مُون" ارسال کر رہا ہوں۔ اب اسے کیا کیجئے کہ جب بھی میں بیسویں صدی کے سالنامے کے لئے کہانی لکھنے لگتا ہوں تو کشمیر میں خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور خزاں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت ظالم ہوتی ہے۔ خیر! یہ ظالم تو ہمیشہ آتی رہے گی اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ "ہنی مُون" بھی ایسی ہی خزاں کی کہانی ہے۔ جو زندگی کی بہار کو ڈراتی دھمکاتی ہے۔ لیکن بہار پھر بھی بہار ہے۔ مُسکراتی ہے اور جئے جاتی ہے امید ہے کہ یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی۔

"جشنِ کشمیر" پر بھی آپ نہیں آئے۔ اور خلش بدستور قائم ہے ——— اپنی رائے اور رسید سے نوازیئے گا! ——— اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

خلوص کیش

پُشکر ناتھ

کوہسار اور کوہسار کی تہہ بہ تہہ ہوتی ہوئی شام ——— نیچے لِدر کے پانی کی موسیقی ——— اور اُوپر چیل اور دیودار کے درخت جو سلسلہ وار اُوپر ہی اُوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے ——— اور اِن درختوں کی ٹہنیوں سے گزرتی ہوئی شام کی ہواؤں کا ہلکا ہلکا شور!

یہی وہ چیزیں تھیں جن کا احساس بنکم بابو کو پہلگام ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہو رہا تھا۔ اُس کے سامنے وہسکی سے بھرا ہوا گلاس آنکھیں میچ میچ کر اُسے ایک نئی دنیا کی سیر کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ لیکن وہ اِس رنگین شرارت کی طرف صرف دیکھ رہا تھا۔ اور بس!

اِسی وقت کامنی ایک خوبصورت کیپ سے اپنے حسین کندھوں کو چھپائے کمرے میں داخل ہوئی۔ بنکم بابو نے کامنی کی طرف اُسی انداز سے دیکھا جس انداز سے وہ اُبتک شراب سے بھرے ہوئے گلاس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج اُسے کامنی اور شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں بہت کم فرق نظر آ رہا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ شراب سے بھرا ہوا گلاس مُبہم اشارے کر رہا تھا۔ اور کامنی کے لہراتے ہوئے بال، اُس کے کانوں میں دمکتے ہوئے موتی اور اُس کی ٹھوڑی کا وہ مُسکراتا ہوا تِل واضح اور پُرزور اشارے کر رہا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر شراب کے گلاس کی طرف دیکھا اور پھر چُپ چاپ اُٹھ کر گلاس کو شراب سمیت کھڑکی سے نالے میں پھینک دیا۔ گلاس نالے کے پتھروں سے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ایک عجیب موسیقی بکھیرتا ہوا نیچے ہی نیچے گرتا گیا۔ پھر جب اُس نے کھڑکی کے پردوں کو سرکا کر کمرے کی طرف دیکھا تو کامنی آئینہ ہاتھ میں لئے ہونٹوں کی لپ اِسٹک کو نکھار رہی تھی۔

"کاسنی! آج تم اِن خوبصورت ہونٹوں سے یہ خوبصورت لپ اسٹک پونچھ ڈالو اور میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایک نئی چیز دکھاؤں گا۔"

کاسنی نے نہایت آہستگی سے آئینے سے نظریں ہٹا کر اُنھیں بنکم بابو کے چہرے پر گاڑ دیا۔

"کبھی کبھی تمھاری باتوں پہ بے اختیار ہنسی آتی ہے ڈارلنگ!" اُس نے بے پرواہی سے آئینہ تپائی پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور کبھی کبھی تمھاری ہنسی پر رونا آتا ہے روزی!" بنکم بابو نے ہونٹوں پر ایک ساحرانہ ہنسی بکھیرتے ہوئے کہا۔

اور پھر دیر تک دونوں اپنے اپنے الفاظ پر غور کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں کا خیال تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف پیار سے دیکھ رہے ہیں۔

"ڈارلنگ! آج ہوٹل میں بال ہے۔ تم کس کے ساتھ ناچنا پسند کرو گے؟"

دفعتہً کاسنی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"تمھارے ساتھ روزی! دوسرے کے ساتھ ناچنے میں مجھے کچھ بھی خوشی نہیں ملتی۔"

بنکم بابو نے کاسنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

اُس کا خیال تھا، جب بھی وہ کاسنی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اُسے وہاں شراب سے بھرا ہوا ایک سمندر دکھائی دیتا ہے۔ اور اِس سمندر کی حسین موجیں اُسے اپنے آپ میں مدغم ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔

اُس نے اِنھیں آنکھوں کی خاطر دو ماہ پہلے کاسنی کے ساتھ شادی کی تھی کاسنی کو پہلی بار تاج میں ناچتے دیکھ کر اُسے اِن ہی آنکھوں نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اِن ہی آنکھوں نے اُسے ایمی فرگوسن کو بھلا دینے پر اُکسایا تھا۔ جس کے ساتھ اُس نے کئی سال پہلے شادی کرنے کا پلان بنایا تھا۔ ایمی فرگوسن، جب وہ ولایت میں پڑھتا تھا تو ایمی فرگوسن نے اُس کی جھولی میں اپنا سارا پیار ڈال دیا تھا۔ اُن دنوں وہ سوچا کرتا تھا کہ ایمی کے بغیر اُس کی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ اُن دنوں اُسے اپنی زندگی ایمی کے بغیر سُونی سُونی اور ویران معلوم ہوتی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا جب وہ ایمی کی آنکھوں میں اُتر کر دیکھتا ہے تو اُسے شیلے کا پورا دیوان مل جاتا ہے۔ لیکن کاسنی کی آنکھوں نے اُسے ایمی فرگوسن کو وہ جھولی واپس کرنے پر مجبور کیا تھا جس میں ایمی نے اپنا سارا پیار ڈال دیا تھا۔

بنکم بابو نے یہ بات شاید ولایت ہی میں سیکھی تھی کہ مرد عورت کی کسی خاص چیز کو دیکھ کر اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کاسنی کی آنکھیں دیکھ کر اُس نے ایمی کو بھلا دیا تھا۔ اور ایمی کی آنکھوں میں چھپے ہوئے شیلے کے دیوان کو ٹھکرا دیا تھا خیر یہ تو پرانی باتیں ہیں اور وہ پرانی باتوں کو سوچنا حماقت سمجھتا تھا۔

اُس نے کاسنی کی آنکھوں میں دیکھا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو پران کے ساتھ ناچ رہی ہوں۔ دیکھو ڈارلنگ! پران کے ساتھ ناچتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں ہوا میں اُڑ رہی ہوں۔ یا جیسے میں جھولے میں بیٹھ کر لمبی لمبی پینگیں بڑھا رہی ہوں۔"

کاسنی جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ رہی تھی۔

کاسنی کے اِن الفاظ کو سُن کر بنکم بابو کو ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے اُسے اُڑتے ہوئے طیارے سے دھکیل دیا گیا ہو۔ اور وہ فضا میں معلق رہ گیا ہو۔ لیکن وہ کاسنی کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اِس لئے اُس نے اِن الفاظ کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

"آل رائٹ! تم اُسی کے ساتھ ناچو۔ میں یہیں بیٹھ کر وقت کے راگ سُنتا رہوں گا۔"

اُس نے بالکل ہموار لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ ڈارلنگ! یُو آر گوڈ ایم سو سویٹ۔"

کاسنی نے ایک بار پھر آئینہ اُٹھا کر مختلف زاویوں سے اپنے چہرے کی دلکشی اور آنکھوں کے سحر کو دیکھا۔ اور پھر آئینہ میز پہ رکھ کر بنکم بابو پر ایک نظر ڈالتے ہوئے دروازے سے نکل گئی۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

کاسنی جب بھی اُس کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اُسے اپنے دل میں ایک میٹھے میٹھے درد کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور صوفے پہ بیٹھ کر اُسے یوں ہی ہنسی آ گئی۔ اُس نے سگریٹ سُلگا کر آنکھیں میچ لیں۔

لیکن ایک بار پھر اُسے اِس خوبصورت شام اور رنگین فضا کا خیال آ گیا۔ لیکن

لی۔ اُس نے فوراً سرا کش کھینچے بغیر ہی سگریٹ پھینک دیا۔ اور ہیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں بکھری ہوئی چاندنی کو دیکھ کر اُسے یکایک خیال آیا کہ آج کی رات سیر کرنے کی رات ہے۔

وہ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

شام کی سرد ہواؤں نے اُس کے چہرے پر پیار سے اپنا ہاتھ پھیرا۔ اُس نے مفلر اچھی طرح لپیٹ لیا اور سنسان سڑک پر چل دیا۔ ہال کے آرکسٹرا کی موسیقی دُور دُور تک اُس کا پیچھا کرتی رہی۔

چلتے چلتے اُسے خیال آیا وہ بہت خوش ہے۔ اور خوش اس لئے ہے کہ کامنی خوش ہے۔ کمرے سے جاتے وقت کامنی کی نگاہیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ خوش ہے اور جب کامنی اور اُس کی نگاہیں خوش ہوں تو یہ ضروری تھا کہ وہ بھی خوش ہو۔

اچھا اُن لوگوں کو خوش نہیں ہے۔ لیکن نہیں، وہ خوش ضرور ہے۔ اور خوشی کا احساس کرنے کے لئے وہ ایک انگریزی گیت گنگنانے لگا۔ جس سڑک پر وہ جا رہا تھا اُس کے ایک کنارے چند مزدور پتھروں کا چولھا بنا کر کچھ پکا رہے تھے۔ اُنھوں نے جب اس کا انگریزی گانا سُنا تو اُنھیں ہنسی آگئی۔ جاہل کہیں کے!

بنکم بابو نے چاہا کہ وہ اِن مزدوروں کو خوب پیٹے۔ اتنا پیٹے کہ سب کے سب بے ہوش ہو جائیں۔ آخر یہ کہاں کی تہذیب ہے کہ کوئی راہ چلتے گانے لگے اور تم اُس کی ہنسی اُڑاؤ۔

"سوائن — ایڈیٹ — کوئی تمیز نہیں اِن لوگوں کو۔ سڑک پر بیٹھ کر اپنے آپ کو لارڈ اور ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔ جاہل! کُتّے!!"

وہ بڑبڑانے لگا۔

مزدور بنکم بابو کے اِس بڑبڑانے کو بھی انگریزی گیت کا ایک حصہ سمجھنے لگے اس لئے اُن کی ہنسی اب قہقہہ بن کر پھوٹ پڑی۔

بنکم بابو کو اور غصہ آیا۔ اور اُس نے آگے بڑھ کر ایک مزدور کو بوٹ سے ٹھوکر ماردی۔

"حرامزادہ — کمینہ!"

مزدور پہلے تو سہم گئے۔ لیکن بعد میں اُن کی حس بیدار ہو گئی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

"ہم کیا کیا صاحب؟ کیوں رعب جماتے ہیں؟"

"تم کیوں ہنس رہے تھے؟ — ایڈیٹ!" بنکم بابو کا غصہ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

"ارے تم غلطی ہے صاحب! میں اڈیٹا نہیں ہے۔ میں تو ہجالمہے۔"

مزدور سمجھا کہ وہ اُسے کوئی اڈیٹا سمجھ کر مار رہا ہے۔ لیکن وہ اڈیٹا نہیں ہے اسلئے اُس کا احتجاج حق بجانب ہے۔

یکایک بنکم بابو کو ہنسی آگئی۔ لیکن غصہ اور یہ ہنسی! اُس نے تعجب سے ایک بار پھر اپنے ذہن کے پردوں سے غصّے کو اُبھارنا چاہا۔ جس کے تحت اُس نے مزدور کو ٹھوکر ماری تھی لیکن نہ جانے غصہ کہاں بھاگ گیا تھا۔ اور اُس کے بدلے ہنسی ایک جھرنا بن کر پھوٹ رہی تھی۔

"اچھا اچھا! اڈیٹا کوئی دوسرا ہوگا۔ کہہ کر بنکم بابو جانے لگا۔

کمبختوں نے سارا موڈ ستیاناس کر دیا۔ وہ چلتے چلتے سوچنے لگا۔ اور سوچتے سوچتے چلنے لگا۔

چاند اب جھیل کی پھُنگوں سے بہت اُوپر چڑھ آیا تھا۔ اور یہاں کھُلی چاندنی میں اُدھر کے پتھروں پر پھِسل پھِسل کر بہتا ہوا پانی، بہتی ہوئی چاندنی کا منظر دکھا رہا تھا۔ بنکم بابو نے سوچا، پھر وہ کوئی انگریزی گیت گنگنائے۔ لیکن اُس کے ذہن میں کوئی گیت نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر سر کو جھٹک دیا۔ اور واپس ہوٹل کی طرف جانے لگا۔

جب وہ پھر مزدوروں کے پاس سے پاس سے گزرا تو وہ کھانا کھا رہے تھے۔ چار چار آدمی ایک ساتھ۔

کتنے وحشی ہیں یہ لوگ! ہمارے ہاں کُتّے بھی اِس طرح کھانا نہیں کھاتے بنکم بابو نے سوچا اور مُنہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"سلام صاحب! کھانا کھائیں گا؟"

مجلنے نے پوچھا۔

"نہیں!"

بنکم بابو نے قدرے زور سے کہا۔ اتنی زور سے کہ ایک آدمی کا نوالہ ہاتھ سے گر گیا۔ اُسے اُبکائی سی آنے لگی لیکن ساتھ ہی اُن لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھ کر

اُسے دیکھتے ہی رہنے کی خواہش بھی ہوئی۔

وہ کچھ دُور ایک پتھر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔

مزدور چاول کھاتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کا نوالہ چھین لیتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے مُنہ میں اپنے ہاتھوں سے نوالہ دیتے تھے اُن میں سے ایک مزدور جو کھانا کھا چکا تھا، ایک پتھر کی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے پہلے دھیمے سُروں میں گنگنانا شروع کیا۔ پھر ذرا زور سے گانے لگا۔ گانے کے بول بنکم بابو سمجھ نہ سکا۔ لیکن گانے کا سوز اور مٹھاس اُس کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ اُس نے گانا سُنتے سُنتے ایک بار پھر قدرت کی بہتی ہوئی چاندنی کی طرف دیکھا۔ لیکن اب کی بار وہ چونک گیا کیونکہ اب کی بار اُسے یہ منظر بہت ہی حسین دکھائی دیا۔ اُس نے جھیل کی پُراسرار شاخوں کی طرف دیکھا۔ جو چاندنی کے شہد میں نہا رہی تھیں۔ اُس نے دُور دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف دیکھا۔ جو سفید اوڑھنیوں میں چھُپی ہوئی الھڑ حسیناؤں کی طرح حسین اور خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے دُور دُور تک پھیلے ہوئے مکانوں اور اُن کی چھتوں کو دیکھا۔ جو اِس پُراسرار چاندنی میں بگلے کے پروں کی طرح اُجلے اُجلے اور دل کش نظر آتے تھے۔ اور یہ دیکھتے ہوئے مزدور کا گیت سُنا۔ جو شیلے کی ایک جیتی جاگتی نظم معلوم ہو رہا تھا۔

اور وہ اِس حُسن اور اِن مناظر میں کھو گیا۔

کھویا ہی رہا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اپنے آپ کو حُسن کے اِس طلسم میں بھٹکنے دیا۔ چاندنی کی اِن بھُول بھُلیوں میں کھونے دیا۔ شراب کے اِس سمندر میں ڈوبنے دیا۔ یہاں تک کہ مزدور بھی کھا پی کر سو گئے۔ اور گیت بھی بند ہو گیا!

اُس نے پتھر سے اپنے آپ کو جھنجھوڑتے ہوئے اُٹھایا۔ اِس حسین ماحول پر ایک آخری نظر ڈالی۔ مزدوروں کی طرف دیکھا جو اب سڑک کے کنارے ہی سو گئے تھے۔ اور ہوٹل کی طرف واپس چل دیا۔

چلتے چلتے اُسے خیال آیا، آج تک اُس نے پہلگام کو دیکھا ہی نہ تھا۔ آج تک اُس نے شیلے کی نظموں کو پڑھا تو تھا مگر سمجھ نہ سکا تھا۔ آج تک اُس نے کامنی کی آنکھوں میں چھُپے ہوئے ساگر کو دیکھا تو تھا، لیکن اُس میں ڈوب نہیں گیا تھا۔ کامنی جس کے ساتھ وہ ہنی مون منانے یہاں آیا تھا۔

آج اُس کے دماغ میں شاعری کا طوفان اُمڈ آ رہا تھا۔

اُس نے سوچا ——————

آج کی رات، واقعی ایک یادگار رات ہے!

آج وہ کامنی سے خوب پیار بھری باتیں کرے گا!!

یہ سوچتے ہوئے جب وہ ہوٹل میں داخل ہوا تو ہال کا آرکسٹرا ختم ہو گیا تھا۔ بہت سے کمروں کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اور چند کمروں سے مصنوعی ہنسی کے فوارے چھُوٹ رہے تھے۔

برآمدے میں اُسے دو سائے دکھائی دیئے جو مِلے جُلے کھڑے تھے۔

"پُور ہنی مونرز! (POOR HONEY MOONERS)" اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ پھسل پڑے۔

اور ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں پر ہنسی مچل اُٹھی۔

"پیارے ڈارلنگ! تم کتنے پیارے ہو!"

وہ چونک گیا۔

یہ کامنی کی آواز تھی۔ اِس آواز کو وہ ایک میل سے پہچان سکتا تھا۔

اُسے سناٹا آ گیا۔

"کامنی ڈیئر! تم شراب سے بھی زیادہ سُوئیٹ ہو!" ایک اور آواز اُبھری۔

"تمہارے ساتھ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ازل ہی سے ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں" کامنی کہہ رہی تھی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تمہارے ہسبنڈ آتے ہوں گے۔"

"اچھا، بائی بائی —— کل صبح تک!"

کامنی نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اور لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

بنکم بابو نے چلنا چاہا۔ لیکن اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہوں۔ اُس کے سارے خواب ڈھے جانے والے اُونچے محل کی طرح زمین پر گر کر بکھر گئے۔

وہ مری ہوئی چال سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو کامنی کچھ گنگناتی ہوئی کمرے میں ٹہل

قُدرت کی نعمت

پانی

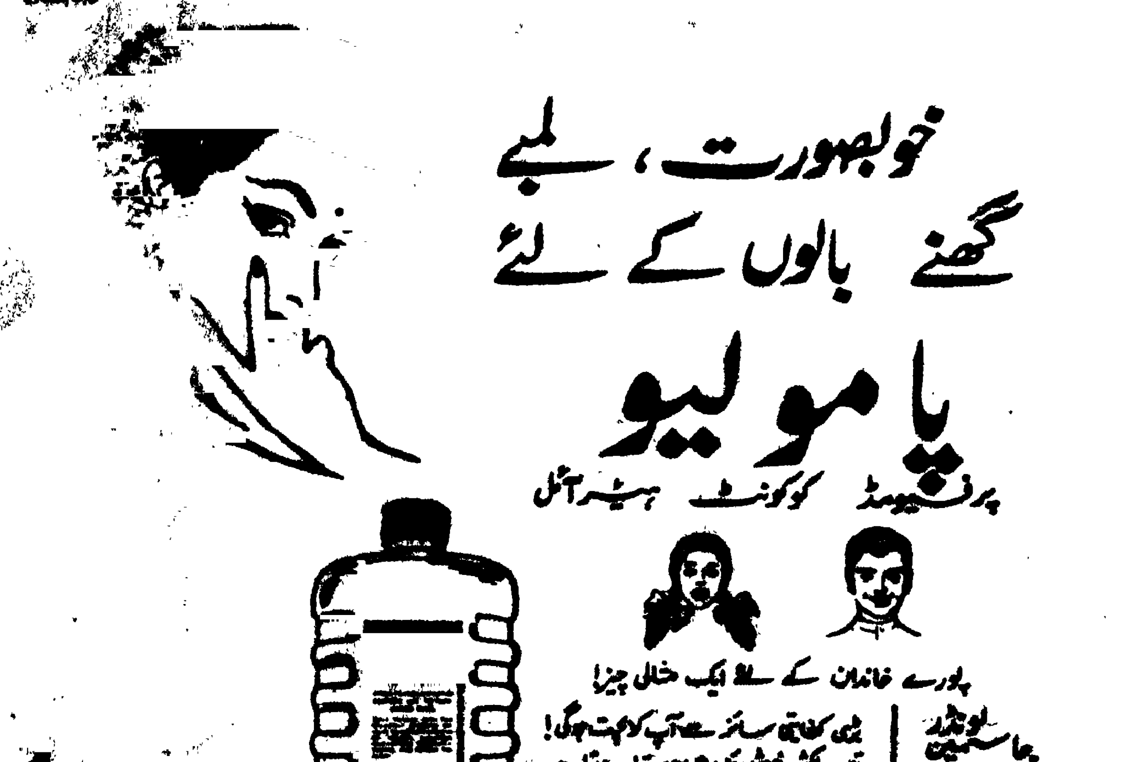


پانی جو ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ جو ہمارے جسموں کو صاف کرتا ہے۔
جو ہماری پیاس بُجھاتا ہے۔ بھگوان کی یہ نعمت ہم سبھی کے لئے ہے۔
آؤ — ہم برادرانہ جذبے سے متاثر ہو کر اپنے دلوں کے دروازوں کو
کھولیں اور ہریجنوں کا اُسی طرح سواگت کریں جس طرح اپنے بھائی بہنوں کا کرتے ہیں۔

چھُوت چھات کو چھوڑ دو
دِل کو دِل سے جوڑ دو

"ہندو شاستروں میں چھُوت چھات
جیسی کوئی چیز نہیں ہے....."
مہاتما گاندھی


کولگیٹ کلوروفل
مسوڑوں کے ریشوں کو مضبوط بناتا ہے
مریضوں پر کی ہوئی آزمائشیں ثابت کرتی ہیں!
مسوڑوں پر معمول کے مطابق کئے سے کولگیٹ کلوروفل ٹوتھ پیسٹ کلوروفل کے کارگر فائدے آپ تک پہنچاتا ہے۔
کولگیٹ کلوروفل سے کی جانے والی ہر برشنگ
• مسوڑوں کے ریشوں کو مضبوط بناتا ہے
• سانس کی بدبو کو زیادہ کارگر طور پر نابود کرتا ہے
• منہ کو دانتوں میں سڑن پیدا کرنے والے جراثیم سے نجات دلاتا ہے
اس سے زیادہ کارگر کلوروفل کسی دوسرے ٹوتھ پیسٹ میں نہیں ہے
اب! بڑی اکانومی سائز میں ملتا ہے
COLGATE
CHLOROPHYLL
بچے اس کی پیپرمنٹ جیسی مرغوب لذت کو پسند کرتے ہیں
اس میں پانی میں حل ہوجانے والی کلوروفلین ہے


خوبصورت، لمبے
گھنے بالوں کے لئے
پامولیو
پرفیومڈ کوکونٹ ہیئر آئل
پورے خاندان کے لئے ایک خاص چیز!
بڑی کفایتی سائز سے آپ کو بچت ہوگی!
تین دلکش خوشبوؤں میں دستیاب ہوتا ہے:
لونڈر
جاسمین
روز

رہی تھی بنکم بابو کے دل میں چنگاریاں سی بھڑک رہی تھیں۔ اُس نے سامنے پڑی ہوئی تپائی کو زور سے ٹھوکر ماری۔ جو ایک چھناکا بکھیرتی ہوئی دُور جا گری۔

کامنی چونک گئی۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ؟"

اُس نے بنکم بابو کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کرنا چاہیں۔

لیکن وہ اُس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلتے ہوئے اپنے بستر کی طرف آیا۔ اور دھڑام سے اُس پر جا گرا۔

"ڈارلنگ! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

کامنی نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے سرسام ہو گیا ہے!" اُس نے بے رُخی سے جواب دیا۔

بستر پر پڑے بنکم بابو نے سوچا، اُسے واقعی سو جانا چاہیئے۔ اُس نے سونے کی بہت کوشش کی۔ لیکن نیند نہ جانے کن وادیوں میں کھو گئی تھی۔ اُسے رہ رہ کر کامنی کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اور یاد آ کر دل میں ایک طوفان برپا کر رہے تھے۔

"تمھارے ساتھ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ازل ہی سے ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں"

لیکن یہ الفاظ کامنی کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ پہلی رات جب کامنی اس کی دُلہن بنی تھی اُس نے یہی الفاظ اِس سے بھی کہے تھے۔

"بنکم ڈارلنگ! کیا تمھیں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ازل ہی سے ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں!"

اور اُس رات بنکم بابو بھی اِن الفاظ کی حرارت اور اِن الفاظ کا پیار محسوس کر کے یہی سمجھنے لگا تھا کہ وہ ازل ہی سے ایک دوسرے کیلئے بنائے گئے ہیں۔

لیکن آج کامنی یہی الفاظ ایک دوسرے سے کہہ رہی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر نیند کی آغوش میں جانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا۔ کامنی دوسرے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ دھیرے سے اُٹھا اور الماری سے شراب کی بوتل نکال لی۔ اُس نے ایک گلاس لبالب بھر کر اُسے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار دیا۔ لیکن یہ کیسی پیاس تھی جس سے اُس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک اور گلاس حلق سے نیچے اُنڈیلا لیکن پیاس؟ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ صدیوں سے پیاسا رہا ہو۔ اُس نے ایک اور گلاس بھر کر چڑھا لیا۔

اب اُسے چکر آنے لگا تھا۔

اور وہ آ کر بستر پر لیٹ گیا۔

صبح جب کامنی بیدار ہو گئی تو اُس نے دیکھا بنکم بابو ابھی تک سو رہا ہے۔ اُس نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر چند ناخوش گوار لکیریں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ اور وہ کپڑے اور بوٹ اُتارے بغیر ہی سو رہا تھا۔

کامنی کو ہنسی آ گئی۔

کہتا تھا سرسام ہو گیا ہے مجھے۔ اُس نے سوچا۔ اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر بنکم بابو کی پیشانی کو چوم لیا۔

پھر اُس نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

"ڈارلنگ! دس بج رہے ہیں اور تم ابھی تک سو رہے ہو!"

بنکم بابو نے آنکھیں کھولیں۔ اور ساتھ ہی اُس کے دل کے کسی گوشے میں وہ ہلکی ہلکی چبھن بیدار ہو گئی۔

"ہوں ——"

اُس نے مُنہ دوسری جانب پھیر لیا۔ کامنی حیران رہ گئی۔

"ڈارلنگ! تم آج بولتے کیوں نہیں؟" اُس نے ہنسی کا جال اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

بنکم بابو کو ہنسی کے اِس جال میں کانٹے ہی کانٹے نظر آئے۔ مچھلیوں کے شکاری بھی لاگ ایسے ہی جال استعمال کرتے ہیں۔ اُسے خیال آیا۔

"آج ہم مچھلی کا شکار کریں گے روز!" اُس نے روز کہتے کہتے کڑوا مُنہ بنایا۔

"آج نہیں ڈارلنگ۔ آج میں مسٹر پران کے ساتھ چندن واڑی جا رہی ہوں —— گھوڑے پر!" کامنی نے مچلتے ہوئے کہا۔

"کامنی ——!"

یکایک بنکم بابو چیخ پڑا۔ کامنی سہم گئی۔

"کیا بات ہے ڈیر؟" اُس نے رُک رُک کر پوچھا۔

"تم آج پران کے ساتھ نہیں جاؤ گی" بنکم بابو نے سختی سے کہا اور اُٹھ کر

کمرے سے باہر نکل آیا۔

آج تک بنکم بابو نے کبھی اتنی سختی سے بات نہ کی تھی۔ اِس لئے کامنی کی حیرانی بجا تھی۔ اُس نے سوچا، بنکم بابو کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ کہیں واقعی اسے سرسام تو نہیں ہو گیا ہے؟ آخر میں پران کے ساتھ کیوں نہ جاؤں گی، وہ کیوں مجھے روک سکتا ہے، کیا صرف اس لئے کہ وہ میرا ہسبینڈ ہے؟

اور اچانک کامنی نے محسوس کیا کہ اُس کی پلکیں بھیگ رہی ہیں۔ اُس کی پلکیں اِس لئے نہیں بھیگ رہی تھیں کہ بنکم بابو نے اُسے چندن واڑی جانے سے روکا تھا بلکہ اِس لئے کہ آج اُسے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اُس نے غلط آدمی سے شادی کی ہے! اُسے اپنی سہیلی مسز گدگھ والا یاد آئی جس کا شوہر اُسے دوستوں سے ملنے کو کبھی منع نہیں کرتا تھا۔ آخر دوستوں کے بغیر زندگی کا کیا لطف آتا ہے؟ وہ ہمیشہ سے اُن عورتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی جن کا خیال تھا کہ عورت کو اپنے پتی کے چرنوں ہی میں زندگی گزار کر راحت ملتی ہے۔ ہُنہہ! غیر مہذب عورتیں۔ اِن ہی عورتوں نے تو ہندوستان کو ترقی کرنے سے روکا ہے ورنہ ہندوستان کب کا پیرس کی طرح ترقی یافتہ اور مہذب ملک بن گیا ہوتا۔ وہ سوچا کرتی۔

اور یہ سوچتے ہوئے اُسے یکایک محسوس ہوا کہ اُس نے بنکم بابو سے کبھی محبت نہ کی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ ولایت رہ کر آیا ہے، خیالات تو اُس کے بھی وہی دقیانوسی ہیں۔

بنکم بابو کمرے سے باہر نکل آیا تو صبح کی سرد ہوا نے اُس کے انگ انگ سے تھکن کو زائل کر دیا۔ وہ چپ چاپ سیڑھیاں اُتر کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر گون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج اُس کے دماغ میں یہ طوفان کیوں برپا ہے۔ کیوں اُس کے دل میں کوئی چیز چُبھتی جا رہی ہے نیچے ہی نیچے، اندر ہی اندر۔

"صاحب اِسلام"

اُس کے سامنے سجانا کھڑا تھا۔ وہ دیر تک اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اُسکے چہرے کی ایک ایک لکیر میں ایک ایک ہنسی پنہاں تھی۔ اُس کی قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔

بنکم بابو نے سوچنے کی کوشش کی کہ اِس سردی میں پھٹی ہوئی قمیص پہن کر بھی کیوں یہ مزدور مسکرا رہا ہے۔ اور وہ خود ایک اچھا ڈریسنگ گون پہن کر بھی مسکرا نہیں سکا۔ اُسے خیال آیا اگر مسکراہٹ کہیں بکتی تو وہ اپنی ساری دولت دے کر اُسے خرید لیتا۔ اور اپنے چہرے کی لکیروں میں چھپا رکھتا۔

"صاحب اڈیٹا مل گیا؟ ہم بھی بہت ڈھونڈا"

مزدور معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ اور اڈیٹا ڈھونڈنے کی جرأت کرنے پر خود شاید فخر بھی محسوس کر رہا تھا۔ بنکم بابو کے چہرے پر بھی ایک زہرخند پھیل گیا۔ کتنا سادہ، کتنا معصوم ہے یہ آدمی!

وہ دیر تک مزدور کے چہرے کو تکتا رہا۔ اور ہر بار اُسے اِس چہرے میں کوئی پہچانی صورت نظر آتی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی بُنیادی چیز ہے جو ہم دو انسانوں میں مشترک ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو ہم دو آدمیوں میں یکساں ہے۔ اگر کوئی فلسفی مفکر زندہ ہوتا تو وہ یہ بات اُس سے ضرور پوچھتا۔

"اڈیٹا مل گیا تو ہم بولیگا، شہر گیا ہوگے"

مزدور پھر کہہ رہا تھا۔

"ایڈیٹ مل گیا!" بنکم بابو نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔

"کدھر؟" مزدور نے تعجب سے پوچھا۔

"ایڈیٹ تو میں ہی ہوں"

بنکم بابو نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

تھوڑی دُور چل کر اُس نے محسوس کیا کہ اُسے ابھی واپس جانا چاہیئے۔ یہاں پہاڑ کی ہوائیں شاید اُسے راس نہیں آئی تھیں۔ لیکن نہیں، بمبئی میں بھی وہ چین سے نہ رہ سکے گا۔ وہاں بھی کوئی پران یا جیون یا کوئی آشا یا نیلا اُس کے زخموں کو کھول کے رکھ دیں گے اور اِس ایک لمحے میں اُسے خیال آیا کہ وہ ہوٹل واپس چلا جائے اور اپنا آٹومیٹک نکال کر پران اور کامنی دونوں کو موت کی آغوش میں سُلا دے۔

یہ خیال آتے ہی اُسے انتہائی تھکن کا احساس ہوا۔ اور وہ ایک دیودار کے نیچے بیٹھ کر سستانے لگا۔

اُس کے سامنے سے مویشیوں کے ریوڑ گزر رہے تھے۔ ممیاتی ہوئی بھیڑیں گزر رہی تھیں اور اِن ریوڑوں کے ساتھ ساتھ چرواہے اور چرواہیاں گزر رہی تھیں۔

ان وہ ان سب سے بے نیاز دُور خلاء میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ یہ جوڑے اور چرواہے اور چرواہیاں چلتے بلتے مسکراتے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف پیاری پیاری نظروں سے دیکھتے جاتے تھے۔

اُسے اُن کی ہنسی دیکھ کر خیال آیا کہ آج تک اُسے کسی نے ایسی پیاری پیاری نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اور اپنی اِس محرومی کا احساس ہوتے ہی اُسے اِس ہنسی سے کوفت ہونے

"بند کرو یہ ہنسی!" وہ زور سے چیخا۔

لیکن ہنسی کو آج تک کوئی بند کرا سکا ہے؟ چرواہے اُس کی چیخ سُن کر اور بھی زور سے ہنس پڑے۔ وہ اور جھنجھلایا۔ اور اُس نے زور سے درخت کے تنے پر ایک مُکا مارا۔ اُس کا ہاتھ بُری طرح دُکھنے لگا۔

اور اسی وقت جب وہ اپنے ہاتھ کو دھیرے دھیرے ہلا رہا تھا اُسے کامنی دکھائی دی گھوڑے پر سرپٹ چلی آ رہی تھی۔ اُس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اور اُس کے گالوں پر خون کی سُرخیاں تڑپ رہی تھیں۔ اور کامنی کے پیچھے ہی دوسرے گھوڑے پر پران آ رہا تھا جس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی۔ کامنی جب اُس کے پاس سے گزر گئی تو اُس نے نظر بنکم بابو پر بھی ڈال دی۔

"ٹا۔۔۔ٹا۔۔۔ڈارلنگ!"

اُس نے دُور ہی سے ہاتھ ہلایا۔ اور چلی گئی۔ کامنی کا پیار اِس ایک لفظ ڈارلنگ ہی محدود ہے پیارے۔ کسی نے اُس کے اندر سے کہا۔

کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ دل ابھی پھٹ پڑے گا۔ اور پھیپھڑے خون اُگلنے لگیں گے۔ کبھی کبھی ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے جیسے دماغ کی ایک ایک رگ پھٹ جائے گی اور سر کے کئی حصے ہو جائیں گے؟ اُس نے سوچا۔ لوگ جھوٹ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت فرانس کی عورت یا امریکہ کی عورت سے مختلف ہے۔ عورت ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے صرف پُرانی بوتل بدلنے کی دیر ہے۔ اور یہ بوتل اب آہستہ آہستہ بدل رہی ہے۔ اُس نے دل میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

لڑکھڑاتے ہوئے اور بے ہنگم چال سے جب وہ ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو اُس نے چاروں طرف ایک غمگین نگاہ ڈالی۔ صبح کی پیاری پیاری دھوپ میں آس پاس کے پہاڑ چمکتے نظر آ رہے تھے۔ گھاس پر شبنم کے قطرے اب بھی چمک رہے تھے۔ موتیوں کی طرح، اور اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو چندھیا دیتے تھے۔

وہ جلدی جلدی ہوٹل کی سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اور دروازہ اندر سے بند کر کے ہانپنے لگا۔ پھر اُس نے گون اُتار کر دُور کونے میں پھینک دیا۔ اور تیزی سے کپڑے پہننے لگا۔ اُس کی نظر سامنے پڑے ہوئے میز پر پڑی۔ اُس پر کامنی کے میک اَپ کی چیزیں پڑی تھیں۔ اُس نے وہ سب اُٹھا کر کھڑکی سے نالے میں پھینک دیں پھر کامنی کے سینڈلوں کو ٹھوکریں مار مار کر کمرے میں تتر بتر کر دیا۔ اُس کے آئینے پر لپ اسٹک سے چند ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنائیں۔ جیسے اُس تہذیب اور اُس سوسائٹی کا حلیہ بگاڑ دینا چاہتا ہو جس نے کامنی اور اُس کے اندر چھپی ہوئی عورت کو جنم دیا تھا اُس کے کیپ کو نوچ ڈالا جس سے وہ اپنے خوبصورت شانوں کو ڈھک لیتی تھی۔ اُس کی ساڑیوں کو تار تار کیا جنھیں وہ کبھی محبت سے لا لا کر اُسے دیتا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اُس کی نظر کامنی کے فوٹو پر پڑی۔ اُس نے نفرت سے اُسے اُٹھا کر فرش پر پٹک کر چکنا چور کر دیا۔

اور پھر کھڑے کھڑے سارے کمرے کا جائزہ لے کر باہر نکل آیا۔

جب وہ سڑک سے گزر کر بس اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا تو اُسے وہ مزدور یاد آئے جو کل رات اِسی سڑک کے کنارے کھانا پکا رہے تھے، مسکرا رہے تھے، گیت گا رہے تھے لیکن آج یہ سڑک ویران سی لگتی تھی۔ کیونکہ آج وہاں مزدور نہ تھے۔ بلکہ پتھروں کا بنا ہوا وہ چولھا تھا۔ ویران اور گُم سُم!

چولھے کو دیکھ کر اُسے اُبکائی نہیں آئی۔ بلکہ اُن غیر مہذب انسانوں کی یاد پیار بن کر آ گئی۔

اُسے محسوس ہوا، اُس کے دل میں آج ایک خواہش جاگ اُٹھی ہے۔ اور زندگی میں پہلی بار جاگ اُٹھی ہے۔ کہ وہ بھی اِن مزدوروں کے ساتھ کھانا پکا کر کھائے۔ اور پھر اُن کے ساتھ ہی گائے۔

اور جب کھانا کھا کر، گیت گا کر اُسے نیند آئے تو وہ وہیں سڑک پر ایک پتھر سرہانے رکھ کر سو جائے!

اور پھر دیر تک سوتا ہی رہے

غزل

از

جناب روشن نگینوی

یہ تو ہمارا حُسنِ طلب ہے اِس کو ہوس کا نام نہ دے
جا کہنہ دے لیکن ساقی بدنام نہ کر الزام نہ دے

ایسی مسرت سے کیا حاصل جس کا نتیجہ غم نکلے!
ایسے دوست سے غیر اچھا جو وقت پڑے تو کام نہ دے

جن حالات کا شکوہ ہے وہ اپنے ہی پیدا کردہ ہیں
گردشِ دوراں کو ہمدم مطعون نہ کر دشنام نہ دے

ملاحوں نے لا کے سفینہ بیچ بھنور میں چھوڑ دیا
ملاحوں کا فرض یہی تھا اُن کو کوئی الزام نہ دے

میں نے ترے ہر ایک ستم کو عینِ کرم گردانا ہے
میری وفاؤں کی تُو مجھ کو داد تو دے انعام نہ دے

غزل

از

محترمہ سلطانہ نکہت ایلر کوٹلوی

پھر اپنے آپ سے بھی رسم و راہ کر نہ سکے
ہم اُن کے بعد کسی سے نباہ کر نہ سکے

شکایتیں تو ہمیں بے حساب تھیں، لیکن
حضورِ دوست جو پہنچے تو آہ کر نہ سکے

کچھ اُن کی یاد سے یُوں زخمِ دل ہوا تازہ
بھری بہار میں پھولوں کی چاہ کر نہ سکے

ہمارے ذوقِ محبت کو داد دے اے دوست!
تباہ ہو تو گئے ہم تباہ کر نہ سکے

دلِ حزیں نے ہزاروں ستم سہے لیکن
وہ ایک بار کرم کی نگاہ کر نہ سکے

یہی گناہ تھا اہلِ وفا کا اے نکہت
گناہگار تو ٹھہرے گناہ کر نہ سکے

غزل

از

جناب بشوا ناتھ [illegible]

دلِ شکستہ کے تاروں کو پھر جھنجھوڑ دیا
فغاں کہ ضبطِ فغاں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا

نہ جانے کون سی دُنیا کے خواب دیکھے تھے
نہ جانے کون سی دُنیا میں تم نے چھوڑ دیا

وفورِ شوق نے جب بھی کیا مجھے بے خود
ترے خیال نے احساس کو جھنجھوڑ دیا

مری حیات کی محرومیاں معاذ اللہ
کسی کی یاد نے سینے میں سانس توڑ دیا

ملی ہے دادِ سخن اب مجھے زمانے سے
بہ شکلِ شعر لہو دل کا جب نچوڑ دیا

افسانہ

جہاں زندگی حسین ہے

از

جناب اختر عادل رُوپ

جامع مسجد قلعہ۔ بریلی۔ اُتر پردیش

محترمی! آداب

پچھلے دنوں اپنے وطن مارہرہ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جب میں یہاں واپس آیا تو مجھے وہاں کے قدرتی مناظر اور سادہ ماحول کی یاد آنے لگی۔ وہاں رہ کر میں سچ مچ اپنی زندگی کے دُکھ بھول گیا تھا۔ اور سبزہ زاروں میں گھومتے ہوئے میں نے عجیب سکون کا احساس کیا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ انسان کی بنائی ہوئی مصنوعی دُنیا اُس کے سامنے کتنی جھوٹی اور تکلیف دہ ہے۔ میرے دل میں اُسی قدرتی ماحول میں زندگی گزار دینے کی چاہت ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ اِس سے متاثر ہو کر میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ اِسے مکمل کرنے کے بعد مجھے کسی حد تک تسکین مل گئی ہے۔ اگر آپ بھی اِسے پڑھ کر ایسا ہی محسوس کریں گے تو میں سمجھوں گا میری محنت کامیاب ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے سچ کہا ہے۔ اپنی رائے ضرور لکھئے۔

مخلص

اختر عادل رُوپ

مجبور ہو کر آپ کو یہ پرچہ لکھ رہی ہوں تاکہ آپ بے خود بنے وہاں تک نہ پہنچ جائیں جہاں سے آپ کو تنہا لوٹتے ہوئے دُکھ ہو۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے میں اپنے کمرے کے جنگلے میں صرف اِس لئے آ بیٹھتی ہوں کہ ذرا ہوا پا سکوں۔ اور کچھ پڑھ سکوں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے اِتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی راہ گیر سے ہو سکتی ہے، مجھے اُمید ہے کہ آئندہ آپ سامنے اپنے کمرے میں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کریں گے۔ اور مجھے بھی خواہ مخواہ کی اُلجھن سے نجات دیں گے۔ شکریہ!

آپ نے بھی مجھے غلط سمجھا ہے۔ آپ سے مجھے بھی اِتنی ہی دلچسپی ہے جتنی سڑک پر چلتی کسی لڑکی سے ہو سکتی ہے لیکن میرے فن کو آپ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے میرا نام المنظر ہے اور میں تصویریں بنایا کرتا ہوں۔ ممکن ہے کسی نمائش میں آپ نے میری بنائی ہوئی تصویریں بھی دیکھی ہوں۔ آجکل میں آپ کی ایک تصویر بنا رہا ہوں۔ اُس کی تکمیل کے بعد آپ مجھے اِس طرح بیٹھا نہ پائیں گی۔ اور اگر ارشاد ہوگا تو میں یہ کمرہ بھی چھوڑ دوں گا لیکن مجھے اُمید ہے کہ تصویر مکمل ہونے تک آپ مجھے اِسی طرح بیٹھی نظر آئیں گی۔ شکریہ!

المنظر صاحب!

بہت خوشی ہوئی آپ کا پرچہ پڑھ کر۔ میں نے آپ کی بنائی ہوئی چند تصویریں دیکھی ہیں۔ بہت اچھی تھی وہ تصویر جس میں ایک لڑکی پھولوں کے پودے کے نیچے


Rexona
BLENDED WITH CADYL
اب... ریکسونا
پہلے سے کہیں زیادہ خوشبودار ہے

اندھیرا اُجالا

افسانہ

از

جناب مخمور حسین

بدنصیبی منزل۔ میرہ محلہ۔ سرینگر

خوشتر بھائی! مجتبیٰ!!

اِس پاکیزہ دھرتی پر قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور خودکشی کے نظارے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ لُوٹ کھسوٹ، چھینا جھپٹی اور بے رحمی کا سماں چھایا ہی چلا جا رہا ہے۔ آخر کیوں؟ جواب اِس کہانی "اندھیرا اُجالا" میں موجود ہے ——— آپ انسان کا مستقبل روشن بنانے کے لئے بیسویں صدی کی شمع کو اپنے مقدس لہو سے روشن کئے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی اِس کہانی کو خونِ جگر ہی سے لکھا ہے۔

نیازکیش

مخمور حسین

شنکر نے کمرے کی کھڑکی تک پہنچی ہوئی دھوپ سے اندازہ لگایا کہ ساڑھے نو بج گئے ہیں۔ اُس نے رات کی بچی ہوئی روٹی ماں سے مانگ کر کھائی۔ جگہ جگہ پیوند لگا ہوا کوٹ کھونٹی سے اُتار کر جلدی جلدی پہن لیا اور اپنے مالک سیٹھ مادھو رام کی دکان کی طرف چلا نکلا راستے میں اُسے سیٹھ جی کی کوٹھی سے بھی گزرنا پڑا۔ یہاں پہنچکر اُسے کامنی یاد آئی ہنس مکھ اور حسین کامنی! اِس وقت اُس نے خود کو سیٹھ جی کا منشی تصور نہیں کیا۔ بلکہ ایک مرد، ایک جوان مرد، اور کامنی بھی اُسے سیٹھ جی کی لڑکی نہیں، ایک جوان دل والی لڑکی ہی دکھائی دی۔ اندر سے وائلن بجانے کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ کامنی ہی تو ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھاٹک کے قریب چند منٹ ٹھہرا۔ پھاٹک پر ایک لیٹر بکس بھی لگا تھا۔ کاش وہ اِس میں کامنی کے نام ایک خط ڈال سکتا۔ وہ اِسے سمجھ سکتی۔ اِس کے دل کی دھڑکنوں کو گن سکتی! یہ خیال بھی گزر گیا۔ اور اُس کی نگاہیں لیٹر بکس کے بائیں طرف کے سوراخ پر جم گئیں سڑک پر بہت سے آدمی چل رہے تھے۔ لیکن اُس نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور اپنی ایک آنکھ سوراخ سے لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ سب سے پہلے اُس کی نظر کوٹھی کے اُوپر والی منزل پر ٹھہری۔ جہاں کامنی کا کمرہ تھا۔ جہاں اکثر اُس نے کامنی کو دیکھا تھا۔ لیکن آج کمرے کی ساری کھڑکیاں بند دیکھ کر وہ پریشان سا ہوا۔ وائلن کی آواز اُسی طرح اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اور پھر اچانک اُس کی نظر کے سامنے کامنی آ گئی۔ گلاس کے درخت کے نیچے وائلن پر کامنی کی پتلی پتلی اُنگلیاں ناچ رہی تھیں۔ اور تھرک رہی تھیں۔ اُس کے لبوں سے نکلتے ہوئے میٹھے میٹھے بول وائلن کی دلکش اور دلفریب آوازوں کے ساتھ فنکارانہ انداز سے گھل مل رہے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اِن پتلے پتلے سرخ لبوں سے نکلتے ہوئے میٹھے میٹھے بول صرف اُس کے لئے ہیں۔ اور اِن مدھر مدھر گیتوں میں وہ اُسے کچھ کہہ رہی ہے۔ جب گاتے گاتے سر کی جنبش سے کامنی کے بکھرے بکھرے بالوں کا کوئی گُچھا اُس کے سرخ و سپید چہرے پر لہرانے لگتا تھا اور کامنی اُسے سر کے ایک ہی جھٹکے سے پیچھے ہٹا لیتی تو وہ سمجھ لیتا تھا کہ اِس جھٹکے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ کامنی اُسے بُلا رہی ہے وہ اِس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس نے اپنے جسم میں کوئی لاوا سا اُبلتے محسوس ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی پھاٹک کے دو ٹکڑے کر کے کامنی کے پاس پہنچ جائے ——— اُسی وقت اُس نے اپنی ٹانگوں پر کوئی حرکت سی محسوس کی۔ مڑ کے دیکھا تو کامنی کا کالے کالے اور گھنے گھنے بالوں والا کُتا اُس کے پاجامے کو چاٹ رہا تھا۔ اُسے کُتے پر بہت غصہ آنے لگا لیکن پھر

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اِس حرکت سے بہت خوش ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب کامنی کا کُتا صرف اُس کے پاؤں ہی کو نہیں، بلکہ سارے جسم کو چاٹتا ہے۔ جیسے کامنی ہی اُس کی ٹانگوں کو چوم رہی ہو۔ اُس کے سارے جسم کو چوم رہی ہو۔!!

اب کُتا اُسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بھوں کر کے وہاں سے چل دیا۔ اُسے دُکان کا خیال آیا سیٹھ جی کی دھمکی اور جھڑکی کا احساس ہوا۔ اِس احساس سے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سیٹھ جی اُس کی میٹھی سی زندگی میں زہر گھول رہا ہو۔ لیکن پھر بھی وہ تیز تیز قدموں سے دُکان کی طرف چل پڑا۔

دکان پر پہنچکر اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنے دونوں ہاتھ جوڑکر دبی زبان سے سیٹھ کو نمستے کہا۔ اُسے یقین تھا کہ آج بھی سیٹھ اُسے دیر سے آنے پر ماں بہن کی گالی دے گا۔ اُسے نوکری سے الگ کرنے کی دھمکی دے گا۔ اور پھر اُسے رو رو کر سیٹھ سے معافی مانگنی پڑے گی۔

لیکن آج سیٹھ نے اُس سے کچھ نہ کہا۔ نہ جانے کیوں؟ وہ لکڑی کے صندوق کے سامنے بیٹھ گیا۔ دوات کو تھوڑا سا ہلا کر روشنائی دیکھی۔ قلم سنبھالا اور بہی کھاتہ دہیں صندوق پر رکھ دیا۔

"منشی جی! چاول کا سارا حساب ٹھیک ہے؟"

"سب کچھ ٹھیک ہے سیٹھ جی!"

لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پچھلے ماہ چاول کا کیا نفع درج کیا تم نے؟" سیٹھ نے دُوسرا سوال کیا۔

پُشکر نے بہی کھاتے کے چند ورق پلٹ کر جواب دیا۔

"دو لاکھ، سیٹھ جی!"

"ٹھیک ہے!"

"سیٹھ جی! آج مجھے تنخواہ مِل جاتی ــــ میری ماں بیمار ہے اور گھر میں چاول کا ایک دانہ بھی نہیں۔"

پُشکر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پانچویں کو لے جاؤ منشی جی! ہم نے کچھ کھایا ہے تمھارا پیسہ؟" سیٹھ جی نے سنجیدگی سے کہا۔ اور خاموش ہو گئے۔

"اور سیٹھ جی اُس بابو کا رُوپیہ . . . . وہ تو روز شکایت کرتا ہے۔"

"کِس بابو کا منشی جی؟"

"وہی سیٹھ جی جو چاولوں کے لیے کنکر لایا تھا۔"

"بکو مت!" . . . ڈ . . . "اُس کا کتنا روپیہ بنتا ہے؟"

"تین سو سیٹھ جی۔"

"تین سو ـــ! چند کنکریوں کے تین سو میرے روپے کنکر ہیں کیا منشی جی۔ دو سو اُسے دے دینا۔"

پُشکر دل میں سوچنے لگا۔ کاش وہ سیٹھ جی سے کہے۔

"سیٹھ جی! تمھارے رُوپے ہرگز کنکر نہیں، کنکر تو ہمارے روپے ہیں۔ ہم رُوپے سے کنکر خریدتے ہیں اور تم کنکر سے رُوپیہ۔ تمھارا سب رُوپیہ کھرا ہے اور ہمارا کھوٹا"

اِتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

سیٹھ جی نے رسیور اُٹھا لیا۔

"کون؟ کامنی بیٹی! . . . . ہاں ہاں . . . . کیا کہا؟ . . . . اُدھر کوئی نوکر نہیں ہے کیا؟ . . . ٹھیک ہے لیکن مہاراج تو اُدھر ہی ہو گا . . . . اچھا بھیج دوں گا تم فکر نہ کرنا۔"

اور سیٹھ پُشکر سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو منشی جی! کامنی بیٹی کا ٹیلیفون آیا ہے، تمھیں بُلا رہی ہے۔ پر تُم واپس بھی جلد آؤ گے۔"

پُشکر دُکان سے نیچے آیا۔ کوٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں۔ پھٹے ہوئے جُوتے کا گِھسا ہوا تلا جو باہر کو نکل گیا تھا، دیکھا۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر کامنی کی پسند کے مطابق بنانا چاہا۔ اِس حالت میں اُسے کامنی کے پاس جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہ سیٹھ کتنے دن زندہ رہے گا؟ روز میں سوچتا ہوں آج مر جائے گا لیکن مرتا نہیں۔ کاش آج سیٹھ مر جاتا۔ تو اُس کے سارے رُوپے میں لے جاتا۔ اور کامنی کو خبر بھی نہ ہونے دیتا۔ روپے کی مجھے کتنی ضرورت ہے۔ اب میں کب تک شادی کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ اور پھر ماں کی حالت بھی تو خراب ہے۔ اُس کے علاج کے لیے بھی رُوپے چاہئیں۔ کاش سیٹھ مر جاتا تو میں کامنی سے شادی کرتا۔ میں بھُوکا نہ رہتا میرے پاس بھی روپیہ ہوتا۔ اور کامنی میرے قدم چُوم کر کہتی۔ سیٹھ پُشکر ناتھ جی! آپ میرے ساتھ شادی کیجئے۔ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اُس وقت ساری دُنیا میرے قدم چُوم لیتی

یہ سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا۔

اچانک ایک اور خیال نے آگھیرا۔

کامنی نے مجھے کیوں بُلایا ہے؟ شاید صبح اُس نے مجھے پھاٹک سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ لیکن وہ کیسے دیکھ سکتی، وہسکی ختم ہو گئی ہوگی۔ لیکن کل ہی تو تین بوتلیں لے آیا تھا! ہاں ٹھیک ہے۔ کامنی مجھے کہے گی۔

"پُشکر ناتھ! تم اتنے ڈرتے کیوں ہو؟ تم سیٹھ جی سے ڈرتے ہو کیا؟ وہ تو دُکان پر ہوتے ہیں۔ آؤ پُشکر ناتھ! آج ساتھ پئیں گے۔"

اور پھر محبت بھرے انداز میں کہے گی۔

"تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو ڈارلنگ!"

یہ خیال آتے ہی اُس کے جسم کی حرارت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ سامنے سیٹھ جی کی کوٹھی تھی۔ اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ اتنی جلدی کوٹھی کے نزدیک پہنچا ہے۔ باہر پھاٹک کے سامنے ایک پیلے رنگ کی کار کھڑی تھی۔ جس کی پُشت پر سفید حروف میں "ہندوستان اسٹینڈرڈ" (HINDUSTAN STANDARD) لکھا ہوا تھا۔ پُشکر کو اپنے سپنے بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ لیکن وہ پھاٹک سے گزر کر صحن میں داخل ہوا۔ بُڈھا مالی پھولوں کی ایک کیاری کے پاس ہی حُقّے سے دھوئیں کے مرغولے نکال رہا تھا۔

"نمستے منشی جی!"

مالی نے حُقّے کی نے مُنہ سے الگ کی۔

"نمستے!"

اُس نے رسمی طور پر جواب دیا۔ اور کوٹھی کی جانب بڑھا۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں پر سے گزرتے ہوئے اُس کے کانوں میں کامنی کے قہقہے کی گُونج سُنائی دی اُس کے قدم آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتے گئے۔ کمرے کا دروازہ کُھلا تھا لیکن پردہ بدستور لٹک رہا تھا۔ پردے کو ایک طرف سرکا کر وہ اندر داخل ہوا۔ کامنی ایک خوش پوش نوجوان کے سامنے نیم عریاں لباس میں بیٹھی تھی۔ پُشکر پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ اُس کی نظریں کبھی فرش پر جم جاتیں۔ کبھی کامنی کے پتلے ہونٹوں پر۔ جن کے درمیانی حصّے سے لپ اسٹک غائب تھی۔ اور کبھی نوجوان کے ہونٹوں کو دیکھتا جن کے درمیانی حصّے پر لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی۔ پھر اپنے خشک سے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا لیکن کامنی نے اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے اُسے دیکھ کر بھی اپنا نیم عُریاں جسم نہیں ڈھانپا۔ اُس کے بال اُسی طرح بکھرے پڑے تھے۔ اور پُشکر کو ایسا معلوم ہوا جیسے اِس وقت کامنی کی نگاہوں میں اُس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جیسے وہ انسان نہیں ایک حیوان ہے۔ جسے دیکھ کر انسان ہر جائز و ناجائز حرکت کرنے سے نہیں چُوکتا۔ اُسے اِس وقت کامنی اور نوجوان پر بہت غصّہ آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اِسی وقت اِس نوجوان کے سینے میں چھُرا گھونپ دے۔ تاکہ اُس کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ اور اُسی کے ساتھ اُس کی ہندوستان اسٹینڈرڈ بھی!

"دو بوتلیں منشی جی!"

کامنی نے ٹیبل پر پڑے ہوئے پرس سے دس دس کے چند نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

رُوپے لے کر وہ کمرے سے باہر آیا۔ زینے اُترتے ہوئے اُس نے منشی کے نوٹ احتیاط سے کوٹ کے اندر کی جیب میں رکھے۔ آخری زینہ طے کرنے کے بعد آنگن میں اُس کا پَیر کسی چمکیلی چیز کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ نیچے جُھکا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار کا چھُرا آیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ اور چھُرا پھر وہیں رکھ دیا۔ لیکن پھر کچھ اور سوچ کر اُٹھا لیا اور مضبوطی سے نیفے میں باندھ لیا۔

پھاٹک کے سامنے ہندوستان اسٹینڈرڈ نے اُس کا ایک بار اور استقبال کیا۔ اُس نے نفرت سے ایک طرف مُنہ موڑ لیا۔ اور جلد جلد قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ اُسے اپنے دل پر ایک بھاری سا بوجھ محسوس ہوا۔ نہ جانے کون سی زہریلی شے اُس کے انگ انگ اور رُوئیں رُوئیں میں سرایت کر گئی تھی۔

نیو انڈیا اسٹور سامنے ہی تھا۔

وہ دُکان میں داخل ہوا۔ خوشنما بوتلیں الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے جیب سے رُوپے نکال کر کونٹر پر رکھ دیئے۔ اور اُس کے ہاتھ میں شراب کی دو چمکیلی سی بوتلیں آ گئیں۔

وہ جلدی سے واپس آیا۔ دونوں سیڑھیاں طے کر لیں اور کمرے میں آ گیا ٹیبل پر ہلکے گلابی رنگ کے دو گلاس پڑے تھے۔ اور اب وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پُشکر کے ہاتھوں میں دونوں بوتلیں دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اور کامنی نے اُس کے ہاتھوں سے بغیر کچھ کہے دونوں بوتلیں لے لیں اور ایک کا کاگ اُڑا کر شراب گلاسوں میں اُنڈیلنے لگی۔

[illegible] سے [illegible] اُس کی [illegible] تک [illegible]

زہر [illegible] کامنی سے مخاطب ہوا۔ جس کا جواب کامنی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر [illegible] مسکراہٹ سے دیا۔ پُشکر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ غصّے میں [illegible] [illegible] [illegible] لیکن پھر رُک گیا۔ زہر [illegible] نے ایک پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے اُس [illegible] منہ پر [illegible] ٹکرا [illegible] بھوت [illegible] لیکن اُس نے [illegible] اور پھر آخر کامنی کے [illegible] [illegible] باہر آگیا۔

باہر [illegible] ہندوستان سٹینڈرڈ اُس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اُس کی حالت پر [illegible] [illegible]۔

وہ اُس کے نزدیک آیا اور پانچ روپے کا نوٹ اُس کی جیب سے نکال کر اُس کی [illegible] پھینک دیا۔ اور دکان کی طرف چل پڑا۔

دکان پر پہنچتے ہی سیٹھ نے اُسے چاولوں کے نرخ نقل کرنے کو کہا۔ اور خود [illegible] گودام میں چلا گیا۔ پُشکر نے اخبار اور بہی کھاتہ ایک طرف پٹک دیا۔ اور وہ بھی گودام [illegible] طرف بڑھا۔ اُس کا تیز دھار والا خنجر اُس کے ہاتھ میں تھا۔ سیٹھ واپس دکان پر آ رہا [illegible] کہ پُشکر نے اُس کے باہر نکلے ہوئے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔ سیٹھ مادھو رام گودام [illegible] کنکر ملے ہوئے چاولوں کی بوریوں کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ اُس نے اُس کی جیبوں [illegible] تلاشی لیکر چابیاں نکال لیں۔ باہر دکان پر آکر سیف سے اَن گنت روپے نکال کر [illegible] کو تالا لگا دیا۔ اور سیٹھ جی کی کوٹھی کی طرف چلا۔ صحن میں کوئی تھا نہیں۔ نیچے [illegible] کمرے میں چند ملازم تاش کھیل رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی اُوپر پہنچا۔ کامنی کے [illegible] کو خالی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور سیٹھ جی کے کمرے میں داخل ہوا۔ سیٹھ [illegible] کے سرہانے رکھی ہوئی لوہے کی الماری کا تالا کھولا۔ اور لاکھوں روپے کا ایک بڑا [illegible] تھیلا سنبھال کر واپس نیچے آیا اور اپنے گھر کا رُخ کیا۔

گھر میں اُس کی دِق کی مریض ماں چولہے کے سامنے سو رہی تھی۔ بھوک سے اُس کا چہرہ اور بھی نڈھال ہو گیا تھا۔ اُس نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھ کر اُسکے سرہانے پانچ ہزار روپے کے نوٹ رکھ دیئے۔ اور اُسی دن وہ اپنے شہر سے فرار [illegible] گیا!

اب وہ بمبئی میں رہنے لگا۔ اُس کی ایک کوٹھی تھی۔ لاکھوں کا کاروبار تھا جو ہو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] اُس کے جسم پر ایک قیمتی سوٹ تھا۔ سر پر ہیٹ۔ وہ اِس وقت تاج محل ہوٹل کے ایک عالیشان کمرے میں تھا۔ نیچے ہال میں شور سا سنائی دیا۔ وہ ہال میں آیا۔ ہال [illegible] قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ سُرخ، سبز اور گلابی رنگ کی ساریاں لہرا رہی تھیں۔ بوتلوں سے کاگ اُڑ رہے تھے۔ دلکش ساز بج رہے تھے۔ [illegible] کے ساتھ اُس کے گلے میں مرمریں بانہیں حائل ہوئیں۔ ایک نسائی جسم کے گداز نے [illegible] [illegible] لمس بخشا۔

وہ ناچنے لگا۔

"تمہارے حُسن میں کتنا نکھار ہے شمی!"

"سچ ---؟"

کلی نے تبسم کیا۔ پھول بکھر آیا۔ اور اُس کا ہاتھ پُشکر کی کمر پر اور زیادہ کس گیا؟

"تم سے بھی جھوٹ؟" معنی خیز نظریں شمی کے چہرے پر جم گئیں۔

"تم کتنے اچھے ہو ڈارلنگ!"

کانوں کے آویزے ہلنے لگے۔

"ہیلو سیٹھ جی!" گُدگُدے [illegible] ہوئی نیلی نیلی آنکھوں والی لڑکی اُس کے سامنے آئی۔ "ہوڈو یوڈو؟"

"او کے نیلو!" شمی کا ہاتھ اُس کی کمر سے الگ ہوا۔ وہاں نیلو کا ہاتھ آیا۔ اور دونوں ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئے۔ نیلو نے دو پیگ بنائے۔

"شوق فرمائیے سیٹھ جی!"

آنکھیں مسکرانے لگیں۔

آئی لو یو ڈارلنگ" جام لب تک آیا۔

"آداب عرض سیٹھ پُشکر ناتھ جی!" ایک بھاری بھرکم جسم اُس کے سامنے آیا۔

"آداب عرض اجیت بابو" پُشکر نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پروگرام یاد ہے؟" اجیت بابو نے یاد دلایا۔

پُشکر نے نیلو کے تھامتے ہوئے رُخسار پر پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگائی



ڈیومیکس

بے بی فوڈ

بچوں کو ڈیومیکس دیجئے پھر دیکھئے وہ کس طرح پھلتے پھولتے ہیں!



بچے تو نہیں کہہ سکتے کہ انہیں
ڈیومیکس کیوں اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب
انہیں ڈیومیکس ملتا ہے تو
دیکھئے وہ کتنے خوش رہتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب
کی بات نہیں کیونکہ ماں کے
دودھ کے بدلے بچوں کیلئے دوسری بہترین چیز
ڈیومیکس بے بی فوڈ ہے

اور اجیت بابو کے ساتھ ہو لیا۔

باہر بیوک کھڑی تھی۔ دونوں پچھلی نشست میں دھنس گئے۔ اور کار کولتار کی چمکتی ہوئی سڑک پر فرّاٹے بھرنے لگی۔

"مال کا کیا ہوا اجیت بابو؟"

"دس ہزار من آگیا!" اجیت نے ٹیشکر کی ران پر ہاتھ مارا۔

"مارکیٹ میں آگیا کیا؟"

"کل آئے گا! سیٹھ صاحب!"

"بس تو ٹھیک ہے!" ٹیشکر فرطِ مسرت سے مسکرا دیا۔

کار ایک عالیشان بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ٹیشکر اجیت کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے نیچے اترا۔ اُس کے قدم زمین پر اچھی طرح نہیں پڑ رہے تھے۔ برآمدے میں سفید سفید روشنی بکھیرتا ہوا لیمپ روشن ہوا۔ سامنے سنہرے بالوں والی ایک اینگلو انڈین لڑکی کھڑی تھی۔ ٹیشکر کے قدم ابھی تک لڑکھڑا رہے تھے۔ لڑکی نے اُسے ایک ادا کے ساتھ سنبھال لیا۔ اور تینوں اُوپر آگئے۔ نیلی نیلی روشنی میں کمرہ بہت ہی حسین معلوم ہو رہا تھا ریڈیو کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

"دیکھ ترے انسان کی حالت کیا ہو گئی بھگوان!"

"کتنا بدل گیا انسان ——!!"

"روزی ——!" ٹیشکر گرجا۔

"ڈارلنگ!" روزی حیرانی سے بولی۔

"ریڈیو بند کرو!" دوسری گرج۔

ریڈیو چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ بند ہوا۔

اجیت گلاسوں میں شراب اُنڈیل رہا تھا۔ اور شراب کی بُو کے ساتھ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو شامل ہو رہی تھی۔

اُس رات ہال میں کافی جمگھٹ تھا۔ ہلکی ہلکی نیلی نیلی روشنی میں ساز بج رہے موسیقی کی لَے کے ساتھ ساتھ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دَور چل رہے تھے ٹیشکر کے ایک ہاتھ میں ایک جام تھا۔ اور دوسرے بازو پر ایک گداز جسم۔

"بس سیٹھ جی!" نلنی رومال سے مُنہ پونچھنے لگی۔

اور یہ تو میری آرزو! —— آرکسٹرا کی یہ دُھن، تم، اور یہ شراب، تم سب ایک ہو نلنی!

"ہیلو پرشاد ڈیر!" کرسی کھینچکر ایک ادھیڑ لیکن گول مٹول آدمی ٹیشکر کے نزدیک آبیٹھا۔

"کہو شوکت ڈیر!"

دل آویز تبسم کے ساتھ دو ہاتھ مل گئے۔

"مال مارکیٹ میں بھیجدو پیارے! لوگ مر رہے ہیں!"

"مرنے دو شوکت ڈیر۔ اتنی جلدی بھی کیا۔ ہاں پندرہ لاکھ نفع پر میرا کوئی اعتراض نہیں۔ سمجھے پیارے! ہاہا!!"

"لیکن سیٹھ جی!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں!"

ٹیشکر نے دو پیگ خالی کر دیئے۔ اور نلنی کی گود میں اپنا سر ڈال کر شوکت سے مخاطب ہوا۔

"مرنے دو شوکت لوگوں کو۔ تم زندہ ہو، ہم... ہم جو زندہ ہیں... ہم ... تم کاہے کی فکر میں ہو... ہاہا... ہاہا....!"

"آپ بہک رہے ہیں سیٹھ جی!"

نلنی نے احساس دلانا چاہا۔

"ہم —— اُوں —— میں بہک نہیں گیا —— ایک سگریٹ دو!"

"یہ لیجئے!"

پانچ سو پچپن کا ٹن آگے بڑھا۔

ٹیشکر مُنہ سے دھوئیں کے مرغولے نکال رہا تھا۔ اور دھواں نلنی کے حسین چہرے پر بکھر رہا تھا۔

"کاش! اِس دھوئیں کی طرح تم بھی —— ہم ——!!"

اُسی وقت اُس کے قدموں پر ایک لڑکی گر پڑی۔

"مجھے بچالو سیٹھ ٹیشکر ناتھ جی! مجھے بچالو!" یہ سیٹھ مادھورام کی لڑکی کامنی کی آواز تھی۔

"مجھے معلوم تھا تم ایک دن میرے قدموں میں آ گرو گی کامنی! مجھے بھیک مانگو گی!"

"ہا ہا ــــــ!!"

آرکسٹرا بے پر نغمہ گا رہا تھا۔ بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ نکی اور شوکت جا چکے تھے۔

"ٹھپ ٹھپ ــــــ!"

کوئی ٹھیکر ہی کی جانب آ رہا تھا۔ بھوک سے اُس کا پیٹ ریڑھ کی ہڈی سے لگ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک زناٹے دار طمانچہ ٹھیکر کے گال پر آ پڑا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ میلی اور غلیظ چادر اُس کے چہرے سے سرک گئی تھی۔ سورج کی زرد کرنیں چھن چھن کر روشن دان سے اندر آ رہی تھیں۔ باہر اُس کی دمہ کی مریض ماں زور زور سے کھانس رہی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر آیا۔ غیر شعوری طور پر اُس کا ہاتھ اُس کے گالوں کو چھونے لگا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ یہ طمانچہ مجھ پر نہیں، سیٹھ جی پر پڑا ہے جو مجھے روز ایسے سپنے دیکھنے کیلئے مجبور کر رہا تھا ــــــ!!"

...ری ہے اور پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کی گود میں گر رہے ہیں۔ ...تصویر تھی۔ آپ کا نام سنا تھا اب دیکھ بھی لیا۔ اگر آپ میری تصویر بنا رہے ہیں تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ لیکن آپ ...ے خالص میں نہ بھیجیں۔ مجھی کو دے دیں۔ چاہے گھر کا ماحول کچھ ایسا ہے جہاں لڑکیوں کی تہمت ...ب کچھ جاتی ہے۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

تصویروں کی پسندیدگی کا شکریہ! میں آپ کی تصویر آپ ہی کو دے دوں گا۔ کل سے ایک وقت مقرر کر لیجئے۔ صبح کا وقت کیسا رہے گا؟

المنظر

المنظر صاحب!

صبح کا وقت مناسب نہیں۔ حالانکہ گھر کے کام کاج میرے سپرد نہیں۔ لیکن ...یکن نہ کسی طرح آپا کا ہاتھ بٹاتی رہتی ہوں۔ دس بجے کے بعد میں تصویر بنواؤں گی۔ لیکن آپ اُسے جلد مکمل کر لیں۔

عصمت

المنظر صاحب!

پورے پندرہ روز ہو گئے آپ کو کاغذ اور پنسل ہاتھ میں لئے بیٹھے ہوئے۔ اب ...تو ہزاروں تصویریں بن سکتی تھیں۔ میں دو چار روز اور دے سکتی ہوں۔ اگر اتنے عرصے ...آپ پورا نہ کر پائیں گے تو کام ادھورا ہی چھوڑ دیجئے گا۔ وہ آئندہ بھی مکمل نہ ہو سکے ...ا۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

آپ کی تصویر مکمل ہو چکی ہے لیکن میں اس وجہ سے آپ کو نہیں دے سکتا کہ ...پ کی پچھلی تحریروں کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ مجھ پر کوئی ...حسان کر رہی ہیں۔ حالانکہ آپ غور کریں تو میں نے ہی آپ پر احسان کیا ہے کہ آپ کے نقش و نگار ہمیشہ کو محفوظ کر دیئے ہیں۔ اسلئے میں اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہوں۔ اور آپ کے ہاتھوں میں دینا نہیں چاہتا۔ آپ آئندہ مجھے نظر بھی نہ آئیں تو بھی کوئی حرج نہیں تصویر تو اتنی اچھی بنی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ آپ کے چہرے پر جو حزن و ملال چھایا رہتا ہے اُس نے اُسے لازوال کر دیا ہے میں کوشش بھی کروں تو شاید اس سے اچھی تصویر نہ بنا سکوں گا۔ آپ کی تکلیف کا شکریہ!

المنظر

المنظر صاحب!

آپ کے پرچے کا پہلا جملہ پڑھ کر میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ اور شاید اس لمحے میرے چہرے پہ حزن و ملال کی جگہ شگفتگی آئی ہوگی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آپ وہ ایک لمحہ بھی محفوظ کر دیتے۔ لیکن دوسرے لمحے پھر آگے پڑھ کر بہت زیادہ ملال ہوا۔ اگر میری تحریروں کا لہجہ آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں لیکن آپ نے مجھ پر تصویر بنا کر احسان کیا ہے۔ یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر میں آپ کے سامنے نہ ہوتی آپ کیسے وہ لازوال تصویر بنا سکتے تھے۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ اُس پر میرا بھی حق ہے وہ سرتاپا میری اپنی ملکیت ہے۔ خدا کیلئے اُسے بھیج دیجئے میں واپس کر دوں گی۔ اس کا وعدہ کرتی ہوں۔

عصمت

عصمت صاحبہ!

تصویر بھیج رہا ہوں۔ دیکھ کر واپس کر دیں اب میں یہ نہیں چاہتا اِسے آپ اپنے پاس ہی رکھ سکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ جب کبھی دیکھا کریں گی تو ہنسا کریں گی شگفتگی کے بے شمار لمحے آپ کو مل جائیں گے۔ اور میں اُسی کو اپنی محنت کا صلہ سمجھتا رہوں گا۔ آپ کے حزن و ملال نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ممکن ہو تو اس کی وجہ بھی بتایئے کیا ہے؟

المنظر

المنظر صاحب!

آپ کی بنائی ہوئی تصویر ملی۔ دیکھتے ہی میں بے اختیار ہنستے ہنستے لوٹ پو...

غزل

از

جناب محمد حسین علیخاں شہاب ہمدانی

جب کسی لب پہ آہ ہوتی ہے
ایک دُنیا تباہ ہوتی ہے

کون دُنیا میں اُس کا ہوتا ہے
جس کی دُنیا تباہ ہوتی ہے

جانتا ہوں نہ آئیں گے وہ مگر
سُوئے در کیوں نگاہ ہوتی ہے

رات تاریک ہو کہ روشن ہو
میری قسمت سیاہ ہوتی ہے

تم چلو تو سہی حرم کو شہاب
دیکھو کیسی نباہ ہوتی ہے

غزل

از

جناب عابد ادیب بریلوی علیگ

کعبۂ مہر و ماہ تک پہنچے
ہم تری بارگاہ تک پہنچے

بادۂ غم کے تلخ پیالے
لذتِ بے پناہ تک پہنچے

تیرے جلووں کو دیکھنے والے
اپنی اپنی نگاہ تک پہنچے

جادۂ دردِ عشق کے راہی
منزلِ غم پناہ تک پہنچے

لطف جب ہے کہ بزمِ رندانہ تک
بات تیری نگاہ تک پہنچے

پردۂ ناز خود اُٹھے تھے ادیب
جرم میری نگاہ تک پہنچے

غزل

از

جناب شفقت کاظمی

خورسندِ جفا ہیں آج تک ہم
راضی برضا ہیں آج تک ہم

کب اُن سے جُدا ہوئے تھے لیکن
جینے سے خفا ہیں آج تک ہم

مدت ہوئی ترکِ عاشقی کو
بربادِ جفا ہیں آج تک ہم

کیا کیا تری مغفرت ہے منظور
مصروفِ دعا ہیں آج تک ہم

دن اپنے کبھی پھرے نہ شفقت
اُس در سے جُدا ہیں آج تک ہم

[illegible]

مفید کار آمد معلوماتی مقالے

صحت و زندگی

۱ ـــ بچوں کیلئے آبحیات ـــ ٹماٹر کا رس

اس سے پہلے بھی ٹماٹر کے خواص و فوائد کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ٹماٹر کا موسم آنے پر قدرت کی اس گراں قدر دین کے متعلق مزید معلومات کرنا ضروری ہے۔ اپنے گوناگوں خواص اور فوائد کے اعتبار سے ٹماٹر قدرت کی بیش قیمت دین اور گرانقدر تحفہ ہے۔

دنیا میں جتنے بھی پھل اور ترکاریاں ہیں ان میں ٹماٹر سب سے جلدی اور سب سے آسانی سے ہضم ہوتا ہے۔ ٹماٹر پیٹ میں پہنچتے ہی چھوٹی آنتوں میں چلا جاتا ہے اور اُس کے قدرتی نمک کو جسم اتنی تیزی سے قبول کرتا ہے کہ اس بارے میں اس کی ہمسری کوئی غذا نہیں کر سکتی۔

ٹماٹر میں تین طرح کی صحت بخش ترشیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ دوسری ترکاریوں میں کسی میں ایک تو کسی میں ایک اور دوسری تیسری ترشی کا ذرا سا حصہ ہوتا ہے۔ ٹماٹر میں ملنے والی یہ تین ترشیاں ہیں، پہلی ملک ایسڈ جو سیب میں ملتی ہے اور سیب کو ترش ذائقہ دیتی ہے۔ دوسری سائیٹرک ایسڈ جو نیبو، نارنگی اور سنترے میں ملتی ہے۔ یہ ترشی جراثیم کش ہوتی ہے۔ ٹماٹر میں ملنے والی تیسری ترشی فاسفورس ایسڈ ہے۔ تقریباً ساری ترکاریوں کی تازگی ان کے پیڑ یا بیل سے الگ ہو جانے کے بعد کم ہونے لگتی ہے۔ لیکن ٹماٹر کی تازگی پودے سے ٹوٹ جانے کے بعد بھی دیر تک قائم رہتی ہے۔ اسلئے اس کا قدرتی ذائقہ بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ مریض کے لئے ٹماٹر کی طرح صحت بخش غذا کوئی اور نہیں ہے۔ ٹماٹر صحت مند لوگوں کے لئے بھی اپنے اندر معجز نما خواص و صفات رکھتا ہے۔ ٹماٹر محافظِ صحت غذاؤں میں سرتاج ہے۔ یہ انسانی جسم کو جراثیم سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی طاقت دیتا ہے۔ کمزوری، کسلمندی اور سستی کو دور کرتا ہے معدے اور پھیپھڑے کے امراض کو دفع کرتا ہے۔ ٹماٹر میں میگنیشیم بھی دوسری غذاؤں سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ جسم کی ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط اور سخت بنا دیتا ہے کیلشیم سے ہماری ہڈیاں بنتی ضرور ہیں لیکن یہ میگنیشیم ہی ہے جو انھیں سیمنٹ کی طرح جوڑ تا ہے جس سے ان کی نرمی دور ہوتی ہے۔ دانتوں میں جسم کی دوسری ہڈیوں کی بہ نسبت آدھا فیصد زیادہ میگنیشیم ہوتا ہے۔ اور یہ زائد میگنیشیم ہی دانتوں کو اتنا سخت بنا دیتا ہے کہ اُن سے سخت سے سخت غذا چبانے پر بھی وہ نہیں گھستے۔

اگر ہماری غذا میں میگنیشیم نہ ہو تو جسم کی ہڈیاں نرم ہو جائیں گی۔ اور ذرا بھی جھٹکا لگنے پر ٹوٹ جائیں گی میگنیشیم کیلشیم کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں اور ہمارے بچوں کو میگنیشیم دینے والی غذا ٹماٹر کے ساتھ ساتھ کیلشیم دینے والی غذا پالک، شلجم، دودھ دہی بھی ملنی چاہیئے۔

ٹماٹر میں وٹامن سی بھی بہت زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ جو صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جسم میں جس کی کمی ہو جانے سے جسم میں جگہ جگہ ورم پیدا ہو جاتا ہے۔ جسم کے جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں۔ دانت اور مسوڑے کمزور ہو جاتے ہیں، جسم کی نشو و نما رک جاتی ہے اور آدمی پستہ قد رہ جاتا ہے۔ ٹماٹر میں وٹامن اے، بی، جی بھی ہوتا ہے اور تھوڑی مقدار میں سورج سے ملنے والا وٹامن ڈی بھی۔ ٹماٹر کے ان ہی اوصاف کو دیکھ کر ماہرینِ غذا کہتے ہیں ٹماٹر کا رس انسان کے لئے خاص کر بچوں کے لئے آبِ حیات ہے۔ ٹماٹر میں میگنیشیم کے علاوہ لوہا، فاسفورس، پوٹیشیم، تانبا اور تھوڑا کیلشیم بھی ہوتا ہے!

۲ ـــ آلو ـــ جسم کو پرورش کرنیوالی غذا

عام طور پر لوگ آلو کو ایک سستی ترکاری سمجھتے ہیں۔ لیکن سائنس کی روشنی

میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سیب، سنترے اور موسمی کی طرح آلو میں بھی کافی قوت بخش سبزی ہے۔ کبھی یورپ کے کئی ممالک میں آلو کو کیمیا کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ وٹامن سی اور بی آلو میں کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ آج وٹامن سی لیموں، سنترے، نارنگی، موسمی، ٹماٹر، آملہ اور کچی ترکاریوں سے آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ وٹامن سی کا ذریعہ آلو لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اس کی حقیقی اہمیت سے لوگ بے خبر ہیں۔ ایک بڑا آلو وٹامن سی کی آپ کی روزانہ ضرورت ایک چوتھائی پوری کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ بی کے چھوٹے حصے کی بھی۔ آلو میں نشاستہ بہت ہے جو جسم کو پرورش کرنے والی غذا ہے اور طاقت کا چشمہ ہے۔ لیکن کیا یہ طاقت آپ آلو سے حاصل کرتے ہیں؟ آلو سے پوری طاقت حاصل کرنے کا راز آلو کے پکانے کے طریقے میں پوشیدہ ہے۔ آلو بغیر چھیلے ہی پکانا چاہئے۔ انھیں بھاپ سے پکانا ان کے پکانے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ ان کو اچھی طرح دھو کر آگ پر چڑھی ہوئی دیگچی میں ڈال دیجئے۔ اور ان پر ابلتا ہوا اتنا پانی ڈال دیجئے کہ دیگچی میں ایک انچ پانی ہو جائے۔ اور پھر دیگچی کو اچھی طرح ڈھک دیجئے۔ آلو پک جانے پر دیگچی آگ پر سے اتار لیجئے۔ آلوؤں کو چھلکے سمیت کھانا زیادہ فائدہ بخش ہے۔ آلو کے چھلکے قبض کے دشمن ہیں۔

اس طریقے سے پکائے ہوئے آلوؤں کا اثر آپ کی صحت پر حیرت انگیز ہوگا۔ ماہرین غذا کہتے ہیں کہ بھاپ سے پکائے ہوئے آلوؤں کا وٹامن سی ضائع نہیں ہوتا۔ لیکن انھیں آگ میں بھوننے سے بیس فیصد، تلنے سے تیس فیصد اور اگر پکانے سے پہلے انھیں چاقو سے چھیل دیا جائے تو پچاس فیصد ضائع ہو جاتا ہے۔ گھی میں پکانے سے آلو ثقیل اور دیر ہضم ہو جاتا ہے۔

۳ ـــــ کیا نمک مضرِ صحت ہے؟

نمک جتنی ارزاں اور سہل الحصول شے ہے، خواص اور فوائد کے اعتبار سے اتنی ہی اہم ہے۔ صحت اور تندرستی کے لئے نمک کا استعمال بہت ضروری ہے نمک سے قوتِ ہاضمہ کو تقویت ملتی ہے۔ نمک کھٹی ڈکاروں کو روکتا ہے۔ بدہضمی اور پیٹ درد میں بہت مفید ہے۔ معدے اور آنتوں کو صاف کرتا ہے۔ اس کا بکثرت استعمال دماغ اور بینائی کے لئے نقصان دہ ہے۔ امراضِ چشم میں نمک کا استعمال بلا شبہ بہت مضر ہے۔

ایک گلاس پانی میں دو ماشے نمک ڈال کر تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک گھونٹ پینا بدہضمی، سنگرہنی اور دردِ سر وغیرہ کے لئے مفید ہے۔

باریک پسا ہوا نمک سرسوں کے تیل میں ملا کر دانتوں پر ملنے سے دانت موتی کی طرح چمکدار اور سفید ہو جاتے ہیں۔ کیڑا نہیں لگتا۔ مسوڑھوں سے خون اور پیپ بہنا رک جاتا ہے اور منہ کی بدبو کو زائل کرتا ہے۔

پسا ہوا نمک شہد میں گوندھ کر، کپڑے میں لپیٹ کر، اوپر مٹی لگا کر آگ پر رکھیں۔ جب مٹی خوب سرخ ہو جائے تو نمک کو نکال کر پیس کر رکھیں۔ اور ایک ماشہ روزانہ صبح کو کھائیں۔ زکام، نزلہ، رطوبت اور جوڑوں کے درد کے لئے بے حد مفید ہے۔

گرم پانی میں نمک ملا کر دھونے سے زخم بہت جلد بھر جاتا ہے۔ اور فاسد مادہ الگ ہو جاتا ہے۔

نمک اجوائن کے ساتھ ملا کر کھانے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ نقرس اور گٹھیا کے لئے مفید ہے۔

آنکھوں میں لگانے سے ناخنہ، جالا اور پھولا دور ہو جاتا ہے۔

۴ ـــــ بصارت کی تقویت اور حفاظت کیلئے

کچا شلجم کھانا نظر کی کمزوری کو دور کرتا ہے۔ گاجر کا استعمال بھی بصارت کو تقویت دیتا ہے۔ گاجر کا رس پینا آنکھوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ گاجریں بکثرت کھائی جائیں تو بینائی لازمی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ سونف اور مصری ملا کر رات کو سوتے وقت ایک تولہ کھانا بصارت کو تیز اور قوی کرتا ہے۔ فاضل اطبا نے اپنے تجربات میں لکھا ہے، اسی طریقے سے سونف کے مسلسل استعمال سے عینک کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ ہری سونف کے پانی میں کھرل کیا ہوا سرمہ لگانا بصارت کی تقویت اور حفاظت کا ضامن ہے!

۵ ـــــ آپ کا چہرہ

آپ جو خیال کرتے ہیں وہی ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کو مریض خیال کرتے ہیں تو بیماری آپ کے پاس موجود ہو جائے گی۔ اگر آپ صحت مند ہونے کا خیال کریں تو نوّے فیصد مرض کو دور بھگا دیں گے۔ برسوں سے آپ جو کچھ خیال کرتے آئے

ہیں، وہ آپ کے چہرے کی لکیروں سے صاف نظر آتا ہے۔ سنجیدہ بشرے کے پیچھے یا تو کشور رُوح جھانکتی رہتی ہے یا وہ میلے احساسِ کمتری کا غماز ہوتا ہے جو دُنیا کی نظروں سے آپ کو چھپانا چاہتا ہے۔ شگفتہ رُو انسان پُر مسرت و مسرور دل کا مالک ہوتا ہے۔ آپ کسی خاص موقعے پر چاہے اِس ظاہری حالت میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی حقیقت پر کچھ دیر کے لئے پردہ ڈال لیں۔ لیکن چھپے چھپے آپ پر نظر رکھنے والے کو آپ کی شکل آپ کا اندرونی رُوپ ضرور دکھائے گی۔ اِس لئے اپنے چہرے کے آئینے پر خیالات و احساسات کا بُرا عکس ہرگز نہ پڑنے دیجئے۔

۶ —— شکھ کی راہ

مشہور مغربی مفکر ٹریین ایڈورس نے لکھا ہے۔

"صرف اپنے لئے شکھ اور سکون تلاش کرنے پر انسان اُنھیں کبھی نہ پاسکے گا اپنے فرض کی تلاش کیجئے اور اُس میں لگ جایئے۔ شکھ اور سکون خود بخود آجائیں گے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے دھوپ کے ساتھ سایہ خود بخود آجاتا ہے۔"

۷ —— تھک جانے کے بعد

آپ اِس لئے بھی تھک جاتے ہیں کہ ایک ہی طرح کا کام بہت دیر تک کرتے رہتے ہیں۔ اِس لئے اِس سے بچنے کے لئے اپنے کاموں میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔

اگر پڑھتے پڑھتے تھک جائیں تو کچھ دیر کے لئے پڑھنا بند کر دیجئے۔ اور ٹہلنے لگئے۔ مطالعے کا موضوع بدل دینے سے بھی ذہنی تکان کم ہو جاتی ہے۔

۸ —— زندگی کے ہر موڑ پر

زندگی کے ہر اہم موڑ پر ہمیں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ مشکلات چھوٹی ہوں یا بڑی، ہمیں اِن کے سامنے شکست قبول نہ کرنی چاہیئے۔ اور نہ اُن سے خائف ہی ہونا چاہیئے۔ اچانک سامنے آپڑنے والی مشکلات اور اُفتادیں ہی ہمیں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور زندگی کی راہ پر مستقل مزاجی سے چلنے کے لئے ہوشیار کرتی ہیں۔ اِن سے خائف اور ہراساں ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

۹ —— بچے جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

ماں باپ، ماسٹر سبھی جانتے ہیں کہ بچے اکثر جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی اِس ذہنیت کو بدلنے کے لئے ماں باپ یا ماسٹر اِن ذرائع کا استعمال کیا کرتے ہیں جیسے :-

۱۔ بچے کے بولے ہوئے جھوٹ کو پولیس کی طرح ہر جگہ ہر وقت بچے کو شرمندہ اور ذلیل کرنے کی غرض سے لوگوں سے کہتے ہیں۔

۲۔ جج بن کر 'سزا' کا اعلان کرتے ہیں۔

۳۔ ذلیل کرتے ہیں، پیٹتے ہیں، ڈانٹتے ہیں۔

۴۔ بار بار بچے کے مُنھ سے کہلاتے ہیں "میں جھوٹ نہیں بولوں گا"

۵۔ بار بار جھوٹ بولنے کے قصور پر زبردستی معافی منگواتے ہیں۔

تقریباً اِس طرح ساری تدبیریں جو بچے کو زبردستی سچ بولنا سکھانے سے تعلق رکھتی ہیں، بچے کے لئے بے حد نقصان دہ اور اُس کی ذہنی نشوونما کے لئے بڑی روک ہیں۔

جھوٹ بولنا ایک دماغی مرض ہے۔ جب تک اِس کے بنیادی اسباب پر غور نہ کیا جائے اِس مرض کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔

بچہ جھوٹ اِسلئے بولتا ہے کہ :-

بچے کا جسم چھوٹا سا ہے۔ ہمارے مقابلے میں اُس کی طاقت کتنی کم ہے-!

جب اُس ننھے بچے کے آس پاس، گھر اور اسکول میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کرتا ہے، اُس حالت میں بچہ اپنی حفاظت کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔

ہم دوسروں کے سامنے بچوں کی کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے عیب نکالتے ہیں۔ بچہ کمزوریوں اور عیبوں کو چھپا کر اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے جھوٹ بولتا ہے جو بچے اپنے جسمانی، ذہنی اور خاندانی حالات کی وجہ سے احساسِ کمتری سے دُکھی رہتے ہیں، وہ اپنے اِس دُکھ کو خیالی دُنیا میں پہنچ کر بھول جانا چاہتے ہیں۔ اُس خیالی دُنیا کو حقیقی دُنیا ثابت کرنے کے لئے بچے جھوٹ بولتے ہیں۔

ماں باپ اور ماسٹروں سے جب بچوں کی صحیح مانگ یا خواہش پوری نہیں ہوتی، وہ

بچے اپنی ناآسودہ خواہشات کو خیالی دُنیا میں آسودہ کیا کرتے ہیں۔ اِس خیالی دُنیا کو جھوٹ کے سہارے حقیقی دنیا ثابت کرنے میں ایسے بچوں کو بہت لطف آتا ہے۔ دوسروں کے سامنے اُس خیال کو حقیقت ثابت کرنے میں وہ خیال اور تصور زیادہ میٹھا اور رنگین ہو جاتا ہے بچے کو ایسا محسوس ہوتا ہے اُس کا خیال، اُس کا تصور واقعی حقیقت بن گیا ہے۔ اگر اس خیال کو کوئی سچ نہ مانے تو بچے کو دلی رنج ہوتا ہے۔ بچہ ایک دم اُداس ہو جاتا ہے۔ بچہ پیار کا بھوکا ہوتا ہے، پیار کا پیاسا ہوتا ہے۔ پیار نہ ملنے سے بچے کی زندگی کا چشمہ رُک جاتا ہے سوکھ جاتا ہے۔ اِس پیار کی کمی سے بچہ پودوں کی طرح مُرجھا جاتا ہے سوکھ جاتا ہے۔ بچے کو بتلایا جاتا ہے کہ جو بچہ چوری کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، پاپ کرتا ہے، اُسے کوئی پیار نہیں کرتا بچے کو اپنے تلخ حالات میں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ اِس لئے بچہ اپنے عیبوں کو چھپا کر اپنے بڑوں کے سامنے اچھا ثابت ہونے کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔

جن بچوں کو کڑی نگرانی میں رہنا پڑتا ہے وہ اکثر اُس کڑی نگرانی سے چھٹکارا پانے کے لئے جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر ایک بار بھی اِس جھوٹ بولنے سے اُنھیں نگرانی توڑنے میں مدد مل گئی تو اکثر ایسے بچے جھوٹ بولنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے سچ بولیں۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو۔

۱۔ بچے کی عزت کریں۔ اُس کے وقار کی حفاظت کریں۔
۲۔ اُس کی شخصیت کی فطری طریقے سے نشوونما ہونے دیں۔ اپنی شخصیت سے دبا کر اُس کے دل میں بغاوت کا جذبہ نہ پیدا ہونے دیں۔
۳۔ بچے کو حتی الامکان کمتری کا احساس نہ ہونے دیں۔
۴۔ دُکھ بھری زندگی سے اُنھیں پیار سے لڑنا سکھائیں۔
۵۔ بچوں کو سمجھداری کے ساتھ خوب پیار سے رکھیں۔ جہاں اُنھیں پیار نہ ملے ایسے ماحول سے دُور رکھیں۔
۶۔ بچوں پر سے کڑی نگرانی ہٹا دیں۔ تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکیں۔
۷۔ ہم خود اپنی وکالت، کاروبار یا دوسرے کسی پیشے میں جھوٹ کا سہارا لیں اگر یہ ممکن نہ ہو تو بچوں کے سامنے تو ہرگز ایسا نہ کریں۔
۸۔ تصورات پرست اور خیالی دنیا میں رہنے والے بچوں کی اس ذہنیت کو کسی آرٹ کی طرف موڑ دینا چاہئے۔ ایسے بچے اچھے شاعر، کہانی کار اور مصور ہو سکتے ہیں۔

آج دیش کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات ایسے ہیں کہ بچے اسکول، محلے آس پاس ہر جگہ اپنے بڑوں کو جھوٹ بولتے دیکھتے ہیں۔ سُنتے ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کی جھوٹ بولنے کی عادت چھڑانے کے لئے بہت احتیاط اور ضبط سے کام لینا پڑے گا۔

۱۰۔۔۔ فکر اور خوف

فکر زندگی کا زنگ ہے جو اُس کی چمک برباد کر دیتا اور طاقت بھی کم کر دیتا ہے خوف تکلیف سے بھرے دنوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ اور آئندہ آنے والے تاریک دنوں کی طرف کانپتی ہوئی انگلیوں سے اشارہ کرتا ہے۔ وہ تاروں سے خون کے آنسو نکلوا کر خطرے کی خبر دے سکتا ہے۔ اُس کا گیت ماتم اور بوسہ موت ہے۔

۱۱۔۔۔ صحت کیلئے نیند

صحت مند رہنے کے لئے نیند بے حد ضروری ہے۔ ضرورت سے کم سونے جیسی صحت کو برباد کرنے والی عادت دوسری نہیں ہے۔ کم سونے سے صحت جتنی برباد ہوتی ہے اتنی دوسری کسی وجہ سے نہیں ہوتی۔ عام طور پر انسان کو آٹھ گھنٹے ضرور سونا چاہئے۔

[illegible] (ناول)	منشی پریم چند	۶/-
[illegible]	"	۳/-
نرملا	"	۲/-
[illegible]	"	۶/-
پریم پچیسی حصہ اوّل	"	۵/۸/-
پریم پچیسی حصہ دوم	"	۵/۸/-
میدانِ عمل (ناول)	"	۵/-
غبن	"	۵/-
بازارِ حسن	"	۴/۸/-
فردوسِ خیال	"	۳/-
حبِّ وطن (افسانے)	"	۲/-
آخری تحفہ	"	۲/۱۲/-
زادِ راہ	"	۳/-
گوشۂ عافیت اوّل	"	۵/-
گوشۂ عافیت دوم	"	۵/-
دیہات کے افسانے	"	۳/-
خواب و خیال	"	۲/۸/-
دل کی وادیاں سو گئیں (ناول)	کرشن چندر	۳/-
الٹا درخت (ناول)	"	۲/۱۲/-
طوفان کی کلیاں	"	۴/۴/-
میں انتظار کروں گا	"	۲/۸/-
ہم وحشی ہیں	"	۱/۸/-
نغمے کی موت (افسانے)	"	۲/۱۲/-
کتاب کا کفن (افسانے)	"	۳/-/-
نئے افسانے	"	۳/-
نئے غلام	"	۲/۱۲/-
ہائیڈروجن بم کے بعد	"	۲/۱۲/-
دروازہ	"	۳/-
تڑپ (ناول)	دت بھارتی	۳/-
جانور	"	۳/-
چوٹ اوّل	"	۳/-
چوٹ دوم	"	۳/۸/-
تھکن	"	۲/۸/-
سہارا	"	۴/-
انقلابِ زندگی (جاسوسی ناول)	ترجمہ رام فیروز پوری	۳/۸/-
انمول ہیرا	"	۳/-/-

[illegible] (ناول)	عصمت چغتائی	۴/-
[illegible] (افسانے)	"	۲/-
پیاسی آنکھیں	"	۲/۸/-
آنسو (ناول)	جنا داس اختر	۲/۱۲/-
آگ	"	۱/۱۲/-
برہ فرقت	"	۱/۴/-
کشمیر کی بیٹی	"	۲/۸/-
جلن	"	۲/-
چھلیا	"	۳/۸/-
چندرکلا	"	۲/-/
[illegible]	"	۲/-
[illegible]	"	۳/۸/-
پائل	"	۳/۸/-
اور خدا دیکھتا رہا	"	۲/-
شیطان (افسانے)	سعادت حسن منٹو	۳/۸/-
پردے کے پیچھے	"	۲/۸/-
شادی	"	۲/-
لاؤڈ اسپیکر	"	۴/۸/-
زہرہ	"	۲/۸/-
سسرال (ناول)	شوکت تھانوی	۲/-/-
بقراط	"	۲/۸/-
سانچ کو آنچ	"	۳/۸/-
مولانا	"	۳/۸/-
مسکراہٹیں	"	۲/۸/-
انشاء اللہ	"	۳/-/-
جوڑ توڑ	"	۴/-/-
بیوی	"	۲/۱۲/-
دو لاکھ کا نوٹ (افسانے)	عادل رشید	۳/۸/-
میر صاحب	"	۳/۸/-
[illegible] (ناول)	"	۳/-
آدمی اور سکّے	مہندر ناتھ	۲/۱۲/-
یہاں سے وہاں تک	"	۲/۸/-
چوٹیں (ناول)	عصمت چغتائی	۳/-
سرخ آنچل (افسانے)	پرکاش پنڈت	۳/۱۲/-

[illegible] (ناول)	[illegible]	۴/-/-
[illegible]	"	۲/-
[illegible] کہانی	[illegible]	۲/۸/-
[illegible]	"	۴/۸/-
اغوا	[illegible]	۳/-
سب کی بیوی	"	۲/۸/-
عورت	رئیس احمد جعفری	۴/۸/-
تصویر	اے آر خاتون	۳/-
انسان	"	۴/۸/-
شمع	"	۵/-
نادرہ	زبیدہ خاتون	۵/-
موت کے بعد	اظہار اثر	۲/۴/-
تانا بانا (افسانے)	الطاف مشہدی	۲/۴/-
ایک پیسے کی خاطر	ابراہیم جلیس	۲/۱۲/-
دو ملک ایک کہانی	"	۲/۸/-
انمول آنسو	[illegible]	۲/-/-
مالا (ناول)	[illegible]	۱/۱۲/-
راکھ تلے	"	۲/-
بے نام گلیاں (افسانے)	کلام حیدری	۲/۴/-
پیار (ناول)	زکی انور	۲/۸/-
گھاٹ کا پتھر	گلشن نندہ	۳/-
میری بھابی	جمیل احمد	۲/۸/-
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش	۲/۸/-
خونی چکر (جاسوسی ناول)	ترجمہ رام فیروز پوری	۴/-
مہرِ خاموشی	"	۳/۸
کارنامے [illegible] آرسین لوپن	"	۳/-
آزادی	"	۳/-
نقلی نواب	"	۳/۸/-
دستِ قضا	"	۳/۸/-
شاہی خزانہ	"	۳/۸/-
کالی نقاب	"	۳/۸/-
تہہ خانے کا راز	"	۳/۸/-
دیوتا کی آنکھ	"	۴/۸/-
وادیٔ خوف	"	۳/-

[illegible]

[illegible] کشیدہ کاری کے [illegible] ہندوستانی عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ قیمت فی [illegible] چار روپے۔

شبنم کشیدہ کاری	۱/-
حسین کشیدہ کاری	۲/۸/-
دلہن کشیدہ کاری	۲/۸/-
قدیم کشیدہ کاری	۱/-
رضیہ کا [illegible] کشیدہ کاری [illegible]	۲/-
چمن کشیدہ کاری	۲/-
گلشن کشیدہ کاری	۲/-

صحت و زندگی

اس مفید کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اتنا مفید ثابت ہوگا کر آپ [illegible] پڑھنے کے بعد اپنے دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ [illegible] کو باقاعدہ [illegible] کرنے کے لیے آسان طریقے تدابیر اور علاج [illegible] گئے ہیں، جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ [illegible] صحت و شباب اور تندرستی کے متعلق وہ باتیں تفصیل سے لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا [illegible] کے لئے ضروری ہے۔ نفیس کتابت و طباعت [illegible] جلد [illegible] قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے۔

رسالہ بیسویں صدی دہلی

آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھئے۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا

سوال و جواب

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوالات بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

منوّر سلطانہ چشتیاں۔ پاکستان

س۔ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج۔ بالکل! ہمیں اِس کا تجربہ نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دل کا دامن ہمیشہ اِس آگ سے بچا رہا۔

س۔ میں "بیسویں صدی" کی مستقل خریدار بننا چاہتی ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ آپ اپنے ہاں کے مقامی ڈاک خانہ سے پانچ رُوپے کے پوسٹل آرڈر خرید لیجئے اور اُس پر کچھ لکھے بغیر وہ پوسٹل آرڈر بذریعہ رجسٹری ہمیں بھیج دیجئے رجسٹری لفافہ ملتے ہی آپ کے نام رسالہ جاری ہو جائے گا اور سال بھر حاضرِ خدمت ہوتا رہے گا۔

ایس۔ ایم۔ مظہر۔ ڈنگوری

س۔ عورت شمعِ محفل ہے یا چراغِ خانہ؟

ج۔ چراغِ خانہ لیکن نئی روشنی اُسے شمعِ محفل بناتی جا رہی ہے۔

س۔ محلوں کے تصورات رکھنے والا امیر اچھا ہے یا کٹیا بسانے کی جدوجہد کرنے والا غریب؟

ج۔ کٹیا بسانے کی جدوجہد کرنے والا غریب!

س۔ زندگی تلخی یا مٹھاس؟

ج۔ جیسی آپ بنائیں۔

موسیٰ رضا رضاؔ گیادی۔ گیا

س۔ مادّی دنیا میں انسان؟

ج۔ ننگِ انسان ــــ ننگِ انسانیت!!

س۔ زندگی کا مقصد؟

ج۔ دیانتداری و حوصلہ مندی سے زندگی کے فرائض پُورے کرنا۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

بندہ اگر گورِ غریباں کی لے خبر
حسرت زدوں کی قبر پہ چادر چڑھائے کون

ج۔ آج جب کہ ہر تیسرا آدمی شاعر ہے، ہر شاعر کا نام جاننے والا کوئی صاحبِ کشف ہی ہو سکتا ہے! شعر کسی کا ہو، بہت خوب ہے

ایم۔ ایچ۔ گوہرؔ ننکانہ صاحب۔ پاکستان

س۔ حکومت کب تک قائم رہتی ہے؟

ج۔ جب تک عوام اُس سے مطمئن رہتے ہیں۔

س۔ دنیا میں انسان کا بہترین دوست یا ساتھی؟

ج۔ اچھے خیالات ــــ اچھا کردار!

[illegible] ۔ آرہ

س۔ [illegible]

ج۔ عقیل صاحب! آپ خود عقیل و فہیم ہیں۔ انسانیت کوئی معمہ یا کوئی پہیلی نہیں ہے، جس کے نکات ہم آپ کو بتائیں۔

س۔ کیا مصر اور برطانیہ دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ میں جھونک دیں گے؟

ج۔ مظلوم مصر کو کیوں الزام دے رہے ہیں۔ امن و انسانیت کے علمبردار برطانیہ اور فرانس دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں خود جل مریں گے۔

ایم۔ ڈی۔ احمد۔ ٹانڈہ

س۔ مندرجہ ذیل شعر کس شاعر کا ہے؟ کس نظم یا غزل کا شعر ہے، اور اُس شاعر کی کس کتاب میں ہے؟

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ج۔ یہ شعر علامہ اقبال کی ایک نظم کا ہے۔ ان کی دو کتابیں "بانگِ درا" یا "بالِ جبریل" میں سے کسی میں وہ نظم ہوگی۔

ایم۔ جی۔ غوث۔ کلکتہ

س۔ آدمی اپنے پچھلے واقعات کو کیوں بھول جاتے ہیں۔؟

ج۔ بہت کم لوگ اپنے پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہوں گے، ورنہ لوگ تو پچھلے واقعات کی یاد سے تڑپ اُٹھتے ہیں۔ کسی نے تو کہا ہے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

س۔ شیطان انسان کو کب پریشان کرتا ہے؟

ج۔ جب انسان شیطان کا مطیع ہو جاتا ہے۔

نسیمہ تبسم۔ آرہ

س۔ موجودہ سماج میں حوّا کی بیٹیوں کا کیا مقام ہے؟

ج۔ بہت بلند! چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بن گئی ہیں۔

س۔ اِس شعر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

ج۔ اچھا شعر ہے۔ شاعر نے چھوٹے سے شعر میں ایک بڑی حقیقت بیان کی ہے۔

خورشید سلطانہ۔ لاہور

س۔ بھائی جان! اِس شعر کا دوسرا مصرعہ تحریر فرمائیں ؎

ہستی کیا ہے؟ شعلہ و شبنم

ج۔ گاہے خنداں گاہے پُرنم

انوار احمد۔ [illegible]

س۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو [illegible] کا بہت معقول ہے۔ آپ بھی [illegible] رکھتے ہیں لیکن سننے میں آیا ہے کہ آپ انگلش سے قطعی ناآشنا ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج۔ مولانا ابوالکلام آزاد عربی، فارسی اور اُردو ہی کے فقید المثال عالم اور انشاپرداز نہیں ہیں، دنیا کی اور کئی زبانیں بھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی حسبِ ضرورت دستگاہ رکھتے ہیں۔

س۔ مرزا غالب اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ اُردو شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ ظفر، ذوق، مومن اور دوسرے اصحابِ سخن موجود تھے۔ شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر شاعروں کے بڑے قدردان تھے۔ لیکن مرزا غالب کی شہرت [illegible] موجودہ زمانے کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ وہ آپ کی شاعری کو کیوں نہیں پسند فرماتے تھے؟

ج۔ اُس وقت کے مذاقِ سخن سے غالب کا رنگِ سخن بالکل الگ تھا۔ اور یہ بھی کہ انسان کی قدر اُس کے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔

قدرِ مردم بعدِ مردن!

محمد عباس۔ برہمپور۔ پورنیہ

س۔ ہندوستان میں نامی شاعر و ادیب گزرے ہیں



تندرست لوگ ہر روز
لائف بوائے صابن
سے نہاتے ہیں
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY SOAP
یہ* آئے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے!
* آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے، جسمیں جراثیم ہوتے ہیں اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے تو بیشمار لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل سے کرتے ہیں۔ جو گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے — اور تازگی اور شگفتگی کا صحتمندانہ احساس دلاتا ہے!

ہوگئی۔ آپ نے تو شنکر اور پنچ کے کارٹونوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اللہ میں سوچتی ہوں اگر میں سچ مچ ایسی ہی ہوتی تو کیا ہوتا۔ اس گھر کی بجائے کسی عجائب خانے میں ہوتی۔ مجھے ہنسی مدت بعد ملی ہے یہ آپ کا احسان ہے۔ لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر یہ عارضی نہ ہوتی مستقل طور سے میری اپنی ہی بن جاتی لیکن — آپ نے مجھ سے میرے غم کا سبب پوچھا ہے میں بتا سکتی تھی لیکن ابھی وقت مناسب نہیں۔

عصمت

عصمت!

آج پہلی بار تمھیں کچھ زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں میری اس تحریر میں کئی تبدیلیاں ہیں۔ میں نے صرف عصمت لکھا ہے اور آپ کی بجائے تم ہر چند کہ یہ بے ادبی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میں نے تمھیں اپنا سمجھ لیا ہے اور اس طرح رسمیات کے تمام پردے اُٹھا دیئے ہیں جو اب تک ہمارے درمیان حائل تھے۔ ایک پردہ ابھی اور باقی ہے جسے میں اپنے اُوپر سے اُٹھانا چاہتا ہوں۔

میں المنظر نہیں ہوں۔ وہ نہیں ہوں جس کی تصویریں تمھیں بہت پسند ہیں۔ میں ایک چڑیا کی تصویر بھی نہیں بنا سکتا۔ میرا نام شاہد ہے۔ اور یہاں کالج کا ایک چھوٹا سا طالب علم ہوں۔ تمھارے کمرے کے سامنے مجھے بھی اتفاقاً کمرہ مل گیا ہے۔ جس میں میری چھوٹی سی دُنیا آباد ہے۔ کبھی کبھی اُکتا کر باہر نکل آتا ہوں میں نے تمھیں دیکھا، جبکہ تم بے پروا، خاموش سی، کتاب سے نظریں ہٹا کر آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں اُنھیں ڈبو دیتی تھیں۔ تو میں نہ جانے کیوں تمھیں تکنے لگتا۔ تمھیں دیکھ کر مجھے شاخ سے ٹوٹے ہوئے گلاب کی یاد آتی۔ اگر تمھارے پاس یہ بے پناہ اُداسی نہ ہوتی تو شاید میں اتنی محویت سے کبھی نہ دیکھتا۔ اور تمھیں بھی ایک عام لڑکی سمجھ کر اپنے کام میں لگ جاتا۔ لیکن اس اُداسی نے مجھے جیت لیا ہے۔ اسی لیے تمھیں اپنے سامنے رکھنے کے لئے میں نے المنظر کا روپ بھرا۔ لیکن جب میں کاغذ لے کر بیٹھتا تو کچھ نہ جانتا تھا کہ کیا بنا رہا ہوں۔ جب تمھارے جانے کے بعد اُس پر نظر ڈالتا تو ٹیڑھی لکیروں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ میں نے ایسے تمام کاغذ جمع کر رکھے ہیں۔ کیونکہ ان لکیروں میں تمھاری خوشبو بسی ہوتی ہے۔

میں بھی عجیب آدمی ہوں عصمت! کالج سے واپس آکر میں کسی کلب، ریستوران یا تفریح گاہ نہیں جاتا۔ ان ہنگاموں میں میرا دل بے حد گھبراتا ہے۔ میں زندگی میں سکون چاہتا ہوں۔ اور اس سکون کی تلاش میں شب و روز قدرت کے حسن سے دل بہلایا کرتا ہوں۔ یہ حسن کبھی تو شفق بن کے آسمان پر مسکراتا ہے۔ کبھی پرندوں کی چہکاریں بولتا ہے۔ کبھی ندی بن کے کناروں سے کھیلتا ہے۔ کبھی چرواہے کی بانسری کا نغمہ بن کے ہری بھری چراگاہوں پر پھیل جاتا ہے۔ اور کبھی میرے دل کے گوشے میں ایک اُمنگ بن کے سمٹ آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں مجھے شاعر بنا سکتی تھیں۔ مجھے غالب یا ٹیگور سا دل دے سکتی تھیں لیکن ابا مجھے کالج میں پڑھوا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں، میں اپنے کو خود قتل کر رہا ہوں میں جس مصنوعی دنیا کو نفرت سے ٹھکرانا چاہتا ہوں اُسی میں مجھے رہنا پڑ رہا ہے۔ شاید میں کسی دن یہ سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں۔ تمھیں دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ میری اُمنگ کا جزیرہ مجھے مل گیا ہے۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ مجھ سے قریب رہو۔ میں کبھی یہ نہیں کہوں گا کہ چھپ کر راتوں میں مجھ سے ملو میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے یہ سمجھنے دو کہ تم میری ہو۔

تمھارا شاہد

یہ خط بغیر القاب کے ہے کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ آپ نے جس خلوص اور اعتماد کے ساتھ مجھے لکھا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ آپ کو شاہد صاحب کی بجائے کچھ اور لکھا جائے۔ لیکن میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتی کہ یہ کچھ لکھ سکوں آپ کے خط کو میں نے کئی بار پڑھا۔ اُسے پڑھ کے میرے ذہن میں اور دل میں اتنے اُلجھے ہوئے خیالات آئے ہیں کہ ابھی انھیں نہیں سُلجھا سکی ہوں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ ابھی دیکھئے کہ قطرے پہ گہر ہونے تک کیا گزرتی ہے۔

عصمت

عصمت!

تم نے سب سے پہلے مجھے لکھا تھا کہ میں بے خود بنا وہاں تک نہ پہنچ جاؤں جہاں سے تنہا لوٹتے ہوئے مجھے دُکھ ہو۔ میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ اب میری

جن کی خدمات نئے لکھنے والے بذریعہ خط و کتابت حاصل کر سکیں؟

ج۔ حضرت آسی رام نگری کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ حضرت مذکور خصوصاً نئے لکھنے والے بذریعہ خط و کتابت اُن سے مستفید ہوتے ہیں۔

الیاس ہاشمی ایم۔ اے

س۔ خوشتر صاحب! آپ بہت ہی تجربہ کار ایڈیٹر ہیں اور جائع نظر سیاست داں بھی۔ بتلائیے ایڈیٹری آسان ہے یا لیڈری؟

ج۔ آج کل دونوں آسان ہیں۔ آج کل لیڈر اور ایڈیٹر بننا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

طائر حیدرآباد دکن

س۔ آج کل لڑکیاں آزادی کو غلط معنوں میں لے رہی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ انھیں صحیح راہ دکھانے کے لئے ایک نیا سلسلۂ مضامین شروع کیجئے اُنھیں حقیقت سے آگاہ کیجئے۔

ج۔ غلط روی کا الزام لڑکیوں ہی کو نہیں دیا جا سکتا۔ لڑکے بھی اُن سے کم غلط راہوں پر نہیں چل رہے ہیں۔ انھیں صحیح راہ دکھانے کے لئے "بیسویں صدی" میں نیا سلسلۂ مضامین شروع کرنا ضروری نہیں "بیسویں صدی" میں جو مضامین پیش کئے جاتے ہیں اُن میں اُن کے لئے کافی روشنی ہوتی ہے۔

س۔ کیا آپ مرزا ادیب کے افسانے "صحرا نورد کے خطوط" پر اپنی رائے ظاہر فرمائیں گے؟

ج۔ "صحرا نورد کے خطوط" قابلِ قدر ادبی تخلیق ہے۔

قاضی وارث قطب الدین۔ وشن

س۔ اگر زندگی میں خوشی اور غم نہ ہو تو؟

ج۔ زندگی زندگی نہ رہے۔

زندگی عبارت ہے اس تضادِ پیہم سے
کچھ کہانیاں غم کی، کچھ خوشی کے افسانے

س۔ انسانیت کو کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے؟

ج۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا کر!

زین البشر۔ بنارس

س۔ کیا کاشتکار فن کار ہے؟ اگر نہیں تو کیوں اور ہاں تو کیسے؟

ج۔ ہاں کاشتکار بھی فنکار ہے۔ کیوں کہ کاشتکاری بھی ایک فن ہے۔

س۔ ایک فن کار اور ایک ادیب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ادیب فن کار بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہر فنکار ادیب نہیں ہوتا۔ فنِ موسیقی، فنِ مصوری، فنِ اداکاری کسی فن کا جاننے والا فن کار ہے۔ لیکن وہ ادیب نہیں ہے۔ سائنس، ریاضی، موسیقی، مصوری کی طرح ادب ایک علم ہے۔ اُس کا جاننے والا ادیب ہوتا ہے۔ ادبیت بھی ایک فن کاری ہے اس لئے ادیب فنکار بھی ہوتا ہے۔

س۔ اُس وقت ایک پھول کی کیا حقیقت ہوگی اگر بلبل اُس سے بیگانہ ہو جائے۔ اور اُس کی قدر نہ کرے؟

ج۔ اِس سے پھول کی دل کشی اور دلآویزی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ بلبل کی بیگانگی و بیگانہ وشی اُس کی کور ذوقی کی دلیل ہوگی۔

س۔ کسی کی کہانی کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے کیا اُس سے اجازت لینی پڑتی ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟

ج۔ اُس کہانی کے مصنف سے خط لکھ کر اجازت لینی چاہیئے۔

شیخ بڑے۔ رائچور

س۔ عورت کا بہترین زیور کیا ہے؟

ج۔ شرم و حیا!

س۔ شاعر اور افسانہ نویس عورت کو ناگن کہتے ہیں۔ کیا وہ بھی سانپ کی طرح ڈستی ہے؟

ج۔ سب شاعر اور افسانہ نویس عورت کو ناگن نہیں کہتے۔ بہت سے شاعر اور افسانہ نویس عورت کو پھول کہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے خیال کی بات ہے!

سید ناظر حسین ٹنکاری بند

س۔ تدبیر پر تقدیر غالب کہ تقدیر پر تدبیر غالب؟ آپ کسے مانتے ہیں؟

ج۔ تدبیر اور تقدیر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

انوار حسین صدیقی۔ مراد آباد

س۔ میں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ کیا وہ "بیسویں صدی" میں جگہ پا سکتے ہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہوں گے تو ضرور جگہ پائیں گے۔ "بیسویں صدی" پہلے فن کو دیکھتا ہے۔ بعد میں فن کار کو!

س۔ "بیسویں صدی" میں کس قسم کے افسانے شائع ہو سکتے ہیں؟

ج۔ جیسے افسانے آپ "بیسویں صدی" میں ملاحظہ فرماتے ہیں۔

شفیع اللہ خاں۔ کراچی

س۔ "عورت شرم و حیا کی پُتلی ہے"۔ لیکن یہ بیسویں صدی میں تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔

ج۔ پہلے عورت چراغِ خانہ تھی۔ اب شمعِ محفل بن گئی ہے!

س۔ وہ کون سی شے ہے جو بہادر کے ہاتھ میں عزت کی محافظ اور بزدل کے ہاتھ

میں دشمن کا سہارا بن جاتی ہے...؟

ج۔ تلوار۔

مشتاق احمد خاں۔ سمستی پور

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا سیاست داں؟

ج۔ سب سے بڑا سیاست داں وہ ہے جو انتخاب میں شکست کھا کر ذرا بھی نہ گھبرائے عوام کو فریب دیتے ہوئے، اُن کے سامنے جھوٹے وعدے کرتے ہوئے ذرا بھی نہ ہچکچائے۔ اپنے خلاف بلند ہونے والی سیاہ جھنڈیوں کو اپنے خیر مقدم کا پرچم سمجھے!

س۔ آجکل انسان اچھائی کو چھوڑ کر بُرائی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ بُرائی کو اچھائی سمجھتے ہیں۔

س۔ کیا عورت کی خوبصورتی سنگھار پر منحصر ہے؟

ج۔ جی نہیں، خد و خال پر، حُسنِ کردار پر!

رضوان احمد غیاثی۔ بھاگلپور

س۔ ماضی غم آمیز، حال پُر درد، اور مستقبل......؟

ج۔ آپ چاہیں اور حوصلے سے کام لیں تو مستقبل کو مسرت بکنار بنا سکتے ہیں۔

پی۔ ایم امین الدین۔ دیور کنڈہ

س۔ عورت کا صحیح مقام تاریک کوٹھری ہی ہے

[illegible] بڑی کی حقیقت ہی کیا ہے!

ج۔ عورت کا صحیح مقام چولھے کے قریب ہے، نہ اس کی طرف [illegible] والے پیروں سے [illegible] عورت کا صحیح مقام اس کا آنگن ہے [illegible] گھر ہے

مقصود دارڈوی۔ آدم پورہ

س۔ ہمارے بیشتر ادیب و شعرا شراب پیتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

ج۔ شراب پینے والے ادبا و شعرا کہتے ہیں کہ وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو غرقِ جام کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے یہ وہی جانیں۔

محی الدین احمد۔ دیور کنڈہ

س۔ افسانہ نگار کو افسانہ میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے؟

ج۔ بہت سی باتوں کا۔ سرگوشیوں میں تفصیل سے بتانا ناممکن نہیں۔ حضرتِ آسی رام نگری سے رجوع کریں۔

س۔ انسان بُری چیزوں کو جانتا ہوا بھی بُرائی کیوں کرتا ہے؟

ج۔ دانستہ فریب کھاتا ہے۔

س۔ بعض اوقات آدمی محنت کرنے کے باوجود کیوں ناکام رہتا ہے؟

ج۔ اُس کے کام اور کوشش کرنے کے طریقے میں

کوئی خامی ہوتی ہے!

عادل رشید سندوریاری

س۔ وہ کون سے انسانیت کے زریں اصول ہیں جن پر انسان کو کاربند ہونا ضروری ہے؟

ج۔ نیکی، سچائی، دوسروں کی بھلائی۔

عبدالغفار۔ سیتامڑھی

س۔ کیا صحیح ہے کہ اکثر تدبیروں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں؟

ج۔ ہاں ——
ہوتی ہے نئے عزم سے پیدا نئی تقدیر

س۔ جس کسی کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہو تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ دوسروں کے تاریک عید تہواروں سے بھی اندھیرا دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اختر جمال۔ لائل پور

س۔ بھائی جان! زندگی کے اُفق پر یہ تاریکیاں کب تک چھائی رہیں گی؟

ج۔ شعورِ زندگی اے دوست اِن تاریک ادوار میں
مرتب کر رہا ہے صبحِ مستقبل کے افسانے!

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎
وہ ظلمتیں ہیں سوادِ حیات پر طاری
کہ مہر و ماہ ترستے ہیں روشنی کے لئے

ج۔ حضرتِ جگر مرادآبادی کا۔

غلام پرویز۔ لائل پور

س۔ لڑکیوں کی تعلیم کہاں تک محدود ہونی چاہیئے؟

ج۔ لڑکیوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلانی چاہیئے۔ لیکن ایسی تعلیم نہیں، جو اُنہیں بے راہ رَو بنائے۔

س۔ اگر کوئی شریف آدمی کسی شریف آدمی سے ناجائز فائدہ اُٹھائے تو ۔۔۔؟

ج۔ اُس سے رذیل کوئی نہیں۔

مسٹر ڈی۔ ایس۔ کالا اٹاوی

س۔ زندگی میں سب سے بُرا وقت کون سا ہے؟

ج۔ جب انسان کے ہاتھ سے ہمت اور حوصلے کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔

س۔ کیا فلم لائن میں جانے سے سچ مچ ہی عزت کھو جاتی ہے؟

ج۔ عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں تو یہی مشاہدہ ہے۔

ایس محمد علی ملک کانپوری

س۔ انسان کی زندگی پر تقدیر زیادہ حاوی ہے یا تدبیر؟

ج۔ تدبیر!
ہوتی ہے نئے عزم سے پیدا نئی تقدیر!

س۔ ذیل کے شعر کا جواب شعر میں دیں ؎
کس کو سننے کی ہے فرصت نالہائے عندلیب
کس لئے ہیں آجکل اہلِ چمن خاموش بس

ج۔ اِس شعر کا پہلا مصرعہ تو بہت خوب ہے لیکن دوسرا مصرعہ اتنا ہی توجہ طلب ہے۔ اِس لئے شعر کا جواب کیا عرض کیا جائے؟ شعر لاجواب ہے!

مولانا محمد علی۔ کلکتہ

س۔ لاکھ کوشش کے باوجود حالات اور حریف سے شکست کھا جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ جب بھی حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔

س۔ عصمت فروش عورت سے ایک مولانا نے شادی کر لی۔ اُس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

ج۔ اگر شادی کر لینے کے بعد وہ عورت شریفانہ زندگی گزارنے لگی ہو تو مولانا کے پیچھے نماز بے شک جائز ہے۔

دھڑکتے دلوں کی محبت بھری داستانیں

میرے بچے نامور افسانہ نگار اور ناقد پروفیسر کرشن کمار کے بہترین دلچسپ نفسیاتی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگ مرمر کے مجسمے پروفیسر کرشن کمار ایم اے کے جذبات آفریں افسانوں کے اس مجموعے میں پیسے کے پرستاروں کا ایک افسانہ ہے جس میں انسانیت بلک بلک کر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ آنسو گیت بن گئے ہیں، آہیں کا دھواں ہیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

حسن پرست حضرت یزدانی جالندھری کے اس مجموعے کا ہر افسانہ جوانی کی مرکز [illegible] گہرا جاتا ہے۔ قیمت فی جلد صرف ڈیڑھ روپیہ۔

دل کے ٹکڑے مشہور افسانہ نگار حضرت [illegible] کے رنگین افسانوں کا مجموعہ جس کے [illegible] پڑھنا شروع کر دیں تو ختم کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

بیسویں صدی کا عشق یہ عشق ہے جسے آگ ہے کہ بجھ نہ سکے اور [illegible] یہ عشق کی وہ آگ ہے جو لاکھوں کی تمیز نہیں کرتی۔ ہر انسان کو تڑپا دیتی ہے۔ نہایت دلچسپ کتاب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

تڑپ مستقبل کا ایک ناول جس کے لیے مصنف نے کہا ہے کہ اس سے بہتر ناول آنے والے دور میں شاید ہی لکھا جائے۔ قیمت صرف تین روپے۔

چوٹ دوسرا حصہ (ناول) آپ نہیں جانتے کہ چوٹ ایک نامکمل ناول تھا۔ اب دوسرے حصے کی شکل میں اس کی تکمیل کی گئی ہے۔ قیمت [illegible] روپے۔

جینے کیلئے ستیہ پال آنند اپنی کہانیوں کو دلہنوں کی طرح سجاتا ہے۔ جہاں اس کا تخیل انہیں الفاظ کا خوبصورت جامہ پہناتا ہے وہاں اس کے تجربے اور مشاہدے مثالی کردار سامنے لاتے ہیں۔ ہندی اور اردو میں گزشتہ پانچ برسوں سے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ قیمت [illegible] روپے۔

چھتیس سال بعد اسی پر تیرتے ہوئے وقت صرف پنجاب کا نہیں بلکہ ہندوستان کا بڑا شاعر ہے۔ اس کا نام ہندوستان کی حدود سے باہر نکل کر دنیا کے ان گنت ملکوں تک پہنچ چکا ہے۔ اردو میں اس کے افسانوں کا مجموعہ نہایت دلکش انداز میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ خوشنما مضبوط جلد۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

یوکلپٹس کی ڈالی [illegible]

ایک روپیہ ایک پھول [illegible]

رات اندھیری ہے [illegible] قیمت صرف [illegible]

چاند بجھ گیا سرائیوں اور آشاؤں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ اگر آپ کو محبت کرنا چاہتے ہیں تو ان افسانوں کو ضرور پڑھئے۔ قیمت صرف [illegible]

دھکتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، جنس کی بجلی ہے، عشق کی بیقراری ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ [illegible] سید امرت کی شکار [illegible] قیمت فی جلد [illegible]

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار رام لال کی رومانی [illegible] کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ ان افسانوں میں رومان و محبت کی گتھیاں ہیں، حسن و شباب کی سرمستیاں ہیں۔ ہر افسانے میں ایک نئی عورت ہے۔ قیمت فی جلد صرف [illegible]

شاہی محلات کی پریم کہانیاں عشق و محبت کی پرکیف داستانیں۔ یہ داستانیں [illegible] افسانوں سے زیادہ دلچسپ، موثر اور رنگین ہیں۔ قیمت فی جلد صرف [illegible]

بے نام گلیاں پروفیسر کلام حیدری ایم اے [illegible] مجموعہ۔ قیمت [illegible]

شاہنامۂ اسلام (مکمل) نیا ایڈیشن [illegible] جالندھری کا شاہنامۂ اسلام [illegible] اسلامی تاریخ ہے۔ قیمتی [illegible] ایک روپیہ [illegible]

رسالہ بیسویں صدی دہلی


آنکھوں کی حفاظت زندگی کی حفاظت ہے
ریڈیم آئی ڈراپس
آنکھوں کی بہت سی بیماریوں میں مفید
لاکھوں گھروں میں استعمال ہوتی ہے
تندرست آنکھوں والے استعمال کریں
تو بینائی بڑھاپے میں بھی تیز رہتی ہے
باریک اور کثرت سے کام کرنیوالوں کو تو ریڈیم آئی ڈراپس کا استعمال ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ آنکھوں کی آنیوالی بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں
Radium
EYEDROPS
The World Known
سول ایجنٹس: میسرز نرائن داس بھگوانداس کیمسٹس چاندنی چوک دہلی
ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ - پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵ دہلی


سول ایجنٹس میسرز نرائن داس بھگوانداس کیمسٹس چاندنی چوک دہلی

واپسی ممکن نہیں۔ اگر مجھے دُکھ بھی اُٹھانا پڑے گا تو وہ بھی مجھے پیارا ہوگا۔

شاہد

میرے اپنے شاہد!

ایک مختصر سی تحریر مجھے ملی ہے۔ لیکن اُس میں آپ نے اپنے دل کا تمام درد بھر دیا ہے۔ اور مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں جو لکھنے کی مجھ میں کبھی ہمت نہ ہوتی۔ آپ نے مجھے بالکل بدل دیا ہیں آپ سے ہار مانتی ہوں۔ خدا جانے کیا کہنا چاہتی ہوں۔ کیسے کہوں؟

"یا کل شام کو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں کہ عصمت! ان دنوں تمھیں کیا ہو گیا ہے تمھیں اپنا دل بہلا کر خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اس طرح تم کھوئی کھوئی رہنے لگی ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ مجھے اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بہت جلد مر جاؤں گی۔ پھر خیال کیا رکھوں۔ یہی میں آپ سے بھی کہنا چاہتی ہوں کہ اگر ممکن ہو تو لوٹ جائیے۔ کیا فائدہ کہ میری آپ کی کہانی ایک غمگین انجام پر ختم ہو جائے۔

آپ کی۔ عصمت

میری عصمت!

آج کا دن کتنا مبارک ہے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ایک دن تم مجھے اپنا کہوگی۔ اور ہار مان لوگی۔ یہ بات میں نے تمھارے پہلے ہی خط سے سمجھ لی تھی۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل!

کھیل بچوں کا ہوا ، دیدہ بینا نہ ہوا

تم موت کی باتیں بہت آسانی سے کر لیتی ہو، اِس سے مجھے دُکھ ہوا لیکن پھر خوشی بھی ہوئی یہ سوچ کے کہ جو بہادر موت کے نام سے ذرا بھی خوف نہ کھائے اُسے موت جلد آ ہی نہیں سکتی۔ آخر وہ کون سی بات ہے جو تمھیں اس حد تک غمگین بنائے ہوئے ہے کہ تم نے فانی کی یاسیت کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے دُکھ اپنوں ہی سے کہے جاتے ہیں۔ پھر مجھے بھی بتا دو۔

تمھارا شاہد

شاہد صاحب!

مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں ہے۔ خدا نے مجھے ایسی ہی طبیعت کا بنایا ہے۔ میں نے آپ کو سچ مچ اپنا سمجھ لیا تھا لیکن مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ کے جذبات نے مجھے بہکا دیا تھا۔ اب میں اِس خیال سے اپنا پیچھا چھُڑانا چاہتی ہوں میرے پچھلے خطوط مجھے واپس کر دیجئے۔

میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس خیال سے بہت دُکھ ہوگا لیکن بعد میں سسکنے سے یہ بہتر ہے کہ ابھی خاتمہ کر لیجئے۔ میں جانتی ہوں آپ بہت نازک دل کے انسان ہیں لیکن میری اِس بے وفائی سے یہ مطلب نکال لیجئے گا کہ دُنیا کی تمام عورتیں فریبی ہوتی ہیں۔ اگر آپ یہ مطلب لیں گے تو یہ میری مجبوریوں کا اور میری فطرت کا مذاق اُڑانا ہوگا۔

آج میں نے اپنی تمام کتابیں جن میں محبت کے جذبات تھے الماری میں ہمیشہ کے لئے بند کر دی ہیں۔ یہ میری زندگی کا حل نہیں بن سکیں۔

عصمت

میری عصمت!

کئی ہفتے گزر گئے ہیں کہ تم نظر نہیں آئی ہو۔ آخری بار مجھے اُس چہرے کو دکھا دو جس کی پرستش کرنے کے بعد بھی مجھے کچھ نہ ملا تاکہ میں معافی مانگ سکوں۔ میں کالج اور تمھارا شہر چھوڑ کر چلا جانا چاہتا ہوں۔ اور کہیں تنہائی میں بیٹھ کر قدرت کے حُسن سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ کبھی مجھ سے بے وفائی نہ کرے گی۔ اُس کے آبشار اور سبزے میرے اِس غم کو مٹا سکیں گے۔ جو تم نے مجھے دیا ہے۔

شاہد

عصمت!

صد شکر کہ مدت بعد تم پھر نظر آئیں۔ چند لمحوں کے لئے اور میں کچھ کہہ بھی نہ سکا اس کی شکایت نہیں۔ شکایت صرف یہ ہے کہ تم نے اُس عصمت کو کہاں چھپا دیا جو پہلے مجھے ملتی تھی۔ حزن و ملال اِس چہرے پہ گہرا کیوں ہو گیا ہے۔ یہ تو پہلے ہی شاخ

سے ٹوٹا ہوا گلاب تھا۔ اب یہ گلاب مُرجھا کیوں گیا ہے؟ تمھارے اندر سے زندگی کا رس کون نچوڑ رہا ہے عصمت! کون ہے جس نے میری سوہنی کی تصویر کے رنگ دھو ڈالے ہیں صرف آخری بار مجھے اتنا اور لکھ دو۔ پھر میں تمھیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

سب سے پہلے میں آپ کو یہ خوشخبری سُنا دوں کہ آج پھر جیت گئے اور میں ہار گئی ہوں۔ جو ارادہ کہ میں نے کیا تھا وہ آپ نے ختم کر ڈالا۔ میں آپ کو دل کی گہرائیوں کیساتھ چاہتی ہوں لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ محبت نہ کروں۔ میں ڈرتی ہوں یہ سوچ کر کہ میں نے آپ کو یہ احساس ہی کیوں دیا۔ میں آپ کو کیوں نظر آئی۔ میں آپ کی گنہگار رہوں اور معافی چاہتی ہوں۔

میں نے اب تک کوشش کی کہ اپنے سر بے وفائی کا الزام لے کر یہ کہانی ختم کر دوں لیکن جب آپ کسی طرح نہیں مانتے تو پھر پورے یقین کے ساتھ وہی بات دہرانا چاہتی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی مجھے بے معنی سمجھ کر بھولنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح مجھے سکون مل جائے گا کہ میں نے اپنے محبوب کو بچالیا۔

میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ فطرت نے مجھے غم کا مریض بنایا ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق میں اچھی ہوں لیکن اپنے یقین کے مطابق میں زندگی کے مختصر ترین راستے پہ چل رہی ہوں۔ کیونکہ غمِ ہستی کا علاج موت کے سوا کون کر سکتا ہے؟ اس گلاب کی ساری سُرخی تو اُس نے چھین ہی لی ہے۔ اب آپ کسی دن سُن لیں گے کہ اُسے خاک میں بھی ملا دیا۔

خدا کے لئے اس کہانی کو یہیں ختم کر دیجئے۔ میرے لئے محبت کی معراج یہی ہے۔ شاید خدا کے حضور میں شرمساری سے اِسی طرح بچ سکوں کہ میں نے ایک انسان کو بچالیا۔

آپ کی عصمت

میری عصمت!

تمھارا خط پانے کے بعد میں شام سے اب تک یوُں ہی بیٹھا رہا ہوں۔ رات جانے کیسے چپکے سے گزر گئی۔ شاید نیند نے اپنے مخملیں قدموں میں میری پلکوں کو بھینچتے محسوس کیا ہوگا۔ جب ہی وہ ایک بار جانے کے بعد پھر تمام رات نہیں آئی۔ اس طرح میں نے رات کے ہر ہر لمحے کو تمھارے لئے سوچنے پر وقف کر دیا تھا۔ اب آبادی سے دُور گیدڑوں کی ہُو ہُو کی آوازیں کم ہو گئی ہیں۔ اور قریب کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگی ہیں وہاں بتوں کو جگایا جا رہا ہے۔ میں بھی اپنے بُتِ نامہربان کو جگانے کی کوشش کر رہا ہوں تم نے شاید مجھے نہیں سمجھا۔ میں تمھارے غمِ ہستی سے گھبرا کے یہ کہانی یہیں ختم کر دوں۔ ایسے میرا دل کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تم محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ پھول سے خوشبو جدا کر دی جائے۔ بلبل سے نغمہ سرائی کیسے چھینی جا سکتی ہے۔ اِس لئے میں تمھیں نہیں مرنے دوں گا۔ تم زندہ رہوگی میرے لئے اور اپنے لئے۔ لیکن آج میں تم سے وہ بات کہوں گا جسے اپنے پہلے کسی خط میں نہ کہنے کا وعدہ کر چکا ہوں کہ میرے ساتھ یہاں سے چلی چلو۔ تمھارا غم بے نام بے معنی نہیں ہے۔ آدمی کی بنائی ہوئی دُنیا میں زندگی کا حُسن نہیں ملتا۔ نہ خوبصورتی ملتی ہے۔ اس کے مصنوعی پن نے ہر انسان کو دُکھی کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ دن اِس سے دُور رہو۔ میں تمھیں اپنے گاؤں لے چلوں گا۔ اور وہاں سے دُور کھجوروں کے ہرے بھرے پیڑوں کے نیچے ہم دونوں ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہیں گے۔ ذرا سوچو تو جب جھیل کے پانی میں مرغابیاں اپنے پروں کو بھگو کر اُڑا کریں گی۔ جب سُورج طلوع ہوا کرے گا۔ جب سُورج ڈوبے گا۔ جب چاندنی پھیلے گی۔ جب بادل اُمڈیں گے۔ جب تم پرندوں کی چہکار سنوگی۔ جب تم آہو کے بے پروا خرام کو دیکھوگی۔ جب تم سبزے پر شبنم کے موتی دیکھوگی۔ جب تم آبشاروں کے گیت سُنوگی۔ جب تم ایسے سُہانے ماحول میں رہوگی تو کیا تمھارے غم تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔ عصمت! کائنات کا سارا حُسن ہمارے لئے ہے۔ اور اسی میں ہمارے دُکھوں کا مداوا ہے۔ بولو، تیار ہو؟

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

آپ کا خط پڑھنے کے بعد اور پڑھنے سے پہلے بھی میں اتنا تو سمجھتی تھی کہ میرے اِس نامعلوم غم کا علاج اِن دُنیا والوں کے پاس نہیں ہے لیکن میں یہ بھی نہیں مانتی کہ یہاں سے جا کر میں سکون پا سکوں گی۔ آپ جس زندگی کی طرف مجھے لے جانا چاہتے ہیں

وہ تو سنیاسیوں اور تارکِ دُنیا انسانوں کی ہے۔ آپ مجھے ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کے صحراؤں سے جانا چاہتے ہیں۔ مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ اب میرے اندر کوئی تازگی، کوئی اُمنگ نہیں رہی۔ غم پسند فطرت بھلا کیسے بدلے گی جب کہ اُس نے میرے جسم میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی ہیں۔ میں اپنے آپ کو مٹا چکی ہوں۔ اب جو میں باقی ہوں اُس پہ گھر والوں کو اپنی تیمارداری آزمانے دیجئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

آپ کی عصمت

عصمت!

میں نے مان لیا کہ واقعی تم عجیب ہوگی۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہم دُنیا کو چھوڑ دیں گے۔ سچ پوچھو تو آجکل ہم نے آدھی دُنیا چھوڑ رکھی ہے۔ کتنے انسان ہیں جو اپنی بنائی ہوئی دُنیا میں سِسک سِسک کر مر جاتے ہیں۔ بے چین، ناآسودہ اور بے قرار زندگی بسر کرتے ہیں لیکن خدا کی بنائی ہوئی سہانی دُنیا سے دُور رہتے ہیں۔ جس کا حُسن انھیں تمام آلام سے چھڑا سکتا ہے۔ اور اُن کے دل کے تاروں پر مسرت سے بھر پور نغمہ گا سکتا ہے۔

تم ابھی نہیں سمجھوگی۔ آج شام کو مجھ سے ملو۔ اب میں زبانی باتیں کروں گا۔ اگر تم نہیں ملیں تو میں تم سے دُور چلا جاؤں گا۔ پھر تم کبھی مجھے نہ دیکھو گی۔ میرا یہ آخری خط ہے۔

تمھارا شاہد

میرے شاہد!

میں آج پھر ہار گئی۔ نہ جانے کیوں میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ ملونگی۔

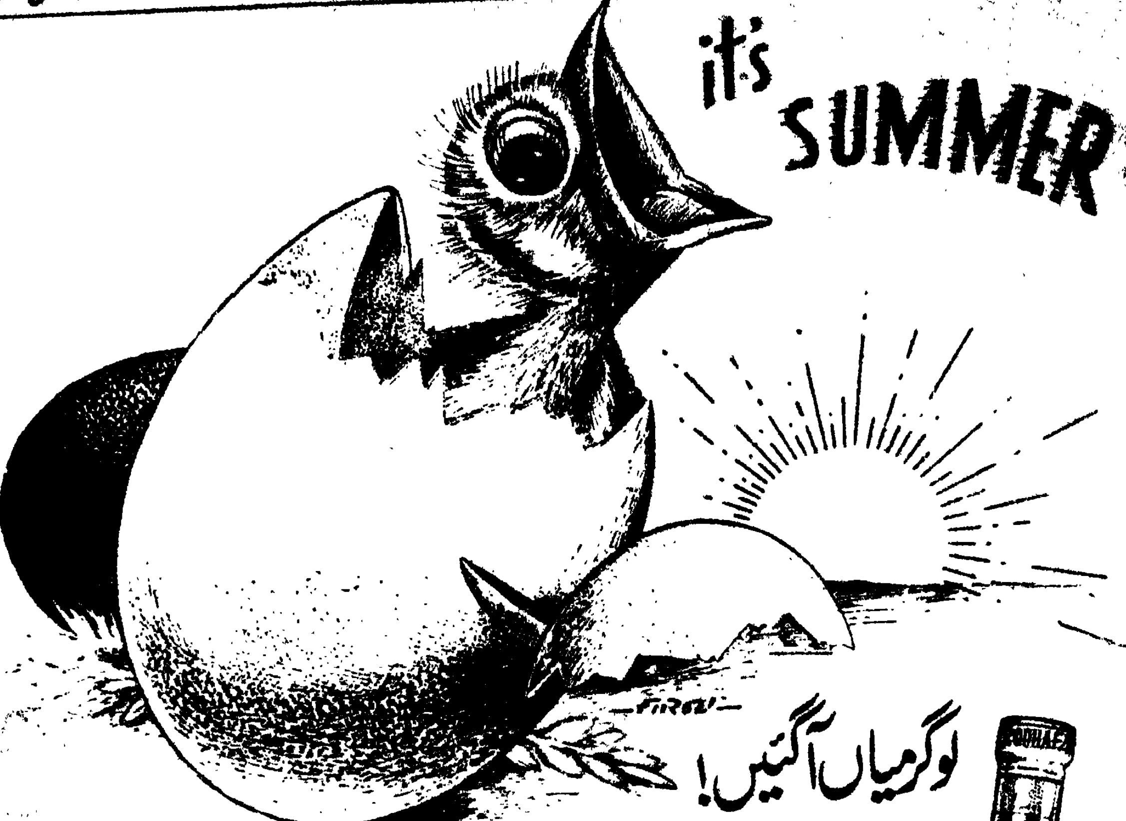
آپ کی عصمت

میری اچھی آپا، آداب

اِتنے عرصے کے بعد آپ میری تحریر دیکھ کر اُچھل پڑیں گی کہ آپ کو کھوئی ہوئی عصمت مل گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے اِس طرح چلے آنے کے بعد آپ کے اور امّی اور ابّا کے دل پہ کیا گزری ہوگی اور ہمارے اُن رشتہ داروں نے جو ہمارے دشمن ہیں مجھ پر کتنی بیہودہ تہمت لگائی ہوگی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں ہر طرح خیریت سے ہوں۔ میں شاہد کے ساتھ اِن کے گاؤں چلی آئی ہوں۔ بلکہ گاؤں سے بھی کچھ دُور جہاں ہم رہتے ہیں وہاں اور کوئی آبادی نہیں ہے۔ ہاں ہرنوں، بیل گایوں، خرگوشوں اور سبزہ زاروں اور ہرے بھرے درختوں اور جھیل اور آبشاروں کی آبادی ہے۔ مجھے اپنے ان پڑوسیوں سے بے حد محبت ہوگئی ہے۔ میں انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اِسلئے ہم نے سوچا ہے کہ اب یہیں ایک بنگلہ بنوالیں گے تاکہ یہ ہم سے جدا نہ ہوسکیں۔ آپ مجھے دیکھیں گی تو شاید پہچان بھی نہ پائیں گی کہ یہ وہی دُبلی پتلی زرد رو عصمت ہے۔ جو ہر وقت اُداس رہا کرتی تھی اور پلنگ پہ لیٹی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ یا خلاؤں میں گھنٹوں گھورتی رہتی تھی اور کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ میں خود بھی نہیں سمجھتی کہ اس کی کیا وجہ ہے لیکن اب میں بالکل بدل گئی ہوں۔ اکثر میں چشمے کے پانی میں اپنی صورت دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ اِتنی سُرخی میرے اندر کس نے بھر دی؟ میرا دل ہر وقت ہنسنے کو چاہتا ہے بھاگنے دوڑنے کو چاہتا ہے۔ ہرن کی طرح۔ اور میں اکثر سبزے پہ بھاگتی بھی ہوں۔ جب تھک جاتی ہوں تو سستانے کو لیٹ جاتی ہوں۔ اور اِس طرح مجھے اتنا سکون ملتا ہے جس کا تصور آپ وہاں کمروں میں بیٹھ کر نہیں کرسکتیں۔ آپ جو زندگی گزارتی ہیں وہ تو بالکل زنداں کی طرح ہے۔ بناوٹی اور تکلیف دہ ہے۔ اچھی زندگی میری آپا یہی ہے جو قدرت کی گود میں گزاری جائے جہاں پہنچکر انسان کے دُکھ درد اُس سے دُور بھاگ جاتے ہیں۔ اور اپنا سایہ بھی نہیں چھوڑ جاتے۔ شاید آپ جانتی ہوں گی شاہد کو میرے کمرے کے سامنے رہتے تھے۔ انھیں نے مجھے یہ نئی زندگی، حسین زندگی دی ہے۔ وہ کتنے اچھے اور پاکیزہ خیالات کے انسان ہیں یہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ سچ مچ آپ کو اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے مجھے زندگی دی ہے۔ ہاں آپ ایک بات پر اُن سے ناراض ہوسکتی ہیں کہ انھوں نے اُس عصمت کو کھو دیا جو آپ کے سامنے تھی۔ بیمار اور غمزدہ عصمت کو!

امّی اور ابّا کو میرے بارے میں بتا دیجئے۔ وہ اور آپ میری یہ خطا معاف کردیں کہ میں اِس طرح چلی آئی ہوں۔ جب آپ لوگوں کی طرف سے جواب مل جائے گا تب میں آؤں گی۔ ہاں ایک بات آپ کے کان میں کہنا چاہتی ہوں کہ وہاں پہنچنے کے بعد میں اور شاہد ایک ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہمارے دل ایک ہوچکے ہیں لیکن آپ کی دُنیا کا ہم اتنا احترام ضرور کریں گے کہ اُسکے سامنے بھی ایک ہو جائیں۔ آپ جس پتے پر مجھے خط لکھیں گی وہ نیچے درج ہے۔ امّی اور ابّا کو میرا سلام کہئے۔

آپ کی عصمت


it's
SUMMER

فرحت بخش مشروبہ

موسم گرما سے پیدا ہونے والی نظام معدہ کی خرابیوں کو دُور کرتا ہے



گرمی کے موسم میں نظام معدہ ہر ذرا سی غفلت سے بگڑ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے منہ کا ذائقہ خراب ہوجاتا ہے اور کاہلی و سستی پیدا ہوجاتی ہے۔ اینو معدہ کی خرابیوں کو دُور کرتا ہے اور آپ کے پیٹ کے نظام کو باقاعدہ کرکے اسے دُرست اور عمدہ حالت میں رکھتا ہے۔

اینو تیز ہونے کے باوجود غیر ضروری تیزآبی مادّوں کی پوری مدافعت کرتا ہے۔ یہ غیر ضروری تیزآبی مادّوں سے پیدا ہونے والی بادی، دِل کی جلن اور بدہضمی کو جلد اور یقینی طور پر روکتا ہے۔ پینے کے آٹھ سکنڈ بعد ہی آپ خوشگوار تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔۔۔ نہ صرف معدہ میں بلکہ کام و دہن میں بھی!

اینو معدہ کی ان خرابیوں کی بھی اصلاح کرتا ہے جو زیادہ غذا یا ناموافق غذا کھا لینے کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ اگر آپ ہلکے جلاب کی ضرورت محسوس کریں تو خوراک کی مقدار تھوڑی سی بڑھا کر اسے خالی پیٹ پی لیجئے۔ اینوز فروٹ سالٹ کی ایک بوتل گھر میں ہمیشہ موجود رکھئے۔

یہ مُفید بھی ہے
اور ساتھ ہی ساتھ تازگی بخش بھی

اینوز
"فروٹ سالٹ"



بڑی شیشی تین روپے بارہ آنے
چھوٹی شیشی دو روپے چھ آنے
اور اس کے علاوہ مقامی ٹیکس

ENO. 1309

'اینو' اور 'فروٹ سالٹ' یہ الفاظ رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہیں

کئی دن سے

از

جناب مخمور سعیدی

پہلو میں ہے وہ جانِ بہاراں کئی دن سے
آباد ہے اک جنتِ ویراں کئی دن سے

پردوں میں تصوّر کے جو تھا انجمن آرا
نظروں میں ہے وہ جلوۂ پنہاں کئی دن سے

مستی ہے ہواؤں میں مچلتی ہوئی ہر سمت
جلوے ہیں فضاؤں میں پرافشاں کئی دن سے

جو تشنگیِ دید سے پتھرائی ہوئی تھیں
اُن آنکھوں میں ہیں حُسن کے طوفاں کئی دن سے

جس گھر پہ برستے تھے جہنم کے شرارے
وہ گھر ہے اب اک خلدِ گُل افشاں کئی دن سے

بے کیفیِ حرماں میں جو دل ڈوب چکا تھا
وہ دل ہے اور اک نشۂ ارماں کئی دن سے

اک آفتِ جاں شوخیِ مضرابِ نظر نے
چھیڑا ہوا ہے سازِ رگِ جاں کئی دن سے

جس سازِ شکستہ کا ہر اک تار تھا خاموش
وہ سازِ شکستہ ہے غزلخواں کئی دن سے

گرتے تھے کبھی خاک پہ جو اشکِ محبت
وہ اشک ہیں اُن کے سرِ داماں کئی دن سے

اِس دل سے جو اُن شوخ نگاہوں نے کیا تھا
شرمندۂ ایفا ہے وہ پیماں کئی دن سے

جس درد کا درماں کوئی دُنیا میں نہیں تھا
وہ درد ہے خود اپنا ہی درماں کئی دن سے

مخمور خوشا اُن کی نگاہوں کا تصرف
ٹھہری ہوئی ہے گردشِ دوراں کئی دن سے

غزل

از

جناب امرت لال عشرت ایم - اے

میں جو منزل سے کچھ قریب ہوا
اک زمانہ مرا رقیب ہوا

تیرا آنچل صبا کا جھونکا ہے
اِس کا سایہ کسے نصیب ہوا

یا ہوئے میکدے میں ہم رُسوا
یا گلستاں میں عندلیب ہوا

ہم بہت دُور ہو گئے جس سے
وہ رگِ جاں سے بھی قریب ہوا

پھول کے لب اُنھیں ملے عشرت
اوس کا دل ہمیں نصیب ہوا


آپ کا آئینہ
آپ سے کسطرح
مخاطب ہوتا ہے؟
اپنی جلد اور رنگت کی حفاظت کرنا اور اسے
نشوونما بہم پہنچانا لازمی ہے۔ ایک سمجھدار
لڑکی ہونے کے ناتے سے وہ جانتی ہے کہ
اک نازک جلد کا خیال ہر روز "ہیزلین"
سنو" "'HAZELINE' SNOW"
لگاکر آرام کرنے سے رکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ ہلکے
سے جلد کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اسے ملایم، سفید
اور پُرشباب زندگی بخشتا ہے۔
"'HAZELINE' SNOW"
(TRADE MARK)
"ہیزلین، سنو" (ٹریڈ مارک)
HAZELINE SNOW
بروز ویلکم اینڈ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ، بمبئی

افسانہ

سپنے بکھر گئے

از

جناب خالد سلمان

نارگھاٹ۔ مرزاپور ــــــ ۱۸ جنوری ۱۹۵۹ء

محترم خوشتر صاحب! تسلیم

ایک عرصہ سے بیسویں صدی کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کے دم سے اُردو میں ایک ایسا رسالہ موجود ہے جو بلند پایہ اور پاکیزہ ہے ورنہ دوسرے رسائل کی حالت تو کسی سے چھپی نہیں۔ اِس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ بیسویں صدی کے لئے ایک نفسیاتی تخلیق بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ افسانہ آپ کو پسند آئے گا۔ اور بزمِ بیسویں صدی میں شامل ہوگا۔ یہ عنوان اگر پسند نہ آئے تو "رات تاریک تھی" یا جو آپ مناسب سمجھیں کر دیں۔

سالنامہ بہت خوب تھا۔ خواجہ احمد عباس، سلام مچھلی شہری اور نیاز قومی کی تخلیقات بہت خوب تھیں ــــ اگر افسانہ بیسویں صدی کے معیار کا نہ ہو تو واپس کر دیجئے گا۔

خلوص کار

خالد سلمان

وہ اپنی مسہری پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسوؤں کے سوتے اُبلتے رہے اور تکیہ بھیگتا رہا۔ کمرے پر خاموشی چھائی تھی۔ اور اُس خاموشی میں کبھی کبھی اُس کی سسکی اُبھرتی اور فضا میں غائب ہو جاتی۔ شام کے طویل سائے اب معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ اور رات کی تیرگی کا دامن دراز ہو رہا تھا۔ وہ اُسی طرح پڑی رہی، دل سُلگتا رہا۔ آنسو بہتے رہے۔

خادمہ نے کمرے میں داخل ہو کر روشنی کر دی۔ میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر بولی ــ

"مِس صاحب! چائے"

نہ جانے کیوں وہ خادمہ کو شعلہ ریز نظروں سے دیکھنے لگی۔ خادمہ حیران حیران سی کمرے سے نکل گئی۔ اور وہ تکیہ پر سر رکھ کر پھر رونے لگی۔ کھولتی ہوئی چائے کیتلی میں رکھے رکھے ٹھنڈی بھی ہو گئی لیکن وہ اُسی طرح پڑی رہی۔ وہ سوچنے لگی ــ کئی بار اِس سے پہلے بھی اِسے صدموں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے اُس نے غمِ دوراں کی تلخی کا مقابلہ کیا تھا۔ لیکن یہ دل کی تلخی، احساس کی تلخی تھی دل نے چپکے سے کہا ــ کیا اِس کا مداوا نہیں؟ اُس نے سرد آہ بھر کر کہا، نہیں، شاید میرے درد کا مداوا نہیں۔ ورنہ میری زندگی اِس طرح سونی سونی، اُداس اُداس نہ ہوتی۔ میری زندگی کا عہدِ بہار بھی ہم رنگِ خزاں نہ ہوتا۔ مسکراہٹیں مجھ سے رُوٹھ جاتیں مسکراہٹیں سرد سرد آہوں کا روپ نہ دھارلیتیں ــــ اور جیسے اُس کی زندگی کا سوناپن، تنہائی کا تلخ احساس اُس کے چہرے پر چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد لنگڑاتی ہوئی مسز چیٹرجی اپنے دونوں خوبصورت کتوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ تعظیماً کھڑی ہو گئی۔

"ہیلو مس زہرہ! طبیعت کیسی ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ مرجھائی آواز میں بولی لیکن سر میں کچھ درد محسوس کر رہی ہوں۔"

"آج تم کوئی ورک نہ کرو اور جلدی سو جاؤ۔ صبح ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

گرلز کالج کی لنگڑی پرنسپل۔ جس میں اُسے خلوص ملا۔ پیار کی جھلک دکھائی دی۔ اُس کا بھی جی چاہا یہ اسی طرح اُس سے باتیں کرتی رہیں۔ لیکن وہ چلی گئیں اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے کتوں کے اُن خوبصورت بچوں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

گرلز کالج کی اُستانیوں کا وہ ہوسٹل شہر کی بڑی اور بارونق سڑک پر تھا۔ سڑک کے ایک طرف دو منزلہ ہوسٹل تھا اور دوسری طرف بڑی بڑی دکانیں۔ اس ہوسٹل میں تیس اُستانیاں اور ایک پرنسپل رہتی تھیں۔ وہی ہوسٹل کی وارڈن تھیں۔ اور صرف وہی شادی شدہ تھیں۔ باقی سب گھر سے دور منزل کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ اُن کے ماں باپ اس بیکاری کے دور میں مدد کرنے سے لاچار تھے۔ اور قریب قریب ساری ایم اے کر رہی تھیں اور نیچے درجوں کو پڑھا رہی تھیں۔ یہ زندگی کے دور بہاریں سے گزر رہی تھیں لیکن ان کی زندگی ہم رنگ خزاں تھی۔ سونی سونی اور اُداس اُداس۔

برابر کے کمروں کی روشنیاں ایک ایک کر کے بجھتی گئیں۔ وہ کمرے سے نکل کر بارجے پر آگئی۔ نیچے سڑک ویران ہو چلی تھی۔ چند دکانیں کھلی تھیں اور انھیں میں مقصود اسٹور کی نیلگوں روشنی بھی چمک رہی تھی۔ نیلگوں روشنی میں سے اُسے طارق کا مسکراتا چہرہ اُبھرتا ہوا محسوس ہوا۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی درختوں سے گزر رہی تھی۔ اور ایسا نغمہ نکل رہا تھا جیسے کوئی چپکے چپکے سسک رہا ہو۔ بارجے کے ایک گوشے میں بجلی کا ایک قمقمہ ٹمٹما رہا تھا لیکن بارجے کا دوسرا گوشہ قریب قریب تاریک تھا۔ رات کی مہیب تیرگی میں اُس قمقمے کی کیا بساط تھی۔ اُس نے ایک ستون کا سہارا لے کر ٹھنڈی سانس لی۔ اور مقصود اسٹور کی جانب دیکھ کر سوچنے لگی ——

ایک مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ اور اُس کی ساتھی اُستانیاں شاپنگ کو نکلی تھیں۔ کئی دکانوں میں وہ گئی تھیں لیکن پسند کی چیزیں نہیں ملی تھیں۔ وہ قریب قریب مایوس ہو کر لوٹ رہی تھیں کہ مقصود اسٹور کے پاس مس رائے نے اُس کا کندھا دبایا۔

"اِس دکان پر دیکھا جائے۔"

اور وہ سب دکان میں داخل ہو گئی تھیں۔ اُن کے داخل ہوتے ہی ایک خوش پوش اور خوبرو نوجوان نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا تھا ——

"آیئے آیئے اندر تشریف لے آیئے۔"

"مجھے پیرس کا پوڈرا سیٹ چاہیے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔ وہ کاؤنٹر پر اکیلی تھی۔ اور سب شوکیس میں لگی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے پیرس صابن کا پوڈرا سیٹ نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ڈبہ کھول کر اندر دیکھنے لگی تھی اور پھر سر اُٹھا کر جو اُس نے قیمت پوچھنی چاہی تو بالکل ہی سامنے اُسے پایا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پسینے کی چند بوندیں پیشانی پر جھلملا رہی تھیں۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ کبھی اتنا قریب اُس نے کسی مرد کو نہ پایا تھا۔

"اِسکی ...... اِس کی کیا قیمت ہے؟"

وہ ہنس پڑا۔

"آپ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ گرمی جو ہے نا۔ ابھی شربت منگواتا ہوں۔"

"جی نہیں شکریہ!" وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔ "شربت وربت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کی کیا قیمت ہو گی؟"

"پونے نو روپے۔"

وہ اپنے پرس سے روپے نکالنے لگی تھی۔ اتنی دیر میں دوکان کے ملازم سے اُس نے شربت کے لئے کہہ دیا تھا۔

اُس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لی اور پھر خیالوں میں گم ہو گئی —— ایک مہینے کی پہلی تاریخ تھی اُس دن وہ اکیلی ہی اُس دکان پر گئی تھی۔ اُس نے کچھ مانگا تھا۔ دکان کا ملازم اندر اُس کی طلب کی ہوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ وہ انتظار میں دکان میں لگے ہوئے ایک کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔ ایک موٹا تازہ اور تندرست سا بچہ ہنس رہا تھا۔ شاید گلکسو کا کیلنڈر تھا۔ اُسے وہ بچہ بہت پیارا لگا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی تھی۔ اُس کے دل میں بھی بہت دنوں سے چاہ تھی کہ اُس کی گود میں بھی کوئی ہنستا کھیلتا بچہ ہو۔ وہ بھی

[redacted]

ماں بنے۔ لیکن اُس کی یہ چاہ زندگی کے تیس سال گزر جانے پر بھی پوری نہیں ہوئی تھی اور صرف تمنا ہی تھی۔ جوانی کی منزل سے گزر کر وہ ادھیڑ ہونے والی تھی۔ لیکن اُس کی شادی نہ ہو سکی اور نہ وہ خود کر پائی۔ وہ کرتی بھی تو کیسے۔ اپنے گھر والوں کو خرچ بھیجتی باپ کا قرض ادا کرتی۔ اور خود اپنا خرچ چلاتی۔ گھر میں وہ سب سے بڑی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ جو اُسی کے ساتھ رہ کر پڑھتا تھا۔ باپ مر چکے تھے اور قرض چھوڑ گئے تھے۔ ماں قصبہ میں موروثی مکان میں رہتی تھیں۔ اور اُس کا چھوٹا بھیا اسکول جاتا تھا اور سودا لاتا تھا۔ یہاں شہر میں وہ کالج میں پڑھا رہی تھی۔ اور ایم۔ اے کا امتحان دینے والی تھی۔ اُس نے اپنا شریکِ حیات چُننے کی فکر ہی نہ کی تھی۔ اور چُننے سے حاصل بھی کیا تھا لیکن ماں بننے کا فطری جذبہ اُس کے دل میں شدّت سے موجود تھا۔ وہ اُس ہنستے ہوئے بچّے کی تصویر سے اِتنی متاثر ہوئی تھی کہ اُٹھ کر دیوار تک چلی گئی تھی۔ لیکن وہ بچہ اُس کی گود میں نہ آیا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔

"اگر آپ کو کیلنڈر اپسند ہے تو شوق سے لے جائیے"

وہ چونک پڑی تھی۔۔۔

"آں۔ مجھے۔ جی نہیں! ایسی بات تو نہیں۔ لیکن جی ہاں میں ضرور اِسے لے جاؤں گی۔ ضرور۔۔۔"

پھر وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ کہ وہ اُس کی ایسی باتوں سے نہ جانے کیا سمجھ رہا ہو گا۔ وہ عجیب جذبات و احساسات لئے واپس چلی آئی تھی۔

اور پھر اُس کے کمرے میں موٹے تازے اور ہنستے کھیلتے ہوئے بچّوں کی تصویروں والے کیلنڈروں میں اضافہ ہوتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کے اخراجات بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ کیونکہ اب وہ کچھ نہ کچھ خریدنے کے بہانے ہفتے میں دو ایک بار مقصود اسٹور ضرور جاتی تھی۔ روز رات کو وہ بارجے میں کھڑی رہتی۔ یہاں تک کہ مقصود اسٹور کی روشنی غائب ہو جاتی اور طارق سیٹی بجاتا ہوا گھر چلا جاتا۔ اس کے بعد وہ بھی لیٹ جاتی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ زہرہ مقصود نام اچھا رہے گا۔

رات اور تاریک ہو گئی تھی۔ سڑک اب بالکل ویران تھی۔ لیکن مقصود سٹور کی نیلی روشنی چمک رہی تھی۔ وہ بارجے میں ستون کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ وہ پھر سوچنے لگی۔۔۔

چند گھنٹے پہلے جب وہ کالج سے پڑھا کر لوٹی تو مقصود اسٹور میں گئی تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے ایک رنگین لفافہ اِس کی جانب بڑھایا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

اِس نے مسکراتے ہوئے لے لیا تھا۔

"آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔" وہ شرما کر بولا تھا۔ اُس نے لفافہ کھولا اور پڑھنے لگی تھی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کا بچہ مسکراتے مسکراتے رونے لگا ہو۔

وہ چکرا کر کرسی پر گر گئی تھی۔

مقصود سٹور کی نیلگوں روشنی بجھی اور اس کے بعد نیچے سڑک پر ایک نوجوان نے سیٹی بجاتے ہوئے گرلز کالج کی اُستانیوں کے بارجے کی طرف دیکھا۔ اُس نے مُنھ پھیر لیا۔ کمرے میں آ کر میز پر رکھے شادی کے دعوت نامے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فرش پر بکھیر دیا۔ اور ٹکڑوں کو کچلتی ہوئی مسہری پر گر پڑی۔ تکیے میں مُنھ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگی۔۔۔

اُس کے رنگین و خوش آئند سپنے بکھر گئے۔۔۔

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئیے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں اُنھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔

چاندنی رات

از
جناب چوہدری بشیر احمد تارڑ پی سی۔ایس ڈپٹی کمشنر سرگودھا

نور کا آب شار گرتا ہے
آسماں سے نکھار گرتا ہے

سیمیں کرنوں کا رقص پانی پر
جیسے مے کا اثر جوانی پر

گلستاں پر ہے بارشِ انوار
دودھ میں غسل کر رہی ہے بہار

شب کے ماتھے پہ چاند کا جھومر
لوٹتا ہے متاعِ قلب و نظر

پھول اِس طرح مسکراتے ہیں
جامِ گُل رنگ یاد آتے ہیں

آسماں پر نجوم ہیں ہر سُو
مشعلوں کے ہجوم ہیں ہر سُو

جب ستارے نظر مِلاتے ہیں
دل میں جذبات جاگ جاتے ہیں

نور ہی نور ہے فضاؤں میں
گھُل گیا طور تک ہواؤں میں

کس قدر کیف، کتنی مستی ہے
چاندنی رات دل کو ڈستی ہے

غزل

از
جناب محمد عثمان عارف ایم۔اے ایل ایل بی

دل کے مٹنے کا مجھے تو کوئی ایسا غم نہیں
کیوں ترے نازو ادا کا آج وہ عالم نہیں

اب تری فرقت میں جینا موت سے کچھ کم نہیں
چاندنی راتوں میں بھی وہ نور کا عالم نہیں

میں نے مانا بے وفائی ہے زمانے کا چلن
آپ بھی شامل ہیں اس میں اور تو کچھ غم نہیں

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیئے
بے کسی میں یاد بھی تیری کرم سے کم نہیں

احترامِ جلوہ عارف ہے نگاہوں میں اگر
بارگاہِ حُسن میں پھر عشق نامحرم نہیں

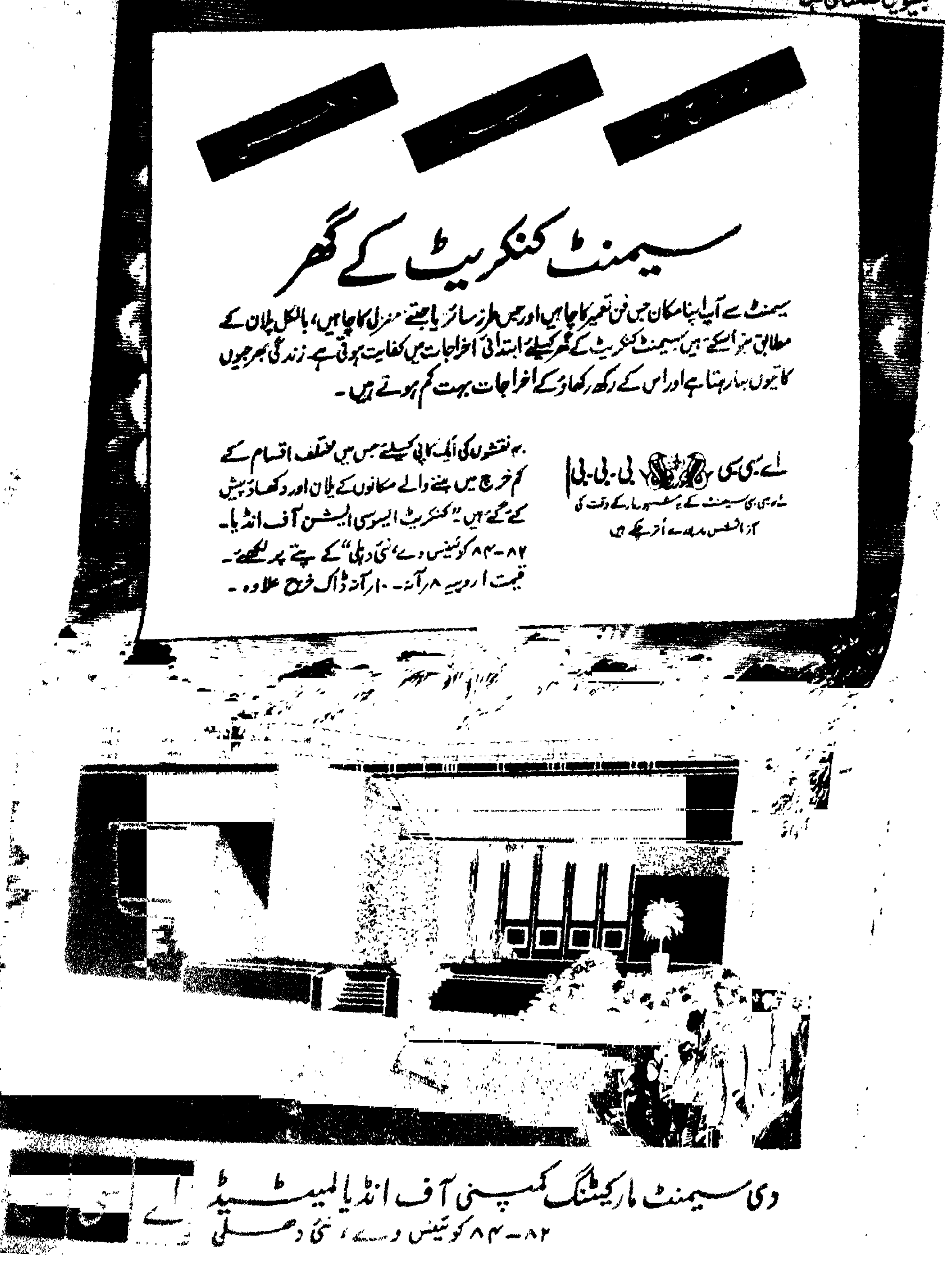
ڈیومیکس

بے بی فوڈ اسقدر محفوظ کیوں ہے؟

اسلئے کہ یہ ایسی گایوں کے دودھ سے بنایا جاتا ہے جن کو پرکھ کر یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ ان میں دق کے جراثیم نہیں ہیں۔ اور آپ کا ڈاکٹر کہے گا کہ ایسی گایوں کا دودھ جن کو دق کے جراثیم سے پاک پرکھ لیا گیا ہے۔ آپکے بچے کیلئے نہایت خالص اور محفوظ ترین دودھ ہے۔ ڈیومیکس آسانی سے ملایا جاتا ہے یہ آسانی سے ہضم ہوتا ہے۔ اس میں ڈیری کی تازگی بخش خوشبو ہوتی ہے۔ اسلئے بچے ڈیومیکس پسند کرتے ہیں۔

ڈیومیکس
بے بی فوڈ

بچوں کو ڈومیکس دیجئے، پھر دیکھئے وہ کسطرح پھلتے پھولتے ہیں


سیمنٹ کنکریٹ کے گھر
سیمنٹ سے آپ اپنا مکان جس فن تعمیر کا چاہیں اور جس طرز سائز یا جتنے منزل کا چاہیں، بالکل پلان کے مطابق بنوا سکتے ہیں سیمنٹ کنکریٹ کے گھر کیلئے ابتدائی اخراجات میں کفایت ہوتی ہے۔ زندگی بھر جیوں کا تیوں بنا رہتا ہے اور اس کے رکھ رکھاؤ کے اخراجات بہت کم ہوتے ہیں۔
۳۰ نقشوں کی ایک کاپی کیلئے جس میں مختلف اقسام کے کم خرچ میں بننے والے مکانوں کے پلان اور دکھائے گئے ہیں "کنکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا۔ ۸۲-۸۴ کوئینس وے، نئی دہلی" کے پتے پر لکھئے۔ قیمت ا روپیہ ۸ر آنہ - ۱۰ر آنہ ڈاک خرچ علاوہ۔
اے۔سی۔سی بی۔بی۔بی
دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ
۸۲-۸۴ کوئینس وے، نئی دہلی

افسانہ

غلط فہمی

از

جناب اقبال فرحت اعجازی

تاجو خیل شاہجہان پور

محترم خوشتر بھائی! تسلیمات

"غلط فہمی" کا موضوع خطرناک ضرور ہے لیکن میں نے بہت سنبھال کر قلم اُٹھایا ہے۔ اگر آپ کو اس میں کہیں اعتراض ہو تو مجھے واپس کر دیں۔ ویسے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں نے اسے کہیں بھی عریاں نہیں ہونے دیا ہے۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ہمیشہ بیسویں صدی کا

اقبال فرحت اعجازی

نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اکبر نہیں چاہتا تھا کہ اپنی نئی نویلی، بہت ہی پیاری پیاری سی رعنا کی کسی بات کو ٹالے۔ چھوٹی موٹی باتیں تو وہ بغیر کسی حیل حجت ہی کے پوری کر دیا کرتا تھا۔ لیکن حال ہی میں گاندھی میموریل ہاکی ٹورنامنٹ کا اعلان سن کر جب رعنا نے اُسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی وہ عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ کر رہ گیا تھا۔ اگر یہ خواہش محض خواہش ہی رہتی جب بھی غنیمت تھا لیکن جیسے جیسے ٹورنامنٹ کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی رعنا کی یہ خواہش ضد میں بدلنے لگی۔ بلکہ ایک دن تو وہ روآنسو ہو گئی۔

"جائیے ہم نہیں بولتے آپ سے۔ آپ ہماری اتنی سی بات تو پوری کرتے نہیں۔ پھر آپ سے کیا امید کی جائے؟"

اُسے کب انکار تھا کہ رعنا ٹورنامنٹ دیکھنے نہ جائے لیکن وہ شہر میں [illegible] [illegible] چاہتا تھا۔ یہ صحیح کہ وہ پردے کا قائل نہ تھا۔ لکھنؤ، دہلی اور کانپور میں رعنا [illegible] ہاتھ میں ہاتھ دیے کریوں ہی گھومتا پھرا تھا۔ لیکن یہ اپنا شہر تھا اور اپنے شہر [illegible] آدمی چاہے کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو تھوڑا بہت تو رجعت پسند بن ہی جاتا ہے

اور پھر یہ شہر بھی ایسا شہر تھا جہاں لڑکیوں کو سات تالوں میں بند کر کے رکھا جاتا تھا اگر کوئی ذرا سا بھی قدم اس کے خلاف اُٹھاتا تو چاروں طرف اُس کی تھو تھو ہو جاتی اُس کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا۔ اُسے کافر اور [illegible] جاتے۔ اسکول کے لڑکوں کو اُس کے پیچھے لگا دیا [illegible] ہو کر رہ جاتی۔ اکبر کے سامنے [illegible] گوارا بھی [illegible] لیکن [illegible]

[illegible]

دل پر پتھر رکھ کر [illegible]

[illegible]

"تو [illegible]

[illegible]

اکبر سب کچھ برداشت کرسکتا تھا لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ رعنا کو اس کے گھر کے مقابلے میں اپنے میکے کی یاد ستائے۔ شام کو جب وہ آیا تو اس نے دو سیزن پاس رعنا کے آگے ڈال دیئے۔

"یہ لو پاس میں ابھی رونذر کمار ٹکیت سے لے کے آتا ہوں۔ تم اپنی ساریاں نکال لو۔ روزانہ اس کی بیوی کے ساتھ چلی جایا کرنا۔"

"لیکن میں تو آپ کے ساتھ بیٹھ کر میچ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تم ایسا کرو" وہ جل کر بولا "کسی قصاب سے چھری مانگ لاؤ اور میرے گلے پر پھیر دو۔ اور جب میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں تو قیمہ بنا کر میرے کباب تل کے کھا جاؤ۔"

"میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔" اس نے اکبر کے غصے کا اثر ہی نہیں لیا۔ "میں لڑکا بن کر آپ کے ساتھ کیوں نہ چلی چلوں۔"

"دنیا میں سب تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے؟ فینسی ڈریس میں ہمیشہ اوّل آیا کرتی تھی۔"

"وہ اور بات تھی ... تم پتہ نہیں رعنا آج کل کیسی عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ اور وہ اپنے دوست رونذر کمار ٹکیت کے ہاں ٹورنامنٹ کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنے چلا گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ رونذر کمار ٹکیت کی بیوی بریلی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کے اس طرح بے وقت چلے جانے پر وہ افسوس کر ہی رہا تھا کہ نوکر نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ٹکیت سے ملنا چاہتے ہیں۔

"انھیں یہیں لے آؤ" ٹکیت نے کہا۔

نوکر باہر جاکر پھر چلا آیا۔

"وہ اندر نہیں آنا چاہتے۔ آپ کو وہیں بلا رہے ہیں۔"

ٹکیت معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اندر آگیا۔

"عجیب شخص ہے کوئی۔" اس نے بتایا "کہتا ہے آپ نہ ٹکیت صاحب ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ بولا اکبر صاحب اگر آپ کے ہاں ہوں تو انھیں باہر بھیج دیجئے۔ سیدھی سی بات تھی۔ چاہتا تو تمھیں نوکر کے ذریعے پہلے ہی بلا سکتا تھا لیکن اُسے تو مجھے بھی پریشان کرنا مقصود تھا۔ جاؤ، ہو آؤ تم بھی۔"

اکبر باہر گیا۔ ایک خوبصورت سا لڑکا سوٹ پہنے کھڑا تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔

"فرمائیے!"

اجنبی لڑکے نے جواب میں اپنے سر سے فلٹ کیپ اُتار لی —

"پہچانا مجھے؟"

"ارے آپ کو نہیں پہچانوں گا تو پھر کسے پہچانوں گا؟" اکبر کھلکھلا اُٹھا "بھلا آپ کو بھول سکتا ہوں۔ یہ ٹوپی آپ پھر پہن لیجئے۔ اور چلئے اندر۔"

اندر پہنچکر اس نے اجنبی لڑکے کو ٹکیت سے متعارف کرایا۔

"آپ سے ملو۔ یہ میرے سالے ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب!" ٹکیت نے بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا اسم شریف؟"

"ناچیز کو ...." اکبر نے بتایا "ناچیز کو سید احمد علی کہتے ہیں"

ٹکیت نے چائے کے لئے گھر میں کہلوایا تو اکبر نے صاف انکار کردیا۔

"آج تو کسی ریسٹوران میں چائے پئیں گے چلو۔"

تینوں اُٹھ کر چل دیئے۔ اکبر اپنے سالے کو بازار میں گھماتا ...

"لو بھئی اپنی باجی کے لئے اپنی پسند کی چوڑیاں خرید لو ... اپنے لئے اپنی پسند سے ساریاں لے لو۔ اپنی باجی کے لئے اپنی پسند ... اور وہ خرید لو۔"

بہت کافی خرید و فروخت کے بعد اُن لوگوں نے ... جاکر چائے پی جہاں بے شمار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ واپسی ... چھوڑنے کے لئے اکبر کے گھر تک گیا۔

اندر بیٹھک میں پہنچکر اکبر نے کہا "بھئی ٹکیت کی ... نہیں ملے ہو آج ملتے جاؤ بھئی احمد علی صاحب اب آپ ٹوپی اُتار دیجئے۔"

احمد علی نے ٹوپی اُتاری تو شکیت تعجب سے چلا پڑا۔

"واہ بھائی! بھگوان قسم آج تو تم نے بالکل صاف آنکھوں میں دھول جھونک دی۔"

اُس رات تقریباً دو بجے تک اکبر اور رعنا میں جھگڑا ہوتا رہا۔ رعنا کا کہنا تھا کہ جب اُسے مرد کے لباس میں اکبر کا وہ قریب ترین دوست بھی نہیں پہچان سکا جو برابر اُس کے ہاں آتا جاتا رہتا ہے تو وہ لوگ جو رعنا کو جانتے بھی نہیں بھلا کس طرح اسے پہچان سکیں گے۔ اکبر کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا لیکن وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں تھا کہ رعنا دولہا بن کر اُس کے ساتھ ٹورنامنٹ دیکھنے جایا کرے۔ بحث ہوتی رہی اور جب کوئی خاص نتیجہ نہیں نکل سکا تو یہ طے کر لیا گیا کہ اگلے دن شکیت کو جج بنایا جائے گا اور جو کچھ وہ فیصلہ کرے گا اُس پر دونوں عمل کریں گے۔

شکیت نے سُنا تو بے حد خوش ہوا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے" اُس نے کہا۔ "ذرا دل لگی رہے گی۔ دل تو چاہتا ہے کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتا لیکن میں ایک مجبوری کی وجہ سے پندرہ بیس دن تک تو میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

شروع کے تین چار میچ بخیر و خوبی گزر گئے۔ اکبر کو بھی تھوڑا بہت اطمینان ہو گیا۔ وہ بڑی شان کے ساتھ رعنا کے ہمراہ جانے لگا۔ پانچویں یا چھٹے دن محلے کے ایک صاحب اُس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اُن صاحب کو وہ چچا کہا کرتا تھا کچھ زیادہ معمر نہیں تھے لیکن پھر بھی جگت چچا مشہور ہو گئے تھے یہاں تک کہ اُن کے دوست بھی اُنھیں چچا کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تمام زندگی یوں ہی گزار دی تھی۔ شادی سے اُنھیں للّٰہی بغض تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ شادی کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا۔ جانور بن جاتا ہے۔ اُن کا یہ اُصول چاہے صحیح ہو یا غلط بہرصورت وہ اس پر سولہ آنے جمے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اُن کے متعلق عجیب عجیب باتیں بھی مشہور کر دی تھیں۔ اُنھیں کسی کی بکواس سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اگر شکوہ تھا تو صرف یہی تھا کہ آجکل کے نوجوانوں کے ذہن و احساس

بقیہ [illegible]

دوسرے دن چچا پھر اُن دونوں کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

تیسری بار جب پھر یہی ہوا تو اکبر ضبط نہ کر سکا۔

"میرا خیال ہے" اُس نے رعنا کے کان میں کہا "چچا نے تمھیں پہچان لیا ہے۔"

"وہ کیا جانیں کہ میں کون ہوں"

"یہ تو صحیح ہے" وہ بولا "لیکن وہ یہ تو سمجھ ہی گئے ہیں کہ تم لڑکا نہیں ہو۔"

"میں کہتی ہوں اُن کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

"اگر نہیں سمجھے ہیں تو بار بار تمھاری طرف کیوں دیکھے جا رہے ہیں؟"

"چھوڑیئے بھی" رعنا نے ٹال دیا "شیکسپیئر کے کسی کلاؤن کو دیکھنا ہو تو کھیل کے اس بُڈھے ریا کی طرف دیکھئے جو اُچھل اُچھل کر کھیلنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اسے میں نے لکھنؤ کے بھی بہت سے میچوں میں دیکھا ہے۔ غالباً اس کا نام باذی ہے۔"

اتنے میں چچا غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ اُن کے ساتھ ساتھ بیرا ٹین چائے اور چار لوازم لئے چلا آرہا تھا۔

"ارے چچا اس تکلیف اور تکلّف کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟" وہ بولے "تمھارے دوست غالباً پہلی بار اس شہر میں آئے ہیں۔ کافی خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔"

"جی ہاں آپ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں۔"

چچا نے ہاتھ ملایا۔

"آپ کا اسمِ شریف؟"

"سید احمد علی" رعنا نے جواب دیا۔

"کیا کرتے ہیں؟"

"پڑھتا ہوں۔"

"کبھی غریب خانے پر بھی تشریف لایئے۔"

"بہت بہتر ہے۔"

رعنا بات کو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن وہ برابر بے تکلف ہونے کی کوشش

سکتے جا رہے تھے۔ میچ شروع ہوا تو اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور چچا کو بھول کر میچ دیکھنے لگی۔

اگلے روز چچا پھر چلے آئے۔ میچ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

"احمد علی صاحب!" اُنھوں نے رعنا کو مخاطب کیا۔

"ارشاد!"

"آپ کو کھیل سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"جی ہاں کبھی کبھی بیڈمنٹن کھیل لیا کرتی ہوں۔"

جملہ پورا کر کے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولی —

"اور اپنی یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم میں بھی میں اکثر کھیلتا رہا ہوں۔"

یا تو چچا نے صحیح طور سے جملہ سنا ہی نہیں۔ اور اگر سنا تو نہ جانے کیا سوچ کر اَن سُنا کر دیا۔

"مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔" چچا بولے۔ "ابھی کچھ دن ہوئے میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا۔ اجازت ہو تو سُناؤں؟"

"ضرور سُنائیے!"

"ایک بار ایک لڑکی کے باپ نے بہت فخریہ لہجے میں اپنے دوستوں کو بتایا — میری لڑکی تین سال تک مَردوں کے ساتھ اُن کے جیسے کپڑے پہن کر کام کرتی رہی۔ اور کسی نے اُسے نہیں پہچانا۔"

"فرض کیجیے۔" اُس کے ایک دوست نے کہا۔ "اگر کسی نے پہچان بھی لیا ہوگا تو بھلا وہ دوسروں کو بتا کر ایک نعمت سے خود کیوں محروم ہو جاتا۔"

رعنا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ یہ تو صاف اُس کے اُوپر طنز تھا۔ انتہائی گرے ہوئے انداز میں چچا نے اُس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔

"آپ کو ہنسی نہیں آئی احمد علی صاحب؟"

"جی — وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔" میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

چچا سر کے درد کی دوا لینے چلے گئے تو اکبر کی بن آئی۔ اُس نے رعنا سے پہلی بار بہت زیادہ تلخ لہجے میں کہا۔ "دیکھ لیا تم نے، بازاری قسم کا مذاق کیا جا رہا ہے اور میری نظروں کے سامنے کیا جا رہا ہے۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ تم ہی بتاؤ اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے اِس چچا کے بچے کو اگر کچھ کہوں گا تو کیا ہوگا؟"

"چلیے" وہ بولی۔ "اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک تو چچا کی باتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ اُوپر سے آپ بھی بگڑنے لگے۔"

وہ اُٹھنے کو تھا کہ چچا آ گئے۔ رعنا کو سر کے درد کی دوا دی۔

"لیجیے احمد علی صاحب!" دوا دیتے ہوئے اُنھوں نے کہا۔ "اِسے کھانے سے سر کا درد فوراً ہوا ہو جائے گا۔"

"شکریہ!" رعنا نے آہستہ سے کہا۔

چچا اب تک نہ جانے کیا سوچ کر خاموش تھے لیکن جانے اُنھیں کیا سُوجھی کہ اکبر کو لے کر دوسری طرف چلے گئے۔

"کیوں صاحبزادے!" اُنھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی!"

"اب پَر نکل آئے تمھارے بھی!"

"جی..."

اکبر کا دل چاہ رہا تھا کہ اُوپر سے اُس کے اور چچا کے سر پر بم کا گولہ گر پڑے اور اِس سے پہلے کہ چچا کچھ کہیں اور وہ کچھ سُنے۔ دونوں یہیں مر جائیں۔

"ارے ہم سے اُڑتے ہو۔" وہ اُسی طرح ہنستے ہوئے بولے۔ "ہم اُڑتی چڑیا کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔"

اکبر بالکل پیلا ہو گیا۔

"اب آپ سمجھ گئے ہیں تو للّٰہ خاموش رہیے۔ یہاں میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو میری خیر نہیں ہے۔ اب میری عزت چچا بس آپ ہی کے ہاتھ ہے۔"

"میری طرف سے تم بالکل مطمئن رہو۔" چچا نے کہا۔ "جوان آدمی ہو تمھارے لئے سب کچھ معاف ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ یہاں یہ بتانا مناسب نہیں تھا کہ یہ لڑکی جسے چچا نے پہچان لیا ہے۔ دراصل اُس کی بیوی ہے۔ اور نہ بتانے سے کام بھی بگڑا جا رہا تھا۔ چچا کے لہجے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کوئی آوارہ لڑکی سمجھ رہے ہیں۔

وہ خاموشی سے دل ہی دل میں اُلجھتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ سچ دیکھئے تو اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ کچھ اپنے اُوپر غصہ آ رہا تھا، کچھ رعنا پر اور کچھ کچھ چچا پر۔ یکایک رعنا کو جانے کیا ہوا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلئیے!" اُس نے ذرا تیزی کے ساتھ اکبر سے کہا۔

"کیوں؟"

رعنا نے اُس کی کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر اکبر کا ہاتھ پکڑا چچا دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور وہ اکبر کے ساتھ باہر نکل گئی۔

گھر پہنچکر اُس نے صلواتیں سُنانا شروع کر دیں۔

"لعنت ہے ایسے ٹورنامنٹ پر اور ہزار دفعہ لعنت ہے ایسے چچا پر!"

"آخر بات کیا ہے؟"

"وہ .... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے پہچان لیا"۔ رعنا بولی۔ "اور پتہ نہیں وہ مجھے کیسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ دو بار میری طرف دیکھ کر بد معاشوں کی طرح آنکھ بند کی۔ آخر یہ لوگ عورت کی عزت کرنا کب سیکھیں گے۔ خیریت یہ ہوئی کہ میں لڑکا بنی ہوئی تھی۔ اِس لئے مجبور تھی۔ ورنہ اپنے پیر کی عزت ہاتھ میں لے کر انھیں بتا دیتی کہ آج کی عورت کل کی بزدل عورت نہیں ہے"۔

اکبر نے کہا—

اِس میں چچا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر خود میں چچا کی جگہ ہوتا اور چچا میری جگہ، اور میں اُن کے ساتھ کسی بھیس بدلی ہوئی لڑکی کو پہچان لیتا تو پہلا تصور میرے ذہن میں جو آتا وہ یہی ہوتا کہ یہ لڑکی کوئی آوارہ لڑکی ہے۔

شام کو ٹکیت آ گیا۔ اکبر نے یہ مسئلہ جُوں کا تُوں اُس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ بات تو طے شدہ تھی کہ چچا پہچان گئے تھے لیکن اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اُس کے لئے یہ ضروری تھا کہ اُن کی غلط فہمی دُور کرا دی جاتی۔ اُنھیں بتا دیا جاتا کہ اکبر کسی غلط راستے پر نہیں جا رہا ہے۔ بلکہ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی مردانے کپڑوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور ایسا وہ اِس لئے کرتی ہے کہ اِس شہر میں اس جیسی آزاد خیال لڑکی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

رات کا وقت اُن سے ملاقات کے لئے مقرر کیا گیا۔ ٹکیت اُنھیں بُلانے کے لئے گیا۔ رعنا کو پھر مردانہ لباس پہنایا گیا—

وہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے آئے۔

"دیکھئے چچا!" اکبر نے کہا۔ "میں آپ کی دُور رس نگاہ کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا لیکن اپنی غلط فہمی دُور کر لیجئے۔ جسے آپ ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل میری بیوی ہے— رعنا! اپنی ٹوپی اُتار دو، اور چچا کو سلام کرو"۔

ٹوپی اُتارتے ہی رعنا کے بال بکھر گئے۔ اور چچا کا ہنستا اور مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سُت گیا۔

"معاف کیجئے" وہ بولے۔ "میں بخدا یہ نہیں جانتا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ میرے ہاتھ پر حلف رکھ دیجئے۔ چاہے جیسی قسم لے لیجئے۔ بلکہ مجھے تو، خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم، یہ ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی عورت ہے"۔

اکبر کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بم جس کے گرنے کی دعا وہ مانگا کرتا تھا، اب اُس کے، ٹکیت کے اور رعنا کے سروں پر گر پڑا ہے۔ اور اِن تینوں کو چند لمحوں کے لئے موت کی آغوش میں سُلا گیا ہے۔

قارئین نوٹ کریں کہ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر یہ ضرور تحریر فرمائیں کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ جوابی کارڈ یا اپنا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی کارڈ یا لفافے ہندوستان میں کار آمد نہیں ہیں اس لئے پاکستانی بھائی اِس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (مینجر بیسویں صدی نئی دہلی)

کہہ چکا ہے تھے۔ میچ شروع ہوا تو اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور چچا کو بھول کر میچ دیکھنے لگی۔

اگلے روز چچا پھر چلے آئے۔ میچ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

"احمد علی صاحب!" اُنھوں نے رعنا کو مخاطب کیا۔

"ارشاد!"

"آپ کو کھیل سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"جی ہاں کبھی کبھی بیڈمنٹن کھیل لیا کرتی ہوں۔"

جملہ پورا کر کے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولی ——

"اور اپنی یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم میں بھی میں اکثر کھیلتا رہا ہوں۔"

یا تو چچا نے صحیح طور سے جملہ سُنا ہی نہیں۔ اور اگر سُنا تو نہ جانے کیا سوچ کر اَن سُنا کر دیا۔

"مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔" چچا بولے۔ "ابھی کچھ دن ہوئے میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا۔ اجازت ہو تو سُناؤں؟"

"ضرور سُنایئے!"

"ایک بار ایک لڑکی کے باپ نے بہت فخریہ لہجے میں اپنے دوستوں کو بتایا —— میری لڑکی تین سال تک مَردوں کے ساتھ اُن کے جیسے کپڑے پہن کر کام کرتی رہی۔ اور کسی نے اُسے نہیں پہچانا۔"

"فرض کیجیے،" اُس کے ایک دوست نے کہا۔ "اگر کسی نے پہچان بھی لیا ہوگا تو بھلا وہ دوسروں کو بتا کر ایک نعمت سے خود کیوں محروم ہو جاتا۔"

رعنا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ یہ تو صاف اُس کے اُوپر طنز تھا۔ انتہائی گِرے ہوئے انداز میں چچا نے اُس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔

"آپ کو ہنسی نہیں آئی احمد علی صاحب؟"

"جی ——وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

چچا سر کے درد کی دوا لینے چلے گئے تو اکبر کی بن آئی۔ اُس نے رعنا سے پہلی بار بہت زیادہ تلخ لہجے میں کہا۔ "دیکھ لیا تم نے، بازاری قسم کا مذاق کیا جا رہا ہے اور میری نظروں کے سامنے کیا جا رہا ہے۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ تم ہی بتاؤ اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے اِس چچا کے بچے کو اگر کچھ کہوں گا تو کیا ہوگا؟"

"چلیے" وہ بولی۔ "اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک تو چچا کی باتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ اُوپر سے آپ بھی بگڑنے لگے۔"

وہ اُٹھنے کو تھا کہ چچا آ گئے۔ رعنا کو سر کے درد کی دوا دی۔

"لیجیے احمد علی صاحب!" دوا دیتے ہوئے اُنھوں نے کہا۔ "اِسے کھانے سے سر کا درد فوراً اچھا ہو جائے گا۔"

"شکریہ!" رعنا نے آہستہ سے کہا۔

چچا اب تک نہ جانے کیا سوچ کر خاموش تھے لیکن جانے اُنھیں کیا سُوجھی کہ اکبر کو لے کر دوسری طرف چلے گئے۔

"کیوں صاحبزادے!" اُنھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی!"

"اب پَر نکل آئے تمھارے بھی۔"

"جی ۔ ۔ ۔"

اکبر کا دل چاہ رہا تھا کہ اُوپر سے اُس کے اور چچا کے سر پر بم کا گولہ گر پڑے اور اِس سے پہلے کہ چچا کچھ کہیں اور وہ کچھ سُنے۔ دونوں یہیں مر جائیں۔

"ارے ہم سے اُڑتے ہو۔" وہ اُسی طرح ہنستے ہوئے بولے۔ "ہم اُڑتی چڑیا کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔"

اکبر بالکل پسپا ہو گیا۔

"اب آپ سمجھ گئے ہیں تو للہ خاموش رہیے۔ یہاں میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو میری خیر نہیں ہے۔ اب میری عزت چچا بس آپ ہی کے ہاتھ ہے۔"

"میری طرف سے تم بالکل مطمئن رہو۔" چچا نے کہا۔ "جوان آدمی ہو تمھارے لیے سب کچھ معاف ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ یہاں یہ بتانا مناسب نہیں تھا کہ یہ لڑکی جسے چچا نے پہچان لیا ہے۔ دراصل اُس کی بیوی ہے۔ اور نہ بتانے سے کام بھی بگڑا جا رہا تھا۔ چچا کے لہجے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کوئی آوارہ لڑکی سمجھ رہے ہیں۔

وہ خاموشی سے دل ہی دل میں اُلجھتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ یہ دیکھ کر اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ کچھ اپنے اُوپر غصہ آرہا تھا، کچھ رعنا پر اور کچھ کچھ چچا پر۔ یکایک رعنا کو جانے کیا ہوا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلئے!" اُس نے ذرا تیزی کے ساتھ اکبر سے کہا۔

"کیوں؟"

رعنا نے اُس کی کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر اکبر کا ہاتھ پکڑا۔ چچا دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور وہ اکبر کے ساتھ باہر نکل گئی۔

گھر پہنچ کر اُس نے صلواتیں سُنانا شروع کر دیں۔

"لعنت ہے ایسے ٹورنامنٹ پر اور ہزار دفعہ لعنت ہے ایسے چچا پر!"

"آخر بات کیا ہے؟"

"وہ.... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے پہچان لیا"—

رعنا بولی "اور پتہ نہیں وہ مجھے کیسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ دو بار میری طرف دیکھ کر بد معاشوں کی طرح آنکھ ماری۔ آخر یہ لوگ عورت کی عزت کرنا کب سیکھیں گے۔ خیریت یہ ہوئی کہ میں لڑکا بنی ہوئی تھی۔ اس لئے مجبور تھی۔ ورنہ اپنے پیر کی عزت ہاتھ میں لے کر انھیں بتادیتی کہ آج کی عورت کل کی بزدل عورت نہیں ہے۔"

اکبر نے کہا—

اس میں چچا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر خود میں چچا کی جگہ ہوتا اور چچا میری جگہ، اور میں اُن کے ساتھ کسی بھیس بدلی ہوئی لڑکی کو پہچان لیتا تو پہلا تصوّر میرے ذہن میں جو آتا وہ یہی ہوتا کہ یہ لڑکی کوئی آوارہ لڑکی ہے۔

شام کو ٹکیت آگیا۔ اکبر نے یہ مسئلہ جوں کا توں اُس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ بات تو طے شدہ تھی کہ چچا پہچان گئے تھے لیکن اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اُس کے لئے یہ ضروری تھا کہ اُن کی غلط فہمی دور کرادی جاتی۔ اُنھیں بتا دیا جاتا کہ اکبر کسی غلط راستے پر نہیں جا رہا ہے۔ بلکہ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی مردانے کپڑوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور ایسا وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس شہر میں اس جیسی آزاد خیال لڑکی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

رات کا وقت اُن سے ملاقات کے لئے مقرر کیا گیا۔ ٹکیت انھیں بلانے کے لئے گیا۔ رعنا کو پھر مردانہ لباس پہنایا گیا——

وہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے آئے۔

"دیکھئے چچا!" اکبر نے کہا "میں آپ کی دُور رس نگاہ کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا لیکن اپنی غلط فہمی دور کر لیجئے۔ جسے آپ ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل میری بیوی ہے—— رعنا! اپنی ٹوپی اُتار دو، اور چچا کو سلام کرو۔"

ٹوپی اُتارتے ہی رعنا کے بال بکھر گئے۔ اور چچا کا ہنستا اور مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سُت گیا۔

"معاف کیجئے" وہ بولے "میں بخدا یہ نہیں جانتا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ میرے ہاتھ پر حلف رکھ دیجئے۔ چاہے جیسی قسم لے لیجئے۔ بلکہ مجھے تو خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم، یہ ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی عورت ہے۔"

اکبر کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بم جس کے گرنے کی دعا وہ مانگا کرتا تھا، اب اُس کے، ٹکیت کے اور رعنا کے سروں پر گر پڑا ہے۔ اور ان تینوں کو چند لمحوں کے لئے موت کی آغوش میں سُلا گیا ہے۔

کئے جا رہے تھے۔ میچ شروع ہوا تو اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور چچا کو بھول کر میچ دیکھنے لگی۔

اگلے روز چچا پھر چلے آئے۔ میچ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

"احمد علی صاحب!" انھوں نے رعنا کو مخاطب کیا۔

"ارشاد!"

"آپ کو کھیل سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"جی ہاں کبھی کبھی بیڈمنٹن کھیل لیا کرتی ہوں۔"

جملہ پورا کر کے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولی ——

"اور اپنی یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم میں بھی میں اکثر کھیلتا رہا ہوں۔"

یا تو چچا نے صحیح طور سے جملہ سُنا ہی نہیں۔ اور اگر سُنا تو نہ جانے کیا سوچ کر ان سُنا کر دیا۔

"مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔" چچا بولے۔ "ابھی کچھ دن ہوئے میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا۔ اجازت ہو تو سُنا دوں؟"

"ضرور سُنایئے!"

"ایک بار ایک لڑکی کے باپ نے بہت فخریہ لہجے میں اپنے دوستوں کو بتایا — میری لڑکی تین سال تک مردوں کے ساتھ اُن کے جیسے کپڑے پہن کر کام کرتی رہی۔ اور کسی نے اُسے نہیں پہچانا۔'

'فرض کیجیے'، اُس کے ایک دوست نے کہا۔ اگر کسی نے پہچان بھی لیا ہوگا تو بھلا وہ دوسروں کو بتا کر ایک نعمت سے خود کیوں محروم ہو جاتا۔"

رعنا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ یہ تو صاف اُس کے اُوپر طنز تھا۔ انتہائی گرے ہوئے انداز میں چچا نے اُس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔

"آپ کو ہنسی نہیں آئی احمد علی صاحب؟"

"جی —— وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

چچا سر کے درد کی دوا لینے چلے گئے تو اکبر کی بن آئی۔ اُس نے رعنا سے پہلی بار بہت زیادہ تلخ لہجے میں کہا۔ "دیکھ لیا تم نے، بازاری قسم کا مذاق کیا جا رہا ہے اور میری نظروں کے سامنے کیا جا رہا ہے۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ تم ہی بتاؤ اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے اِس چچا کے بچے کو اگر کچھ کہوں گا تو کیا ہوگا؟"

"چلیئے" وہ بولی۔ "اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک تو چچا کی باتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ اُوپر سے آپ بھی بگڑنے لگے۔"

وہ اُٹھنے کو تھا کہ چچا آ گئے۔ رعنا کو سر کے درد کی دوا دی۔

"لیجیے احمد علی صاحب!" دوا دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "اسے کھانے سے سر کا درد فوراً ہوا ہو جائے گا۔"

"شکریہ!" رعنا نے آہستہ سے کہا۔

چچا اب تک نہ جانے کیا سوچ کر خاموش تھے۔ لیکن جانے انھیں کیا سُوجھی کہ اکبر کو لے کر دوسری طرف چلے گئے۔

"کیوں صاحبزادے!" انھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی!"

"اب پر نکل آئے تمھارے بھی۔"

"جی۔۔۔"

اکبر کا دل چاہ رہا تھا کہ اُوپر سے اُس کے اور چچا کے سر پر بم کا گولہ گر پڑے اور اس سے پہلے کہ چچا کچھ کہیں اور وہ کچھ سُنے۔ دونوں یہیں مر جائیں۔

"ارے ہم سے اُڑتے ہو۔" وہ اُسی طرح ہنستے ہوئے بولے۔ "ہم اُڑتی چڑیا کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔"

اکبر بالکل پسپا ہو گیا۔

"اب آپ سمجھ گئے ہیں تو للہ خاموش رہیئے۔ یہاں میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو میری خیر نہیں ہے۔ اب میری عزت چچا بس آپ ہی کے ہاتھ ہے۔"

"میری طرف سے تم بالکل مطمئن رہو۔" چچا نے کہا۔ "جوان آدمی ہو تمھارے لئے سب کچھ معاف ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ یہاں یہ بتانا مناسب نہیں تھا کہ یہ لڑکی جسے چچا نے پہچان لیا ہے۔ دراصل اُس کی بیوی ہے۔ اور نہ بتانے سے کام بھی بگڑا جا رہا تھا۔ چچا کے لہجے سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کوئی آوارہ لڑکی سمجھ رہے ہیں۔

وہ خاموشی سے دل ہی دل میں اُلجھتا ہوا واپس لوٹ آیا۔ میچ دیکھنے کو اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ کچھ اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کچھ رعنا پر اور کچھ چچا پر۔ یکایک رعنا کو جانے کیا ہوا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلئے!" اُس نے ذرا تیزی کے ساتھ اکبر سے کہا۔

"کیوں؟"

رعنا نے اُس کی کیوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر اکبر کا ہاتھ پکڑا! چچا دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور وہ اکبر کے ساتھ باہر نکل گئی۔

گھر پہنچ کر اُس نے صلواتیں سُنانا شروع کر دیں۔

"لعنت ہے ایسے ٹورنامنٹ پر اور ہزار دفعہ لعنت ہے ایسے چچا پر!"

"آخر بات کیا ہے؟"

"وہ... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے پہچان لیا" رعنا بولی "اور پتہ نہیں وہ مجھے کیسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ دو بار میری طرف دیکھ کر بدمعاشوں کی طرح آنکھ بند کی۔ آخر یہ لوگ عورت کی عزت کرنا کب سیکھیں گے۔ خیریت یہ ہوئی کہ میں لڑکا بنی ہوئی تھی۔ اس لئے مجبور تھی۔ ورنہ اپنے پیر کی عزت ہاتھ میں لے کر انھیں بتا دیتی کہ آج کی عورت کل کی بزدل عورت نہیں ہے۔"

اکبر نے کہا۔۔۔

اس میں چچا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر خود میں چچا کی جگہ ہوتا اور چچا میری جگہ، اور میں اُن کے ساتھ کسی بھیس بدلی ہوئی لڑکی کو پہچان لیتا تو پہلا تصور میرے ذہن میں جو آتا وہ یہی ہوتا کہ یہ لڑکی کوئی آوارہ لڑکی ہے۔

شام کو تکلیت آگیا۔ اکبر نے یہ مسئلہ جوں کا توں اُس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ بات تو طے شدہ تھی کہ چچا پہچان گئے تھے لیکن اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اُس کے لئے یہ ضروری تھا کہ اُن کی غلط فہمی دُور کرادی جاتی۔ اُنھیں بتا دیا جاتا کہ اکبر کسی غلط راستے پر نہیں جارہا ہے۔ بلکہ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی مردانے کپڑوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور ایسا وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس شہر میں اس جیسی آزاد خیال لڑکی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

رات کا وقت اُن سے ملاقات کے لئے مقرر کیا گیا۔ تکلیت اُنھیں بُلانے کے لئے گیا۔ رعنا کو پھر مردانہ لباس پہنایا گیا۔۔۔

وہ ہنستے اور مسکراتے ہوئے آئے۔

"دیکھئے چچا!" اکبر نے کہا "میں آپ کی دُور رس نگاہ کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا لیکن اپنی غلط فہمی دُور کر لیجئے۔ جسے آپ ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل میری بیوی ہے۔۔۔ رعنا! اپنی ٹوپی اُتار دو، اور چچا کو سلام کرو۔"

ٹوپی اُتارتے ہی رعنا کے بال بکھر گئے۔ اور چچا کا ہنستا اور مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سُت گیا۔

"معاف کیجئے:" وہ بولے "میں بخدا یہ نہیں جانتا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ میرے ہاتھ پر حلف رکھ دیجئے۔ چاہے جیسی قسم لے لیجئے۔ بلکہ مجھے تو خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم، یہ ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی عورت ہے۔"

اکبر کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بم جس کے گرنے کی دعا وہ مانگا کرتا تھا، اب اُس کے، تکلیت کے اور رعنا کے سروں پر گر پڑا ہے۔ اور ان تینوں کو چند لمحوں کے لئے موت کی آغوش میں سُلا گیا ہے۔

جوشِ جنوں

از

جناب امجد قیس جالندھری

خیالی ملاقات ہوتی رہی
شبِ غم بہم بات ہوتی رہی

بگڑتے رہے ہیں سنور کر بھی ہم
وہی شکلِ حالات ہوتی رہی

کھٹکتی تھی جو عشق میں رات دن
وہی بات دن رات ہوتی رہی

وہ دے دے کے دم، دم بڑھاتے رہے
بہ ہر رنگ یہ بات ہوتی رہی

جہاں ختم ہوتی رہی راہِ شوق
وہیں سے شروعات ہوتی رہی

غنیمت ہے خط بھی جو آتا رہا
یہ آدھی ملاقات ہوتی رہی

ہر اِک چال اُلٹی چلے وہ مگر
مجھے مات پر مات ہوتی رہی

گلستاں میں کلیاں ترستی رہیں
سمندر پہ برسات ہوتی رہی

کرم اُن کا مجھ پر یہ ہوتا رہا
ستم سے مدارات ہوتی رہی

یہ سحرِ تصور تھا فرقت میں بھی
ملاقات کیا، بات ہوتی رہی

نصیب اپنا بن کر بگڑتا رہا
نہ ہونی تھی جو بات ہوتی رہی

بہ نامِ خدا قیس پیتا رہا
یونہیں کچھ مناجات ہوتی رہی

غزل

از

جناب اوم سنگھ شائق بی اے ایل ایل بی

کبھی کاش اِس حقیقت پہ نظر کرے زمانہ
کہ چمن سرائے اُلفت میں قفس ہے آشیانہ

یہ الم، یہ رنجِ پیہم، یہ ملالِ جاودانہ
مری زندگی ہے شاید مری موت کا بہانہ

کہیں رفتہ رفتہ آخر مجھے ڈر ہے بن نہ جائے
مرے عشق کی حقیقت ترے حُسن کا فسانہ

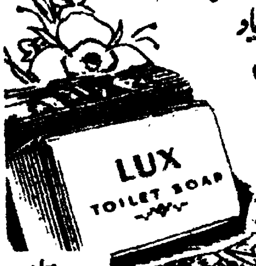
مری کائناتِ دل میں یہ نمودِ زندگانی
کہیں ہو رہا ہے شاید مرا ذکر غائبانہ

مرے ذوق کی بلندی کو ہے عارِ حدِ منزل
کہ چمن میں پھونک ڈالا ہے بنا کے آشیانہ

لگے خاک جی قفس میں ابھی نو اسیر ہوں میں
ابھی آ رہا ہے شائق مجھے یاد آشیانہ






LUX
TOILET SOAP



افسانہ

عیش کے دکھ

از

محترمہ نکہت اقبال بی۔اے۔بی ٹی

۱۱۶ گاندھی گارڈن۔ ویسٹ کراچی

بھائی صاحب تسلیم

آپ نے میری تخلیق کو سالنامہ میں جگہ دی، اُس کے لئے شکریہ۔ ایک اور تازہ ترین افسانہ بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو شریکِ اشاعت کیجئے شکر گزار ہوں گی۔ اتنے پیارے سالنامے کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

مجھے اپنے افسانوں کے تراشے مطلوب ہیں جو پاکستان آتے ہوئے راستے میں گم ہو گئے۔ افسانوں کے مجموعے کے سلسلے میں اُن کی اشد ضرورت ہے۔ میں بیسویں صدی کے ذریعے ہند و پاکستان کے تمام بھائی اور بہنوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ میری مدد کریں شکر گزار ہوں گی اور اس احسان کو کبھی فراموش نہ کروں گی۔ جن بھائیوں اور بہنوں کے پاس پرچے ہوں اُن میں سے میرے افسانوں کے تراشے مجھے رجسٹری سے بھیج دیں۔ بھائیوں اور بہنوں پر یہ ایک بے جا بار تو ضرور ہوگا لیکن اُمید ہے کہ اپنی بہن کے لئے یہ قربانی برداشت کی جائے گی اور میں اس قربانی پر فخر محسوس کروں گی۔ تراشے مجھے جلد چاہئیں۔ اُمید کہ میں مایوس نہیں کی جاؤں گی۔

بھابی کو تسلیم کہئے اور بچوں کو پیار

آپ کی بہن
نکہت اقبال

ریل جہاں رُکی تھی وہاں اسٹیشن نہیں تھا۔

جھٹکے سے ریل کے رُکنے کے معنی بھی یہی تھے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ ہو سکتا تھا سگنل نہ ملا ہو۔ میں نے اپنے کمپارٹمنٹ سے جھانکا تو سگنل تو نظر نہیں آیا البتہ لوگوں کے کھڑکیوں سے باہر نکلے ہوئے سر اور دھڑ ضرور نظر آئے۔ میں سر کھڑکی پر ٹیک دیا لیکن نگاہوں کا تجسس مطمئن نہیں ہوا۔ اور نظریں اِدھر اُدھر اُٹھتی رہیں۔ ریل کے اِس طرح اچانک رُکنے کا سبب معلوم ہونا ضروری تھا میں بھی مسافر تھی اور سبب معلوم کرنا مسافر کا حق ہے۔

لوگ کمپارٹمنٹ سے اُتر کر اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ ایک مسافر نے جو انجن کی طرف سے آ رہا تھا چلا کر اپنے دوسرے ساتھی سے کہا ــ

"ایک شخص ریل سے کود پڑا ہے۔"

"لوگ تو موت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے!" یہ کہہ کر میں نے پہلو بدل لیا۔ اور سامنے والی کھڑکی سے اِرد گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھنے لگی۔ انسانی محنت نے ہرے ہرے پتوں کا رُوپ لے لیا تھا۔ کسانوں کی محنت اور اُن کی عرق ریزی کا ثمرہ یہ ہریالی تھی۔ انسان محنت کا پھل کھاتا ہے۔ اگر یہ

...رے کھیت سُوکھ جائیں یا جل جائیں تو کتنے دل ٹوٹ جائیں گے۔ ہری ...تی کا جلنا کون برداشت کرسکتا ہے۔ میں تو برداشت نہیں کرسکتی اور کوئی صحیح انسان گوارا نہیں کرسکتا۔

کسی نے مجھے چونکا دیا۔

چائے آگئی تھی۔

سفید کیتلی، سفید پیالی اور طشتری، ایک پلیٹ میں کیک کے سلائز، اور دوسرے میں چار ٹوسٹ، چھوٹے سے شکر دان میں چینی، ایک چمچہ، ایک چھننا۔ ...یرا ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ میں نے چائے بنائی اور پہلا گھونٹ لیا۔ میں پھر خیالات میں ڈوب گئی۔ دراصل دُنیا کا ہر مرد اور ہر عورت کسان ہی ہے۔ سب کو اپنے اپنے کھیتوں میں محنت کرنی پڑتی ہے اور فصل اُگانی پڑتی ہے۔ کوئی ماں کے رُوپ میں فصل کی پرورش کرتی ہے۔ اور کوئی بیوی کے رُوپ میں۔ اگر ماں کی کھیتی سُوکھ جائے تو قیامت آجائے۔ اور اگر بیوی جس نے اپنے جیون کی کیاری میں خلوص اور پیار کے بیج دئیے ہیں نہ اُگ سکیں تو اُس کی دُنیا اندھیر ہو جائے۔

میں پھر چونکا دی گئی۔

کسی نے دروازے پر دھکا دیا تھا۔

میں نے اُٹھ کر دیکھا تو کسان کا ایک چھوٹا سا لڑکا بستہ پکڑے کھڑا تھا۔ ننگا بچا، میلا کچیلا، صرف ایک چیتھڑا اور وہ بھی میلا باندھے تھا۔ ادھر کسان کی ایک لڑکی کھڑی منع کرتے ہوئے اُسے کہہ رہی تھی ——

"ہو وے منگلا! گاڑی چل پڑھیے۔ آتو نا"

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور منگلا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو منگلا مجھے دیکھنے کے بجائے چائے کی پیالی کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور اندر آیا۔ بچہ تھا۔ چائے کی میٹھی پیالی اُسے کیوں نہ پیاری معلوم ہوتی۔ لڑکی نے باہر کھڑے کھڑے ہنس کر کہا ——

"میم صاحب! گاڑی چل دیہئے"

"ابھی دیر ہے۔ تم بھی آجاؤ"

"کا ہے نائی آتا ہو رمیہ؟"

منگلا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

رمیہ کچھ دیر ہچکچائی۔ پھر وہ بھی آگئی۔ رمیہ موٹے سیاہ کپڑے کا ٹخنوں سے اُونچا لہنگا پہنے تھی۔ اور باہنیں کٹی کُرتی جسم پر تھی۔ اُس کی اوڑھنی سُرخ اور موٹی تھی۔ کپڑے میلے تھے، بال اُلجھے ہوئے۔ ننگے پاؤں تھی۔ ہاتھ میں ایک سوکھا سا کانگرہ تھا۔ منگلا کا سر صاف تھا۔ اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا۔ چاندی کے کڑے ہاتھوں میں تھے۔ منگلا کو میں نے ایک ٹوسٹ دے دیا۔ جسے اُس نے مٹی سے بھرے ہاتھوں سے لیا۔ اور لیتے ہی کھانے لگا۔ اب میں نے اپنی بحث رمیہ کو دیکھا جو سامنے کھڑی معصومیت سے مجھے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ گیہوں کی بالی، گندمی رنگ، موٹی سی ناک، بھری بھری سی۔ میں نے پوچھا ——

"تم کہاں رہتی ہو اور یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

رمیہ مجھ سے صاف اردو بول رہی تھی۔ کہنے لگی ——

"وہ باغ جو ہے اُس کے پیچھے ہمارا گاؤں ہے۔ یہاں ہم گائے بیل چرا رہے تھے"

"تمھیں اپنا گاؤں اچھا لگتا ہے؟"

"ہاں بہت!"

منگلا کا ٹوسٹ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک ٹوسٹ اُسے دیا اور بقیہ ٹوسٹ رمیہ کو دے دیئے جو اُس نے بے جھجک لے لئے۔

میں نے پوچھا ——

"تم گاؤں میں خوش رہتی ہو؟"

"ہاں میم صاحب!"

"ہمارے ساتھ چلوگی؟"

"کہاں؟"

"ہمارا گھر شہر میں ہے"

"شہر سے گاؤں اچھا ہوتا ہے"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں، سب یہی کہتے ہیں"

"رمیہ تم ہمارے ساتھ چلو تو ہم تمھیں اچھے کپڑے دیں گے۔ اچھا کھانے کو ملے گا"

رتیہہ نے کیک سلائز کھاتے ہوئے مجھے گھورا اور ہنسنے لگی۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو میرے کپڑے تمھیں پسند ہیں ؟"

"اچھے ہیں"

"پھر یہ کپڑے تمھیں بھی ملیں گے"

رتیہہ نے سر ہلا دیا۔

"کیوں ؟"

میں نے پوچھا۔

"میم صاحب! شہر میں لوگ خوش نہیں رہتے"

"تمھیں کیسے معلوم ؟"

رتیہہ نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر ہنسکر چپ ہو گئی۔

"دیکھو! کیا میں خوش نہیں ہوں ؟"

"نہیں میم صاحب"

"تمھیں کیسے معلوم ؟"

"میم صاحب! تمھارے گالوں پر لالی نہیں ہے۔ تم خوش نہیں ہو"

میں ایک لمحہ کے لئے رُکی تو رتیہہ نے کہا ـــ

"ہمارے گاؤں میں سب خوش رہتے ہیں۔ سب لوگ۔ تم بھی وہیں چلو میم صاحب! تم بھی خوش رہو گی"

"تم مجھے گھر میں جگہ دو گی ؟"

"ہاں!"

"اور کیا کھلاؤ گی ؟"

"گھی، دودھ، دہی سب کچھ کھانا"

"اور مجھ سے کام کیا لو گی ؟"

"میم صاحب!"

یہ کہہ کر رتیہہ ہنس دی۔

"کیوں بھئی رتیہہ میں کیا کام کروں گی بتاؤ ؟"

"کچھ بھی نہیں" رتیہہ نے ہنسکر کہا۔ "تم کام نہیں کر سکتیں میم صاحب!"

"بغیر کام کئے تمھاری ماں ہم کو کھانا دے گی ؟"

"کیوں نہیں میم صاحب! تم بیمار ہو۔ جب اچھی ہو جانا چلی آنا تمھارے گال ٹیسو کے پھول بن جائیں گے"

اور اپنی دی ہوئی مثال پر رتیہہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا لیکن رتیہہ کا قہقہہ ادھورا رہ گیا۔

انجن زور سے چیخا۔

منگلا اُچھل پڑا۔

رتیہہ چونک پڑی۔

رتیہہ منگلا کے ساتھ نیچے اتر پڑی۔ وہ گھبرا گئی تھی۔ نیچے اتر کر منگلا تالی بجا بجا کر کہنے لگا ـــ

"میم صاحب ـــ میم صاحب!"

اس طرح وہ ٹوسٹ اور کیک سلائز کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

اور رتیہہ کہہ رہی تھی ـــ

"چلو میم صاحب! ہمارے گاؤں چلو"

گاڑی رینگ رہی تھی۔ لوگ اُچک اُچک کر سوار ہو رہے تھے۔

کھڑکیوں سے لوگ سر نکالے کبھی منگلا اور رتیہہ کو دیکھتے اور کبھی مجھے۔

"سلام میم صاحب، سلام میم صاحب!"

منگلا چلا رہا تھا۔ رتیہہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رتیہہ نہیں مسکرا رہی تھی۔ بلکہ ہندوستان کی زندگی مسکرا رہی تھی ـــ خوشی مسکرا رہی تھی ـــ دُکھ کا شکھ مسکرا رہا تھا ـــ اور میں ـــ ؟

میں اُداس تھی۔

میں رنجیدہ تھی۔

میرے دل میں زخم تھا۔

زخم میں ٹیسیں تھیں۔

سامنے ہرے بھرے درخت ریل کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے لیکن میرا چمن میری خوشیوں کا مرکز لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہو رہا تھا ـــ اور دور ہوتا جا رہا تھا۔ میرے خرمن میں آگ لگی تھی۔ وہ جل رہا تھا۔ شعلے نکل رہے تھے اور میرا وجود بھی شعلوں کی نذر ہوتا جا رہا تھا۔



"اب تو لائف بوائے صابن
سے غسل کرنا چاہیئے"
اس سے بدن چُست اور طبیعت
خوش ہوتی ہے!
LIFEBUOY
SOAP
ہندوستان میں بنتا ہے

میری آنکھوں میں رمیہ اُبھر آئی۔ ننگے پاؤں میلی کچیلی۔ موٹے اور غلیظ ہوئے لیکن وہ خوش تھی۔ رمیہ کے گاؤں میں کوئی اُداس نہیں تھا۔ سب موٹا پہنتے تھے لیکن خوش رہتے تھے۔ وہاں سب خشک کھانا کھاتے مسکراتے رہتے تھے۔ اُف! رمیہ کا جملہ یاد آگیا۔ اُس نے کہا تھا۔

"میم صاحب! تمھارے گالوں پر لالی نہیں ہے۔ تم بیمار ہو"

میں نے پرس سے آئینہ نکال کر دیکھا تو چہرہ واقعی زرد تھا۔ میرے رخساروں پر ٹیسو کے جو پھول کل تک کھلے تھے وہ آج مُرجھا گئے تھے۔

ٹیسو کے پھول مرجھا گئے تھے۔

اب ٹیسو کے پھول نہیں کھلیں گے۔

اب ٹیسو کے پھول نہیں کھلیں گے۔

اب ٹیسو کے ....

میں نے نمناک آنکھوں سے آسمان پر بادل کے ٹکڑوں کو گھورتے ہوئے سوچا۔ ۔ ایک بادل کا ٹکڑا عجیب شکل اختیار کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ ایک انسانی شکل اختیار کرتا جاتا تھا۔

اسلم نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

اسلم نے مجھے ہمیشہ ستایا تھا۔ اور آج بھی ستا رہا تھا۔ بیوی کو ستانا، بیوی کے دل کو دُکھا دینا اُس کے نزدیک کوئی بُری بات نہ تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ ازدواجی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہی رہتے ہیں۔ آدمی کا چوبیس گھنٹے ایک سا موڈ نہیں رہتا اور کبھی وہ چڑچڑا بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس عارضی چڑچڑے پن کو برداشت کرنا بھی چاہیئے۔ لیکن میں یہ محسوس کرتی تھی کہ اُس چڑچڑے پن میں اُس کا احساسِ برتری بھی شامل رہتا تھا۔ جس سے بہت زیادہ دُکھ ہوتا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ وہ شوہر تھا۔ اور شوہر کی حیثیت سے جو فرائض انجام دیتا اُسے ذاتی احسان کی بھی صورت دے دیتا تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آج کی دُنیا میں بیوی کے متعلق اُس کا جو نظریہ تھا وہ دقیانوسی تھا اور اُس دقیانوسی نظریئے کو میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ بات بڑھ جاتی تھی اور وہ حدود کو پھلانگ جاتا تھا۔

پھر میں یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اُس کی نگاہوں کے بھونرے اِدھر اُدھر دوسرے پھولوں اور کلیوں کے گرد بھی منڈلایا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر بیوی کی آنکھوں میں کھلے ہوئے خلوص و محبت کے پھول مُرجھا جاتے اور جب میں اپنے حق کے لئے ٹوکتی تو وہ کہتا۔۔۔

"بیوی اپنی جگہ ہے۔ اُس کے حقوق برقرار رہیں گے"

لیکن بیوی بھی تو آخر عورت ہی ہوتی ہے۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی۔ بیوی تو خاموش بھی رہ سکتی تھی۔ لیکن عورت کا چُپ ہو جانا محال ہو جاتا تھا۔ بات پھر بڑھ جاتی تھی۔ اور کان سُنتے۔

"میں نے تمھیں دُکھ کے بجائے عیش دیئے ہیں۔ پھر تم کفرانِ نعمت کیوں کرتی ہو؟"

اور میں اُن عیشوں کو ترک کر کے وہ دُکھ مول لینے کے لئے تیار ہو جاتی جسے ایک عورت تو نہیں لیکن ایک بیوی اپنانے کو ہر وقت تیار رہتی ہے۔ تاکہ دُکھ کے اُسے سُکھ مل جائیں۔

اسلم کی نگاہیں پھسلتی رہیں۔

میری زبان بند نہیں ہو سکی۔

اور جب بات آگے بڑھنے لگی تو میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں اسلم سے دُور ہو جانا چاہتی تھی تاکہ وہ میری جُدائی محسوس کرے۔ بیوی کی جُدائی ایک عورت کی جُدائی۔ خلوص کی کنارہ کشی۔ محبت کا فقدان۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ظاہری اعتبار سے اسلم نے میرے لئے ہر عیش مہیا کر دیا تھا۔ جس پر میں اُس کی شکر گزار بھی تھی۔ لیکن میں کسی طرح عیش کے دائمی دُکھ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اِس لئے عارضی طور پر یہ سمجھ کر چلی آئی تھی کہ عیش کے دُکھ اور دُکھ کے سُکھ میں جو واضح فرق ہے اُسے اسلم جتنی جلدی محسوس کرے اُتنا ہی اچھا ہے۔

یہی میری بیماری تھی۔

اور میں اِس مرض میں مبتلا تھی۔

رمیہ نے جو کچھ پہچانا تھا ٹھیک پہچانا تھا۔ وہ بھی آخر میری ہم جنس تھی۔ ننگی بچی تھی تو کیا ہوا، تھی وہ بھی عورت۔ آخر پہچان گئی کہ میں سُہاگن ہوتے ہوئے بھی، اور قیمتی کپڑے پہنے ہوئے بھی خوش نہیں تھی۔ مسرور

...نہیں تھی میرے گال
زرد تھے بیمچہرے کا
رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ دیمک
جاٹ گئی تھی کہ میرے
جیون کی کیاری بنجر بنتی
جاتی تھی۔ میں اس میں
نہ تو کچھ بو سکتی تھی اور
نہ کچھ بو کر کاٹ سکتی تھی
کیونکہ میری ازدواجی زندگی
کی کیاری میں جہاں محبت
اور خلوص، مسرت اور
شادمانی کی فصل اُگنا چاہیے
تھی وہ سوکھتی جاتی تھی
اور کانٹے اُگتے جاتے
تھے۔

کاش! اسلم سمجھ لے
کہ مجھے عیش کے دکھ نہیں
چاہئیں۔
کاش وہ سمجھ لے
کہ عیش کے دُکھوں نے
میرے گالوں کے ٹیسو
مجھ سے چھین لئے ہیں۔
اور میں اُن دکھوں
کے نیچے دبی جاتی ہوں
کچلی جاتی ہوں۔!!

غزل

از

جناب ادیب مالیگانوی

آتشِ جام سے نہیں ڈرتے
برقِ گلفام سے نہیں ڈرتے

تیری زلفوں سے جن کو نسبت ہے
ظلمتِ شام سے نہیں ڈرتے

غمِ انساں ہے جن کے سینوں میں
کفر و اسلام سے نہیں ڈرتے

ظلم کی موت، قہر ہے پھر بھی
لوگ! انجام سے نہیں ڈرتے

خوف کھاتے ہیں بات بات کا ہم
تم کسی کام سے نہیں ڈرتے

اہلِ دل ہر فضا میں ہیں آزاد
دانہ و دام سے نہیں ڈرتے

بندگانِ وفا ادیبؔ کبھی
شورشِ عام سے نہیں ڈرتے

غزل

از

محترمہ [illegible] شبنم شمع

جذبِ دل میرا آزمانے کو
اُس نے دُہرا دیا فسانے کو

برق سے دوستی رہے قائم
آگ لگ جائے آشیانے کو

اک تری جستجو ہی کافی ہے
زندگی بھر فریب کھانے کو

ڈھونڈتی ہوں مگر نہیں پاتی
اپنے گزرے ہوئے زمانے کو

مست آنکھوں سے دیکھنے والے
بند کر دے شراب خانے کو

میرے نقشِ جبیں ہیں اب دُنیا
ڈھونڈھ لے اُس کے آستانے کو

شمعؔ نے کھینچ کر اِک آہِ سرد
مختصر کر دیا فسانے کو


حُسن نکھرتا گیا۔ جوں جوں رکسونا
استعمال کیا . . .
. . . کیونکہ کیڈل آمیز
رکسونا سے سویا ہوا حُسن
جاگ اُٹھتا ہے
کیڈل آمیز رکسونا سے حسین بننا سچ مچ آسان ہے۔
اس کے روزانہ استعمال سے آپ دیکھیں گی کہ آپ کی
جلد روز بروز زیادہ صاف اور ملائم ہو رہی ہے۔ اور
آپ کا حُسن پھول کی طرح کِھل رہا ہے۔
بڑے سائز میں
بھی مِلتا ہے
رکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن
کیڈل جلد کیلئے ملائم اور مقوی
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا طبی نام ہے


میرے حلق میں ایسی خراش تھی کہ
مجھے سٹکنے میں تکلیف ہوتی تھی
لیکن پیس
نے اسے آرام پہنچا دیا
گلے اور چھاتی کی ٹکیوں پیس میں آرام دہ و پُر اثر دواؤں کے ست ہوتے ہیں!
جیسے ہی آپ پیس چوستے ہیں یہ ست آپکے سانسوں کے ساتھ حل ہو کر سانسوں کی
نلیوں و پھیپھڑوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سیدھے آپکی بیماری پر حملہ کرتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ پیس اتنی پُر اثر اور شہرۂ آفاق ہیں۔ پیس کھانسی، حلق کی خراش،
بلغم وغیرہ کو دُور کرتی ہیں اور زکام و نزلے کا اکسیر علاج ہیں۔
پیس
گلے و چھاتی کی ٹکیاں
تمام دوا فروشوں کے یہاں دستیاب ہیں۔


آہاہا.....!
یہ کتنے لذیذ
ہیں
خستہ، لذیذ ایکمی بسکٹ۔
بچوں اور بوڑھوں میں یکساں مرغوب
ہمیشہ خرید فرمائیں۔ جنھیں تمام
گھر والے پسند کرتے ہیں۔
Acme
SPECIAL BISCUITS
ایکمی سپیشل۔ نائس۔ ماری۔ کسٹرڈ کریم
سالٹش۔ پکنیٹ بیڈی۔ فنگر کریم
چلڈرن سپیشل۔ ایرا روٹ وافر۔ لیمن ایرا روٹ

افسانہ

حُسنِ سیرت

از

جناب رضا علی عابدی ایم۔اے۔ایل ایل۔بی

ملیر اسٹیشن کراچی ۲۳ ——— ۲۴۔ مارچ ۱۹۵۵ء

بزرگِ محترم! آداب

حُسنِ سیرت نے کچھ حسین، رومان پرور، تلخ اور حقیقت آمیز نقوش جن میں کہیں کہیں مذہب کی (جو انسانیت کا دوسرا نام ہے) ہلکی سی شعاع بھی ہے۔ بیسویں صدی کی نذر ہیں۔ آپ جس طرح بیسویں صدی کو سجاتے اور زینت دیتے ہیں۔ شاید یہ نقوش اُس کی مزید سجاوٹ کا سبب بن سکیں۔

بیسویں صدی میں تصویروں کا سلسلہ تو ہمیشہ رہا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ فلمی، جاسوسی اور جنسیاتی ادب پر آپ کا یہ عمل کتنا عظیم طنز ہے۔ ——— فلمی ادب میں حیا سوز تصویریں ہوتی ہیں ——— جنسیاتی ادب، تحریر میں اِن تصاویر کو پنہاں کرتا ہے۔ اور جاسوسی ادب اِن دونوں کے مابین چل رہا ہے۔ عقل حیران ہے کہ آخر ادب کا راستہ کون ہے ——— کراچی ہی کو لے لیجئے۔ یہاں فلمی ادب اور جاسوسی ناولوں کی بہت مانگ ہے۔ جگہ جگہ لائبریریاں قائم ہیں، جو دو روپے ماہوار لے کر عوام کو ادبی آسودگی بہم پہنچاتی ہیں۔ لیکن اِن کی تمام فہرست دو قسم کے رسالوں یا کتابوں پر مشتمل ہوتی ہے ——— یا تو فلمی یا جاسوسی!

آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ادب کو جس راستے کا پتہ دے رہے ہیں وہ صد درجہ صحیح اور مقبول ہے۔ کراچی تشریف لائیے تو تفصیل سے گفتگو ہو۔ اِس دفعہ "طنز و مزاح" کا آغاز بھی خوب ہے۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

احقر

رضا علی عابدی

زاہد میرا بہترین دوست ہے۔ صد درجہ نیک طینت ہے۔ چھ سات سال سے میرا دوست ہے لیکن میں نے اُسے بناوٹی گفتگو کرتے ہوئے نہیں پایا۔ خلوص اور محبت اُس کے انگ انگ میں رچ چکا ہے۔ جب میں کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں تو وہ میرے چہرے سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور اپنی تمام تر توجہ میری طرف کر دیتا ہے۔ پہلے تھوڑا سا جھک جاتا ہے کیونکہ تواضع اُس کی فطرت ہے۔ پھر مسکراتا ہے بس اِس میں طنز نام کو نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کوئی اُس کی عادت سے واقف نہ ہو تو شاید یہ شک کر بیٹھے کہ اُس کی ہنسی ہنسی نہیں، وہ اپنی جھینپ مٹا رہا ہے۔ وہ مسکراتا ہے اس لئے کہ مسکرانا اُس کی سرشت میں داخل ہو چکا ہے۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو انتہائی خلوص سے میرے شانوں پر ڈال دیتا ہے۔ اِس طرح جیسے اپنے خلوص کا بار بھی بہت اُٹھوا رہا ہے۔ پھر اُس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اور چمکتی ہوئی آنکھوں تمتماتے

ہوئے چہرے اور مسکراتے ہوئے لبوں سے پوچھتا ہے۔

"بولو امجد! میں ہمہ تن گوش ہوں، جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے دھڑک کہہ دو۔ میں انتظار کی مزید تاب نہیں لا سکتا۔"

بس ایسے ہی جملے ہمیشہ اُس کے مُنھ سے نکلتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے بھی محبت کرنا سکھا دیا ہے۔ میرے دل کو دردمند بنا دیا ہے۔ میں تو ہمیشہ اُس کا احسان مند رہوں گا۔

میں سنہ ۱۹۴۷ء میں پنجاب آیا۔ اور تمام پنجاب میں کسی کے دل میں میرے لئے جگہ پیدا ہوئی تو وہ زاہد کا دل تھا۔ پنجاب کا یہ سیدھا سادہ انسان سنہ ۱۹۵۰ء تک شلوار اور قمیص پہنا کرتا تھا۔ اور سنہ ۱۹۵۰ء میں جیسے ہی اُس نے بی اے پاس کیا تو اپنا چولا ہی بدل دیا۔ بہترین سوٹ، نہایت اچھے قسم کی ٹائی۔ ولایت کی سلی ہوئی اسٹیف کالر کی قمیص۔ اُس کے ظاہری لباس میں ضرور تبدیلی ہو گئی تھی۔ لیکن باطن ویسا ہی صاف و شفاف تھا۔ بلکہ ظاہری لباس کے فرق سے اُس میں اور بھی جلا پیدا ہو گئی تھی۔

چائے سے بھی اسے سنہ ۱۹۵۰ء تک نہ جانے کیوں پرہیز تھا۔ لسی کے پیالے بڑے مزے لے لے کر پیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ اِن ہی پیالوں میں تو سوہنی مہینوال ——— ہیر رانجھا ——— مرزا صاحبان ——— اور بالو وغیرہ کی پیار بھری داستانیں رقص کرتی نظر آتی ہیں ——— یہ لسی نہیں، پنجاب کے سب سے بڑے رومانی دریا یعنی چناب کی وہ بل کھاتی ہوئی ٹھنڈی اور سفید لہر ہے جس کی وسعتوں میں ہزاروں، لاکھوں رُومانی داستانیں چھُپی ہوئی ہیں۔ اور جن میں اب بھی بے پایاں سرور اور مدہوشی ہے۔

اب کوٹ اور پتلون کی زیبائش کے ساتھ اُسے چائے کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ اور اُس کا خیال ہے کہ تقریباً چالیس فی صدی رومان تو اُس سے رخصت ہو چکا ہے۔ لیکن چائے پیتا ہے تو کسی بڑے ہوٹل میں بیٹھ کر، جہاں بیرے کو چائے کے بعد وہ ٹپ بھی دیا کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ جب بارہ آنے دو کپ چائے میں دیئے جا سکتے ہیں تو چار آنے ٹپ میں بھی سہی۔ اِس طرح بیرے بیچارے کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ اور اِس کے علاوہ اُن بے چاروں کا سہارا بھی کیا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے منیجر بے چاروں کو بہت قلیل تنخواہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال سے اُسے دلی لگاؤ ہے۔ اور وہ انھیں رومی، بھانی، کالیداس، حافظ، سعدی، غالب، ورڈس ورتھ، اور کارلائل وغیرہ کا درجہ دیتا ہے۔ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اُس نے اپنی فارسی اور عربی کی استعداد کو بڑھایا۔ فارسی کی موٹی موٹی لُغتوں کا مطالعہ، عربی سے گہرا لگاؤ سب اُس کے ذوق و شوق کو اُجاگر کرتے ہیں۔ دو تین اشعار تو وہ جیسے ہر وقت گنگنایا کرتا ہے۔

ؔ　عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ؔ　فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ؔ　رموزِ علم ادریسی بود ذوقی نہ تدریسی
چہ داند ذوقِ ابلیسی رموزِ علم الاسمائی

اُس کا قول ہے کہ دُنیا کے ہر بڑے شاعر کا مذہب انسانیت ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اُس کی شخصیت عالمگیر اور ہمہ گیر نہیں!

چھ سال کی خاموشی کے بعد ایک دن میں نے پوچھا ——

"زاہد! تم نے مجھ سے محبت کی ہے۔ بے مثال محبت! آج میں اُس محبت کا بدلہ چاہتا ہوں۔"

میرا جملہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ اُس نے اپنا پورا چہرہ میری طرف کر دیا۔ اور اپنی عادت کے مطابق مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ میرے شانوں پر خلوص سے حائل کر دیئے۔ اور آنکھوں کے دیئے روشن کر کے بولا ——

"میرے امجد بھیا! آج تم بہت مُوڈ میں ہو۔ میری محبت کا مذاق مت اُڑاؤ۔ مجھے تو ہر فردِ بشر سے دلی اُنس ہے۔ کاش میں انسانیت کے کسی کام آ سکوں۔"

"بس یہی خلوص تو مجھے مارے ڈالتا ہے۔ کاش تم مرد کے بجائے عورت ہوتے تو اب تک تو میں نے اپنا سر تمھارے قدموں پر ڈال دیا ہوتا۔"

زاہد بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"بھئی بہت خوب! کیا محبت دکھائی آپ نے! پھول سے اُس کی خوشبو کو جدا کرنا چاہتے ہو بھئی خدا کی قسم تمھارے خلوص کی تعریف نہیں ہو سکتی۔"


منّی کی نئی فراک
اماں میری نئی فراک
منّی، اب خیال رکھنا اس کا
آؤ منّی کھیلیں!
نہ بابا میری نئی فراک خراب ہو جائے گی۔
منّی! تیری فراک تو پھٹ گئی
لیکن میں نے تو بہت خیال رکھا تھا۔
آپ نے اسی فراک کی گارنٹی دی تھی نا
ہوں... اسمیں قصور دھونے والے کا ہے۔
کپڑے میں خود دھوتی ہوں!
معاف کیجیے...
... لیکن یہ حالت پیٹنے سے ہوتی ہے جس سے کپڑے کے ریشے نکل آتے ہیں اور کمزور ہو کر پھٹ جاتے ہیں۔
لیکن سنلائٹ صابن سے کپڑے بغیر پیٹے سفید اور اُجلے دھلتے ہیں۔
وہ سچ ہی کہتا تھا! اب میں انہیں سنلائٹ صابن کے بھرپور جھاگ سے دھوتی ہوں جس سے کپڑے بہت دیر چلتے ہیں اور اس طرح پیسے بچتے ہیں
SUNLIGHT SOAP
سنلائٹ صابن سے کپڑے بہت دیر چلتے ہیں
ہندوستان میں بنتا ہے

S. 228-X52UD

"اچھا بھائی، مذاق ختم کرتا ہوں۔ ایک بات خلوص سے بتاؤ۔ تم نے انسانیت اخلاق، اور محبت کے جذبے سیکھے کہاں سے ؟"

"انسانوں سے !"

بہت مختصر سا جواب ملا۔

"کیا آدمی اور انسان میں بھی کوئی فرق ہے ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"ہاں !" اُس نے کچھ سنجیدگی سے جواب دیا۔

"وہ کیا ؟"

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا !"

"کیا آج کی دُنیا میں بھی انسان موجود ہیں ؟"

"جس دن انسان دُنیا سے جدا ہو جائیں گے، تمام کائنات ہی ختم ہو جائے گی !"

"مجھے تو دُنیا میں سب ہی انسان نظر آتے ہیں۔"

"ہاں تم نے کسی حد تک ٹھیک کہا ہے۔ یوں سمجھو ہر دل میں انسانیت کی ایک شعاع موجود ہے۔ اِس شعاع کی حفاظت، ترقی اور ارتقاء کا ہر فرد خود ذمہ دار ہے۔ کسی کے دل میں یہ شعاع موجود تو ہے لیکن ماحول کے غبار نے چاروں طرف سے اُسے قید کر دیا ہے۔ کوئی بالکل ختم ہو چکی ہے، کوئی سسکیاں لے رہی ہے۔ لیکن چھوڑو تم کن خیالات میں پڑ گئے۔"

"زاہد ! تمھاری نگاہ بہت گہری ہے۔ کیا بھائی تم یہ بتا سکتے ہو کہ تمھیں انسان کس نے بنایا ہے ؟"

"انسانوں نے !"

"اور انسانوں کو ؟"

"مذہب نے !"

"مذہب کسے کہتے ہیں ؟"

"راستے کو ! عبد کے معبود تک پہنچنے کا راستہ۔"

"کیا دُنیا کا ہر مذہب یہی سکھاتا ہے ؟"

"ہاں دُنیا کے ہر مذہب کو یہی تعلیم دینی چاہیئے۔ اور یہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ ہر بات محبت سے طے ہو سکتی ہے۔"

"اب تم نے مذہب کی بحث چھیڑ دی ہے تو مجھے یہ کہنے دو کہ ہم نے تو جتنے مذہبی آدمی دیکھے ہیں۔ اُنھیں عموماً تکلیفوں اور مصیبتوں کا شکار دیکھا ہے۔ بے چارے فاقے کرتے ہیں۔ ٹاٹوں پر سوتے ہیں۔ دن بھر کی دھوپ راتوں کی اوس سے جسم صعوبتیں اُٹھاتا ہے۔ کیا عبد کی یہی منزل ہے ؟ علامہ اقبال نے خود کہا ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

ہائے ہائے میرے بھولے امجد ! تم کس قدر جلد بُرے خیالات کو دل میں جگہ دے دیتے ہو۔ اب یہ باتیں بہت تفصیل چاہتی ہیں۔ ایک نشست میں سب کچھ تو نہیں بتایا جا سکتا۔"

"اسی لئے تو میں خود نہیں چاہتا تھا کہ تمھیں مذہب پر بحث کے لئے مجبور کردوں لیکن جب تم نے خود مذہب کو اہمیت دی تو مجھے کچھ کہنا پڑ گیا۔"

"میں جانتا ہوں امجد ! تم ایسے نہیں مانوگے۔ لو میں تمھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ شاید وہی کچھ میری ترجمانی کر سکے۔"

"ہاں ہاں زاہد بھائی ! اللہ رہتا دو ! تمھاری صحبت کے صدقے ہی میں تو کسی حد تک انسان بن گیا ہوں۔"

"میرے اِس واقعے سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ تم پر میں اپنی موعوبیت جتا رہا ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص تا دمِ مرگ طالب علم ہے۔ ہر لحظہ گزرتے ہوئے لمحات کچھ درس دیا ہی کرتے ہیں۔"

"ارے میاں چھوڑو ان باتوں کو اب سُنا دو واقعہ !"

"میرے بھائی ! قصّہ بہت پُرانا ہے۔ ہزاروں برس پہلے کا۔ اور خصوصاً اِس زمانے کے لوگ جو مذہب کو ایک ڈھونگ سمجھتے ہیں، اُن کے لئے تو یہ ایک عجیب سی بات ہوگی جس پر اُن کی طنزیہ مسکراہٹ یہ ثابت کرے گی کہ اُنھیں اِس واقعہ کی سچائی کا یقین نہیں۔ بہرحال تم مصر ہو اس لئے بیان کرتا ہوں۔ ورنہ نئے ذہنوں سے اُلجھنا اِس دَور میں آسان نہیں۔

بھائی قصّہ یوں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں دو فرشتوں کو حکم [illegible] ہوا کہ زمین [illegible] احکام لے کر جاؤ۔ احکام یہ تھے کہ ۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ فلاں [illegible] جو دن بھر سے روزہ رکھے ہوئے ہے اور اِس وقت اپنی دیگچی چولھے پر چڑھانے

روزہ کھولنے کا سامان کر رہا ہے۔ جاکر اُس کی دیگچی … دوسرے فرشتے کو حکم ہوتا ہے فلاں فاسق و فاجر پر خزانے کھول دو۔ مصلحتِ خداوندی میں کسے چون و چرا کرنے کی جرأت ہے۔ لیکن شاید فرشتوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ مومن بے چارے کو جو دن بھر کے روزے سے تھا اُس کے لئے یہ حکم کہ چولھے پر رکھی ہوئی دیگچی کو اُلٹ دو۔ اور جس کے فعل اچھے نہ تھے بلکہ ننگِ زمانہ تھے اُس پر خزانے وا کر دیئے جائیں۔ فرشتوں نے اِن احکام کی بجا آوری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ واپس جا رہے تھے کہ حضرتِ سلیمانؑ سے ملاقات ہو گئی۔ حضرتِ سلیمانؑ نے جب پوچھا تو اُنھوں نے پورا واقعہ کہہ سُنایا۔ واقعہ کے دوران میں شاید حضرتِ سلیمانؑ نے یہ محسوس کیا ہو کہ فرشتوں نے احکام کے بجا لانے میں کوئی کمی نہیں کی لیکن یہ کچھ مشکوک ضرور ہو گئے ہیں۔ حضرتِ سلیمانؑ نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے بلند کئے۔ حکمِ ایزدی پہنچا کہ اے سلیمان! وہ مومن جس کے لئے ہانڈی اُلٹ دینے کا حکم تھا، اُس نے نیک اعمال کے ساتھ دو ایک بُرے کام بھی کئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا مومن بُرے افعال کا مرتکب ہو۔ اور اگر ہوا ہے تو اُسے اِسی دنیا میں اُس کی سزا مل جائے۔ وہ ایک دن کے روزے سے تھا اگر چند گھنٹے مزید فاقے سے رہ کر اُس کے گناہ ختم ہو سکتے ہیں تو اِس سے زیادہ اور کیا رحمتِ ایزدی کا ظہور ہو سکتا ہے۔ رہ گیا وہ فاسق و فاجر اُس سے مجھے قطعی اُنس نہیں! جب تک کہ وہ نیک کردار نہ بن جائے اور اپنے گناہوں سے تائب نہ ہو جائے اُس نے اب تک کچھ اچھے کام بھی کئے تھے۔ اُس کی جزا اُسے ملنی ہی تھی۔ میں نے اُن اچھے کاموں کی جزا میں اُس پر دُنیا کے خزانے کھول دیئے۔ تاکہ روزِ جزا وہ اپنے نیک کاموں کی جزا کا طالب نہ ہو سکے۔ اور امجد میاں! سچی بات تو یہ ہے کہ دولت ایسی نامراد چیز ہے کہ اچھے اچھوں کا دماغی توازن خراب کر دیتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ وقتی تکالیف میں مبتلا ہو کر معبود سے بے خبر نہیں ہونے پاتے اِسی لئے اُن کا دامن دولتِ زر سے نہیں بلکہ دولتِ اخلاق، جوہرِ خلوص اور مہر و الفت اور انسان دوستی سے لبریز رہتے ہیں۔ میرے لئے تو بھائی یہی چیزیں مشعلِ راہ بنی ہیں۔ اور میں نے اب تک یہی کچھ نتائج اخذ کئے ہیں جنھیں تمھارے حضور نہایت خلوص سے پیش کر چکا۔ میں اِس امر کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں سو فی صدی اپنے نظریئے میں صحیح ہوں۔ اِس لئے کہ تحقیق کے لئے حیات باقی ہے۔ مرتے وقت ہی کسی صحیح بات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ اگر آج مر گیا تو یہی بات صحیح سمجھنا، ورنہ میری حیات باقی ہے تو تحقیق کا میدان بھی بہت وسیع ہے۔"

امجد جواب تک زاہد کا مُنہ تک رہا تھا سر جھکا کر بولا ـــــ

"زاہد! اب تم نے میرے لئے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ بس اِتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ بہت اعلیٰ خاندان تھا جس میں تم پروان چڑھے اور بہت ہی سازگار ماحول تھا جس میں تم نے پرورش پائی۔ اور تمھارے تیور بتاتے ہیں کہ مستقبل کے لئے تمھاری شخصیت بہت پُر خلوص اور اُمید افزا ہے۔ میں تو بھائی انگریزی پڑھا لکھا ہوں۔ تمھاری طرح مولوی تو نہیں۔ کچھ انگریزی میں میری بھی باتیں سُن لو۔ تم جسے روحانیت کہتے ہو اُس کے متعلق صرف تین کلمے پیش کرتا ہوں ـــــ

MORALITY; SAID GESEUS IS KINDNESS TO THE WEAK

MORALITY, SAID NIETZSCHE IS THE BRAVING OF THE STRONG

MORALITY, SAID PLATO, IS THE EFFECTIVE HARMONY OF THE WHOLE.

بہرحال زاہد! تمھاری زندگی قابلِ تقلید ہے۔"

"اب آ گئے تم خوشامد پر!"

"خوشامد کا لفظ تمھاری زبان سے اچھا نہیں لگتا۔

"اب میں یہ کہوں کہ یہ لفظ تمھیں نے سکھایا ہے۔ تو تم بُرا مانو گے۔" زاہد مسکرایا۔

"سچ کہتا ہوں زاہد! کاش تم عورت ہوتے۔"

زاہد پھر زور سے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے ہی بولا ـــــ

"تو پھر ایک ترکیب بتاؤں۔"

میں جیسے چونک پڑا۔

"ترکیب ـــــ؟"

"ہاں!"

"ضرور بتاؤ اور جلد بتاؤ میں تمھاری جُدائی میں تڑپ رہا ہوں۔"

"ہاں تو پھر بتا ہی دوں؟"


ترو تازہ بنی رہیے!
ملائمت محسوس کیجیے!
حسن کے نکھار کو باقی رکھیے!
CHARMIS
ترو تازہ بنی رہیے! نہانے کے بعد چارمس ٹالکم پاؤڈر کو سارے جسم پر چھڑک لیجیے۔ اس کے استعمال کے بعد آپ کتنی تازگی کیسی فرحت اور کس قدر ٹھنڈک محسوس کرتی ہیں۔
ملائمت محسوس کیجیے! جسم کے حساس حصوں پر بکثرت چارمس ٹالکم پاؤڈر کا استعمال کیجیے۔ اس کا حفاظت عطا کرنے والا ریشمی استر جلد کے کھردرے پن کے خلاف ضمانت ہے۔
حسن کے نکھار کو باقی رکھیے! اکثر اور افراط کے ساتھ چارمس ٹالکم پاؤڈر کا استعمال ایک کم خرچ عشرت ہے۔ یہ حسن اور رومانیت کا راز ہے۔
چارمس
ٹالکم پاؤڈر
حد درجہ رومان انگیز خوشبو والا۔
کولگیٹ کے بنائے ہوئے چارمس کی افزائشِ حسن والی اشیاء میں ہر مقصد کے لائق کریم اور اسنو۔ دو خاص الخاص چہرے کے کریم بھی ہیں جو ہر طرح کی جلد کے لیے کارآمد ہیں۔

"اُف کس مُنھ سے کہوں ؟"

زاہد نے چہرے پر سنجیدگی بکھیرتے ہوئے کہا ــــ

"میرے SEX CHANGE ہونے کا انتظار کرو۔"

ہنستے ہنستے ہم دونوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ حد درجہ سادگی کی بدولت یہ عجیب بات بھی زاہد کی زبان پر آگئی تھی۔

"جانتے ہو اِس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے۔ بائیڈروجن بم تو خیر فراڈ تھا ہی۔ سائنس نے انسانوں کے جسموں میں بھی جنسی تبدیلی کا امکان پیدا کر دیا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ CHANGE OF SEX ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سالہا سال سے یہ دُنیا قائم ہے آج تک کوئی جنسی تبدیلی ہوئی نہیں۔ یہ ادبار آخر اِسی صدی میں کیوں آیا ؟"

"امجد میاں! یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ اخبار بیچنے والی خبریں ہیں"

اِس ملاقات کے بعد تین ہفتے تک زاہد سے ملنا نہ ہو سکا۔ مجھے حیرت اور پریشانی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ انھیں دنوں خبر ملی کہ زاہد کی شادی ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کیا ہوگئی۔ پچھلی ملاقات میں کوئی تذکرہ بھی نہ تھا۔ دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ آخر اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے طے ہوگیا۔ زاہد نے اکثر اِس خیال کا اظہار کیا تھا کہ میرا ارادہ ایم۔اے میں داخلہ لینے کا ہے۔ اور جب تک تعلیم حاصل کر رہا ہوں شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا میری نوکری کا، وہ قطعی وقتی ہے۔ میں شادی سے پہلے اپنا کیریر بنا لینا چاہتا ہوں۔

شادی کی اطلاع ــــ خود مجھے اُس دن ملی جس شام کو اُس کا عقد ہونے والا تھا۔ جب میں اُس کے گھر پہنچا تو وہ دُولھا بن چکا تھا۔ میں اُس کی عادت سے واقف تھا کہ یہ حضرت فطرتاً بہت ہی شرمیلے ہیں۔ اگر کوئی گہری اور بے موقع بات اِس وقت مُنھ سے نکل گئی تو نہ جانے کیا رنگ لائے۔ اِس لئے خیالات کو پی گیا۔ اور میں نے بڑے چاؤ سے عقد میں شرکت کی۔

لیکن دل میں ایک خلش تھی کہ آخر لڑکی کیسی ہے، خاندان کیسا ہے، لڑکی کی تعلیم کہاں تک ہے ؛ صورت شکل کی کیسی ہے۔ خاندان والوں کی تعلیم کہاں تک ہے ؟ اور یہ سب کچھ آخر اس قدر جلد ہوا کیوں ؟

زاہد میری موجودگی سے بہت خوش تھا۔ مجھ سے بولا۔" ذرا میرے سہرے کے پھولوں کو سہارا دیتے رہنا۔" اور بالکل دلہنوں والے لہجے میں آہستہ سے شرماتے ہوئے کہا۔" ذرا قریب ہی بیٹھنا۔ ایسا نہ ہو کہ میری نظریں تمھیں تلاش کرتی رہیں۔" اِس موقعے پر بہت کچھ بولا جا سکتا تھا۔ لیکن میں ضبط کرکے رہ گیا میں نے قدرے مسکراتے ہوئے صرف اشارے سے زیر لب کہا۔" مجھے تمھارا پورا خیال ہے۔ تم بے فکر رہو۔" مجھے اُس کے جملے بہت رُوکھے سُوکھے معلوم ہوئے اِس لئے کہ اُس کے خلوص بھرے ہاتھ میرے شانوں پر نہ تھے۔ وہ بھانپ گیا۔ کہنے لگا ــــ

"مجھے معلوم ہے کہ تم کبیدہ خاطر کیوں ہو۔ بہرحال صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ یہ راز تم اپنی ہونے والی بھابی سے پوچھ لینا۔ میں دراصل بہت ہی کشمکش و پیچ میں ڈال دیا گیا۔ بس اماں کو تو تم جانتے ہو۔ کہنے لگیں کہ زاہد تو نے انکار کیا تو میں کچھ کھا کر سو جاؤں گی۔"

"ارے میاں یہ موقعہ ان باتوں کا نہیں۔ میرا خیال چھوڑ دو اور اپنے خیالات کا مرکز میری ہونے والی بھابی کو بناؤ!"

زاہد کی شادی ہوگئی۔

دو دن تک میں خود نہیں گیا۔ دونوں دن اُس نے آدمی بھیجے لیکن میں وعدے کے باوجود نہیں گیا۔

اِس دوران میں مجھے پتہ چل گیا کہ زاہد کی شادی بہت اچھے گھرانے میں ہوئی ہے۔ سب لوگ وہاں پڑھے لکھے ہیں۔ سسر صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی ہیں۔ اب پنشن پا چکے ہیں ــــ ساس ایف۔ اے پاس ہیں ــــ سالیاں دو ہیں، ایک بی ایس سی میں ہے، اور دوسری ایم۔ اے کی طالب ہے ــــ لڑکی کے ماموں جان کالج میں پروفیسر ہیں ــــ چچا جان انگریزی فرم میں منیجر ہیں ــــ خالہ میٹرک پاس ہیں ــــ اور خود بیگم صاحبہ بی۔ اے بی۔ ٹی ہیں۔ اور کسی اسکول میں معلمہ ہیں۔

تیسرے دن میں خود زاہد کے گھر پہنچ گیا۔

وہ کمرہ جہاں ہم نے مدتوں خوش گپیاں کی تھیں حسبِ معمول خالی تھا میں بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ اُسی کمرے سے ملحق دوسرا کمرہ تھا، جہاں زاہد موجود تھا۔ شاید بیوی صاحبہ بھی تھیں، اور دو تین آوازیں آرہی تھیں میں ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا اور اُس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اندر سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں اور قہقہے بلند ہوئے۔

"ہمارے دُولھا بھائی بھی بڑے بھولے ہیں"

"مزے کا ٹھ کے ہیں"

میں ذرا چونکتا ہوا۔

شاید زاہد میاں کی سالیاں تھیں۔ پھر دوسرے لمحے اُنھیں میں سے کسی نے کہا ——

"دُولھا بھائی اور باجی کا تفاوت ملاحظہ کیجئے۔

دُولھا بھائی بی۔اے پاس —— اور باجی بی۔اے بی۔ٹی

دُولھا بھائی کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے —— اور باجی کی تنخواہ دو سو روپے

دُولھا بھائی کا وزن ایک من پانچ سیر —— اور باجی کا وزن دو من دس سیر

دُولھا بھائی کی عمر چھبیس سال کی —— اور باجی کی عمر بتیس سال کی

پھر قہقہے بلند ہوئے۔

میں گھبرا کر اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

حیرت کے عالم میں یہ خیال دل کو منقلب کرنے لگا کہ زاہد اور اُس کی شریکِ حیات میں یہ تفاوت! اُسی لمحہ میرے دل میں یہ خیال بھی گزرا کہ پہلے تو نہیں لیکن اب زاہد میاں ضرور CHANGE OF SEX کا شکار ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب زاہد باہر آیا تو پھیکی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اور مجھ سے یوں شرما رہا تھا جیسے وہ میرا قرضدار ہو میں فرطِ جذبات میں اُس سے بغلگیر ہوگیا۔

"اُف کس مُنہ سے کہوں ؟"

زاہد نے چہرے پر سنجیدگی بکھیرتے ہوئے کہا —

"میرے SEX CHANGE ہونے کا انتظار کرو"

ہنستے ہنستے ہم دونوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ حد درجہ سادگی کی بدولت یہ عجیب بات بھی زاہد کی زبان پر آ گئی تھی۔

"جب سنتے ہو اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی تو خیر فراڈ تھا ہی۔ سائنس نے انسانوں کے جسموں میں بھی جنس کی تبدیلی کا امکان پیدا کر دیا ہے"

"تمہارا مطلب ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ CHANGE OF SEX ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سالہا سال سے یہ دُنیا قائم ہے آج تک کوئی جنسی تبدیلی ہوئی نہیں۔ یہ اوبار آخر اسی صدی میں کیوں آیا ؟"

"امجد میاں! یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ اخبار بیچنے والی خبریں ہیں"

اس ملاقات کے بعد تین ہفتے تک زاہد سے ملنا نہ ہو سکا۔ مجھے حیرت اور پریشانی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ انھیں دنوں پتہ چلا کہ زاہد کی شادی ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کیا ہو گئی پچھلی ملاقات میں کوئی تذکرہ بھی نہ تھا۔ دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ آخر اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے طے ہو گیا۔ زاہد نے اکثر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ میرا ارادہ ایم اے میں داخلہ لینے کا ہے۔ اور جب تک تعلیم حاصل کر رہا ہوں شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا میری نوکری کا، وہ قطعی وقتی ہے۔ میں شادی سے پہلے اپنا کیریر بنا لینا چاہتا ہوں۔

شادی کی اطلاع — خود مجھے اُس دن ملی جس شام کو اُس کا عقد ہونے والا تھا۔ جب میں اُس کے گھر پہنچا تو وہ دُولھا بن چکا تھا۔ میں اُس کی عادت سے واقف تھا کہ یہ حضرت فطرتاً بہت ہی شرمیلے ہیں۔ اگر کوئی گہری اور بے موقع بات اِس وقت مُنہ سے نکل گئی تو نہ جانے کیا رنگ لائے۔ اِس لئے خیالات کو پی گیا۔ اور میں نے بڑے چاؤ سے عقد میں شرکت کی۔

لیکن دل میں ایک خلش تھی کہ آخر لڑکی کیسی ہے، خاندان کیسا ہے۔ لڑکی کی تعلیم کہاں تک ہے؟ صورت شکل کی کیسی ہے۔ خاندان والوں کی تعلیم کہاں تک ہے؟ اور یہ سب کچھ آخر اس قدر جلد ہوا کیوں؟

زاہد میری موجودگی سے بہت خوش تھا۔ مجھ سے بولا "ذرا میرے سہرے کے پھولوں کو سہارا دیتے رہنا" اور بالکل دلہنوں والے لہجے میں آہستہ سے شرماتے ہوئے کہا "ذرا قریب ہی بیٹھنا۔ ایسا نہ ہو کہ میری نظریں تمہیں تلاش کرتی رہیں" اس موقعے پر بہت کچھ بولا جا سکتا تھا لیکن میں ضبط کر گیا۔ میں نے قدرے مسکراتے ہوئے صرف اشارے سے زیر لب کہا "مجھے تمہارا خیال ہے۔ تم بے فکر رہو" مجھے اُس کے جملے بہت دُکھے سُوکھے معلوم ہوئے اِس لئے کہ اُس کے خلوص بھرے ہاتھ میرے شانوں پر نہ تھے۔ وہ بھانپ گیا۔ کہنے لگا —

"مجھے معلوم ہے کہ تم کبیدہ خاطر کیوں ہو۔ بہر حال صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ یہ راز تم اپنی ہونے والی بھابی سے پوچھ لینا۔ میں دراصل بہت ہی کشمکش و پیچ میں ڈال دیا گیا۔ بس اماں کو تو تم جانتے ہو کہنے لگیں۔ زاہد تو نے انکار کیا تو میں کچھ کھا کر سو جاؤں گی"

"ارے میاں یہ موقعہ ان باتوں کا نہیں۔ میرا خیال چھوڑ دو اور سب خیالات کا مرکز میری ہونے والی بھابی کو بناؤ!"

زاہد کی شادی ہو گئی۔

دو دن تک میں خود نہیں گیا۔ دونوں دن اُس نے آدمی بھیجے لیکن میں وعدے کے باوجود نہیں گیا۔

اس دَوران میں مجھے پتہ چل گیا کہ زاہد کی شادی بہت اچھے گھرانے میں ہوئی ہے۔ سب لوگ وہاں پڑھے لکھے ہیں۔ سسر صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی ہیں۔ اب پنشن پا چکے ہیں — ساس ایف اے پاس ہیں — سالیاں دو ہیں، ایک بی ایس سی میں ہے، اور دوسری ایم اے کی طالبہ ہے — لڑکی کے ماموں جان کالج میں پروفیسر ہیں — چچا جان انگریزی فرم میں منیجر ہیں — خالہ میٹرک پاس ہیں — اور خود بیگم صاحبہ بی اے بی۔ ٹی ہیں۔ اور کسی اسکول میں معلمہ ہیں۔

تیسرے دن میں خود زاہد کے گھر پہنچ گیا۔

وہ کمرہ جہاں ہم نے مدتوں خوش گپیاں کی تھیں حسبِ معمول خالی تھا۔ میں بے تکلف اندر داخل ہوگیا۔ اُسی کمرے سے متصل دوسرا کمرہ تھا۔ جہاں زاہد موجود تھا۔ بیوی صاحبہ بھی تھیں، اور دو تین آوازیں آرہی تھیں۔ میں ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا اور اُس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اندر سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں قہقہے بلند ہوئے۔

"ہمارے دُولھا بھائی بھی بڑے بھولے ہیں"

"مزے کا ٹھ کے ہیں"

میں ذرا چونکا ہوا۔

شاید زاہد میاں کی سالیاں تھیں پھر دوسرے لمحے اُنھیں میں سے کسی نے کہا ——

"دُولھا بھائی اور باجی کا تفاوت ملاحظہ کیجئے۔

دُولھا بھائی بی اے پاس —— اور باجی بی اے بی ٹی

دُولھا بھائی کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے —— اور باجی کی تنخواہ دو سو روپے

دُولھا بھائی کا وزن ایک من پانچ سیر —— اور باجی کا وزن دو من دس سیر

دُولھا بھائی کی عمر پچیس سال کی —— اور باجی کی عمر بتیس سال کی

پھر قہقہے بلند ہوئے۔

میں گھبرا کر اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

حیرت کے عالم میں یہ خیال دل کو منقلب کرنے لگا کہ زاہد اور اُس کی شریکِ حیات میں یہ تفاوت! اُسی لمحہ میرے دل میں یہ خیال بھی گزرا کہ پہلے تو نہیں لیکن اب زاہد میاں ضرور CHANGE OF SEX کا شکار ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب زاہد باہر آیا تو پھیکی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اور مجھ سے یوں شرما رہا تھا جیسے وہ میرا قرضدار ہو میں فرطِ جذبات میں اُس سے بغلگیر ہوگیا۔

از

غزل

جناب عبد الحیٔ سہا چیوری

ہم نہ مغموم نہ مسرور تمھیں کیا معلوم

ہے خودی اپنی بدستور تمھیں کیا معلوم

تابشِ حُسن کا کیا حال سُنیں تم سے کلیم

تم تھے بے ہوش سرِ طور تمھیں کیا معلوم

چشمِ نم، تلخیٔ غم، جور و جفائے پیہم

ہم نے کیوں کر لیے منظور تمھیں کیا معلوم

میٹھی نظروں کی یہ ٹھنڈک نہیں وجہِ تسکین

دل میں جو آگ ہے مستور تمھیں کیا معلوم

اُن سے ممکن ہی نہیں ترکِ رہ و رسم مگر

ہے سہاؔ کس طرح مجبور تمھیں کیا معلوم

از

غزل

جناب صادق القادری بی اے آنرز

مدعائے سفر نہیں معلوم

جا رہا ہوں کدھر نہیں معلوم

ایک ہے شیخ و برہمن کا حال

کون ہے راہ پر نہیں معلوم

ہم سے پُوچھو نہ کچھ کسی کی خبر

ہم کو اپنی خبر نہیں معلوم

ایک ہی طرح وقت کٹتا ہے

فرقِ شام و سحر نہیں معلوم

دل سے اُٹھتی ہے صادقؔ اکثر آہ

کون سی بات پر نہیں معلوم

از

غزل

جناب اے۔ ایم۔ کوثرؔ

ہو ہی گیا تھا مطمئن عشرتِ کائنات پر

تیری نظر کا شکریہ، کر گئی دل کو غم اثر

جتنی تسلیاں مجھے دیتے ہیں وہ دمِ وداع

شدتِ اضطرابِ دل بڑھتی ہے کچھ اُسی قدر

عشوۂ دلبری میں تھا نازِ جفا ملا ہوا

درد بھی تھی، دوا بھی تھی حُسن کی شرمگیں نظر

غرق بھی ہو کے شاد ہوں بحرِ غمِ حیات میں

اے مرے ناخدا مجھے چھوڑ بھی میرے حال پر

دل میں یہ کون آ بسا کوثرِؔ غم نصیب کے

کِس کی نظر نے کر دیا سارے جہاں سے بے خبر

غزل

از

جناب عبدالحئی سہا چیوری

ہم نہ مغموم نہ مسرور تمھیں کیا معلوم

ہے خودی اپنی بدستور تمھیں کیا معلوم

تابشِ حُسن کا کیا حال سُنیں تم سے کلیم

تم تھے بے ہوش سرِ طور تمھیں کیا معلوم

چشمِ نم، تلخئ غم، جور و جفائے پیہم

ہم نے کیوں کر لیے منظور تمھیں کیا معلوم

میٹھی نظروں کی یہ ٹھنڈک نہیں وجہِ تسکین

دل میں جو آگ ہے مستور تمھیں کیا معلوم

مُں سے ممکن ہی نہیں ترکِ رہ و رسم مگر

ہے سہا کس طرح مجبور تمھیں کیا معلوم

غزل

از

جناب صادق القادری بی اے آنرز

مدعائے سفر نہیں معلوم

جا رہا ہوں کدھر نہیں معلوم

ایک ہے شیخ و برہمن کا حال

کون ہے راہ پر نہیں معلوم

ہم سے پُوچھو نہ کچھ کسی کی خبر

ہم کو اپنی خبر نہیں معلوم

ایک ہی طرح وقت کٹتا ہے

فرقِ شام و سحر نہیں معلوم

دل سے اُٹھتی ہے صادق اکثر آہ

کون سی بات پر نہیں معلوم

غزل

از

جناب اے۔ایم۔کوثر

ہو ہی گیا تھا مطمئن عشرتِ کائنات پر

تیری نظر کا شکریہ، کر گئی دل کو غم اثر

جتنی تسلیاں مجھے دیتے ہیں وہ دمِ وداع

شدتِ اضطرابِ دل بڑھتی ہے کچھ اُسی قدر

عشوۂ دلبری میں تھا نازِ حجاب ملا ہوا

درد بھی تھی، دوا بھی تھی حُسن کی شرمگیں نظر

غرق بھی ہو کے شاد ہوں بحرِ غمِ حیات میں

اے مرے ناخدا مجھے چھوڑ بھی میرے حال پر

دل میں یہ کون آ بسا کوثرِ غم نصیب کے

کِس کی نظر نے کر دیا سارے جہاں سے بے خبر

CALCIUM A D

کیلسیم اے۔ڈی

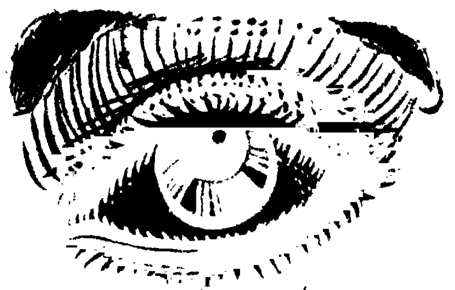


جس میں کیلسیم اور وٹامنز اے۔ڈی۔ شامل ہیں

کمزور مریضوں، حاملہ عورتوں، دُودھ پلانے والی ماؤں اور دانت نکالنے والے بچوں کے لئے نامور ڈاکٹر کیلسیم اے۔ڈی کے استعمال کی زبردست سفارش کرتے ہیں۔ زمانۂ حمل اور دُودھ پلانے کے زمانے میں عورتوں کی خوراک میں کیلسیم اے۔ڈی کی کمی ہی سے عورتیں زرد رُو اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ بچوں کی جسمانی نشوونما، ہڈیوں اور دانتوں کی پرورش کے لئے کیلسیم اے۔ڈی بہت ضروری ہے۔ دُور اندیش والدین اپنے بچوں کو روزمرّہ کی دُوسری غذاؤں کی طرح کیلسیم اے۔ڈی بھی کھلاتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے میں ایسے لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۶۰ گولی صرف تین روپے۔

ملنے کا پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۷ نئی دہلی

مفت



آنکھوں کی حفاظت

نامی کتاب مصنفہ پروفیسر مہر سنگھ ایم اے۔ عوام کے فائدے کے لئے مفت تقسیم ہو رہی ہے۔ اس میں آنکھوں کو مختلف امراض سے بچانے کے طریقے۔ اور بینائی کو تیز کرنے کے راز درج کیے گئے ہیں۔ ایک خط لکھ کر مفت منگوائیں۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی۔ ترکمان گیٹ۔ نئی دہلی

اولاد کی پیدائش آپ کے اختیار میں —— جب چاہیں روک لیں

برتھ کنٹرول

کمزور عورتوں کے لئے ہر سال بچوں کی پیدائش بہت خطرناک ہے۔ اور ویسے بھی کثرتِ اولاد موجودہ زمانے میں ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ برتھ کنٹرول کے استعمال سے صحت پر بُرا اثر نہیں پڑتا۔ یہ دوا کھانے کی نہیں بلکہ لگانے کی ہے۔ نہایت بے ضرر اور مفید دوا ہے۔ کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ ہزارہا معززین اسے روزانہ استعمال کرتے ہیں۔

جب اولاد کی خواہش ہو اس کا استعمال ترک کر دیا جاتا ہے۔ بہت بھروسے کی چیز ہے جو کبھی فیل نہیں ہوتی۔ قیمت فی شیشی صرف تین روپے۔ جو مدتوں کیلئے کافی ہے۔

سفید پانی یعنی لیکوریا کا علاج

ریڈیم لیکوکیور

جس طرح لکڑی کو گھن اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح یہ مرض عورت کے حُسن، صحت اور جوانی کو فنا کر دیتا ہے۔ سفید پانی کی بیماری نوجوان عورتوں کو وقت سے پہلے بُوڑھا کر دیتی ہے۔ خون کم یا زیادہ آئے۔ رُک رُک کر آئے۔ درد سے آئے۔ سر چکراتا ہو۔ کمر میں درد رہتا ہو۔ تو ان امراض میں ریڈیم لیکوکیور استعمال کریں۔

نہ صرف برسوں کی بیماری سے نجات ہی مل جاتی ہے۔ بلکہ عورت بچہ پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ جب کسی دوا سے آرام نہ ہو تو ریڈیم لیکوکیور استعمال کریں —— قیمت فی شیشی صرف تین روپے جو اس کی خوبیوں کے سامنے ہیچ ہے۔ لیکوریا کا آخری علاج ریڈیم لیکوکیور ہے۔

ملنے کا پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۷ نئی دہلی

دھڑکتے دلوں کی محبّت بھری داستانیں

میرے سپنے نامور افسانہ نگار و شاعرہ پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین افسانوں کا دلفریب مجموعہ میرے سپنے کیا ہیں؟ زندگی کی اصلی تصویریں۔ محبت کے سچے نغمے جوانی کی مسکراہٹیں دوشیزگی کی انگڑائیاں۔ یوں تو کیا مرد کیا عورت سبھی خواب دیکھتے ہیں لیکن ایک عورت کی آنکھوں میں جو خواب مسکراتے ہیں، اُن کی دلفریبی اور رنگینی کا کیا کہنا۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگھار کمرے میں پہنچ کر عورت کا حُسن، عورت کی رعنائی اور نکھر جاتی ہے۔ یہ فتنہ قیامت بن جاتا ہے اور اس قیامت کے سامنے بڑے بڑے زاہدوں کے ہاتھ سے بھی ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ پروفیسر کرشنا کماری ایم اے نے سنگھار کمرے میں اسی حقیقت کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ جذبات آفریں افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر مستیوں کا ایک طوفان اور جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ عشق و محبت کی ایک ایسی رُوداد ہے جس میں آرزو کے پرکیف گیت بھی ہیں آہوں کا دُھواں بھی۔ اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی نمی بھی۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

حُسن پرست حُسن و شباب کی سرمستیوں اور رُومان و محبت کی دلفریبیوں کی رنگین داستانیں جنھیں حضرت یزدانی جالندھری کے شوخ قلم نے کیف و سرور کی دُنیا بنا دیا ہے۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ جوان دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان ہے۔ شباب کی مچلتی ہوئی اُمنگوں، آرزوؤں، اور محبت کی سُلگتی ہوئی چنگاریوں کا عکس ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

دل کے پیام ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری کے رنگین افسانوں کا مجموعہ جس کے ہر افسانے میں آپ شباب کی دھڑکنیں اور اٹھتی جوانیوں کے گیت سُنیں گے آپ جوان دلوں کی آہیں اور برباد تمناؤں کی سسکیاں محسوس کریں گے۔ اور اپنے ہی دل کے پیام سُنیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

بڑے آدمیوں کا عشق بھی بہرحال عشق ہے اور یہ ایسی آگ ہے کہ جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق کی یہ آگ شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں کرتی ہر دل کو جلاتی ہے۔ ہر انسان کو تڑپاتی ہے۔ اس کتاب کا بارھواں ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

یوکلپٹس کی ڈالی جادو نگار کرشن چندر کے افسانوں کا ایک شاندار مجموعہ جس میں مہکتے رنگین پھول کھلتے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے بارہ آنے۔

ایک روپیہ ایک پھول نثر کے شاعر کرشن چندر کے پُر رومان اور پُر معنی افسانوں کا ایک اور مجموعہ قیمت صرف دو روپے بارہ آنے۔

رات اندھیری ہے آپ بمبئی کی فلمی زندگی کی آوارگی، اوباشی اور عُریاں تصویر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں تو اس ناول کو ضرور پڑھیے۔ مصنف مہندر ناتھ قیمت صرف چار روپے۔

چاند بجھ گیا سرلا دیوی عورتوں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ اگر آپ آج کی عورت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ان افسانوں کو ضرور پڑھیے۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے۔

دُکھتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے حُسن کی بے کلی ہے۔ عشق کی بے قراری ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

ایک حمّام میں تین ننگے زندگی کی عُریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ آپ ان افسانوں کو بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار رام لال کی رُومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ ان افسانوں میں رُومان و محبت کی رنگینیاں بھی ہیں اور حُسن و شباب کی سرمستیاں بھی۔ ہر افسانے میں ایک نئی عورت ہے۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

شاہی محلات کی پریم کہانیاں عشق و محبت کی پُرکیف سچی داستانیں۔ یہ سچی داستانیں فرضی افسانوں سے زیادہ دلچسپ، مؤثر اور پُرکیف ہیں۔ قیمت فی جلد دو روپے۔ جو کتاب کی خوبیوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

پیاسی آنکھیں دت بھارتی کے رنگین و رُومانی افسانے۔ قیمت اڑھائی روپے۔

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸ نئی دہلی

افسانہ

کیا یہ سچ ہے؟

از

جناب اشرف قادری بی اے آنرز۔ ایل۔ ایل۔ بی

سارے فیلسوف اس مرکز پر آ کر متحد و متفق ہو جاتے ہیں اور بیک زبان کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں بہت سے اُتار چڑھاؤ ہوتے ہیں۔ انسان زندگی کے مختلف موڑوں پر پہنچتا ہے۔ اور وہاں پہنچنے کے بعد اُسے ایک نیا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ تصور کبھی حیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا کہ زندگی کو ایک شاہراہ پر لگا دینے کے بعد اُس کی زندگی طلاطم خیز نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ عام مشاہدات سے بھی یہ باتیں حرف بحرف صحیح ثابت ہوتی ہیں۔

سردیوں کی شام تھی۔ نواب علی وارث صاحب کی عالیشان بلڈنگ کے ڈرائنگ روم میں اصغری، انوری، اکبری، شاہدہ، صابرہ، ذکیہ، سجمہ گرل ہائی اسکول کی متعلمہ بیٹھی ہوئی بہت ہی انہماک سے بحث کر رہی تھیں۔ موضوع بہت ہی دلچسپ تھا اور معنی خیز بھی۔ کیا مرد بے وفا ہوتے ہیں؟ اکثر لڑکیاں اس کی تائید میں بول رہی تھیں لیکن شاہدہ کہہ رہی تھی کہ مرد بے وفا نہیں ہوتے۔ اُس بے چاری نے تو اظہارِ حقیقت کیا اور یہ اظہارِ حقیقت اُس کے لئے وبالِ جان ہو گیا۔ ساری لڑکیوں نے اُسے مذاق کا مرکز بنا لیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ناہید چلی آئی اور سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ناہید ہی کو آج کی بحث کا جج بنا دیا جائے۔ ناہید سکتے میں تھی کہ ایسی کون سی بات ہے جو اُس کے فیصلے کی منتظر ہے؟

ابھی ایک سال ہوا تھا کہ ناہید کی شادی میرے ایک دوست حسرت علی سے انجام پائی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں شادی کے پہلے ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جانتے ہی نہ تھے بلکہ اُنس بھی رکھتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ فرشتوں کی طرح پاک محبت اور پانچ سال کی مسلسل کشمکش کے بعد ازدواج کے ریشمی دھاگوں میں باندھ دیئے گئے تھے اور اب تک وہ ایک دوسرے کی زندگی ہیں۔ آج اُس کے سامنے اس بات کا فیصلہ رکھا گیا ہے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے یا باوفا؟ مرد کے بارے میں اُسے اپنا خیال ظاہر کرنا ہے۔ جسے اُس نے کئی سال تک پرکھا ہے۔ جو اُس کی پرکھ میں مہر و وفا کا دیوتا ثابت ہوا ہے۔

شاہدہ نے ساری باتوں کو ناہید کے سامنے رکھا، اور کہا کہ آپ ایک تجربہ کار عورت ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا فیصلہ ہم ساری لڑکیوں کے لئے راہِ عمل ہوگا۔ کوئی اُس وقت شاہدہ کی صورت دیکھتا جو ناہید کی صورت تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہیں میری ہار نہ ہو جائے۔ سب لڑکیوں نے اپنی بحث ختم کی اور اُس کے بعد ناہید نے نہایت ہی سنجیدگی سے گفتگو شروع کی۔ اور اپنا فیصلہ سناتے ہوئے فخر سے کہا کہ مرد بے وفا نہیں ہوتے۔ وفاداری اُن کی رگ و پے میں ہوتی ہے میں کتنی ہی مثالیں پیش کر سکتی ہوں۔ دوسروں کی مثالوں سے قطع نظر اپنی ہی بات کہوں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ اُنھوں نے کتنی تکلیفیں اُٹھائیں کتنی مصیبتیں برداشت کیں کتنی دشواریوں کا مقابلہ کیا اور ایسی صورتیں بھی اُن کے سامنے پیش کی گئیں جن سے بڑے بڑے نکتہ سنج بھی سمجھ بیٹھے تھے کہ اب یقیناً اُن کے خیالات بدل جائیں گے لیکن وہ نہیں بدلے۔ ہم ایک دوسرے کی زندگی ہیں۔ وہ پھول ہیں، میں نکہت ہوں۔ وہ چاند ہیں، میں چاندنی ہوں!

اصغری نے جھنجھلاتے ہوئے کہا ——

"یہ تمھاری اپنی بات ہے۔ اور ہو سکتا ہے یہ شاعری اور افسانہ طرازی ہو یا تم حسین فریب کھا رہی ہو"

انوری نے اپنی حسین پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے کہا — "ناہید تم غلط کہتی ہو"

اور اکبری نے منہ بنا کر طنز سے کہا —

"ہاں شاہدہ تمھاری بہن ہے نا؛ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں"

ناہید نے ہزار کہا لیکن بھلا اُس کی کون سنتا؛ شاہدہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

حسرت علی میرے دیرینہ دوست تھے۔ اُن کی شادی پہلے ہی ہو گئی تھی اِس لئے میں اُن کی بیوی ناہید کو بھابی کہا کرتا تھا۔ میں شام کو اُن کے ہاں گیا تو بھابی نے یہ دلچسپ بحث سُنائی۔ میں، حسرت صاحب اور بھابی تینوں بیٹھے ہوئے تھے چائے کا دَور چل رہا تھا اور بھابی بہت لطف لے لے کر اُن لڑکیوں کے اندازِ بحث کا خاکہ کھینچ رہی تھیں کہ شاہدہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی شرما کر سر جھکا لیا اور دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے شاہدہ کو اس سے پہلے کئی بار دیکھا تو ضرور تھا لیکن کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ نقرئی قہقہے بکھیرتی ہوئی ساری لڑکیاں گھر میں آ گئیں۔

ایک نے کہا —

"ناہید نے غلط کہا، بالکل غلط۔ میں نہیں مانتی۔ میں دولھا بھائی کے سامنے فیصلہ رکھتی ہوں"

دوسری نے چہک کر کہا —

"انوری! تم نہیں جانتیں کہ یہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ دولھا بھائی بھی ناہید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لئے اِسی کے فیصلے پر مہر ثبت کر دینگے کیوں اصغری میں غلط کہتی ہوں؟"

اصغری نے مسکراتے ہوئے کہا —

"صابرہ! تم سچ کہتی ہو۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن حسرت بھائی صحیح فیصلہ دیں گے"۔ آخر یہ طے پا گیا کہ دولھا بھائی کو ہی جج بنایا جائے۔ اِس لئے سب لڑکیاں اُسی کمرے کی طرف بڑھیں جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ انوری سب سے آگے تھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ مجھے دیکھ کر جھجک گئی۔ اور اُس کے مُنہ سے نکل گیا "ہائے اللہ!" اور فوراً کمرے کے باہر چلی گئی۔ دوسری لڑکیاں باہر ہی رہ گئیں۔ اور اب وہ آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ میں نے بھابی سے پُوچھا "کیا یہ وہی لڑکیاں ہیں؟"

اور بھابی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے حسرت صاحب کی طرف رُخ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا —

"بھائی صاحب! جائیے آپ بہت اچھا فیصلہ کریں گے لیکن دیکھئے کہیں —"

حسرت صاحب نے کہا "بھئی میں اِن کی منصفی سے باز آیا" اور یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے آواز دی — "انوری، اصغری، نجمہ، ذکیہ سب آ جاؤ یہ میرے عزیز دوست ہیں اِن سے کیا حجاب؟"

لڑکیاں اپنے ساتھ شاہدہ کو بھی گھسیٹ لائیں۔ میں نے دیکھا، شاہدہ خاموش ایک طرف کھڑی رہی۔ دوسری لڑکیاں اپنی اپنی باتیں حسرت صاحب کے سامنے رکھ رہی تھیں لیکن شاہدہ شرم و حیا سے سمٹی کھڑی رہی۔ بھابی نے تو مجھ سے سارا واقعہ بیان کر ہی دیا تھا۔ اور اُن کا فیصلہ بھی مجھے معلوم ہی تھا۔ حسرت صاحب اس شش و پنج میں تھے کہ آخر کیا جواب دیں۔ وقت ٹالنے کے لئے وہ مختلف قسم کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ اور میں چائے کی ہلکی چُسکیاں لیتے ہوئے شاہدہ کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہ بارِ حیا سے سمٹی جا رہی تھی۔ میں سب کی نظریں بچا کر اُس کے معصوم حُسن کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جُھکی جُھکی سی پلکیں، وہ عرق عرق سے عارض! آج پہلا دن تھا کہ شاہدہ کو دیکھ کر اپنے اندر عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میں حسین تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ حسرت صاحب نے گلاب کا ایک پھول میری طرف پھینکتے ہوئے کہا —

"اب تم ہی کہو سچ کیا ہے؟"

میں چونک اُٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ اور کسی نے جگا دیا۔ میں گھبرا کر حسرت صاحب کی صورت تکنے لگا۔ حسین تخیلات کا سلسلہ ٹُوٹ گیا۔ میں خواب سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ لیکن یہ حقیقت کی دُنیا بھی کم حسین نہ تھی۔ لڑکیوں کے نقرئی قہقہے کانوں میں گونج رہے تھے۔ حسرت صاحب نے فرمایا —

"ساجد! تم ادیب ہو۔ تم اِن کی اِس بحث کا صحیح فیصلہ کر سکتے ہو کہ کیا مرد بے وفا ہوتے ہیں؟"

میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا ـــ

"میرے لئے بھی بہت مشکل ہے۔ ایک طرف شمشیرِ بے نیام ہے اور دوسری طرف نوکِ سناں ہے۔ اگر ہاں کہتا ہوں تو دُنیا مجھ سے خفا ہو جاتی ہے اور نہیں کہتا ہوں تو مجھ سے جنّت چھین جاتی ہے۔"

صابرہ نے اپنی زبان قینچی کی طرح چلاتے ہوئے کہا ـــ "ہم سب آپ کی بات مانیں گے۔"

اب تو میرے لئے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اِس لئے میں نے کہا کہ میں ایک شاعر کا ایک شعر سُنا دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سوال کا مکمل اور مناسب جواب ہو جائے گا۔ لیجیے یہ شعر ہے، سُنیئے ؎

وفاؤں کے بدلے جفا کرتے ہیں
میں کیا کر رہا ہوں وہ کیا کر رہے ہیں

شاہدہ جو اَب تک تصویرِ حیرت بنی تھی یکایک خوشی سے اُچھل پڑی۔ اور کہنے لگی ـــ

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک!"

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اُس وقت کتنی خوش تھی۔ اُسے اپنی فتح پر بے حد مسرت تھی میں نے کہا "اگر کسی کو اس پر بھی یقین نہ آئے تو کیا اِس شعر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ؎

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے"

میں نہیں کہہ سکتا کہ اِس شعر نے اُن لڑکیوں پر کیا اثر کیا کہ وہ گھبراہٹ میں یوں اُٹھیں ـــ

"ایں، یہ تو کسی مرد کی زبان سے ہے۔"

اور پھر میں نے دیکھا کہ یہ کہنے کے بعد وہ کچھ شرما سی گئیں۔ اور رنگین و ریشمیں دوپٹے اُن کے مُنھ سے لگ گئے۔ انوری محویت کے عالم میں نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ وہ بغیر پلک جھپکائے میری طرف اِس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھنے لگا شاید اُسے میری باتیں اچھی معلوم ہوئی ہیں۔ وہ اِنھیں خیالات میں غرق ہو گئی ہے اور اُس پر گہری نظر سے سوچ رہی ہے کہ گویا میں نے نہایت فراخ دلی سے اُس کے سامنے حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ وہ اُس وقت چونک اُٹھی جب میں نے اُس کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ

"دیکھیے نا کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن، اضطراب میں
واں ایک خامشی تری، سب کے جواب میں

اگر میں کوچہ میں، گلی میں، سڑک پر یا گھروں کی چھتوں سے بھی پکار پکار کر کہتا ہوں کہ میں اُن سے محبت کرتا ہوں جب بھی کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ جنگلوں کی سیر بھی کر لیتا ہوں تو کوئی چرچا نہیں ہوتا ہے۔ شام کے دُھندلکے میں ہر پھول سے پتہ پوچھنے کے لئے نکلتا ہوں۔ ویرانے میں ڈھونڈتا ہوں۔ گلپوش وادیوں میں تلاش کرتا ہوں لیکن اُن کا پتہ نہیں چلتا۔ سُورج کی تیز کرنیں بھی اُنھیں نہیں بتاتیں۔ اور نہ ماہتاب کی ٹھنڈی کرنیں اُنھیں ڈھونڈ نکال سکتی ہیں۔ جب بھی میں تو ایسی زندگی میں رہتا ہوں جس میں وفا حرفِ بے معنی بنی رہتی ہے۔ اور ہم آپ کی نظر میں جفا شعار تصور کئے جاتے دل اُن کی یاد میں صبح کی دلکشی اور شام کی رنگینی بھول جاتا ہے اور بس یہی ایک خیال رہتا ہے کہ ؏

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

جب بھی ہم اُن کے لئے بے وفا ہوتے ہیں۔ اور آپ جو گھروں اور دیوان خانوں میں بیٹھی زندگی کے مد و جزر سے دُور، زندگی کی حسین وادیوں میں گم گیسوؤں کو سنوارنے میں مشغول رہتی ہیں کسی کی یاد میں چند لمحات گزار دینے کو وفا کہتی ہیں۔ آپ ہی بتائیے یہ کتنا ظلم اور ناانصافی ہے لیکن کیا کہا جائے یہی ہوتا ہے۔ میں آپ ہی سے فیصلہ چاہتا ہوں۔ کیا یہ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اگر مرد نے کچھ کہہ دیا تو اُس کی زبان کاٹ لی جائے۔ اور آپ جو ارشاد فرمائیں سب بجا، آپ تلخ بات بھی کہیں تو قند و نبات! بھلا یہ کس کی مجال جو آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ تساہل پر تو میرا سر ہے اور آپ کی شمشیرِ برہنہ، کیوں، ہے نا یہ بات؟

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

آپ نے کہہ دیا کہ مرد بے وفا ہیں تو میں ذرا اور زور دے کر کہوں گا کہ "جی ہاں مرد بے وفا ہوتے ہیں"۔ اور اگر آپ نے پھر فرمایا کہ "نہیں صاحب! مرد بے وفا نہیں ہے" تو میں بھی کہوں گا کہ جی ہاں آپ بجا فرماتی ہیں۔ مرد ہرگز بے وفا نہیں ہوتے۔"

میری اس بات پر ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔ نقرئی قہقہوں سے کمرے کی فضا گونج گئی ———— یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کلاک نے آٹھ بجائے۔ فوراً میں معافی چاہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اُٹھتے ہوئے میری نظریں شاہدہ سے مل گئیں۔ شاہدہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ تبسم اُس کے ہونٹوں پر رقص کناں ہے، اور وہ اپنی کامیابی پر بے حد مسرور ہے۔ ایک بار پھر اُس کی نظریں اُٹھیں اور مجھ سے مل گئیں۔ اِس بار میں نے محسوس کیا جیسے وہ میرے اس فیصلے پر میرا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

میں گھر چلا آیا لیکن دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ میں جھوم جھوم کر یہ شعر گنگنانے لگتا تھا ؎

اللہ رے اپنی محویت وہ حُسنِ تکلم تھا اُس کا
کیا ہم نے سُنا کیا اُس نے کہا کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے

شاہدہ کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی، کتنی خوبصورت تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے چہرے کی چمک ڈھلی ہوئی چاندنی کی طرح کبھی ماند نہ ہوگی اور اُس کی کرنیں اپنی ٹھنڈک اور معصومیت کبھی نہیں کھوئیں گی۔ اب ہر لمحہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دُنیا کی ہر شے اُسی محور پر رقص کر رہی ہے۔ شاہدہ، اور بس شاہدہ ہی میرے تصوّرات کی دُنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

دوسرے دن شام کو میں حسرت صاحب کے گھر گیا۔ حسرت صاحب تو موجود نہ تھے لیکن بھابی کمرے میں بیٹھی ہوئی شاہدہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ میرا نام آیا۔ اور اِس لئے میں قدم پیچھے ہٹا کر باتیں سُننے لگا۔ میں نے سُنا شاہدہ کہہ رہی تھی۔ "بہت اچھے ہیں ساجد صاحب، کتنا اچھا فیصلہ کیا۔ واقعی بہت بڑے ادیب ہیں اور سُنا ہے شاعر بھی ہیں۔ اگر وہ آجاتے تو میں اُن کا شکریہ ادا کرتی۔ میرے متعلق وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ فیصلہ میرے موافق ہوا لیکن میں نے شکریے کے رسمی الفاظ بھی نہیں کہے۔" ابھی وہ اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آواز دی ——

"حسرت بھائی!"

میں نے سُنا بھابی نے کہا ——

"یہ لو وہ بھی آگئے۔ اب اُن کا شکریہ ادا کر دو!"

بھابی نے مجھے آواز دی ——

"چلے آیئے!"

اور میں دھڑکتے ہوئے دل سے ڈرائنگ روم کی طرف چلا۔ جہاں بھابی اور شاہدہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی دونوں کھڑی ہو گئیں۔ میں ابھی بھابی کو آداب بجا لانے والا ہی تھا کہ شاہدہ نے ندامت میں ڈوبے بول میں کہا۔

"تسلیم عرض کرتی ہوں!"

اُس کی آواز میں حسین ارتعاش تھا۔ جیسے آواز میں دل کی دھڑکن بھی ملی ہوئی ہو۔ میری عجیب حالت ہو گئی۔ یہ احساس نہ رہا کہ بھابی بھی یہاں موجود ہیں۔ میں شاہدہ کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگا۔ اُس کی خوبصورت پلکیں بارِ حیا سے گالوں پر جُھک گئیں۔ میں تو اُس وقت ہوش میں آیا جب بھابی نے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔

میں، شاہدہ اور بھابی تینوں بیٹھ گئے۔ شاہدہ نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے کل میری اور زاہدہ بہن کی عزت رکھ لی۔ ورنہ ساری لڑکیاں خوب خوب فقرے کستیں۔"

سچ کہتا ہوں کہ میں کئی دن تک شکریے کے اُن الفاظ کی شیرینی کو محسوس کرتا رہا۔ یہ الفاظ میرے مُنھ میں شہد گھولتے رہے۔ اور دل میں گُدگُدیاں پیدا کرتے رہے۔ میں یہ اکثر سوچتا —— کاش کبھی ایسا موقع بھی آتا جب میں یہ ظاہر کر سکتا۔ کہ تمہاری ایک نگاہِ التفات کے لئے میں تمھیں کیا کچھ نہیں دے سکتا ہوں! دل تو تمھیں دے ہی چکا ہوں۔ تم پر جان بھی

نبھا دہ کر سکتا ہوں۔

اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ آنکھوں آنکھوں میں محبت کے افسانے دہرائے جاتے رہے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب شاہدہ نے مجھ سے مومن کے اس شعر کے معنی پوچھے۔ جس میں انھوں نے چند سادہ لفظوں میں محبت کو ڈھال دیا ہے۔ ذرا شاہدہ کی سادگی تو دیکھئے کہ وہ ایک پُرزہ پر لکھ کر لائی ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا!
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور کہنے لگی، مجھے اس کا مطلب بتا دیجئے۔ کوئی مثال پیش کیجئے۔ کیا واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ شاہدہ نے اِس شعر کے پردے میں اپنے دل کے جذبات کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ اب تو میں اپنی اُمیدوں کی شاہراہ پر تھا کبھی کبھی شاہدہ مجھ سے رُوٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن محض رُوٹھنے کے لئے۔ یہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے رُوٹھ نہیں سکتی۔ اور میں یہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ اُس سے رُوٹھنے کا حق چھین لوں اور اُس سے یہ چھین بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اِس رُوٹھنے میں میری مسرت بھی شامل تھی کیا اُسے منانا کم مسرت کی بات تھی۔ جب کبھی وہ رُوٹھ جاتی میں کہتا ـــ

"واہ! حُسن کی یہ ادا کتنی دلکش ہے ـــ کتنی حسین ہے"

اور وہ مسکرا کر بھاگ جاتی تھی۔ میں سمجھنے لگتا تھا کہ میں دُنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔

ناہید بھابی کے گھر انوری بھی اکثر آیا کرتی تھی۔ مجھ سے کبھی کبھی باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ میری باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتی۔ آج مجھے حسرت صاحب کے گھر آئے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ انوری آئی۔ آج وہ ہلکی سبز شلوار میں ملبوس تھی۔ اور اُس پر شوخ سُرخ رنگ کا دوپٹہ۔ یہ حسین لباس اُسے اور بھی حسین بنا رہا تھا۔ اُس کا لباس آج ایک سماں پیدا کر رہا تھا۔ میرا دل اُس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک کمزوری محسوس کی۔ انوری نے آتے ہی مجھے اپنے یہاں چلنے کی دعوت دی۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا "بھابی بھی ساتھ رہیں گی نا؟" اُس نے کہا ـــ "ناہید بہن تو ضرور ساتھ رہیں گی"

میں اُس دعوت کے بعد قریب قریب روز ہی انوری کے گھر جاتا، اُس سے باتیں ہوتیں، مرنے مرنے کی باتیں ہوتیں۔ ہم بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے۔ اور پھر ہمارے دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہونے لگیں اور ایک دن ہم نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی بنانے کے لئے عہد و پیمان کئے قسمیں کھائیں۔

شاہدہ بیمار ہو گئی اور سخت بیمار ہو گئی کئی مہینے تک بستر سے لگی رہی کچھ دنوں تک عیادت اور مزاج پرسی کے لئے جاتا رہا۔ اور اب تو اس کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔

ایکدن میں ناہید بھابی کے پاس گیا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا شاہدہ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ شاہدہ جس کا چہرہ کبھی اوس میں بھیگے ہوئے گلاب کی طرح تھا۔ آج مُرجھا گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پُرزہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ اور وہ اُسی طرح میری طرف آنے لگی۔ اُس نے میرے سامنے کاغذ کا پُرزہ پھینک دیا اور خاموش کھڑی رہی۔ اُس میں لکھا تھا ؎

وفاؤں کے بدلے جفا کر رہے ہیں
میں کیا کر رہا ہوں وہ کیا کر رہے ہیں

اور جواب طلب انداز سے کہا "کیا یہ سچ ہے؟" وہ کئی لمحے تک خاموش رہی اور میری نگاہیں ندامت سے زمین میں گڑی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ میری جھکی ہوئی آنکھیں اُوپر اُٹھیں میں ملتجی نگاہوں سے شاہدہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے میں نگاہوں ہی نگاہوں میں معافی کا طلب گار ہوں مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میں نے دیکھا شاہدہ کی آنکھوں سے اب تک شعلے نکل رہے تھے۔ میری نگاہیں اُوپر اُٹھتے ہی وہ اور بھی مشتعل ہو گئی۔ اور غصّے میں کہنے لگی ـــ

"کیا یہ سچ ہے کہ مرد . . . . "

ابھی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ میں نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا "شاہدہ! ایسا نہ کہو ـــ

سچ تو یہ ہے کہ ؎

تم کو آتا ہے پیار پر غصّہ
مجھ کو غصّہ پہ پیار آتا ہے

غزل

از

جناب ضیا فتح آبادی ایم اے

انجام مری بیتابی کا اے گردشِ دوراں کیا ہوگا
یہ بزم گہ ہستی ہے یہاں تسکیں کا ساماں کیا ہوگا

دیوار و در و روزن پر ہیں سُورج کی کرنوں کے بوسے
لیکن وہ ابھی تک کہتے ہیں، اِس گھر میں چراغاں کیا ہوگا

اے سُننے والو تم ہی کہو خوش فہمی سی خوش فہمی ہے
میں پوچھ رہا ہوں قسمت سے تدبیر کا عنواں کیا ہوگا

آؤ تو ذرا ہم پوچھ ہی لیں اِن روز بدلتی قدروں سے
جب انساں ہی رہ جائے گا، وہ عالمِ انساں کیا ہوگا

میں دیکھ رہا ہوں پاس ہی ہے اب میرے ساحل کی منزل
کشتی نہ ابھی تک ڈوب سکی، اے زورِ طوفاں کیا ہوگا

اشعارِ ضیا سُن کر وہ بھی سر دھنتے ہیں جو کہتے تھے
اِس شعر و سخن کی محفل میں اب کوئی غزلخواں کیا ہوگا

پنکھڑیاں

از

جناب ہوش

عنبریں گیسوؤں کے سائے میں | یوں درخشاں ہے تیرے رُخ کا کنول
سُرمئی شام کے دُھندلکوں پہ | طنز کرتا ہو جیسے تاج محل

آپ کی نیلی نیلی آنکھوں میں | یوں ہیں رقصاں شباب کی لہریں
جس طرح نیلگوں پیالوں میں | اٹھ رہی ہوں شراب کی لہریں

بادلوں کے سفید دامن پر | سُرخئ شام رقص فرما ہے
سنگِ مرمر کے فرش پر جیسے | کوئی گُل فام رقص فرما ہے

دل کو تنہائیوں کے نرغے میں | اِک ملاقات یاد آتی ہے
جیسے اکثر سیاہ راتوں میں | چاندنی رات یاد آتی ہے

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری

وہ کتاب جو یورپ کی بہترین کتب کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے
جسے نامور خواتین بیسویں صدی پنفیسر کرشنا کماری ایم اے ایل ٹی اور محترمہ معروف بانو صاحبہ

بی اے سابق ایڈیٹر شریمتی نے لکھا اور جس کی ڈرائنگ ہندوستان کے نامور آرٹسٹ نے کی ہے جو فنِ کشیدہ کاری کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں اور جنہیں ہندوستانی عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اس میں موجودہ فیشن کے مطابق کارآمد اور دلفریب کشیدہ کاری کے بہترین ڈیزائن۔ سوزن کاری، کٹ ورک، موتیوں کا کام۔ کراس سٹیچ کے بہترین نمونے۔ گریبان، بیلیں، میز پوش، چادروں کے کونے۔ خوشنما پرندے۔ خوبصورت مناظر۔ تکیہ کے اشعار، خوشنما گرتے۔ غلاف باسکٹ کے حسین ترین ڈیزائن۔ انگریزی بیل بوٹے۔ خوشنما پھول۔ اور دیگر صدہا مفید کارآمد اور دلکش ڈیزائن نہایت قابلیت سے جمع کئے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کی کشیدہ کاری تحفے میں دینے کے لئے بہترین چیز ہے۔ بڑا سائز۔ دل کش مضبوط جلد۔ چو رنگا ٹائیٹل پیج۔ کاغذ ولایتی۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ۔ اُردو ہندی مشترکہ زبانوں میں شائع کی گئی ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود قیمت فی جلد صرف چار روپے

حسین کشیدہ کاری

چار رنگ کا خوبصورت ٹائیٹل

۲۷۶ صفحات۔ بلاکوں کی چھپائی کے ساتھ۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے۔

دُلہن کشیدہ کاری

پوری کتاب رنگین صفحات ۱۲۷

جس میں اُونی کام سلائیوں سے درج ہے۔ سہ رنگا حسین سرورق۔ قیمت اڑھائی روپے

قدسیہ کشیدہ کاری

اچھوتے ڈیزائن۔ اور اتنی سستی کہ تمام کشیدہ کاریوں کو چیلنج ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

رضیہ کراس سٹیچ

فنِ کراس سٹیچ پر مکمل کتاب ہے۔ بڑا سائز مجلد قیمت صرف تین روپے

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری

سینکڑوں قسم کے بہترین ڈیزائن۔ حسین دلکش بُوٹے۔ کراس سٹیچ۔ موتیوں کا کام۔ خوشنما گریبان۔ جمپر فراکوں کے کونے اور دامن۔ ایرانی۔ کشمیری فرانسیسی۔ انگلش بیلیں۔ میز پوش کے گوشے۔ تکیوں کیلئے بہترین جذباتی اشعار۔ بڑا سائز مجلد حسین ٹائیٹل رنگین قیمت چار روپے۔

چمن کشیدہ کاری

خوشنما اور اعلیٰ قسم کی کشیدہ کاری۔ سینکڑوں پھول اور کشیدہ کاری کے ڈیزائنوں کے علاوہ فنِ خیاطی پر بہترین مضامین۔ قیمت صرف دو روپے۔

رضیہ کا شاہی دسترخوان

اِس کتاب میں مغل بادشاہوں کے دسترخوان کے لذیذ کھانوں کی ترکیبیں جو شاہی باورچی سے حاصل کی گئی تھیں تفصیل سے درج ہیں۔ اب اس کتاب کو جدید انگریزی اور دیسی کھانوں کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ہر قسم کے نلستے۔ آئس کریم۔ فالودہ۔ کیک۔ شاہی ٹکڑے۔ مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں۔ قورمہ۔ کباب مرغ۔ دہلی کی مشہور نہاری۔ سبزیاں۔ نرگسی کوفتے۔ مچھلی کے سالن اور کباب۔ شاہی مچھلی۔ قیمہ پلاؤ۔ انگریزی و دیسی مٹھائیاں انگریزی کھانے بنانے کی مفصل اور آسان ترکیبیں درج ہیں۔ قیمت مجلد اڑھائی روپے۔ جو اس کی خوبیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں

صحت و زندگی

اِس مفید کتاب کا مطالعہ آپکے لئے اِتنا مفید ثابت ہوگا کہ آپ اسے خود پڑھنے کے بعد اپنے اُن دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ اِس میں جسمی صحت اور جوانی قائم رکھنے کے قیمتی اور پوشیدہ راز۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ امراض کو بلادوا دُور کرنے کے ایسے آسان طریقے، تدابیر اور علاج درج کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ غذا صحت و شباب اور تندرستی کے متعلق وہ باتیں تفصیل سے لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ صحت اور تندرستی کے خواہشمند اس مفید کتاب کو ضرور پڑھیں۔ اِس کتاب میں ۲۲ سے زائد مفید اور کارآمد مضامین درج ہیں۔ پختہ جلد۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ و دیدہ زیب۔ سفید ولایتی کاغذ۔ سرورق رنگین مع گردپوش۔ مکمل دو حصے۔ قیمت صرف تین روپے جو اِس کتاب کی خوبیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

بچوں کیلئے دلچسپ اور سبق آموز کتابیں

ہمارا گاندھی دیش پتا مہاتما گاندھی کے پیدائش سے لے کر شہادت تک کے مکمل حالات جن سے سچائی، نیکی، اور وقت کی پابندی کا سبق ملتا ہے۔ قیمت اُردو ۸ ر

ہمارا جواہر لال ہندوستان کے محبوب وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے حالاتِ زندگی۔ اُردو ۸ ر

ہمارا ابوالکلام آزاد مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی اُردو ۸ ر

ہمارا پٹیل ہندوستان کے مقبول رہنما کے حالاتِ زندگی اُردو ۸ ر

ہمارا سبھاش چندر بوس شہیدِ اعظم نیتاجی سبھاش چندر بوس کے حالاتِ زندگی۔ اُردو ۸ ر

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸ نئی دہلی

مفید، کارآمد معلوماتی مقالے

صحت و زندگی

۱- زندگی میں سُکھ اور چین چاہتے ہیں تو ـــ

سبھی چاہتے ہیں کہ سکون اور سُکھ سے زندگی گزاریں۔ سُکھ اور سکون سے زندگی گزارنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ اور اس سے زیادہ آسان بات اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ ان سطور کے نیچے شمع روشنائی سے لکیر کھینچ لیجئے۔ واقعی یہ بہت آسان ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ سُکھ اور سکون سے زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے۔ آپ اگر سُکھ اور سکون سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو دوسروں کے بھی سُکھ اور سکون کا خیال رکھئے۔ یہ آپ ہی پر موقوف ہے کہ آپ سُکھ اور سکون سے اپنی زندگی کا دامن بھر لیں یا غلط راہ پر چل کر سُکھ اور سکون سے محروم رہیں۔ دُنیا میں سب سے زیادہ جھگڑا لڑائی، انتشار، اور خلفشار اغراض اور مفاد کی ٹکر ہی سے ہوتا ہے۔ آپ اگر خود غرض ہیں تو دُنیا کے ہر شخص سے آپ کا لڑائی جھگڑا ہوگا۔ اور کبھی آپ کو سکون نہیں مل سکتا۔ جو اپنے لئے جیتا ہے، جو صرف اپنے ہی سُکھ، سکون اور لُطف کے لئے سوچتا ہے، وہ کبھی بھی سُکھی نہیں ہو سکتا۔

۲- پریشانیوں پر فتح پانے کیلئے

مغربی مفکر پروفیسر ولیم لیون فیلسوپ نے اپنے تجربات کی روشنی میں پریشانیوں پر فتح پانے کے لئے یہ پانچ تدبیریں لکھی ہیں۔

(۱) دلچسپی اور حوصلے کے ساتھ زندگی گزارئیے۔

"میں ہر دن اِس طرح زندگی گزارتا ہوں، جیسے وہی دن میرا پہلا دن ہے جسے میں نے دیکھا ہے۔ اور وہی دن آخری دن ہے جسے میں دیکھنے والا ہوں۔"

(۲) کوئی دلچسپ کتاب پڑھئے۔

"جب میں طویل عرصے تک ذہنی پریشانی کا شکار رہا تو میں نے کارلائل کے سوانح حیات پڑھنا شروع کئے۔ اور اُسے پڑھنے میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنا سب دُکھ درد بھول گیا۔"

(۳) کھیل کھیلئے۔

"جب میں خوفناک افسردگی کا شکار ہوا تھا، اُس وقت میں نے دن کے ہر گھنٹے میں جسم کو کام میں لگائے رکھا۔"

(۴) کوئی کام کرتے وقت اُس کام ہی پر ساری توجہ مرکوز رکھئے۔

"بہت سے لوگ ایک کام کرتے ہوئے دوسرے کاموں کے بارے میں بھی سوچتے رہتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ پریشانی کو خود دعوت دیتے ہیں۔ میں جو کام کرتا ہوں ساری توجہ اُسی پر مرکوز رکھتا ہوں۔"

(۵) اپنی مشکلات کو اُن کی حقیقی شکل میں رکھیئے۔

"میں سوچتا ہوں آج سے دو ماہ بعد میں آج کی بُری حالت کے لئے پریشان نہ ہوں گا۔ تو اسی وقت کیوں اِس کی فکر کروں، کیوں نہ اِسی وقت وہ رُخ اختیار کروں جواب سے دو ماہ بعد کروں گا۔"

۳- قدرت کی گود میں

اگرچہ ڈاکٹر خود بھی امراض میں مبتلا ہو پھر بھی لوگ اُس کے پاس جاتے ہیں۔ اور اس یقین کے ساتھ جاتے ہیں کہ وہ ہمیں صحت یاب کر دے گا۔ دوا فروش کے ہاں سے آنے والی دوا اگر زہر بھی ہو، صحت کو نقصان پہنچانے والی ہو اور تباہ

کرنے والی۔ اور دوا بنانے والوں کی ذرا سی غلطی سے جان لینے والی ثابت ہو، جب بھی ہم اُس پر آنکھیں بند کرکے یقین رکھتے ہیں جب ڈاکٹر ان خطرناک دواؤں کے نام سادہ کاغذ پر شکستہ خطوں، اطالیسی زبان میں، جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔ لکھ کر دیتا ہے تو اُن پر ہمارا یقین و اعتماد اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

لیکن قدرت سے لوگ ڈرتے ہیں اور اُس قدرت پر بھروسا نہیں کرتے جس کے علاج کے ذرائع پانی، روشنی، ہوا، گرمی اور سردی ہیں۔ جن سے دُنیا بنی ہے اور چلتی ہے۔ جو قدرت سارے جانداروں کا بھلا چاہتی ہے۔ جب تک انسان قدرتی راستے سے نہیں ہٹا، قدرت سے دُور نہیں ہوا۔ قدرت کی گود میں خوشی خوشی کھیلتا رہا۔

۴۔ درازیٔ عمر کا راز

زیادہ دنوں تک کیسے زندہ رہا جائے؟ اِس سوال کا جواب مشکل ہے۔ غالباً اِس کا کوئی ایک جواب نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آدمی چاہے تو اپنی مصروفیت اپنی خواہش کی قوت اور حوصلے سے اپنی عمر دراز کر سکتا ہے۔ ہر شخص کا مزاج الگ ہوتا ہے فطرت الگ ہوتی ہے۔ جسم اور مزاج کی ساخت الگ ہوتی ہے۔ اِس لئے ہر شخص کی زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کی سعی و تدبیر بھی الگ الگ انداز کی ہوگی۔ فطرت اور مزاج کی طرح اِس کوشش میں بھی یکسانیت نہ ہوگی۔

اگر آپ زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی خواہشوں اور تمنّاؤں کو محدود نہ کرنا چاہیئے۔ ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو سامانِ حیات اور زندگی کے ذرائع نہ ہوتے ہوئے بھی اسی لئے زندہ رہتے ہیں کہ جینے کے لئے اُن کے پاس کام ہوتا ہے۔ اُن کے دل میں اپنے عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے کبھی نہ تھکنے، کبھی نہ مرنے والی خواہش کی قوت ہوتی ہے۔ جو انھیں اُس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے بہت دنوں تک زندہ رکھتی ہے۔ اُن کے دل میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے طویل زندگی کا تصور، طویل زندگی کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل پر کبھی موت کا سایہ نہیں پڑنے دیتے۔

تاریخ ایسے لوگوں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے جن کے سامنے عظیم مقاصد تھے اور جو مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی ہر سانس کو مصروفِ عمل رکھ کر بہت دنوں تک زندہ رہے۔ طویل عمریں پائیں۔

۵۔ خاموشی کی قیمت

اگر آپ گھبرائے ہوئے ہیں، فکرمند ہیں اور طرح طرح کے خوف آپ کو پریشان کر رہے ہیں تو آپ خاموشی اختیار کیجئے۔

بڑے بڑے کام پُرسکون اور خاموش رہ کر ہی انجام پاتے ہیں۔ بڑے بڑے جنگل خاموش اُگتے ہیں۔ جس وسیع زمین پر آپ چل پھر رہے ہیں وہ چپ چاپ اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے۔

۶۔ مسکراہٹ

آپ کی ہر مسکراہٹ آپ کے جیون میں جوت جگاتی ہے پھر آپ مسکرا مسکرا کر زندگی کو روشنی سے معمور کیوں نہیں کرتے۔ زندگی کے اُفق پر چھائی ہوئی تاریکیوں کو مسکراہٹ کی کرنیں دُور کر دیتی ہیں۔ مسکراہٹ جیسی گراں مایہ اور مسکراہٹ جیسی ارزاں کوئی اور چیز نہیں ہے۔

۷۔ اُمید کی چاندنی

مایوسی کے کالے بادلوں میں چھپی ہوئی اُمید کے چاند کی نورانی کرنوں کو دیکھیئے۔ آپ کی ساری گتھیاں سُلجھ جائیں گی۔ مایوسی موت ہے، اُمید زندگی ہے۔ مایوسی کے کالے بادلوں میں اُمید کی کرن چھپی رہتی ہے۔ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

۸۔ خود اعتمادی

اگر آپ اپنی زندگی کو مایۂ ناز و پُر افتخار بنانا چاہتے ہیں تو اپنا راستہ خود متعین کیجئے۔ اپنا سفینہ خود کھینے کے لئے تیار ہو جایئے۔ اور آپ کے جو دوست کنارے پر آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں اُنھیں مسکراتے ہوئے خوش باش کہہ کر بادبان اُڑا دیجئے۔

۹۔ ہمارا جسم

عام انسان غلط سوچنے اور صحیح سوچنے کا جو اثر جسم پر ہوتا ہے اُس سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ اُس غذا ہی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں جو وہ روزانہ اپنے پیٹ میں پہنچاتے ہیں۔ بس اُن کا خیال یہی ہوتا ہے کہ پیٹ بھرنا چاہیئے۔ خالی پیٹ بھرنے کو پیٹ میں جانے والے ٹماٹر، چاٹ یا چاول اُن کی نظر میں سب ایک ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم آج اپنے جسم میں پہنچاتے ہیں وہی کل ہمارا جسم بننے والا ہے۔

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہارات کا پلندہ نہیں بنایا۔ چار سو بیس اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات جن کا مقصد محض خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے بیسویں صدی میں شائع نہیں کئے جاتے۔ اس میں شائع ہونے والے اشتہارات پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں۔

(منیجر بیسویں صدی نئی دہلی)

نظمیں اور غزلیں

ہفت رنگ از جناب عرش ملسیانی بی اے۔ آسمانی شعر یا ایک منہ بولتی تصویر۔ عرش کا شعر روح کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے شعری ادب کو اس نے ہر رنگ سے نوازا ہے۔ ان تمام رنگوں کا نظارہ "ہفت رنگ" میں کیجئے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چنگ و آہنگ عرش ملسیانی کا نیا شاہکار غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ تعارف جوش ملیح آبادی۔ دیباچہ عبدالقادر سروری قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

آہنگِ حجاز رسولِ کریم کی بارگاہ میں ایک ہندو کا خراجِ عقیدت جناب پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بی اے کی نعتوں کا مجموعہ۔ اس حسین و جمیل کتاب کو ہندوستان اور پاکستان کے مشاہیر نے سراہا ہے دیباچہ از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ

پوسٹ مارٹم عرش کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا مجموعہ دیباچہ قاضی عبدالغفار قیمت فی جلد دو روپے چار آنے۔

دستک اردو کے مشہور نوجوان شاعر نریش کمار شاد کی رومانی اور انقلابی نظموں کا مجموعہ۔ جسے اردو کے بیشتر نقادوں نے نئی شاعری کی پاکیزگی، گہرائی اور عظمت کا نمائندہ مجموعۂ کلام قرار دیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

آہٹیں آپ کے محبوب شاعر نریش کمار شاد کی نظموں، غزلوں، رباعیوں اور قطعوں کا نیا مجموعہ جس کا ہر شعر متلاطم و متبسم اور رقصاں و درخشاں زندگی کے قدموں کی آہٹ ہے۔ جوش ملیح آبادی کے بصیرت افروز دیباچہ، فکر تونسوی کے دلچسپ تعارف اور چغتائی کے سہ رنگے سرورق کے ساتھ قیمت فی جلد صرف دو روپے چار آنے۔

بیکراں جناب جگن ناتھ آزاد ایم اے کا مجموعۂ کلام۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں "آپ کا کلام مقبولیت کی بلند ترین چوٹیوں کو چھو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو خلوص کبھی بے نتیجہ نہیں رہتا" نیا ایڈیشن مع اضافہ۔ عمدہ کتابت و طباعت نفیس کاغذ خوبصورت اور پختہ جلد۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

ستاروں سے ذرّوں تک جناب جگن ناتھ آزاد ایم اے کی ترقی پسند نظموں اور غزلوں کا نیا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے بارہ آنے۔

رُباعیاتِ محروم ملک کے نامور شاعر حضرت تلوک چند محروم کا مجموعۂ رباعیات۔ جو دوسری بار نئی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قیمت تین روپے بارہ آنے۔

فانوس حضرت افسر آذری کا حسین مجموعۂ کلام۔ ہندوستان اور پاکستان کے نقادوں نے بیک زبان کہا "افسر آذری کی شاعری رنگین بھی ہے اور سنگین بھی"۔ دلوں کے اندھیرے میں فانوس جگمگا دینے والا یہ شعری مجموعہ آپ کو انسانیت کی نئی منزلوں کا پتہ دے گا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کی حیات افروز تصانیف

کارِ امروز	(نظمیں)	ساڑھے چار روپے
ساز و آہنگ	(نظمیں)	ساڑھے پانچ روپے
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپے
شعرِ انقلاب	(نظمیں)	تین روپے

تمام کتابیں پختہ مجلّد ہیں۔ جلدوں پر رنگین گرد پوش کتابت و طباعت اعلیٰ۔ کاغذ نہایت نفیس۔

شاہنامۂ اسلام (مکمل)، نیا ایڈیشن صرف ساڑھے سات روپے میں حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ ہے قیمت سولہ روپے۔ اب صرف سات روپے آٹھ آنے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ ہوگا۔

نشاطِ غم ہندوستان کے مشہور رومان پرست شاعر جناب بسمل سعیدی کا حسین و رومان پرور مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں حُسن و محبت کی حقیقت بداماں دلفریبیوں اور رنگینیوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ مسرت و غم کے اس حسین امتزاج میں آپ ایک ایسی خوشی کا احساس پائیں گے جو آپ کو لذتِ غم سے آشنا کرے گی قیمت چار روپے

کیفِ الم جناب بسمل سعیدی کی غزلوں نظموں، رباعیوں اور قطعوں کا نیا مجموعہ۔ جسے پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ اس کا ہر شعر حدیثِ یاس و الم ہی نہیں، امیدوں، آرزوؤں مسرتوں اور رعنائیوں پرور رنگینیوں کی مکمل تفسیر بھی ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

گرمیٔ بازار اردو کے عوامی شاعر جناب تاجور سامری کی شاعری میں عوام کے دل دھڑکتے ہیں۔ گرمیٔ بازار شاعر کی زندگی خیز اور حسین و جمیل مترنم غزلوں کا دلفریب مجموعہ ہے۔ زبان سادہ اور سلیس اسلوب تیکھا لیکن سہانا ہے۔ خوبصورت گرد پوش مضبوط جلد قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

محفلِ خواتین کئی سو شاعرہ خواتین کے کلام کا نادر و نایاب مجموعہ۔ روح پرور اور رنگین نظمیں اور غزلیں۔ نہایت ہی شان دار اور خوبصورت بڑے سائز کی کتاب قیمت صرف چار روپے۔

سوال وجواب

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے۔ ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ —— (ایڈیٹر بیسویں صدی نئی دہلی) ——

محمد ابواللیث ۔ اورنگ آباد

آج کی تعلیم کا معیار اتنا نیچا کیوں کر دیا گیا ہے ؟

تاکہ انسان میں زیادہ قابلیت پیدا نہ ہو سکے۔ زیادہ قابلیت امنِ عالم کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

جوانی کیا لے کر آتی ہے اور کیا دے کر جاتی ہے ؟

جوانی ہونٹوں پر مسکراہٹیں، قہقہے، گالوں پہ شادابی اور شگفتگی لے کر آتی ہے اور ہونٹوں کو خاموشی، سنجیدگی۔ ذہن و احساس کو فکر اور گالوں کو جھریاں دے کر جاتی ہے۔

لیاقت اللہ ۔ کھنڈوہ

کیا آپ کا بھی نظریہ ہے کہ دُنیا کے تمام آدمیوں کا مکمل انسان بن جانا ہی ہر ایک کے لئے امن سلامتی اور کامیابی کا باعث ہے۔

ج۔ یقیناً۔ جب تک "انسان صحیح معنوں میں انسان نہیں بنتا اُس وقت تک دُنیا میں امن اور سلامتی کا دَور دَورہ نہیں ہو سکتا۔

س۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ اور شائق آدمی کو ترقی پسند کیوں کہا جاتا ہے۔ جب کہ وہ مشرقی ملک کی پیداوار ہے ؟

ج۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ مشرقی آدمی کے لئے "ترقی پسند" کا استعمال کچھ اچھے معنوں میں نہیں کیا جاتا۔

س۔ ایک انگریزی اخبار گاندھی جی کے متعلق لکھتا ہے ——

GANDHI JI WAS GOOD OF INDIA

کیا آپ اِس خیال سے متفق ہیں ؟

ج۔ جی ہاں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما گاندھی اِس دَور میں انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

عبّاس بھائی قادر بھائی برہانپور

س۔ اگر انسان ہر بار ناکام رہے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے ؟

ج۔ ہر ناکامی کے بعد کامیاب ہونے کے لئے نئی ہمت، نئے حوصلے سے جدّوجہد شروع کرنی چاہیئے۔

س۔ عورت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج۔ بہت بلند۔